

تسنیم نمبر

# محور

۱۹۷۷ء

طلبہ وطالبات پنجاب یونیورسٹی کا اُردو مجلہ

سرپرست

ڈاکٹر خیرات محمدؐ ابنِ رسا

(وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)


مشیر

پروفیسر مسکین علی حجازی

(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ صحافت)

مدیرِ اعلیٰ

سلیم منصور خالد

ایم اے فاضل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج



نگراں محور



# پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

**Printed by**
***Allahwala Printers 81 Shahrah Quaid-e-Azam Lahore***

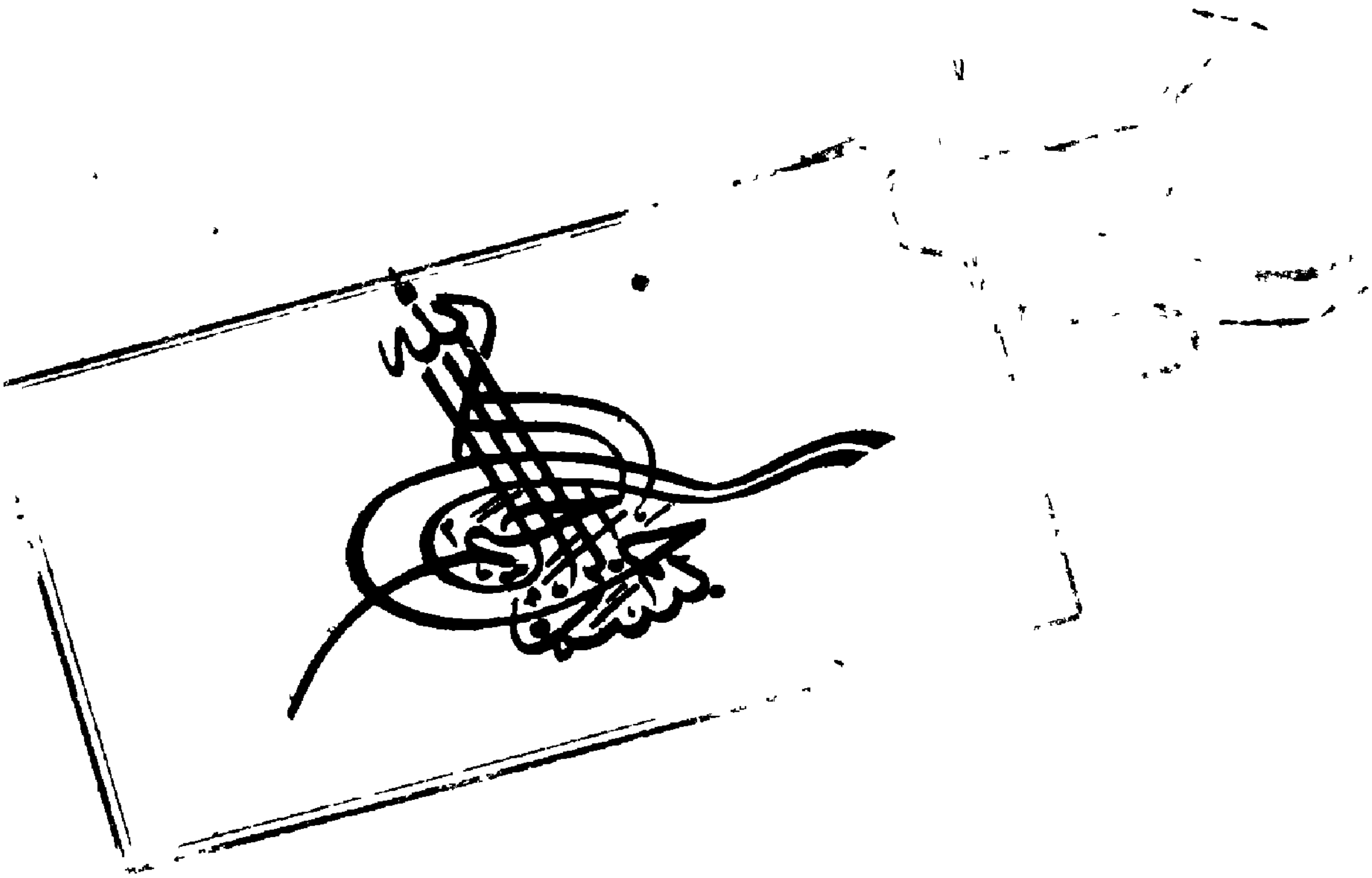




مدیر اعلیٰ



مشیر



## طلبہ کی رہنمائی



## [illegible]



## گفتگو



## [illegible]



## [illegible]



سعید ظفر (اردو)، محمد اکرم ناصر (اردو)، شاہد سلیم (سائیکالوجی)، عبدالرؤف (ارضیات)، طارق عزیز طارق (اردو)، ناصر حمید (شماریات) جاوید معصوم (لاء کالج)، مشتری سٹ (اردو)، جاوید اقبال (سوشل ورک)، انتشار اختر (ارضیات) ۔ ۔ فارسی، سلیم منصور خالد (پنجابی)

## [illegible]



## [illegible]



## [illegible]

## پھول کہانی



## نصابیات



## وجود، زمان، کائنات اور تعلیم



## تجاویز — میمورنڈم



## نقطۂ نظر



## تنقیدات و تفہیمات



سالقین جامعہ کا موثر کلام

عدیم دادی، شمیم یار، محمود شام، ممتاز حسین

عطار الحق قاسمی، سلیم طاہر، امجد اسلام امجد، جلیل عالی

ماشد حسین، ہر بہت المکس، ہمایوں مجاہد۔

# مطلع



مطلع ابر آلود نہیں !
مطلع "خشک" — خشک تر ہے !
اس موسم کا نیں پھل — "محور" — "اس کی نظر میں خشک اور قلندر کی نظر خود آگاہ میں تر بہ تر —"
"محور" — طرح طرح کے اشاروں، تبصروں اور نقروں کے جھکڑوں میں آپ کے درمیاں — !

"بدقسمتی" سے "ہم واقع ہی ہوئے "خشک قلم" — ہمارا "تصورِ حسن" پیام زندگی سے مرصع ہمارا "لٹریچر خشک" روحِ اسرار خودی سے مالا مال —"

"خوش قسمتی" سے "وہ" واقع ہی ہوئے "رنگین مزاج" — ان کا تصور رنگ و طرب ہے دل کے لیے موت، اور زندوں کے لیے پیغامِ مرگ — "

اس خشکی میں — اس تری میں اے قارئینِ محترم! لیجئے حاضر ہے آپ کا محور —!

★ قائداعظمؒ اور اقبالؒ کی سوچوں کا نقیب ——— محور!
★ نئی نسلوں کا ترجمان، شہدائے پاکستان کے لہو کا ——— محور!
★ مالک کی قربانی اور تسنیم عالم منظر کے ایثار کا ——— محور!
★ وحید شہید کے کردار اور البدر کے جذبۂ تحفظِ پاکستان کا ——— محور!

ساتھیو! آؤ! اس محور میں اپنی تعلیم کا پہیہ گھمائیں، سر سے تیر تر طرلیں یہ چلا دیں — !! آپ کو یاد ہو گا لوڑھے ہوتے ہی خشک رو ہیں! اسی لیے تو مقصدیت کی "پھیکی پھیکی" باتیں کرتے رہتے ہیں، ہمیں خوشی ہے کہ ہم "جوان نہیں، ۲۴، ۲۵ کے پیٹے "بوڑھے" ہیں اور عزم رکھتے ہیں اُس پیغامِ انقلاب، آوازۂ عظمت و کردار کی زندہ و جاوید لہروں کو کہساروں سے صحراؤں تک — اور صحراؤں سے میدانوں تلک — ! پھیلائیں گے۔ انہیں پھیلانا، اُبھارنا، حق کو طاغوت کے کل پرزوں کو توڑ پھوڑ کے انہیں مسلط کرنا آپ کی — ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ آئیے! مل جل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں — بظاہر کام کٹھن ہے۔ ظاہر ہے اس راہ پُرپیچ میں نہ قالینوں سے آراستہ رم و گداز راستے ہیں اور نہ کہکشاں کی سی ٹھنڈک — ! سچ ہے کہ ذمہ داری ہوتی ہی کٹھن ہے — "جس میں ہو نہ کشمکش موت ہے وہ زندگی"!!

جاتو!
ایک بات یاد آئی — خشک موسم اس بات کا ضامن ہے کہ کپاس کی فصل بہتر ہو۔ اور یاد ہے کچھ

ذرا ذرا کر ـــ کپاس ـــ شرم و حیا کی ضامن، تن بدن ڈھانپنے کا وسیلہ ! اے کاش اک ہم غلطی کے" ان سوتوں سے عفت و حیا کی جوت جگا کر اپنی ملت، اپنی قوم کا تن ڈھانپ سکیں۔

ـــ کہ جس کا ستر مغرب کے سفید ہاتھوں نے

ـــ کہ جس کا تن مشرق کے سرخ پنجوں نے

کھول رکھا ہے ـــ پیرہن تار تار کر رکھا ہے ـــ بنیادیں ریزہ ریزہ کر رکھی ہیں ـــ ! یہ ریزے ـــ یہ تار ہم سب کا قیمتی سرمایہ ـــ اور حقیقی سرمایہ ہیں ـــ آؤ ! انہیں سمیٹ لیں انہیں ڈھانپ لیں ـــ !!

اگلی بات ـــ !

اسلامی نظامِ تعلیم ـــ اسلامی انقلاب ہی کا ایک جزو اور اس کی جہد و جُہد، عظیم جہد و جُہد ـــ !

ادارہ "محور" اس انقلاب آفرین، پیہم رواں ـــ ہر دم جواں ـــ پھر جاوداں ـــ اور کامراں ـــ جذبے کو سلام کہتا ہے۔

وہ جذبہ کہ جس نے پاکستان کی نظریاتی اساس کو ٹکڑے کرنے والے اقتدار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ـــ !

وہ حوصلہ کہ جس نے تحریکِ پاکستان کی ابتداء سے آج کے "عہد ہزار داستان" تک ـــ لہو کے چراغ جلائے

وہ تڑپ کہ جس کے نتیجے میں طلبہ گھمبیر اندھیروں سے لڑتے رہے، اپنے لہو سے روشنی دیتے رہے، ٹمٹماتے دیوں کو اپنے سینوں کی حدّتِ جذبات سے روشن رکھتے رہے۔

وہ مقدس لہو جو ماؤں کی زندگی، بہنوں کی روشنی، والدین کا سہارا تھا ـ ! اسے قاتلوں، ظالموں، آمروں کی طرف سے چھینا چاہا، بجھانا چاہا ـــ پھر ہزاروں زندگیاں چھن ہی گئیں، مگر ـــ مگر، روشنیوں اور جذبوں کا سفر رک نہ سکا ! کروڑوں انسانوں کو زندگی دے گیا ـــ جذبۂ مستانہ دے گیا۔

آج جامعہ پنجاب کے سر سر طالبِ علم کا یہ عہد ہے کہ یہ چراغِ زندگی روشن رہے گا، جلتا رہے گا۔ ضیاء پاش رہے گا۔ ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اگر کل تحریکِ پاکستان کا گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھی ـــ تو آج

پاکستان میں اسلامی انقلاب کا سورج ـــ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے طلوع ہوگا اور یہی حقیقی طلوع ہوگا باقی سب غروب! طلوع میں روشنی ہے۔ غروب کے بعد اندھیرا ہے۔ اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ چہرے نہیں سماج بدلے گا، سماج! زندگی بندگانِ زر کی غلام ہوگی، ـــ نہ بندگانِ ثقافت کی باندی بنے گی!

ذرا سنیئے تو سہی!

سحر کا ـــ اُجالے کا ـ بگل بج رہا ہے!

سلیم منصور خالد

[illegible]

نعیمہ صدیقی

# محسنِ انسانیتؐ بحیثیت معلمِ انسانیتؐ

رفتارِ عالم کا آغاز، خداوند علیم و حکیم کے نام سے ہوا جس نے پیدا کردہ ہر مخلوق کے لیے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر معین کرتا ہے اور اس کے لیے راہِ ہدایت کی نشاندہی کرتا ہے جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علّمَ الاَسماء کے اعزاز سے نوازا اور جو تمام انسانوں کے لیے اوّلین معلمِ حقیقت و ہدایت ہے۔

خدا کا سلام اس انسانِ عظیمؐ پر جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر و نذیر بنا کر اٹھایا گیا اور ساری انسانیت کے لیے معلمِ فلاح و سعادت کے منصب پر قیامت تک کے لیے مامور کیا گیا۔ وہ کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ صحرا میں غار کے عمرانی کلاس روم میں معلمِ صدق و صفا سے درس لینے والی مہذب ناآشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوامِ عالم کے لیے نہ صرف راستی، مساوات، عدل، اخوت، احسان اور امن کی رہنما بنی، بلکہ اس نے تدبر و تفکر کی کلیدوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوعِ انسانی کے لیے کھول دیئے حتیٰ کہ حضورؐ ہی کی تیار کردہ جماعت نے بین الاقوامی دورِ تہذیب کا افتتاح کیا اور آج کے جاہ و علوم اور نئے تہذیبی تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابلِ قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے، یہ اسی قومِ محمدؐ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سراغ گم کر بیٹھی۔

اصل بحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساسِ ندامت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ امتِ اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبی پاکؐ جیسے عظیم ترین معلمِ ایمان و عمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری و عملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے۔ اپنے کاروانِ حیات کو ہر پیچ و خم تاریخ سے گزارتے ہوئے حضورؐ کا دامن قیامت تھامتے، اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبوں کے کارپرداز حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے، مگر ہماری افسوسناک حرکت یہ ہے کہ ہم اس ہستی کو جو قائدِ تہذیبِ انسانی تھی، ایک آراستہ پیراستہ محافلِ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلوں کو دوسرے فکر و عمل کی وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ تہذیب کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لیے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے افق پر ابھرنے والے مت سے "آفلین" کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصودِ نظر پھر جب چمکتوں کی چمک دکھا کر آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے، تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اس پر مر مٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی گھٹیا اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں، اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے، جب تعلیم بھٹک جاتی ہے، جب مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے، اور جب معلم اپنا فریضہ اور بات صحیح طور سے ادا نہیں کرتا۔ علم اور تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے، نہ جمہوریت نشو و نما پاتی ہے، نہ اقتصادی عدل قائم ہو سکتا ہے، نہ اخلاقی شعور اتنا رو دار ہو سکتا ہے کہ جرائم کا راستہ رک سکے۔ نہ قومی خودی اس حد تک توانا ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دفاعی، سائنسی اور لشکری قوتوں کو صحیح طور سے بروئے عمل لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا، آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو میں جادہ پیمائی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو بالکل ابتدا سے آہستہ آہستہ پرورش پا کر اب پوری طرح جوان ہو گیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا وسیع کر کے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو اس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ علوم و فنون، تعلیمات و ادارات، ذرائع و وسائل اور تحقیقات و تعلیمات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دوچار ہے۔ جنگوں، انقلابات، قومی و طبقاتی تعصبات، طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور ہر قسم کے جرائم کے ہجوم میں کھڑا ہوا بے بس انسان دل و دماغ کا سارا سکون گنوا کر ہمدردی کے ایک مخلصانہ بول کے لیے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی، اور عالمی لحاظ سے بھی زندگی کو سنوارنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ تعلیم کا شعبہ ہے اور اسی کی درستی پر ہماری سلامتی کا بھی انحصار ہے، اور اسی کو صحیح اصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فساد کدۂ دنیا کو امن و انصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

میرے مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کی درستی کے لیے حضورؐ خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید اشارات و نکات اخذ کر سکیں۔ حضورؐ کے معلمانہ کارناموں پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہو گی جب تک ہم اس حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

## ہماری حکمتِ علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع و اصول کیا ہیں؟ ان سوالوں کو چھیڑتے ہوئے ہم مغرب کے نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) کو دیکھتے ہیں تو پھر ہم بیرونِ محمدؐ اور حاملینِ قرآن کی حیثیت سے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ اس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑ کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزا ہیں وہ غلط افکار و تصورات کے ساتھ اس بری طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے ذریعے زندگی کو پوری طرح خیر و فلاح سے آراستہ کرنا ناممکن ہے اور جو نظامِ تعلیم

محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ بن کے رہ گیا ہے، وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کرسکتا ہے اور نہ انسانیت کو موجودہ بحران سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کی رو سے حقیقت صرف وہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے ماورا خواہ کتنے ہی بڑے سے بڑے حقائق موجود ہوں، ہمارے لیے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جس شکل میں سمجھتے یا جان لیتے ہیں، اس مرحلے میں وہ کچھ حقیقت ہے۔ بعد میں اگر نئی معلومات پچھلے مسلّمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریۂ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایۂ علم کسی بھی مرحلے میں ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہو سکیں کہ ہم نے صحیح عمارت اٹھائی ہے، اور اب مزید معلومات و تجربات کی مدد سے اسے سجانے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیرِ حیات کے عمل میں قابلِ اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کے نظریے، آج کی تحریکیں، آج کے سماجی نظام آج کے معاشرے اُس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحلِ سمندر کی ریت سے بناتے ہیں، پھر اپنے حاصلِ محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دہراتے ہیں۔ غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے میں اُس حکمتِ علم پر چند گزارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے دنیا کے سامنے رکھا

واضح ہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیرِ بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدارِ گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں، رویّوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبی پاکؐ نے بحیثیت معلّمِ انسانیت ہمارے سامنے اوّلین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علمِ کامل صرف خدا کو حاصل ہے[1] وہی کائنات کے ہر ذرّے کا جاننے والا، ظاہر و پنہاں سے آگاہ اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو جو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اسی کا عطیہ ہے[2] انسان کو جو محدود ذرائع علم حاصل ہیں وہ اسی کے عطا کردہ ہیں، سماعت، بصارت اور تفکر کی قوتیں اسی نے دی ہیں[3] انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے اکتشافات سمیت بہت ہی محدود ہے[4] خدا کے علمِ کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علمِ قلیل کی محدودیت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلبِ علم پیدا ہوگی اور دوسرے وہ علمِ کامل کے سرچشمے سے استفادہ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا اور اس سے استفادہ کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحبِ علمِ کامل اور اس کے زیرِ تعلیم متعلم کے درمیان بروئے عقل موجود ہونا چاہیئے۔ ایسے علم کی محدودیت کا شعور انسان کو اس جسارت سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر بنے نظاموں اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور غیر متوازن ڈھانچے کھڑے کرے۔ ان پر بےحد انسانی قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کریں اور پھر وہ کچھ عرصے بعد دیکھے کہ وہ ہولناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ حضورؐ کی حکمتِ علم انسان کو بتاتی ہے کہ انسانی علم کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا بار اٹھانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان خدا کا نائب کے مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیرِ ہدایت کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے[5]

علمِ قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسّی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے، بلکہ حسّی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دوسرے ذریعۂ علم کا بھی سراغ لگائے جو تعمیرِ حیات کے لیے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ پس انسان ایک لامتناہی وادیٔ علم کا مسافر ہے جس کے لیے گھومنے کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافۂ علم کی دعا جذبۂ طلبِ علم کو متحرک رکھنے کے لیے سکھائی گئی ہے[6]

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمتِ تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافرِ علم کے سامنے کچھ نشاناتِ راہ ضرور واضح ہوں۔ اس کے پاس کچھ نہ کچھ زادِ راہ بھی ہو اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبی اکرمؐ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کے رو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی صحت کا دارومدار ہے۔

ان میں سے اوّلین حقیقتِ علیا (SUPREME REALITY) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمتِ علم کی بنیاد تصورِ خدا پر ہے۔ اُس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ (۶۷-۲۶، ۴۶-۲۳) إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۳۵-۳۸) يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (۶-۳) وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۴-۳) وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶-۸۰) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵)

[2] ملاحظہ ہو آیت: عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶-۵)

[3] ملاحظہ ہو آیت: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۶۷-۲۳)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷-۸۵)

[5] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[6] ملاحظہ ہو آیت: رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۲۰-۱۱۴)

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے[1]۔ اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے[2] وہ اگر صحیح راستے پر چلے تو اس کے لیے خلافت و نیابت کا درجہ مقدر ہے[3] اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تمیز خیر و شر دی گئی ہے[4] بنا بریں وہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے[5]۔

تیسری بڑی حقیقت مادی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی، وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے[6] وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے[7] اس کی ایک غایت ہے[8] اس میں نظم و ترتیب ہے[9] اس میں سے چند اٹل قوانین میں جکڑی ہوئی ہے[10] اس میں توازن ہے[11] اور اس میں حسن و زیبائی ہے[12] پوری کائنات ایک ہی کل ہے جو ایک ہی قوت کے زیر فرمان چل رہی ہے[13] اس کائنات کی تمام مادی اشیاء اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو، اس کے لیے مسخر کی حیثیت رکھتی ہیں[14] اور ان سے وہ حیثیت ... الٰہی فائدہ اٹھانے اور ان کو حدود اللہ کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا مجاز ہے کائنات مادی کے موجودات اور ان کی قوتوں سے کام لینے کے لیے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اس علم کو حصول کے علم ... قرار دیا ہے یعنی وہ علم جو مجسم موجودات ... اور ان کی قوتوں اور ان کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں

ان تینوں حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالب علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے آتے ہیں ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ[15] دوسرا امور غیب کا[16] دائرہ امور غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور ان تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں نہیں دیا گیا، لیکن ہم امور غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی نہیں چل سکتے۔ ہر فرد انسانی چند نمایاں سوالات سے دوچار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؟ یہ زندگی ایک وقتی ظہور ہے یا اسے موت کے بعد بھی کسی شکل میں جاری رہنا ہے؟ ہم اپنے اعمال سے جو کچھ جیسے کچھ نتائج دنیا ہی میں پا لیتے ہیں، یہ معاملہ اسی پر ختم ہے یا کسی باقاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷: ۷۰) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵: ۴)

[2] " " : يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (۲: ۲۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱: ۵۶)

[3] " " : وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴: ۵۵)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰: ۱۰)

[5] " " : أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (۲۳: ۱۱۵)

[6] " " : وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (۲۱: ۱۶) لَوْ أَرَدْنَا أَن نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنَاهُ مِن لَّدُنَّا إِن كُنَّا فَاعِلِينَ (۲۱: ۱۷)

[7] " " : رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (۳: ۱۹۱)

[8] " " : خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (۶۴: ۳)

[9] " " : هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ (۶۷: ۳)

[10] " " : مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ (۱۶: ۱۲)

[11] " " : وَوَضَعَ الْمِيزَانَ (۵۵: ۷)

[12] ملاحظہ ہوں آیات: إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا (۱۸: ۷) إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (۳۷: ۶) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (۱۵: ۱۶) حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ (۱۰: ۲۴)

[13] ملاحظہ ہوں آیات: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱: ۲۲) نیز قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا (۱۷: ۴۲)

[14] ملاحظہ ہو آیت: ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۳: ۱۴) وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲: ۳۶)

[15] امور غیب کی کئی اقسام ہیں مثلاً، ایک وہ تمام امور جو ماضی و مستقبل کے دائرے میں پائے جاتے ہیں جیسا کہ دور رس اور وسیع الاثر قوانین و عوامل جو صدہا سال کی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں جیسے اخلاقی و عملی سلسلۂ اسباب و علل کہ وہ بے حساب اور ناقابل استقصا نتائج جو ہزارہا اشخاص سے ہوتے ہوتے کئی نسلوں تک پھیلے چلے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا دائرہ وسعت عالمگیر ہوتا ہے (واضح رہے کہ الہامی علم و ہدایت میں ایسے حقائق و امور کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے)

دوسرے وہ امور جو ایک وقت میں کسی کے لیے غیب ہیں، کسی کے لیے شہود جیسے مری میں بیٹھے ہوئے ہم نہیں جانتے کہ اس لمحے لاہور کی مال روڈ یا کراچی کی بندرگاہ پر کیا ہو رہا ہے اور وہاں کون کون سے اشخاص موجود ہیں یا مثلاً اس وقت کہاں کہاں بارش ہو رہی ہو یا مثلاً ایک آدمی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر جان چکا ہے کہ فلاں نام کی گاڑی کس جگہ سے آنے والی ہے اور اب کس مقام سے گذر رہی ہوگی، لیکن اس بارے میں دوسرے بے شمار لوگ لاعلم ہیں، یا مثلاً ایک شخص کسی خاص زبان یا علم و فن کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے بے شمار ایسے امور سے واقف ہوتا ہے جن کو دوسرے نہیں جانتے ——— تیسرے وہ امور جو ایک زمانے کے لوگوں کے لیے دائرہ غیب میں ہوتے ہیں اور دوسرے زمانے میں شہود میں آ جاتے ہیں جیسے ریڈیو، بجلی یا جوہری توانائی کا وجود، یا جیسے چاند کی حقیقت کے بہت سے گوشے جو خلائی جہازوں کے استعمال سے قبل نامعلوم تھے یہ ساری اقسام ممکن الشہود غیب کی تعریف میں آتی ہیں ——— چوتھے وہ امور جنہیں ہم محض اشیا و حوادث کے علم کی ہزار وسعتوں کے بعد بھی براہ راست نہیں پا سکتے مثلاً خدا کی ہستی، سلسلۂ وحی و الہام، حیات بعد الموت وغیرہ

ایک بات میں اس معنی میں ہم نے امورِ غیب کی اصطلاح استعمال کی ہے
کے صحیح اور مکمل نتائج ملتے ہیں؟ زندگی کا معاشی اور جنسی کامرانیوں علاوہ بھی کوئی مقصد ہے؟ ان سوالات کا جواب طے کیے بغیر زندگی کی سرگرمی کو حسن و خوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص جانتا ہو یا نہیں، شعوری طور پر، نہیں تو نیم شعوری طور پر، باقاعدہ استدلال سے نہیں تو ظن و تخمین سے ان سوالات کے جوابات طے کر لیتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کرتی ہے۔

ان امورِ غیب کے متعلق انبیا وحی و الہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کرتے اور دکھلاتے ہیں کہ الہامی رہنمائی کو جس نے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت شاید مفید ہوگی کہ تاریخ کے مطالعہ میں اسلامی حکمتِ علم جس چیز پر ہماری توجہات کو مرکوز کرتی ہے وہ سنۃ اللہ[1] اور امر اللہ[2] ہے۔ اس سنۃ اللہ اور امر اللہ کے زیرِ عنوان آنے والے قوانین و لوازمیں میں سے جو زیادہ جامع، مذہبی اور اساسی ہیں ان کی تصریح مثالوں کے ساتھ قرآن نے کر دی ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ کر کے مزید شواہد دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح مطالعہ کائنات کے سلسلے میں قرآن کی ایک اصطلاح بہت اہم ہے اور وہ ہے آیت۔[3] جس طرح آیاتِ قرآن علمِ حقیقت اور علم حواس سے بہرہ مند ہونے کے لیے ہماری رہنما ہیں، اسی طرح مادی کائنات میں پائے جانے والے تمام مظاہر تلاشِ حقیقت کے سفر میں ہمارے لیے نشانات راہ ہیں اور ان پر بھی آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کائنات کی آیات سے ایک فلسفی اور ایک سائنس دان یکساں استفادہ کر سکتے ہیں مگر ان آیات میں جمال کا جو پہلو پایا جاتا ہے اس سے ادیب، شاعر، مصور اور حملہ فنونِ لطیفہ کے وابستگان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

یہاں اس اشارے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کی آیات اور تاریخ میں کام کرنے والے قوانین الہامی تعلیم کی آیات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہی ہم آہنگی الہامی تعلیم کی صحت و صداقت کے لیے ایک مؤثر عقلی دلیل قرار پاتی ہے۔

اس الہامی ذریعۂ علم سے ہمارے حسی و قیاسی ذرائع حصولِ علم کی کوتاہی کی تلافی ہوتی ہے اور ہمیں ایسے یقینیات حاصل ہو جاتے ہیں جن پر انفرادی اور اجتماعی تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہ الہامی یقینیات نظامِ تمدن میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں جیسے ریاضی میں دو اور دو چار کا فارمولا ہے۔

سوئے جہاں ہمیں بعض تفصیلی احکام و قوانین اور حدود و شعائر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے وہاں اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں "العلم" THE KNOWLEDGE یا اساسی علم (THE BASIC KNOWLEDGE) سے بہرہ یاب کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں مرکزی حقیقت عظمیٰ کا شعور ملتا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں رہنما اصولِ حیات (GUIDING PRINCIPAL) اور بنیادی صداقتوں (FUNDAMENTAL TRUTHS) نیز مستقل اخلاقی قدروں (PERMANENT MORAL VALUES) کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ اسی قسم کے اٹل یقینیات کو قرآن "قولِ ثابت"[4] قرار دیتا ہے جو کردار اور تہذیب کی اساس کے طور پر اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ ان اساسی حقائق و قوانین کے چوکھٹے میں دیگر تفصیلی ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔

یہی وہ علم ہے جسے وراثتِ انبیا قرار دیا گیا اور یہی وہ العلم ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔[5] اگر اس علم سے مراد جملہ اقسام کے علوم لیے جائیں، تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ روئی دھننے اور جیلڑے کی دباغت کرنے سے لے کر انجینئرنگ اور ڈاکٹری اور جوہری توانائی اور خلائی پرواز تک کے سارے علوم حاصل کرے اور نہ کر سکے تو ترکِ فرض کے جرم کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ فی الحقیقت سارے کا سارا قرآن اسی العلم کا آئینہ دار ہے اور نبی اکرمؐ نے بحیثیت معلمِ کتاب و حکمت اصل زور اسی العلم کو پھیلانے پر صرف کیا ہے۔ اس کی مختصر جامع تعریف حضورؐ نے ان الفاظ میں کی ہے "وہ علم جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔" (روایت ابوہریرہ، مشکوٰۃ کتاب العلم)

علم کا آخری مقصد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاحات کے مطابق اس سوال کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ علمِ حق کے ذریعے علمِ صالح کا حصول، اعمالِ صالحہ سے حیاتِ طیبہ کی تشکیل اور حیاتِ طیبہ سے نفسِ مطمئنہ کے مقام تک رسائی علم کا مقصود ہے۔

اگر ذرا اور اجمال سے کام لیا جائے کہنا یہ چاہیے کہ علم کا کام یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، مفید اور مضر، نیکی اور بدی کو الگ الگ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دے۔ تعلیمِ نبوت کا امتیاز رشد و غی میں امتیاز پیدا کر دینا ہے[6] یہی تعلیم کا فرقان ہونا لازم ہے۔[7]

اسلامی حکمتِ علم کی پوری تفاصیل کو سمیٹنے کے لیے ایک مستقل مقالہ چاہیے۔ یہاں محض سرسری طور پر چند نکات درج کیے بغیر چارہ نہیں، البتہ یہ غلط فہمی رفع

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۱۷: ۷۷
[2] ملاحظہ ہوں آیات ۸: ۴۴، ۱۱: ۱۲، ۱۶: ۱، ۱۹: ۳۴، ۳۸
[3] ملاحظہ ہوں آیات ۱۲: ۵، ۱۶: ۱، ۱۲: ۱۳، ۱۶: ۷۶، ۱۲: ۷۰، ۳: ۱۳، ۱: ۹۲
[4] ملاحظہ ہو آیت: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۱۴: ۲۷)
[5] ملاحظہ ہو حدیث: طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة (مشکوٰۃ کتاب العلم)
[6] ملاحظہ ہو آیت: قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲: ۲۵۶)
[7] هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (۲: ۱۸۵)

اور یہ اسرار ہی ہے کہ العلم کی متذکرہ اہمیت کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے طبعی اور عقلی علوم سے توجہ ہٹالی جائے جن کی مدد کے بغیر انسانی زندگی کی بہت سی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

قابل لحاظ بات صرف یہ ہے کہ ہمیں العلم[۳] کی اساس پر تمام علوم کو مدون کرنا چاہیے اور اپنے نظامِ تعلیم اور نصاب سازی کے لیے اس کو محور بنانا چاہیے۔ ہمارے تعلیمی، طلاب کا لقدر آغاز جس کو کا پورا تعلیم نے اب تک نہیں کیا اور ہم ایک ہمہ گیر اور مطلوب نظامِ تعلیم کے فقدان میں محسوس ہیں۔

## حضورؐ ایک تعلیمی تحریک کے سربراہ تھے

جب کبھی کوئی سی اٹھتا ہے تو وہ ایک ہمہ گیر تہذیبی انقلاب اور ایک تعلیمی تحریک کا علمبردار بھی ہوتا ہے۔ حضورؐ بھی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی لانے کے لیے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے اور عقائد و افکار سے لے کر احکام و قوانین تک ہر چیز کی تعمیرِ نو کا کام آپ کے سامنے تھا۔ اساسی کام انجام دینے کے لیے حضورؐ معلم اساس ہی نہیں تھے ایک وسیع تعلیمی تحریک کے سربراہ بھی تھے۔

اسلام جس طرح دینِ ہدایت ہے، اسی طرح صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دینِ علم اور دینِ تعلیم و تعلّم بھی ہے جس دین کا آغاز حکمِ اِقْرَأ[۱] سے ہوتا ہو جس کے اصل مخاطب اولوا الالباب[۲] ہوں جس کے اسرار و رموز کو پا کر ایمان کے معیار کمال تک پہنچنے والے الراسخون فی العلم[۳] ہوں جو براہین پیش کر کے مخالفین سے ثبوت و براہین طلب کرتا ہو[۴] جو تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتا ہو، اور جو سمع، بصر اور فواد سے کام نہ لینے والوں کو مویشیوں سے بدتر قرار دیتا ہو[۵] جو کتاب الٰہی کا بوجھ گدھوں پر لاد کر اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کو ایسے گدھے سے تشبیہ دیتا ہو[۶] جس پر علم کا دفتر لدا ہو[۷] اس کے بارے میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ وہ اساسی طور پر ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔

دینِ حق کی تعلیمی تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے حضورؐ کے پیشِ نظر معاشرہ کا اس رُخ تھا اور آپ ذہنی و فکری لحاظ سے بھی تعلیم دینے والے تھے اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے بھی فریضۂ تعمیر ادا کرنے والے تھے، سیاسی و اقتصادی دائروں میں بھی صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرنے والے تھے اور مخالف [illegible] کے مقابلے میں حکمت کے اندر بھی کمان کرنے والے تھے حضورؐ نے عملاً تعلیمی تحریک چلا کر توسیعِ علم کے لیے جو کام کیا اس کا نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ [illegible] حضورؐ کا پیغام پہنچا ان کے اندر طلبِ علم کی اتھاہ پیاس پیدا ہو گئی اور جوں جوں دینِ حق پھیلتا گیا ہر قسم کی علمی ترقیات کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

## نبی اکرمؐ کا معلمانہ منصب اور حکمتِ تعلیم

قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ حضورؐ کو معلمِ کتاب و حکمت اور مزکی قرار دیا گیا ہے[۸] حضورؐ خود اپنے آپ کو معلم قرار دیتے ہیں[۹] مسجد نبوی میں ایک وقت آپؐ ایک طرف حلقۂ ذکر دیکھتے ہیں اور دوسری طرف مجلسِ تعلیم و تعلّم، تو دونوں کا استحسان کرتے ہوئے مجلسِ تعلیم کو ترجیح دے کر اس میں حاضر ہو جاتے ہیں[۱۰] حضورؐ نے رات کے تھوڑے سے حصے میں تعلیم دینے کو شب زندہ دارانہ عبادت سے افضل قرار دیا[۱۱]

آیئے ذرا ایک نظر اس تعلیمی حکمت پر بھی ڈال لیتے چلیں جس سے حضورؐ نے بحیثیت معلم کام لیا اور بعد کے معلمین کے لیے واضح نشانات راہ چھوڑ گئے حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کے نکات کو مسروار پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) قرآن میں حضورؐ کے لیے معلمانہ ذمہ داری کو بلاغ مبین تک محدود کر دیا گیا ہے[۱۲] یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کر دینا سرِ سچے معلم کی معلمانہ ذمہ داری ہے۔

اوپر کے اصول کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضورؐ پر واضح کیا گیا کہ آپ مخاطب لوگوں کے لیے چوکیدار یا جبار نہیں بنائے گئے ہیں[۱۳] یعنی معلمانہ کام کی روح جبر کی متقاضی نہیں ہے اس فریضہ کو انجام دینے میں جبر و تشدد کی اسپرٹ راس نہیں آسکتی۔

---

[۱] اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (۹۶ : ۱)

[۲] لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (۳۸ - ۲۹)

[۳] وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ (۳ : ۷)

[۴] ملاحظہ ہو آیت، هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۸ - ۷۵)

[۵] ملاحظہ ہو آیت، هُمْ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷ - ۱۷۹)

[۶] ملاحظہ ہو آیت مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (۶۲ - ۵)

[۸] ملاحظہ ہوں آیات ۲ - ۱۲۹، ۲ - ۱۵۱، ۳ - ۱۶۴۔

[۹] مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن عمر

[۱۰] ایضاً

[۱۱] مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت ابن عباس۔

[۱۲] ملاحظہ ہو آیت فَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ (۳ - ۲۰، ۱۳ - ۴۰، ۱۶ - ۸۲ و دیگر آیات)

[۱۳] ملاحظہ ہوں آیات، وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰ - ۴۵) لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸ - ۲۲)

(۳) حضورؐ کو جو حکمتِ تعلیم سکھائی گئی اس کا تقاضا یہ ہے کہ معلّم نرم خو ہو، تند خو نہ ہو۔ بصورتِ دیگر یا تو زیرِ تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر ایسے کلاس روم میں بیٹھے رہنے کا پابند کیا گیا تو کم سے کم طلبہ کے دل و دماغ ضرور کلاس روم سے فرار کر جائیں گے۔ حضورؐ نے خود اپنے رفقائے کار کو ہدایات دیں کہ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو۔ ان کو بشارت دینے والے ہو، نفرت دلانے والے نہ ہو۔[۲]

(۴) حضورؐ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے عملاً اس نظامِ حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نظامِ حیات کو چلانے کے لیے ایمان و کردار سے آراستہ لیڈر، افسر، کارکن اور شہری تیار کیے جائیں۔

(۵) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم ہر معاملہ کا مشنری تصور رکھتی ہے۔ ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیمِ حق دیتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا[۳] میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ یہی اصول حضورؐ کا بھی تھا اور آپ نے اپنے تیار کردہ معلّمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔

اس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلّم کا کام کسی درزی یا ترکھان یا آہن گر کی طرح کا پیشہ ورانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیئے اس کا جتنا کام کر دیا، بلکہ یہ مشنری سپرٹ سے کرنے کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں مخالفینِ اسلام یا منافقین کے لیے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ منافق میں تفقہ فی الدین کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی۔[۴]

تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ ساتھ اگر بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارات قائم کر کے کثیر التعداد معلّمین سے ان کا پورا وقت لیا جاتا ہو تو اس صورت میں یہ ذمہ داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔

(۶) تعلیم کے مشنری کام کو سرانجام دینے کے لیے اوپر کے اشارات کے مطابق معلّم میں جہاں اپنے مخاطبین کے لیے محبت و خیر خواہی اور نرم خوئی کے جذبات ہونے چاہئیں وہاں حضورؐ کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ عام فہم آسان طرزِ تکلّم اختیار کیا جائے۔[۵] اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو جدالِ احسن سے کام لیا جائے[۶] یعنی خوشگوار انداز میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔

(۷) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک تقاضا یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل و ذہنی استعداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، شہری اور دیہاتی کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، مبتدی اور منتہی کے مراتب کا خیال بھی کرنا ہوگا۔

(۸) حضورؐ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو ہدایت فرمائی کہ ایک دم سے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دہلا نہ دیا جائے، بلکہ پہلے انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے، پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے، پھر اس کے بعد روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دعوت دی جائے۔[۷]

حضورؐ کی حکمتِ تعلیم میں ایک اصولی بات یہ بھی ہے کہ آپ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے کہ تعلیم و خطابت کا سلسلہ اتنا طویل نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اکتا جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے۔[۸]

حضورؐ کے اس اصول کی ایک شہادت حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے حضرت عکرمہؓ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ ابن عباسؓ نے آنحضرتؐ کے مسلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یہ تلقین کی کہ لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو، اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دو بار یا حد سے حد تین بار۔[۹]

اسی اصول کی بنا پر حضورؐ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب دیا کرتے تھے جو نہایت مؤثر ہوا کرتے تھے۔ حضورؐ کا سب سے طویل خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے مگر وہ بھی اپنی جگہ بے حد مختصر ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں مختلف افراد اور مجالس سے حضورؐ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے ان میں سے بعض میں ایک بات،

---

[۱] ملاحظہ ہو آیت فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳: ۱۵۹) نیز ملاحظہ ہو: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۵: ۸۸)

[۲] حدیث يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (ریاض الصالحین۔ باب العلم والاناۃ والرفق۔ روایت حضرت انس) نیز حدیث: فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ۔ بخاری، روایت ابی ہریرہ۔

[۳] ملاحظہ ہو آیت، لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (۳۶: ۲۱)

[۴] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم، روایت ابی ہریرہؓ۔

[۵] ملاحظہ ہو آیت، قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲: ۸۳)

[۶] ملاحظہ ہو آیت وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۲۹: ۴۶)

[۷] حدیث (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ، روایت ابن عباس)

[۸] حدیث (مشکوٰۃ، کتاب العلم، روایت عبداللہ بن مسعود (مسلم و بخاری)

[۹] حدیث (مشکوٰۃ کتاب العلم روایت عکرمہ (بخاری)

بعض میں دو باتیں اور بعض میں چار یا پانچ باتیں ملتی ہیں کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بیسیوں تلقینات اور نصیحتیں ایک ہی سانس میں کرا دی گئی ہوں۔

(۱۰) تعلیم و تدریس کے لئے طلبِ علم کی ذہنی فضا خود ہموار کرنی ضروری ہے، چنانچہ حضور کی معلمانہ حکمت[1] یہ تھی کہ مجالسِ صحابہ میں جب تشریف لاتے تو جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہوتی ان کا تسلسل جاری رہنے دیتے اور خود بھی ان میں حصہ لیتے۔ تعلیمی گفتگو کے لیے آپ یا تو طالبِ علم کی فضا کے منتظر رہتے جو کسی سوال یا بحث یا احتمالی تنبیہ سے از خود پیدا ہو جاتی یا پھر خوبصورت طریقے سے ایسی فضا پیدا فرماتے۔

اسی بنا پر ابن عباس نے کہا کہ جب کسی مجلس کے لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے تعلیم و تبلیغ شروع نہ کرو بلکہ خاموش رہو تا آنکہ لوگ خود ہی حصولِ علم کی خواہش کریں یعنی کوئی سوال اٹھائیں[2]۔

(۱۱) متعلم کا ذہن اس وقت تک آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ معلم اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو مرکوز نہ کرے۔ چنانچہ حضور نے توجہات کو اپنی بات کی طرف مرکوز کرنے کے لیے مختلف مؤثر صورتیں اختیار فرمائیں۔ مثلاً

کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغازِ کلام کیا گیا جیسے یہ قرآنی پیرایۂ آغاز ہو کر آن پہنچا اس کا فیصلہ[3]۔

کبھی سوال سے گفتگو شروع فرماتے مثلاً کیا تم فلاں بات جاننا چاہتے ہو، کیا میں تم کو بھلائی کے راستے نہ بتاؤں؟ یا مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا[4] یا مثلاً حجۃ الوداع کے آغاز میں مجمع سے دریافت کیا کہ یہ کونسا شہر ہے، یہ کونسا مہینہ ہے، یہ کونسا دن ہے[5]۔

کبھی کوئی حیرت انگیز منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ کر دیتے مثلاً جب آسمان پھٹ جائے گا، جب تارے جھڑ جائیں گے۔ اور جب دریا اپنی گزرگاہوں سے باہر نکل کر آپس میں مل جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی[6]۔

اس سلسلے میں زیادہ مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

(۱۲) اصولِ تکرار سے بھی حضور نے بارہا کام لیا۔ کسی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے تین بار اسے دہرا لیتے۔ اسی طرح کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب فرماتے[7]۔

(۱۳) حضور نے کارِ تعلیم کے لیے مختلف دائرے اور مختلف سطحیں مقرر فرمائیں۔

ایک دائرہ عمومی تعلیم کا تھا۔

دوسرا دائرہ خصوصی مجالس کا تھا جس کا مقصد معیاری علما اور قائدین کو تیار کرنا تھا۔

تیسرا دائرہ خواتین کی تعلیم کا تھا جس کے لیے آپ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا اور جس کے لیے حضرت عائشہؓ کو مامور فرما کر لوگوں کو تلقین فرمائی کہ دین کا آدھا علم، یعنی نظامِ معاشرت اور خواتین کے متعلق معلومات ان سے حاصل کرو۔

چوتھا دائرہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دینے کا تھا۔

پانچواں دائرہ باہر سے حصولِ تعلیم کے لیے آنے والے وفود کو تیار کر کے قبائل میں فروغِ تعلیم کے لیے واپس بھیجنے کا تھا۔

(۱۴) تعلیم کے علاوہ حضور نے ہر قسم کے مفید علوم و فنون کے سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ نوشت و خواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی[8]، صحتِ زبان کے اہتمام کی تعلیم دی، فنِ کتابت کے لیے باقاعدہ اہتمام کیا، زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا، میدانِ بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے اور فنِ حرب کے لیے انہیں باقاعدہ فرمان سنا کر، گھوڑدوڑ کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا مکمل ڈھانچہ شروع کیا[9]، نوجوانوں کو تعلیمِ جہاد دینے کے لیے دوڑ اور تیراندازی کے مقابلے کرائے، میدانِ جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کو مقام جرش کی طرف بھیجا[10]۔

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔ قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا۔ بزرگ تربیت دے کر اسے سیدھا کے آداب سکھائے، پراگندہ بالوں کو درست رکھنے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی۔ عیدین کے موقع پر مسرت سے منانے کے لیے حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اعلانِ نکاح کے مسرت آمیز مدارج سکھائے اور لوگوں کو صحتِ صفائی کی سمجھ دی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی تربیت دی۔ پیرِ صدہ بیتائی کے ساتھ لوگوں میں میل جول کے آداب سکھائے۔

حضورؐ کا یہ وسیع نصب تعلیم قرآن کے جس کلیدِ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھی بھلائی حاصل کرنی ہے۔

(۱۵) حضور نے اسی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔ قرآن نے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیار جواب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے[11]۔ اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔

---

۱ حدیث مشکوٰۃ کتاب العلم روایت عکرمہ ۲ کتاب العلم ۳ مشکوٰۃ کتاب العلم روایت عکرمہ ۴ ملاحظہ ہو آیت ۱۰۳، ۱۸ ۵ ملاحظہ ہو آیت ۱۸، ۱۰۳ ۔
۶ حدیث بخاری مسلم، باب حجۃ الوداع، روایت حارث عبدالصمد وغیرہ ۷ ملاحظہ ہو آیت ۸۲، ۱ تا ۴ ۸ حدیث مشکوٰۃ کتاب الاستئذان، روایت ابوسعید خدری ۹ حدیث مشکوٰۃ کتاب الآداب روایت زید بن ثابت (ترمذی) ۱۰ حدیث مشکوٰۃ کتاب الجہاد۔ ۱۱ ملاحظہ ہو آیت وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۸۔ ۶۰) ملاحظہ ہو آیت، رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱:۲) ملاحظہ ہو آیت وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲۴۷:۲) حدیث ریاض الصالحین باب الاقتصاد فی الطاعۃ روایت عمرو بن العاص۔

اس موقع پر حضورؐ کا یہ ارشاد قابلِ توجہ ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے[1]

—— جسم کی ضروریات مدِنظر رکھنے کا ثبوت وہ طبی تعلیم بھی ہے جو حضورؐ نے دی، کہ طب کے مطابق اپنے پیروؤں کو دی[2]

(۱۶) حضورؐ نے تعلیم کے فروغ کے لیے سوال کو بڑی اہمیت دی۔ کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے[3] یعنی سوالات اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصبِ معلمی کا لازمہ ہے۔

(۱۷) حضورؐ نے جدید دور کے فلسفیوں سے بہت پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ تعلیم کا آغاز مہد سے ہونا چاہیئے اور اس کا تسلسل لحد تک جاری رہنا چاہیئے[4]

(۱۸) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک سبق یہ ہے کہ علم ریکھو کر سیکھو کس سے سیکھ رہے ہو یعنی آیا معیارِ معلم دانستہ اور علمی قابلیت اور اخلاق و کردار قابلِ اعتماد ہے[5]

اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ لازم آتا ہے کہ وہ معلمین کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے کر ہی ملک بلحاظ کردار ان کے ماضی کے پس منظر اور تعلیمی دور کے ریکارڈ کو بھی زیرِ غور لائے جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر و تشکیل کا نازک کام سونپا جا رہا ہو ان کے متعلق دوسری ملازمتوں کے امیدواروں سے زیادہ سخت چھان بین ہونی چاہیئے۔ یکساں ضروری ہے کہ آیا معلمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ کی حیثیت کے ساتھ آ رہا ہے یا اس کے اندر تبلیغ و تشہیر کا جذبہ موجود ہے بلکہ ملازمت کے آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کا ریکارڈ زیرِ نظر رکھنا چاہیئے اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کے لیے غیر موزوں نظر آئے تو اسے فوراً اس مقدس ذمہ داری سے الگ کر دیا جائے۔

(۱۹) حضورؐ نے ایسے علم سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے کوئی نفع نہ پہنچے[6] اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کے بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کر دینا ہے اور دوسرے یہ کہ بعض علوم فی نفسہ ایسے ہو سکتے ہیں جو کوئی مثبت افادیت انسانوں کے لیے نہ رکھتے ہوں۔

(۲۰) حضورؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمالات سے پرہیز کی تاکید کی ہے[7] ملاحظہ ہو کہ حضورؐ نے تقدیر کے مسئلے پر ایک ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصے کو لیے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصے کو اور سچائی کے دونوں حصوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے ٹکرا کر نہ دیکھو رہے کہ بحث و مناظرہ کی بیشتر صورتوں میں جو باعثِ تفرقہ و انتشار ہوتی ہیں یہی صورت پائی جاتی ہے۔

پھر آپ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔ مثلاً یہ سوال کرنا کہ خدا کو کس نے پیدا کیا[8] اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے کہ جس دائرہ حقائق کے لیے ہمیں ذرائع علم دیئے ہی نہیں گئے، اس میں قدم رکھنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں۔

(۲۱) ایک ہدایت حضورؐ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے[9] یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بیشتر اہلِ علم اور راسخ فکر ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دل لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشورانہ نکات کو علمی استدلال اور پروپیگنڈے کے زور سے ناقابلِ تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دلفریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں پوری نوعِ انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے

ایسے دائرہ ہائے امورِ غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور نہ ایسے دوائر کے لیے اسے وسائلِ علم دیئے گئے ہیں[10]

حضورؐ نے مجرد آیاتِ اللہ یعنی خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصانِ علم کا موجب بتایا جس کے اثر سے سمع، بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طریق پہ کام نہیں کر سکتیں۔

(۲۲) بچوں کے متعلق حضورؐ کی حکمتِ تعلیم ہمیں ایک خاص نقطۂ نظر دیتی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں۔

—— حضورؐ نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ وہ جنت کے باغوں کے پھول ہیں یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیئے[11]

—— پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ وہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، بعد میں گھر اور معاشرے کا ماحول انہیں کسی دوسرے رنگ میں رنگ دیتا ہے[12]

—— میرے نزدیک فطرتِ اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کے لیے کہی گئی ہے[13] اور اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ بتاتے ہیں کہ فرزندِ آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی، یعنی اس کے اندر خیر و شر کے دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیزِ خیر و شر کا میلان بھی ملا ہے اس ارشاد کی رو سے یہ گھر، مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے اندر کی ملکوتی آواز کو زوردار بنا دیں، یا پھر کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔

---

[1] حدیث ریاض الصالحین باب فی المجاہدہ روایت ابوہریرۃؓ [2] احادیث درباب طب زاد المعاد از حافظ ابن قیم ج ۳ ذکر لادویہ والاغذیہ پر ملاحظہ ہو نیز الاصابہ از ابن حجر و طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ [3] حدیث اطلبوا العلم من المھد الی اللحد [4] منہاج المتعلم بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ مستمل [5] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم [6] حدیث مشکوٰۃ باب الاستعاذہ۔ روایت زید ابن ارقم و ابوہریرۃؓ [7] حدیث مشکوٰۃ باب الایمان والقدر۔ روایت ابوہریرۃؓ [8] حدیث مشکوٰۃ۔ باب الوسوسہ روایت ابوہریرۃؓ (ابوداؤد) [9] حدیث مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت معاویہؓ [10] ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷-۳۶) [11] ملاحظہ ہو آیات: وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ (۲۹-۴۹)، وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (۳۱-۳۲) [11] حدیث مشکوٰۃ کتاب الرؤیا بحوالہ حضرت عائشہؓ (مسلم) [12] حدیث مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر روایت ابوہریرہؓ (مسلم) [13] ملاحظہ ہو آیت: فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰-۳۰) [14] حدیث ان للشیطان لمۃ بابن آدم وللملک لمۃ الخ مشکوٰۃ کتاب الایمان روایت ابن مسعودؓ۔

ـــــ پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں بصورت دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے یہی اصول اجتماعی نظام تعلیم پر بھی لاگو ہوگا درسگاہوں میں تمام طلبا کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیئے اور سب کے لیے حقوق و فرائض یکساں ہیں سب کے ساتھ اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیئے۔

ـــــ حضورؐ کی حکمت تعلیم سے نظریہ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزائیں نہیں دی جانی چاہئے جو نشان چھوڑنے والی ہو سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا قمچیاں نہیں لگائی جائیں لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں جیسے کہ نشوز کی صورت میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریہ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں

ا۔ تعلیم کا اسلامی تقاضا محبت و شفقت ہے سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لیے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے

ب۔ اس نظریہ سزا کے سلسلے میں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ بگڑے ہوئے ماحول سے متعلق ہے اس دور سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریہ سزا بیان فرمایا ستھری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اور بہ معمولی سی سزا بھی اس لیے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی سوسائٹی میں جہاں برائی کی قوتیں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزین بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے مذہبی و اخلاقی محاذ پر ایک مستقل جنگ برپا ہو دو ہی طرز عمل ہو سکتے ہیں یا تو سب اصول عام بن جاتے، مشتعلانہ رویہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آئے یا بہر کیف اور بھلائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر مؤثر بنا دے گی، لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

ج۔ سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمت عمل کا تقاضا کرتا ہے ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے

د۔ بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے[۱] یہاں حدیث کے عصا سے مراد ہیچ مچ کا عصا نہیں ہے، بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی انداز بیان ہے جیسے کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلوار کے لفظ کے لغوی معنوی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فن لطیف ہے۔

(۲۳) حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا[۲] جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع گائیڈ بک ہے تعلیم کے بقیہ سب اسی مرکزی نصاب کے ارد گرد مرتب ہوتے ہیں۔

(۲۴) سرکار رسالت مآبؐ کی حکمت تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلم کو متعلمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیئے اسی طرح متعلمین کے لیے لازم ہے کہ وہ معلم کا ادب و احترام رکھیں[۳] اس ہدایت میں یہ تقاضا بھی مضمر ہے کہ معلم بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار اور بلحاظ طرز عمل ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلبا میں اس کے لیے احترام نشوونما پاتے۔

## توسیع تعلیم کے لیے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالیے جو حضورؐ نے توسیع تعلیم کے لیے سر انجام دیں۔
ایک طرف تو نظام صلوٰۃ، اس میں تلاوت قرآن اور خطبات جمعہ کا نظام بجائے خود فروغ تعلیم کا ذریعہ تھا، دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر اور خطبات بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے

توسیع تعلیم کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ وہ ہیں جو معلم ہوں یا متعلم[۴]۔ پھر آپ نے قُوٓا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا کے قرآنی حکم[۵] کے تحت والدین پر ذمہ داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں[۶]۔ پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا بندوبست کرنے کے لیے بدر کے قیدیوں کے لیے یہ فدیہ بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں[۷]

حضورؐ نے دور مکہ میں دار ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا[۸]

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صفہ کے نام سے مسجد نبوی میں قائم ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نومسلم اور کچھ مقامی لوگ

---

[۱] حدیث مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ روایت عمرو بن شعیب (ابو داؤد)۔ کتاب الایمان [۲] ملاحظہ ہو آیت۔ سورہ نساء آیت ۴۴۔

[۳] حدیث، ولا ترفع عنهم عصاك ادبا۔ مشکوٰۃ باب الکبائر و علامات النفاق روایت حضرت معاذؓ

[۴] متعدد احادیث، مشکوٰۃ۔ کتاب فضائل القرآن۔

[۵] حدیث، تواضعوا لمن تتعلمون منه (الجامع الصغیر الکامل لابن عدی منہاج المتعلم)

[۶] حدیث سنن دارمی، المقدمہ باب ۲۵-۳۱ [۷] ملاحظہ ہو سورۃ تحریم آیت ۶ [۸] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱، ص ۲۴۶

سیرالنبی المعیر، ج ۱، ص ۱۷۱۔ [۹] تاریخ الامم والملوک (طبری) بحوالہ ڈاکٹر احمد شبلی۔

مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ اسے ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر احمد شلبی نے اقامتی درسگاہ قرار دیا ہے[1] اس درسگاہ میں نہ صرف قرآن کی سورتیں یاد کرائی جاتیں اور فن تجوید کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کا فن اور فقہ کا علم بھی سکھایا جاتا تھا[2] مسند امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق درسگاہ صفہ کے طلبہ کی تعداد ایک موقع پر ستر تک پہنچی[3]

حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے کہ حضور نے انہیں چند اصحاب صفہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی[4] اس درسگاہ کے ایک درخشندہ طالب علم حضرت ابو ہریرہ تھے[5]

حضور کے توسیع تعلیم کے منصوبے کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہر مسجد مرکز تعلیم بھی تھی۔ خود آنحضور کے دور میں مدینہ میں نو مسجدیں ایسی تھیں جہاں پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا اور قرآن اور معاملات زندگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

توسیع تعلیم کے لیے حضور نے مختلف قبائل کی طرف قرا کو بھیجا۔ واضح رہے کہ درسگاہ صفہ کے فارغ التحصیل قراء کہلاتے تھے[6] قراء قاری کی جمع ہے مگر یہ لوگ آج کل کے معنوں میں قاری نہ ہوتے تھے بلکہ تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ فہم قرآن اور تفقہ فی الدین میں مہارت حاصل کرتے تھے یہ قراء دن میں بستیوں کے ساتھ کی علاقوں میں صحرائے جاتے تاکہ وہ خود مجاہدین کی تعلیم کا سلسلہ سفر میں بھی جاری رکھیں اور اگر کوئی قبیلہ اطاعت قبول کرے تو اس کے لوگوں کو تعلیم دیں[7]

درسگاہ صفہ کے ذریعے ان کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ ایک مرتبہ ستر قاریوں کا قافلہ بئر معونہ کے قبائل کی تعلیم کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان قیمتی ہستیوں کو بئر معونہ کے مقام پر ان غریب کار بدویوں نے شہید کر دیا جنہوں نے خود ہی درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا[8]

جن ممتاز صاحب علم شخصیتوں کو حضور کسی مقام پر اپنا عامل یا نمائندہ بنا کر بھیجتے ان کے ذمے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کام بھی کر دیتے۔ جیسا کہ یمن، حارث کی طرف خالد بن ولید کو بھیجا گیا، تو ان کو تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی[9] اسی طرح عمرو بن حزم عامل یمن کو حضور نے تحریری ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھائیں، اس میں تدبر و تفکر کی تربیت دیں اور انہیں آگاہ کریں کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان پر فرض کیا عائد ہوتے ہیں[10]

سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ کے مطابق مختلف مسلم قبائل کے وفود مدینہ میں آکر قیام کرتے اور حضور اور صحابہ سے علم حاصل کر کے واپس جاتے اور اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے[11] اس قسم کا ایک وفد مالک بن الحویرث کی سرکردگی میں بیس آکر بیس روز تک مقیم رہا[12]

بعض خاص مواقع پر حضور نے خصوصی معلمین کا تقرر فرمایا۔

مثلاً سب سے پہلی مثال ہجرت سے قبل کی ہے جب کہ آپ نے اہل مدینہ کے لیے مصعب بن عمیر کا تقرر بطور معلم فرمایا اور انہیں مامور کیا کہ دین سکھانے کے علاوہ لوگوں کو تعلیم دیں۔ واضح رہے کہ حضرت مصعب خوشنویس تھے[13] ان کے متعلق المحبر کی روایت یہ ہے کہ انہیں معلم حکمت کا لقب دیا گیا[14]

اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضرت معاذ کو مکہ کے نومسلموں کی تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔

ان مساعی کے واضح نتائج تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

وہ قوم قریش جس کے ہاں اسلام سے پہلے صرف سترہ آدمی نوشت و خواند جانتے تھے اس کے نبی کے گرد مدینہ میں کاتبان وحی اور محرران مکاتیب کا ایک وسیع سیکرٹری ایٹ موجود تھا۔

مردوں کا معاملہ الگ رہا، ۵ خواتین بھی لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں اور ۵ پڑھ سکتی تھیں (۱) حضرت حفصہ بنت عمر (۲) حضرت ام کلثوم بنت عقبہ (۳) حضرت عائشہ بنت سعد (۴) حضرت کریمہ بنت مقداد اور (۵) حضرت الشفا بنت عبد اللہ عدویہ جو حضرت حفصہ کی استاد تھیں[15] قرون اولیٰ میں ۳۳ ۱۵ خواتین محدث تھیں[16]

آہستہ آہستہ اہل تخصص (SPECIALIST) پیدا ہوئے جب کہ حضور نے علم فرائض میں زید بن ثابت کو، قرآن خوانی اور تجوید میں ابی بن کعب کو، حرام و حلال کے احکام کا علم رکھنے میں حضرت معاذ بن جبل کو مرتبہ اول پر شمار کیا[17] اسی طرح ایک موقع پر فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو عبد اللہ ابن مسعود سے، سالم مولیٰ ابو حذیفہ سے، ابی بن کعب سے اور معاذ بن جبل سے[18]

کتنا حیرت ناک واقعہ ہے کہ یہ تیز رفتار تعلیمی سرگرمی ایسے حالات میں رو بعمل آئی جبکہ مسلسل افراتفری کا دور تھا اور مدینہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کثیر التعداد دشمن کے حملوں کی زد میں تھی یاد رہے دراصل یہی تو تعلیم دین ہی تھی جس کے بل پر ریاست کھڑی تھی اور جس کی دی ہوئی بصیرت مسلمانوں کو معرکہ ہائے کارزار میں اپنے سے بڑی طاقتوں پر فتح دلا رہی تھی اس تعلیم کے کام میں اگر کوتاہی رہ جاتی تو پھر اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

دوسرا اثر یہ تھا ہم دیکھتے ہیں کہ العلم کے ساتھ ساتھ مختلف دنیوی علوم و فنون میں بھی مسلمانوں میں بھی نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیئت، نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، رنگ، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، صیقل گری وغیرہ میں صدی دو صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ ان کی علمی فوقیت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا۔

---

[1] حدیث سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علیٰ طلب العلم [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳، ص ۱۷ [3] ایضاً [4] حدیث ابو داؤد کتاب البیوع فی کسب المعلم [5] مسلم کتاب الفضائل باب فضائل ابی ہریرہ بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی [6] عینی شرح بخاری، ج ۲ ص ۲۴۹ بحوالہ تاریخ معین الدین ندوی [7] حدیث مسلم کتاب الامارہ ثبوت الجنۃ للشہید [8] حدیث بخاری، ج ۲، ص ۴۵ [9] حدیث مسلم کتاب الامارہ باب ثبوت الجنۃ للشہید۔ [10] الوثائق السیاسیہ مکتوب ۹۳ [11] ایضاً [12] تفسیر جلالین۔ تفسیر ما کان المؤمنون لینفروا کافۃ بحوالہ تاریخ اسلام، مولانا معین الدین ندوی [13] المحبر ص ۱۵۹ ابو داؤد [14] ایضاً [15] حدیث بخاری ج ۱ ص ۷ [16] فتوح البلدان، بلاذری ص ۴۵۸ [17] ابن حجر الاصابہ فی تمیز الصحابہ۔ [18] ترمذی۔ مناقب عشرہ مبشرہ۔ روایت انس [19] بخاری و مسلم باب جامع المناقب وعلم التاریخ فی روایت ودرایت۔

باقی صفحہ ۲۷ پر

[illegible]

# ملّتِ اسلامیہ کی قومی تعلیم

ایک اور اہم امر مسلمانوں کی اہم ترین ضرورت ہے کہ وہ معاشرہ مسلم کے تمام شعبوں کے تقاضے مسلم ہی ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم دینی اور دنیاوی تعلیم کی تفریق ختم کریں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں میں یادریوں کی طرح کے کسی الگ طبقہ اور گروہ کا بھی وجود نہیں ہونا چاہیے، جو ایک ہی میں فرق کے حامل کی حوصلہ افزائی کریں۔ ان خامیوں کو جن سے اس ملک میں مسلم معاشرہ دوچار تھا، جب پہلے کبھی محسوس کیا گیا تھا اور ان کے متعلق اس کا حل تلاش کیا جا رہا تھا تو اسے تعلیم کے منصوبوں میں شمولیت دی جا رہی تھی۔ دوسرا حصہ پیش نظر رکھا گیا یہ تھی کہ ان اداروں سے ایسے نوجوان پیدا کیے جائیں جو نہ صرف تمام عصری معیار پر پورے اترتے ہوں بلکہ حقیقی اسلامی روح رکھنے والے مسلمان بھی ہوں اور اسے مذہب کے بارے میں اتنا علم رکھتے ہوں کہ وہ داعیان اسلام کی صفوں میں اپنا مقام پا سکیں۔ اس بات کو خصوصاً محسوس کیا گیا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اپنے دین کے بارے میں اس قدر علم ہونا چاہیے کہ مذہب سے متعلق سارے امور کو علما کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سپرد کر کے اطمینان سے بیٹھ رہنے میں مبتلا نہ ہوں اور ان کی ایسی تنگ نظری اس کا عمل دخل نہ ہو جو علما کے اس گروہ میں کسی ایک بار ملاوہ پر اندھا اعتماد کیے بیٹھے تھے۔ اس میں نوجوانوں کے لیے ضرر بھی اور علما کے لیے بہ اسلام کے لیے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ سرسید احمد خان کی قائم کردہ علی گڑھ یونیورسٹی مسلمانوں کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکی، بلکہ اس کے تربیت یافتہ نوجوان مطلوب رجحانات کے برعکس مغربیت و تصورات سے کہیں زیادہ متاثر تھے۔ وہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی عالمگیر اور عظیم روایات تاریخ سے سرسری حد تک ناواقف تھے۔ یہ وہ صورت حال تھی جس کی اصلاح کرنے کا بیڑا جامعہ ملیہ اسلامیہ یا علی گڑھ کی قومی مسلم یونیورسٹی کے منصوبے نے اٹھایا۔ اس مقصد کے لیے قرآن کریم کا بھرپور مطالعہ ایک ناگزیر معیار تصور کیا گیا اور اس لیے تعلیم کے ہر مرحلہ پر کلام اللہ کو اچھی طرح سمجھ کر مطالعہ کرنے کا مقصد و نصب کیا گیا تھا کہ مسلم معاشرہ کے وہ افراد بھی جو اقتصادی اور دوسرے گوناگوں مسائل کی وجہ سے پرائمری کے بعد اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں، نہ صرف عربی میں بلکہ اردو اور دوسرے ترجموں میں قرآن شریف کا مطالعہ کر چکے ہوں۔ انہوں نے اس سے آگے بڑھ کر پرائمری کے مرحلے پر عربی زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت پر اصرار کیا کہ عربی زبان کے طریقہ تدریس میں کچھ اہم تبدیلیاں کی جائیں۔ عربی کے موجودہ طریقہ تدریس کو جس میں ایک لو آموز کرامر کے دقیق قواعد میں الجھ جاتا ہے، کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک سیدھا اور سادہ فطری طریق وضع کیا جانا چاہیے۔ یہ ضروری ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے عربی زبان پر اتنا عبور حاصل کریں کہ قرآن سمجھ سکیں تو ہمیں اسی طرح مدد دینی ہوگی۔

مجوزہ منصوبہ یہ تھا کہ جب بچہ اردو اور عربی الفاظ کو پہچاننے لگے تو اسے قرآن شریف کی کچھ آخری مختصر سورتیں عربی اور ان کے اردو ترجمہ میں پڑھایا جانا چاہیے۔ نماز میں جو کلمات پڑھے جاتے ہیں وہ بھی اسی طرح پڑھا دیے جائیں تاکہ ایک سات سالہ بچہ بھی ایسی نماز نہ پڑھے جسے وہ سمجھ نہ رہا ہو۔ اس کے علاوہ یہ تجویز بھی تھی کہ جب بچہ بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں اپنی پرائمری تعلیم ختم کر دے اور قرآن شریف کو عربی میں پڑھ لے تو اسے بامحاورہ سلیس قرآن شریف بھی ختم کر چکا ہونا چاہیے۔ یعنی وہ اس عمر میں نہ صرف قرآن شریف پڑھ سکے بلکہ جیسا کہ اس سے ایسے جانتے ہیں کہ اگر وہ دوسری زبان کی کتاب بھی تو اس صورت میں قرآن کا ترجمہ ہوگا پڑھ سکے۔

لیکن اس مرحلہ پر جیسا کہ کہا جا چکا ہے صرف ابتدائی کافی نہیں سمجھا گیا تھا اس لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پرائمری کے آخری تین سالوں میں ایک بچے کو عربی اسی طرح پڑھائی جائے جس طرح اب انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ خیال ہے کہ مروجہ تعلیم میں ترمیموں کے باوجود دس سال کے بچے سے جس سال کی مدت میں ایک غیر ملکی زبان میں محدود سی دسترس کے حصول سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ امید بھی کی گئی کہ اس ابتدائی دسترس کے ساتھ ساتھ جب وہ پانچ سال یا اس عرصہ کی مدت تک قرآن اور اس کا ترجمہ پڑھے گا، تو اس میں اتنی دلچسپی اور رغبت پیدا ہو جائے گی کہ وہ بلاواسطہ ترجمہ کی مدد سے اپنا قرآن پڑھ سکے۔ دراصل یہی مدد اور دوق و شوق تھا جس کا پیدا کیا جانا مقصود تھا۔ اور یہ اندازہ تھا کہ بیان کردہ طریقہ کے سوا کسی اور طرح شاید یہ ممکن نہ ہو۔ ثانوی مرحلہ میں اس قدر تعلیم دی جاتی تھی جس قدر آج کل کے کالجوں میں انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں دی جاتی ہے۔ عربی کی تعلیم اسی نقطہ نظر کے تحت لازمی قرار دی جاتی تھی اور اس لیے یہ تجویز کیا گیا کہ ان پانچ سالوں میں جو ایک نوجوان کی عمر کے سترھویں سال پر ختم ہوتے ہیں طلبا کو درسی کتاب کے طور پر تمام قرآن شریف اور کچھ منتخب احادیث پڑھائی جانی چاہئیں اور پھر انہیں عربی کا بہ حیثیت ایک زبان کے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ عربی لکھنے اور پڑھنے پر اساسی عبور حاصل کر سکیں جیسی آج انٹرمیڈیٹ طلبا کو انگریزی پر ہے۔ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ گرامر کے صرف ابتدائی ضروری حصے پڑھائے جائیں اور اسے پڑھانے کا موجودہ طریق ختم کر کے طالب علم کو عربی زبان کے صحیح استعمال کی مثالوں سے قواعد استنباط کرائے جائیں، بجائے اس کے کہ وہ پہلے قواعد پر عبور حاصل کر کے پھر درست فقرے بنائے۔

اس مرحلہ پر عربی زبان میں کسی اور ضخیم کتاب کی بھی تجویز کی گئی تھی کیونکہ اولاً تو محض زبان کا علم اتنا مقصود نہ تھا جتنا مطلوب قرآن کا قریبی علم تھا اور دوسرے یہ کہ اس مرحلہ پر زبان کے علم کے لیے بھی قرآن شریف کا مطالعہ کافی سمجھا گیا تھا۔ پھر بھی تجویز کیا گیا تھا کہ چند منتخب اشعار بھی طلبا کو عربی شاعری سے مانوس کرانے کے لیے پڑھائے جائیں۔

مدعا یہ تھی کہ قرآن شریف کا یہ مجوزہ مطالعہ ایک نوجوان کو بہتر مسلمان بنائے گا اور دینیات کے لیے درسی کتب کے مطالعہ کی نسبت وہ اپنے مذہب کا زیادہ علم حاصل کرے گا لیکن یہ مقصد نہیں تھا کہ مسلم نوجوانوں کے دوسرے علوم کی تعلیم نہ دی جائے۔ اس کے لیے جو کچھ تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پرائمری کے مرحلہ پر اولاً اساس اسلامی عبادات کی زبانی تعلیم دی جائے اور ثانیاً درسی ریڈروں میں جن میں اسلامی تاریخ اور مناسب طور پر سائنسی معلومات بھی شامل ہوں اسلامی عقائد اور اصولوں کے بارے میں اسباق شامل کیے جائیں۔

یہ بھی تجویز تھی کہ اس طرح سے عبادات، اخلاق اور سیرت کے بارے میں عقائد اور فقہ بھی پڑھائے جائیں تاکہ ایک پڑھا ہوا بچہ اوائل عمر ہی سے جدوجہد کرے۔ دینیات کی دو تعلیم جو اب دی جاتی ہے، وہ عبادات کے بارے میں ابتدائی جتنی معلومات سے آگے نہ بڑھ سکی اور یہ بھی کچھ اس طرح سے دی جاتی ہے کہ طالب علم کا سارا دن وقت اس میں ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس کے لئے اکتا جاتا ہے۔ اس کے بجائے یہ تجویز کی گئی تھی کہ اردو میں ماہرانہ انداز سے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جس میں اول جانچی اور پرکھی ہوں کہ وہ ایک مسلمان بچہ کو اس کے صحیح مسلم عقائد سے اور اس کے مذہب کے اہم احکامات سے آہستہ آہستہ بغیر کسی رکاوٹ کے واقف کرا دیں۔

ثانوی تعلیم کے مرحلے پر اور یونیورسٹی کے مدارج پر بھی صرف عقائد اور سیرت محض اور اردو کتابوں کی بجائے باقاعدہ الگ مضامین کی حیثیت سے کورس رکھے گئے تھے لیکن یکطرفہ رائج ہوئے تھے اور پھر چھوڑ دیا گیا تاکہ جہاں تک ہو سکے نصابی کتابوں سے گریز کیا جائے۔ نصابی کتابیں عام طور پر تو اساتذہ کی رہنمائی کے لئے تھیں تاکہ موجودہ جمود کا علاج کیا جا سکے اور جدید تقاضوں کی بجائے نصابی مآخذ پر زیادہ بھروسہ کیا جائے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ اچھی طرح محسوس ہوا ہو گا کہ سال دینی تعلیم کو جو اہمیت دی جا رہی تھی وہ اس سے پہلے کسی بھی ایسے قومی ادارے میں جہاں سیکولر تعلیم دی جاتی ہو، نہیں دی گئی تھی لیکن توقع تھی کہ یہ مجوزہ طریقہ اس طریقہ سے بھی کہیں بہتر ثابت ہو گا جو ان اداروں میں دینی تعلیم کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جن کا واحد مقصد دینیات اور اسلامیات کی تعلیم ہے۔

یونیورسٹی کے مرحلہ پر معارف اسلامی کے کلیہ کی گنجائش رکھی گئی تھی جہاں ایسا نوجوان مسلمان جس نے آج سیکولر تعلیم حاصل کی ہو جیسی آج کے انٹرمیڈیٹ معیار تک کالجوں میں دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور ان سب کے اصول، عقائد اور کلام اور سیرت، تاریخ اسلام، جس کے جغرافیہ کا ضروری علم بھی ہو، کی تعلیم حاصل کر سکے اور وہ اس کورس کے اختتام پر حسب کار اس کی عمر ۲۰ برس یا اس کے لگ بھگ ہو، ایک مستند مذہبی استاد یا مولوی جتنی اہلیت رکھتا ہو اور ساتھ ہی یہ بھی تعلیم دیا جائے کہ وہ ایسا ہی جدید مادہ ست جیسا کسی بھی اول یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹریٹ کر سکتا ہے جس کے مذہب سے متعلق مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی ایک پر تحقیقی مقالہ کی ضرورت ہوتی۔ خیال تھا کہ اس طرح پہلی بار دنیوی اور دینی تعلیم کا وہ امتزاج ہو گا جس سے بلاشبہ دونوں ہی کو فائدہ ہو گا اور ان دونوں کا وہ لگاؤ اور علیحدگی جس نے دینی تعلیم کو جامد اور دنیوی تعلیم کو بے روح اور بے معنی بنا رکھا ہے، دور ہو گی۔

**ذریعۂ تعلیم**

تعلیم کے مذہبی عنوان کے بعد جس کو اس اہمیت دی گئی جتنی اس سے پہلے کسی نے دی گئی تھی، دوسری اہم بات جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ مختلف علوم اور مضامین میں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم کے علاوہ اور دوامی تصور کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ ثانوی مرحلہ پر انگریزی زبان کی تعلیم کو کتب یک اختیاری مضمون کے شامل کیا جانا چاہیے اور مناسب یہ ہے کہ کم کچھ مدت تک سکولوں میں اکثر طلباء اس زبان کو ۱۳ سال کی عمر کے بعد پڑھیں لیکن اسے پرائمری مرحلہ سے بالکل ختم کر دیا جائے اور اسے کسی حالت میں بھی ذریعہ تعلیم نہ ہونا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ سائنسی علوم میں یورپی اصطلاحات کا استعمال نہ کیا جا سکے تاہم ثانوی مرحلہ پر سکول کے طلباء کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی یورپی زبان کا مطالعہ کر سکیں۔ ان ثانوی سکولوں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور جرمنی بھی پڑھائی جانی چاہیے۔

لیکن السانی زبانوں کی مدارس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے مادری زبانوں کی تعلیم کی ہو گی اور اس کے بعد جہاں اردو مادری زبان ہو وہاں ہندی جہاں اور مقامی طور پر رائج ہو وہاں اردو کا انتظام ہو مگر ابھی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد اور موجودہ ضرورت پیش نظر اور کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے منظور شدہ کسی بھی مضمون میں مادری زبان میں ڈگری دی جانی چاہیے۔ اس سے ان کی کتب کی تیاری کی بڑی حوصلہ افزائی ہو گی جس کی دوسری زبانوں کے علاوہ تعلیمی مفاد کے لئے بھی بڑی اہمیت ہے۔

مادری زبانوں میں لازمی تعلیم اور ہر مرحلہ پر اسی کے ذریعے تعلیم ہونے کے علاوہ اسکولوں میں مادری زبانوں کے علاوہ کسی اور لسانی زبان کی اختیاری تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی کے مرحلہ پر عربی، فارسی، ادب اور زبان، دونوں کی ڈگری کی گنجائش ہونی چاہیے اور مادری زبان اور عربی فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبانوں میں کسی زبان دانی کی اہلیت کی بھی گنجائش ہونی چاہیے۔

چونکہ ایک غیر ملکی زبان کو بحیثیت ذریعہ تعلیم ختم کیا جا رہا ہے اس لئے یہ بات توقع سے کہی جا سکتی ہے کہ طلباء اتنے ہی سالوں میں جن میں وہ موجودہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم مکمل کرتے ہیں زیادہ گہرا اور زیادہ وسیع علم حاصل کر سکیں گے۔ ایک ایسے طالب علم سے جس نے ثانوی کا کورس پاس کر لیا ہو یہ توقع ہو گی کہ وہ

(۱) مسلم سوسائٹی کی عبادات سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔ اگر یہ مضمون مجوزہ طریقہ کے مطابق پڑھایا گیا تو وہ دینی لحاظ سے سب سے زیادہ عملی عادت کا حامل ہو گا اور حدیث، فقہ اور روایات کے لحاظ سے بھی نمایاں ہو گا۔

(۲) اس حد تک جانتا ہو کہ وہ نہایت روانی اور درستی سے قرآن پاک پڑھ سکے۔

(۳) عملی ضروریات کے لئے جتنا حساب ضروری ہے اتنے حساب سے ابتدائی عملی جیومیٹری اور پیمائش اور ان کے ضروری علم سے الجبرا کی ابتدائیات سے اچھی طرح واقف ہو تاکہ ایک دیہات میں رہنے والے لڑکے کو بھی روزمرہ کی زندگی میں بہت کام آئے گی۔

(۴) مختلف سائنسی علوم سے متعلق وسیع اور مستند معلومات، جو وہ ابتدائی نوعیت ہی کی کیوں نہ ہوں، رکھتا ہو۔

(۵) عالمی تحریکوں کے پس منظر میں اسلام اور ہندوستان کی تاریخ کی بنیادی خطوط سے آگاہ ہو۔

(۶) ہندوستان کے جغرافیہ سے تفصیلاً اور دیگر اسلامی ممالک کے جغرافیہ سے ان کے دوسرے ممالک سے تعلقات کی نسبت سے عموماً واقف ہو۔

(۷) اپنے ملک کی حکومت کے دستور کے واضح خطوط اپنے ضلع کی انتظامی ہیئت سے واقف ہو۔

۱۰۔ شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض پہچانتا ہو

اس مرحلے کے اختتام پر اسے اپنی زبان کو آسانی سے پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو جانا چاہیے تاکہ وہ مختلف درخواستوں وغیرہ کے لکھنے کے لیے یا اخبار و رسائل کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے دوسروں کا سہارا نہ لے اور وہ پیشہ ور منشیوں کا محتاج نہ ہو۔

ثانوی کورس کے ختم کرنے والے طالب علم سے یہ توقع ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کا علم رکھتا ہو، عربی میں قرآن کا اچھا خاصا تفصیلی علم اسے حاصل ہو، اپنی زبان کے سہارے کو لے کر پڑھ سکے اور اس سے لطف اٹھا سکے نیز آسانی سے ایسی عبارت لکھ سکے جس میں ادبی حسن بھی پایا جاتا ہو، سادہ فارسی پڑھ سکے اور اگر اس کی زبان اردو ہے تو عربی پڑھ سکے اور اردو کے علاوہ کوئی زبان ہے تو درج ذیل مضامین میں سے کسی میں موجودہ انٹرمیڈیٹ معیار کی استعداد رکھتا ہو۔ کوئی یورپی زبان، مادری زبان کے علاوہ کوئی پاکستانی زبان، تاریخ (تاریخ عہد نبوی، تاریخ اسلام اور کوئی تاریخی مضمون)، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات، مدنیات، معاشیات، سائنس (طبیعی سائنس کے تین مضامین)، ریاضی، منطق، شماریات، نفسیات اور ڈرائنگ

۔۔ یونیورسٹی کے مرحلے میں اپنے مذہب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے اور معیاری کتابوں سے آگاہی حاصل کرنے کے علاوہ اسے تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، ریاضی، ادب، قانون میں سے کسی ایک کے بارے میں اور ان میں یونیورسٹیوں کے بی اے کے معیار تک موجودہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ایم اے کی ڈگری تک کی استعداد پیدا کرنے کے لیے کہا جائے۔

## تعلیمی مراحل

اس کی وضاحت بھی کر دینی چاہیے کہ تعلیم کے مرحلوں کی موجودہ تقسیم میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ دیہات یا قصبات میں رہنے والے غریب گھرانوں کے بچے اپنی عمر کے بارھویں سال کے بعد تعلیم حاصل کر سکیں گے اور مستقبل میں تک جماعت ۵۔ لوگ خواہ کسی بھی عمر کی تعلیم دی جائے وہ اپنی ذات میں ایک مکمل یونٹ (اکائی) کی صورت ہونی چاہیے تاہم ان کے لیے جو آئندہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں، کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہیے اور جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کی تبدیلی ہوتی ہے اس لیے اسے تعلیم میں بھی ایک فطری سنگ میل ہونا چاہیے۔ اس لیے اس مرحلہ پر طریق تعلیم اگلے مرحلہ کے طریق تعلیم سے مختلف ہونا چاہیے۔ یہاں ماسوائے حساب کے جیسے ابھی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے مختلف علوم میں تقسیم نہ ہونی چاہیے بلکہ اس طرح ہو کہ اسباق کو پڑھا کر اسے زبانی ہدایات کی صورت میں درس نہ دیا جائے، تاکہ بچہ کتاب کے روزمرہ مسائل سے معلومات اور اخلاقی تربیت حاصل کرے۔

ہمیں کتب تیار کرانا پڑیں گی اور تجویز یہ ہے کہ ایک ایسے ماہر تعلیم کی ادارت میں جو بچے کی نفسیات اور اسلامی طرز پر عبور رکھتا ہو، اس مقصد کے لیے سب سے مستند کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ یہ وہ کام ہے جس کے کرنے والے پوری مسلمان قوم کی سرپرستی کے مستحق ہیں۔ ہر مصنف کی لازمی طور پر اہلیت بی اے ہونی چاہیے جتنی خود چیف ایڈیٹر کی، بلکہ کچھ مصنف ایسے بھی ہونے چاہئیں جنہوں نے سائنس میں اختصاصی مہارت حاصل کی ہو، کچھ ایسے جنہوں نے علوم میں اور کچھ وہ ہیں جو ہندوستانی اور اسلامی تاریخ میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ خوب اچھا خاصا مطالعہ کرتے ہوں اور علمی مذاق رکھتے ہوں۔ درسی کتابوں کے مضامین کو متعلقہ گروپ کے سپرد کر دیا جائے اور چیف ایڈیٹر کو اہم ... سے ہر کتاب کی ضخامت اور ہر سال ہونے والے اسباق کی تعداد کا اور ہر مضمون سے متعلق اسباق کا تعین کرے۔ اس طرح سے پرائمری کے مرحلہ پر طلباء کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مصنفین کے مختلف گروپوں کے باقاعدہ ... باقی پر تعلیم دی جانی چاہیے اور کتاب کو صرف مادری زبان کی درس و تدریس کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے بلکہ اسے وہ درست اور صحیح معلومات بھی فراہم کرنی چاہیے جو انسان کے لیے ضروری ہیں، جو ایک ۱۲ سال کا بچہ آسانی سے سمجھ سکے۔ اس لیے بچہ کا امتحان صرف درسی کتب پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ سائنس، مذہب، تاریخ، جغرافیہ، سیرت وغیرہ جیسے موضوعات ... حصوں میں بھی لیا جانا چاہیے۔

اگلا مرحلہ ثانوی تعلیم کا ہوگا جو موجودہ ہائی سکول کے برابر نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ کے معیار کا ہوگا۔ پرائمری کی طرح ۵ سال میں طالب علم کی عمر کے سترھویں سال میں ختم ہوگا۔ اس مرحلہ پر مادری زبان میں تعلیم کا مقصد زبان اور ادب کی تعلیم ہی ہونا چاہیے۔ اس پر دوسرے مضامین بھی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے چاہئیں۔ درسی کتابوں کے ذریعے تعلیم کا طریقہ ختم کر دینا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ تین سالوں میں جو موجودہ میٹرک معیار کے برابر ہوگا، ایک نوجوان کی مادری زبان، عربی اور اس کے علاوہ کوئی سے تین مضامین لے لے لیکن آخری دو سال میں جو انٹرمیڈیٹ کے برابر ہوں گے اسے صرف دو معیاری مضامین لینا ہوں گے۔ اس کے انتخاب و اختیار کو ... ضروری نہیں ... اسے یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ مضامین کے مطابق جو وہ رجحان رکھتا ہے ... لیکن اس مرحلہ پر اسے مضامین کے انتخاب کا موقع فراہم کیے جانے سے زیادہ اختصاصی تعلیم کا نہ ہونا چاہیے جب تک کہ وہ یونیورسٹی کے دار تک نہ پہنچ جائے۔

۔ثانوی کے مرحلہ پر اسے ہر اہم موضوع پر ضروری معلومات حاصل کرنی ہوں گی جو ابتدائی نوعیت کی ہوں، ہوں گی مگر یہ اتنی ہوں گی کہ ہر طالب علم کے لیے اس کی طلب میں اضافہ کریں اور اس علم کا تکملہ ہو جائے۔ ... تو وہ ان سے تفصیلی مطالعہ میں اچھا خاصا وقت صرف کرے۔

ثانوی مرحلہ پر جو موقع دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی مضمون سے وہ بالکل ہی ناواقف رہ جائے بلکہ یہ کہ اسے جن مضامین کا فطری رجحان ہو ان میں مزید علم حاصل کرے۔

یونیورسٹی مرحلہ پر گروپ سسٹم کو یک لخت ختم کر دینا چاہیے، بلکہ مضامین کو مختلف وسیع علوم کو (SCHOOL) کے تحت مرتب کیا جانا چاہیے مثلاً تاریخ، فلسفہ، ریاضی، سائنس، ادب، قانون، عمرانیات اور خاص طور پر اسلامی تعلیمات کو۔ خاص صورتوں میں طالب علم کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ مختلف ... کے اسباق میں حاضر رہے اور اس کورس کے اساتذہ اور ... کی تسلی پر اسے ڈپلومہ دیا جائے۔

لیکن بحیثیت مجموعی ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اس طریق کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ایک پاس ڈگری عام ہونے کے بجائے جب کہ یونیورسٹیوں کا موجودہ ہندوستان ہی میں بہت کم بات ہونی چاہیے۔ یونیورسٹیوں کے مرحلہ پر پڑھانے کا طریق لیکچر سسٹم سے مختلف ہونا چاہیے اس میں طالب علم کو استاد کے لیکچر کے ساتھ ساتھ نوٹس لینا چاہیے، ...

ایک ٹیوٹوریل سسٹم جس میں استاد طالب علم کے پرائیویٹ مطالعہ کی رہنمائی اور ترتیب میں مدد دے، نہ کہ یہ درسی کتاب ہاتھ میں لے کر اور کلاس میں بیٹھ کر تشریحات کرے، اس لیے موجودہ انٹرمیڈیٹ سٹیج کو ثانوی سٹیج میں مدغم کیا گیا ہے جو اس سے حد قریب ہے

یہ پہلے ہی بتایا گیا ہے کہ آئندہ کچھ عرصہ تک تقریباً ۵۰ فی صد آبادی پرائمری کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے گی اور پچاس فی صد سے زائد ثانوی تعلیم کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکے گی، اس لیے اسے بھی پرائمری ہی کی طرح کسی حصول یا سند کے لیے ایک اور مستقل اکائی ہونا چاہیے۔ سترہ سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد ایک نوجوان جس نے سکول کورس مکمل کر لیا ہو جو موجودہ انٹرمیڈیٹ معیار کے برابر ہو، ایک مہذب اور شائستہ انسان ہونا چاہیے خواہ وہ آگے نہ بھی پڑھے۔ وہ افراد جو علمی ذوق رکھتے ہوں اور اس کی تسکین کے لیے وقت بھی ہو، یا وہ جو علمی موضوعات پر آگے کام کرنا چاہیں صرف وہی یونیورسٹی سٹیج میں داخل ہوں گے۔ یہاں انہیں مزید تین سال صرف کرنے چاہییں، اور ۲۰ برس کی عمر کو پہنچ کر انہیں گریجوایٹ ہو جانا چاہیے، مگر گریجویشن کا مطلب موجودہ ہندوستانی بی اے کی ڈگری کا حصول نہیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم، تحقیق اور تصنیف کے لیے انگریزی یونیورسٹی کا بی اے آنرز ہوگا، اور اسے ۲۲-۲۳ برس کی عمر میں حاصل کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

اس طرح یہ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے میں جو وقت صرف ہوگا، وہ اس وقت سے لازماً کم ہونا چاہیے جو اب بی اے کی ڈگری لینے میں ہوتا ہے، جب کہ ایک گریجوایٹ سے جو کچھ توقع ہوتی ہے اس میں خواہ دینیات کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اب اس کا جو کم سے کم معیار ہو سکتا ہے وہ آج کل کے ایم اے کا ہے۔ یہ صرف مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور بہتر طریق تعلیم سے ہی ممکن ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان سائنس میں کہیں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں اور اس مقصد کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے کی مضبوط بنیاد کے لیے پرائمری سٹیج پر ہی بچوں کو سائنسی علوم کی ضروری تعلیم دی جائے۔ امید ہے کہ ثانوی مرحلہ میں سکولوں میں سائنس کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور موجودہ تناسب کی نسبت زیادہ طلباء سائنس میں اپنی ڈگریاں لیں گے، لیکن سائنس میں تحقیقی تجربہ گاہوں کی ضرورت بڑی ہے اور یہ فیصلہ مسلمان قوم کو ہی کرنا ہے کہ وہ مدرسے کے بعد اس اہم ترین مضمون کی تعلیم کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔

**تاریخ** تاریخ کی تدریس میں تاریخ اسلام اور تاریخ ہند دونوں شامل ہوں گے اور ثانوی کورس کے آخری دو سالوں میں ایک تاریخی مضمون انتخاب کرنا ہوگا مثلاً یونان، روم یا ہندوستان کی قدیم تاریخ، یورپ یا انسانی تاریخ کا کوئی ایک دور یا انگلینڈ کی آئینی تاریخ کا خلاصہ۔ کلیہ تاریخ میں ایسی گنجائش رکھی ہوگی

لیکن یہ بتا دینا چاہیے کہ تاریخ کی تدریس کا موجودہ طریق تسلی بخش نہیں ہے۔ اس میں سب ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور لاتعلق محسوس ہوتے ہیں، یہ تاریخ پڑھانے کا نہایت غلط اور فرسودہ طریق ہے جس کا نتیجہ محدود نقطہ نظر اور بین الاقوامی رقابت کی شکل میں نکلا ہے، اس لیے یہ تجویز ہے کہ خواہ کوئی تاریخی مضامین پڑھائے جائیں ان کا طریق تدریس ایسا ہونا چاہیے کہ ہر تاریخ کی حقیقی روح جھلکتی نظر آئے۔ اس مقصد کے لیے پرائمری سٹیج پر ہی طلباء کو ان بڑی بڑی عالمگیر تحریکوں سے روشناس کرایا جائے جن سے کسی ملک میں تاریخ اور عوام الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ بعد کے مرحلوں میں عالمگیر تحریکوں کا خاکہ مختلف قوموں اور ملکوں یا مختلف عہد میں نسل انسانی کی تاریخ کی تدریس مزید زوال پذیر ہوگی۔ مسٹر ایچ جی ویلز نے تاریخ کو نسلی بحث تو نہیں اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے بہت خام و ناقص ہے، اگرچہ بھی تاریخ پر ایک شاندار کام ہے اور ان کے طریقوں کو وہ لوگ یقیناً اختیار کریں گے جو تاریخی تفصیلات پر زیادہ وسیع اور درست معلومات رکھتے ہیں

**ریاضی** جہاں تک پرائمری میں ریاضی کی تدریس کا تعلق ہے، فی الوقت بچوں کے ذہن کو ان طویل دقیق اور مشکل سوالوں سے بھر دیا گیا ہے جنہیں بڑے آدمیوں کو عملی زندگی میں حل کرنے کی شاذ ہی کبھی ضرورت پڑتی ہو، اس لیے ایسے دقیق سوالوں کی بجائے اور

کی سختی سے مخالفت کی جاتی ہے، لیکن یہ صبر اور محنت کا امتحان ہوں لیکن چھوٹے بچوں کی بجائے بڑے نوجوانوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اس طریق کو ختم کر کے یہی ٹھیک ہوگا کہ تیزی سے آگے بڑھا جائے اور ایک بارہ برس کے بچے کو دل آزار تفریق، سود، رقبہ وغیرہ کے سوالات حل کرنے کے لیے مناسب حساب پڑھایا جائے جس سے ایک دیہاتی یا شہری بچے کو عملی زندگی میں ہر روز واسطہ پڑنے والے قاعدوں، یہ مہارت جس کے نتیجہ میں پیش آنے والے عملی معاملات سے بالکل ناواقف ہو، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ کم وقت میں زیادہ وسیع مہارت حاصل کی جائے جو لوگوں کے روزمرہ کے لین دین میں کام آئے

یہیں حساب اور پیمائش کے ضروری علم کے علاوہ ریاضی کی تدریس کا طریق ختم کر دیا جاتا ہے، الجبرا جیومیٹری کی تعلیمی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ الجبرا اور جیومیٹری کو لازمی مضمون رکھا جائے تو ایک کو وہ جہاں اتنے سب مضامین پڑھائے جائیں جو اس کی تہذیب کے لیے ضروری ہیں۔ وہ طالب علم جو حساب کے لیے ایک فطری رجحان رکھتے ہوں اور وہ جو ایسے پیشہ میں داخل ہوں جہاں ریاضی کے ان علوم کا علم ضروری ہو وہ ثانوی مرحلہ پر انہیں بحیثیت انتخابی مضمون کے لے سکتے ہیں

**ڈرائنگ** پرائمری اسٹیج پر مبادیات ڈرائنگ کی تعلیم بھی شامل کی جانی چاہیے۔ اس کے ذریعہ بچے کی آنکھوں اور ہاتھوں کی ایسی تربیت ہو جس کے نتیجے میں اس میں حسن و توانائی کو محسوس کرنے کی قابلیت پیدا ہو سکے۔ لیکن ثانوی اسٹیج پر ڈرائنگ اختیاری ہو جانا چاہیے اور صرف وہ طلباء جو مستقبل میں ایسے پیشہ میں داخل ہوں جہاں ڈرائنگ کا عمل دخل ہو، اسے اختیاری مضمون کے طور پر لیں

**ہنرمندی** موجودہ طرز تعلیم سے ہمارے منصوبے کا ایک نمایاں فرق جو نمایاں اہم ہے جیسا ذریعہ کی تبدیلی جیسی اہمیت ہے۔ وہ طلباء کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی تربیت اور کسی نہ کسی ہنر کا حصول ہے۔ پرائمری مراحل پر مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ آنکھ اور ہاتھ کی تربیت ہو گی اگرچہ پرائمری اسٹیج کے بعد بچوں کی اکثریت کاشتکار رہے گی، اس لیے انہیں زراعت میں نظریاتی اور عملی تربیت اور انہیں حفظان صحت سے بہرہ ور کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ پھول، ترکاریاں اور باغبانی بھی آسانی سے کاشتکاری میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ مضافاتی سکولوں میں اس میں کچھ ترمیم کرنی چاہیے اور دیگر تربیت کے لیے اور کوئی

(باقی صفحہ ...)

# پہلا اسلامیہ کالج اور اُس کے عظیم طلبہ

دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے متعلق یہ مضمون اس لئے یہاں مرتب کیا گیا کہ اس سے معلومات میں اضافہ کیا جائے اور یہ بھی اس لئے یہاں دیا جا رہا ہے کہ اس کے حالات ہم بہتر رسالوں اور الفاظ میں پڑھ کر سر دُھنا جائے بلکہ اس میں واقعات و حالات کو ایسی ترتیب اور ایسے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد خود بخود یہ واضح ہو جائے کہ مسلمان طالب علم کے نزدیک تعلیم کا مقصد اور اس کا طریقۂ کار کیا ہے اور ہمالی منطب کا حل کیا ہے۔ تعلیم و تربیت اور سیاست کا صحیح تعلق کیا ہے اور اس کی رُو سے میدانِ عمل میں آنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ اسلام پوری انسانیت سے کیسے خطاب کرتا ہے اور اس کے نزدیک علم نافع کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔ اس کالج کے حالات اور واقعات خود یہ بتاتے ہیں کہ دنیا کا یہ سب سے پہلا اسلامیہ کالج اگر ایک طرف معجزہ ہے تو دوسری طرف وہ قیامت تک پوری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ بھی ہے۔ (ایڈیٹر محور)

## میدانِ عمل میں

اس اسلامیہ کالج کے طالب علم حلقہ ہوں کوش کرار و قطار رہنے والے عالم اور فقیہ شام و روم کی سلطنتوں کو زیر و زبر کرنے والے بھی تھے، وہی طالب علم صحرائی آواز "صوت الحق" سے بلند کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے، ان کے نعرہ ہائے تکبیر سے دنیا کی فضائیں تھرتھراتی تھیں اور کفر کی سلطنتیں ان کی گرج سے لرزتی تھیں۔"

کالج کے ان عام طالب علموں کے علاوہ وہ طالب علم، جو مستقل طور پر صفہ کی درسگاہ میں حصولِ علم میں مصروف رہتے تھے انہیں بھی مختلف سرایا میں اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجا جاتا تھا اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ ملک میں امن و امان نہیں تھا اور دشمنوں کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھنے کی وجہ سے ان کی زندگی ہمیشہ خطرے میں ہوتی تھی ———— چنانچہ صفر ۴ھ میں ستر طالب علموں کی جو جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجی گئی تھی، وہ بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھوں تمام کی تمام شہید ہو گئی صرف ایک طالب علم بچ گئے تھے، جنہوں نے مدینہ آکر خبر کی

وہ طالب علم، جو اس اسلامیہ کالج سے فارغ ہو چکے تھے یا جو ابھی تعلیم و تربیت کے حصول میں مصروف تھے، ان بڑی عمر اور جوان طالب علموں کے علاوہ کم عمر کے طالب علم بھی تھے ———— غزوۂ بدر میں عمیر بن ابی وقاص سے، جو ایک کم سن طالب علم تھے، جب واپسی کے لیے کہا گیا تو وہ رو پڑے اور اس طرح آنحضرت صلعم نے انہیں فوج کے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی

غزوۂ احد میں جب آنحضرت صلعم نے فوج کا جائزہ لیتے وقت رافع بن خدیج سے فرمایا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس چلے جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے ———— سمرہ ایک اور طالب علم ان کے ہم عمر تھے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں کشتی میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں ان کو اگر اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو زمین پر دے مارا اس لیے ان کو بھی اجازت مل گئی ———— یہ تھے دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے ننھے طالب علم

صحابۂ کرامؓ کی بیگمات بچیات نے تب اس تعلیم و تربیت کا مذاکرہ کیا، جو ان کے بیٹے، بھائی اور شوہر اس اسلامیہ میں جا کر حاصل کر رہے تھے، تو انہوں نے مسلم اکبر کے پاس ان میں سے ایک عابدہ کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ "یا رسول اللہ! مرد ہم پر سبقت لے جا رہے ہیں آپ ایک دن اپنی طرف سے ہمارے لیے بھی مقرر فرما دیجئے" چنانچہ آپ نے ایک دن خواتین کے لیے مقرر کر دیا آپ ان طالبات کو وعظ کرتے، اقامتِ دین میں عملی حصہ لینے اور بھلائی کو فروغ دینے کی تلقین فرماتے تھے ————

اور یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اگر ایک طرف غزوات میں کوشش کر ان طالبات میں سے کوئی ہاتھ بڑھا کر اپنے کان کے آویزے اتارتی اور اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتی اور دوسری انگلی سے انگوٹھی کو الگ کر کے اسے دین کے لیے پیش کر دیتی اور حضرت بلالؓ ان سارے صدقات کو سمیٹ رہے ہوتے وہ اُن کی چادر پر ڈالتی تھیں ———— تو دوسری طرف جب اہل حق پر مصیبتیں توڑی گئیں اس وقت دوسرے طلبہ کی طرح ان طالبات نے بھی تکلیفیں جھیلیں اور شدائد و مصائب کو برداشت کرنے کی بہترین مثالیں قائم کیں جب مکہ کی فضا اہل حق کے لیے بالکل ہی ناسازگار ہو گئی، تو حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت میں طالبات نے بھی اپنے وطن اور اپنے اعزا اور اپنے املاک و اموال کو خیرباد کہا اور مختلف غزوات میں دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی طالبات نے پانی پہنچا کر زخمیوں کو پانی پلایا اور ان کی مرہم پٹی کرتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھائی

## پوری انسانیت کے لئے

دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج میں مختلف اطراف سے طالب علم تعلیم و تربیت

کے لیے آئے تھے اور ان کے دلوں و دماغوں اور زبانوں پر ایک ہی پاک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جاری کرنے ہوئے رحمۃ العالمین نے ملکوں قوموں رنگوں اور زبانوں کا فرق دور کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر دکھایا کہ آپ ہی تمام جہانوں، تمام ملکوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔

اس کالج کے طالب علموں میں سے ایک عثمان بن طلحہؓ ہیں جن کے پاس خانہ کعبہ کی کنجی تھی عرب کے لوگ ان کی ویسی ہی عزت کرتے تھے جیسے یورپ کی عیسائی اور دوسرے طالب علم عبداللہ بن سلامؓ ہیں جو حضرت یوسفؑ کی اولاد سے ہیں اور جن کو عرب کے تمام یہودی اپنا مذہبی آدمی اور سردار مانتے تھے — اگر ایک طرف خالد بن ولیدؓ جیسے طالب علم ہیں جنہوں نے غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست دی تھی اور اب دین آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ لات و عزیٰ کے توڑنے کی اجازت دیجیے تو دوسری طرف ذوالبجادینؓ بھی ہیں جنہوں نے گھر بار چھوڑ دیا اب کمل کا تہبند ہے اور کمل کا کرتا، جس کو ببول کے کانٹے سے اٹکا رکھا ہے اور اسی میں خوش ہے

دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کا ایک طالب علم دحیہ بن خلیفہؓ بھی ہے، جو تمام الہامی کتابوں کا جاننے والا ہے جو تمام اور بیت المقدس کا سفر کر چکا ہے ہرقل شاہ روم کے دربار میں اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کی لڑائیوں کا یہ چرچا حقہ کے دربار سے ہوتا ہے اور جس کو عرب کے تمام عیسائی اپنا لاٹ پادری مانتے ہیں وہ سب کے سامنے علانیہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پوجنے کے لائق نہیں، محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور مریم کے بیٹے ہیں ——

اور اسی کالج کے ایک طالب علم سلمان فارسیؓ بھی ہیں جو فارس کے بہت بڑے رئیس زادے اکلوتے بیٹے تھے پہلے آگ کو پوجتے تھے پھر عیسائی ہوئے، مگر جب اس سے بھی ان کے دل کی پیاس نہ بجھی، تو وہ ایران سے شام، شام سے عراق اور عراق سے حجاز پہنچے اب انہوں نے آپؐ ہی کے قدموں کی مٹی کو اپنا فرش بنا لیا ہے

یہ اسی کالج کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا، کہ اس کالج کے طالب علم رنگ، نسل اور ملک کی تمیز کے بغیر ملک ملت کے درخشندہ ستارے بن گئے، ان کی جھلملاہٹ سے ساری دنیا رہبری حاصل کرنے لگی، یہ مسجد نبوی کے دائرہ علمیہ (LECTURE THEATER) کی حاضری ہی تھی جس نے انہیں "خیرات امۃ اخرجت للناس" —— سب سے بہتر جماعت، جو انسانوں کی رہنمائی کے لیے اٹھائی گئی۔ —— کا مرتبہ عطا کیا

حق تو یہ ہے کہ اگر تاریخ عالم کا کوئی طالب علم عدل و انصاف کے ساتھ دنیا کے تمام قدیم و جدید کالجوں اور درسگاہوں کو تعلیم و تربیت کی میزان میں تولے تو اسے دنیا کی تاریخ میں صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، بلالؓ، سلمانؓ جیسے طالب علموں کی کلاس (CLASS) کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ملے گی —— اور کلاس بھی ایسی جس کی تعلیم و تربیت کے فرائض ریگستانِ عرب کے ایک ان پڑھ چرواہے نے ماہرین تعلیم کی کسی مجلس سے مشورہ لیے بغیر سرانجام دیے۔

## علم نافع کا حصول

ابی عبدالرحمٰن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ یعنی عثمانؓ بن عفان اور عبداللہ بن مسعود اور ان کے دوسرے اصحاب نے ہم سے بیان فرمایا کہ وہ جب نبی صلعم سے دس آیات پڑھ لیتے تھے تو وہ ان سے آگے اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے، جب تک وہ ان آیات کا جوہر علم اور معنی عملی اخذ نہیں کر لیتے تھے —— یہ خود اصحاب نبی کا بیان ہے کہ ہم نے یوں "القرآن اور العلم" کی تعلیم پائی"

اس کالج کے طالب علم محض کثرت معلومات کے حریص نہ تھے بلکہ ان کو حاصل کئے ہوئے علم کی حفاظت اور پھر اس پر عمل کرنے کا ذوق تھا اور اسی لئے مشرق و مغرب کی فضاؤں میں اسلام کا علم بلند کرنے والے یہ طالب علم قرآن کی دس دس آیات کے اسباق پڑھتے تھے اور اس وقت تک آگے نہیں پڑھتے تھے جب تک کہ انہیں مصولی سے حفظ نہ کر لیتے تھے اور ان میں سے جملہ آداب و احکام اور توجیہات و غایات کو تدبر کر کے اخذ نہ کر لیتے تھے اور جب تک کہ اپنے ذہن اور اپنے اعضاء کو ان پر عمل کرنے کی اتنی مشق نہ

ہم پہنچا لیتے تھے کہ وہ عمل طبیعت و عادت بن کے رہ جائے

اس کالج کے جوہر شناس طالب علم اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ "علم نافع صرف وہی ہے جس کو لے کر جب وہ زمین کے راستوں پر چلیں تو دل سے بھی، زبان سے بھی اور عمل سے بھی وہ حق کے علمبردار حق کے داعی اور حق کے حامی اور ناصر بن کر چلیں —— ان طالب علموں کی زبان پر نبی صلعم کی یہ دعا ہوتی تھی: "اے اللہ ہم علم غیر نافع سے بچنے کے لئے تیری پناہ چاہتے ہیں" اور اسی لئے وہ ایسے عقل و ادراک کو مسولیات، مورمالعدالطبیعی فلسفہ کے لاطائل مسائل میں الجھاتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مواراتیب سے اپنے علم کا جو حصہ نصوص کی صورت میں نازل فرمایا، اسی پر اکتفا کرتے تھے نہ اس میں اضافہ کرتے تھے اور نہ کمی

رسول پاکؐ عملی تربیت کا جو اسلوب استعمال فرماتے تھے وہ صفات عالیہ کے ساتھ انسانیت کی تعمیر کے لئے اعلیٰ ترین اسلوب تھا، چنانچہ احادیث کی کتب الیسی "ترو تازہ" نصوص صحیحہ سے بھری پڑی ہیں کہ گویا ان کے حروف میں براہ راست ہادی اعظمؐ کی آواز سنائی دے رہی ہے اور ان سے مردم سازی کا وہ محمدی طریقہ معلوم ہو سکتا ہے جس نے انسانیت کی اجتماعی تاریخ میں ایک انقلاب اعظم کی تکمیل کرنے والے مردان کار پیدا کر دکھائے تھے۔

## معجزہ اور اسوہ

یہ اسی دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے معلم جیسے مدینہ کے اس اسلامیہ کالج میں ایسے طالب علم تیار کیے جنہوں نے دیکھتے دیکھتے اس علم کی روشنی سے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر یہ روشنی عرب سے نکل کر ساری روئے زمین پر پھیل گئی۔

مدینہ کے اس اسلامیہ کالج کی نقل میں صوفیائے اسلام نے خلافت راشدہ کے بعد چھوٹے چھوٹے مدرسے اور درسگاہیں، جنہیں خانقاہ کہا جاتا ہے اس تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیں، جن میں استعداد رکھنے والے ایسے طالب علم رہتے تھے جنہیں ان خانقاہی کالجوں کے پرنسپل بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک ایسے کالجوں میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انہیں اس کام کے لئے تیار کرتے تھے، جس کے لئے معلم اکرمؐ ایسے جلیل القدر طالب علموں کو تیار کیا کرتے تھے

دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی تعلیم و تربیت سے جو انقلاب عظیم برپا ہوا تھا، اس کی فطرت وہی معلم اکرمؐ خوب جانتا تھا جس نے پہلی مرتبہ اسے برپا کیا، اس معلم اکرمؐ کی سیرت ایسے اخلاق و تقویٰ، حکمت و عدالت، اعلیٰ قوت شخصیت اور انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات کی وجہ سے اگر ایک لحاظ سے معجزہ ہے اور قیامت تک کے لئے معجزہ ہے —— تو دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے کیونکہ اس معلم اکرمؐ نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا عملی خاصہ وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر اسلامیہ کالج کے نتائج کے طور پر دنیا کے سامنے ساڑھے —— سو برس پہلے آ چکی ہے۔ اس معلم اکرمؐ کے نمونے کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی، اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنے ہی اقرب ہوں گے جو اصل نمونے کی طاقت سے برپا ہوا تھا اسی لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے —— جب بھی انسان چاہے خواہ بیسویں صدی میں یا چالیسویں صدی میں اور جہاں بھی انسان کوشش کرے خواہ پاکستان میں یا امریکہ و روس میں وہ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے معلم اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کرے۔

امام ابوحنیفہؒ نے یہ خط اپنے مایہ ناز شاگرد امام ابویوسفؒ کو لکھا

# اُستاد کی وصیت شاگرد کے نام

دربار شاہی میں نہ جانا کیونکہ اس طرح ایسا

سلاطین کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا، اس سے ہر وقت اس طرح پرحذر رہنا جس طرح آدمی آگ سے پرحذر رہتا ہے جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو [illegible] جب سلطان اپنے حاشیہ نشینوں میں بیٹھا ہو تو اس وقت اس سے زیادہ گفتگو نہ کرنا چاہیے ایسے

ہوتا ہے اور اکرام قائم رہتا ہے اور اس لیے بھی کہ سلطان اپنے مقابلے میں ہر شخص کو بے حقیقت سمجھتا ہے۔ اس طرح تم لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو جاؤ گے

موقع پر وہ اپنے علم و فضل کا سکہ جمانے اور تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا [illegible] ہو کر حکومت کے [illegible] تم اپنے فیصلے کے خلاف عمل کرنے پر مجبور

اگر سلطان تمہیں قاضی مقرر کرنا چاہے، تو پہلے دریافت کر لو کہ وہ تمہارے فقہی مسلک اور طریقہ اجتہاد سے واقف ہے یا نہیں [illegible] یا کچھ اور؟ اس لیے کہ جب خود پیش قدمی کرو گے تو وہ

ہو جاؤ، پھر یہ بھی معلوم کر لو کہ تمہارے اس تقرر کی تہہ میں کیا مقصد کار فرما ہے۔ تمہارے علم و فضل سے استفادہ [illegible] سلطان سے تعلقات رکھنا، اس میں کبھی خود پیش قدمی نہ کرنا

سلطان سے ڈرنا اور اس کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا صرف سلطان سے تعلقات رکھنا [illegible] مرکام میں تمہارے کیرکٹر کو نقصان پہنچے گا۔

میں اپنے اخلاص کا اظہار کرنا [illegible] تو تمہیں ذلیل و رسوا کرے گا [illegible] اگر کوئی شخص دین میں کسی بدعت کا موجد ہو رہا ہو تو علانیہ اس کی غلطی بیان کر دینا تاکہ دوسرے لوگ اس کی پیروی نہ کریں [illegible] کہ حق کے اظہار میں

اظہار حق میں کسی کی پروا نہ کرنا، خواہ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو لوگوں کے دلوں میں تمہارے علم و اعتبار کی عزت [illegible] اور وہ تمہارے اظہار حق سے بھی واقف رہیں گے [illegible] سے کوئی مناسب اور دین

خدائے تعالیٰ تمہارا معین و مددگار ہو گا اور اپنے دین کا محافظ ہو گا۔ اگر تم ایسا کرو گے [illegible] کسی غلطی پر آپ کو مطلع کرنا میرا فرض ہے۔ [illegible] اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو، عبادت اتنی

کے خلاف حرکت صادر ہو تو صاف کہہ دو کہ عہدہ و قضا کے لائق نہیں [illegible] اللہ کے یہاں تمام باتوں کی باز پرس ہو گی [illegible] دنیا کے کسی کام میں مطلق رغبت [illegible] دنیا کو بالکل حقیر سمجھو، زیارت قبور کی عادت ڈالو، موت کو ہمیشہ

اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو، علم کی نگہداشت رکھو [illegible] ہر ہفتے میں دو چار دن روزے کے لیے مقرر کر لو [illegible] آگے بڑھو

یاد رکھو۔ ہی نہ رہو جیسی عام لوگ کرتے ہیں ہمیشہ تلاوت قرآن کرتے رہو جب تک لوگ تم کو خود امام نہ بنائیں [illegible] کسی پیشے میں رکھ کر کسی انسان میں اپنی طرف سے بھلائی دیکھو

جو لوگ اپنی حاجات کے سبب سے بھیجے ہیں ان سے ربط ضبط، اگر تبلیغ اور دعوت دین کی غرض سے ان سے ملنا یا تعلق قائم کرنا مناسب ہو [illegible] تاکہ لوگ اس کی اتباع نہ کریں اور اس سے محفوظ رہ سکیں۔

تو اس کے لیے بھلائی چاہو اور بھلائی کے ساتھ اس کا تذکرہ کرو۔ البتہ یہ برائی دین کے بارے میں ہے، تو لوگوں سے اس کا تذکرہ کر دو تاکہ لوگ اس کی اتباع نہ کریں [illegible] کم میل جول رکھنا

کاروبار اور کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ گفتگو کرو، ورنہ لوگوں کو خیال ہو گا کہ تم مال کے حریص ہو [illegible] تم رشوت لیتے ہو۔ عام آدمیوں، بالخصوص دولت مندوں سے کم میل جول رکھنا

ورنہ وہ سمجھیں گے کہ تم ان سے کچھ توقع رکھتے ہو۔ [illegible] لوگوں کے راز افشا کرو کوئی تم سے مشورہ کرے تو اپنی معلومات کے مطابق بتانے میں کوتاہی نہ کرو

گفتگو میں نہ سختی اور درشتی ہو، نہ آواز بلند ہو، لہو و لعب سے پرہیز کرو [illegible] اس لیے کہ یہ امانت ہے۔

طرح اللہ تعالیٰ سے تقرب حاصل ہو گا [illegible] کسی کی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو [illegible] ہمیشہ قلب میں استحضار رکھو، دنیا کی طمع و رغبت بالکل نہ کرو خواہ تم

بخل سے پرہیز کرو، حریص نہ ہو اور نہ کبھی جھوٹ بولو۔ بازاری لوگوں کی صحبت اختیار نہ کرو۔ ہر معاملے میں اپنی عزت اور وقار کا خیال رکھو

مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

ہر معاملے میں متانت و وقار سے کام لو، اس لیے کہ جس کی ہمت کم ہو جاتی ہے، اس کا رتبہ بھی گر جاتا ہے۔

# بقیہ : محسنِ انسانیت، معلّمِ انسانیت

تیسرا سبق آموز تجربہ یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی تدریجی تعلیم نے مسلمانوں میں ایسا فکری، تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا۔ پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیلِ نو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج جب کہ علمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و تہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملتِ اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کمزور ہو گئی ہے ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت آسانی سے شکست کھا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

**کلمۂ آخر** آئیے اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر سے آ کر ہمیں اپنی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا جو ملتِ اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا، نبی اکرمؐ کی حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے آہستہ آہستہ ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظامِ تعلیم کے تیزاب میں ہماری خودی اس طرح تحلیل ہو گئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نکل نہیں پا سکتے۔

بدقسمتی سے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے دلکش الفاظ کو سیاسی کھلونوں کی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوا کہ قمار خانۂ معاذ میں ہر دوسری پر دیمٹ گئی تو مقامروں نے فوراً نعرۂ اسلام کو اٹھا کر لبِ طاق پر رکھ لیا۔ پھر جب وقتی ضرورت پوری ہو گئی تو اس نعرہ کو کسی آئندہ امر کے لیے محفوظ رکھ دیا گیا۔

کاربردازانِ تعلیم کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اب تک جو کچھ سوچا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ اس مسلط شدہ نظامِ تعلیم کے نصابات میں چند اچھی باتیں اسلام کی بھی داخل کر دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی ٹینک میں جدید ترین سلائی کی مشین فٹ کر کے یہ سمجھیں کہ اب یہ ٹینک ٹھیک ٹھیک سینے لگے گا۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علمبردار ملت اور تحریکِ فلاحِ انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پورا نظامِ تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے۔ وہ نصابات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے۔ وہ اپنی حکمتِ تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظامِ حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔

میں ملک کے دینی شعور رکھنے والے اور ماہرینِ تعلیم کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ نبی اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملتِ پاکستان کے لیے ایک صحت مند نظامِ تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلافِ ایمان اور خلافِ مزاج نظامِ تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے کنگال کر کے رکھ دیا ہے۔ ●●

# بقیہ : مسلمانوں کی قومی تعلیم

اور مناسب طریق وضع کر لینا چاہیے۔ ثانوی اور یونیورسٹی کے مرحلوں میں بھی VOCATIONAL تعلیم ہونی چاہیے۔ ہر ایک سکول اور کالج ہر طرح کی تربیت نہیں دے سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، لیکن مقامی طور پر ہر سکول اور کالج میں مناسب (VOCATIONS) میں تربیت کا معقول انتظام کر سکتا ہے۔ مثلاً مراد آباد کے سکول میں نقرت (BHARAT) یا گلاٹ ( T A L I G ) کی تدریس میں اور علی گڑھ میں تالا سازی کی تربیت میں کوئی مشکل نہ ہونی چاہیے، لیکن لکڑی کا کام، کھانا پکانا، رنگ سازی، خمائی، کپڑا رنگنا، جلد سازی، اکاؤنٹنسی، ٹیلیوگرافی، آہنگری، دری اور چمڑے کی اشیاء بنانے وغیرہ جیسے مختلف کاموں سے انتخاب کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے۔ ایک طالب علم کو اپنے پورے دورِ طالب علمی میں زیادہ سے زیادہ دو پیشوں میں مہارت حاصل کرتے رہنا چاہیے تاکہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی طالب علم موجودہ مایوسی اور کم تنخواہ والی ملازمتوں مثلاً کلرکوں یا سول سروس کے دوسرے طبقوں پر انحصار سے نجات حاصل کر لیں۔ کوئی نوجوان ایسا نہ ہو جو سرکاری ملازمت پر علی الاعلان انحصار کا یہ جواز پیش کر سکے کہ اس کے پاس تو بس یہی تعلیم ہے جس سے وہ کلرک بن سکے۔ ضروری نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی اس پیشہ کو برقرار رکھے جس کی تربیت اس نے سکول اور کالج میں پائی تھی، لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے تو یہ تربیت کام آ سکتی ہے اور اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ان سکولوں میں اولیٰ اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک نوجوان لباس سازی، ہوٹل، لانڈری یا آہن گری کی اچھی تجارت نہ کر سکے۔ ایک تربیت یافتہ نوجوان نہایت قلیل سرمایہ سے یا صرف اپنی محنت سے کچھ ہی عرصہ میں اپنا کاروبار چلا سکتا ہے۔

اس بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے نوجوان ہاتھ سے محنت و کام کی عظمت اور اہمیت بھی محسوس کریں گے اور وہ بُعد اور علیحدگی دور ہو سکے گی جو اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ میں اور ان عوام میں ہے جو دستی کاموں پر گزارا کرتے ہیں۔ ایک طالب علم کو مستقبل میں بہتر مواقع فراہم کرنے کے علاوہ ان پیشوں کا معیار بھی بڑھے گا، کیونکہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان محض تقلید نہیں کرے گا، بلکہ ارتقاء و ایجاد کی جانب بھی قدم بڑھائے گا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پیشہ ورانہ تربیت فنی تربیت کا متبادل ہے۔ یہاں جن اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں کہ ادنیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تربیت دی جائے جس پر ایک طالب علم ہفتہ میں صرف چند گھنٹے صرف کرے گا جو ایک تھکے ہوئے ذہن کو تھکانے کے بجائے تسکین پہنچائے گی جو اسے چودہ برس کی مدت میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو ایک دستکاری سکھا دے گی تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی روزی کما سکے۔ ●●

## تعلیم ـــــ طلبہ ـــــ پاکستان

مرتب احمد جاوید ملک (شعبۂ ارضیات)

# قائدِ اعظم ـــــ تعلیمی نظریات

> قائد اعظم محمد علی جناح مسلم قوم کے عظیم رہنما تھے محض تعلیم یافتہ رہیں ان کا کبھی بھی پیشہ رہا نہ میدان ـ لیکن اپنے ہمہ گیر کردار کے سبب وہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے بہترین استاد تھے ـ انہوں نے طلبہ کے مستقبل سے متعلق حکمت کی جو باتیں کہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں ـــــ محور )

● ہم پچھلی نسل کے لوگوں کو جتنی بھی آزمائشیں درپیش آئی تھیں درپیش آ چکی ہیں لیکن تم کو کی بات میں یاد ہے کہ جوان دوستوں کی صحبت میں ان کو بھول جانا چاہتا ہوں آج کی رات میں ان کے دلوں میں چھپے ہوئے جوان امنگوں کے تاروں کو چھونا چاہتا ہوں کیونکہ یہی ہیں وہ مرد میدان عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

پیام عید ـ ۱۳، نومبر ۱۹۳۹ء

ـــــ ❖ ـــــ

● میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں کام، کام اور بس کام ــــ سکون خاطر، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے

مسلم طلبہ سے خطاب ـ جالندھر ۱۵، نومبر ۱۹۴۲ء

ـــــ ❖ ـــــ

● جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری پر محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں آپ کو لازم ہے کہ طلبہ کی تنظیم کریں اور ان کی ایک مستحکم و منضبط جماعت بنائیں تاکہ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی کامل حفاظت ہو آپ کو چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نشوونما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ اسلامی تہذیب کو بہر طور بر پا رکھنے میں کوشاں ہوں اور اس امر کی حوصلہ افزائی کریں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں باہمی خیر سگالی اور ایک دوسرے کے حق میں نیک نیتی پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے کے حال سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور سمجھ لیں کہ ہمارے بھائیوں کی ضرورتیں اور خواہشیں کیا ہیں آپ کا ایک اور اہم فرض یہ ہے کہ ہندوستان اور اسلامی ممالک اور دنیا بھر کے مسلمان طلبہ کے باہمی تعاون کار کی تخلیق کریں ـ میں نے ابھی کہا کہ آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں

میں اس کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسے اور وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار اور ضروری ساز و سامان یعنی علم و آگاہی اور توفیق عمل سے آراستہ کریں آپ کی اولین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ، مطالعہ، مطالعہ ـ اس میں شک نہیں کہ مسلمان طلبہ اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہو گئی ہے ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے جوش و خروش ہے طبیعتوں میں ولولے ہیں، جذبات ہیں مگر ساتھ ہی مزاجوں کو محض رانگیختہ کیے جانے سے صرف مطلوبہ نتائج بھی رہ جاتے ہیں جن سے سرور ہو مگر جو دل میں کیونکہ ہندوستان کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ اور مشکل ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ اسی صورت میں دوسروں کے عقیدے بدل سکتے اور ان کو اپنا راویہ لا سکتے ہیں کہ پہلے آپ خود روش ضمیر بن جائیں اور مسائل سے کامل طور پر آگاہی حاصل کر لیں آج کل ہمارے لیے یہ بالخصوص حاجت ہے کیونکہ ہر فرقے اور فریق نے اپنے مقاصد کے لیے ایک منظم پروپیگنڈہ اختیار کر رکھا ہے اکثر اوقات سچائی بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے اور فریق مقابل کے خیالات اور خواہشات کی ترجمانی دیدہ و دانستہ غلط کی جاتی ہے

سٹوڈنٹس کانفرنس جالندھر ـ ۱۵، نومبر ۱۹۴۲ء

ـــــ ❖ ـــــ

● یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے جائیے اور علم حاصل کیجئے۔

اجلاس بلوچستان ـ کوئٹہ ـ ۲، جولائی ۱۹۴۳ء

ـــــ ❖ ـــــ

● آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار کریں یہ آپ کا پہلا فریضہ ہے آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دور حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیل جائیں کم ہیں

ویلیکا شیکشن شل سلز کی افتتاحی تقریب کراچی ۲۶، ستمبر ۱۹۴۷ء

• میں پاکستان کے ہر فرد سے اور بالخصوص اپنے نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور ریاضت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ ایسی شاندار اور بلند مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔

طلباء سے خطاب لاہور، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

---

• تعمیر پاکستان کی راہ میں مصیبتوں اور دشواریوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں۔ نو زائیدہ اور نوخیز اقوام کی تاریخ میں کئی ایک ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں کہ انہوں نے محض قوت ارادی، قوت عمل اور قوت کردار سے خود کو بلند کر لیا۔ آپ خود بھی فولادی قوت کے مالک ہیں اور عزم و ارادے کی دولت میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ دوسروں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کی طرح کامیاب نہ ہوں۔ آپ کو صرف مجاہدوں کا سا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ شجاعت، کردار اور آہنی ارادے کے لوگوں اور کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی شاندار روایات کے مطابق زندہ رہیے، بلکہ ان میں عظمت و شوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔

طلباء سے خطاب، لاہور ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

---

• پاکستان کو اپنے جوانوں اور بالخصوص طلباء پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صف اوّل میں رہے ہیں۔

آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں، اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے

طلباء کے وفد سے ۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

---

• تعلیم اور صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت سب پر واضح ہے۔ ایک صدی سے زائد عرصے کے غیر ملکی تسلط کا یہ فطری نتیجہ ہے کہ ہمارے لوگوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ہمیں حقیقی، تیز رفتار اور ٹھوس ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہو، جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو، جو دنیا بھر میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔

کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء

---

• اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو، موت سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔

طلباء سے خطاب، لاہور ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

---

• پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرز تعلیم پر ہے۔ ہمیں کیونکر اپنے بچوں کو پاکستان کے سچے خدمت گزار بناتے ہیں۔ تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا، اور جہاں تک کتابی تعلیم بھی حیرت سے پست درجہ اور ناقص ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو اس راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر بھی کریں۔ اس امر کی فوری اور شدید ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دی جائے کیونکہ اسی سے ہمارے مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہونے کی امید ہے۔ حصول تعلیم کے بعد لوگوں کو تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت میں داخل ہونا چاہیے۔ یاد رکھیے ہمیں دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے جو انتہائی تیزی سے خود کو بدلتی ہوئی چل رہی ہے۔

کل پاکستان تعلیمی کانفرنس ۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء

---

• سکاؤٹنگ ہمارے جوانوں کے کردار کی تعمیر میں بہت اہم حصہ لے سکتی ہے۔ ان کے جسمانی، ذہنی اور روحانی ارتقا میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔ انہیں مکمل، مفید اور اچھا شہری بنا سکتی ہے۔

پاکستانی سکاؤٹوں سے خطاب ۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء

---

• ہم جس دنیا میں اس وقت زندگی گزار رہے ہیں، وہ کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ تہذیب و تمدن کی ترقیوں کے باوجود جنگل کا قانون جاری ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق طاقتور کمزور سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رہتے۔ اپنی ترقی کو مقدم رکھنا، لالچ اور طاقت حاصل کرنے کی ہوس نہ صرف افراد بلکہ اقوام عالم کے تمام افعال کی محرک ہے۔ اگر ہم دنیا کو زیادہ محفوظ، زیادہ پاکیزہ اور پُرمسرت جگہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اصلاح کا کام افراد سے شروع کرنا پڑے گا۔ یقین جانئے فرد کی زندگی میں سکاؤٹنگ کا ایثار، خدمت، قول و عمل اور خیال کی پاکیزگی کا مسلک پیدا کر دینا چاہیے۔

اگر ہمارے نوجوان ہر ایک کو دوست رکھنے، ہر ایک کی ہر وقت خدمت کرنے اور ذاتی مفاد کو دوسروں کی بھلائی کے سامنے پس پشت ڈالنے، خیال، الفاظ اور عمل میں ستھرا رہنے کا سبق سیکھ لیں تو مجھے امید واثق ہے کہ عالمگیر اخوت ہمارے امکان اور دسترس میں ہو گی۔

لوئر سکاؤٹس سے خطاب ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء

---

• میرے نوجوان دوستو! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی ہو گی۔ یاد رکھئے کہ اب ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ اب ہماری اپنی حکومت ہے۔ اب ہم آزاد اور خود مختار مملکت کے مالک ہیں۔ اب ہمیں آزاد لوگوں کی طرح اپنے عمل اور اپنے معاملات کا انتظام کرنا چاہیے۔ اب ہم کسی بیرونی طاقت کے تسلط میں نہیں ہیں۔ ہم نے وہ زنجیریں توڑ دی ہیں، ہم نے وہ بیڑیاں کاٹ ڈالی ہیں۔ میرے نوجوان دوستو! اب میں آپ ہی کو پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی باری پر کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح رہیے کہ کوئی آپ کو گمراہ نہ کر سکے، کوئی آپ کو غلط طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام پیدا کیجئے۔ ایک مثال قائم کر دیجئے کہ نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کا اصل کام کیا ہونا چاہیے؟ اپنی ذات سے وفا، اپنے والدین سے وفا، اپنی مملکت سے وفا، اپنے مطالعے پر کامل توجہ۔

جلسۂ عام ۔ ڈھاکہ ۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

---

• آپ کی بھلائی، آپ کے والدین کی بھلائی، بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ کی توجہ صرف تحصیل علم کے لیے وقف رہے۔ صرف اس طرح آپ خود کو زندگی کی جنگ کے لیے مسلح کر سکتے ہیں۔ اس زندگی کی جنگ کے لیے جو آپ کو عنقریب پیش آنے والی ہے

صرف اس طریقے سے آپ اپنی مملکت کے لیے طاقت اور قوت کا سرچشمہ بن سکتے ہیں اور ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جو اس مملکت کو سیاسی اور سماجی میدان میں درپیش ہیں۔ صرف اس صورت میں آپ اسے دنیا کی ایک عظیم ترین طاقتور اور ترقی یافتہ قوم بنا کر اس کی منزل مقصود تک پہنچا سکتے ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد، ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

---

• ہمارے کالجوں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زراعت، حیوانات، انجینیئری، طب اور دوسرے فنی و خصوصی مضامین میں اول درجے کے ماہرین پیدا کریں۔ صرف اسی طریقے سے ہم ان مسائل کا کوئی ٹھوس حل نکال سکیں گے جو عام آدمی کا معیار زندگی بلند کرنے کے کام میں پیش آ رہے ہیں۔

ایڈورڈز کالج پشاور ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء

---

• زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری قوم کی کامیابی کا انحصار صحیح جسمانی تربیت پر ہے۔ آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجئے۔ محض کھیل یا دل بستگی کے لیے نہیں بلکہ سارے ملک کی قوت پیدا کرنے کی خاطر، تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبے میں ہمیشہ کے لیے اس وابستگی، بین الاقوامی خیر سگالی اور محنت کا سرچشمہ رہیں۔

کل پاکستان اولمپک کھیلوں کے موقع پر ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء

---

• پرانے طرز تعلیم اور طرز حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اچھے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ کلرک پیدا کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کلرک دیا او نچے اٹھ گئے اور ایک بلند مقام پر فائز ہو گئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مقصد اچھے کلرک حاصل کرنا ہی تھا۔ سول سروس میں زیادہ تر حکومت انگریز رہتے تھے۔ ہندوستانیوں کو سول سروس میں داخل کرنے پر بہت بعد میں عمل کیا گیا۔ بہرحال پورا اصول اور خیال یہ تھا کہ ایک خاص قسم کی ذہنیت، ایک نفسیات، ایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کی جائے۔ یہ کہ ایک عام آدمی جب بی اے یا ایم اے پاس کر لے تو بس سرکاری ملازمت ڈھونڈتا پھرے۔ اگر ملازمت مل گئی تو سمجھ لیا کہ نروان پا لی۔ اس سے زیادہ بلندیوں کا تصور ہی نہیں کیا گیا۔ میں جانتا ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایم اے پاس کی آمدنی ٹیکسی ڈرائیور سے بھی کم ہوتی ہے اور سرکاری ملازمین میں سے بیشتر ایسی پست زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان سے کہیں اچھی زندگی ایسے لوگ بسر کرتے ہیں جو پرائیویٹ اداروں میں ادنیٰ ملازمتوں پر کام کرتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اب آپ اس پرانے ڈھرے سے نکلیں، اس ذہنیت کو دور کریں۔ اب آپ آزاد پاکستان میں ہیں۔ حکومت ہزاروں لوگوں کو نہیں لے سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی تگ و دو میں ایک طرح کی مقابلہ بازی شروع ہو جاتی ہے جس سے احساس کمتری میں مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔ حکومت میں صرف کچھ لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے اور جن باقی لوگوں کو کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملتی وہ ہمیشہ اپنی مایوسی اور ناکامی کی وجہ سے ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو حکومت کے خلاف نعرہ بازی کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

---

• میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کی توجہ، آپ کا ذہن، آپ کے مقاصد، آپ کی تمناؤں کا رخ دوسرے راستوں، دوسرے میدانوں، دوسری منزلوں کی طرف ہونا چاہیے جو آپ

کے لیے کھلی پڑی ہیں اور رفتہ رفتہ کھلتی جائیں گی۔ دستی کام، دستکاری میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں ٹیکنیکل تربیت کی زبردست گنجائش ہے کیونکہ ہمیں کاریگروں اور ہنرمندوں کی اشد ضرورت ہے۔ آپ معاشیات، بینک کاری، تجارت، رموز کاروبار، قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جس سے نئی امکانات ترقی پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نئی صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، کارخانے لگ رہے ہیں، بینک، انشورنس کمپنیاں اور نئے تجارتی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ یہ آپ کے سامنے کھلے ہوئے نئے میدان ہیں اور نئے راستے نئی منزلوں کی طرف لے جانے والے۔ ان کے متعلق غور کیجئے، توجہ دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سرکاری ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ سرکاری ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ صبح سے شام تک کلرکانہ ذہنیت میں گھرے رہنا اور انتہائی تکلیف دہ اور سرمایہ رنج حالات میں زندگی بسر کرنا۔ اگر آپ تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت کی راہ پر چلیں گے تو آپ بہت زیادہ خوش رہیں گے، بہت خوش، بلکہ خوشحال بھی، اور خوشی اور خوشحالی کے مزید مواقع ہر وقت آپ کے منتظر رہیں گے۔ اس سے صرف آپ ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا، ملک پاکستان کو بھی فائدہ ہوگا۔

جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

---

• پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد کے دوران میں ہم غیر ملکی حکومت پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے، تاکہ اس کی جگہ ہم اپنی مرضی کی حکومت قائم کر سکیں۔ ایسا کرتے وقت ہم نے بہت سی قربانیاں دیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے جوانوں کی تعلیمی زندگی تباہ ہو گئی۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ آپ نے اپنی جگہ ایسا کردار شاندار طریقے سے انجام دیا۔ اب کہ آپ اپنا نصب العین حاصل کر چکے ہیں، آپ کی اپنی حکومت ہے، آپ کا اپنا ملک ہے جس میں آپ آزاد لوگوں کی حیثیت سے رہتے ہیں، تو آپ کی معاشرتی اور معاشی مسائل کے لیے آپ کا نقطۂ نظر اور آپ کی ذمہ داریاں بھی بدل جانی چاہئیں۔ نظم و ضبط کا کھلا احساس، عمدہ کردار، حقیقی اور عمل پر اکسانے والی تعلیم۔ آپ کو چاہیے کہ خود کو پورے دل و دماغ کے ساتھ مطالعے کے لیے وقف کر دیں کیونکہ آپ کی پہلی ذمہ داری ہے اپنی ذات کی طرف، اپنے والدین کی طرف اور اپنی مملکت کی طرف۔ آپ کو حکم ماننے کی عادت ڈالنی چاہیے کیونکہ صرف اسی طریقے سے آپ حکم دینا سیکھ سکتے ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء

---

• میرے نوجوان دوستو! اب تمہیں اس ضروری اور بنیادی تبدیلی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے جو اس حلقے میں حال ہی میں ہوئی ہے۔ اب اپنی شخصیت کو محض سرکاری ملازمت کے حصول میں محدود نہ کیجئے جیسا کہ اب تک سب ہی اس کی تمنا کرتے رہے ہیں۔ اب نئے میدان، نئے راستے اور نئی منزلیں آپ کی تگ و دو کے منتظر ہیں۔ سائنس، تجارت، بینک، بیمہ، صنعت و حرفت اور فنی تعلیم کے شعبے آپ کی توجہ اور تحسین کے محتاج ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء

---

• اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے تمام وسائل کو کام میں لانا پڑے گا۔ سرگرمی اور طریقے سے مکمل تیاری کرنی پڑے گی۔ میں آپ سے کہوں گا کہ جذبات کے دھارے پر نہ بہہ جائیے، محض نعروں کی پیٹ میں نہ آئیے۔ (طلبہ سے خطاب ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء)

---

• تعمیر قوم کا پہلا ستون تعلیم ہے۔ تعلیم کے بغیر آپ بالکل ویسی ہی حالت میں ہیں جیسی کہ کل رات اس پنڈال میں اندھیرے میں تھی۔ تعلیم کے ساتھ آپ اس حالت میں ہوں گے جیسے کہ اب دن کے اس چکاچوند اجالے میں ہیں۔ (طلبہ سے خطاب ۲ مارچ ۱۹۴۱ء)

حارث رشید (تعلیمات)

## ایک سروے ـــ ایک جائزہ

# اساتذہ کا طلبہ سے تعلق

لاہور کے کالجوں میں پچاس اساتذہ سے درج ذیل سروے ایک فارم کی صورت میں حاصل کیا اور ایک نظر میں اس پہلو پر نگاہ ڈالنے کے لیے اس کے نتائج صیاقتِ طبع کے لیے نہیں بلکہ سوچ کے دائرے فراہم کرنے کے لیے آپ کی نذر ہیں ـــــ (محور)

### تدریسی تجربہ رکھنے والے افراد کا تناسب یہ رہا؟

| | |
|---|---|
| ۱ تا ۵ سال | ۲۶ فی صد |
| ۵ تا ۱۰ سال | ۴۲ " " |
| ۱۰ تا ۱۵ سال | ۳۰ " " |
| ۱۵ تا ۲۰ سال | ۱ " " |
| ۲۰ تا ۲۵ سال | ۲ " " |

### زیرِ تدریس طلبہ پر اساتذہ کی نگرانی کا تناسب؟

| | |
|---|---|
| ۲۰ طلبہ تک | فی صد اساتذہ |
| ۵ طلبہ تک | ۲۸ " " |
| ۵۰ طلبہ تک | ۳۰ " " |
| ۱۰ طلبہ تک | ۱۵ " " |
| ۲۰ طلبہ تک | ۱۵ " " |

### جو آزمائشی امتحان لیا اُس کا نتیجہ کیسا رہا؟

| | |
|---|---|
| تسلی بخش | ۱ فی صد |
| غیر تسلی بخش | ۸۲ " " |
| کسی حد تک ٹھیک رہا | ۱۸ " " |

### آزمائشی امتحان کی رپورٹ کبھی والدین کو بھیجی گئی؟

| | |
|---|---|
| ہاں بھیجی گئی | ۰ فی صد |
| نہیں بھیجی | ۱۰۰ " |

### اساتذہ و طلبہ کے درمیان تعلقات؟

| | |
|---|---|
| دوستانہ / رادارانہ | ۵۴ فی صد |
| گریز کا پہلو لیے ہوئے | ۱۰ " |
| سمت متضاد | ۳۶ " |

### کیا آپ نصاب مقررہ مدت میں ختم کر لیتے ہیں؟

ہاں کر لیتے ہیں ۱۵ فی صد اساتذہ

نہیں ... [illegible]

### کیا آپ نے کبھی کلاس روم کے علاوہ کبھی طالب علم سے تبادلۂ خیالات کیا؟

| | |
|---|---|
| ہاں | ۶ فی صد |
| نہیں | ۱۲ |
| کبھی کبھی | ۸ |

### آپ نے کبھی اپنے طلبہ کا آزمائشی امتحان لیا ہے؟

ہاں

کبھی کبھی ۱۵ فی صد اساتذہ

نہیں ۱۰

### لیکچر کے لیے تیاری [illegible]

| | |
|---|---|
| ہاں | ۱۵ |
| نہیں | ۱۰ |
| کبھی کبھی | ۱۵ |

# اے فریب خوردہ شاہین

طاہر اسحاق

- جب نوعِ انسانی کو ظلم و جور کی چکی میں پیسا جا رہا ہو۔
- جب انسان کو خون سے نہلایا جا رہا ہو
- جب مذہب و اخلاق اور تہذیب و انسانیت کا دیا ٹمٹما رہا ہو
- جب انسان پر انسان کی خدائی مسلّط ہو۔
- جب عصمتوں کے آبگینے سرِ بازار پاش پاش ہو رہے ہوں

جب پوری دنیا بدکاریوں کی عفونت سے معمور ہو۔

- جب کفر اور ظلم کی تیرہ شبی مسلّط ہو۔

اور

- جب مظلوم و ستم رسیدہ انسانیت جدا جدا ہزار تہذیبوں کے لگائے ہوئے زخموں سے جاں بلب ہو

کیا اس وقت بھی

ہم

پاکستان کے مذہبی رہنما بھی باشعور اور روشن خیال نوجوان

رقص و سرود اور طاؤس و رباب کے ہنگاموں میں مست رہیں گے؟

مے و معشوق جواں سال سے شغل کرتے رہیں گے؟

عیش و عشرت کے گیت گاتے رہیں گے؟

نفس کی پوجا میں مشغول ہو کر زندگی کے تمام تر بلند مقاصد کو فراموش کر دیں گے

ہم سرمایہ دارانہ جمہوریت اور روس کی غلام ساز اشتراکیت کا بُت تعمیر ہوتے دیکھیں گے اور خاموش رہیں گے؟

- یہ بھول جائیں گے کہ یہ مُلک اسلام کی مقدّس امانت ہے جس میں ہم نوجوانوں کو [illegible] آرزوؤں کو پروان چڑھانا ہے؟

- صرف زرتار آنچلوں کے سایوں کا تعاقب کریں گے۔ نقرئی قہقہوں کو فردوسِ گوش بنائیں گے گیسوؤں کے پیچ و خم میں اُلجھے رہیں گے؟

نہیں

- ہماری منزل چرخِ نیل فام سے پرے ہے۔
- ہماری دنیا ستاروں سے بھی آگے ہے۔
- پاکستان کا حصول ہماری منزل نہیں ـــــ اس کا پہلا سنگِ میل ہے
- ہمیں اس سرزمین میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنی ہے۔
- ہمیں یہاں ایک نئے نظام کا تجربہ کرنا ہے جو انسانیت کو ظلم و جور، فساد اور جنگ سے نجات دلائے۔
- ہمیں یہاں وہ نیا انسان پیدا کرنا ہے جس کے لیے اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک مدّت سے چشم براہ ہے۔
- ہمیں اپنی پرانی ذہنیتوں، اپنے سوچنے کے پست یا افتادہ طریقوں اور اپنے قدر و قیمت کے فرسودہ پیمانوں کو یکسر تبدیل کر دینا ہے اور اسلام کی اخلاقی قدروں پر سوسائٹی کی تعمیرِ جدید کرنی ہے۔
- ہمیں ظلم اور جور الحاد اور دہریت کی تاریکی دور کر کے عدل و انصاف اور خدا ترسی و خدا پرستی کی روشنی پھیلانی ہے۔
- انسان پر انسان کی خدائی ختم کر کے خدائے واحد کی حکومت قائم کرنی ہے

اور اس مقصد کے لیے

- ہمیں اسلام کے اصولوں کے محور پر منظم ہو کر پیہم اور مسلسل جد و جہد کرنی ہے گیا
- پاکستانی شاہین کے بازو میں ان بلند فضاؤں میں پرواز کرنے کا دم خم باقی ہے!

# علم کی شمع

عبدالرشید (متعلمہ علوم اسلامیہ)

کیا نصابوں میں اٹھا علم ہے، سمندروں میں تیرا علم ہے۔ یہ سب صحیح مگر میں تو علم اسے کہوں گا جو انسان کے جسم و ذہن کو جھکا دے اور وہ علم یہ ہے ۔ ۔ ۔

- علم معراجِ خداوندی کا وہ زینہ ہے جو اہلِ نظر ہی آسکتا ہے اس کا قرب تاریکی میں روشنی کے مانند ہے۔
- علم معراجِ انسانیت، گنجینۂ اخلاق اور لازوال دولت ہے
- علم ایسا لوز ہے جس سے سب مستفید ہو سکتے ہیں لیکن اس کے حصول کے لیے پروانوں کی طرح جلنا اور لُٹنا ضروری ہے
- علم ایسا پھول ہے جو کبھی مرجھاتا نہیں اور ہمیشہ خوشبو دیتا رہتا ہے
- علم گہرا پیدا کنارہ ہے جس میں آسمان اور زمین کی وسعتیں پنہاں ہیں
- علم ایسا کنواں ہے جس کا پانی جتنا پیو اتنا ہی بڑھ جاتا ہے
- علم ایک ایسا نور ہے جو روح کو ایک الوہی روشنی سے منور کر دیتا ہے
- علم ایک ایسی شئے ہے جو انسانی ذہن کے بند دریچوں کو کھول کر انسان کو باشعور بنا دیتا ہے
- علم ایک ایسا خزانہ ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد کسی اور چیز کی طلب محسوس نہیں ہوتی
- علم وہ قوت ہے جو انسان کو مطالعۂ حیات سے نوازتی ہے اور انسان کی دنیوی و اُخروی فلاح کا سامان مہیا کرتی ہے
- علم شاہدِ مستقبل کا دارو ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ

# انقلاب اور نوجوان

کہتے ہیں ـــــــ جوانی نام ہے فکر جوانی کا، ولولوں میں ہیجان کا، خون میں گرمی و حرارت کا، خیالات میں انقلاب کا، رگ رگ میں جذبۂ مقابلی کا، ارادے میں پہاڑ کی مضبوطی کا، بازوؤں میں توانائی کا، چال میں موجوں کے تلاطم کا، سانسوں میں گرمی کا، نگاہوں میں برق سامانی کا، دل میں جوش کا، اور جوانی نام ہے سرگرمی کا، مصروفیت کا، جد و جہد کا، سخت کوشی کا، سرفرازی کا، عزم و استقلال کا، اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا ــــ"

ذرا تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں کہ نوجوانی نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں ح؟(ن)

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک یا خطے میں جب جب انقلاب آیا ہے اس انقلاب میں اس ملک کے نوجوانوں کا ایک اہم رول رہا ہے بات چاہے اسلامی انقلاب کی ہو۔ اشتراکی انقلاب کی، ہر جگہ نوجوان ہی ریڑھ کی ہڈی سے دکھائی دیتے ہیں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو آمریت اور تنا است ا ہی کے جنگل سے نکال کر ایک الہٰی حدنگ کے زیرِ سایہ اسلامی انقلاب کا پرچم بلند کیا تھا، جب فرانس میں ۱۷۸۹ء میں روسو (RUSSE AUE) اور والٹیر (VOLTAIR) کی قیادت میں انقلاب لانے کی کوشش کی گئی تھی، جب ۱۹۱۷ء میں روس میں مارکس (MARX) اور اینگلز کی سائنٹفک تعلیمات کی بنیاد پر سرخ انقلاب آیا، جب ۱۹۴۸ء میں چین میں لال ماؤ کی قیادت میں چین کا دو تہائی حصہ لال انقلاب سے لال ہو گیا، جب ۱۹۶۰ء کے اوائل میں موجودہ ملک گھانا کے بانی ڈاکٹر کوامے نکرومہ (Dr KWAME NKRUMAH) کو آمریت کی آغوش میں جانے سے روک دیا گیا، جب ۱۹۶۲ء کے اواخر میں انڈونیشیا میں تا زندگی صدارت کا کرسی پر براجمان رہنے کا عزم رکھنے والے ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو کو اپنے آمرانہ نظام کی بنا پر ملکی سیاست کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا گیا، جب بیسویں صدی کے فرانس کے بانی اور جنگ عظیم دوم کے زمانہ کے رہنما بھی فرانس میں جنرل ڈیگال (GENERAL DE GAULLE FRANCE) کو ناسودگی کر نوجوانوں نے بے دخل کر کے پیرس سے نکال کر

ـ تھی جو ہا پڑا، اس وقت بھی یہی نوجوان ایک اہم رول ادا کر رہا تھا اور چند دنوں پہلے ہمارے مادرِ وطن میں جب جمہوریت کے نام پر جمہوریت کا گلا گھونٹا جا رہا تھا اور ملک آمریت کے آہنی شکنجوں میں کسا ہوا تھا، اس وقت بھی نوجوانوں نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے بزرگوں کی قیادت میں ایک عظیم جنگ لڑی اور ہندوستان ان ناپاک ارادوں اور عزائم رکھنے والوں سے ایک بار پھر آزاد ہو گیا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سو برس میں ہندوستان کو دو بار آزادی کی جنگ لڑنی پڑی۔ ایک بار ۱۹۴۷ء میں غیر ملکی سامراجی طاقتوں سے اور دوسری بار اپنے ملک کے سامراجی اور آمرانہ ذہنیت رکھنے والوں سے۔

لیکن کیا اب ـــــ کا نوجوان بیٹھ جائے، آرام کرنے لگے؟ ـــــ کیا یہ جیالوں کی منزل مل چکی ہے؟؟ ـــــ کیا ایک صحت مند اور صالح معاشرہ کے قیام کا خواب پورا ہو چکا ہے؟؟؟ ـــــ نہیں! ہرگز نہیں! یہ ابتدائی کوشش تو ایک عظیم اور ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ ہے، یہ تو ایک بڑے کام کے لیے زمین کی تیاری ہے۔ ہم نوجوانوں کو اس عظیم اور ہمہ گیر انقلاب کی جانب پیش قدمی کرنی ہوگی اور ایک عظیم انقلاب کے لیے عظیم جد و جہد کرنی ہوگی اور تاریخ کے اس تسلسل کو برقرار رکھنا ہوگا جسے ہر زمانے میں ہر دور کے نوجوانوں نے علم و سرکشی سے پنجہ آزمائی کر کے قائم رکھا ہے۔

اس مرحلے میں ہم نوجوانوں کو سوچنا چاہئے کہ یہ ہمہ گیر انقلاب کیسا ہوگا، کیسے آئے گا اور ہمارا رول اس میں کیا ہوگا؟ معلوم انقلاب کی حقیقت سے ہمیں واقف ہونا چاہئے۔ مقصد منزل کے تعین کے بغیر کوشش و کار رائیگاں جاتی ہیں مگر سا اتفاقات مصروفِ ملک تماشہ بن جاتی ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے مقصد سامنے آئیں اور منزل کا واضح تصور ضروری ہے۔ لیکن جب مقصد اور منزل متعین ہو، مطلوبہ انقلاب کی حقیقت و ماہیت سے پوری آگاہی ہو تو پھر توقف اور انتظار جمود اور تعطل ایک فضول چیز ہے، گزرتے ہوئے وقت کی تاخیر سے منزل کی دوری ہے۔ ہمیشہ کہ انقلاب کا انتظار کرنا بوڑھوں کا کام ہے، انقلاب لانا نوجوانوں کا کام ہے۔ نوجوانوں کے دل میں پروان چڑھ کر آتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے نوجوان دوستوں سے کلیم زبان میں کہنا چاہتا ہوں کہ

کس انقلاب کی اب تک انتظار ہے اگر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ت ... اپنے طالب علم ساتھیوں کے واقعات ... ساتھیوں کو کھو کا
... احساس بیدار کرنے کے لیے، شاید مہمیز لگا سکیں۔ (محور)

## سقوط ڈھاکہ کا باب

# طلبہ لہو رنگ ہوگئے

**راجشاہی** کے علاقے میں پاکستانی فوج اور البدر کے رضاکار بہت بے جگری سے لڑے۔ وہاں بھارت کی فوجیں ایک ایک انچ زمین کے لیے خاص ... ہتھیار ڈال دینے کے بعد بھی پاکستانی جوان کھا دیو ڈٹے رہے۔ ۱۸ دسمبر کو جنرل بیاری اور اروڑا اخشی پہنچے اور پاکستانی جوانوں نے بادل نخواستہ ہتھیار ڈال دیے۔

البدر کے رضاکاروں میں راجشاہی یونیورسٹی کا ایک طالب علم عبدالسلام بہت سرگرم تھا ... سے مکتی باہنی والے سب نقصان اٹھا رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنگ کے دوران میں مکتی باہنی کے حوصلے ٹوٹتے جا رہے تھے کیونکہ بھارتی ساری مدد آگے بڑھنے کے لیے ... ان کو آگے بھیج دیتے تھے اور ادھر پاکستانی فوج اور البدر والے ان کو ماری مار میں لگا رہی تھی ... سرکردہ لیڈروں نے عبدالسلام کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ... ہتھیار ڈالنے کے ... عبدالسلام ایک گلی کے موڑ پر اچانک ان کی طرف دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی کشتی ... قتل ہونے والی تھی کہ ... سے دو کشتیاں آئیں ... اور کے تمام راستے بند کر دیے۔ ... کا چہرہ خون کا پانی سے جدا کیا تھا، انھیں جب کشتیاں قریب سے گزریں تو ... رضاکار نے عبدالسلام کو پہچان لیا، چنانچہ دونوں لڑکے ان کے ہتھے چڑھ گئے۔

کشتی سے اتارنے کے بعد جو کرار دونوں نے دونوں لڑکوں پر ایک طرح کا عذاب نازل کر ... عبدالسلام کے کپڑے اتار دیے گئے، اور اس کی ننگی پیٹھ پر بلیڈ سے زخم لگائے گئے اور ان میں نمک ... انگلیوں کے ناخن میں سوئیاں ٹھونک دی گئیں۔ مختلف عذاب کے حربوں پر ... رات ... اسی عذاب میں گزرے، پھر ... لڑکوں نے انہیں ختم کر دینے کا فیصلہ کیا ... دوسرا ... رضاکاروں نے مخالفت کی اور کہا انہیں جان سے مار دینے سے کیا ملے گا ... رات ... اندھیرے میں انہیں چھوڑ دیا گیا۔

... عبدالسلام کئی دن ... سے گزر رہا تھا ... دوسری طرف اس کے گھر ... چکی تھی۔ مکتی باہنی کا ایک گروہ اس کے گھر ... کے دو بڑے بھائیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ پہلی رات ان سے عبدالسلام کے متعلق پتہ ... انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ پھر دھمکی دی کل تک عبدالسلام کو ہمارے حوالے نہ کیا، انہیں ... اور پھر صبح کا انتظار کیے بغیر انہیں بے دردی سے قتل کر دیا۔ ایسے ایک ہم جماعت ... عبدالسلام اپنے گاؤں پہنچا، چار روز سے گھر میں رکھا گیا تھا ... جلد ... کیا ... اطلاع ملی کہ مکتی باہنی کے رضاکار اسے پکڑنے کے لیے ادھر آ رہے ہیں، چنانچہ

وہ اسی حالت میں گھر سے جنوب کی طرف کو دوڑا اور ایک اور گاؤں میں پناہ لی۔ مکتی باہنی کے رضاکاروں نے گھر کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی لی۔ عبدالسلام کو نہ پا کر وہ غصے سے بے قابو ہوگئے۔ گھر میں عبدالسلام کا چھوٹا بھائی تھا جو ششم جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے اور بعد میں اس کے جسم کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالا۔ عبدالسلام کو ... اور ساتھ ... اس کی کوئی خبر نہ مل سکی، مگر حالات معلوم ہونے ... پھر حوصلہ دیا اور ... چھپ چھپا کر ... ہو سکے گا ... تاریخ اس کی ہمت، مردانگی اور شجاعت پر فخر کرتی رہے گی۔ وہ زندہ ہے اور جب تک ایسے نوجوان زندہ رہیں گے حق کا چراغ فروزاں رہے گا۔

صدر علی ڈھاکہ اس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان کا چھوٹا بھائی سکندر البدر میں تھا۔ مکتی باہنی ان دونوں بھائیوں کے تعاقب میں تھی۔ ... دسمبر کا دن نکلتے ہی ان کی تلاش شروع ہوگئی۔ انہوں نے رات ہی کو ایک رشتہ دار کے ہاں پناہ لے لی تھی۔ مکتی باہنی کو اس کی خبر مل گئی اور گھر کا محاصرہ کر لیا۔ دونوں بھائی پکڑ لیے گئے، پھر رضاکار انہیں کھینچتے ہوئے شاہراہ پر لے آئے۔ یہ سڑک گورنر ہاؤس کو جاتی ہے۔ پہلے ان دونوں کی داڑھیاں اور بال مونڈ دیے گئے، پھر ان کے چہروں پر سیاہی مل دی گئی۔ اس کے بعد چاروں طرف سے لوگ جمع ہوگئے اور انہیں جوتے مارنے لگے۔ چار دن تک یہی ذلت جاری رہی۔ صبح سویرے انہیں سڑک پر لے آتے اور راہ چلتے لوگ ان کے سروں پر جوتے مارتے اور گندگی پھینکتے۔ پانچ روز تک کھانے کو کچھ نہ دیا۔ نقاہت سے آنکھیں باہر کو نکل آئیں اور چہرے پر ورم آگیا۔ چھٹے روز انہیں پھر ان کے ... سامنے لے گئے۔ ان کے جسم بالکل ... پڑ چکے تھے مگر ... کی آتش انتقام سرد ہونے میں نہ آتی تھی۔ پھر صدر علی نے مسجد کے سامنے دم توڑ دیا اور ان کے بھائی سکندر کو گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد لاشوں کو جانوروں کی طرح ... اور انہیں گھسیٹتے ہوئے ... لے آئے۔ وہاں ایک گڑھا کھودا اور دونوں کو اس میں ڈال دیا، اوپر سے مٹی پھیلا دی، مگر ان کے ہاتھ اور پاؤں باہر نکلے رہے۔

... ان علاقوں میں سے ایک ہے جہاں بھارتی فوجوں نے سب سے پہلے قدم رکھا۔ اس علاقے میں پاکستانی فوج، دسمبر کو پسپا ہوگئی تھی۔ ڈھاکہ سے ربط قائم نہ رہنے کی وجہ سے صحیح صورت حال کا اندازہ ... کے بعد ... البدر کے ایک رضاکار نے ۹ دسمبر کو ... سے اطلاع دی کہ ... دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اسی ... کا ایک طالب علم محمد الیاس

باغیوں کے خلاف بہت سرگرم رہا تھا۔ وہ البدر کے غیر معمولی فعال اور مستعد قائدین میں سے تھا۔ اُس کی بہادری میں رضاکار بھارت کی سرحدوں میں نکل جاتے تھے، رات کے اندھیرے میں دشمن کو شدید نقصان پہنچاتے۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے مکتی باہنی اس نوجوان کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ دسمبر کی تمام کرامات فوجیں بھی میں، اصل ہزیمت محمد الیاس اپنے ایک ساتھی عبدالخالق کے ساتھ شہر سے بہادت کی طرف روانہ ہوا۔ دس میل کی مسافت طے کر کے ابھی وہ پہنچے ہی تھے کہ مکتی باہنی نے آ لیا۔ وہاں قریب ہی ایک سکول تھا جس میں بھارتی فوجیوں نے اپنا کیمپ قائم کر لیا تھا۔ الیاس اور خالق اس ... دن کے لئے میں تھے۔ مکتی باہنی نے خالق صاحب کو ... لڑکوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے انتہائی شرمناک انداز میں انہیں مارا پیٹا اور سرعام رسوا کر دیا۔ الیاس سے وہ نئے نئے طریقے سے انتقام لینا چاہتے تھے، چنانچہ اس جری نوجوان کو ایک ٹرک کے ساتھ اس طرح باندھا گیا کہ اس کا سارا دھڑ سڑک کو چھوتا تھا۔ اس حالت میں ٹرک اسٹارٹ کیا گیا اور الیاس کئی میل تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ سڑک پر مسلسل گھسٹنے کی وجہ سے اس کا جسم لہولہان ہو چکا تھا اور تمام خون آنکھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ جبکہ دس میل کے فاصلے پر تھا اور ٹرک تیز رفتاری پر دوڑ رہا تھا۔ الیاس کی چیخیں سن کر مکتی باہنی والے قہقہے لگاتے اور کہتے:

"پاکستان کے حامیو! مدد کے لیے پکارو"

یہی پیچھے ہی الیاس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ بالکل بےحس و حرکت پڑا تھا اور تماشائی اس پر ظلم کے نت نئے طریقے آزما رہے تھے۔ پھر انہوں نے نیم مردہ حالت میں اسے اٹھا کر بٹھایا اور اس کی پشت پر جلتے ہوئے سگریٹ سے "جے بنگلہ" کا نعرہ لکھا اور دو دن تک مسلسل اسی طرح تڑپتے رکھا تاکہ ایک عالم ان کے مظالم کا نظارہ کر لے۔ اس کے بعد الیاس کی دونوں آنکھیں نکال لی گئیں۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہا، مگر اس نے کوئی انکار کیا نہ اپنے باطن پر کسی قسم کی ندامت کا اظہار کیا۔ پھر اسے گولی مار دی گئی اور اس کی لاش چار دن تک بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکائے رکھی۔ الیاس کے پانچ بھائی تھے، ان میں سے چار طرح طرح کی اذیتیں دے کر ختم کر دیے گئے۔

الیاس کے ساتھی عبدالخالق کی ابھی رہ گئی تھی، چنانچہ ان کے ایک ہم جماعت نے انہیں درندوں سے بچا لیا۔ وہ انہیں اپنے گاؤں لے گیا۔ ان کے گھر سے دو فرلانگ کے فاصلے پر دھان کا سب سے بڑا ڈھیر جمع تھا۔ اس میں عبدالخالق کو چھپا دیا۔ رات کے بارہ بجے انہیں ... سے نکالا جاتا، آدھ گھنٹے تک وہ تازہ ہوا کھاتے اور پیٹ کا ایندھن بھرتے اور پھر صبح جیسی تاریک ... جانے سے پہلے ... چلے جاتے۔ مکتی باہنی والے ان کی تلاش میں کئی بار آئے، اس ڈھیر کے پاس سے بھی گزرے، بلکہ ایک دفعہ تو انہوں نے وہاں کئی گھنٹے قیام کیا۔ عبدالخالق پر وہ چند گھنٹے قیامت کے سے گزرے۔ پھر وہ چلے گئے، مگر خالق صاحب ... ماہ تک فطرت کی آغوش ہی میں لیٹے رہے۔

ڈھاکے میں البدر تنظیم نے شہریوں کی جان و مال اور آبرو بچانے کی عظیم الشان کوششیں کیں، ان کا ذکر ہم کسی وقت تفصیل سے کریں گے۔ اگر یہ تنظیم بروقت منظم ہو جاتی اور اسے جدید ترین اسلحہ بروقت مل جاتا تو سابق مشرقی پاکستان کا بڑا حصہ اس عذاب سے محفوظ رہتا جس سے وہ ۱۶ دسمبر کے بعد گزر رہا ہے۔ ڈھاکے میں زندگی معمول پر تھی، جس میں پاکستانی فوجیوں کے ساتھ ساتھ البدر کے رضاکاروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ تنظیم اگر سرے سے موجود نہ ہوتی تو مکتی باہنی بہت پہلے ڈھاکے کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی ہوتی۔ اس شہر میں البدر کے ڈپٹی کمانڈر مصطفیٰ شوکت عمران تھے۔ انہیں کیسی کیسی اذیتیں دے کر شہید کیا گیا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ہم یہاں ان کی ایک کمپنی کے نائب قائد جناب مصطفیٰ کمال کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ انٹرمیڈیٹ دوسرے سال کے طالب علم تھے، پُرجوش اور پُرعزم۔ ۱۶ دسمبر کی قیامت صغریٰ کے بعد اُس نے چند روز کے لیے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، پھر تبلیغی جماعت کے ایک گروہ کے ساتھ ڈھاکے سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ سب کے سب ایک مضافاتی بستی کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے دیہاتیوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ وہ جدید اسلحے سے مسلح تھا اور جوش سے رقص کر رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے بھانپ لیا کہ مکتی باہنی والے آ پہنچے۔ ان کی نظروں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس کے کالج کے دو لڑکوں نے اُسے پہچان لیا اور چیخ اٹھے: "وہ ہے مصطفیٰ کمال"۔ تبلیغی افراد کی موجودگی میں مکتی باہنی کے خونخوار لٹیروں نے مصطفیٰ کمال کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ پہلے اس کی انگلیاں کاٹیں اور ان سے خون چوس کر اسے اپنے چہرے پر مل لیا، پھر اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس کا سینہ چیرنے کے لیے اسے زمین پر لٹا دیا گیا۔ ایک سنگدل نے اُس کی آنکھیں نکالنے کا مشورہ دیا۔ اس پر مکتی باہنی کے مابین تکرار شروع ہو گئی۔ ادھر مصطفیٰ کمال ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک مسلمان نے ترس کھا کر گولی داغ دی اور یوں اس نوجوان کی روح قیدِ حیات سے نجات پا گئی۔

ڈھاکے میں قانون کا ایک طالب علم ابوالحسن تھا۔ ٹولا بیکا اگر ملا کا رہنے والا۔ البدر تنظیم میں بہت سرگرم اور مستعد تھا۔ اس کا گھر شانتی نگر میں تھا۔ اس علاقے میں مکتی باہنی کا بہت زور تھا۔ ۱۶ دسمبر کو ابوالحسن کیمپ چھوڑ کر اپنے محلے شانتی نگر میں چلا گیا۔ دراصل ہتھیار ڈالنے کی افواہیں ... سے گشت کر رہی تھیں مگر فوج کے ذمہ دار افسر اس کی تصدیق نہ کرتے تھے۔ پھر سارا کام اتنی جلد بازی میں ہوا کہ فوجی حکام البدر کے کمانڈر کو وقت سے پہلے مطلع بھی نہ کر سکے۔ اسی لیے ۱۶ کی شام سے ذرا پہلے البدر کے کیمپ سے رضاکار مختلف سمتوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ ابوالحسن اپنے گھر چلا آیا جو دشمنوں کے اندر گھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے محلے میں قدم رکھا ہی تھا کہ مکتی باہنی والے چیلوں کی طرح جھپٹے اور پھر گِدھوں کی طرح نوچنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ابوالحسن کے جسم کا ہر رواں سختی کریں گے تو سب کچھ اُگل دے گا، مگر وہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ وہ مار مار سے بےہوش ہوا اور ایک دفعہ تو اُسے مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا، مگر اس کی قوت ارادی پھر حرکت میں آئی۔ اس کے بازو اس طرح چھیل دیے گئے جس طرح قصاب جانور کا گوشت چھری سے کاٹتا ہے۔ ابوالحسن بہت اہم لڑکا تھا، اس کے سینے میں سینکڑوں راز تھے۔ اگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نکل جاتا جس سے دشمن اس کے ساتھیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتے تو سینکڑوں کام کے آدمی دھر لیے جاتے۔ سارا ستم ہر تکلیف برداشت کرتا رہا، پھر اس کی آنکھوں نے اپنے ہاتھ جسم سے جدا ہوتے دیکھے، جسم کے نازک حصوں پر جلن اور سوزش بڑھتی گئی اور اُس نے اپنے مکان کے سامنے انتہائی بےبسی میں جان دے دی۔

محبوب الرحمٰن ڈھاکہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس نے پاکستان کے تحفظ کی جنگ میں دل و جان سے حصہ لیا تھا۔ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تو وہ فرار ہو کر اپنے آبائی گاؤں مداری پور ضلع فریدپور چلا گیا۔ چونکہ اس کے کارہائے نمایاں سے سبھی واقف تھے، اس لیے اُسے مداری پور ہی میں مکتی باہنی نے پکڑ لیا۔ عمر اس کی بیس بائیس سال کی تھی۔ بہت خوبصورت اور بہادر تھا۔ ظالموں نے اس سے بہت بُرا انتقام لیا۔ دونوں رخسار کاٹ دیے اور گلے چیر دیے۔ اس جوان ہمت لڑکے نے یہ سب پر آپریشن بڑے سکون سے برداشت کیا۔ پھر اس کے کان اکھیڑے اور پورے شہر میں گشت کروایا۔ دو روز تک بھوکا رکھا۔ تیسرے روز مجمع لگایا اور محبوب الرحمٰن کے منہ میں چاول کے لقمے ٹھونس دیے۔ وہ سارے کے سارے کٹے ہوئے رخساروں میں سے نکل گئے تو دشمن خوشی سے چلائے اور سارا دن یہی کھیل کھیلتے رہے۔ پھر رات کے وقت زخموں پر نمک اور مرچیں چھڑک دیں۔ رہبر ظلم کے آثار پر یہی کہتے: "جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ اور پاکستان کو گالی دو۔" محبوب الرحمٰن ہر بار سر ہلا کر ان کی مرضی کے آگے جھک جانے سے انکار کر دیتا۔ اگلی صبح مداری پور کے چند بھلے لوگوں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ دل کتنے ہی پتھر ہوں اور نفرت کا زہریلا مادہ کتنا ہی زیادہ ہو، انسانیت کی رمق اُبھر ہی آتی ہے۔ آپس میں تکرار شروع ہو گئی۔ ادھر محبوب الرحمٰن کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ آخر ایک لڑکے نے بندوق سے فائر کر دیا اور محبوب ابدی نیند سو گیا۔

مداری پور میں سترہ سالہ لڑکا عصمت علی کا رکن تھا اسے مکتی باہنی نے پکڑ لیا اور کچھ پوچھے بغیر ظلم و تشدد کا کوڑا برسانا شروع کر دیا لڑکا بہت اور جری تھا مار کھا کر نعرۂ تکبیر بلند کرتا اور بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھتا اس پر مکتی باہنی والے سخت گھبراتے اور ان کے اوسان منتشر ہو گئے۔ جب وہ مار مار کر تھک گئے تو ان کے کمانڈر نے اس لڑکے سے کہا

"اگر تم اعلان کر دو کہ میں نے جو کچھ کیا، غلط کیا اور میرا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔"

لڑکے نے کراہتی ہوئی آواز میں جواب دیا؛

"ظالمو! میری موجودگی میں یہ کیا بک رہے ہو میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض ادا کیا پاکستان میری روح ہے، میری جان ہے میں اسے کیونکر چھوڑ سکتا ہوں ہاں اگر تم میرے ہاتھ پہلے لگ جاتے تو میں تمہیں ضرور ختم کر دیتا ہمارا ایک دوسرے سے صرف دین کا رشتہ ہے جس نے ہمارے دین سے انحراف کیا ہم اس سے لڑیں گے۔"

یہ جواب سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا؛

"ہم تمہیں ختم کرنے والے ہیں، تمہاری کوئی آرزو ہے تو بیان کر دو۔"

"مسلمان کی ایک ہی آرزو ہو سکتی ہے اور وہ ہے شہادت میں اسے لبیک کہتا ہوں۔"

آخری فقرہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ چار گولیاں اس کے جسم میں داخل ہو گئیں۔

ہم آخر میں مصطفیٰ شوکت عمران کی ابدی زندگی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا تعلق نواکھلی سے تھا اور بچپن ہی سے ان کا رجحان دین کی طرف تھا نواکھلی میں علمائے دین بہت کثرت سے ہیں مگر عجیب بات ہے اسی علاقے میں لادینی قوتوں نے بہت زور پکڑا اور نکسل باڑی تحریک کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں۔

عمران کے والد عوامی لیگ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے باپ اور بیٹے کے مابین نظریاتی ہم آہنگی نہ تھی۔ عمران ڈھاکہ میڈیکل کالج میں پانچویں سال کے طالب علم تھے، بہت ذہین اور سمجھدار۔ ان کے بارے میں عام مشہور تھا کہ امتحان میں نقل کے بغیر پاس ہوتے ہیں۔ مطالعۂ قرآن کے ساتھ خاص شغف تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے وسط میں البدر منظم ہوئی تو عمران پاکستان کی بقا کی جنگ میں کود پڑے۔ البدر کے انٹیلی جنس سیکشن سے ان کا تعلق تھا اور فوج کے اعلیٰ افسروں سے گہرے مراسم تھے۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی کا دیا ہوا شناختی کارڈ ان کے پاس تھا۔ ڈھاکہ میں آخری دنوں میں کرفیو لگا اور گھروں کی تلاشی لی گئی تو اس میں عمران بہت نمایاں تھے۔

۱۴ دسمبر کو فوج نے ابھی باقاعدہ ہتھیار ڈالے نہیں تھے کہ مکتی باہنی نے البدر کیمپ پر حملہ کر دیا اس وقت عمران وہیں موجود تھے اور اپنے ساتھیوں کو نکالنے میں سرگرمی سے مصروف رہے تھے۔ جب مکتی باہنی کے مسلح رضاکار سر پر آ گئے، تو انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی کوشش کامیاب بھی رہی، مگر ایک گولی نے ان کے ہاتھ کو زخمی کر دیا تھا بچتے بچاتے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ بدقسمتی سے ان کا بہنوئی روس نواز کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا گھر کے اندر گھٹن اور باہر موت کے بادل چھائے رہے، خون مسلسل بہہ رہا تھا بہن کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑے، البتہ ایک چٹ چھوڑ گئے کہ ہولی فیملی ہسپتال جا رہا ہوں۔ ان کے چلے جانے کے آدھ گھنٹے بعد مکتی باہنی گھر پہنچ گئی انہوں نے کونے کونے کی تلاشی لی لیکن عمران کہیں نظر نہ آیا مکتی باہنی کے ایک رضاکار کی نظر چٹ پر پڑ گئی وہ فوری طور پر ہسپتال پہنچ گئے زخمی عمران کو بستر سے کھینچا اور پکڑ کر اپنے کیمپ میں لے گئے۔

عمران پر تشدد کی داستان بہت لرزہ خیز اور دردناک ہے۔ ان کا تعلق چونکہ البدر کے شعبہ سراغ رسانی سے تھا اس لیے مکتی باہنی والے ان سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سینے پر جے بنگلہ کا نعرہ کھدوا دیا گیا اور جسم کے مختلف حصے تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیے گئے۔ ظلم کے جواب میں ان کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری رہا۔ اذیت کی تاب نہ لا کر عمران بے ہوش ہو جاتے، مکتی باہنی والے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے اور جونہی ہوش آتا، تشدد کا عمل جاری ہو جاتا۔ چاروں دن جاں کنی میں گزر گئے اور جب عمران کی زبان سے اپنے کسی ساتھی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ نکلا، تو پانچویں روز انہیں گولی مار دی گئی۔

خون جواں لالہ و گل میں نمایاں ہو گیا

اور میت کو چوراہے میں ایک درخت پر لٹکا دیا ___

چاند ستارہ سرنگوں تھا ___

مگر چاند ستارے کا بیٹا ___

سوہنی دھرتی کا ویرانہ تھا لہرا رہا تھا ___

---

## بقیہ : اسلام کا نظریۂ تعلیم

سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ۴۱۰ھ (مطابق ۱۰۱۹ء) میں قائم کیا۔ بقول ابوالقاسم فرشتہ "مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔" محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے اور اس کے وزرا اور دوسرے امرا، ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں اقدام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔

اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا جال بچھ گیا۔ ان میں ایسے ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے، اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی تھی۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفرما تھے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

# "عہدِ سعادت" اور تعلیم

پروفیسر سعید احمد (سعدیات)

حضرت انسان کی آفرینش سے لے کر آج تک کے طویل دور میں ہم جس عہد کو
— عہدِ سعادت —
قرار دیتے ہیں وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔

اوّل : عہدِ نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)

دوم : عہدِ خلافتِ راشدہ

اس "عہدِ سعادت" میں تعلیم کے بارے میں ہمارے بزرگ پروفیسر سعید احمد صاحب نے مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا جو ہم تبرکاً ان کی یادداشت اور ان کی یاد دلانے کے لیے ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ (مدیر)

## عہدِ نبوی میں نظامِ تعلیم (۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایامِ جاہلیت کی شاعری کے مطالعے سے عربوں کے حُسنِ ذوق، قادر الکلامی اور فصاحت و بلاغت کا پتا ہمارے سامنے آتا ہے اور ان کی کہانیوں، ضرب الامثال، خطبوں اور حکایتوں سے ان کی فراست و ظرافت کا ایک دلکش نقشہ نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور یہ بھی کہ عربوں کی زبان میں پڑھنے لکھنے کی چیزوں کے متعدد الفاظ ملتے ہیں، مثلاً قلم، قرطاس، مرقوم، مسطور، کاتب، مکتوب، صحف، زبر، اسفار وغیرہ لیکن اس تمام قابلِ قدر علمی و ادبی سرمایہ کے باوصف دورِ جاہلیت میں کسی باقاعدہ تعلیمی نظام کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اپنی مخصوص افتادِ طبع اور معین اندازِ تحقیق سے کام لیتے ہوئے مدینے میں یہودیوں کے ایک نیم تعلیمی ادارے "بیت المدراس" کا سراغ لگا لیا اور مکّے کے قریب قبیلہ ہذیل کے ابتدائی نوعیت کے بچوں کے مدرسے کی روایت ڈھونڈ نکالی لیکن یہ ایک تاریخی صداقت اور مسلّم ہے کہ طلوعِ اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں نہ باقاعدہ کوئی نظامِ تعلیم و تربیت مروّج تھا اور بعثتِ نبوی سے پہلے وہاں تعلیمی اداروں کا کوئی وجود تھا۔

ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک بڑا مقصد نہ صرف عربوں کو بلکہ ساری دُنیا کو علم و تمدن کی دولت سے مالا مال کرنا تھا۔ چنانچہ اسی لیے سیدالمرسلینؐ کو اپنے "معلّمِ کتاب و حکمت" ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اسی لیے عبداللہ بن عمرو بن عاص نے ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا کہ آنحضرتؐ ایک دن مسجدِ نبوی میں تشریف لائے اور صحابہ کرام کے دو حلقے دیکھے، ایک تلاوت و دعا میں مشغول تھا اور دوسرا درس و تدریس میں۔ آنحضرتؐ نے پہلے ارشاد فرمایا: "دونوں گروہ اچھے کام میں مشغول ہیں" پھر "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" کہہ کر علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔

## ارشاداتِ نبوی

آئیے ہم آپ کو یہ بتلائیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور اربابِ علم کی فضیلت ظاہر خود کیا متعین فرمائی ہے۔ اسی طرح علم کے کن مقاصد کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور کن مقاصد کو ناپسند ٹھہرایا۔ علم کی فضیلت کے بارے میں فرمایا:

- علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ (بیہقی)
- علمِ فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ (بیہقی)
- ہر مسلمان (مرد و زن) پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ (بیہقی)

○ علم حاصل کرنا، اس پر عمل کرنا اور اس کی اشاعت کرنا صدقہ ہے۔
○ ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرو۔ (مشکوٰۃ)

**عالم** اور **معلّم** کے بارے میں ہادیٔ اسلامؐ نے فرمایا:

○ جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو۔ (ترمذی)
○ بے شک انبیاء علماء کے وارث ہیں اور یہ یقین جانو کہ نبیوں نے کسی کو دینار و درہم کا وارث نہیں بنایا، بلکہ صرف علم کا وارث بنایا۔ (ترمذی)
○ خیر سکھانے والے (معلم خیر) کے لیے اللہ اور اس کے فرشتے آسمان والے اور زمین والے یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں اور مچھلیاں تک دعائے رحمت کرتی ہیں۔ (ترمذی)
○ قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی: انبیاء، علماء، شہداء (ابن ماجہ)
○ عالم اور متعلم دونوں اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہیں۔ (ابن ماجہ)

**طالب علم** کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سید العالمینؐ نے فرمایا:

○ جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے (ابوداؤد)
○ طالب علم کی راحت کے لیے فرشتے اس کے قدموں میں پر بچھاتے ہیں۔ (ابوداؤد)
○ طالب علم حصول علم کی حالت میں مرتا ہے تو شہید مرتا ہے۔ (مشکوٰۃ)
○ جس نے ایک طالب علم کی عزت کی اس نے ستر[۱] شہیدوں کی عزت کی۔ (مشکوٰۃ)

**عبادت** پر **علم** کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

○ بلاشبہ عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ مسلمان پر ہے۔ (ترمذی)
○ جو عالم فرض پڑھ کر لوگوں کو خیر سکھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے، اس کی فضیلت اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم پر ہے۔ (مشکوٰۃ)
○ علم میں اضافہ کرنا عبادت کی کثرت سے افضل ہے اور دینداری کی جڑ پرہیزگاری (ورع) ہے۔ (بیہقی)
○ شیطان پر ایک ہزار عابدوں کی بجائے ایک عالم بھاری ہے۔ (سیوطی)

**علم** کے پست مقاصد کے بارے میں آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا:

○ علم اس لیے حاصل نہ کرو کہ علماء پر فخر جتاؤ اور مجلس میں اونچی جگہ پر بیٹھو جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کے لیے دوزخ ہے
○ جس شخص نے علم اس غرض کے لیے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء سے مناظرہ کرے گا یا بے وقوفوں سے جھگڑے گا یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔
○ جس شخص نے وہ علم سیکھا جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے لیکن اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے گا تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو میسر نہ آئے گی۔

مزید برآں مثبت طور پر علم کے مقاصد عالیہ بھی قائد الانبیاءؐ نے خود ہی متعین فرما دیے:

○ جو کوئی میرا قول اس لیے نقل کرے گا کہ اللہ کا دین سربلند ہو، اس کا مقام جنت ہے۔
○ علم سیکھنے کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔
○ علم حاصل کرو کیونکہ اللہ کے علم کی تحصیل خشیت الٰہی ہے علم کی طلب عبادت ہے اور علم کا مذاکرہ تسبیح
○ اللہ تعالیٰ کو اپنے جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس میں تین وصف پیدا کر دیتا ہے: دین کا فہم[۱]، دنیا سے بیزاری[۲] اور اپنے عیوب کی پرکھ"

---

[۱] مسند امام احمد جلد ۳ صفحہ ۱۳۳ ، [۲] ابوداؤد

## فروغِ تعلیم کے لیے عملی اقدامات

عہدِ نبوی میں تعلیم کی اشاعت اور علم کے فروغ کے لیے جو عملی کام ہوا اس کا مختصر خاکہ ہم پیش کرتے ہیں:

دارِ ارقم[1] مکہ میں مسلمانوں کی پہلی درسگاہ تھی یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں مسلمان چھپ چھپ کر جمع ہوتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔ نبی کریم قرآن پاک کی کوئی آیت یا سورۃ نازل ہوتی تو انہیں پڑھ کر سناتے۔ یہیں حضرت عمرؓ[2] حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا یثرب میں مصعب بن عمیرؓ اور عبداللہ بن ام مکتومؓ ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس کی کوششوں سے مدینے میں دین کا نور اور علم کی روشنی پھیلنے لگی طیبہ میں ہجرت کے فوراً بعد سرورِ عالمؐ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو عبادت گاہ ہونے کے علاوہ اسلام کی پہلی عظیم درسگاہ تھی یہیں وہ چبوترہ تھا جو تاریخِ اسلام میں صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ تحصیلِ علم کی خاطر یہاں فروکش ہوئے وہ اصحابِ صُفّہ کہلائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی حضور اقدسؐ بذاتِ خود فرماتے تھے۔[3] مدینہ میں مؤرخینِ اسلام کے بیان کے مطابق نو دوسری مساجد تعمیر ہو چکی تھیں[4] جو عہدِ نبوی میں تعلیم و تدریس کے ذیلی مراکز کا درجہ رکھتی تھیں۔

## بچوں کی تعلیم و تربیت

پیغمبرِ اسلامؐ کو مسلمانوں کے بچوں کو علم و عرفان سے بہرہ ور کرنے کا بے حد خیال اور فکر تھا اسی لیے آنحضورؐ نے والدین کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں چند ارشاداتِ نبویؐ نقل کیے جاتے ہیں:

"اولاد اپنے والدین سے عمدہ تعلیم و تربیت کی مستحق ہے"[5]

"اولاد کے لیے والدین کا اچھا تحفہ اچھی تعلیم دلوانا ہے"[6]

مرد سے اس کے اہل و عیال کے بارے میں پوچھا جائے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد دونوں کے لیے جواب دہ ہوگی۔[7]

## اشاعتِ تعلیم

مسجدِ نبوی اس دور کی مرکزی درسگاہ تھی جو قبائل اسلام لاتے اسی دارالعلوم کا رُخ کرتے اور دین کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اسلام کی روشنی سے اپنے علاقے کو مستفیذ کرنے کا عزم و ولولہ لیے لوٹ جاتے۔ مورخینِ اسلام نے ایسے متعدد وفود کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے مثلاً بنی عامر کا وفد بنی تمیم کے قبیلے کے ستر اشخاص وغیرہ[8] جوں جوں اسلامی معاشرہ پھیلتا چلا گیا آنحضورؐ تعلیم و تربیت کے لیے معلمین مختلف علاقوں میں بھیجتے چلے گئے۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق نبی کریمؐ نے معاذ بن جبل کو اہلِ یمن اور حضرموت کے علاقوں کے لیے معلّم بنا کر بھیجا اسی طرح صحیح بخاری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کو دین کی باتیں سکھانے کے لیے عمرو بن حزم کو مامور فرمایا۔ یہ بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے قبائل قارہ و عضل کے لیے چھ معلّم مقرر فرمائے تھے۔

## نصابِ تعلیم

اس دور کے نصابِ تعلیم کے بارے میں ہمارے پاس تاریخی مواد بہت کم ہے؛ البتّہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ دینی علوم کے پہلو بہ پہلو رسول اکرمؐ نے بہت سے دوسرے علوم و فنون مثلاً علمِ ریاضی[9] مبادی طب[10] علمِ ہیئت[11] یا علمِ فلکیات، علمِ انساب[12]، علمِ تجوید اور فنِ خطاطی جیسے علومِ مفیدہ کو سیکھنے کی یا تو اجازت دی یا ان کی تحصیل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ علاوہ ازیں جسمانی صحت کو بحال رکھنے کے لیے نشانہ بازی، شہسواری، پیراکی اور کشتی کا فن سیکھنے کی اجازت دی۔ اگرچہ ان جملہ مضامین کی بیک وقت تعلیم کا کسی درسگاہ میں بھی انتظام نہ تھا۔

## علوم اضافی کی اہمیت

یہاں یہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں یہ طے فرما دیا تھا کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تدریس میں اوّلیت کن مضامین کو حاصل ہوگی۔ اسی طرح نصابِ تعلیم میں علوم کی اضافی اہمیت (ADDITIONAL IMPORTANCE) کا معاملہ ہمارے یہاں شروع ہی میں طے ہو گیا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ صہ ۱۳۲ ، [2] ابوداؤد [3] طبرانی [4] سیوطی [5] دیلمی [6] صحیح بخاری [7] ابوداؤد [8] جمع الجوامع (سیوطی)

[9] بحوالہ ابونعیم [10] بحوالہ ابونعیم

ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اصل علم تین چیزوں کا علم ہے آیتِ محکم، سنتِ قائمہ اور فریضۂ عادلہ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَۃٌ ۔ اٰیَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ اَوْ سُنَّۃٌ قَائِمَۃٌ اَوْ فَرِیْضَۃٌ عَادِلَۃٌ وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَھُوَ فَضْلٌ اس حدیث پاک میں آیتِ محکمہ سے مراد آیاتِ قرآنی ہیں، سنتِ قائمہ کے مفہوم میں آنحضرتؐ کی احادیث آتی ہیں اور فریضۂ عادلہ سے مراد فقہ یا فرائض دینیہ ہیں۔ ان تینوں علوم میں سے قرآنِ مجید کے علم کو افضل ترین قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ (تم میں سے افضل وہ ہے جو قرآن مجید سیکھے اور سکھائے۔)

## تعلیمِ نسواں

عہدِ نبوی میں تعلیم کے فروغ کے لیے آنحضرتؐ کی ازواجِ مطہرات آنحضورؐ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں لکھنا پڑھنا جانتی تھیں[1]۔ اور حضرت عائشہؓ تو اپنے وقت کی سب سے بڑی معلمہ تھیں جن کے بارے میں خود لسانِ نبوت سے یہ جملہ جاری ہوا "آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو۔" حضرت عائشہ کے علمی مرتبے کے بارے میں عظیم محدث امام زہری کا خیال ہے: اگر تمام صحابہؓ کا علم ایک پلڑے میں ہو اور عائشہؓ کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو عائشہؓ کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا۔

لیکن یہ معلوم رہے کہ اسلام نے "مخلوط نظامِ تعلیم" کی روایت کو کسی مرحلہ پر نہیں اپنایا۔ آنحضورؐ نے تو عورتوں کو نمازِ جمعہ، نمازِ جنازہ اور جہاد جیسے اہم فرائض سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے، تاکہ مرد و زن کا اختلاط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے اجتماع کے لیے ایک مخصوص دن مقرر فرما دیا اور یہ مدہ کا دن تھا۔ اس بارے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ مسجدِ نبوی میں عورتوں کے داخلے کے لیے دروازہ بھی الگ کیا گیا تھا۔ مسجدِ نبوی کا یہ دروازہ اب تک "بابُ النساء" کے نام سے موسوم ہے۔ اُمہات المومنینؓ کے علاوہ صحابیات کو بھی علمِ دین سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے: حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریمؐ کی خدمت میں ایک صحابیہ حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی باتیں مردوں نے خوب حاصل کر لی ہیں (اور ہم محروم رہی جاتی ہیں) لہٰذا اپنی طرف سے ہمارے لیے ایک دن مقرر فرمائیں جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ ان معلومات سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہیں ہمیں بہرہ مند کریں۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا "اچھا فلاں فلاں روز فلاں مقام پر تم جمع ہو جانا" چنانچہ مقررہ جگہ اور دن پر صحابیات جمع ہو گئیں۔ آنحضرت وہاں تشریف لے گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علوم میں سے بہت کچھ پہنچایا۔[2]

## شاگرد و استاد کے باہمی تعلق کی نوعیت

اس دور میں شاگرد و استاد کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ حضور اکرمؐ معلمِ اعلیٰ تھے۔ اکابر صحابہ تعلیم و تربیت کے فرائض کی انجام دہی میں ان کے معاون تھے۔ معلّمین شفیق تھے، رحیم تھے۔ شاگرد مؤدّب تھے، فرمانبردار تھے۔ استادوں کو حضورؐ کی نصیحت تھی "علم سکھاؤ اور سختی نہ کرو۔ معلّم شفیق سختی کرنے والے استاد سے بہتر ہے" نیز انہیں تاکید کی گئی تھی کہ لوگ تمہارے پاس دور دراز گوشوں سے دین کا فہم حاصل کرنے کے لیے آئیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے اچھا سلوک کرنا۔ لا محالہ آنحضرتؐ کی درسگاہ سے فیض یافتہ معلّمین اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح اور استعداد طبع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے "لوگو میں ناغے دے کر وعظ و تلقین کرتا ہوں جیسا کہ نبی کریمؐ ناغے دے کر وعظ فرماتے تھے اور آپؐ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔"

متعلمین اور معلّمین کو آنحضورؐ نے ہدایت فرما دی تھی کہ لوگوں کے مزاج اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر انہیں تعلیم دینا۔ "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات چیت کرو۔)

## نظامِ تعلیم کے فیض یافتگان

حضرت مسیحؑ کے قول کے مطابق "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ اس نظامِ تعلیم کی اثر آفرینی اور افادیت کا اندازہ لگانے کے لیے درسگاہِ نبوت کے فیض یافتہ افراد پر نظر ڈالیے۔

ان میں حضرت سلیمان فارسیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے زاہد اور خرقہ پوش تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور علی مرتضیٰؓ جیسے عالم اور فقیہ تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص، خالد بن ولیدؓ جیسے فاتح اور مجاہد تھے۔ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرمانروا تھے۔ یہاں ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالبِ علم تھے اور مسجدِ نبوی ایک جامع اور عمومی درسگاہ تھی جہاں ذوق، مناسبتِ طبع اور استعداد کے لحاظ سے سب لوگوں کو تعلیم مل رہی تھی۔

---

[1] ابوداؤد [2] موطا امام مالک

# خلافتِ راشدہ میں نظامِ تعلیم

### سنہ ۱۱ھ تا سنہ ۴۰ھ

## خلفائے راشدینؓ کی مساعیِ جلیلہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بڑا مختصر تھا اور انہیں کئی فتنوں کا سامنا تھا۔ اس لیے ان کی زیادہ تر توجہ مرتد قبائل، منکرینِ زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کو سرنگوں کرنے کی طرف رہی اور انہیں تعلیم و تدریس کے نظام کی ترقی و ترویج کے لیے فرصت نہ مل سکی؛ تاہم ان کا یہ بڑا احسان تھا کہ انہوں نے قرآن مجید کو جو پہلے متفرق و منتشر نوشتوں کی صورت میں تھا، یکجا مرتب و مدوّن کر کے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب امیر المومنین بنے تو انہوں نے نظامِ تعلیم و تدریس کی طرف توجہ فرمائی۔ خصوصاً بچوں کی تعلیم پر انہوں نے زور دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ ممالک میں ہر جگہ قرآن حکیم کا درس جاری کیا۔ مدینہ منورہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لیے جو مکتب تھے ان کے معلموں کا وظیفہ یعنی تنخواہ پندرہ درہم مقرر فرمائی۔[1]

کتاب البیان والتبیین کے مؤلف جاحظ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کو ضرب الامثال یاد کرنے اور عمدہ اشعار ازبر کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام اضلاع میں احکام بھیجے کہ بچوں کو کلامِ پاک لکھنے (کتابت) کا فن شریف سکھایا جائے۔ بچوں کی تعلیم گاہیں بالعموم مسجدیں تھیں یا پھر گھروں پر انہیں والدین تعلیم و تربیت دیتے تھے۔[2] مسجدوں میں ہی بالغوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی حلقے بھی قائم تھے جن کی تعداد چار ہزار نو سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں نو سو جامع مساجد تھیں جہاں سے علم و تہذیب کی شعاعیں پھوٹتی تھیں اور اسلامی معاشرے کو منور کر رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے فوجیوں کے فرائضِ منصبی میں قرآنِ مجید کی تعلیم و تدریس کو شامل کر دیا تھا۔ امیر المومنینؓ ہر سال صوبوں کے حکام اور فوجی افسروں سے حفاظِ قرآن کی فہرست طلب فرماتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے صوبہ بصرہ سے ایک سال دس ہزار حفاظِ قرآن کی فہرست بھیجی جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور ان کا وظیفہ بڑھا دیا۔[3]

ایک فرمان حضرت عمرؓ نے جاری فرمایا کہ۔

"بلادِ اسلامیہ میں سے کوئی شخص بازاروں میں دکان نہیں کھول سکتا، جب تک وہ تجارت کے بارے میں دینی احکام سے آگہی نہ رکھتا ہو۔"[4]

ایسی تدابیر سے حضرت عمرؓ نے پوری مملکت کو علوم سے معمور کر دیا اور رعایا کے فکر و نظر میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کی تعلیمی پالیسی کو جوں کا توں رکھا اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی؛ البتہ عالمِ اسلام ان کے احسان و کرم کو فراموش نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں قرآنِ عظیم کی کتابت و قرأت کے اختلافات کو دور کیا اور مصحفِ صدیقی (نسخۃ الامّ) کی مصدقہ نقلیں تیار کروا کے مختلف مراکز میں رکھوا دیں، تاکہ لوگ اپنے اختلافات رفع کر سکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جنہیں لسانِ نبوت سے "باب العلم" ہونے کا لقب ملا تھا، حضرت عمرؓ کی تعلیمی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور چند اضافے فرمائے۔ مثلاً علمِ نحو کی بنیاد انہوں نے رکھی اور اپنے تلمیذِ رشید ابو الاسود دوئلی کو چند اصولی قاعدے بتلا کر علمِ نحو کی تفاصیل مرتب کرنے پر مقرر فرما دیا۔

## صحابہ کرامؓ کی مساعیِ جمیلہ

تعلیم کی اشاعت و توسیع میں خلفائے راشدین کے پہلو بہ پہلو دوسرے صحابہ کرامؓ نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ شبلی کے الفاظ ہیں

"ہزاروں صحابہؓ سرزمینِ عرب سے نکل کر تمام نئے مفتوحہ ملکوں میں پھیل گئے اور بعض نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ محتاط اندازے کے مطابق شام میں دس ہزار، کوفہ میں ایک ہزار، حمص میں پانچ سو، مصر میں ساڑھے تین سو صحابی موجود تھے۔ یہ لوگ جہاں گئے حدیثوں اور عام مذہبی مسائل کا ذخیرہ ساتھ لے گئے۔"[5] اس دور میں عمّالِ حکومت بھی عوام کی تعلیم و تربیت میں خلفائے اربعہ کا ہاتھ بٹا رہے تھے؛ چنانچہ ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ میں عامل

---

[1] سیرت العمرین۔ ابن جوزی [2] معجم البلدان۔ یاقوت حموی [3] الفاروق شبلی نعمانی [4] الفاروق شبلی نعمانی [5] مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (مقالات شبلی)

مقرر ہو کر آئے تو فرمانے لگے: "مجھے عمر فاروقؓ نے تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں خدا کی کتاب اور سنتِ رسولؐ کی تعلیم دوں"

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی شخص کو گورنر بناتے تو اسے تاکید فرما دیتے:

دیکھو تمہیں میں مسلمانوں کا رہنما اور تربیت دینے والا بنا کر بھیجا ہوں، ان کی تعلیم و تربیت سے غفلت نہ کرنا:

## معلّم کا مقام

اس سنہری دور میں استاد کو معاشرے میں بلند مقام حاصل تھا۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"جابر بن عبد اللہ کی بے پناہ عزت و توقیر کی جاتی تھی کیونکہ وہ مسجدِ نبوی میں درس دیتے تھے۔"[1]

حضرت ابو الدرداء دمشق میں درس دینے کے لیے مسجد میں آتے تو ان کے ساتھ ان کے طلباء کا اتنا ہجوم ہوتا تھا جتنا بادشاہ کے ساتھ درباریوں کا۔[2]

ابو سعید خطبہ دیتے تو سامنے آدمیوں کی صفیں کھڑی ہو جاتیں:

ایک صحابیِ رسولؐ حدیث بیان کرتے تو ان کے اردگرد آدمیوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا کہ انہیں اپنے بالائی منزل پر جا کر حدیث بیان کرنا پڑتی۔

یہ تھا معلّم کا مقام اسلامی معاشرے میں! اور یہ تھا علم کے لیے ذوق و شوق اس دور میں۔

## طلباء سے حُسنِ سلوک

اکابر صحابہ اور معلمین کرام طالبانِ علم کے ساتھ نہایت کشادہ دلی، شفقت اور مروّت سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ جب ابو ہارون عبدی حضرت ابو سعید خدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے نہایت تپاک سے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس گوشے گوشے سے بہت سے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے آئیں گے، تم ان سے بھلائی کرنا"[3]

حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت عالیہ میں خواجہ حسن بصری حاضر ہوئے تو انہوں نے رئیس التابعین کو بتایا: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، میرے بعد تمہارے پاس لوگ تحصیلِ علم کے لیے آئیں گے ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہنا اور علم سکھانا:"

یہ چند روایات خلافتِ راشدہ کے زمانے میں معلم اور شاگرد کے باہمی تعلقات کی خوشگواری اور استواری پر دلالت کرتی ہیں۔

## نصابِ تعلیم میں وسعت

جہاں تک اس بابرکت زمانے میں نصابِ تعلیم کا تعلق ہے اس بارے میں ہمارے پاس تاریخی مواد بہت کم ہے، تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں عہدِ نبوی کی نسبت نصابِ تعلیم وسعت پذیر ہو چکا تھا۔ ایک طرف قرآن، حدیث اور فقہ کی تدریس و کتابت پر توجہ دی گئی تو دوسری طرف علمِ انساب، شعر و ادب کی طرف میلان بڑھا اور تیراکی اور شہسواری کے فنون پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ اس ضمن میں کتاب البیان والتبیین کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"حضرت عمرؓ نے تمام اضلاع میں حکم بھجوایا تھا کہ اپنی اولاد کو تیرنا سکھاؤ، شہسواری کی تربیت دو، عمدہ ضرب الامثال یاد کراؤ اور پاکیزہ اشعار یاد کرنے کی تلقین کرو۔"

محدّث ابن جوزیؒ لکھتے ہیں:

"ان درسگاہوں میں قرآن مجید کے علاوہ ادب، لغت، شعر و نحو کی تعلیم ہوتی تھی خصوصاً حضرت عمرؓ تاکید فرماتے تھے: اپنی اولاد کو شعر کی تعلیم دو۔ عَلِّمُوْا اَوْلَادَکُمُ الشِّعْرَ فَاِنَّ الشِّعْرَ دِیْوَانُ الْعَرَبِ[4]

## مقاصدِ تعلیم

اس زمانے میں تعلیم کا مقصد وہی تھا جو عہدِ نبوی میں واضح کر دیا گیا تھا، اس لیے معلّمین کے پیشِ نظر صرف یہی تھا کہ طلباء و عوام کی زندگیاں اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھل جائیں اور انہیں عقبیٰ میں خدا کی رضا و خوشنودی حاصل ہو۔ اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:

---

[1] حسن المحاضرۃ از جلال الدین سیوطی [2] تذکرۃ الحفاظ۔ علامہ ذہبی [3] صحیح مسلم [4] ابن جوزی سیرتِ عمرؓ [5] جامع بیان العلم۔ از علامہ ابن عبد البر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "جب کسی عالم کو دیکھو کہ دنیا سے محبت رکھتا ہے تو دین کی بات میں اس کا اعتبار نہ کرو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی "اے فرزند ریاکاری بحث مباحثے اور نمود و مباہات کے لیے علم نہ سیکھنا۔"

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں "بہت سی حدیثیں یاد کر لینا علم نہیں علم تو خوفِ خدا کا دوسرا نام ہے۔"

المختصر رضائے الٰہی کا حصول مسلمانوں کی سعی و جہد کا منتہائے مقصود اور نظامِ تعلیم کا نصب العین تھا۔

## لازمی و جبری تعلیم کی ابتدا

اس دور میں لازمی تعلیم کے اصول کا بھی سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو چند آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ قبائل عرب کا دورہ کریں اور ہر مسلمان کا امتحان لیں جس کو قرآن مجید یاد نہ ہو اس کو سزا دیں۔ کنز العمال میں فاروقِ اعظمؓ کا یہ ارشادِ گرامی درج ہے:

"مسلمانوں کو بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور سورتیں سیکھنا لازم ہیں کیونکہ ان میں عملی زندگی کے بارے میں ضروری احکام مذکور ہیں۔"

## حفظ و کتابت دونوں پر توجہ

اس دور میں حفظ و روایت کا طریقِ تعلیم رائج تھا؛ چنانچہ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

"۲۵ھ تک جب باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع نہ ہوئی تھی۔ جو تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظے سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا یعنی سند و روایت جو قدیم زمانے میں رائج تھا؛[1]

رفتہ رفتہ املاء، تحریر و کتابت کا رواج بڑھنے لگا جس کی ابتدا عہدِ نبوی میں ہو چکی تھی۔ کتابتِ قرآن اور کتابتِ حدیث پر خاص توجہ دی گئی۔ حضرت عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور رافع بن خدیج کے بارے میں ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ انہوں نے احادیث کے صحیفے مرتب کیے اور شہرتِ دوام پائی۔

## مدارجِ تعلیم

اس دور میں معید مقرر کرنے اور جماعتوں کی درجہ بندی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو الدرداء جامع دمشق میں درس دیتے تھے۔ ان کے گرد تقریباً ۱۶۰۰ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔ ان کا اندازِ تعلیم یہ تھا کہ دس دس طلبہ کی علیحدہ علیحدہ جماعت بنا دیتے تھے۔ ہر جماعت پر ایک نائب یا معید مقرر ہوتا تھا وہ مختلف جماعتوں کے درمیان ٹہلتے رہتے اور طلباء کا سبق بڑے غور سے سنتے تھے[2]

## تنخواہیں دینے کا رواج

اگرچہ قرونِ اولیٰ میں سے بیشتر معلمین اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا فرض رضائے اللہ کی رضاجوئی کے لیے بلا معاوضہ انجام دیتے تھے لیکن حالات کے تقاضوں اور عصری مجبوریوں کے باعث تنخواہ دار معلمین کی تقرری کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ مثلاً ابن جوزی نے سیرتِ عمرین میں لکھا ہے:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر معلم کی تنخواہ پندرہ درہم سرکاری خزانے سے مقرر فرمائی تھی۔ اُدھر طالب علموں کے وظائف STIPENDS اسی زمانے میں پہلے پہل مقرر ہوئے۔ اس جدت کا سہرا حضرت علیؓ چوتھے خلیفۂ راشد کے سر ہے۔ بعد کے مسلمان حکمرانوں نے اس مفید روایت کو جاری رکھا اور اسے فروغ دیا[3]

## تعلیمِ نسواں کا اہتمام

خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں تعلیمِ نسواں پر مناسب حد تک توجہ دی گئی۔ حضرت عائشہؓ کا گھر اس تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ حضرت فاطمہؓ علمِ عروض و فنِ خطابت میں بڑی دستگاہ رکھتی تھیں۔ جناب فاطمہؓ کی صاحبزادیاں زینبؓ و کلثومؓ اور پوتیاں سکینہ، فاطمہ اور صغریٰ سب کی سب زیورِ علم سے آراستہ تھیں۔ عائشہ بنتِ طلحہ علمِ نجوم اور ذوقِ سخن میں ممتاز تھیں۔ الغرض تعلیمی سرگرمیوں میں خواتین مردوں سے پیچھے نہ تھیں بلکہ

---

[1] مقالاتِ شبلی [2] علامہ ذہبی۔ طبقات القراء [3] کنز العمال [4] خواتین کی تعلیم۔ مولفہ محمد امین زبیری

ڈاکٹر احمد (نبشر)

# اسلام کا نظریۂ تعلیم

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں یک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد حق تعالیٰ نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم الاسماء تھا۔[1] اسماء کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتا ہے اور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے۔[1] علم نیابت کا ایک خاصہ[2] اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی بندہ کے صحت مند ارتقا اور نشو و نما کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اوّلین ضرورت قرار دیا۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (CULTURE) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے بلکہ اہل علم کے ایک طبقے کے تابع ہو گئے تھے۔ افلاطون اپنی "جمہوریہ"[3] (REPUBLIC) میں وادیٔ کے اونچا خواب دیکھ سکا اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس اعتبار سے وارا گیا ہے۔ اسلام وہ مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا[4] اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم —— پڑھنا اور لکھنا —— کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب کریم ہے وہ جس نے قلم سے علم دیا۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا (سورۃ علق ۱-۵)

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب و حکمت، تبیین احکام و آیات، تزکیۂ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا

(میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

## (۲) تعلیم کیا ہے؟

علم اور تعلیم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصولوں کا صحیح فہم حاصل کریں

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے۔ اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی اور روحانی ورثے کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے۔ تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے مہذب مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے اور کسی ریاست کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں —— ہر دور کے ممتاز ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصورِ تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ علم (ع ل م) ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں تعلیم آتا ہے تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے

انگریزی زبان کا لفظ (EDUCATION) لاطینی لفظ (DUCER - DUC) یعنی رہنمائی سے ماخوذ ہے لفظی طور پر اس کے معنی "معلومات کا جمع کر دینا" اور "مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں ہر نوع اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مفہوم میں آتا ہے۔

---

۱- قرآن حکیم، البقرہ - ۳
۲- قرآن حکیم، البقرہ - ۲۴۷
( " THE STORY OF CIVILISATION" BY W DURRANT VOL I) -۳
۴- طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ (حدیث نبوی)

جان اسٹوورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے

"تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی غرض سے مقصد کی خاطر اپنے لیے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے اُن چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہیں جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں"

جان رسکن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے:

"مہذب زندگی کی مکمل اور ترجیحانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض دیانت و مہارت اور حکمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے"

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصور ہے۔

امریکی فلاسفر جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی رجحانوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے ڈاکٹر یرک کا خیال ہے کہ تعلیم بنیادی طور پر مطالعہ سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل پاتی ہے بس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے نئی نسلوں کی اخلاقی ذہنی اور جسمانی نشو ونما ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں

وسیع تر مفہوم میں یہاں تمام طبعی و جسمانی، اخلاقی و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں یہ صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے اسکولوں اور کالجوں اور دوسری درسگاہوں میں مرتب ہوتے ہیں

بہرکیف تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

"تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لیے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لیے ہے تو درخت اگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو"

افراد کی تعمیر صرف تعلیم ہی سے ممکن ہے

## (۴) ایک غلط فہمی کا ازالہ

تعلیم کسی قوم کے سماجی نظریات اور روایات سے گہرے طور پر مربوط ہوتی ہے ماہرین کسی قوم کا نظام تعلیم اپنے مزاج مواد اور موضوعات کے اعتبار سے ہر تو ملکی یا قومی رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس میں اتنی معروضیت OBJECTIVITY ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جا سکے۔ لیکن عہد جدید میں (LIBERALISM) (INDIVIDUALISM) کے علمبرداروں نے تعلیمی دنیا میں اس غلط فہمی کو بڑے زور شور سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم مذہبی اقدار اور معیارات جیسے عقیدے کے سلسلے میں، بالکل اسی طرح غیر جانبدار ہو سکتی ہے جس طرح طبیعی علوم۔ اس غلط تصور کی بناء پر تعلیم کو مذہب اور اخلاقی اقدار سے الگ کر دیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشو ونما پانے کے لیے پوری آزادی ملنی چاہیئے اور اس کی فکر و کردار کو کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ طریق تعلیم ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت مقبول ہوا اور اس نے دوسرے یورپی ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

## بے عقیدہ تعلیم کے نتائج

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں۔

(الف) "بے عقیدہ" تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر اُبھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی، اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ وار ہی گزر جاتی ہے دونوں کی نشو ونما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف ذہن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لیے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لامرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ یہ جدید تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرتکز کرنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبا اپنی زندگی اور اردگرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ نئی مقصد تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی حقائق، واقعی اور روزمرہ مسائل پر کوئی غور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی نقطۂ نظر سے بھی یہ تعلیم مقصد سازی حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے اکار بریک انڈ لوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے

"مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی اور فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔"

مشہور اہل علم والٹر لیب مین نے "اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کمی" کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا

"سکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیج رہے ہیں جو اس معاشرے کے تعلیمی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اسی تعلیمی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے دینی وحدات میں مغربی مذہب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی صحیح رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے"

امریکی تعلیم پر ایک مبصر کی رپورٹ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے

"طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں مگر ان کا زمانہ، ان کی ثقافت اور حتیٰ کہ ان کے رہنما انہیں کوئی معلوم مقاصد تصورات نہیں دیتے پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں۔"

سر والٹر موبرلے نے اپنی کتاب "یونیورسٹی میں بحران" میں جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعہ پر مشتمل ہے لکھا ہے

"ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر آزادانہ استعمال کریں تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دیتے اور سوچ بچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ لاوجہ سب کو ہی تسلیم کر لیتے ہیں اور نہ اس لئے کہ علم کے مختلف اجزا میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔"

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں۔

"تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے، اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطۂ نظر سے عاری ہیں۔"

ان نئے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

## (۴) تعلیم کے اسلامی اصول

(ا) **تصور علم**۔ اسلام نے جو تصور علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے علم انسان اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔ مزید یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں، مقاصد حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیئے یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے نظام تعلیم کا پورا مزاج بنتا ہے۔

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم اور تربیت ساری ایک ہی حقیقت کے دو پہلو سمجھے گئے ہیں اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے

(ب) **مقصد تعلیم**۔ علم بجائے خود منزل نہیں منزل کے حصول کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت انہیں کرنی ہے۔ اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ "تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔" اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھا تھا

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔

بولہب را حیدر کرار کن

اگر یہ بولہب حسد کرا رہ جائے اور کینے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لیے سراپا رحمت ہے۔"

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصد، دنیا میں انسان کی حیثیت، توحید، رسالت، آخرت، انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔ انہیں بتایا جانا چاہیے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لیے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں۔ تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں۔ اور ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں۔ وہ تعلیم جس کا مقصد اہل علم پیدا کرنا ہو اسے اولین طور پر اسلام کا علم بخشنے کا نظریہ رکھنا چاہیئے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبانِ علم بھی (اس حقیقت کے) شاہد ہیں (آلِ عمران - ۱۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں۔ اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا۔"[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لیے انبیا مبعوث کیے گئے ہیں۔ ایک ایسا مشن جو صاحبانِ علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے قرآن حکیم کے مطابق اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کہتا ہے

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے اُمیوں میں انہی میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔ (جمعہ - ۲)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔ (الحدید - ۲۵)

پس اسلامی سوسائٹی کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔

یہ مقصد تعلیم کے سرگرمیوں میں اسلامی نظریۂ حیات کی روح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہوگا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطہ نظر سے کی جانی ہوگی۔ اس کے لیے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل نو اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو

**(ج) انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن۔** تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقا کو اہمیت دی جائے۔ اس پر ہمارے سامنے متضاد نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک فرد کا ارتقا بنیادی قدر ہے۔ وہ اجتماعی یا مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے مفادات سے مطابقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشوونما پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں حدیں غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اسلام فرد کی اسی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقا اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینی چاہیئے۔ قرآن کریم کے مطابق

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (النجم - ۳۹)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ

بیشک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی نہیں کر لیتے (الرعد - ۱۱)

---

[1] ۱۔ احیاء العلوم، جلد اوّل، باب علم کے بیان میں۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کے لئے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔ (البقرہ - ۲۸۶)

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)۔ (البقرہ - ۱۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو نشوونما دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اسے معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی زندگی کے وظائف کو بحسن و خوبی انجام دے سکے

**(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگی** - تعلیم کا ایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہئے کہ وہ دنیا کی رنگا رنگ بوقلمونیوں کے درمیان زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر واریقا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق فکر و عمل کا توازن مومن کی خصوصیات میں سے ایک ہے اس لئے تعلیم میں یہ بات لازما پیش نظر رہنا چاہئے کہ اختصاص کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے طالب علم کو علم کے وسیع پس منظر سے واقفیت حاصل ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ متعین کرلے

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کل ہے۔ اس حقیقت سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر متلاشی کا ذہن تشکیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز متعین کرے گی خواہ اس کے حصول علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے اس بنیادی نقطے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان نفس علم کو چھوٹے چھوٹے غیر مربوط حصوں میں تقسیم نہیں کریں گے بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ نمایاں ہو جائے گا اس سے جزو پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی اعلیٰ یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی علم شروع کرنے کے نقطہ نظر سے زیادہ قریب ہے ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہئے یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا

**(ھ) تعمیر کردار** - تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونا چاہئے تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد بھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اوّلین اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی نیک و قت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر شامل ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں

"تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہئے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہئے۔"[1]

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے (الاحزاب - ۲۱)

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں اساتذہ کو خود اسی زندگی اور ایسے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے اور درسگاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہئے کہ اس سلسلے میں ممد و معاون ہو سکے

**(و) تکمیل حیات** - اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کو زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا چاہئے انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہئے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہئے۔

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکش کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی گزارے قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصوں کی تعلیم دیتا ہے۔[2] قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالی

---

۱ - احیاء العلوم

۲ - البقرہ - ۲۰۹

ہیں۔ کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے حرام نہ ان کے لیئے بنائیں"۔ ۱

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ

کھاؤ پیو مگر حد سے زیادہ اسراف نہ کرو (الاعراف - ۳۱)

اسلام کی نظر میں انسانی محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے۔ پس تعلیم کو دیانت داری، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں ممد و معاون ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ ان ضروریات کو نہ صرف یہ کہ نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لیے مثبت طور پر کام کرنا چاہیئے۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیئے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی آدرشوں کا ترجمان ہوگا اور بنی آدم کے لیے رحمت ثابت ہوگا۔

# (۵) تعلیم کی تاریخی روایت

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم اپنی بنیادی اقدار کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ طریقے مختلف رہے ہیں۔ اصول تعلیم میں بھی تنوع نظر آتا ہے۔ اداروں کی ہیئت بھی بدلتی رہی ہے لیکن بنیادی مقاصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے۔

**دور نبوی ؐ میں تعلیمی روایت** - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے۔ آپؐ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفہ یا نبی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے متعلم تھے۔ اس مدرسے میں ۷۰ اور ۸۰ تک طالب علم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے صحابۂ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے عبادات، احکام دیتے تھے۔ اصحاب صفہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبلؓ مالی امور کے نگراں تھے۔ عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لیے مامور کر دیئے جاتے تھے، اور تعلم و تبلیغ کے لئے تو خصوصیت سے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ اپنی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے، دوسرے اہل ثروت مسلمان بھی ان طلبہ اور ان کے متعلقین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہ راست ان کی مدد فرماتے۔ اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی جو قائم کی اور جو روایت میں پڑی وہ ہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی:

(ا) اولیں چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اور مسلم معاشرے کی ہمہ ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ تھی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین ہے۔

(د) متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود محنت مزدوری کرنا، اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا

(ھ) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لیے ایسے وسائل استعمال کرنے چاہئیں مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولیں حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے

**ادوار مابعد** - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادی بیج پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقاء ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے ہے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی اور ایک قسم کی ہمہ اسی اور ہمہ گیر تعلیم موجود تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی، اور مساجد کے فن تعمیر پر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑا ہے۔ ستونوں ستونوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں محرابوں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو عالمی درگاہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں۔ مساجد کے علاوہ خانقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے عالمانہ سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے۔

---

۱۔ الاعراف - ۲۳

(باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

(ماہر - صحافت)

# ڈگریوں کے ڈسے لوگ

وہ تھکے ہارے لوگ جو کاغذ کے پرزے جیب میں ڈال کر مستقبل کے دروازے پر دستک دیتے ہیں مگر... مستقبل کہیں نظر نہیں آتا۔ (محمود)

زندگی کی طویل اور پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے اب اس کے دونوں پاؤں گھائل ہو چکے تھے اور زندگی کی سنگلاخ سڑک کا کوئی انت نہ تھا وہ تھک ہار کر مایوسی کے اندھیرے تھے جن میں سرکاری عمارتیں، دفاتر، بینک اور بازار چمکتے رہتے حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، آدم جی، کے پی ٹی، ایل ڈی اے، اونچی بلند و بالا عمارتوں کی لامتناہی قطاریں، آہنی گیٹ پر بندوق لیے وکیل سو کچھوں والے چوکیدار اور ان کے سر کے اوپر دیواروں پر NO VACANCY کے بے رنگ اور مایوس کر دینے والے بورڈ جنہیں دیکھ کر اسے شدت کی پیاس محسوس ہوتی اور گہری تھکاوٹ کا احساس رگ رگ میں سرایت کر جاتا وہ نوکری کی تلاش میں تھا اور نوکری جیسے خلق تھی، وہ انٹرویو کے لیے درخواستیں لکھتا تھا اور درخواستوں کا بیشتر کوئی جواب نہ آتا۔ وہ انٹرویو دیتا تھا اور انٹرویو کے بعد اسے دوبارہ بلایا نہیں جاتا تھا۔ ہر جماعت طلب کیے جاتے تھے اور ضمانت کے لیے پیسے نہیں تھے کوئی دن ایسا نہیں تھا جس پر اسے "او کے" کرنے کا پیغام آتا اس کی پچھلی جیب میں اس کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی کاغذی سند تھی اور وہ دن بھر تھک ہار کر بعد رات گئے گھر لوٹتا:

"کیا ہوا نوکری ملی؟"

وہ آنگن میں بچھی ہوئی چوکی پر لیٹ کر آسمان پر پلکیں جھپکاتے تاروں کو دیکھتا رہتا۔

"نوکری کا کیا ہوا ملی یا نہیں؟" ماں جھلا کر پوچھتی مگر وہ بس خاموش آسمان کو تکتا رہتا

جیسی یہ کسی ستم کی تنہا

مکمل تھا کوئی احساس میٹھا

دیوار کے پیچھے رہنے والی لڑکی ہر رات یہ نظم پڑھتی لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں جھلائی ہوئی آواز گونجتی "میں پاگل ہوں کیا جو کہے جا رہی ہوں نوکری کا کیا؟"

"نہیں ملی، نہیں ملی، نہیں ملی"

یک دم اس کا جی چاہتا کہ پچھلی جیب میں رکھے ہوئے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور انہی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جائے جن دیواروں کے پیچھے وہ لڑکی نظم پڑھتی ہے اور چھوٹے کمروں والے اس مکان میں سسکیاں گونجنے لگتیں اور کئی چہرے افسردہ اور اداس ہو جاتے۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ یہ مجھے معلوم ہے"

اور یہ دکھ بھرا جملہ اس کے دل میں درد بن کر ابھرتا، قطرہ قطرہ ساری رات ٹپکتا رہتا وہ اندر گلی میں نکل جاتا جہاں قطار سے محل کے محل دور تک چلے گئے تھے اور طب کی دکانوں دور دور تک پڑوس کے بچے رات گئے تک آنکھ مچولی کھیلتے رہتے یہی آنکھ مچولی دن میں سڑکوں پر کھیلی جاتی!

"انتخابات کی نئی تاریخ کا اعلان کیا جائے"

"سابق وزیراعظم نے طیارے کی فروخت پر لاکھوں روپے کمیشن لیا تھا!"

"بیروزگاری سے تنگ آ کر نوجوان نے خودکشی کر لی"

اور اخبارات کی ان جلی سرخیوں سے دور اس کی آنکھوں میں ان دنوں کی یاد بیدار ہو جاتی، جب وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھ کر اچھے دنوں کے خواب دیکھتا تھا اور کوئی آواز اس کے اندر سے کہتی تھی "سب بیکار... یہ سب بے کار اور فضول دن گزار رہے ہیں۔ یہ کچھ سر جلتے تھے بس دیوانوں کی طرح بھٹکتے جا رہے ہیں اور انہیں بھٹکانے والا ایک دن ایک مقام پر لا کر ایک ایک کو قتل کر دے گا اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔"

کینٹین، راؤنڈ شاپ، سیڑھیوں اور لائبریری میں بیٹھ کر لڑکے لڑکیاں گپیں ہانکتے رہتے، بے معنی باتوں کے شور میں لیکچرر، پروفیسر اور ڈاکٹرز اپنے گاؤن اور فائلیں سنبھالے کلاسوں میں چلے جاتے تقریریں کرتے اور چلے جاتے انتظامیہ کے طلبا میں اپنی بیروں پر چائے کی چسکیاں لیتے اور باتیں کرتے ان کے سامنے کوئی آئیڈیل نہیں تھا اور انہیں صرف اپنے اپنے چیک سے دلچسپی تھی جو ہر ماہ کے آخر میں ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا اس تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ اسے حاصل کرنے والوں کی تقدیر میں کیا لکھا ہے یہ کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ کوئی جاننا ہی چاہتا تھا۔ بہت دور... ان دیکھی فضاؤں میں اس نسل کے سروں پر ہر لمحے، بحران، بیروزگاری اور ناانصافی کی خونخوار چیلیں اڑ کر منڈلاتی رہتی ہیں بیروزگاری، نفرت، حقارت، سازشیں، توہین، رشوت، دھکے، ذلت آمیز رویوں اور بھیانک راتوں میں اڑنے والے کالے سیاہ کوّے جن پر اس قوم کی تقدیر کا محافظ کتا ہر دم بھونکتا رہتا۔ ہوائیں اور تیزی سے چلنے لگتیں شیلف پر رکھی ہوئی کتابوں کے ورق اڑنے لگتے، پھٹنے لگتے۔ اس گھٹن میں کتابیں گر جاتیں کتابیں بکھر جاتیں، گاؤن پھٹ جاتے کوّے اڑتے رہتے، چیلیں منڈلاتی رہتیں۔

لیکن کوئی نہ سنتا۔ انکریمنٹ، ترقی، بونس، مطالبے، گریڈ، ٹیسٹ، سیاست، ڈپلومیسی، عشق و محبت اور منافقت کا شور گونجتا رہتا اور حسب دستور تھا۔ تب ایک ایک کے ہاتھ میں تعلیم کی سند تھما دی جاتی، ایک ایک کو رخصت کیا جاتا اور پھر یہ مقتول شہر کی سڑکوں پر اپنے مستقبل کو ڈھونڈنے نکلتے لیکن مستقبل کہیں نہ تھا، کاروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ گزر جاتے لیکن کسی کار پر ان کا نام نہ لکھا ہوتا کوٹھیوں کی کوٹھیاں قطار اندر قطار کھڑی ہوتیں لیکن کسی کوٹھی کے گیٹ کے پیچھے ٹھنڈے کمروں میں ان کا نام نہ ہوتا اور فکروں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مارتا لیکن کسی دروازے پر ان کے عہدے اور نام کی تختی نہ لگی ہوتی، وہ سوچتا رہتا۔

"یہ دن کب تک رہیں گے، یہ دن کب بدلیں گے"؟

لیکن ماں کی دعائیں یہ دن کا دوپہر کا، گرد اڑتے دن اور سال کا نیا سورج طلوع ہوتا اور چھوٹے چھوٹے انسانوں پر چمکتا رہتا۔ کبھی کبھی دیوار کے پیچھے نظم پڑھتی رہتی اور ہر بات ماں کی جھلائی ہوئی تھی بس کر اس کا جی یہی چاہتا کہ سند کے کاغذ کو پرزے پرزے کر کے پھاڑ کر ہوا میں اڑا دے اور ان انٹرویو والے دفتر کی طرف دوڑ کر بیچ کو دھلائے، لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر پاتا تھا کیونکہ تعلیم نے اسے بزدل بنا دیا تھا اس کی فطری جرأت اور بہادری کو چھین کر اس کے کشکول میں چند فرسودہ اور کھوکھلے خیالات کے سکے ڈال دیے جاتے۔ چند کھوٹے سکے!

پھر ایسا ہوا کہ اس نے نوکری ڈھونڈنا چھوڑ دی اخبارات میں WANTED کے اشتہارات پڑھنا ترک کر دیے اور تندہی سے ایک کام میں جت گیا اب وہ پریشان نہ رہتا تھا مستقبل کے اندھیروں میں کوٹھی، کار اور بنگلے تھوڑے تھوڑے چمکنے لگے تھے، اب ماں کی جھلاہٹ پر وہ بھڑکتا بھی نہ تھا، بلکہ صرف مسکرا کر چپ ہو جاتا، ماں کبھی کبھی اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوب جاتیں ایک دن اس نے اپنی ماں کے گھٹنے چھو کر کہا کہ وہ جا رہا ہے اس ملک سے دور جہاں امن ہے اور خوشحالی ہے وہ کچھ امن اور خوشحالی اپنے حصے سے بچا کر اسے بھی بھیجے گا اور اب وہ سود سلف کے سامان کے لیے پریشان نہیں رہے گی اور بابا جی جائے گے کہ خوشی بھرے کشکول کرے میں ایسی سادھی کے پاس اپنے بہتے ہوئے آنسو خشک نہیں کرے گی۔ میں تیرے امن اور تیری راحت کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں، پھر وہ چلا گیا

اسی رات ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی:

"سمندر سے بارہ میل دور غیر قانونی طور پر اولیبی جانے والے پاکستانیوں کی لانچ پکڑی گئی بہت سے پاکستانیوں نے پکڑے جانے کے خوف سے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں اور ڈوب گئے۔"

یہ مضمون نہ تو فحش ہے، نہ بے مقصد، بلکہ لطیف پیرائے میں معاشرے پر ذود کی چوٹ لگائی گئی ہے۔ اس کی اصطلاحیں گو کہ "آزاد" دنیا سے ہی متعلق ہیں (محمود)

کرشن چندر

# علمی قاعدہ سے فلمی قاعدہ تک

عجب زمانہ آن لگا ہے۔ آج کل بچے پیدا ہو کر ڈیڈی بعد میں کہتے ہیں دلیپ کمار کہنا پہلے سیکھ جاتے ہیں۔ ماں کا لفظ زبان پر بعد میں آتا ہے سینما کی ایکٹرس کا نام سب سے پہلے آتا ہے اور بہت آسانی سے۔ جو حال گھر کا ہے وہی اسکول کا ہے۔ ایک دفعہ مجھے اسکول میں پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے پوچھا "بچو! ساوتری ماتا کس نے لکھی" تو جواب ملا "مالا سنہا" ستری نے۔ میں نے پوچھا "مشہور مغل بادشاہوں کے نام گنا دو" ـــــ بولے "مغل اعظم، بابر، شاہجہاں، پکار اور کے آصف"۔ میں نے پوچھا ـــــ "بمبئی کا جغرافیہ بیان کرو" بولے "بمبئی کے مشرق میں جیتندر رہتے جہاں راجیندر کمار رہتا ہے۔ شمال میں پالی ہل ہے جہاں دلیپ رہتا ہے۔ مغرب میں وہی مالا کا مکان ہے اور جنوب میں جے شری کا" ـــــ میں نے اسی دن اسکول سے استعفا دے دیا اور گھر چلا آیا۔

گھر آ کر بہت سوچا، بہت سوچا۔ آخر سمجھ میں آیا کہ غلطی میری ہے۔ دراصل یہ فلم کا عہد ہے۔ ہندوستان میں صرف پندرہ فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں، لیکن سینما دیکھنے والے سو فی صدی ہیں۔ اس لیے اگر لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا ہے تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں فلم کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ یہی سوچ کر میں نے مندرجہ ذیل فلمی قاعدہ لکھا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہر وہ شخص جو پڑھا لکھا نہیں ہے بہت جلد پڑھنا لکھنا سیکھ جاتا ہے اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کر سکتا ہے ـــــ اس قاعدے کی فلم بھی بن سکتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی فلم بن سکتی ہے جو پروڈیوسر چاہے مصنف کی اجازت حاصل کیے بغیر اس کی فلم بنا سکتا ہے اور اس کے اندر ناچ اور گانے اپنی حیثیت اور حماقت کے مطابق ڈال سکتا ہے۔

لیجیے اب شروع کرتا ہوں:

بچو!

الف سے اندھیرا ہوتا ہے جو فلم انڈسٹری کے لیے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر کام دن کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اسکول دن میں کھلتے ہیں، کارخانے دن میں چلتے ہیں، دفتر دن میں کھلتے ہیں لیکن فلم کا ہر کام اندھیرے میں ہوتا ہے۔ فلم اندھیرے میں بنائی جاتی ہے، اندھیرے میں دھوئی جاتی ہے اور اندھیرے میں دکھائی جاتی ہے۔ اس انڈسٹری میں شروع سے آخر تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس لیے اس انڈسٹری میں کامیاب ہونے کے لیے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تو پیارے بچو! جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لو اور زور سے کہو ـــــ "الف سے اندھیرا"

الف سے آئینہ ہوتا ہے جو ہر فلم کی جان ہوتا ہے۔ فلم کیمرے میں چلتی ہے جو ایک طرح کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہیروئن آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہے اور میک اپ کے ذریعے اپنی بدصورتی چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ پروڈیوسر بھی ایک طرح کا آئینہ ہی ہوتا ہے جس میں سے روشنی گزار کر پردے پر پھینکی جاتی ہے۔ پروڈیوسر دراصل ایک طرح کا آئینہ ساز ہوتا ہے جو لاکھوں روپے خرچ کر کے آپ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتا ہے ورنہ سر جھکا کر کہتا ہے ـــــ

"آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے"

اس لیے بچو، تنگ موہری کی پتلون پہن کر لال رنگ کی بش شرٹ، بالوں کو ہاتھ سے بگاڑ لو اور آئینہ دیکھ کر کہو ـــــ "الف سے آئینہ"۔

"الف سے انٹرویو"

---

الف سے انٹرویو بھی ہوتا ہے جو ہر فلم کمپنی میں ہوتا ہے۔ انٹرویو کیے بغیر فلم انڈسٹری میں کام کرنا ممکن نہیں لیکن یہ انٹرویو دوسری جگہوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی عقل کیسی ہے؟ یہاں دیکھا یہ جاتا ہے کہ آپ کی شکل کیسی ہے؟ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے کالج کے کتنے امتحان پاس کیے ہیں۔ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنے امتحانوں میں فیل ہوئے ہیں ـــــ اور جو آدمی جتنا زیادہ فیل ہو چکا ہوگا، اتنا ہی فلم انڈسٹری میں کامیاب ہوگا۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لڑکا اسکول یا کالج میں فیل ہو جاتا ہے فوراً گھر سے بھاگ کر کسی فلم کمپنی میں انٹرویو کرنے کے لیے بمبئی کا رخ کرتا ہے۔ اس لیے بچو تم بھی جلدی سے اپنی کتابیں پھاڑ دو، سامان باندھو اور بولو ـــــ "الف سے انٹرویو"

الف سے اچک دانہ ہوتا ہے جو ہمیشہ بچک دانہ کے ساتھ لگا رہتا ہے جیسے شنکر کے ساتھ جے کشن۔ تم نے شاید ابھی تک اس کا نام نہیں سنا ہوگا۔ "اچک دانہ بچک دانہ دانے اوپر دانہ" یہ ایک مشہور فلمی گیت ہے جسے بعض ہونہار بچے بندے ماترم کی جگہ گاتے ہیں اور اسکول کی سالانہ نمائش میں اوّل انعام پاتے ہیں ـــــ اس کا مطلب کیا ہے، یہ کوئی بچہ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکا۔ لیکن اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل یہ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے اور اس دنیا کے ساتھ ساتھ علم اور سائنس اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ بہت سی باتوں کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھیے کہ اس نے کلاس میں کتنے نمبر حاصل کیے؟ بڑی مشکل سے بتائے گا۔ لیکن دلیپ کمار کی کار کا نمبر پوچھیے فوراً بتا دے گا ـــــ اس لیے بچو! اگر فلم میں کام کرنا چاہتے ہو تو کسی بات کا مطلب جاننے کی کوشش مت کرو، جلدی سے سر ہلا کر کہو ـــــ "الف سے اچک دانہ"

الف سے ایمان داری بھی ہوتی ہے جو آج کل کی دنیا میں صرف فلم کے علاوہ ملتی ہے اسی لیے میں نے ایمان داری کا نام نہیں لیا دوسری بات یہ ہے کہ ایمان داری کوئی ہیرو تو ہے نہیں وہ کوئی سیونگ بھی نہیں ہے جسے فلم کے پردے پر دکھایا جا سکے اور آج کل کے بچوں کا یہ دستور ہے کہ جس چیز کو وہ فلم پر نہیں دیکھ سکتے اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں آج کل کے زمانے میں ایمانداری ایک بے مطلب سے معنی کھو بیٹھنے والی شے ہے یعنی جو ایمان داری ہے، وہ گویا ایک طرح کا دیوانہ پن ہے اس لیے بچو ایمان داری کو بھول جاؤ اور رٹو رہے کہو ۔۔۔ الف سے ایکٹر اور۔

الف سے ادھار ہوتا ہے جس پر اکثر فلم کمپنیوں کا دارومدار ہوتا ہے کہتے ہیں کہ ایک فلم کمپنی صرف تین چیزوں کے سہارے چلتی ہے سنگھار، اشتہار، ادھار ۔۔۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری چیز ادھار ہے لوگ کہتے ہیں کہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ مگر یہ فلم کمپنی کی جان ہے اگر کہیں سے ادھار نہ ملے، تو وہ بیچاری فلم کمپنیوں کی جان نکل جائے۔ گر شوٹنگ کے وقت کپڑے والا کپڑے ادھار نہ دے، تو اکثر ایکٹر لوگ سیٹ پر چڈھی پہنے گھومتے نظر آئیں اگر ہوٹل کھانا ادھار نہ دے، تو سارا سٹاف بھوکا مر جائے اگر سٹوڈیو والا سٹوڈیو ادھار نہ دے تو اسی وقت پیک اپ ہو جائے ۔۔۔ یہاں کہانی ادھار پر آتی ہے سیٹ ادھار پر بنایا جاتا ہے فرنیچر ادھار پر سجایا جاتا ہے ہیرو ہیروئن ادھار پر ملتی ہے کیمرے کی سریلی ادھار پر چلتی ہے۔ ہیرو کا گھوڑا، دولہن کا گھونگھٹ، ولن کا ہاتھ، سپاہی کی بندوق، مرغی کا انڈا، جادو کا ڈنڈا سب کچھ ادھار پر ملتا ہے۔ گویا فلم کمپنی کی جو بہار ہے سب خالص ادھار ہے آپ نے وہ محاورہ تو ضرور سنا ہو گا ادھار کھائے بیٹھے ہیں یہ ضرور کسی فلم کمپنی میں کام کرنے والوں کی صورتوں کو دیکھ کر بنایا گیا ہے اس لیے بچو! اگر فلم پروڈیوسر بننا چاہتے ہو، تو ابھی سے ادھار مانگنا شروع کر دو اور بولو ۔۔۔ "الف سے ادھار"

## "الف سے اوٹ پٹانگ"

عام طور پر اوٹ پٹانگ کسی ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہ ہو جو بالکل بے معنی، بے کار اور بے اصل ہو ۔۔۔ مگر فلم انڈسٹری میں اس کا مطلب ہے کہانی ۔۔۔ باقی ہر بات کا فلمی دنیا میں کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے مثال کے طور پر کیمرے کا فلٹر استعمال کرنے کا ایک اصول ہے گھوڑے کو دوڑانے کا ایک طریقہ ہے کیمرے کے ساتھ مائیک کو استعمال کرنے کا ایک مطلب ہے ۔۔۔ لیکن فلمی کہانی کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے، نہ طریقہ ہوتا ہے۔ اور اکثر حالتوں میں اس کا مطلب بھی نہیں ہوتا

لیکن اس میں نہ قصور کہانی لکھنے والے کا ہے نہ کہانی بنانے والے کا۔ بلکہ دیکھنے والوں کا ہی کہ صرف اوٹ پٹانگ کہانیاں پسند آتی ہیں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو کہانی جتنی زیادہ اوٹ پٹانگ ہو گی اتنی ہی زیادہ لوگوں میں مقبول ہو گی اگر ہیرو قاعدے اور شرافت سے محبت کرے، تو کس کو پسند آتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہیروئن کو کمرے سے پکڑ کر دو تھپڑیاں دے کر اپنے سر پہ اٹھا کر باہر گلی میں نکل آئے اور سڑکوں پر گیت گاتا چلے، تو واہ واہ کے ڈونگرے برس جاتے ہیں اور لوگ سینما کے باہر کیو پر کیو لگائے کھڑے ہیں مجھے خود ایسی اوٹ پٹانگ کہانیاں بہت پسند آتی ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا لیکن جو پڑھنے، مرنے میں ہنساتی اور رلاتی چلی جاتی ہیں کیونکہ اندر سے میں بھی ایک بچہ ہوں چھوٹا سا۔ تمہاری طرح اس طرح آؤ بچو! اوٹ پٹانگ تصویریں دیکھیں اور کہیں ۔۔۔ الف سے اوٹ پٹانگ!

## الف سے ان ہونی

الف سے ان ہونی ہوتی ہے اس ہونی کا فلم سے گہرا تعلق ہے۔ ان ہونی وہ ہوتی ہے جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی۔ ایسی کہانی جو زندگی میں کہیں نہ دکھائی دے ایسے ڈریس جو لوگ کبھی نہیں۔ ایسے مکان جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے ایسے ناچ جو اور کہیں نہیں ناچے جاتے ایسے سپاہی جو ایک تلوار سے ساری فوج کو کاٹ کے پھینک دیتے ہیں۔ اور دوسری ایسی ان ہونی باتیں آپ صرف فلم میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور لوگ دراصل اسی لیے فلم دیکھنے جاتے ہیں، کیونکہ یہ ہونی ہے یا ہو سکتی ہے اسے دیکھنے کی چاہ کیسے ہو، اسی لیے ساری فلم ان ہونی سے شروع ہوتی ہے اور ان ہونی پر ختم ہوتی ہے یہ ان ہونی وہ سندر سپنا ہے جو ہر شخص اپنے دل میں چھپائے گھومتا ہے اور جسے وہ صرف فلم کے پردے پر دیکھ سکتا ہے اور محل سے زیادہ سندر سپنے کون دیکھ سکتا ہے اس لیے ان ہونی کو یاد رکھو اور کہو ۔۔۔ الف سے ان ہونی۔!

## الف سے ایکسٹرا

الف سے ایکسٹرا ہوتا ہے اور ہوتی بھی ہے یعنی ایکسٹرا مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ فلم میں جب کسی گلی، محلے یا بازار کا سین دکھایا جاتا ہے، تو اس میں چلتے پھرتے والے لوگوں کی اکثریت ایکسٹرا ہوتی ہے ۔۔۔ وہاں بیچنے والا ایکسٹرا ہے اور وہ جو دکان پر کھڑا ہو کر ایک پیسہ کا لال کاغذی پان کی فرمائش کر رہا ہے ۔۔۔ وہ بھی ایکسٹرا ہے ۔۔۔ بادشاہ کے دربار میں ایکسٹرا ہوتے ہیں۔ وہ دربان جو لال رنگ کا جامہ پہنے سنہرے رنگ کی موٹھ والی چھڑی ہاتھ میں لیے بادشاہ کے آگے چل رہا ہے اور بلند بانگ لہجے میں چلا رہا ہے باادب باملاحظہ ہوشیار وہ بھی ایکسٹرا ہے کبھی کبھی بادشاہ بھی ایکسٹرا ہوتے ہیں جیسے کہ آج کل کئی ملکوں میں ہوتے ہیں یعنی سنہری وردی پہنے تخت پر بیٹھے ہیں مگر مجال نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جوتے کا تسمہ بھی کھول سکیں۔

مجھے آج کل کے بادشاہوں اور فلم کے ایکسٹرا لوگوں کو دیکھ کر بڑی ہمدردی ہوتی ہے مگر دراصل یہ لوگ کسی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں ۔۔۔ فلم کے ایکسٹرا فلمی دنیا میں سب سے کم کماتے ہیں جیسے کسی کو پانچ دن تو کسی کو دس دن کام ملتا ہے۔ باقی دن بیکار ملتے ہیں کس طرح چلاتے ہیں یہ بھگوان ہی بہتر جانتا ہے مگر اس پر بھی یہ فلمی دنیا سے الگ نہیں ہو سکتے کسی قیمت پر الگ نہیں ہو سکتے اگر یعنی سنئے تو کسی فلمی ایکسٹرا کو جو مہینے میں بڑی مشکل سے پچیس روپے کماتا ہے ۔۔۔ پچاس روپے کی نوکری پیش کر کے دیکھ لیجیے وہ ٹھکرا دے گا کام کو بھی اور آپ کو بھی اسے فلمی دنیا میں پانچ دن کام کر کے باقی پچیس دن بھوکا مرنا منظور ہے مگر وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا ۔۔۔!

دراصل یہ ایکسٹرا وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہیرو یا ہیروئن بننے کی خواہش میں ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر، اپنے ماں باپ، بہن بھائی، جائیداد، بیوی بچے سب چھوڑ کر یہاں چلے آتے ہیں اور بھیڑوں کی طرح ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر دھکیلے جاتے ہیں ان میں سے ہر مرد یا عورت کی آنکھوں میں ایک خواب بسا ہے کبھی وہ ہیرو یا ہیروئن بن جائیں گے اور بدقسمتی سے فلمی دنیا میں چند ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایک ایکسٹرا دو سال تک ایکسٹرا رہا پھر اچانک ہیرو ہو گیا ایک لڑکی جو پانچ سال تک ایکسٹرا رہی اچانک ہیروئن بن گئی اور اسپالا میں بیٹھ گئی۔ اسی لیے یہ خواب کسی ایکسٹرا کی آنکھوں سے نہیں ہٹایا جا سکتا ۔۔۔!

میں ایسے ایک فلمی ایکسٹرا دوست کو جانتا ہوں۔ آج سے دس سال پہلے وہ اپنی مدرسے کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی میں ہیرو بننے کے لیے آیا تھا اس کی شکل آزاد اور ملاوٹ سے بھرپور دلیپ کمار جیسی رکھتا ہے اس لیے اسے آپ کو کسی طرح دلیپ کمار سے کم نہیں سمجھا۔ فلمی دنیا میں آتے ہی سب سے پہلا کام ملا، وہ لاٹھی اٹھا کر ایک ٹھاکر کے پیچھے چلنے کا تھا۔ دس سال بعد آج بھی اسی طرح لاٹھی اٹھا کر سٹوڈیو کے دروازے پر کھڑا نظر آتا ہے مگر فلمی دنیا سے باہر نہیں جاتا ہے ۔۔۔!

فلم کا ایکسٹرا آج کی دنیا کا ڈان کوئیکزوٹ ہے وہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہے اور اپنی چاہت کا نیزہ ہاتھ میں لیے کسی چکتی ہوئی چکی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اسے اس کے حال میں گرفتار رہنے دو اور سبق سیکھو کہ ۔۔۔ الف سے ایکسٹرا ۔۔۔!

## الف سے ایکٹر!

ایکٹر مٹی میں دو سادرے آتا ہے۔ پنجاب سے آتا ہے اور یوپی سے آتا ہے اور حیدرآباد سے ...

یں خوبصورت اداکاراؤں کی مانگ بڑھ گئی ہے تو حسینہ اداکار سے مل آتا ہے ۔ ایکسٹرا کا سینہ چوڑا، ٹانگیں پتلی، آنکھیں کھلی ہوئی اور صورتیں مسخری ہوئی ہوتی ہیں اکثر وہ اوروں میں مردوؤ پر ٹہلتا نظر آتا ہے۔

ایکسٹرا دو قسم کا ہوتا ہے چھوٹا ایکسٹرا اور بڑا ایکسٹرا ——— چھوٹے ایکسٹرا کا حال تو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بڑے ایکسٹرا کا حال سنتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔

ایکسٹرا، ایکسٹرا سے اوپر درجے کا ہوتا ہے جو فلم کا کیریکٹر ایکٹر کہلاتا ہے آرٹ اور فن کے میدان میں وہ ایکسٹرا تو کیا کسی ہیرو یا ہیروئن کو خاطر میں نہیں لاتا ——— اس کا خیال ہے کہ فلمی دنیا کا سارا بھرم اس کے دم سے قائم ہے اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے کیونکہ ایکسٹرا اپنے فن کا پجاری ہے اور فلم اپنے کیریکٹر وغیرہ وں کے باوجود ایک فن ہے جس کا پجاری ایکسٹرا ہے مگر ایکسٹرا بننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک ڈاکٹر بننا یا انجینئر بننا اس میں علم اور تجربے کے ساتھ ساتھ خون پسینہ ایک کر دینا پڑتا ہے اس کام کے لیے دل اور روح کا انہماک چاہیے اور برسوں کی ریاضت ہماری فلم انڈسٹری بھی اچھے ایکسٹروں سے خالی نہیں ہے، بلکہ بعض تو ان میں سے اتنے اچھے اور اپنے کام کے اتنے ماہر ہیں کہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے فلم ایکٹر کے مقابلے پر رکھے جا سکتے ہیں مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ دل میں کام کی لگن ہو اور پیسے کا زیادہ لالچ نہ ہو سب رنگ برنگی شرٹ پہننے سے اچھا ایکسٹرا نہیں بنتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایکسٹرا جذبات و احساسات کی ست رنگی دنیا پر قادر ہو ———!

اس لیے کہو ——— الف سے ایکسٹرا

## الف سے ایکٹریس

کالی، پیلی، نیلی، گوری، سانولی، حنائی ——— ایکٹریس ہر رنگ کی ہوتی ہے اور عمر ہونے تک ہر رنگ میں ملتی رہتی ہے۔ ایکٹریس بھی دساور سے آتی ہے اور اکثر حالتوں میں کسی کے ساتھ بھاگ کر آتی ہے اور پھر کسی ہوٹل میں قیام کرتی ہے اور اپنے زیور فروخت کر کے گزر کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ فلم کمپنی میں پہنچ جاتی ہے۔ فلم کمپنی میں خوبصورت جسم کو آرٹ کہتے ہیں اور پروڈیوسر سے لے کر سیٹ کے چپراسی تک آرٹ کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ ایکسٹرا کے مقابلے میں ایکٹریس بہت جلد ترقی کر لیتی ہے اور جتنی زیادہ خوبصورت ہوگی، اتنی ہی جلدی ترقی کرے گی۔ بعض ایکٹریسوں کو ہیروئن بننے میں کئی سال لگ جاتے ہیں لیکن کئی ایک خوش قسمت ایکٹریسیں ایسی بھی ہیں جو ایک ہی رات میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر لیتی ہیں۔

ہر فلم بھی ایکٹریس پر چلتی ہے فلمی زندگی کا محور ہی تماشا ہے ———!

ایکسٹروں کی طرح ایکٹریسیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں چھوٹی اور بڑی ———! چھوٹی ایکٹریس اکثر اپنے حمائتی یا شوہر کے ساتھ دیکھی جاتی ہے بڑی ایکٹریس پروڈیوسر کی کار میں کیونکہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہوتا، کوئی حمائتی نہیں ہوتا۔ بڑی ایکٹریس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سیٹ پر آ کر سو جاتی ہے اور اس کا موڈ اکثر بگڑ جاتا ہے ——!

اس لیے کہو ——— الف سے ایکٹریس۔

## الف سے اوٹ !

فلمی پردے کی اوٹ میں کیا ہوتا ہے یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ جگمگاتے ہوئے فلمی پردے کے پیچھے کتنا اندھیرا ہے! پردے کی اوٹ میں ہیرو اور ہیروئن شاید ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں، لیکن پردے پر آ کر ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور ہیں ——— ایک ایکسٹرا دو دن کا بھوکا ہے، لیکن فلم کے پردے پر وہ کھانے سے بھری ہوئی تھال کو ٹھوکر مارنے پر مجبور ہے کیونکہ اسے یہ پارٹ ہی ایسا دیا گیا ہے۔ وہ عورت جو فلم میں ایک شریف گرہستن سی ہوئی اپنے خاوند سے لاتیں کھا رہی ہے، گھر جا کر ہر روز اپنے شوہر کو پیٹتی ہے

اس لیے صرف پردے کی چمک ہی کو مت دیکھو اس کی اوٹ کو بھی یاد رکھو اور کہو ———

الف سے اوٹ !

## الف سے اشتہار !

کوئی فلم اشتہار کے بغیر نہیں چل سکتی۔ فلم بننے سے پہلے اشتہار دینا پڑتا ہے فلم بننے کے دوران میں اشتہار دینا پڑتا ہے فلم بننے کے بعد تو دھڑا دھڑ اشتہار دینے پڑتے ہیں کچھ لوگوں نے فلم کی کامیابی کا یہ فارمولا بنا رکھا ہے۔

ہیرو، ہیروئن اور اشتہار !

ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو فلمی ہیرو اور ہیروئن بھی سیکس (SEX) اور گلیمر کے اشتہار معلوم ہوتے ہیں گویا فلم میں جو کچھ ہے اشتہار ہی اشتہار ہے باقی سب آمد ہے۔ اسی لیے تو بعض فلم اسٹار اشتہار کے لالچ میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی ایک کھلا اشتہار معلوم ہوتی ہے وہ انسان نہیں اخبار کا ایک کھلا ورق معلوم ہوتے ہیں۔

الف سے اشتہار !!

---

## بقیہ : طالب علمی سے پروفیسری تک

"اشتیاق! آئندہ عمر میں تمہیں بہت سے اعزاز حاصل ہوں گے لیکن جوانی دوبارہ نہیں آئے گی، لہٰذا یہ تمنا نہ رکھو کہ جوانی جلد گزر جائے۔" مجھے کم سنی کے باوجود وہ عہدہ مل گیا یا میں جب اسے کالج کے پرنسپل بخاری صاحب کے پاس جاتا تھا۔ تو نوجوان استادوں سے ملنے کے زمانے کے بعد تک ان کی آنکھوں میں ایک شفقت آمیز چمک پیدا ہوتی ہوئی پاتا جو اس زمانے میں میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب وہی چمک جب میری آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے، تو مجھے بخاری صاحب کی آنکھوں کی چمک اور ان کے شفقت آمیز فقرے یاد آتے ہیں، یا کیمبرج میں میرے استاد ڈاکٹر وائٹ ہیڈ صاحب کا کیمبرج کے دستور کے خلاف مجھے "مائی ڈیئر بوائے" کہہ کر خطاب کرنا اور پھر خود ہی یہ معذرت کرنا کہ "مجھے امید ہے کہ تم بُرا نہیں مانو گے، میری تمہاری عمر کا تفاوت میرے اس جملے کو کچھ زیادہ نامعقول نہیں بناتا۔"

یا ایک مرتبہ جب میں استاد تھا، تو شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب قبلہ کا ثقلِ سماعت کی وجہ سے میرے کچھ عرض کرنے کو غلط سمجھنا اور بہت خفگی کا اظہار کرنا اور دوسرے دن مجھے بلا کر یہ کہنا "کل مجھے مغالطہ ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ تم نے وہ نہیں کہا تھا جو میں نے سمجھا، غصہ اسی پر زیادہ آتا ہے جس سے زیادہ محبت ہو" اور میرا عرض کرنا کہ ان کی خفگی کا اظہار بھی میرے لیے باعثِ سعادت ہے، یا میرے استاد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا تقسیم کے بعد پریشان ہونا اور جب میں وزیر ہوا، تو میرا ڈرتے ڈرتے یہ کہنا کہ وہ میرے پرائیویٹ سیکرٹری ہو جائیں، اس لیے کہ یہی ملازمت کلی طور پر میرے اختیار میں تھی اور ان کا قبول کر لینا اور دورانِ وزارت میں متعدد مرتبہ مجھے ڈانٹ دینا، مگر میری خیر خواہی کو انتہا تک پہنچا دینا یا میرا آخری مرتبہ مرض الموت کے دوران میں بخاری صاحب کی طبیعت کا حال دریافت کرنے کو جانا، اور ڈاکٹروں کی تاکید کے باوجود ان کی اہلیہ کا مجھے ان کے پاس لے جانا اور جب میں نے عجلت سے واپس آنا چاہا کہ ایسی حالت میں بارِ خاطر نہ ہوں، ان کا مسکرانا اور کہنا!

"اشتیاق! تمہارے آنے سے میری طبیعت کو فرحت ہوتی ہے اور اس سے فائدہ ہوتا ہے، نقصان نہیں ہوتا۔"

غرض اس زندگی میں جو باتیں یاد آ کر دل بے تاب کر دیتی ہیں، وہ بزرگوں اور استادوں کی شفقت اور چھوٹوں اور شاگردوں کی محبت ہے جو خوبیاں ہیں وہ ان ہی کے طفیل میں ملی ہیں جو برائیاں ہیں وہ خود میرے شومئی اعمال کا نتیجہ ہیں۔

# جدید تعلیم کی تدوینِ نو

پروفیسر محمدؐ قطب (مکہ)

دنیائے اسلام کے موجودہ سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے اس میں صحیح اسلامی روح کا فقدان ہے۔ اللہ کے قانون کو قائم کرنا اور اسے اس کی حیثیت پہچاننا کہ ایک جامع اور برتر طریق تعلیم کا متقاضی ہے۔ ماضی میں مسلمان اسی زندگی کی بنیاد اسلام پر رکھتے تھے تاکہ تربیت ان کی رگ رگ میں پیوست ہو اور ان کے اندر اسلامی اخلاق اور اسلامی طرز عمل کو تقویت حاصل ہو تو ہمارے گھر اور وقت اکثر ... جو تعلیم ہے۔ اسی طرح کسی ایسے شخص سے ملتا اور اس کے پاس صحیح اسلامی تعلیم ہے جس کے دل میں خوف خدا ہے، پاکیزہ ہو اور جو اپنے عمل میں احکام الٰہی کو پیش نظر رکھتا ہو مگر صورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیم کو عام زندگی میں یا سکول میں صرف کلاس روم کے ایک سبق تک محدود رکھنے کی بجائے اسے ساری زندگی پر پھیلا دیا جائے تاکہ اسلامی عقائد بچوں اور نوجوانوں کے ذہن میں راسخ ہو جائیں کے لئے لازمی ہے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں جدید مضامین کی از سر نو تدوین کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے گھر اور بازار اسلام کی تربیت گاہیں بن جائیں۔ آج کل کی طرح مخالف اسلام رجحانات پیدا کرنے والے نہ رہیں۔

آج کل یہ حالت ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کا صرف ایک پیریڈ ہوتا ہے لیکن بالعموم ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ماحول اسلامی نظر نہیں آتا بلکہ اسے اگر غیر اسلامی کہا جائے تو بجا ہوگا علاوہ ازیں ہم جو مضامین پڑھاتے ہیں اور جس طرح سے پڑھاتے ہیں وہ بالکل یورپی ہے اور یورپ کی دنیا مذہب کی مخالف ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو سیکولرزم کے حامی اور مذہب کے بارے میں غیر جانبدار کہتے ہیں۔ یورپ میں تحریک احیائے علم کے بعد سے سائنس اور مذہب کے درمیان معرکہ چلا آ رہا ہے وہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب اور سائنس کے درمیان قابل نفرت دشمنی ہے۔ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی سائنسی مقالہ میں اللہ تعالیٰ کا نام آ جاتا ہے تو وہ اسے سخت قابل اعتراض کہتے ہیں اور ان کے نزدیک ساری ریسرچ داغدار ہو جاتی ہے۔ (اعوذ باللہ)

بقول ڈارون "اس سے ایک حادثہ میکانکی حیثیت میں ایک مافوق الفطرت عنصر داخل ہو جاتا ہے" جدید یورپی جاہلیت نے مذہب اور سائنس کو الگ الگ اور دشمن بنا رکھا ہے۔ مگر ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم اس مجرمانہ طریق تعلیم کو ختم کریں۔ جس کے ذریعے نوجوانوں کے ذہن زہر آلود کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اپنے سکولوں اور کالجوں میں سائنس کو مذہب کے معیار اور مذہب کو سائنس کے معیار پر نہیں پڑھانا چاہیئے۔ اب میں مختصر عرض کرتا ہوں کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے والے موجودہ مضامین کو کیسے از سر نو مدون کرنا چاہیئے ہم اپنے سکولوں اور کالجوں میں نظریہ ڈارون بطور ایک مفروضہ یا نظریہ (جسے غلط یا صحیح ثابت کیا جا سکتا ہو) نہیں پڑھاتے بلکہ اسے ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت کے طور پر پڑھاتے ہیں، حالانکہ اس نظریہ کی ابتداء سے اب تک حقیقت کی حیثیت نہیں ہو سکی اور تو اور جولین ہکسلے جو ڈارون کا شدید مداح اور دہریہ ہے اپنی کتاب "انسان جدید دنیا میں" کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ بندر اور انسان کا درمیانی فاصلہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو چیونٹی اور بندر کے درمیان ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو سکولوں اور کالجوں میں نظریہ ڈارون پڑھاتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ بین الاقوامی یہودیت نے مذہبی عقائد اور اعلیٰ انسانی اقدار کو تباہ کرنے کے لئے نظریہ ڈارون کا مسلسل اور زبردست استعمال کیا ہے۔

ہمارے سکولوں اور کالجوں میں یہ بھی پڑھایا جاتا ہے کہ ماحول انسان کی زندگی کی عادات، روایات، احساسات، افکار اور طرز عمل کو بناتا ہے اور یہ بات نظریہ ڈارون ہی کا عکس ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں کوئی سائنسی ثبوت مہیا نہیں ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص کا کوئی مذہبی عقیدہ نہیں وہ آسانی سے ایسے ماحول کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماحول اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے مگر جس شخص کو صحیح عقیدہ میسر ہو

اور اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا قانون موجود ہو جو اس کی زندگی اور طرزِ عمل کو منظم اور متشکل کرتا ہو، اس کی زندگی، عادات، روایات، احساسات، افکار اور طرزِ عمل ماحول کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کے عقیدے اور قانون کے تابع ہوتا ہے (یعنی وہ اپنا ماحول خود پیدا کرتا ہے۔)

تاریخِ اسلام پر نظر ڈالنے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلامی عقائد نے کیسے ایک امت کو جنم دیا۔ جسے اللہ نے بہترین امت فرمایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب یہ امت اپنے عظیم الشان ماضی سے بالکل کٹ چکی ہے۔

اسی تاریخ کی طرف آئیں۔ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ جس غلط نگاہ سے کیا جاتا ہے وہ اسلامی نظریہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ اس سے متصادم ہے۔ تاریخی نظریہ انسانی ترقی کو مادی اور جغرافی کاموں سے مربوط کرتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہم مختلف تہذیبوں کی تعریف کرتے ہیں جیسے یونانی تہذیب، رومن تہذیب، تہذیبِ بابل، تہذیبِ اسیریا یا تہذیبِ فراعنہ۔ اسی نظریہ کے تحت ہم موجودہ تہذیب کی بھی تعریف کرتے ہیں اور اسے بہترین اور اعلیٰ ترین قرار دیتے ہیں

مگر اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان یا تو بہترین حالت میں ہے (احسن التقویم) اور یا پست ترین حالت میں (اسفل السافلین)۔ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے مقرر کردہ قوانین پر چلتا ہے تو وہ بہترین حالت میں ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا اور اس کے قوانین پر عمل نہیں کرتا تو وہ پست ترین خلائق سے ہے۔ تہذیب و تمدن کا مادی پہلو خواہ وہ ترقی یافتہ ہو انسانی ترقی جانچنے کے لئے کوئی معیار نہیں۔ قرآن پاک کئی ایسی اقوام کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے زمین پر ایسا کچھ بنایا ہوا تھا، بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد رکھی تھی، بڑی تعمیرات کی تھیں مگر وہ انہیں جاہلیت ہی کی تہذیبیں کہتا ہے کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے تھے نہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مانتے تھے۔ ان کے پاس ایسے علوم تھے، جن میں وہ ماہر تھے، مگر وہ حدائق سائنس کے منکر تھے جس کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔

موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دور ترقی کے باوجود تاریخ کا بدترین دورِ جاہلیت ہے کیونکہ اس دور میں انسان کے اندر جو روحانی اور اخلاقی پستی آئی ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی مادی ترقی محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے جب تک اس پر صحیح عقائد اور اعلیٰ اخلاق کی عمارت تعمیر نہ کی جائے، وہ تہذیب قابلِ تعریف قرار نہیں دی جاسکتی۔ کافر بھی مادی تہذیب پیدا کرسکتا ہے اور مومن بھی۔ کافر اپنے مادی وسائل کو شیطانی عقائد پھیلانے میں صرف کرتے ہیں اور مومن ان سے اسلامی عقاید اور اعلیٰ اخلاق قائم کرنے اور پھیلانے کا کام لیتے ہیں۔

سوشیالوجی میں ہم ایک یہودی ڈرخیم کے نظریات پڑھاتے ہیں، جو کہتا ہے کہ مذہب، اخلاقیات، شادی اور خاندان وغیرہ معاشرے کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری نہیں۔ سائیکالوجی میں ہم فرائڈ کے نظریات پڑھاتے ہیں جو مذہب کو انسانی فطرت کا لازمی جزو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ جہاں تک کیمسٹری، فزکس، بیالوجی، ایسٹرالوجی، ریاضی، انجینئرنگ اور میڈیسن کا تعلق ہے، ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھاتے ہیں کہ نیچر نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کی رہنمائی کرتی ہے اور وہی اس کا انتظام چلاتی ہے اور جو قوانینِ فطرت ہیں وہ اٹل، ناقابلِ تبدیل اور مطلق العنان ہیں۔ حالانکہ یورپ نے نیچر کا لفظ اللہ تعالیٰ کی بجائے گھڑا ہے۔ انہوں نے اس طرح ایک ایسا خدا تراشا ہے جو ذمہ داریوں سے مبرا ہے۔ اس خود ساختہ خدا کے ذمہ انہوں نے تخلیق، ہدایت اور کائنات کا انتظام چلانے کا کام ڈال دیا۔ بقول ڈارون "نیچر ہر چیز کو تخلیق کرتی ہے اور اس کی تخلیق کی کوئی حد نہیں"۔ سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو اس طرح سے مضامین پڑھانے کے بعد ہم کیسے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہماری نئی پود اسلامی عقائد سے بہرہ ور ہوگی۔ ایک طرف یہ سارے مضامین اور ان کا انداز تعلیم ہے اور دوسری طرف دینیات کا ایک پیریڈ بھلا اس روحانیت کش اور مذہب دشمن ماحول میں کر سکتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تعلیمی نصابات میں اسلام کو اس کا صحیح مقام دیں تو ہمیں دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہم مذہبی تعلیم کو صرف رسمی یا روایتی وعظ تک محدود نہ رکھیں۔ دوسرے یہ کہ مندرجہ صدر جملہ مضامین کے نصابات کو اسلامی عقائد کی روشنی میں از سرِ نو لکھیں۔ جب تک بچوں کے تصورات، انداز فکر، اخلاق اور طرزِ عمل اسلامی نہیں ہوں گے وہ اسلام کے صحیح فرزند نہیں بن سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنے تمام انسان کو واعظ بنا دیں، ایسا کرنے سے ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ رسمی مذہبی وعظ سارے دن میں چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ مختلف مضامین کے نصابوں کو از سرِ نو لکھنا چاہیے۔ مثلاً بیالوجی کی کتابوں میں جہاں کہیں لفظ قدرت آتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ لکھ دیں۔ اسی طرح فزکس اور کیمسٹری میں مادے کے خواص بیان کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ایسٹرالوجی کا مضمون پڑھاتے ہوئے ہم اس کی وسعت اور نظام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں اسلامی شعور پیدا کرسکیں گے۔ تاریخ کے بارے میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ ہمیں شخصیتوں اور واقعات کا جائزہ لیتے وقت اسلامی معیار کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اسلام ہر چیز کا وزن صداقت کی میزان سے کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حقائق کو تبدیل کردیا جاتے ہم صرف ان کی قیمت لگانے کا معیار بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم انہی شخصیتوں کو عظیم کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کے بندے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں اپنی جانیں دیں۔ جب طالب علم تاریخ، سوشیالوجی، اقتصادیات، سائیکالوجی، لٹریچر اور دیگر مضامین کا مطالعہ اس انداز سے کرے گا تو اس کا ذہن اسلامی سانچے میں ڈھل جائے گا۔ وہ محسوس کرے گا کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہوگی اور ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ترساں رہے گا۔

یورپی سرمایہ دارانہ جمہوریتیں یہ مضامین اپنے نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر رکھ کر پڑھاتی ہیں اور کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک یہ مضامین پڑھاتے وقت اپنا نقطۂ نگاہ پیشِ نظر رکھتے ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں کے سکولوں اور کالجوں میں یہ مضامین پڑھاتے وقت اسلامی نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کریں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج کل ہم اسلامیات کے جو سبق پڑھاتے ہیں وہ بالکل بے جان اور روکھے پھیکے ہوتے ہیں حالانکہ اسلام کی روح میں بہت وسعت اور جاذبیت ہے۔ اسلامی اصولِ زندگی کے باوجود زندگی سے معمور ہیں اور آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایسے اصولوں سے نئی نسل اور باقی دنیا کو محروم رکھنا صرف زیادتی ہی نہیں بلکہ جرم ہے۔

• علامہ اقبالؒ • لیاقت علی خاں
• فضل الحق • سر راس مسعود

# تعلیمِ نسواں

(تعلیمِ نسواں کسی بھی ملت کے ترقیاتی پروگرام کا ایک اہم جزو ہے لیکن ہمارے ملک میں تا حال اس بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اسلام عورت کو معاشرے میں ایک اہم مقام دیتا ہے اور نظامِ تعلیم کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ موجودہ نظام عورتوں کے لیے بالکل ہی غیر افادی بلکہ مضرت رساں ہے۔
اس موضوع پر ہم علامہ اقبال، سر راس مسعود، مولوی فضل الحق اور لیاقت علی خاں کے خیالات پیش کر رہے ہیں "محور")

## علامہ اقبال!

میں کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ بفحوائے آیت کریمہ الرجال قوامون علی النساء میں مرد و عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کو جُدا جُدا خدمتیں تفویض کی ہیں اور ان فرائض کی جداگانہ صحیح اور باقاعدہ انجام دہی ہی نوعِ انسان کی صحت اور فلاح کے لیے لازمی ہے مغربی دنیا میں جہاں نفسانفسی کا عالم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے اُلٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے سخت پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے افرادِ قوم کی شرح ولادت پر جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسب معاش کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی اقتصادی حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی لیکن تجربے نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو ہی نوعِ انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لیے آمادہ ہوں کہ زمانہ حال میں کسی ملت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے نشو و نما پانا محال ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم کے لیے بغرض تکمیلِ صحت اسی تمدنی آب و ہوا کی تمدنیت کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب کرنا قرینِ مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اظہار کی تقلید میں جلدی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظامِ قومی کے اعضائے رئیسہ میں اختلالِ عظیم واقع ہونے کا خطرہ ہوگا اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں پس ایسی قوم کی خاص نوعیت، اسلام کی تعلیم اور عالمِ نسواں کے متعلق علم الاعضاء اور علم الحیات کے انکشافات کو مدّنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو اسلامی معاشرے میں بدستور انہی حدوں کے اندر رہنا چاہیے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے اور جو حد اس کے لیے مقرر کی گئی ہے اسی لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیے۔

پس اپنی قومی ہستی کے مسلسل بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتداءً ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی علوم، علمی تدبیر خانہ داری اور علمِ اصولِ صحت پڑھایا جائے اس سے ان کی دماغی صلاحیتیں اس حد تک نشو و نما پائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائضِ اوّلیں ہیں۔ تمام وہ مضامین

جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں، با احتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لیے کوئی خاص نصاب تعلیم متعین و مرتب نہیں کیا اور ان میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی میں ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی سو رایخ وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے، کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

**ابوالقاسم فضل الحق** جب وکیل کو قانون کی اور ڈاکٹر کو علم ادویہ اور علم تشریح کی تعلیم دی جاتی ہے تو وکیل وکیل اور ڈاکٹر ڈاکٹر ہوتا ہے۔ اگر وکالت کے طالب علم کو علم ادویہ اور ڈاکٹری کے طالب علم کو قانون پڑھایا جائے گا، تو نہ ڈاکٹر ڈاکٹر ہوگا اور نہ وکیل وکیل۔ اسی اصول پر ہم کو اگر گھر والی کی ضرورت ہے، تو اس گھر والی کو امور خانہ داری میں ماہر ہونا چاہیے۔ میرا یہ نظریہ کسی تعصب یا تنگ خیالی پر مبنی نہیں۔ جرمنی، اٹلی اور بعض دیگر مہذب کہلانے والے ملکوں میں جو قانون جاری کیے جا رہے ہیں، ان کا رُخ بھی اسی جانب ہے۔ دانایانِ فرہنگ کئی نسلوں کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں کا پہلا فرض انتظامِ خانہ داری ہے۔ کیونکہ ان کا یہ تلخ تجربہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ عورتیں نہ فقط انتظامِ خانہ داری سے نابلد بلکہ اس سے متنفر بھی ہو گئی ہیں۔

**لیاقت علی خاں** عورتوں کی تعلیم ہماری قومی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کا خیال ہے کہ اسے کسی علیحدہ مسئلے کی حیثیت دینا مناسب نہیں، مگر ہم مسلمان اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کے فرائض کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات دوسری اقوام کے تصورات سے مختلف ہیں۔

اسلام نے حقوق و فرائض سے متعلق جو احکامات دیے ہیں، وہ مرد عورت دونوں سے متعلق ہیں۔ رسول کریمؐ نے مسلمانوں مرد اور عورت دونوں پر تعلیم کا حصول لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام نے ان دونوں کے لیے جو وظیفۂ حیات مقرر کیا ہے، وہ مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے باہمی اختلاط اور میل جول کو اسلام پسندیدہ نہیں سمجھتا۔ مذاہب عالم میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو ایک باوقار مقام عطا کیا اسے قانونی حقوق اور انفرادیت بخشی۔ تاریخ اسلام مسلمان عورتوں کے شاندار کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور انہوں نے حسن اخلاق بندی، خدمت اور ایثار کا مظاہرہ کیا ہے کہ وہ آج ہمارے لیے روشن مثال کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن انہوں نے جو شاندار کارنامے سر انجام دیے، وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے انجام دیے جو اسلام نے ان کے فرائض کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اب جبکہ عورت کے فرائض، وظائف، حقوق اور صلاحیتیں مرد سے مختلف ہیں، تو ظاہر ہے کہ عورتوں کی تعلیم بھی ایک الگ مسئلے کی حیثیت سے لی جائے گی۔ علاوہ ازیں غیر منقسم ہندوستان میں غیر اسلامی رسوم اور تعصبات و توہمات کے رواج اور مردوں کی عدم توجہی کی وجہ سے عورتوں میں تعلیمی پسماندگی ہے اور اس نے بےشمار مشکلات کو جنم دیا ہے۔ ان عوامل کی موجودگی میں ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم عورتوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے ایک مخصوص طریق کار اختیار کریں۔ یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ عام مسلمان عورتوں کی تعلیم کی ضرورت سے آگاہ ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک پڑھی لکھی عورت کسی قوم کے ثقافتی ورثے کی بہترین محافظ اور نئی نسل کی صحت مند نشو و نما کی یقینی ضمانت ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمان مغربی ممالک کے معاشرتی اور تعلیمی اداروں کی اندھا دھند تقلید پر کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ چند اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک کمیٹی عورتوں کی تعلیم کے مسئلے کا جائزہ لے اور ایک ایسی اسکیم تیار کرے جس میں ایک مسلمان عورت کے مخصوص مقام کو قائم رکھتے ہوئے اسے جدید سائنس اور علوم سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہوں۔

**سر راس مسعود** چونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خواتین کو کسی قوم کی بہترین روایات کا محافظ تصور کرتے ہیں، اس لیے مجھے ان چند رجحانات سے بڑا دکھ ہوتا ہے جو میں ان خواتین میں پاتا ہوں جنہوں نے وہ تعلیم حاصل کی ہے جسے غلطی سے مغربی تعلیم کہا جاتا ہے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جو تعلیم آج کل ہماری نوجوان لڑکیوں کو دی جا رہی ہے، اس کے باعث وہ لڑکیاں اپنے اس ثقافتی ورثے کو جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ملا ہے حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگی ہیں اور اس جذبۂ حقارت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کی زندگی کے طور طریقوں کی بندر کی طرح بھونڈی نقالی کرتی ہیں جو ان میں سے اکثر کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوگا۔

# طالب علمی سے پروفیسری تک

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

**● آپ نے اپنے کردار سے بے شمار طلبہ کو متاثر کیا ہوگا کیا کسی طالب علم نے بھی آپ کو متاثر کیا؟**

اسکول میں تو ابھی بہت کم عمر تھا اس لیے متاثر ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کالج میں طالب علم ایسے ہوا کرتے تھے جو اپنے اساتذہ کو متاثر کرتے تھے۔ پڑھانے کے بعد میرے شاگردوں کا بہت اثر ہوا۔ اس کا سبب تو شاید یہ ہے کہ میں ہمیشہ طلبہ سے بہت قریب رہا ہوں اور شاگردوں کو اس قدر قریب ہونے کا موقع ملتا ہے کہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں۔ میرے پڑھانے کا یہ طریقہ تھا کہ میں طلبہ کو ہمیشہ موقع دیتا تھا اور کبھی کسی رائے کو تنقید کے بغیر قبول نہ کریں۔ جب ایم اے کے طالب علموں سے خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ میرا کام معلومات بہم پہنچانا نہیں ہے، یہ تو تمہیں کتابوں سے میسر ہو سکتی ہیں۔ میرا فرض یہ ہے کہ میں تمہاری قوت تنقید کو بیدار کروں اور تمہیں متعدد الفاظ کی عادت سے آزادی حاصل کرنے کے قابل بناؤں جس میں اپنی تحقیقات سے کسی نتیجے پر پہنچتا تھا، تو سب سے پہلے ایم اے کی جماعت کے سامنے اسے پیش کرتا تھا۔ اس پر میرے شاگرد کڑی تنقید کرتے تھے اور اس طرح بہت سی خامیاں دور کرنے میں مدد و معاون ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مقالہ شائع ہو کر کسی علمی مجلس میں پیش ہوتا یا کسی جریدے میں طبع ہوتا تو میں نکتہ چینیوں اور نقادوں کے سوالات کا زیادہ بہتر جواب دے سکتا تھا۔ مجھے بہت پختگی حاصل ہوئی ہے اس میں شاگردوں کا اثر شامل ہے۔ وہ طالب علم جو آئندہ تحقیقات جاری رکھتے تھے یا جنہوں نے میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالات لکھے ہیں ان سے تو میری معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ بعض مالک کے پروفیسروں کی شہرت کا سبب یہی ہے کہ انہیں قابل شاگردوں کی تحقیقات کی نگرانی کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔

کردار کی پختگی میں بھی یہ خیال بہت مفید تھا۔ جو تاثر استاد کے جیسے سے چھوٹے عمل کا طالب علم پر گہرا اثر پڑتا ہے، اس لیے ذمہ داری کا احساس رہتا تھا۔ پھر بھی ہمارے سے لغزش ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک دفعہ میں یونیورسٹی میں تھا کہ ایک مسلمان طالب علم سے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر ایک ایسا جملہ کہہ دیا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ میں ڈاڑھی رکھنے کو پسند نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے ایسے فقروں کی دوبارہ مرتبہ تکرار ہوئی۔ اس پر اس نے مجھے ایک خط لکھا جس میں احترام کے ساتھ لکھا کہ:

مجھے آپ کی ذات سے امید تھی کہ آپ ان عادات کو تقویت دیں گے جن کے ماتحت میں نے ڈاڑھی رکھی ہے لیکن مجھے اس امر سے بڑی مایوسی ہوئی کہ آپ بھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہم طالب علم اگر ایسا کرتے ہیں تو ہمیں اس کا اثر قبول نہیں کرتا لیکن آپ کے معمولی فقرے سے بھی میری بے حد دل شکنی ہوتی ہے۔

یہ تحریر پڑھ کر مجھے بہت ندامت ہوئی۔ میں نے اس طالب علم کو بلا کر اور میں نے یہ عرض کر دوں کہ وہ مجھے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھا۔ اظہار ندامت کیا اور میری قلب پر نقش کالحجر کی طرح یہ بات ثبت ہو گئی کہ کسی کو برے اور قابل اعتراض کا اظہار کسی مسلمان کی تحقیر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ شاگرد آج ایک نامور ڈاکٹر صاحب اولاد اور میرا دوست ہے۔ اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں یاد ہے لیکن مجھے یاد ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کی ڈاڑھی نہیں ہے تو اکثر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا الزام میرا حصہ کتنا ہے حالانکہ اس واقعے کے بہت دنوں بعد ڈاڑھی غائب ہوئی تھی۔

**● کیا آپ بھی طالب علمی کے زمانے میں ایسے ہی مضطرب ہوتے تھے جیسے آج کے طلبہ مضطرب ہیں؟**

ہمارے زمانے میں ایسا اضطراب نہیں تھا۔ ہم سیاسی اضطراب سے واقف تھے۔ جب تحریک خلافت میں روشن ہوتے اس وقت میں نے تعلیم ترک کر دی اور تحریک میں شامل ہو گیا۔ تین سال تک سیاسی کام کرنے کے بعد جب تحریک ختم ہوئی تو میں دوبارہ کالج میں داخل ہوا۔ لیکن یہ بات تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں تھی کہ تعلیم اور عملی سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ کبھی ہماری مرضی تھی کہ مطالبات منوائیں۔ ہمیں تو طلب اسلام اور آزادی کی محبت تھی۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ تعلیم اور سیاست کو الگ رکھا جائے۔ شاید یہ سب ہے کہ اس زمانے میں اعلیٰ درجے کے اساتذہ میسر تھے جن کی علمی قابلیت کا معیار بہت بلند تھا۔

**● کچھ ایسے واقعات سنائیے جن سے ان تعلقات کی وضاحت ہو جو آپ کے اور آپ کے اساتذہ کے درمیان تھا؟**

میں ایک طالب علم تھا اور مجھے تحقیق اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ میرے ایک استاد نے میرا ایک مقالہ پڑھا اور میرے لیے فوراً تحقیقات کے لیے ایک اسلامیہ کالج کا ذکر کیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے ایک مقالے میں ایک اختلافی نقطہ پیش کیا اور میرے استاد نے اس کی تعریف کی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ یہ میرا تقرر ہوا تو میرے محترم استاد شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کا ایک شعر یاد آیا:

اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو باپ کو استاد کو ∗ دیکھیے بڑھتا اپنے سے شاگرد کو اولاد کو

یہ بات بھی یاد ہے کہ ایک ہی دن میرا تقرر ہوا تھا اور میرے اعلان پر دلیل کا شکار تھا کہ میری عمر کم ہے تو میرا اپنے استاد ڈاکٹر SPEAR سے کہا کہ کاش عمر زیادہ ہوتی اور انہوں نے مسکرا کر یہ فرمایا

# اشتراکی نظامِ تعلیم

ولی زمل

اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جو الحاد، مذہب دشمنی اور اخلاقی و روحانی اقدار کی بیخ کنی کے لیے وجود میں آیا۔ طبقاتی کشمکش پیدا کر دو اور لوٹ مار کرو ہی میں افراد اور ان کی انفرادیت اس نظام میں ایک ناقابلِ لحاظ ہیں۔ شہریوں کی جان و مال اور ان کی محنت، آزادی اور ملک کے تمام وسائل و ذرائع کی مالک حیثیت ریاست ہوتی ہے جبکہ افراد کی حیثیت محض مشین کے پرزے کی ہے۔ ہر فرد کو کھلے بندوں عبادت کی آزادی نہیں ہے، مذہب کے خلاف مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے، اسے مزدور انقلاب کا نعرہ سنانے اسی لیے اپنی زندگی دی جاتی ہے اسے جبر و استبداد اور تکلیف و اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## اشتراکی مقاصدِ تعلیم

اشتراکیت کے علمبردار دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہم افراد کو سماج کے لیے ایسا کارآمد بنانا چاہتے ہیں کہ ان میں طلبہ کی فطری صلاحیتوں اور انفرادی خصوصیات کو اس طرح سے موزوں کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کو تمام مادی معاملات میں ترقی دے سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ طلبہ کو مادہ پرستی، مذہب دشمنی اور الحاد کا سبق دیتے ہیں اور انہیں جانوروں سے بدتر بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح چند افراد یا ایک مختصر سی پارٹی ملک کے سارے وسائل و ذرائع پر قبضہ کر کے عوام کو روٹی کے عوض ایک بے حس مشین بنا دیتی ہے۔ اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے تو ۔۔۔

رہتے ہیں۔ اگر ان میں سوچ سمجھ نہیں کیونکہ اس سے پہلے یہ تجربہ کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی ترقی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔

## اشتراکی نظامِ تعلیم ۔ خصوصیات

اشتراکی نظریہ تعلیم کی اساس پر جو تعلیمی نظام تشکیل پاتا ہے اس میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ تعلیم سب کے لیے عام اور لازمی ہوتی ہے تاکہ ملک کے تمام افراد اشتراکیت سے متاثر اور اس نظام کے مؤید اور خادم بن سکیں۔

۲۔ تعلیم کا پورا نظام حکومت کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ حکومت کے مرتب کردہ ڈھانچے کے مطابق ہر ایک کو تعلیم دی جاتی ہے۔ پرائیویٹ اداروں کے قیام کی قطعاً اجازت نہیں تاکہ طلبہ کے کانوں میں حکومت اور سرمایہ کے خلاف کوئی بات نہ پڑنے پائے۔

۳۔ تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ تعلیم خواہ عمومی نوعیت کی ہو یا پیشہ ورانہ، صنعتی ہو یا زرعی، سارے مصارف ریاست خود برداشت کرتی ہے۔ طلبہ کو کھانا، کپڑا اور تعلیمی سامان کی ریاست کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔

۴۔ بچوں کو کم عمری سے تعلیم کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ بچوں کے ذہن پر شروع ہی سے اشتراکیت کی گہری چھاپ پڑ سکے۔ اس کے لیے والدین کو خاص رعایت دی جاتی ہے۔ نرسری سکولوں کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا جاتا ہے۔

۵۔ مخلوط تعلیم ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ذہنی اور جسمانی کام سے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ سب کو یکساں ذریعے سے پڑھایا جاتا ہے۔

۶۔ مذہب، اخلاق اور روحانیت اور زندگی کی مستقل قدروں کو اس نظامِ تعلیم میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس مادہ پرستی، الحاد، مذہب دشمنی اور جنسی آوارگی کوٹ کوٹ

کوشش کی جاتی ہے تاکہ سماج کے موجودہ ڈھانچے کو جڑ سے اکھاڑ کر خالص مادہ پرستی اور دہریت کی بنیادوں پر سماج کی تشکیل کی جا سکے ۔

۷۔ درس گاہوں کے تمام مصارف حکومت برداشت کرتی ہے، مادی نقطہ نظر حاوی رہتا ہے دینی پہلو یکسر نظر انداز ہو جاتا ہے اور گویا عالمے جس سے مساوی فائدہ ہو اور ملکی پیداوار اور قومی دولت میں اضافہ کی توقع ہو اسی پہلو پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ تعلیم کا مقصد معاشی مسئلوں سے مربوط کر دیا گیا ہے طلبہ کو فارموں یا کارخانوں وغیرہ میں عملی تعلیم حاصل کرنا ہوتی ہے ۔

۸۔ ملک کے دیگر ادارے تعلیمی اداروں کے ساتھ پورا تعاون کرتے ہیں کیونکہ اشتراکی نظام میں ساری صنعت و حرفت تجارت و اقتصادی ملک حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لیے کارخانے، فارم اور دوسرے سرکاری ادارے مدرسوں کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں ۔

۹۔ ملک کو اپنے منصوبے کے مطابق جس قدر اور جس قسم کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے سب کو اپنے کنٹرول میں رکھا جاتا ہے تاکہ ریاست کی ضروریات اور افراد کی صلاحیتوں میں توازن رہے ۔

۱۰۔ نصاب تعلیم، درسی کتب اور طریق تعلیم سب کا تعین حکومت کرتی ہے طلبہ کو مضامین کے انتخاب اور اساتذہ کو طریق تعلیم وغیرہ میں آزادی نہیں دی جاتی، اسی لیے پورا نظام تعلیم جامد اور بے لچک ہو جاتا ہے اور اس میں جمود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

## خوبیاں

اس نظام میں بعض خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً

- افراد میں اجتماعی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کر دینے کی اسپرٹ اور جذبہ پیدا کرنے کی کوشش ۔
- طلبہ کو محنت و مشقت کا خوگر اور عادی بنایا جاتا ہے وہ ہاتھ سے کام کرنے کو عار محسوس نہیں کرتے ۔
- نظری تعلیم کے بجائے عملی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کے سبب طلبہ عملی زندگی میں کام آنے کے طریقوں سے واقف ہو کر زیادہ کارآمد انسان بنتے ہیں
- معاشی و معاشرتی مساوات اور دولت کی مساوی تقسیم پر زور دیا جاتا ہے جس کے سبب امیر غریب اور اونچ نیچ کا بہت زیادہ تصور نہیں رہتا ۔
- مفت جبری اور لازمی تعلیم کے سبب خواندگی (LITERACY) کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو جاتا ہے
- تعلیم میں یکسانیت کے سبب افراد میں وحدت فکر کا زیادہ امکان رہتا ہے
- سب حکومت کے کنٹرول میں ہونے کے باعث مدرسہ اور ریاست کے مختلف اداروں میں مکمل تعاون کے سبب تعلیم میں بہت سہولت ہو جاتی ہے ۔
- تعلیم پر ریاست کا مکمل کنٹرول ہونے کے سبب ملک کی ضرورت اور مناسبت سے تعلیم دی جاتی ہے اس سے تعلیم یافتہ بے کاروں کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا

---

- مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود کچھ اس قدر بنیادی خامیاں ہیں کہ تمام خوبیوں اور اچھے پہلوؤں پر پانی پھیر دیتی ہیں ۔

## خامیاں

- خدا سے بغاوت، مذہب دشمنی، اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا درس لے کر پروان چڑھنے والے افراد سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ صرف دوسروں کے حق میں ظالم ہوتے ہیں بلکہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور صحیح راستہ دیکھ نہیں سکتے ۔
- انفرادی آزادی کچل کر رکھ دی جاتی ہے خودی کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔
- جبر اور بیرونی دباؤ کے باعث طلبہ کو اپنی خواہشات دبانے اور ضمیر سے مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے وہ ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے طلبہ عمدہ سیرت و کردار کے مالک نہیں بن سکتے ۔
- مادہ پرستی اور افادی نقطہ نظر غالب ہونے کے سبب خود غرضی عام ہو جاتی ہے ۔
- ہر چیز اوپر سے ٹھونسنے کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ سب کام کو مجبوری اور بیگار سمجھنے لگتے ہیں اور جھوٹ، کام چوری کی عادت عام ہو جاتی ہے اور جانوروں کی طرح پوری قوم ڈنڈے کے اشارے پر چلنے کی عادی ہو جاتی ہے ۔
- پیداوار اور قومی دولت میں اضافے کو غیر معمولی اہمیت دے کر تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد کو معاشی حیوان کی سطح پر لا کھڑا کیا جاتا ہے کھانے کمانے کے سوا زندگی میں کسی اور چیز کی اہمیت نہیں رہنے دی جاتی ۔
- مملکت کے چند بڑے عہدیداروں کے سوا باقی عام افراد کو ذہنی جمود، تعطل کا شکار بنا دیا جاتا ہے ۔
- انفرادی تصور زندگی نہ ہونے کے سبب اخلاقی اور جنسی اعتبار سے غیرت، شرم و حیا اٹھ جاتی ہے ۔

# طلبہ کی قسمیں

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو سب کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور موسم بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبہ کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔

## قسم اوّل جمالی کہلاتی ہے

۔طلبہ عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازیں دھوبی حجام کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی پیسوراں میں ان کی مانت بانی جاتی ہے عروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں۔

روح روشن کے آگے سیج رکھ کر دہ ۔ سکتے ہیں

ادھر جاتے رکھیں یا ادھر آتے پردا۔

شعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی لمبا اور ایک یم میں تیغ کرکے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں

## دوسری قسم جلالی

طلبہ کی سے ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لے نکلتے ہیں اور جو دوسرا کے حرم لینڈ جاتے پھرتے ہیں کالج کی خوراک اچھی راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں فراکس ہوتے

## تیسری قسم خیالی

طلبہ کی سے یہ اکثر مذہب اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر آوارہ تلون خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آرلینڈ اور صیہات جسمی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں صحت جسمانی کو ارتقائے انسان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے علی الصبح بائیک چڑھ جاتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر کھڑے سانس لیتے ہیں۔ کالے عنصر ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں

## چوتھی قسم خالی

طلبہ کی سے یہ طلبہ کی خالص ترین قسم ہے ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں امتحانات مطالعہ اور اس قسم کے حرجے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے حسن معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچتے تھے ، اس سے آخر مسافرت ہوتے ہیں اور تعلیم ۔ اور نصاب ۔ اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبہ کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ وہ لوگ بیدھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت ملتا ہے اور اگر یہ ماں یا دائی کے ساتھ ہوں تو ان ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔!

تحریر سعد فاری

# دینی عنصر

# نصابِ تعلیم میں

## ایک جائزہ • ایک سروے

(لاہور کے ثانوی تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے دینی عنصر تعلیم کے میں سوالات کیے جن کا نتیجہ حسب ذیل رہا ——— محور)

◐ نصاب تعلیم میں کس قدر دینی عنصر شامل ہونا چاہیے؟

مکمل مذہبی ہو - - - - - - - - - - ۴٪

نصف حد تک مذہبی ہو - - - - - - ۳٪

تین چوتھائی حد تک مذہبی ہو - - - - - - - - ۲۴٪

موجودہ کافی ہے - - - - - - - ۳۲٪

دینی عنصر بالکل ختم کیا جائے - - - - - - - ۱٪

◐ آپ کے مضامین میں دینی تعلیم کس قدر ہے؟

کسی حد تک موجود ہے - - - - - - - ۱۵٪

بالکل نہیں - - - - - - - - ۸۵٪

◐ کیا موجودہ نصاب تعلیم طلبہ کی تعمیرِ شخصیت کر سکتا ہے؟

ہاں - - - - - - - - ۱۲٪

نہیں - - - - - - - - - ۷۲٪

کسی حد تک - - - - - - - - ۱۶٪

◐ کیا موجودہ نصاب تعلیم سے وابستگی اور اسلامی اقدار کی وضاحت کر سکتا ہے؟

ہاں - - - - - - - - - ۲۲٪

نہیں - - - - - - - - - ۷۸٪

سید اسعد گیلانی

# اقبال، دارالسلام، تعلیمی اسکیم

علامہ اقبال کی ایماء اور مشورے سے چودھری نیاز علی خان نے ادارہ دارالاسلام ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ اس سے دارالاسلام کی تعلیمی اسکیم میں علامہ کے نظریات کی ترجمانی مقصود تھی۔ ملک میں بے شمار تعلیم گاہیں موجود تھیں جن میں مسلمان بچے دینی علم حاصل کرتے تھے۔ ایسی تعلیم کا بس یہی کام تھا کہ وہ ان کو [illegible] کے لئے کچھ موزوں بنا دیں۔ ادھر ان میں مسلمان بچوں کو ان کے مذہب اور روایات سے حتی الوسع آگاہ رکھا جاتا تھا، لیکن علامہ کے نزدیک یہ سب کچھ ادھورا تھا اور اصل مقصد تعلیم کا وہ نظام تعلیم تھا جو انگریز نے ہندوستان میں رائج کر دیا تھا اور وہ جو غلامی پیدا کرنے کا ذریعہ تھا۔ اس کے ذریعے علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک خاص قسم کی ذہنیت پیدا کر کے اسے زندگی کا واحد سانچہ بنا دیا گیا تھا۔ گویا مروجہ علوم علامہ اقبال کے نزدیک علم نہیں، غلامی میں روٹی کمانے کا ذریعہ اور قوم کو غیر ملکی آقاؤں کے پاس گروی رکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا نام تھا۔ اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا:

"آج کل تعلیم زیادہ ہے، لیکن علم نہیں ہے۔ پہلے زمانے میں علم زیادہ تھا اور تعلیم کم تھی۔" [1]

انہوں نے دنیوی تعلیم کے مروجہ طریقے کو مسلمانوں کے لئے خصوصاً ناپسند کیا اور کہا:

"ہر ملک کی تعلیمی سرگرمیں مختلف ہوتی ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کا تعلق ہے خالص دنیوی تعلیم سے ان کے لئے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں۔" [2]

وہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں قرآن مجید کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور میں ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو کہا:

"وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے معاملہ میں ہماری قوم کی ماہیت سے زیادہ ماہر تھے۔"

نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی تعلیمی مساعی میں دین کے حروف کی شمولیت لازم ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں مسلمانوں کے تعلیمی عزائم پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو ان میں سیرچشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ نہیں پیدا ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے مابہ الامتیاز ہیں۔" [3]

ان کے نزدیک علم کو دین کے ماتحت رکھنے سے ہی حیدری اور فاروقی صفات پیدا ہو سکتی ہیں ورنہ یہ سے حالی علم صرف گولی سکھاتا ہے۔ مشہور ماہر تعلیم جناب [illegible] کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے، تو محض شیطنت ہے یہ علم۔"

علم حق اول حواس، آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ علم کو "مسلمان" کرے۔ بولہب را حیدر کرار کن۔

"اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لیے سراپا رحمت ہے۔" [4]

علامہ اقبال مسلمانوں کے بارے میں بے حد فکرمند رہتے اور ان کے زوال کے اسباب پر غور کرتے رہتے تھے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا:

"مسلمانوں کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے اور ملی اعتبار سے یہ چیز علماء کے ہاتھ میں ہے۔" [5]

چنانچہ مسلمانوں کے بے قومی اور دینی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے غیروں کے نظام تعلیم کو انہوں نے ذہنی غلامی سے تعبیر کیا۔

"میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں ایسے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے کیں۔ اب ہم ہمارے نوجوانوں کو دوسری قوم کی سوانح عمری سے واقفیت ہے، مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استشہاد کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ عقل اور رائے کے لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح التزام

---

[1] روزگار فقیر اوّل صفحہ ۴۲ [2] بیان حرف اقبال ۱۹ اکتوبر ۳۳ [3] آثار اقبال [4] اوراق گم گشتہ صفحہ ۴۸، ۴۹
[5] مقالات صفحہ ۳۱۲۔

خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو سر ورق اپنا رکھ سامنے رکھنا ہے تیس سال تمدن کا حلقہ بگوش بنانا ہے یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں" ؎

ملک میں غیر ملکی طرز کے نظامِ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے اسی خطبے میں کہا

"ہم اپنی قومیت کے لوسے کو اسلام نے آب حیات سے سینچ رہے ہیں اور اس طرح اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں ہم اپنے درمیان ایک ایسا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو کسی اجنبی مرکز کے ہونے کے سبب اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا" ؎

اس کے بعد انہوں نے اپنے خطبے کے آخر میں اپنے تصور دارالعلوم کا نقشہ پیش کیا

"یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں مسند نشین اسلامی مذہب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس کی مثالی تصویر کھینچنا آسان کام نہیں ہے اس سے لئے اعلیٰ تخیل، زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر کی ضرورت ہے" ؎

علامہ اقبال اس نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے جو مسلمانوں کو اطوار زمانہ سکھاتا تھا اور انسان کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈھال کر اسے غلامی کے سانچے میں ڈھال لیتا تھا وہ مسلمانوں کے لئے کسی ایسے دارالعلوم کی تلاش میں تھے

اسی کے ساتھ ان کے خیال میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ نظریاتی وطن کی ضرورت بھی تھی جس کا نقشہ وہ بار بار اپنے خطوط میں شرح کے ساتھ بیان کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم سٹیٹ علیحدہ اسلامی مملکت کے تصور کو جسے نظری حیثیت سے عملی طور پر قبول کرنے کی تحریک ایسی جدید اسلامی ریاست کے لئے جدید فقہ اسلامی کی تشکیل کا کام بھی ان کے نزدیک سب سے اہم تھا ان کے خیال میں دور حاضر میں مسلمانوں کی سب سے بڑی علمی اور سیاسی ضرورت یہ تھی کہ ان کی قدیم فقہ دور حاضر کی ضروریات کے مطابق جدید صورت میں ڈھل جائے اس کی جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر مدون اور مرتب کر لیا جائے اسے دفعہ وار مرتب کر کے عدالتوں سے رجوع کے قابل بنا دیا جائے اور مسلمانوں میں فقہ جدید کی صورت میں ایسا مرتب ہو جائے کہ جس اسلامی مملکت میں بھی قانون اسلامی کے اجرا کی ضرورت ہو اسے اختیار کر کے وہاں جاری کر دیا جائے اور جس کے ذریعے ایک اسلامی ریاست جدید حالات کے سارے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو جائے چنانچہ اسے ان تعلیمی تصورات کے پس منظر میں وہ مسلمانوں کے لئے اس فقہ جدید کے کام کو بھی زمانے کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتے تھے اور اسی تلاش میں تھے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی سامان پیدا فرمائے جس سے ان کے نزدیک ہندی مسلمانوں کی یہ سب سے اہم ضرورت پوری ہو جائے

تلاش و جستجو کے انہی ایام میں چودھری نیاز علی خان علامہ اقبال کے پاس جاوید منزل میں تشریف لائے چودھری صاحب نے علامہ سے اپنے ٹرسٹ کا ذکر کیا جو انہوں نے قلعہ جمال پور میں دارالاسلام کے نام سے قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا چودھری صاحب وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے وہ علامہ اقبال سے مناسب ہدایات اور رہنمائی کے خواہش مند تھے

علامہ اقبال نے فرمایا کہ

"دینی مدارس کی تو کمی نہیں تھی بہتر ہوتا کہ آپ اس وقف سے کوئی دوسرا مفید کام لیتے"

چودھری صاحب نے کہا تو پھر آپ ہی فرمائیے اس وقف سے کیا کام لیا جائے"

علامہ اقبال نے فرمایا

"میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ ہمارے موجودہ ہم عصر اور دور اسلام سے دور ہٹ چکے ہیں اور جن کی زندگی کے سیاسی اور اجتماعی مسائل میں جنہوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی تعلیم کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں" ؎

علامہ اقبال کی اس تجویز کے حوالے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس ادارے کو اس مقصد کے لئے وقف بھی کر دیا جائے جو علامہ کے پیش نظر ہے تو اس ادارے کی سربراہی کے لئے کیا کوئی ایسی شخصیت میسر آسکتی ہے جو اس کام کی منصوبہ بندی کرے ابتدائی خاکہ تیار کرے علامہ سے مشورے کے ساتھ اس سکیم کی تفصیلات طے کرے جوان کے ذہن میں ہے اور پھر ایک مناسب ٹیم تیار کر کے اس عظیم کام کو سرانجام دے جو تدوین فقہ جدید کے عنوان سے علامہ کے پیش نظر تھی

اس پر متعدد شخصیات کا تذکرہ آیا جن میں علامہ محمد اسد جو نو مسلم بھی شامل تھے جو اس وقت ماہنامہ عرفات نامی ایک انگریزی ماہنامہ نکال رہے تھے اور جو مسلمانوں کی علیحدہ ریاست اور اس کے خدوخال نمایاں کرنے میں ایک موثر کردار ادا کر رہا تھا مالآخر اس گفتگو میں علامہ کی زبان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام آیا جو اس وقت ماہنامہ ترجمان القرآن کے ذریعے حیدر آباد دکن سے تحریک اسلامی کا فکری آغاز کر رہے تھے اور اسلام کے اس کو تحریک کی صورت میں ابھارنے کے عملبردار تھے

لیکن مولانا مودودی کی دارالاسلام میں آمد سے پہلے وہاں ایک تعلیمی اسکیم جاری تھی جس کے مطابق چودھری نیاز علی خان صاحب اپنے قائم کردہ ادارے کو چلا رہے تھے اپنے ادارے کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے مندرجہ ذیل امور کو ادارے کے دائرہ کار میں شامل کیا تھا۔

ا۔ ہندوستان میں ہر ایک مسلمان کے گھر کو جہاں تک ہو سکے دارالاسلام بنا دیا جائے ہر مسلمان کنبے کا سربراہ اپنے کنبے کے سب افراد کو عقائد و اعمال میں شریعت اسلامیہ کے

---

؎ ؎ ؎ خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء ؎ اوراق گم گشتہ صفحہ ۸۲

۱ محنت لانے اور ان کے لیے ارکان اسلام کی پابندی کو لازم کر دے۔

۲۔ ادارے کا ماٹو ہو " قرآن پڑھو اور پڑھاؤ "

۳۔ آئمہ مساجد کو جدید علوم کے ساتھ تیار کیا جائے جو قرآن، عربی ادب، عقائد، سیرت و تاریخ، تحریر و تقریر، معلومات عامہ اور مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور مسادی طور پر اسلام کے مبلغ ہوں۔ ایسے آئمہ تیار کر کے بستی بستی تک بھجوا دیے جائیں۔

۴۔ ایک جریدہ دارالاسلام کے نام سے جاری کیا جائے جو قرآنی علوم اور تحریک دارالاسلام کا ترجمان ہو اور تبلیغ دین اور منظم مساجد میں مدد گار ہو۔

۵۔ نصابی ترتیب اور دستکاریاں سکھلانے کا اہتمام ہو پارچہ بافی، لوٹے، دری، کھدر، تولیے وغیرہ تیار کیے جائیں جس سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا آزادانہ معیشت حاصل کر سکیں۔

۶۔ ایک ایسی اسلامی نو آبادی قائم کی جائے جس میں تمام تر زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق اور تمام تر فضا خالص اسلامی اور اخلاقی ہو۔

گویا ادارہ دارالاسلام کا یہی پروگرام اور ہدف اس قدر تھا کہ:

۱۔ مسلمانوں کی مساجد نے جو مدرسے ہیں ... آئمہ مساجد تیار کیے جائیں جو مسلمانوں کی ... قیادت اور دینی رہنمائی کا ذریعہ ... ہوں

۲۔ مسلمانوں کی دیہاتی آبادی میں اسلامی شعور بیدار کرنے کے لیے دیہاتی مبلغین تیار کیے جائیں جو معیشت کے لحاظ سے کسی کسی دستکاری کو جانے کے سبب خود کفیل ہوں۔ لیکن دیہاتی مسلمانوں کو اسلام کے اصولوں سے آگاہ کریں اور ان میں غیر مسلم آبادی کے متصل ہی اپنے اسلامی تشخص کا حقیقی احساس اور شعور پیدا کریں۔ یہ علمی اور تربیتی کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے سالہا سال درجہ بدرجہ ہو تو اس کا نتیجہ خیز ہو سکتی تھی اور احساس ... اس ادارے نے مسلمانوں کے حقیقی مرض کی تشخیص بھی کر لی تھی۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے حقیقی مرض ملت دو امراض سے متصف تھے

● فرقہ بندی ● اسلام سے بے خبری

ادارہ دارالاسلام نے اس مرض کا علاج یہ تجویز کیا تھا کہ ایسے آئمہ مساجد جو براہ راست قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کریں، مسلمانوں میں سے فرقہ بندی کا خاتمہ کریں اور انہیں فرقہ بندیوں اور مذہبی جتھہ بندیوں میں تقسیم ہونے سے باز رکھیں۔ اسلام سے بے خبری کا علاج یہ چاہا کہ قرآن کی تعلیم عام کرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتی مبلغین کا نیٹ ورک موجودہ معاشرے کے مسلمانوں میں اسلامی شعور پیدا کرے۔ شہر کا مسلمان تو مدرسوں، اسکولوں، اخبارات، کتب اور دوسری ... سے استفادہ کر کے کچھ نہ کچھ شعور حاصل کر بھی لیتا ہے لیکن دیہات کا مسلمان ان مواقع اور ذرائع سے محروم ہونے کے سبب اسلام کے نام کے سوا اس کے ہر کام سے بے بہرہ ... رہتا ہے

۔ دونوں امور تو دارالاسلام کی تعلیمی اسکیم میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند تھے لیکن دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خاں سے علامہ اقبال نے جامعہ ... کے ساتھ کالجوں کے مسلم طلبا کے بارے میں بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے ایک بار ان سے کہا:

" چودھری صاحب! کالجوں کے طلبا میرے پاس آتے ہیں۔ ان میں اسلام کے لیے تڑپ ... ہوتا ہے۔ ہمیں ان کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ "[۱]

ایک دوسری جگہ انہوں نے اپنے ... کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا[۲]:

" اسلام کے لیے اس ملک میں ... آ رہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ انشاء اللہ آپ کا ادارہ اس مقصد کو احسن وجوہ پورا کرے گا۔ علما میں ... ہیں۔ ... جن ... اثرات سے ... اور حکام کے ہدف ... اخبار نویس ... جن کی تعلیم یافتہ لیڈر ... میں اور ... سلطنت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام بے چارے ... لیکن ان کا سوائے خدا کے کوئی رہنما نہیں ہے۔ "[۳]

چنانچہ علامہ اقبال نے ان تعلیمی نظریات کی روشنی میں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، ایک ایسے ادارے کے متلاشی تھے جو

۱۔ کالجوں کے مسلمان طلبا کو گرمیوں کی چھٹیوں میں اسلامی اور اخلاقی ماحول فراہم کرے اور جہاں ... علمی زندگی میں سے گزار کر عملی مسلمان ہونے کا گر سکھلائے

۲۔ ایک ایسا ادارہ جو اپنے پاس ایسے ہوسٹل رکھے جن میں مسلمان طلبا، اقامت اختیار کرکے اسلامی طرز عمل، دینی تعلیم اور اسلامی تربیت حاصل کریں اور ساتھ ہی آزاد معیشت کے فنون سیکھیں تاکہ علم کو معیشت کی ... نہ بنایا جائے اور مسلمان ... پھر علم کو حصول علم کی خاطر حاصل کر سکے

چنانچہ علامہ اقبال کی اسی آرزو کی تکمیل ... ادارہ دارالاسلام نے ... ساتھ دارالاسلام کے جنوری فروری ۱۹۴۰ء کے شمارے میں ہندوستان کے مسلمان طلبا کے نام ایک اپیل شائع ہوئی جس کے تعلیمی مقاصد اور تربیت ... قدر ... ہے وہ اپیل یہ تھی

" ... کالجوں اور سکولوں کی لادینی تعلیم سے گرم ... ہو چکے ہو اور ... سے کار دن گزار رہے ہو تو اور دیکھو ان اوقات کو کام میں لانے کا بہترین طریق علم دین کا حصول اور ... قرآن سے زندگی حاصل کرنا ہے۔ کہ آوارہ پھرنا ... اخلاق، ماحول اور ... سے ... تمہاری اقامت کا بہترین مقام دارالاسلام ہے۔ اگر ہمیں تعلیم سے فراغت ... آتی ہیں ان میں ادھر ادھر پھرنے کی بجائے دارالاسلام کے مختصر کورس میں شریک ہو ... زیادہ سے زیادہ علم دین حاصل کر ... ان چھٹیوں میں ایک خاص کلاس کھلے گی جس میں ... لیکچروں کا انتظام ہو گا۔ "[۴]

... ادارہ دارالاسلام نے اپنی نو آبادی میں خطبات جمعہ کا بھی اہتمام کیا ... تاکہ آس پاس کے ... سے مسلمان ... دینی علوم، حالات حاضرہ اور ... سے

---

[۱] رسالہ دارالاسلام جلد ... دسمبر ... صفحہ ... [۲] مکتوب بنام چودھری نیاز علی ... جولائی ... مکاتیب اقبال صفحہ ... [۳] علامہ اقبال ... ۱۹۳۷ء میں ملت کا جو تجزیہ کیا تھا چالیس سال گزر جانے کے باوجود اس تجزیے کی نوعیت اور ان طبقات کی نفسیات اور طرز عمل میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ... کے باوجود قوم کے حالات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ... [۴] رسالہ دارالاسلام ستمبر ۱۹۴۰ء صفحہ ۸

آگاہ ہوں ان خطبات میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے آسان اور سہل خطبات جمعہ سب مشہور ہوئے جن کے ذریعے انہوں نے مسلسل کلمہ طیبہ کے مفہوم سے لے کر سربراہ حکومت اور جہاد کے مسائل مسلمانوں کو آسان عام فہم پیرایے میں سمجھانے کی کوشش کی یہ خطبات بعد میں ایک علیحدہ مجموعے کی صورت میں شائع ہو کر دیہاتی مسلمانوں کے لئے بہترین دینی رہنمائی کے کام آئے

دارالاسلام کی علمی اور تربیتی اسکیم کا خیال رہنمائی کے طور پر علامہ اقبال نے بانی ادارہ چوہدری نیاز علی خان کے سامنے بھی پیش کیا اس اسکیم کو جن الفاظ میں انہوں نے بیان کیا ہے اس کا اعادہ بھی موضوع کے لحاظ سے مفید ہوگا انہوں نے شیخ جامع ازہر جناب علامہ مصطفیٰ المراغی کے نام اپنے خط میں اس اسکیم کا تعارف کراتے ہوئے لکھا

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی ــــــ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فاضل متخصصین اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں جو اپنی زندگی دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیں ہم ان کے لیے ایک علمی مرکز اور لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں اور ان کی رہنمائی کے لیے ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور بصیرت رکھتا ہو وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سے واقف کرے " [1]

چونکہ اس علمی اسکیم میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بھی ابتدا میں منسلک رہے اس لئے اس وقت انہوں نے جو اسکیم کا خاکہ اپنے الفاظ میں پیش کیا اعادہ بھی یہیں مناسب ہے

" ہماری تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جو لوگ سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں جن کے دلوں میں حوصلے ہیں ان کو جہاں تک ممکن ہو رفتہ رفتہ ایک مرکز پر جمع کریں اور دارالاسلام میں ان کی اجتماعی طاقت سے خاص اسلامی ماحول پیدا کر دیں اس کام کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱ اعلیٰ درجے کی استعداد کے لوگوں کا شعبہ جو علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں یہ لوگ علوم کو از سر نو اسلامی بنیادوں پر مرتب کریں

۲ دوسرا شعبہ خدمت اسلام کے لئے اچھے کارکنوں کی تیاری کا ہو جو پاکیزہ اخلاق خصوصاً سیرت و عمل کے پکے مخلص مصروف زندگی رکھنے والے لوگ جن کی زندگی کا مشن خدمت اسلام ہو

۳ تیسرا شعبہ ایسے لوگوں کے لئے ہو جو دارالاسلام میں مختصر قیام کر کے واپس جانا چاہیں ان کی ابتدائی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کر کے انہیں فارغ کر دیا جائے

۴ چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور نو مسلموں کے لیے ہو جو عارضی طور پر دارالاسلام میں رہ کر اس سے استفادہ کرنا چاہیں

دارالاسلام کی علمی اسکیم کا یہ وہ عملی نقشہ ہے جو اسکیم کا ابتدائی خاکہ مرتب کرنے والوں نے تیار کیا تھا جس کی تعریف کرتے ہوئے بعد میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی لکھا کہ

" اگر ایسی اقامت گاہ قائم ہو جاتی ہے تو اس کو نمونے کی اقامت گاہ بنایا جا سکتا ہے اگر اس میں اضافہ کر دیا جائے کہ تعطیلات کے زمانے میں نوجوانوں کو جو کم سے کم گریجویٹ ہوں وہاں تعطیل گزارنے کی دعوت دی جائے اور اس عرصے میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ قدیم و جدید دونوں قیام فرمائیں جو ان کی ذہنی اور عملی رہنمائی کر سکیں اور ان کو ذہنی طور پر مطمئن، اخلاقی طور پر متاثر اور عملی طور پر مستعد اور صاحب عمل بنا سکیں اگر ایسا ہو سکے تو یہ بہت بڑا انقلاب انگیز کام ہوگا "

اس طرح علامہ اقبال کے علمی نظریات کی روشنی میں قائم ہونے والے ادارہ دارالاسلام کی تمام تر تعلیمی اور تربیتی اسکیم ہمارے سامنے آ جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درد مند مسلمان نے اپنی تمام تر مالی، علمی اور دینی صلاحیتیں مسلمان قوم کے تن پژمردہ میں روح ایمانی اور عمل صالح کی توانائی داخل کرنے کے لئے وقف کر دیں انہوں نے ایسا ماحول تیار کر دیا اور ایسے نئے مرد عمل مسلسل سے اپنے علم صحیح اور عمل صالح کی داستان رنگین بنا دیا اجتماعی سطح پر عمل صالح کا یہ ایک ایسا اچھا نمونہ ہے جو ہمارے سامنے تقریباً گذشتہ نصف صدی کے دامن میں پھیلا ہوا ہے

---

[1] مکتوب بنام چوہدری نیاز علی خان از مولانا ابو الحسن علی ندوی از لکھنؤ

---

# بقیہ : اشتراکی نظام تعلیم از لارڈ رسل

زندگی اور حریف کا سد باب کر دے۔ بہرحال روس میں ناقابل انقلابات کے باوجود اس قدر موجود ہیں کہ اشتمالیت اپنی مقصود میں سے ایک طویل عرصے تک غیر موزوں ملاوٹ پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔ تعلیم ایسے دائمی اور [illegible] عمل کا موسم کی تمہید بنا ہو تو اس سادگی پسندی کا خطرہ بہت زیادہ حقیقی ہوگا۔ وہ مارکس کلیے سے کہیں زیادہ قیمت اور مستحق ہے۔ عقلی لحاظ سے دو نہ او علی اور سطحی ہوئی لیکن میرے اعتراضات فلسفیانہ ہی نقطۂ نگاہ سے ہیں کہ سیاسی نقطۂ خیال سے۔

سیاسی نقطۂ نگاہ سے وسیع معنوں میں اس بات میں میرا فلسفیانہ رجحان ہو جاتا ہے۔ اشتمالیت، جاذبیت اور جنسی مساوات جیسے مسائل کا حل پیش کرتی ہے یہ حل ممکن ہے ہمیں ناپسند ہو لیکن بہرحال اس سے ہمیں ایک ممکن حل ضرور مل جاتا ہے۔ یہ مجبور ہے کہ تمام دنیا جس سے مسابقت کا غیر سماجی جذبہ نکال کر خارج کر دیا گیا ہو ایک ایسے معاشی نظام کو تسلیم کرتی ہے جو نظام آبادی اور زندگی کا ایک ہی قابل عمل متبادل ہو سکتا ہے ۔ شاید زندگی کی معاشرت کو ناپود کر دیتی ہے جس کی اصل ترجمانی نہیں ہو سکتی ہے اور ترقی کی دولت ملک کا علم ہے آدمی روز بروز معاشروں کا اظہار ہوتا جا رہا ہے یہ نوجوان طبقے کے دلوں میں ایک ایسی امید پیدا کرتی ہے جو یادگار ہو اور ایک ایسی سرگرمی ہے جس کی امید کوئی نہیں ہو سکتا اگر اس سے دنیا ہمارا تسلط ہم جس کا امکان موجود ہے تو اس سے ہمارے عہد کی زندگی قناعت کا حق نکل آئے گا۔ ان دلائل کی بنا پر اشتمالیت کے باوجود یہ نظام ہمارے زمانے کا مستحق ہے ۔

پروفیسر کنہیا لال کپور

# ڈاکٹر بالغ : جدید ریسرچ اسکالر

اگر صرف ایک فقرے میں ڈاکٹر بالغ کا تعارف کرانا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے سب سے بڑے غالب شناس ہیں اور سچ تو یہ ہے، انہیں یہ سعادت یونہی نصیب نہیں ہوئی کہ گذشتہ پچیس برس سے وہ غالب حاصل کر دیوان غالب پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پانچ سو صفحات لکھ چکے ہیں جو ان کے محض تمہید کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں ڈاکٹر بالغ اگر چاہتے تو اس طویل تمہید میں ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ کر قارئین کا وقت ضائع کر سکتے تھے لیکن صد شکر ہے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ان پانچ سو صفحات میں سے چار سو اپنی ذات کے لیے وقف کیے ہیں لیکن باقی صفحات میں غالب سے متعلق واقعی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں، شروع شروع میں تو میں کہتا تھا کہ دیوان غالب کا مصنف مرزا مر گیا ... سے کیونکہ غالب کو شعر کہنے کی بے حد فرصت ... سوائے پر دن رات طاری رہتی تھی فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ شعر کہہ سکیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد رشید مرزا تفتہ سے فرمائش کی ہوگی کہ وہ ان کے لیے ایک دیوان تیار کریں جس کا نام ـــــــ دیوان غالب ہو۔ لیکن دو سال اس تھیوری پر کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ میں نے قیاس لگایا کہ دیوان غالب نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی تصنیف ہے۔ تین سال اس تھیوری پر تحقیق کرتا رہا جب یہ بھی غلط ثابت ہوئی، تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوان غالب کو دو شعرا نے مل کر لکھا اور وہ تھے اسد اور غالب۔ اس لیے دیوان غالب کی بجائے اسے دیوان اسد و غالب کہا جانا چاہیے تحقیق کے دوران دو ایک بار مجھے شک ہوا کہ دیوان غالب میرا ہی لکھا ہوا ہے کیونکہ لفظ بالغ میں غالب کے تمام حروف شامل ہیں اور اگر غالب کے مقطعوں میں بالغ پڑھا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً سے

عشق نے بالغ نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر یک لخت مجھے یاد آیا کہ میں سرے سے شعر ہی نہیں کہہ سکتا اس لیے دیوان غالب کا مصنف کس طرح ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر بالغ کی رائے میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ غالب کے دو تخلص تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔ کوئی درباری شاعر دو تخلص کس طرح رکھ سکتا تھا کیا باقی شعرا یہ اعتراض نہ کرتے کہ جہاں مقطع میں غالب بطور تخلص نہیں لایا جا سکتا وہاں اسد لایا جا رہا ہے جو کہ اصول غزل گوئی کے سراسر خلاف ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اسد اور غالب گہرے دوست تھے۔ انہوں نے مل کر دیوان چھپوانے کا قصد کیا کیونکہ دونوں کا شعری سرمایہ بے حد قلیل تھا اگر علیحدہ علیحدہ دیوان چھپواتے تو اول تو وہ اپنی مختصر ضخامت کی وجہ سے مقبول نہ ہوتا دوسرے مصارف بھی زیادہ کرنے پڑتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر بالغ فرماتے ہیں۔ بہرحال اگر اتمام حجت کی خاطر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اسد اور غالب ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں، تو یہ مناسب ہوگا کہ ان تمام مقطعوں میں اسد یا غالب کی بجائے مرزا کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اسے دو کی بجائے ایک شاعر کا کلام سمجھیں۔ غالب اور مرزا ہم وزن الفاظ ہیں۔ اس لیے جن مقطعوں میں غالب تخلص آیا ہے وہاں مرزا لکھ دینے سے بخوبی کام چل سکتا ہے مثلاً۔ سے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان مرزا تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

البتہ اسد کی بجائے مرزا لکھتے وقت مصرعوں میں معمولی تصرف کرنا پڑے گا مثلاً یک طور یہ شعر

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

کی بجائے یہ لکھا ہوگا شعر

ہستی کے مت فریب میں اے مرزا آئیو

اسی طرح شعر

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

کی نئی صورت یہ ہوگی شعر

خوبرویوں کو ہم مرزا چاہتے

ڈاکٹر بالغ کی تحقیق کے مطابق کاتب کی غلطی سے دیوان غالب میں متعدد اشعار غالب کے معاصرین کے شامل ہو گئے ہیں۔ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

محض بچکانی سوجھ بوجھ والا ہی یہ باور کر سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار غالب کے ہیں سے

نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار کے "دعاف ساز" سے ہیں کہ مولانا حالی کے ہیں چونکہ مرزا صاحب کو حالی بہت عزیز تھے اس لیے انہوں نے یہ اشعار از راہِ محبت اپنے دیوان میں شامل کر لیے یہ بھی ممکن ہے یہ اشعار مولانا حالی کے اصرار پر شامل کیے گئے ہوں تاکہ سارے دیوان میں دو شعر تو ایسے ہوں جنہیں ایک عام قاری سمجھ سکے۔

غالب کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دراصل داغ دہلوی کی غزل ہے۔ خاص کر اس غزل کا مقطع تو چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ میں داغ کا ہوں غالب کا نہیں ؎

وصل دھوکا اِس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

داغ کا ایک اور شعر خواہ مخواہ دیوانِ غالب میں در آیا ہے وہ یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور اس شعر کا خالق تو میر تقی میر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دیوانِ غالب میں کتابت کی غلطیوں کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر بالغ نے چند حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں ان کی رائے میں غالب کے کئی اشعار محض کاتب کی غلط شماری سے لشتر کی بجائے شعر بن کے رہ گئے ہیں بالغ صاحب نے مشتے از خروارے کے مصداق پانچ اشعار منتخب کیے ہیں جو اگر صحیح صورت میں لکھے جاتے تو بیت الغزل کہلاتے ؎

| | | |
|---|---|---|
| (شعرِ غالب) | کوئی صورت نظر نہیں آتی | یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے |
| (کاتب) | کوئی اُمید بر نہیں آتی | کوئی صورت نظر نہیں آتی |
| (شعرِ غالب) | دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا | جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں |
| (کاتب) | دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا | میں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے |
| (شعرِ غالب) | اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے | عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو |
| (کاتب) | اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے | تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر |
| (شعرِ غالب) | لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے | ہاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں |
| (کاتب) | لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے | یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں |
| (شعرِ غالب) | اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا | مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر |
| (کاتب) | اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا | لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں |

ڈاکٹر بالغ کی ریسرچ میں ایک مقام ایسا بھی آیا ہے جہاں تحقیق تحقیق نہیں رہی، الہام بن گئی ہے سالہا سال کی دماغ سوزی کے بعد انہوں نے اُس ستم پیشہ ڈومنی کا نام ڈھونڈ نکالا ہے جس پر غالب مرتے تھے اور جسے انہوں نے عمر بھر کے لیے ناز رکھا تھا ڈاکٹر صاحب کی دانست میں اس کا نام ناز تھا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے غالب کے چند اشعار پیش کیے ہیں ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(نوٹ) غالب نے نثر میں اپنی محبوبہ کو ستم پیشہ کا لقب دیا تھا۔ اس شعر میں اسے ستم ظریف کہہ کر یاد کیا ہے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے ؎

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

●

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

●

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ

●

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ڈاکٹر بالغ کے خیال میں جس محبوبہ کی وفات پر مرزا نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا وہ ناز ہی تھی جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

آپ نے ڈاکٹر بالغ کے تمہیدی مقالہ سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جدید تحقیق میں ان کا کیا مقام ہے اب بھی اگر مرزا غالب یہ شکایت کریں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، تو چاہے آپ غالب کے طرفدار ہی کیوں نہ ہوں، آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب ڈاکٹر بالغ کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اور ان کا شکوہ نہ صرف بے جا ہے، بلکہ بے بنیاد بھی ہے۔

●●

## اشتراکیوں کی نظر میں

لارڈ برٹرینڈ رسل (لندن)

# اشتراکی نظامِ تعلیم

اشتراکی نظریہ کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں روس میں نظامِ تعلیم کی موجودہ حالت پر غور ہونا چاہئے لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ فیصلہ کن نہیں کیونکہ وہ منہاج مقصود سے بہت دور ہے۔ لہٰذا ہمارے مقصد کے لئے اس چیز پر غور کرنا کہ حکومت روس کی توقعات اور ارادے کیا ہیں، ہر حیثیت سے کہیں بہتر ہے کہ اس سے ناحاصل کیا گیا ہے جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے اس کی حیثیت لازمی طور پر عارضی ہے۔ آغاز انقلاب میں روسیوں کی اکثریت ناخواندہ تھی اور کسانوں کی دہشت جو آبادی کا اسی فیصدی تھے، [illegible] سرمایہ، مدارس اور استادوں کی کمی سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ان سب دقتوں کے باوجود اتنا کام ہو چکا ہے جو اس امر کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مکمل ہونے کے بعد یہ نظامِ تعلیم کس قسم کا ہوگا۔ اس لئے ہم سب سے پہلے اس چیز پر غور کریں گے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ پھر تعلیم کے مستقبل کے مطلوب کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔

ماسکو کی دوسری سرکاری یونیورسٹی کے صدر البرٹ پی پنکوچ (Albert P. Pinkevitch) کی کتاب "جمہوریۂ روس میں جدید تعلیم" میں، کم و بیش ایک سرکاری بیان کی حیثیت ہے۔ اس کتاب کو تعلیم اور اس کے موجودہ مقاصد کے بارے میں مستند کہنا چاہیئے۔ اگر ہم یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ اس میں کتنی باتیں ایسی ہیں جو مغربی ممالک کی موجودہ صورت حال سے متعلق ہیں۔ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانا ایک انسانی کام ہے جو اقتصادی نظام سے جداگانہ ہے۔ ہوتا جسمانی صحت کا سوال بھی ایک غیر نزاعی مسئلہ ہے، لیکن ان امور کے علاوہ وہاں سکاؤٹنگ، اخلاق، مدرسہ سکھانے اور لڑکوں میں حکومت سے وفاداری پیدا کرنے کا نظام بھی رائج ہے جو انگلستان اور امریکہ کے رائج الوقت نظام سے بہت مشابہ ہے اور بظاہر انوس استعمالی انداز تحریر میں امریکی صدر جامعہ کے مانوس نقطۂ نظر کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہے، مثلاً ان بریسے طالبوں کی صدائے بازگشت کے باوجود کچھ بھی موجود ہے اور جو کچھ ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔ ملاحظہ تمام اشتراکیوں سے اس گہرے تعلق پر واضح طور سے روشنی پڑتی ہے جو تعلیم اور سماج میں پایا جاتا ہے اور جس پر پچھلی صدی میں زور دیا جاتا ہے۔ پنکوچ نے مغربی سرمایہ پرست ملکوں کے مدارس کے متعلق لینن کی کتاب سے ایک پیرا نقل کیا ہے۔

"ملک متوسط طبقہ کی حکومت جس قدر زیادہ مہذب ہوگی وہ اسی قدر زیادہ عیاری سے یہ دعویٰ کرے گی کہ درسگاہیں سیاست سے آزاد ہو کر ساری قوم کی خدمت کر سکتی ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مدارس متوسط طبقہ کے ہاتھ میں جماعتی برتری کا آلۂ کار رہے ہیں۔ ان مدارس کی رگ رگ میں ذات پات کی روح ہمیشہ جاری و ساری رہی ہے اور ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ سرمایہ داروں کو اطاعت گزار غلام اور کارآمد مزدور مہیا کرتے رہے۔"

ایک اشتراکی حکومت میں مدرسہ عوام کے ہاتھوں میں جماعتی برتری کا ایک آلہ ہے اور وہاں اس اخلاقی تعلیم کے سوا کچھ نہیں جو مزدوروں کو جماعتی کشمکش میں مفید ہو سکے۔ لینن کا پھر حوالہ دیا گیا ہے۔

"ہم ایسے ضابطۂ اخلاق سے انکار کرتے ہیں جو کسی غیر انسانی یا غیر جماعتی تصور پر مبنی ہو اور ہم ایسے اخلاق کو مکروفریب سمجھتے ہیں جس کا مقصد سرمایہ داروں اور زمینداروں کی خاطر مزدوروں اور کسانوں کے ذہنوں کو مسدود کرنا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق جماعتی کشمکش میں مکمل طور پر عوامی مقاصد کے تابع ہے۔"

اس کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب عوام کو ایسی مکمل فتح حاصل ہو جائے کہ کسی قسم کی جماعتی کشمکش باقی نہ رہے تو پھر اخلاقیات کا نام ہی اٹھ جائے گا، لیکن پنکوچ کا خیال ہے کہ ایسے حالات میں ایک نیا فطری ضابطۂ اخلاق جاری ہوگا۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے

"سوویٹ روس میں عام تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ایک تندرست، مضبوط، سرگرم، دلیر، آزادی سے سوچنے اور عمل کرنے والے انسان کے نشوونما میں ہر طرح سے امداد دی جائے جو معاصر ثقافت کے تمام پہلوؤں سے پورے طور پر آشنا ہو۔ عوامی مقاصد کے پیدا کرنے اور ان مقاصد کی حفاظت کے لئے اور اس طرح سے آخری تجزیہ میں تمام انسانیت کے مفاد کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار رہے۔"

اس پیرے میں صرف عوام کے ہی ذکر کو حذف کر دینے سے ایک مکمل ضابطۂ اخلاق صاف نظر آتا ہے جس میں کوئی چیز امتیازی طور پر اشتمالی نہیں لیکن جمہوری دور میں پروپیگنڈے کو بڑا کام کرنا ہے۔ اس دور میں گویا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کو عوامی فلسفے کا معتقد بنایا جائے۔

پنکوچ تسلیم کرتا ہے کہ تعمیر کردار کے زاویۂ نگاہ سے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ مخصوص طور پر زندگی کے بہت ہی اہم حصے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ محض اداروں میں بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے جو محض خود ان کی خاطر نہیں بلکہ ایک ایسی اشتراکی حکومت پیدا کرنے کے لئے بھی ہو جس میں عورت ذلیل، پست اور غیر مستعد کسب محنت سے آزاد ہو کر مرد کے دوش بدوش اپنا مقام حاصل کر لے

اس کا خیال ہے کہ یہیں اور دوسرے دونوں میں مدرسے کا اثر خاندان کے اثر سے بہتر ہوتا ہے۔

"معاصر مدارس کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہیں ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو اپنے اوقات کا بیشتر حصہ مدرسے سے باہر اور ماترات مدرسہ سے دور بسر کرتے ہیں انہیں ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ایک خاص نوع کا علم، خاص طرح کی عادات اور کم از کم ایک خاص قسم کی افتاد طبع ساتھ لے کر آتے ہیں جو دنیا کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بلاشبہ دارالاطفال میں جہاں بچے بالغ کسی میں داخل ہوتے ہیں اور جہاں وہ جوان ہونے تک عمر گزارتے ہیں، ان کی زیادہ مکمل تعلیم ہو سکتی ہے۔ دارالاطفال میں ہم کسی رکاوٹ کے بغیر ایسی تعلیمی فضا پیدا کر سکتے ہیں جس کی ہم عہد حاضر کے اساتذہ تمنا کرتے ہیں۔ لیکن عام قسم کے غیر رہائشی مدرسوں میں گھر کے قوی تر اثرات اور باقی بیرونی اثرات کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں"۔

ان اقتباسات سے سوویٹ حکومت کا نصب العین واضح ہو جاتا ہے، لیکن سردست اس کی حیثیت نصب العین سے زیادہ نہیں اور صرف پانچ یا چار فی صدی بچے مدرسے جانے کی عمر سے پہلے ان اداروں میں جاتے ہیں۔ عام لازمی تعلیم ابھی صرف چار سالوں تک یعنی آٹھ سے بارہ سال کی عمر تک محدود ہے جو پرائمری سکولوں میں گزارے جاتے ہیں۔

تعلیم کے تمام عرصے کے دوران میں خواہ وہ لمبا ہو یا چھوٹا، روسی مدارس دوسرے ملکوں کے مدارس سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ بہت کم علمی ہوتے ہیں اور ان کی توجہ علم سکھانے پر بہت کم مرکوز ہوتی ہے۔ علم بذات خود مطلوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ مدرسے میں بچہ کی زندگی کی تنظیم کا ایک قدرتی اور ضمنی نتیجہ ہونا چاہیے۔ "مدرسے کے مشاغل کا حقیقت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہونا چاہیے۔ صنعت، حرفت و دست کاریوں کو نسا رجحانات حاصل ہونی چاہئیں۔ مدرسے کا تمام ڈھانچہ ایسا ہو جو ساتھی مسئلہ کی نشوونما میں مدد دیتا ہو اور مستقبل کے اشتراکی انقلابیوں کو سر ایک کی ترتیب دے سکے" مدرسے میں بچے صرف سبق ہی نہیں پڑھتے بلکہ جہاں تک ان کی ہمت اور رسائی ہو، دست کاریوں میں بھی حصہ لیتے ہیں اور وہ ان کاموں کو تعلیم سمجھ کر نہیں بلکہ ایک شہری کے فرائض کے ایک جزو کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ جسمانی صحت کو مدرسے میں جو عظیم ترین سیاسی اور سماجی کام سرانجام دیا ہے اس کے متعلق پنکوش یوں لکھتا ہے:

"جب تک جسمانی محنت کو عضلاتی حرکات کی ترتیب کے زاویۂ نگاہ سے مفید اور صحت بخش خیال کیا جاتا رہے گا، ہمارے مدارس کبھی ایسے نہ ہوں گے جو اشتراکی یا اشتمالی کہلانے کے حق دار ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے طالب علم اپنے آپ کو مزدوروں کے معاشرے کا ایک رکن اور ایک محنت کش خیال کریں"

روس کے نظام تعلیم کی یہ نہایت ہی اہم خصوصیت ہے

پنکوش ہماری ضرور رہنمائی کے لئے بالتفصیل یہ نہیں بتاتا کہ طلبہ سے کس قسم کی جسمانی محنت لی جاتی ہے اور ان کے نصاب میں کتنے گھنٹے اس کام کے لئے وقف ہیں۔ وہ لکھتا ہے "فیکٹری، کارخانے میں فی الواقع جو چیزیں کے بنانے میں معروف رہتا ان معنوں میں مدرسے کی دستکاری کا ایک حصہ ہے کہ ان کے مسائل کو مدرسے کے پروگرام میں پیوست کر دیا گیا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں فیکٹری کے کام کی جگہ کھیتوں کے کام کو دی گئی ہے" مسٹر جولین ہکسلے (Julian Huxley) درست کہتا ہے

"اس رابطے کے معاملے میں جو شہری مدرسوں اور کارخانوں کے درمیان ہو سکتا ہے، دیہاتی مدرسوں کو کھیتوں کے ساتھ رابطہ دینے کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کیونکہ زراعت ایک وسیع موضوع ہے اور ایک کارخانہ صنعت صرف ایک خاص شعبے سے سروکار رکھتا ہے۔ صنعت شہری زندگی سے اتنی ہم آہنگ نہیں جتنی زراعت دیہاتی زندگی سے مربوط ہے۔ اس لئے مدرسے کو زراعت کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ دونوں ایک ہی ادارے کے اجزا تھے لاینفک معلوم ہوں، تعلیمی زاویہ نگاہ سے نہایت مفید ہے"

تاہم یہ نقطہ نظر روس کے ماہرین تعلیم کے نقطہ نظر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو طلبا کی جسمانی محنت پر اخلاقی صفات کے پہلو سے غور کرتے ہیں۔ پنکوش کہتا ہے "گو مطالعہ ضروری ہے لیکن زندگی کی عملی سرگرمیوں کا سیکھنا بھی کم ضروری نہیں۔ اشتراکی مزدوروں کے کسی مدرسے میں یہ سرگرمیاں سماجی اور مفید ہونی چاہئیں۔ کیا ہم ایسے مفید سماجی کاموں کو سماجی اہمیت کے کام خیال کریں جو مدرسے اور طلبہ کے لئے مفید ہوں یا مدرسے کے ایسے کاموں کو جو گرد و نواح میں بسنے والوں کے لئے مفید ہوں۔ ہمارے اس خیال سے اس مسئلے کے مفہوم کا انحصار اس تشریح کے مان لینے پر ہے"۔ یعنی ایسے لڑکوں کی محنت کی حیثیت عام ضروری کام کی ہے نہ کہ خاص کام کی جسے اس کی تعلیمی قدر و قیمت کے پیش نظر منتخب کیا گیا ہو۔

مدرسے کے مفید سماجی کام کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اول تبلیغ و اشاعت اور دوم عملی کام۔ پہلے عنوان کے ماتحت لڑکوں کو مختلف موضوعات پر لوگوں کو ابھارنا ہوتا ہے۔ مثلاً کھیت میں مل جل کر مسلسل ہونا، انتخابات میں موزوں ترین آدمی کو ووٹ دینا، مذہب، ملیریا، حشرات الارض، تمباکو نوشی اور شراب نوشی کے خلاف پرچار کرنا۔ عملی کاموں میں بھی ایسا ہی تنوع پایا جاتا ہے؛ بچے اس طرح کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، جیسے متعدی جراثیم سے حملے کو طالبوں کی مدد سے بچانا، درخت لگا کر بیماری بادوں کے خلاف حملہ کرنا، کسانوں کے گھروں تک بجلی کی روشنی پہنچانا، انتخابی لٹریچر تقسیم کرنا، ان پڑھ لوگوں کو اخبار پڑھ کر سنانا، طفیلیوں کا خاتمہ کرنا اور ضرورت مند بیوہ عورتوں کی مدد کرنا۔

روسی مدارس کا مقصد صرف دنیا کو سمجھانا ہی نہیں بلکہ اسے بدلنا بھی ہے۔ ان کا مقصد جیسا کہ پنکوش لکھتا ہے ——— "مارکس کے نظریے کے مطابق دنیا کی از سر نو تعمیر کی جائے، انصاف احساس کا سارا تصور ہی اس نظام سے غیر مانوس ہے اگر ہم صحیح طور پر اس نظام کے متعلق رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ خیال ضرور پیش نظر رکھنا پڑے گا"

میرا خیال ہے کہ بیشتیوں کی روس کانگرس نے جو تعلیم کامل مدرسہ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی، مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی تھی۔ یہ قرارداد مارکس کے پیرو کی حیثیت کے بجائے روسیوں کی حیثیت سے منظور کی گئی تھی

"موسیقی کو بچے کی زندگی پر مکمل طور پر حاوی ہونا چاہیئے، کام کرتے وقت اور چھٹیوں کے دوران میں گانا ضروری ہے، استاد کو لڑکے کی ذاتی قوت تخلیق کا خیال رکھنا چاہیے اور آرکسٹرا اور اجتماعی گانے کا بندوبست کر کے انہیں موسیقی کے ضروری تجربے بہم پہنچانے چاہئیں"

یہ سب کچھ قابل تعریف ہے لیکن میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ اشتراکی انقلاب سے انگریز قوم کو اس قدر موسیقی نواز بنایا جا سکتا ہے۔

اشتراکیت کے خلاف دوسری اقوام کے مخالفانہ جذبات کی وجہ سے جو جنگی دہشت روس میں پیدا ہوتی ہے، اس سے روس کے نظام تعلیم میں بعض ایسے عناصر شامل کر دیئے گئے ان عناصر سے جو قومیت نے باقی ممالک میں پیدا کئے ہیں، بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ "نوجوان رہنماؤں" کی تحریک نوائے سکاؤٹ کی نقل ہیں ان کے آئین اور حلف بھی اسی قسم کے ہیں وہ قوانین درج ذیل ہیں

۱۔ "رہنما" مزدوروں کے مقاصد اور زمین کے مواشیوں کا سچا حامی ہے۔
۲۔ "رہنما" عوام اور اشتمالیوں کا چھوٹا بھائی اور مددگار ہے۔
۳۔ "رہنما" دوسرے رہنماؤں، مزدوروں اور تمام دنیا کے کسانوں کے بچوں کا مِیت ہے۔
۴۔ "رہنما" اپنے گرد و پیش کے بچوں کی تنظیم کرتا ہے اور ان کے ماحول میں ان کا شریک کار ہوتا ہے۔ رہنما باقی تمام بچوں کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔
۵۔ "رہنما" علم کے لئے کوشاں رہتا ہے، علم و ہنر مزدوروں کے معاشی کشمکش میں قوت و طاقت کا سرچشمہ ہیں۔
اس کے علاوہ رہنما سچے دل سے حسب ذیل قسم کھاتا ہے

"میں جو دعاق روس کا ایک نوجوان رہنما ہوں، اپنے رفیقوں کے سامنے سنجیدگی سے اس امر کا عہد کرتا ہوں کہ (۱) میں اس کشمکش میں جو دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں کی آزادی کے لئے جاری ہے، مستقل مزاجی سے محنت کش طبقہ کے مفاد کی حمایت کروں گا اور (۲) میں راست بازانہ طور پر لاسیں و پیش لیس کے مواثیق اور نوجوان رہنما تحریک کے ضوابط کی پابندی کروں گا۔"

اگرچہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے حکومت روس اخلاقی تعلیم کی قائل نہیں ان آئین اور ضوابط میں اخلاق کی جگہ کیا جا سکتا ہے تو دماغ کی ایک صاف جھلک موجود ہے۔ نوجوان "رہنما" کی تصویر جو حصول علم کے لئے کوشاں ہے اور باقی بچوں کے لئے نمونہ ہے مجھے اپنے ایام طفلی کی "پرہیزگار لڑکوں کی کتاب" کی یاد دلاتی ہے

جو لوگ روس کے خلاف رجعت پسند ہیں، بیگمنہ سنتے آتے ہیں، انہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ جنسی تعلیم کے متعلق روس کا زاویہ اعتدال پسندوں سے بہت دور ہے۔ سکوس کہتا ہے "اساتذہ اور والدین کا فرض ہے کہ وہ بچے کو جنسی رجحان کے غیر ضروری ہیجان سے محفوظ رکھیں۔ نوجوانوں کی توانائی کو جسمانی تربیت، کسرتی کھیلوں، دستکاری، علمی سرگرمیوں، تحریک "نوجوان رہنما" اور ایسے تمام سماجی کاموں کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے جن میں جسمانی قوت کی کافی ضرورت ہے۔ اگر بچے کی طاقت کو حسب ضابطہ ان مصنوعی چیزوں دیا گیا تو جنسی ترغیبات کی غیر ضروری نشو و نما کے لئے اس میں طاقت نہیں رہے گی۔ مخلوط تعلیم کو اس لئے پسند کیا گیا ہے کہ لڑکے لڑکیوں میں جنسی کشش کو کم کیا جا سکے، جنسی موضوعات کے متعلق سب سے زیادہ احتیاط ہم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر ایسا کیا تو نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ جنسی تعلقات کے بارے میں ایک غیر اخلاقی ہیجان اور ممکن ہے کہ ایک غیر صحت مند یا غیر ضروری رویہ پیدا ہو جائے۔ وہ اس کو بہت نفرت سے ٹھکرا تا ہے لوگوں کو کتوں، مرغوں، جانوروں اور گھوڑوں کو مباشرت کرتے دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر جنسی موضوعوں کو تنگ کر کے ان پر خاص طور پر زور دیا گیا تو بچوں اور نوجوان نوجوانوں کی توجہ اِدھر مبذول ہو جائے گی۔" وہ کہتا ہے "جنسی سوالات کو دوسرے زیادہ دلچسپ اور اہم مسائل کے ضمن ہی میں دیکھنا چاہیئے" یہ سب کچھ درست ہو یا نادرست لیکن ان میں سے کسی چیز کو بھی انقلاب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، سوائے مخلوط تعلیم کی حمایت کے جسے مشکل ہی سے حرف اخلاق کہہ سکتے ہیں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ بہت حد تک برطانوی مدارس کے ہیڈ ماسٹروں کے خیالات سے ہم آہنگ ہیں

روس کے موجودہ دستور سے اشتراکیت کے ماتحت تعلیم کی متوقع کامیابی کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے، صرف یہی نہیں کہ بعض اہم پہلوؤں میں حکومت کے مسائل کو عملی صورت نہیں دی جا سکی بلکہ زیادہ اہم امر یہ ہے کہ وہ جنگی دہشت جو اشتمالیت اور سرمایہ داری کی عالمگیر کشمکش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، مدرسے کی فضا پر یوں چھائی ہوتی ہے کہ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ اگر تمام دنیا میں اشتمالیت پھیل جاتی تو مدرسوں کی نشو و نما کس طرح پر ہوتی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ابھی کچھ نہیں ہوا تھا، مجھے روس جانے کا اتفاق ہوا اس وقت مجھے ریٹیں سکول دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جن میں بچے نہایت لباس تھے اور جسمانی دیکھ بھال نہایت عمدہ تھی۔ لیکن جو سبق وہ بولا سیکھ لیتے اس سے مدرسے پروپیگنڈے کے پر اثر لایا جاتا۔ میں نے لڑکوں کے مدرسے میں بھی دیکھے جو سامان کی خطرناک کمی کے باوجود ہر ممکن طریقہ سے کام دے رہے تھے مجھے یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملنے کا موقع بھی ملا ان کی حالت، بالکل اطمینان بخش نہ تھی لیکن بعد کی ترقی کے پیش نظر جس کی مجھے براہ راست اطلاعات پہنچتی رہی ہیں میرا یہ ذاتی تجربہ زیادہ مفید نہیں۔

سو جہاں تک مذہب اور جنسیات کے بارے میں روس اور مغربی ممالک کے مدرسوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا جس مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے وہ دونوں میں یکساں ہے لیکن اس کی تعلیم بالکل ایک سی حیثیت اور علاحدہ دی جاتی ہے۔ روس میں مغرب کی طرح بعض مسائل ایسے ہیں جن پر سوال اٹھانا خلاف تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جن کی تنقیدی جانچ پڑتال کی اجازت نہیں دی جاتی یہ درست ہے کہ عیسائی ملکوں کے مذہب کے برعکس روسی مذہب ایسا ہے کہ جن نوجوانوں کو اس کے زیر اثر رکھا جاتا ہے وہ خوش و خرم رہتے ہیں اور اسے قبول کرتے ہیں اور اسے اپنی زندگیوں کا قرار دیتے ہیں یہ درست ہے کہ سمجھ دار لوگ روسی مذہب کو بہتر دنیا پیدا کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اس کے عقائد کو کم از کم نفس الامری طور پر عقل و خرد سے درست مان کر تسلیم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مارکس ازم کو وہی فوقیت حاصل ہے جو عیسائیت کو اپنے ابتدائی زمانے میں تھی، لیکن اگر وہ تمام دنیا میں پھیل جاتے اور غالب ہو جاتے تو کیا یہ فوقیت رہ سکے گی۔ سر دست مارکس ازم اس پر امیدی اور ان سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ ایک وسیع نیم ویران اور اقتصادی ترقی کے لئے آمادہ ملک کا نتیجہ ہیں۔ کسی زمانے میں امریکہ کی بھی یہی حالت تھی اور وہ اس وقت جمہوریت کا حامی تھا، چنانچہ تمام ترقی پسند اہل یورپ کو اس وقت امریکہ اور جمہوریت سے یہ جوش لگاؤ محسوس ہوتا تھا اور جن کے ساتھ وہ ایسی وابستگی محسوس کر رہے تھے جیسی اب ہم ایک نظام کے وجود سے پاتے ہیں جو اقتصادی ترقی کے لئے بہترین راہ تھا۔ اب اس طرح کا ایک جغرافیائی اتحاد اشتمالیت کے حق میں مصروف عمل ہے۔ ہمیں اس کے اثرات کو منہا کرنے کے بعد اس نتائج کا اندازہ لگانا چاہیئے جو اشتمالیت کی وجہ سے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں واقع ہوں گے، کیونکہ ان اس طول طویل تعاقب کے بعد ابھرنے کا کوئی امکان نہیں جو دور حاضر میں روس کا امتیازی نشان ہے۔

اگر مارکسی عقیدہ ایسا ہی زہر آلود رہا جیسا آج کل ہے تو کچھ عرصے کے بعد وہ عقلی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جائے گا۔ اس وقت بھی جدید سائنس کے بعض ایسے پہلو ہیں جن کا اس کے مذہب سے ہم آہنگ ہونا اشتمالیوں کو مشکل معلوم ہوتا ہے، مثلاً جوہریہ کے متعلق وہ خیالات جو نظریہ مقادیر میں ریاضیات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے یہ خیال کہ انسانی کردار کی ہر شے اقتصادی اسباب کا نتیجہ ہے، ایک دن سائنس سے شدید طور پر متصادم ہو جاتے؛ مثلاً گرم ممالک میں HOOK - WORM کی بیماری جسمانی قوت کو بہت کم کر دیتی ہے اور اس معاملے میں اقتصادیات کو نہیں بلکہ اس وبا کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مارکس کا سارا فلسفہ جدلیاتی کشمکش میں اس بری طرح الجھا ہوا ہے کہ جب وہ

ایک غیر جماعتی دنیا کا تصور پیش کرتا ہے جسے وہ پیدا کرنے کے درپے ہے تو وہ مبہم اور غیر یقینی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ایک غیر مدلل کامیاب مارکس ازم عیسائیت کا جانشین بن جائے تو ممکن ہے کہ وہ بھی سائنسی ترقی کی راہ میں اتنی ہی بڑی رکاوٹ ثابت ہو جتنی عیسائیت ہو۔

بہرحال میرا خیال معلوم ہوتا ہے کہ جو فلسفہ اس وقت اشتمالیت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہ اپنی موجودہ صورت میں بھی اپنے وجود کو قائم رکھ سکے گا۔ اشتمالیت بجائے خود صرف ایک اقتصادی نظام ہے جسے اقتصادی اور سیاسی معیاروں ہی پر پرکھا جائے گا۔ کلامی مادیت کا مسئلہ اور تاریخ کی اقتصادی توضیح منطقی طور پر نظریۂ اشتمالیت کے لازمی حصے نہیں ہیں۔ اگر آج سے اشتمالیت کو ایک اقتصادی نظام کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے تو اس بدعت کو دبانے کی اتنی ضرورت نہیں رہے گی۔ علاوہ مارکس اور لینن کا احترام کیا جائے لیکن لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ انہوں نے ساتھ وہ ان کا مقصد نہیں تھا۔ عہد حاضر کی ادعائیت اس کشمکش میں ایک اتفاقی حادثہ ہے اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر کشمکش کا انجام کامیابی کی صورت میں رونما ہوا تو یہ خیال آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح کے خیالات کا جماعتی کشمکش پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرمایہ دار ممالک میں تعلیم امرا کی سرپرستی کے نیچے دبی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس روس میں یہ عوامی ملائیت کے مرض میں مبتلا ہے۔ عوام کے بچوں کو متوسط طبقے کے بچوں سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے اور متوسط طبقے کے بچوں کو اعلیٰ علم کے حاصل کرنے میں زیادہ دقت پیش آرہی ہے۔ لیکن ایک نسل ہی میں یہ طریق اٹھ جائے گا کیونکہ عوام کے بچوں کے علاوہ اور کوئی بچے باقی نہیں رہیں گے۔

اس سے زیادہ اہم سوال جس کا تعلق مستقبل سے ہے، خانگی زندگی کا قطعی خاتمہ ہے۔ اس امر کی توقع ہے کہ جب مالی حالت اجازت دے گی تو سوویٹ حکومت آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو نرسریوں اور ... میں تعلیم دینا شروع کر دے گی تاکہ انہیں والدین سے معمولی واسطہ رہ جائے یا مطلقاً کوئی تعلق نہ رہے۔ اس نظام کی خوبیوں اور برائیوں پر ایک گذشتہ باب میں بحث کی جا چکی ہے اور اب میں ان کا اعادہ نہیں کروں گا، لیکن خواہ یہ بات اچھی ہو یا بری، اغلب یہی ہے کہ ایک مکمل ترقی یافتہ اشتمالی نظام تعلیم کی یہ اہم خصوصیت ہوگی۔

بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن کے بارے میں اشتمالی نظام حکومت کو اس نظام پر جو سرمایہ دار ممالک میں رائج ہو سکتا ہے، ترجیح ملنی چاہیئے۔ ان میں سے ایک مسابقت کا خاتمہ اور انفرادی سرگرمیوں کی جگہ سماجی سرگرمیوں کا وجود ہے۔ یہ درست ہے کہ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں حال حال ترقی یافتہ مدرسے ایسی کوشش کر سکتے ہیں لیکن امتحان کے لئے بچوں کو تیار کرنے کی ضرورت اور امداد وظائف کی مسابقت کشمکش ان کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص مدارس کے تعلیم یافتہ لڑکے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ... محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایسی دقتیں ہیں جنہیں بہرحال برداشت کرنا ہی چاہیئے لیکن روسی بچے اس دقت سے بری ہیں۔ ایک ایسا مدرسہ جو مخصوص فضا پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ لازمی طور پر کم و بیش عام دنیا سے الگ تھلگ رہے گا اور یہ صورت حال قابل افسوس ہے، خواہ یہ ناگزیر ہی ہو۔ روس میں مسابقت نہ صرف مدرسے کی زندگی سے بلکہ روزمرہ زندگی سے بھی خارج کردی گئی ہے جس سے ایک ایسے تعاون کے جذبے کی تخلیق ممکن ہوگئی ہے جسے مغربی ممالک میں کوئی جانتا ہی نہیں۔

دنیا کی روزمرہ زندگی میں مدارس کے شریک کرنے میں کچھ خطرے بھی ہیں لیکن میرے خیال میں ان کے محاسن کا پلہ تمام برائیوں کے مقابلے میں بھاری ہے۔ بچوں سے جس کام کی توقع کی جاتی ہے ابھی تک اس کے بارے میں بہت کچھ بیکار پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ انہیں کمسنی ہی میں اشتمالیت کا سبق پڑھا دیا جاتا ہے جس سے ان میں ایک گونہ آدم بیزاری اور ناگوار خود یقینی کا پیدا ہونا یقینی ہے، لیکن یہ ایک اچھی بات ہے کہ نوجوان اپنے آپ کو قوم کا ایک ممبر خیال کریں اور یہ احساس رکھیں کہ انہیں حسب استعداد مفید بننا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ مغرب میں ترقی پسند ماہرین تعلیم کا رجحان بچے میں حد درجہ انفرادیت کو بیدار کرنے ... اسے یہ احساس دلانا ہے کہ وہ خود کو ایک اجتماعی ... جس کی خدمت کرنا ... کے لئے ضروری ہو۔ اس سے وہ بڑا ہو کر [illegible] بن جاتا ہے اور سماجی زندگی کی بندشوں کو برداشت کرنے سے گھبراتا ہے۔ روسی تعلیم میں یہ نقص نہیں پایا جاتا، بچے کو ابتدا ہی سے یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کا ایک جزو ہے اور اس کے ... قوم کے کچھ فرائض ہیں۔ اس کی سرگرمیوں کو منظم کر کے اسے اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ پیداوار کے نتائج ہیں۔ روس میں اخلاقی تعلیم کا یہ کرداری پہلو قابل تعریف ہے اور اگر شہادت قابل اعتبار ہو سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں قابل ترین نوجوان بھی اپنے آپ کو قوم کا لاینفک جزو خیال کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مغربی ممالک کی طرح وہ اگر حالات میں ... کا تماشا بن کر رہ جائیں جو مایوسی کے طفیل بیزار ... اور خشک مزاجی کی بدولت سنکی بن جائیں۔ اشتمالیت نے ایک ایسا اخلاقی ضابطہ دریافت کیا ہے جسے عہد حاضر کا نوجوان تسلیم کر لیتا ہے اور ایک ایسا طریق حیات جس کے ماتحت وہ خوش خوش زندگی بسر کر سکتا ہے۔ سرمایہ دار ممالک اس گتھی کو ناقابل حل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے ادارے ریاکاری کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کے زاویۂ نگاہ سے جنہوں نے دولت مندی اور پیچیدہ بیباکی کے زیر اثر قدیم تمدن میں تعلیم پائی ہے، نظریۂ اشتمالیت میں ایک طرح کا بھونڈا پن اور ناقابل برداشت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہر مسئلے کو خواہ وہ کتنا ہی دور کا کیوں نہ ہو، جماعتی نزاع کی طرف منسوب کرنے سے ہر چیز میں عامیانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور ذہن ہر بلندی کا لطف کھو جاتا ہے۔ خالص سائنس کی ایک مثال میرے مطلب کو واضح کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ مثلاً وہ قاعدہ لیجئے جس کے ماتحت بعید المسافت ستاروں اور سدیموں کا فاصلہ ناپا جا سکتا ہے۔ یہ اصول انسانی قوت ایجاد، صحت استدلال اور درست مشاہدے کا شاہکار ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے جماعتی کشمکش کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ آیا ایک خاص سدیمے کا فاصلہ ایک سو یا ایک ہزار نوری سال ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ انسان یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہے کہ کون سی بات صداقت کے قریب تر ہے تو اس سے انسانیت کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ میرا مطلب نہیں کہ اشتمالیت علم ہیئت کی تحقیقات کو ممنوع قرار دے دیگی، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے فلسفے کو سچے دل سے مان لیا جائے تو سائنسی سوز تحقیق کے تمام سوتے جو ان دریافتوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، خشک ہو جائیں گے۔ مارکس کا نقطۂ نظر ایک غلط چیز کی اہمیت پر زور دیتا ہے، ممکن ہے کہ نیوٹن کے کارنامے کے تمام اسباب معاشی ہوں، لیکن یہ کارنامہ بجائے خود اپنے اسباب کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ اور اہم ہے۔ معاشیات کا موضوع بہرحال انسان کو زندہ رکھنے سے متعلق ہے۔ اگر اس مسئلے کا مستقل تسلی بخش حل مل جائے، جیسا کہ اشتمالیت کے ذریعے ممکن ہے، تو ہمیں غور کرنے کے لئے کچھ اور موضوعات اور زندگی مستقل کی تعمیر کے لئے کچھ نئے اصولوں کی ضرورت ہوگی۔ سادگی کسی نعرے کے لئے تو ضروری وصف ہے لیکن کسی فلسفے کے لئے نہیں۔

جس چیز کو ہم سوچ سمجھ کر تیار کیا جانے کا وہ عام طور پر سادگی کا شکار ہوگی۔ اس سے ایک ایسا ... ایک جنون سا پیدا ہوگا جو بار بار ایک ہی بات سننے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

پروفیسر خورشید احمد

# ہندوستان
# میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

تاریخِ انسانیت میں اسلام کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی و جہالت سے نہیں، علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے بعد خالق نے انسانِ اوّل کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علمِ اسماء ہی ہے اور علم ہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر کائنات کی دوسری تمام مخلوقات پر انسان کو فوقیت حاصل ہے۔

علم اور تعلیم کے باب میں اسلام کی تعلیمات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی قائم کردہ روایات کی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کے مطالعہ سے تعلیم کی دنیا میں اسلام کا جو مخصوص کارنامہ نظر آتا ہے اس کے چند بنیادی پہلو یہ ہیں

(ا) علم اشیا کی تعلیم سے انسان کے دنیوی سفر کے آغاز سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اوّلین ضرورت علم ہے اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔

(ب) علم کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ ربّ السمٰوٰت والارض کی ذات ہے۔ حقیقتِ اشیاء کا علم بھی اور ہدایت و ضلالت کا علم بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ سے اہم ذرائعِ علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ سرچشمۂ علم ہے۔ پھر یہ کہ علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات ہی سے نہیں، مقاصدِ حیات سے بھی ہے اور یہ زیادہ اہم ہے۔ اس سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں علمِ دین کی تعلیم، رب کی معرفت اور الہامی اصولِ ہدایت کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

(ج) اسلام نے تعلیم کو بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں، تمام انسانوں کی اوّلین اور بنیادی ضرورت (BASIC NECESSITY) قرار دیا ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو حتیٰ کہ یونان اور چین بھی جو اپنی علمی ترقیات کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، اس کے قائل نہ تھے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عام اور ہر شخص کی تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) کا تصور پیش کیا۔

(د) ایک طرف اسلام نے تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا تو دوسری طرف اس کو حاصل کرنے کی ذمہ داری فرد اور معاشرہ دونوں پر عائد کی۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز سب پر فرض ہو، وہ اس کی فراہمی کی اوّلین ذمہ داری فرد پر اور آخری ذمہ داری معاشرہ اور ریاست پر عائد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز، حج اور زکوٰۃ کا نظام اسلامی ریاست کے وظائف میں شامل ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں جو حضورؐ نے جو روایت قائم کی، وہ اصحابِ صفہ کی درسگاہ میں نظر آتی ہے۔ اصحابِ صفہ میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود ہی تگ و دو کرتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے اہلِ ثروت ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے، دل کھول کر عطیات و وظائف دیتے تھے اور حضورِ اکرمؐ خود ان کی ضروریات پوری فرماتے تھے بلکہ جب تک ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہو جاتا آپؐ کھانا تناول نہ فرماتے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی ہے۔

(ہ) مسلمانوں کے نظام میں علم اور تربیت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور یہ بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تتبع ہی میں تھا کہ بحیثیت معلم کے جہاں آپ تعلیمِ کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے وہیں تزکیۂ نفس کا کام بھی انجام دیتے۔ ہمارے تعلیمی نظام کا مخصوص مزاج ان دونوں عناصر کے حسین امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو عرفِ عام میں اس مزاج کا اظہار "علم و فضل" کی اصطلاح سے ہوا ہے جو علم اور نیکی میں بڑھے ہوئے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

(و) ایک اور اہم چیز تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا متقاضی تھا کہ دینی زندگی کے محور مسجد سے اس کو مربوط کیا جاتا۔ مسجدِ نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔

یہ ہے ہماری مخصوص نظریاتی اور تاریخی روایت۔ پہلی چار صدیوں میں باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا لیکن تعلیم و تعلم کے لاکھوں حلقے اسی نہج پر کام کر

رہے ہے جو صحہ کی تعلیم گاہ میں قائم ہوتی تھی مساجد تعلیم کا مرکز تھیں اور حلقہائے درس قرآن وحدیث تعلیم کا ذریعہ۔ ایک ایک درس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ خود حکومت ان اساتذہ کو معقول وظائف دیتی تھی جو اس کی حالت آپ نہ کر سکتے تھے اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ علم گھر گھر پھیل رہی تھی اور ہر سطح پر، وہاں کی ضرورت کے مطابق سلسلہ تعلیم قائم تھا جس کے ذریعے زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین تیار ہوتے تھے۔ اس نظام کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ جس تہذیب و تمدن کے لئے یہ کارکن فراہم کر کے دے رہا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا، ایک طرف چاز سو سال میں دنیا کی عظیم ترین سلطنت قائم ہوگئی تھی اور دوسری طرف اہل علم کی یہ افراط تھی کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے جن علماء کا تذکرہ ملتا ہے اس کی تعداد ۵ لاکھ سے متجاوز ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے علم کا لوہا مانا جا چکا تھا۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو اب تک موجود ہیں اور ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں، مسجد الحرام (مکہ مکرمہ) اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامع ازہر ہیں۔

مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے اور ان کا جال پوری اسلامی قلمرو میں بچھ گیا سب سے پہلا مدرسہ ۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنوی نے غزنی میں قائم کیا جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ، وقف املاک، مدرسین عام مرحمات اور نصاب تعلیم وغیرہ تھے۔ دوسرا اہم مدرسہ دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین اور امام غزالی جیسے صدر مدرسین حاصل ہوتے۔ یہ مدارس اسلامی مملکت کے طول و عرض میں پھیلے ہوتے تھے اور ان کی تعداد کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

## پاک وہند میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی دعوت، دور رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی، پھر بنو امیہ کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے میں ہوگیا تھا اور سندھ کے پرانے لٹریچر اور ثقافت کے مطالعہ سے اس کے نقوش آج بھی نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوا جو اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو یہاں حکمران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں حکمران رہے۔ اس زمانے کے تعلیمی نظام اور اس کے نشوو ارتقاء سے حسب ذیل کات سامنے آتے ہیں:

**حصولِ علم دینی فریضہ** (الف) تعلیم کا جو دینی مزاج قرن اول میں تشکیل پایا تھا، بڑی حد تک قائم رہا۔ پورا تعلیمی نظام دینی تعلیم اور دینی موضوعات کے گرد گھومتا تھا۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا اور اہل علم نے تدریس کو اپنا ایک دینی فرض سمجھا گویا کہ علم کی زکوٰۃ ہے جسے برابر نکالا جاتا رہا۔

**مسجد کی حیثیت** (ب) گو اول روز سے یہاں باقاعدہ مدارس کا انتظام کیا گیا لیکن مدارس کے علاوہ دوسرے موثر تعلیمی مراکز بھی موجود تھے ابتدائی تعلیم اور لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام گھروں پر تھا۔ مساجد اور ان میں قائم شدہ مکاتب تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھے۔ اہل علم کے مکانات اور کتب خانے اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا درجہ رکھتے تھے بڑے بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔

**تصورِ تعلیم** (ج) تصور تعلیم بحیثیت مجموعی بڑا وسیع اور ہمہ گیر تھا سب سے بنیادی اہمیت دینی تعلیم کو حاصل تھی جس کی روح کو باقی تمام تعلیمی سلسلوں میں بھی سمو دیا گیا تھا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا تجارتی تعلیم کے الگ ادارے تھے جنہیں مہاجنی اسکول کہا جاتا تھا فنون سپہ گری کے لئے بے شمار تربیتی ادارے قائم تھے۔ کتابت، خطاطی، طغریٰ نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر ان تمام کے باقاعدہ مکتب بھی تھے اور ان فن کے گرد طالبان کا ہجوم الگ رہتا تھا۔

خود عام دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم مروج تھا اس میں خالص دینی علوم کے علاوہ ہندسہ، جغرافیہ، منطق، تاریخ، طب اور طبعیات کی تعلیم کا انتظام تھا۔

**مفت تعلیم** (د) اس پورے دور میں بڑے پیمانے پر تعلیمی سہولتیں فراہم کی (UNIVERSAL EDUCATION) فراہم کی گئی سلطان محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے اور ان میں ایسے مدارس بھی تھے جن کی حیثیت آج کی یونیورسٹیوں کے برابر تھی۔ عہد اورنگ زیب کا مشہور سیاح الیگزنڈر ہیملٹن سندھ کے بارے میں لکھتا ہے کہ صرف ٹھٹھہ میں چار سو مدارس تھے۔ یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں ہر ہر شہر کی تھی، ایک علاقہ کی نہیں ہر ہر علاقے کی تھی اور مسلمانوں کے کسی ایک دور کی نہیں، پورے دور حکمرانی کی تھی۔

**فطری انداز کے مطابق** (ہ) مسلمانوں کا نظام تعلیم عوامی بھی تھا اور آزاد بھی۔ حکومت تعلیم کے فروغ کے لئے بے پناہ رقم خرچ کرتی تھی، لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیمی نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ تعلیمی اداروں کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے اور ذہین و طباع طلبہ کو وظائف دینے کے مناسب کے لئے منتخب کرنے کے لئے صدر الصدور کا عہدہ سلاطین دہلی اور سلاطین مغلیہ کے دور میں ضرور موجود تھا، لیکن اس کا کوئی کنٹرول اداروں پر یا نصاب تعلیم پر نہ تھا۔ وہ مدارس جو حکومت کی گرانٹ سے چل رہے تھے، وہ بھی اندرونی نظام میں کلی طور پر آزاد تھے۔ ہر مدرسہ اپنے انتظام، اپنے نصاب، طلبہ کے بارے میں پالیسی، علوم کی تخصیص، ہر بارے میں آزاد تھا۔ اور تعجب یہ ہے کہ اس کے باوجود نظام تعلیم میں مشرق سے مغرب تک غیر معمولی ہم آہنگی اور باہم مطابقت پائی جاتی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری اجتماعی قدروں کی گرفت معاشرہ پر اتنی مضبوط تھی کہ فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت و یک رنگی پیدا ہوتی، دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں ایسی تعلیمی آزادی کی مثال نہیں ملتی۔

**اُستاد کی حیثیت** (و) اس نظام تعلیم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ پورے نظام کا محور استاد تھا۔ اور تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا استاد اور طالب علم میں گہرا قلبی ربط پایا جاتا تھا۔

**ارباب حکومت کی دلچسپی** (س) ایک طرف تعلیم قطعاً آزاد تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ تعلیم کا سے تمام دیگر کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ ارباب حکومت تعلیم کو تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ اسے خزانہ پر بار تصور کرتے تھے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کو سنانے کا ایک موثر

فیروز تغلق کے عہد میں، وظائف اور عطیات کی مد میں جو بجٹ تھا اس کا ۵ فی صدی سے زائد صرف تعلیم کی مد میں خرچ ہوتا تھا یعنی ۳۶ لاکھ ٹنکا (۳۶ لاکھ روپیہ کے برابر) تھا اس نے صرف دہلی میں ایک یونیورسٹی قائم کی جس کے سارے اخراجات سرکار سے برداشت کیے جاتے تھے۔ محمد گاوان اس حد درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول مصنف تاریخ جہاں اس نے ان مدارس کو از سر نو تعمیر کرایا جو تین سو سال سے بند پڑے تھے اور ان کو دوبارہ اساتذہ اور طلبہ سے بھر دیا۔ اورنگ زیب نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول H. G. KEEN اس نے "لاتعداد مدارس و کالج قائم کیے" یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال اسی طرح پر مسلمان امرا۔ جاگیرداروں، حکومت، زمینداروں، جاگیرداروں اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے۔

**طلبہ کی معاشی کفالت** (ح) ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔ مسلمانوں نے اسے کسی دور حکومت میں بھی یہ اصول قبول نہیں کیا کہ تعلیم ایک مال تجارت ہے جس کی خرید و فروخت ہو اور آٹے چاول کی منڈیوں کی طرح اس کی بھی منڈیاں ہونی چاہئیں۔ پاک و ہند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبہ کے قیام و طعام اور خوراک و لباس کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ حکومت، مختلف امرا یا خود مدرسہ کی طرف سے وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔

**تزکیہ نفس اور اصلاح باطن** ط طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ان کے تزکیہ اور اصلاح باطن کی فکر کی جاتی تھی اور استاد صرف معلم ہی نہیں مربی بھی ہوتا تھا۔

**متحرک نظام تعلیم** (ی) نظام تعلیم میں جمود کی جگہ حرکت کا ثبوت ملتا ہے اور ہر اگلی آخری دور کو بیسویں صدی کی ضروریات کو پورا کرنے کا داعیہ اور اس کے لیے خاطر خواہ کوشش ہر مرحلہ پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے دور میں اس نظام تعلیم کے سارے کردہ افراد نے نظام حکومت کو نہایت دانشمندی اور خوش اسلوبی سے چلایا۔

**تجزیہ** یہ جائزہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا کیسا عظیم الشان نظام قائم کیا تھا اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے وہ کیسا منفرد اور کیسا اعلیٰ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں بعد ازاں چند وجوہ کی بنا پر اعلیٰ تعلیم میں منطق و فلسفہ اور دوسرے معقولات نے ضرورت سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی جس کے نتیجے میں قرآن و حدیث سے وہ رشتہ نہ رہا کہ جو کیا جاتا مسلم معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سو یہ کہ علوم طبعی میں مسلمانوں نے پاک و ہند میں اس اجتہادی جرأت اور احترامی ذہن کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا اظہار عراق اور اسپین میں ملتا ہے لیکن ان کمزوریوں کے باوجود یہ نظام بہت ترقی یافتہ نظام تھا اور اس نے ملک میں تعلیم کا معیار بڑھایا تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس ملک کی تعلیمی پستی انگریزوں کی مرہون منت ہے۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اٹھارویں صدی کے یورپ کے تعلیمی نظام سے کہیں ترقی یافتہ تھا۔ انگریزوں نے برسر اقتدار آکر اس ملک پر ایک اجنبی نظام تعلیم مسلط کیا مگر ان کا ایک نہایت گھناؤنا جرم یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک وسیع و ترقی یافتہ نظام کو ختم کیا۔

## (۳) انگریزوں کی آمد کے وقت تعلیمی حالت

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کی ایک اہم ترین خصوصیت عام اور مفت تعلیم تھی۔ معیار تعلیم بلند تھا اور تعلیمی سہولتیں وافر تھیں۔ عہد مغلیہ کی ثقافتی ترقی کے ذکر کے بعد (PARKINSON) لکھتا ہے "مغلیہ ہندوستان میں ثقافت کا بلند معیار زیادہ تر وہاں کے اعلیٰ طریقہ تعلیم کا ہی نتیجہ تھا۔ تعلیم وہاں بہت ہی وسیع کا درجہ رکھتی تھی۔"[1]

ہم اس دعوے کے ثبوت میں کہ کس وسیع پیمانے پر تعلیمی سہولتیں حاصل تھیں خود انگریز مورخین، سیاح اور عمال حکومت کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

سر تھامس منرو (MUNRO) کی ۲۵ جون ۱۸۲۲ کی تحریر بہت اہم دستاویز ہے جس میں وہ اعتراف کرتا تھا کہ صوبہ مدراس کے علاقے میں ہر ایک ہزار آبادی میں ایک اسکول موجود تھا۔ مزید کہا کہ آبادی میں ایک بہت حصہ (۱/۳) کو اسکولوں کے ذریعے تعلیم حاصل ہے۔[2]

بنگال کے بارے میں آر۔ ڈی۔ پرولیکر (PRULAKER) کی مرتب کردہ کتاب (A? SONRCE BOOK OF HISTORY) تعلیم کی وسعت کے بارے میں ان گنت حقائق و شواہد سے پر ہے۔ صفحہ ۹۷ پر یہ شہادت متعلق سنہ ۱۸۲۳ء میں کہا گیا ہے کہ کلکتہ کے علاقے میں ہر گاؤں میں ایک اسکول موجود ہے جو مقامی آبادی نے قائم کر رکھے ہیں۔ اسی کتاب میں مشنری ایجوکیشن سوسائٹی کی پانچویں سالانہ رپورٹ ۱۸۱۶ء میں درج ہے کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا یورپ کی اقوام میں ہے جہاں تک موجودہ پاکستانی علاقوں کا تعلق ہے، بنگال کے بارے میں (WARD) کی رپورٹ یہ ہے کہ ہر دیہات میں ابتدائی تعلیم کے جس میں پڑھنا لکھنا اور حساب شامل ہے، مدارس موجود تھے۔ پنجاب کے علاقے کے تعلیمی اوسط کے متعلق LEITNER لکھتا ہے کہ اس وقت پنجاب کے بہت سے ضلعوں میں تعلیمی اوسط برطانوی عہد کے اوسط سے بلند تھا۔ سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے "ملک ہمارے ہاتھوں میں آنے سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی و فراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے۔ ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا اور مسلمانوں کا نظام ہندوستان کے تمام دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا" اور جرل (SELIMAN) انیسویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی بہت کم قومیں ہوں گی جن میں ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ تعلیم کا عام رواج ہو۔ ہر وہ شخص جسے ۲۰ روپے ماہوار کی ملازمت حاصل ہوتی ہے،

---

[1] صفحہ ۳۷۳ (A BRIEF CULTURAL HISTORY)

[2] یہ تو کل ۱۸۰۰ء کی حالت ہے۔ اب ڈیڑھ سو سال کے بعد اسکول سے تعلیم پانے والوں کا اوسط کل آبادی کا ۵ فی صد بھی نہیں ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

[3] اس کے معنی یہ ہیں کہ سنہ ۱۹ء میں پورے ہندوستان میں تمام تعلیمی اداروں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں نے کس عظیم پیمانے پر ہماری تعلیم کو نقصان پہنچایا اور معلم ادارے سے ہمارے مدرسے ختم کیے۔ [3] 533 - P (REMBELSAND COLIECTION)

عام طور پر ایسے مشنوں کو کسی دربار انتظام کے برابر تعلیم دلوا آیا ہے جو کچھ ہمارے وہ کے یونانی اور لاطینی رسالوں کی وساطت سے سیکھتے ہیں یہاں کے نوجوان وہی باتیں عربی اور فارسی کے ذریعے سے سیکھتے ہیں۔ مثلاً سالہا سال مطالعہ کے بعد یہاں کا مسلمان نوجوان علم کی ان شاخوں (گرامر، بلاغت، منطق وغیرہ) سے قریب قریب اتنا ہی واقف ہوتا ہے جتنا آکسفورڈ کا کوئی تعلیم یافتہ نوجوان۔ یہ بھی اسی کی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بو علی سینا کے متعلق بڑی روانی سے گفتگو کر سکتا ہے۔"

یہ تھی وہ علمی دنیا جو ہمارے پرانے نظام تعلیم نے آراستہ کی تھی اور یہ تھا وہ تعلیمی معیار جو مسلمانوں نے اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قائم کیا تھا۔ انگریزوں نے جس وقت اس ملک پر قبضہ کیا ہے، اس وقت یہاں کی تعلیمی دنیا پر تاریکی و ظلمت کا نہیں روشنی و نور کا دور دورہ تھا۔ انگریزوں نے علم کی ان شمعوں کو گل کیا، مدارس کو بند کیا، تعلیمی اعانت ختم کر دی۔ کہ نظام کو ختم کیا اور چند ہی نسلوں میں ہمیں ایک ناتعلیم یافتہ گروہ بنا دیا اور پھر اس مظلوم قوم کے لئے ایک ایسا نظام بنایا جو اس کے فکر و نظر اور ثقافت و تہذیب کو مسخ کر دے۔ پہلے اس چمن کو اجاڑا گیا اور پھر اس کی جگہ ایک جنگل اگایا گیا جس کا حال تو ہم نے دیکھ لیا اب بربادی چمن کی داستان بھی سنیے۔

صدیوں سے یہاں انگریز طبیب اور تاجر بن کے روپ میں آتے اور آخر اس ملک کے حکمران بن گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں وجود میں آئی۔ اس کمپنی کا مقصد تجارت تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک سیاسی حیثیت بھی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا سیاسی پہلو زیادہ ہو گیا اور ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح کے بعد یہ ایک حکمران قوت کی حیثیت سے ابھری۔ ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایک سرکاری فرمان کے ذریعے انگریزوں کے حوالے کر دی تھی۔ یہاں سے انگریزوں کی علمی اور سیاسی حکمت عملی کا آغاز ہوا۔ کمپنی کا راج ۱۸۵۷ء تک رہا جب کہ ملکہ وکٹوریہ نے پورے اختیارات براہ راست خود سنبھال لئے۔ برطانوی حکومت ۱۹۴۷ء تک حکمران رہی۔

اس دور کا جائزہ لیا جاتا ہے تو سب سے پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ کمپنی کے دور اور برطانوی حکومت کے بلاواسطہ راج کے درمیان تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جس میں کسی قسم کا انقطاع واقع نہیں ہوا اور گو سیاسی نقطۂ نظر سے ۱۸۵۷ء ایک اہم موڑ ہے لیکن انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم اس پورے دور کو ایک وحدت کی حیثیت سے لیں گے اور جو ادوار قائم کریں گے وہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے ہوں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جو بھی تعلیمی پالیسی وضع کی گئی اس کی بنیاد کمپنی کے دور میں پڑی اور اس پر عمل بعد کے ادوار میں ہوتا رہا۔ اس لئے اگر ہمیں اصل بنیادوں کا فہم پیدا کرنا ہے تو کمپنی کے دور کے طرز عمل کو سمجھنا اور جائزہ دیکھنا ہوگا۔

اس پورے دور کے جائزے سے چند اہم دور واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اور وہ ہمارے خیال میں یہ ہیں۔

۱۔ پہلا دور ۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء
۲۔ دوسرا دور ۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۴ء
۳۔ تیسرا دور ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۵ء
۴۔ چوتھا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء

## (۱) پہلا دور (۱۷۶۵ — ۱۸۱۳)

سیاسی حیثیت سے یہ دور کشمکش، تصادم اور اس ملک کی سیاسی مغلوبیت کا دور ہے۔ کمپنی کا راج آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور جہاں اسے فوجی اقتدار حاصل ہو رہا تھا وہاں بھی اس کا سیاسی اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ ان حالات میں فطری طور پر کمپنی کے حکام کو تعلیم کے بارے میں مسلک طے کرنا پڑا۔

سترھویں صدی میں جب انگلستان نے پارلیمنٹ کے ذریعے قائم ہونے والی کمپنیوں کی وساطت سے بین الاقوامی تجارت کا ایک عالمی جال پھیلایا تو یورپ کے عیسائی پادریوں نے اس کو محسوس کر لیا کہ ان کے لئے مشرق میں اپنے مذہب کی اشاعت کا نادر موقع ہے۔ اس مقصد کے لئے ایشیا و افریقہ کے تقریباً تمام اہم تجارتی مراکز کی طرف سے عیسائی مبلغین بھیجے گئے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی مشنری تعلیمی ادارے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عیسائی پادریوں کو تعلیم و تبلیغ کے مواقع فراہم کرے اور جہاں جہاں اس کی کوٹھیاں (ENCLAVES) قائم ہوں وہاں تعلیم کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرے۔ پیرا ایسے تجارتی جہازوں پر بھی ان کو کام کرنے کی توقع دے۔ ہندوستانیوں کی پالیسی کے تحت وہ رہتے رہے اور بعد ۱۶۱۴ء میں مشنری مقاصد کے لئے تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ تعلیم کا مورخ لا (LAW) کہتا ہے کہ ۱۶۱۴ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس مقصد کے لئے ضروری اقدامات کئے کہ ہندوستان کو انجیل کی تعلیم کے لئے تیار کیا جائے اور کمپنی نے اس کا انتظام بھی کیا کہ یہاں صدی بھر یہی ہوتا رہے۔ اس کام کے لئے ضروری رہنمائی و تعلیم دی جا سکے۔ ۱۶۹۸ء میں باقاعدہ مطالبہ پر پارلیمنٹ نے ایک دفعہ منظور کی MISSIONARY CLAUSE جس کے ذریعے لازم کیا گیا کہ کمپنی کے ہر جہاز، ہر فیکٹری اور ہر مرکز پر عیسائی مبلغین کا بندوبست کیا جائے اور اسکول قائم کئے جائیں جہاں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار بڑھتا گیا، عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں ترقی کرتی گئیں اور خصوصیت سے اس کے نتیجے میں تعلیمی ادارے وجود میں آ گئے۔ یہ اسکول صرف عیسائی بچوں کے لئے کھولے گئے مگر غیر عیسائیوں اور ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے بھی ان کے دروازے کھلے رکھے گئے۔ جب یہ سلسلہ بڑھا، اہل ہند اور خصوصیت سے مسلمان اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور بالآخر مسلمانوں نے اس کے خلاف بھرپور قوت سے آواز اٹھائی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

(۱) بالواسطہ اور جہاں ممکن ہو بلاواسطہ طور پر مشنری اداروں کی مدد اور سرپرستی - بالعموم یہ کام کھلے کھلے ہوا - لیکن جن مقامات پر مخالفت بھی وہاں صرف مالی مدد ہو رہی اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئیں -

مشنری اداروں کے انگریزی کے ذریعے تعلیم دے رہے تھے اور نصاب میں بھی مغربی علوم وادب کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ہندوستان کا ایک گروہ بھی مغرب سے مرعوبیت کی بنا پر اس کام کو ابھر گیا تھا

(۲) کمپنی کے وہ حکام جو اس نقطہ نظر کے قائل تھے وہ مغربی تعلیم کو مروج دیا جانے کے حق میں کا اصرار تھا کہ تعلیم مشرقی علوم کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے اور مشرقی علوم میں بھی بنیادی اہمیت فکروں کو نہیں بلکہ زبان وادب کو دی جائے - اس مقصد کے لئے اولین اہمیت سنسکرت اور ثانوی اہمیت عربی اور فارسی کو دی جانی مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کو قائم رہنے دیا جائے اور اعلیٰ مدرسی تعلیمی اداروں کو مالی مدد بھی دی جائے اور پنڈتوں اور مولویوں کو مختلف قسم کے انعامات وعطیات سے بھی نوازا جائے یہ وہ گروہ ہے جسے ORIENTLIST SCHOOL یا مشرقی مستشرقین کا مکتبہ فکر کہا جاتا ہے - انہی کے زیر اثر ۱۷۸۱ء میں کلکتہ کا مدرسہ اور بنارس کا سنسکرت کالج قائم ہوا[۱] - نیز سنسکرت پر تحقیقات کا آغاز ہوا ۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس سے ہندو قومیت کی اشاعت پر صرف ہوئے اور مسلمانوں کی ایک بھی قابل ذکر چیز شائع نہ کی گئی -

(۳) ایسے ادارے قائم کئے گئے جو کمپنی کی ضرورتیں پوری کر سکیں اور ان سے ایسے منتظم تیار کیے جا سکیں جو نئے نظام کے لئے مفید آلۂ کار ثابت ہوں -

یہ وہ عام تعلیمی مقاصد ہیں جو کمپنی کے پہلے دور میں نمایاں نظر آتے ہیں - اس دور کے عام رجحان پر احساس ہوتا ہے کہ کمپنی کے حکام کسی ایک غیر جانبدار پالیسی پر مطمئن رہے تھے اور وہ مقامی نظام سے تصادم مول لئے بغیر مغربی تعلیم اور خصوصاً مشنری تعلیم کی سرپرستی کر رہے تھے اور ہندوستان میں اپنے نظام تعلیم و تمدن کو رواج دینا چاہتے تھے - مگر سیاسی مصالح انہیں مجبور کر رہے تھے کہ کھل کر یہاں کے نظام سے ٹکراؤ نہ ہو اور ایسی پالیسی اختیار کریں جس سے یہاں کا تعلیمی نظام بتدریج ختم ہو جائے اور ایک دوسرا نظام فطری رفتار کے ساتھ مکمل غلبہ وتسلط حاصل کرے اور انہیں یہاں کے نظام کو ختم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے - مغربی مؤرخین اس دور کو تعلیمی غیر جانبداری کا دور قرار دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کمپنی نے تعلیم سے غفلت برتی حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس دور کی پالیسی نہایت ہوشیاری و عیاری سے ساتھ کی گئی تھی آخر معاملات کے بھی دبی تھے لیکن وہ اس کام کو تدریج و دھیرے سے سامنے لا پاتے تھے ہم ان کی اسی کو SLOW POISON کی پالیسی کہہ سکتے ہیں

کمپنی اس غیر جانبداری مگر احتیاط کے ساتھ جس نکتے عملی عمل کر رہی تھی یورپ کے مسیحی حلقے اس پر مطمئن نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو بتدریج رواج میں مسیحیت کے رنگ میں رنگ دیں اس لئے انہوں نے اس پالیسی کو عیسائیت سے غداری کے مترادف قرار دیا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر اس کے خلاف شدید احتجاج کیا اور ان کا کہنا تھا کہ تعلیم کے پروگرام احتیاطاً مشنری اداروں کو دیتے جانے چاہئیں - کمپنی کے وسائل ان کے ہاتھوں میں دیئے جائیں اور مقامی زبانوں ، ہندوستان کی اقوام کے ادب و علوم پر کوئی توجہ نہ دی جائے - بیک وقت کمپنی کے حکام کے درمیان بھی اور کمپنی کے منتظمین اور انگلستان کے دوسرے بااثر عناصر کے درمیان بھی - اور بالآخر یہ کشمکش ۱۸۱۳ء کے برطانوی پارلیمنٹ کے چارٹر ایکٹ پر منتج ہوئی - یہ قانون ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے جو بنیادیں طے کیں وہ یہ ہیں -

(الف) تعلیم حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور اسے ایسے وسائل اس مقصد کے لئے مستقل طور پر صرف کرنا ہوں گے یہ کہ کمپنی کی حیثیت "ریاست در ریاست" کی ہے ، اس لئے وہ اہل ہند کی تعلیم کی ذمہ داری ہوگی -

(ب) تعلیم کے لئے مالی بجٹ بنایا جائے گا اور باقاعدہ سالانہ سرمایہ کے ذریعے فروغ تعلیم پر صرف کیا جائے گا -

(ج) تعلیم کا ایک اولین مقصد اہل ہند تک عیسائیت کا پیغام پہنچانا ہوگا - اس کے لئے مشنری اداروں کو نہ صرف مکمل اجازت دی جائے گی بلکہ ان کی سرپرستی کی جائے گی -

اس کے کمپنی کی جو بظاہر کوئی پالیسی تھی اسے باقاعدہ طور پر مشنری تعلیم کے حق میں طے کر دیا گیا -

(د) تعلیم میں انگریزی تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کو اختیار کیا جائے گا -

(ہ) کچھ وسائل ہندوستانی (سنسکرت و عربی) لٹریچر کے احیاء و فروغ اور ماہرین اہل علم کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی استعمال کئے جائیں گے -

ہماری نگاہ میں یہ قانون ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد جو بھی ارتقا ہوا اس کے دئے ہوئے خطوط پر ہوا ہے ایسے تمام مسائل جو ساتھ تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا اس نے آئندہ کی تعلیمی ترقیات کو لازمہ کی بنا پر کیا لیکن ہم اس کو جدید تعلیمی نظام کا بانی ماننے کو تیار ہیں - اس سلسلے میں سب سے پہلی فکری کوشش چارلس گرانٹ کی دستاویز ہے ، جو ۱۸۱۳ء کے قانون کی بنیاد بنی - گرانٹ کمپنی کا ڈائریکٹر تھا اور مسٹر ولبر فورس کا دایاں بازو کا خاص رہا وہ کٹر مسیحی تھا اور یہ اسی کے افکار و نظریات ہیں جن کا عکس ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں نظر آتا ہے - اس نے ۱۷۹۲ء میں ایک MINUTE لکھی جو تاریخ میں OBSERVATIONS ON STATE POLICY کے نام سے موسوم ہے - اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستانی سوسائٹی نہایت پست اخلاقی حالت (IMMORAL) میں ہے اور اس کا علاج بجز عیسائی تعلیم کے اور کچھ نہیں - ہم صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں - وہ کہتا ہے -

---

[۱] نور اللہ اور نائیک - A HISTORY OF EDUCATION IN INDIA

[۲] بحوالہ نور اللہ اور نائیک ، صفحہ ۶۲ GRANT'S OBSERVATIONS

درجہ اولیٰ کو عمل پیرا ہوا اور ہم اس کو اس احساس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ اب ہماری قوت و احتیاط میں ہے کہ ہم اہلِ ہند کو بتدریج سب سے پہلے اپنی زبان سکھا دیں۔ پھر اس زبان کے ذریعہ اپنے ادب کی آسان کلیات سے معیاری کتابیں جو موضوع موضوعات پر موجود ہیں ہماری اس بات کی بنا پر مصری کے ساتھ میں کچھ رہ جاتا ہے آہستہ آہستہ ہم اس ذریعہ سے اہلِ ہند کو اپنے فلسفہ اور بالآخر اپنے مذہب تک لے آئیں گے۔ اس کام کا حصول آہستہ آہستہ اور پوری خاموشی کے ساتھ اہلِ ہند کے نظام کو جیسے دالو دگرد سے کیا گیا۔

یہ حقی و حقوقی مدارس مری برطانوی تعلیمی پالیسی تمام سونی اور جیسے مقاصد سے بنیاد دے کر ایک فلسفہ اور ایک نظام ساد یا

## دوسرا دور ۱۸۱۳ء ——— ۱۸۵۴ء

پہلے دور میں جو بنیادیں اس پر تعمیر ہونے والے نظامِ تعلیم کے تفصیلی خد و خال اس دور میں ابھرے۔ اسی لئے ہماری نگاہ میں یہ دور سب سے اہم ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کے تفصیلی مقاصد اور مخصوص معیار کو قائم کیا اور جو پروان چڑھا وہ یہی ہے جس نے تعلیمی امور کے بارے میں سب سے زیادہ عجب وہ اختیار ہوا اور یہ کچھ خاص نتائج پر منتج ہو کر گویا کہ مصر کے لئے تم ہو جاتا ہے۔

سیاسی حیثیت سے یہ دور برطانیہ کی فتح مندی اور ہندوستان کی محکومیت کا دور رہا۔ برطانوی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی جو کوشش ملک کے گوشے گوشے میں ہو رہی تھی انہیں اس زمانے میں کچل دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن جنگ ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہیدؒ کے زیر قیادت لڑی گئی جو دراصل پہلی جنگ آزادی تھی۔ اس کی ناکامی کے بعد آخری مسلم کوشش ۱۸۵۷ء میں ہوئی جو بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک ثابت ہوئی۔ اس لئے سیاسی حیثیت سے یہ دور انگریزوں کی فتح پر منتج ہوا اور اہلِ ہند کے لئے غلامی کی بیڑیاں مقدر ہو گئیں۔

تعلیمی حیثیت سے ہم اس دور میں مندرجہ ذیل خصوصیات پاتے ہیں:۔

(۱) اس دور میں تعلیم کی پالیسی ماہرینِ تعلیم کے نہیں، عمّالِ حکومت کے ہاتھ میں تھی جو نہ کوئی تعلیمی تجربہ رکھتے تھے اور نہ ہی فکری حیثیت سے اس کام کی اہلیت و قابلیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمی کو محسوس کر کے ۱۸۵۴ء میں حکومت نے محکمۂ تعلیم قائم کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس محکمہ کو بھی ماہرینِ تعلیم کم ہی میسر آئے۔ اور ایک مورخ کے الفاظ میں یہ محکمہ فوجی افسروں کا ریٹائرنگ روم بن گیا۔

(۲) اہلِ ہند کو اس تعلیمی پالیسی اور پروگرام میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ تمام معاملات و ہدایات لندن میں بیٹھ کر طے کئے جاتے تھے اور کلکتہ سے نافذ کئے جاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ خود انگریز حکام ہندوستان میں تھے خود ان کو بھی معاملات کا اختیار نہ تھا اور معمولی معمولی باتوں کے لئے لندن سے پوچھنا پڑتا تھا۔

(۳) ۱۸۱۳ء کے قانون کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ مشنریوں کی ایک فوج ظفر موج ملک میں در آئی اور مشنری تعلیمی اداروں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ۱۸۵۲ء ——— ۱۸۵۳ء میں جب کہ تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف ۳ ہزار طلبہ تھے، مشنری تعلیمی اداروں میں اس سے دس گنا زیادہ یعنی ۳۰ ہزار طالب علم تھے۔ یہ مشنری اسکول و کالج صرف بائبل ہی کی تعلیم نہ دیتے تھے بلکہ انہوں نے عیسائیت کو پورے نظامِ تعلیم میں سمو دیا تھا اور بعض ذریعہ تعلیم بھی انگریزی کو استعمال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں عیسائی مبلغین نے کھل کر ہندوستانی مذاہب پر تنقید کی اور ایک بڑی تعداد میں اہلِ ہند کو عیسائی بنا لیا گیا۔

(۴) کمپنی نے تعلیم سے غفلت کی جو بظاہر معصومانہ پالیسی اختیار کی تھی اس کے تلخ نتائج اس زمانے میں سامنے آنا شروع ہو گئے اور وہ یہ تھے کہ اوقاف کے تولیت پر ہی اور مشرقی علوم کی کچھ سرپرستی جو رہی تھی لیکن جو اہلِ علم کے لئے مدارس کا جو نظام تھا وہ مسلسل قوت اور دیرینہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے تیزی سے دم توڑ رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں ... رفتہ رفتہ ... حکومت ... اس نظام کو جلد از جلد ختم کر دے ...

[illegible]

تھا۔ وہ مدارس جو ہر بارے میں آزاد تھا۔ اور یعنی یہ، ثقافتی قدروں کی گرفت معاشرہ پر اتنی مضبو

**اُستاد کی حیثیت** (۵) اس نظا ... ربط پایا جاتا ہے۔

**اربابِ حکومت کی دلچسپی** (۶) ایک طرف تعلیمی مسائل ا ... تھی۔ اربابِ حکومت تعلیم کو تجارت ...

ملہ نور اللہ اور ڈاکٹر نائیک ... ۱۹۵۱ء ... صفحہ ...

THE EDUCATION OF SEQUFIRA

THE EDUCATION IN INDIA ...

EDUCATION IN INDIA

نظام تعلیم کو مکمل طور پر تقریباً باقاعدہ طور پر تیس سال ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں پورے صوبے میں ان لوگوں کی تعداد جو پڑھ لکھ سکتے ہیں، ہمارے تسلط کے بعد گھٹتے گھٹتے آدھے سے کم رہ گئی ہے"۔

اس دور کی تعلیمی حکمت عملی کا ایک اہم مقصد ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ پرانے نظام کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اس کی ضرب سب سے زیادہ مسلمانوں کے نظام تعلیم پر پڑی جس کے نتیجے میں علم کی مجلس سونی پڑ گئیں، مدرسوں، محلوں اور دیہاتوں تک میں علم کا چرچا تھا، وہاں جہالت کی تاریکیاں چھا گئیں۔ تاریخ کا المیہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کا سب سے بڑا کارنامہ فروغ تعلیم نہیں، تعلیم کی تباہی ہے۔

(۵) اس دور کا ایک نہایت ہی اہم پہلو بنیادی تعلیمی معاملات پر بحث و مباحثہ ہے۔ جو کہ تعلیمی پالیسی اس دور میں تشکیل پائی اس کی حیثیت بہت بنیادی اور تفصیل طلب ہے۔ ہم کو ملتے ہیں اور یہ دور اس پہلو سے ممتاز ہے کہ حکمران طبقہ کی طرف سے اس کے بعد کے ادوار میں غور و فکر کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ دور کے مباحث کو مختصراً سامنے رکھ دیں۔

(الف) مقاصد تعلیم کے سلسلے میں ہمیں بنیادی اختلافات کم نظر آتا ہے۔ اور اس بات پر تقریباً سب متفق نظر آتے ہیں کہ بالآخر مغربی فکر و تمدن کو ہی بار پانا ہے۔ مستشرقین کا وہ گروہ جو مشرقی علوم کی بقا کا حامی تھا اور ان کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی ترویج چاہتا تھا، اس زمانے میں آخر لڑائی لڑ کر ہار گیا اور میکالے کی (MINUTES) اس بحث کو تقریباً ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے اور تعلیم کا یہ مقصد طے پا جاتا ہے کہ اصل چیز مغربی افکار و علوم کی ترویج ہے۔

دوسرا بنیادی اختلاف اس بارے میں ابھرا کہ آیا تعلیم کو ریاست کی ذمہ داری ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور بالآخر یہ طے ہوا کہ تعلیم ریاست کی ذمہ داری رہے گی۔

تیسرا اختلاف اس بارے میں تھا کہ ملازمت آیا تعلیم کا ایک مقصد ہے یا نہیں، اور یہاں بھی یہی طے ہوا کہ یہ تعلیم کا مقصد ہے۔

(ب) دوسری بحث اس بارے میں تھی کہ تعلیم کا وسیلہ کن اداروں کو بنایا جائے۔ اس بارے میں تین مکاتب فکر ملتے ہیں۔ پہلا اور سب سے مؤثر یہ تھا کہ اس کا ذریعہ سابق مشنری اداروں کو ہونا چاہئے۔ اس نقطہ نظر کا سب سے اہم وکیل چارلس گرانٹ تھا۔ دوسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ مشنری تعلیمی اداروں کو حکومت مراعات دے مگر بڑی حد تک غیر جانبدار رہا جائے اور ہندوستان کے پرانے مدارس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا جائے اور انہی کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔ مستشرقین کا ایک گروہ اس رائے کا حامی تھا۔ تیسرا گروہ مقامی تعلیمی نظام کا سخت مخالف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ حکومت کے زیر سرپرستی تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ دوسرے گروہ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ میکالے اور بینٹنک تیسرے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ اسی کو غلبہ حاصل ہوا مگر مشنری تعلیم کی جس طرح حوصلہ افزائی کو سرکاری پالیسی کا جزو بنایا گیا

(ج) بحث کا ایک نہایت اہم موضوع یہ تھا کہ تعلیم کا تصور اور نظام کیا ہو۔ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں پہلے سے عام تعلیم کا رواج ہے اور چونکہ ہمیں عوام کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے، اس لئے ہم اپنے طور پر (MASS EDUCATION) کا انتظام کریں۔ دوسرا گروہ اس رائے کا سخت مخالف تھا اور اس کا موقف یہ تھا کہ تعلیم کو ایک طبقہ تک محدود رہنا چاہئے اور یہ طبقہ عوام کے لئے ہمارے وکیل اور ترجمان کی حیثیت سے کام کرے۔ اسی دوسرے گروہ کی بات کو قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ نظریہ جسے اختیار کیا گیا (DOWN-WARD FILTERATION THEORY)

(د) آخری اہم موضوع بحث کا ذریعہ تعلیم تھا۔ کمپنی کے اولین عمال اس رائے کے حامی تھے کہ سنسکرت اور عربی کو فروغ دیا جائے۔ لیکن دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ عربی اور سنسکرت کو نظر انداز کر کے مقامی زبانوں کی سرپرستی کی جائے اور ان کے ذریعے عوام تک رسائی حاصل کی جائے۔ تیسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ نہ سنسکرت، نہ عربی اور نہ مقامی زبانیں بلکہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔

ان مباحث کے آئینے میں اس دور کے پورے ذہن کو دیکھا جا سکتا ہے۔

(۶) تعلیم کے نظام کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ، تعلیمی حکمت عملی کا دوسرا بڑا مقصد ایک نئی قسم کی تعلیم کا رواج تھا جو اہل ہند کو ان کی تاریخی روایت سے کاٹ کر مغرب کا حلقہ بگوش کر دے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام گرانٹ کی تحریرات اور ۱۸۱۳ء کے چارٹر نے کر دیا تھا۔ اب اس بنیاد پر میکالے نے مزید تعمیر کی۔ میکالے نے مستشرقین کے مکتب فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ان کے نقطہ نظر کی کھل کر تردید کی۔ ۱۸۱۳ء کے قانون میں مشرقی علوم و علماء کی سرپرستی کے لئے جو گنجائش موجود تھی اس کا دروازہ بند کیا اور بالکل صاف الفاظ میں اس مقصد تعلیم کا اظہار کیا کہ ہمیں ایسی نسل تیار کرنا ہے جو دیسی آبادیوں کے لئے ہمارے افکار و نظریات کی ترجمان ہو اور جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو بلاشبہ ہندی ہو لیکن فکر و نظر اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے خالص انگریزی ہو۔ مشرقی علوم کے فروغ کے لئے جو مالی امداد جاری تھی اسے بند کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اسی دور میں اس پر عمل بھی کیا گیا اور تمام وسائل کو صرف انگریزی تعلیم کے فروغ کے لئے وقف کر دیا گیا۔ میکالے کی ان سفارشات پر پالیسی کا جو اعلانیہ تیار ہوا اسے (BENTINCK'S RESOLUTION) کہتے ہیں۔ ۷/ مارچ ۱۸۳۵ء کو منظور کیا گیا۔ جس طرح گرانٹ کے افکار ۱۸۱۳ء کے قانون میں منعکس ہوتے اسی طرح ۱۸۳۵ء کا یہ اعلانیہ میکالے کے افکار کا آئینہ دار ہے۔ اس ریزولیشن کے اہم خدوخال یہ ہیں:

(الف) تعلیم کا اصل مقصد یورپی ادب اور یورپی سائنس کا فروغ ہے۔

(ب) ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔

(ج) سرکاری خزانے کی تمام رقوم صرف اس تعلیم پر خرچ ہوں گی۔ ہندوستان کے پرانے تعلیمی اداروں کو جو تھوڑی بہت امداد دی جا رہی تھی اس کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے گا۔

(۷) اس دور میں ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ تعلیم کا تعلق سرکاری ملازمت سے جوڑ دیا گیا تعلیم کا ایک مقصد یہ قرار دیا گیا کہ وہ سرکاری ملازمت کے لئے لوگوں کو تیار کرے خصوصیت سے نچلی سطح کے استعمالی کلرک (کلرک) کی فراہمی کا کام انجام دے اور اس کی وجہ یہ بھی کہ انگلستان سے اس قسم کے عملہ کو لانا بہت مہنگا پڑتا تھا اور اس لئے ضرورت بھی کہ ہندوستانیوں ہی سے اب ہم مشرب وہم مزاج افراد تیار ہو سکیں جو ان ذمہ داریوں کو انجام دے سکیں جن میں پالیسی کے امور شامل نہ ہوں اور صرف عام روٹین نوعیت کے کام کریں۔ دوسری طرف حکومت نے اپنی یہ پالیسی صاف الفاظ میں ظاہر کر دی کہ کھلے اور چھپے دونوں طریقے سے روزگار کے مواقع ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دئے جائیں گے جو نئی تعلیم سے آراستہ ہوں اور یہ دروازے ان لوگوں کے لئے تقریباً بند کر دئے جائیں گے جو پرانے نظام تعلیم کی پیداوار ہیں۔ لارڈ ہارڈنگ نے اس مقصد کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "ہمارا مقصد ان کالجوں کے ذریعے لوگوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا ہے جو ذہن و اصول کے اعتبار سے ہندوستانی ہو (تاکہ) برطانیہ کی سول انڈمنسٹریشن میں ملازمت کا اہل ہو" اور ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے پارلیمینٹ میں ایک اعلان کے ذریعے اس بات کو صاف الفاظ میں اظہار کیا

"... قائم کردہ اسکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ملازمت اور دوسرے تمام معاملات و مواقع میں ترجیح دی جائے گی"

... اس پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے "بس اسی طرح وہ روایت مستحکم ہو گئی جس میں سرکاری ملازمت تعلیم کا مقصد اور منتہا بن گئی"

(۸) اس دور کی تعلیمی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس میں صرف پرانے نظام تعلیم ہی سے بیزار نہیں کیا بلکہ ہندوستان کی دو اہم قوموں کے درمیان بھی امتیاز و تفریق کا آغاز ہوا ... طریقے بر کیا ... کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام ... ہو جائے اور ان کے معاملے میں ہندوؤں کو ہر میدان میں آگے بڑھایا جائے حد تو یہ ہے کہ ملازمتوں کے لئے اخبارات میں جو اعلان کئے جاتے تھے ان میں یہ بھی لکھ دیا جاتا تھا کہ سوائے ہندوؤں کے کسی اور کو ملازم نہ رکھا جائے گا۔ ولیم ہنٹر اس قسم کے متعدد واقعات نقل کر کے لکھتا ہے "مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ وہ اگر سرکاری ملازمت پانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے ان کی بے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی کسر شان سمجھتے ہیں کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہو گا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے کسی مسلمان کو نوکری مل سکے"۔ اس طرح انگریزوں کی تعلیمی اور اقتصادی حکمت عملی کا ایک مقصد ہم مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور برتاؤ سے ان کو زوال ... دور تعلیمی نقطۂ نظر سے سر چارلس ووڈ کے ۱۸۵۴ء کے DESPATCH پر اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہ ڈسپیچ پالیسی کے ان تمام مباحث کو جن کا ہم نے ذکر کیا ہے ... ہندوستان میں تعلیم کے بارے میں ... اور ان مبادیات کے بارے میں صرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین اسے (THE MAGNA CARTS OF ENGLISH EDUCATION IN ...) کہتے ہیں۔ اس نے جدید تعلیم کے ان مقاصد کو جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ایک قانونی شکل دے دی ... جدید تعلیم کی سمت سے طے کر دیا اور سب سے اہم چیز یہ کہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے قیام کا اصولی طور پر طے کر لیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے اس دور میں وہ تعلیمی مسائل کے بارے میں کسی جدوجہد کے لئے نظر نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں زندگی و موت کی اصل جنگ لڑ رہے تھے کہ اپنی ساری قوتیں اور توجہات اس مقصد پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ انگریزوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہ دیا جائے تعلیمی امور کی بات تو اس وقت سوچی جاتی ... ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ انگریز یہاں کی حکمران قوت ہیں اور انہیں اس حقیقت کی ماتحتی ... اس دور میں ان کی کوششیں ... کہ ... انگریزوں سے لڑائی مول لی جاتی ہے ... اقتدار کو بحال رکھا جائے ... بہادروں کی طرح لڑے ... ہوتے ... تعلیمی میدان میں ... مسلمانوں کے ... [illegible]

[illegible]

... زمانے ... حکومت ... [illegible]

(۱) تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ سرکاری پالیسی کے تعین کے لئے کسی بحث سے خالی ہے، جو خطوط دوسرے دور میں طے ہو گئے تھے اس زمانہ میں ان ہی پر تعلیم تیزی سے کام ہوتا گیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

(۲) سب سے اہم چیز یونیورسٹیوں کا باقاعدہ قیام اور ان کے ذریعہ تعلیم کا قائم کیا جانا تھا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں سب سے پہلے یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور پھر ۱۸۸۲ء کے یونیورسٹی کمیشن کی سفارشات کے نتیجے میں متعدد دوسرے مقامات پر یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ یونیورسٹیاں شروع میں صرف امتحان لینے والا ادارہ تھیں اور ان کے انتظامی امور پر حکومت کی گرفت بہت زیادہ مضبوط تھی۔ محکمہ تعلیم کے تحت سیکنڈری اور پرائمری تعلیم کی نگرانی کا کام انجام دیا گیا۔

اس بنیادی تبدیلی کے چند اہم نتائج مرتب ہوتے ہیں:-

(الف) تعلیم کا مرکز انگلستان کی بجائے کلکتہ ہو گیا اور ڈائرکٹ پالیسی وہاں سے چلائی جانے لگی۔ اس سے پہلے کے ادوار میں جا بجا تعلیم پورے طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور اس میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا، لیکن پھر بھی کلکتہ کے مرکز بننے کی وجہ سے نظام میں ایک گونہ آزادی اور خود مختاری کی کیفیت پیدا ہوئی۔

(ب) حکومت نے تعلیمی امور میں اس حیثیت سے دلچسپی لی کہ اس نے باقاعدہ کیا ہے کہ پورے ملک میں اور کس نوعیت کی تبدیلیاں درکار ہیں۔ اس مقصد کے لئے ۱۸۵۵ء ہی میں ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا مقصد یونیورسٹیوں کے لئے پورا منصوبہ بنانا تھا۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے تحت ۱۸۵۷ء کا انڈین یونیورسٹیز ایکٹ پاس ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۵ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک مسلسل تعلیمی سروے ہوتے رہے اور سال آخر ۱۸۸۲ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن قائم ہوا جس نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اہم سفارشات پیش کیں۔

(ج) یونیورسٹیوں کے قائم ہونے سے مغربی طرز کا اعلیٰ علم کا انتظام ہندوستان میں ہوا اور اس طرح نئے نظام کو مکمل نشوونما کا موقع ملا۔

(د) تعلیم میں ایک تدریجی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا نظام مربوط ہو گیا لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ثانوی تعلیم بجائے اس کے کہ متعلمین کو زندگی کے لئے تیار کرے یونیورسٹی کے لئے درمیانی زینہ بن گئی اور اس طرح تعلیم کا نظام ملک کے حالات اور ملکی ضروریات سے کٹ گیا۔

(ہ) اس کے نتیجے کے طور پر حکومت کی گرفت تعلیم پر سخت ہو گئی اور تقریباً سارا نظام حکومت کے تابع ہو گیا۔ جو اسکول اور کالج حکومت کے محکمہ تعلیم کے تحت کھولے گئے اور جو اسکول اس کے تحت نہیں تھے وہ بھی سرکاری گرانٹ کے ذریعہ حکومت کی گرفت میں لے آئے گئے۔ یہ ایک ایسا کھلا ہوا نقصان تھا کہ جس پر تعلیمی ناقدین متفق ہیں، اس سال سے مکمل آزادی کی فضا میں نشوونما پا رہا تھا وہ اب نظام حکومت کے زیر نگیں آ گئی۔

(۳) تعلیمی حیثیت سے یہ زمانہ جدید تعلیم کی وسعت و فروغ کا زمانہ ہے۔ پرانا نظام تعلیم اس دور میں تقریباً ختم ہو گیا اور صرف وہ چند جگہیں باقی رہ گئیں جو سیاست، تمدن اور معاش کی بہار کے سدھی سے تمام سے ہٹتے۔ نیا نظام اس زمانہ میں بار نشوونما پاتا رہا اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ان اداروں میں بھی زیادہ اہمیت ثانوی تعلیم کو دی گئی۔ پرائمری تعلیم اس پورے دور میں عدم توجہی کا شکار رہی۔ ۱۹۰۲ء کے تعلیمی کمیشن نے اس بات کا پر زور الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ پرائمری تعلیم کے حالات غیر تسلی بخش ہیں۔ بہرحال ثانوی تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو ضرور اضافہ ہوا ہے لیکن معیار تعلیم میں کمی واقع ہوئی ہے۔

(۴) اس بات کا اظہار غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف حکومت تعلیم پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی چلی جا رہی ہے لیکن دوسری طرف تعلیم کے لئے جو مالی وسائل فراہم کئے جاتے ہیں وہ نہایت ناکافی ہیں۔ تقریباً تمام سرکاری رپورٹوں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تعلیم پر مالی صرفہ ضرورت سے بہت ہی کم ہے۔

(۵) ذہنی نقطۂ نظر سے اس زمانہ میں ہندوستان میں چند اہم رجحانات رونما ہوتے جن میں سے ہر ایک کے اثرات تعلیم کے دائرہ پر بھی مرتب ہوتے۔ ہندوؤں کا ردعمل یہ تھا کہ انہوں نے نئی تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ہندوؤں کے ایک طبقہ نے ہندو تہذیب اور تاریخ کے عظر اندار کئے جانے پر توجہ ضرور کی، لیکن بحیثیت قوم ان کا رویہ تعاون اور اشتراک عمل کا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں دو متخالف رجحانات رونما ہوتے۔ سواد اعظم نے نئی تعلیم کا بائیکاٹ کیا۔ محض اس لئے نہیں کہ اس میں انگریزی کی تعلیم تھی۔ کیونکہ محض انگریزی کی تعلیم پر انہیں کوئی اصولی اعتراض نہ تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ مسلمانوں کا اصل اعتراض یہ تھا کہ نئی تعلیم اپنے مزاج، اپنے مقاصد، اپنے نصاب تعلیم اور اپنے اجتماعی ماحول کے اعتبار سے دین اسلام اور اسلامی ثقافت سے کاٹنے اور دور لے جانے والی چیز تھی اور اس کی روح پر مادیت اور عیسائیت کا غلبہ تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا رویہ عدم تعاون کا تھا اور یہ بڑی حد تک پہلی جنگ عظیم تک رہا۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کا یہ گروہ کوئی انقلابی اقدام کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا تھا۔ اس لئے اس نے جس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی وہ یہ تھی کہ اپنے علمی سرمایہ کو جس حد تک محفوظ کر سکتا محفوظ کر لے اور اس طوفان کی زد سے بچا لے۔ یہ ایک جاہلانہ نہیں، منفعلانہ ردعمل تھا جس پر حالات نے ان کو مجبور کر دیا تھا لیکن مسلمان برابر اس کو نافذ کرنے کے لئے برابر پریشان اور مضطرب رہے اور ایک قابل ذکر کوشش ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت میں انہوں نے کی جس میں قدیم و جدید کے امتزاج کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ سر بر سر موقع پر مسلمانوں نے یہ مطالبہ اٹھایا کہ جدید تعلیمی اداروں میں کم از کم ان کی مذہبی تعلیم کی گنجائش پیدا کی جائے نیز یہ کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے خصوصی انتظامات کئے جائیں تاکہ مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط بلند ہو سکے۔

مسلمانوں میں دوسرا ردعمل ان کا تھا جنہوں نے نئی تعلیم کو قبول کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک اس میں اصلاحات کی موزونکاری کر سکیں کر لیں، لیکن بحیثیت مجموعی نئی تعلیم کو ہی قبول کر لیں۔ یہ ردعمل بھی منفعلانہ تھا لیکن ایک دوسری نوعیت کا۔ اول الذکر گروہ مقاومت کی روش اختیار کئے ہوئے تھا اور آخرالذکر مفاہمت کی

اس دور کے اختتام تک ہی تعلیم کے اثرات و نتائج رونما اور واضح ہو گئے تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ جہاں اس تعلیم نے برطانوی سامراج کی مشینری کے لئے پرزے تیار کر دیے ہیں وہیں اس نے اہم ثقافتی اور سیاسی رجحانات کو بھی جنم دیا ہے۔ سب سے اہم خبر یہ بھی کہ ملک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک الگ [illegible] اور عوام کے درمیان منقسم ہو گیا تھا اور ان دونوں کے درمیان کوئی ربط بھی کہ ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی لگانگت بھی باقی نہ رہی تھی۔ یہ وہ ساری ناسور تھا جو ہند کی تعلیمی کوشش یہاں کی پوری نصاب کو کچھ نے مار رکھا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہی قیادت اُبھری اور یہ نئی قیادت اس حیثیت سے نئی تھی کہ ماضی میں قوم کی ماندگی میں لوگوں نے کبھی اس کے معاملے میں نئے افراد یہ لوگ تھے جن کی مغربی قوم میں ترقیں اور جو نئے نظام تعلیم کی پیداوار میں۔ تاہم یہ دور شدید ذہنی معلومات کا دور ہے۔ انگریزی تہذیب اسے اوج کمال پر بھی اور یہاں علما ء جب اپنے سامنے تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے رہنمائی کا معیار بھی [illegible] مغربی سہ کی تھا اور ہر دانشور کا رہیں اس کی نقالی کی کوشش کی جا رہی تھی اس نئی روش کو پیدا کرنے میں مغربی تعلیم کا فیصلہ کن حصہ تھا اور یہی بات پر مسلمان مغربی علم کے خلاف تھے وہ بھی تھی۔

## چوتھا دور (۱۹۰۵ ——— ۱۹۴۷)

۱۹۰۵ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہے۔ اس سال تقسیم بنگال واقع ہوئی جس نے یہاں کا نقشہ بدل دیا۔ ہندوؤں کے شرائط سامنے آگئے اور انگریزوں کی کمزوری بھی واشگاف ہو گئی۔ اگر ۱۹۰۵ تک کا دور مجموعی اہل ہند کی طرف سے برطانیہ کے ساتھ خاموش مفاہمت اور مجبورانہ سپردگی کا دور ہے تو ۱۹۰۵ کے بعد کا دور احتجاج، عدم تعاون اور مجاہدانہ کشمکش کا دور ہے۔ اس زمانہ میں آزادی کی تحریک ابھر کر ابھری اور ہندی کے ہر میدان میں ٹکرلے کا مظاہرہ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم نے انگلستان کو ایسے عالمی مقام کو بھی بے حد مارا اور وہ جو کبھی سمندروں کی لہروں پر حکمراں کرتے تھے سمندر کی لہریں ان کے جنگل سے نکل کر تلاطم برپا تھی۔ تعلیمی نقطہ نظر سے اس زمانہ میں کئی اہم رجحانات نظر آتے ہیں۔ اس دور کا آغاز لارڈ کرزن کی خالص گورا ساہی سے ہوتا ہے جس نے اس ملک کے ساتھ ہمدردی ، تعلیم اور ریاستی ایجنسی تعلیم کے تصور کو اور سر پر بیٹھ گیا لیکن اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ کرزن کی تعلیمی ترقی عرب کے لئے تاریخ ساز ثابت ہوئیں اور قومی تعلیم کا رجحان جو اسباب میں پیدا ہوا اس میں سے ایک یہ بھی تھا۔

اس دور کے اہم تعلیمی رجحانات یہ ہیں۔

(ا) تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ کا رجحان جاری رہا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش بھی ہوتی

(ب) تعلیمی پالیسی کے نقطہ نظر سے جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار شعبہ تعلیم ہندوستانیوں کے کنٹرول میں دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ نصاب تعلیم اور دوسرے تعلیمی امور میں ہندوستانیوں کے مختلف مطالبات جب سے کچھ منظور کئے جانے لگے اور حکومت کی تعلیمی پالیسی کچھ نرم پڑ گئی۔

(ج) اس زمانے کی سب سے اہم خصوصیات قومی تعلیم اور تحریک کا وجود ہے۔ ۱۹۰۵ میں سودیشی تحریک کا اثر طلبہ پر یہ پڑا کہ انہوں نے سیاست میں کھل کر حصہ لینا شروع کیا۔ اس کو چیک کرنے کے لئے حکومت نے مختلف نوعیت کے انسدادی اقدامات کئے طلبہ کو خارج کیا گیا، اساتذہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ طلبہ پر (I D) کا نام بھی انجام دیں۔ اس ردعمل میں ایک آگ سی لگ گئی اور سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کرنا اور آزاد قومی ادارے قائم کرنے کا رجحان رونما ہوا۔ ہندوستان اور مسلمانوں نے بیک وقت قومی اداروں کو قائم کیا۔ بنگال ان سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ پہلی جنگ کے بعد جب کہ سودیشی تحریک اور عدم تعاون کی تحریک نے اور زیادہ زور پکڑا، یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ کانگریس نے مسلم لیگ اور کانگریس کو پوری تائید کی اور مسلمانوں کی طرف سے قومی تعلیم کے لئے جامعہ کی شکل میں مسلم کوشش ہوئی۔

(د) حکومت نے اہل ہند کے ہاتھوں میں شعبہ تعلیم کو دینے سے پہلے ایک آخری کوشش انسدادی حربوں کے استعمال کی کی اور یہ سلسلہ ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں طلبہ اور اساتذہ دونوں کو سیاسی سرگرمیوں سے روکنے اور ان پر حکومت کی گرفت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی اور جبر و تشدد کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے لیکن یہ کوشش آزادی کی تحریک کو ناکام بنانے میں کارگر نہ ہو سکی۔

(ھ) اس دور کی ایک اور خصوصیت بحیثیت مجموعی طلبہ کا سیاسی کردار بھی ہے۔ اس پورے دور میں طلبہ نے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حصول آزادی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کیا۔ سیاسی ارتقاء کے اثرات تعلیمی زندگی پر اور سیاسی ضرورتوں کے تحت نئی تعلیمی راہیں تلاش کرنا اس دور کی اہم خصوصیات ہیں۔ [illegible] میں یہ احساس اپنی شدت کو پہنچ گیا کہ ہندوستانیوں کا نظام تعلیم قومی ضروریات کے مطابق ہے اور ہر طرف سے اس نظام کو بے رحم تنقید کا نشانہ [illegible] اس تنقید میں بیش پیش [illegible] تھا اور مسلمان اس پر اس حیثیت سے تنقید کر رہے تھے کہ [illegible] بہا لے گئے [illegible] ہر طرح سے [illegible] اپنی اصل سے [illegible] ور کے مقابلہ میں ایک رجحان [illegible] مسلمانوں [illegible] تعلیم کا مخرج ان [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] کی سرور تھی ایک منصب کی تھی اس احساس کا یہ بہرحال ہوا کہ مجموعہ دار تعالی اور قومی طلباء کی مسعود [illegible]

[illegible] کے بعد اب ہم مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں سے چند نمایاں تحریکات کا تعارف کرائیں گے۔

# مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک میں چار رجحان زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۔ **انگریزی حکومت سے عدم تعاون** نئے تعلیمی نظام سے کلی انقطاع و عدم تعاون اور پرانے تعلیمی نظام کے تحفظ کی کوشش۔ اس کا نمائندہ ہے دارالعلوم دیوبند

**جزوی ترمیمات کے ساتھ نظام کو جاری رکھنا** دوسرا رجحان نئی تعلیم کو مغربی نظام کے [illegible] طور پر قبول کرنا اور جزوی ترمیمات کے ساتھ اسے مسلمانوں میں فروغ دینا۔ اس کا نمائندہ ہے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔

**دونوں سے عدم اطمینان** تیسرا رجحان علی گڑھ اور دیوبند دونوں سے عدم اطمینان کی پیداوار ہے۔ اور اس کی نمائندگی ندوۃ العلماء لکھنؤ کرتا ہے۔

**تینوں سے بائیکاٹ** چوتھا رجحان ان تینوں تحریکات کو ملکی، قومی اور ملی ضروریات کے سلسلے میں ناکام محسوس کرتے ہوئے تعلیم کو نئے رنگ میں رنگنے کا تقاضا، پہلی عالمی جنگ کے بعد رونما ہوا۔ اس کا نمائندہ جامعہ ملیہ دہلی ہے

اب ہم ان میں سے ہر رجحان کے نمائندہ ادارے کا تاریخی و تنقیدی مطالعہ کریں گے

## (۱) دارالعلوم دیوبند

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پاک و ہند کی گذشتہ تین سو سالہ تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مسلم حکومت کے آخری دور کا یہ مجدد زندگی کے ہر میدان میں اسلامی افکار و اساسات کی ایسی موثر کوشش کرتا ہے کہ بعد کی تاریخ کے ہر مرحلہ پر شاہ ولی اللہ کی چھاپ موجود ہے۔ ان کی تجدیدی کوششوں کا ایک اہم حصہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین تھی۔ اس تحریک کی ناکامی کے بعد علماء ہند نے ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں شرکت کر کے ایک آخری بازی کھیلی لیکن بدقسمتی سے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تحریک دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے مقاومت اور مدافعت کی وہی روش قائم رکھی اور اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کی بنا پر برطانوی اقتدار کے لئے مستقل دردِ سر بنا رہا۔ اس تحریک کے باقی ماندہ چند لوگوں نے کام کا ایک دوسرا لائحہ عمل بنایا اور وہ یہ تھا کہ تعلیم کے ذریعے علوم اسلامی اور ثقافت ملی کو محفوظ کر لیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند انہی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مولانا محمود الحسنؒ اس مدرسہ کے بارے میں ان صاف الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"درحقیقت میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

دیوبند کا مدرسہ ۳ مئی ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں قائم ہوا جو مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے اور مولانا مملوک علیؒ ایک طرف شاہ ولی اللہ کے تعلیمی مکتب فکر کے پروردہ تھے اور دوسری طرف سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے باقی ماندہ لوگوں میں سے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب اس مدرسہ کے پہلے سربراہ تھے۔ ۹ سال مدرسہ مسلسل ابتدائی حالت میں رہا۔ ۱۸۷۶ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس کے پہلے طالب علم تھے۔

دیوبند کی خصوصیات یہ ہیں

۱۔ اس ادارہ کا اصل مقصد دینی تعلیم کے ایک مرکز کا قیام تھا جس کا نظریہ تھا کہ اس وقت جب کہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام تباہ و برباد کیا جا رہا ہے قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کر دیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کی حیثیت ایک مدرسہ کی نہیں، ایک تحریک کی تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ ہوا بھی ایسا ہی۔

۲۔ ہر دور میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں تین نمایاں روایتیں ملتی ہیں۔ ایک دہلی کی جس میں شاہ ولی اللہ کے زیر اثر قرآن و حدیث کی تعلیم کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ دوسری فرنگی محل کی، جو درس نظامی کا اصل گہوارہ تھا اور جہاں فقہ، اصول اور معقولات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور تیسری خیرآباد کی جہاں کلام کو غلبہ حاصل تھا۔ دیوبند میں نظام تعلیم کی بنیاد درس نظامیہ کو بنایا گیا لیکن اولین دور میں اس کا مزاج دہلی کی روایت سے قریب تر تھا، بعد میں فقہ اور کلام دونوں کی طرف رجحان بڑھا اور ایک حیثیت سے یہ مدرسہ تینوں روایتوں کا جامع ہو گیا۔ یہاں کا تعلیمی کورس ۹ سال کا تھا۔

۳۔ دیوبند کے پورے نظام تعلیم پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو اصل مقصد دینی تعلیم کا تحفظ ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ذہنی وسعت اور [illegible] پیدا کرنے کے لئے چند دوسری چیزوں کو بھی تعلیم کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ مثلاً علم طب ایک ضمنی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کیا گیا۔ اس کے علاوہ خطاطی کو ایک مضمون بنایا گیا۔ پھر مختلف حرفوں کی ابتدائی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا مثلاً جلد سازی، کپڑا بننا اور سینا وغیرہ۔ افسوس ہے کہ تعلیم کا یہ پہلو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی نہ پا سکا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند کا تعلیمی نظام مسلمانان ہند کی تعلیمی اور معاشی ضرورتیں پوری نہ کر پاتا۔ بانیان مدرسہ کے فکر میں وسعت نظر آتی ہے لیکن حالات کی مجبوری کی بنا پر وہ مدرسہ کی سرگرمیوں کو بہت محدود رکھتے تھے۔ لیکن بعد کے لوگ فکر کے فقیر بن جاتے ہیں اور ان خطوط

پر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے جن کا سراغ تاسیسی دور میں ملتا ہے۔

(ج) دیوبند کی نہایت اہم خصوصیت اس کی آزادی تھی مولانا محمد قاسم صاحب ایسے ان اصولوں میں جو انہوں نے دیوبند کے لئے مرتب کئے تھے، دینی پہلو کے بعد سب سے زیادہ اہمیت صبر کی آزادی اور حکومت اور امراء کی گرفت سے اس ادارہ کو آزاد رکھنے پر دیتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کی دفعات (۶) اور (۷) پیش کریں۔

**اصل (۶)** اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

**اصل (۷)** سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ الغرض ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا موجب نظر آتا ہے"۔

یہ ایک بڑا ہی انقلابی اقدام تھا جس کے درج ذیل پہلو قابل غور تھے۔

(۱) حکومت کے بارے میں یہ فیصلہ مسلمان اہل علم کے ذہن کا عکاس ہے انہوں نے انگریزی حکومت اور اس کی تعلیم کے مقاصد کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا جیسا کہ اس ادارہ پر بالواسطہ طور پر بھی حکومت کا سایہ پڑنے پر حکومت سے عدم مصالحت کے رویہ کا ایک اہم مظہر ہے۔

(ii) یہ ایک حیثیت سے خود مسلمانوں کے نظام تعلیم کی روایت سے انحراف بھی تھا اس لئے کہ اس میں حکومت اور امراء کی مدد کا ہمیشہ ہی بڑا حصہ رہا ہے لیکن اب مسلمان جن سیاسی و تمدنی حالات سے دوچار تھے ان میں غیر معمولی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ حکومت اور دوسرے اہل مفاد کے اثر سے اسے کوشش رکھا جاتا۔ اس لئے کہ حکومت اسی پر بھی دسترس کی تھی۔

(iii) مالی نظام کو اہل اخلاص کی تھوڑی رقوم تک محدود رکھنا ایک بہت بڑی رحمت ثابت ہوا اس کی وجہ سے مدرسہ صرف غیر صحت مند اثرات ہی سے محفوظ نہ رہا بلکہ بہت جلد ایک عوامی تحریک میں تبدیل ہو گیا اس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان مدرسہ سے وابستہ ہو گئے اور اسے دین و ثقافت کی حفاظت کے لئے انہیں ایک راستہ نظر آیا۔

(iv) اس سے نمایاں ادارہ کا ذاتی معاملہ اور توکل علی اللہ اور بے غرضی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے بے سروسامانی سے کام کرنا پسند کیا لیکن غلط ہاتھوں سے بڑی بڑی رقوم لینا پسند نہ کیا۔

(v) اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دیوبند کا مزاج سیدھا سادہ رہا۔ اور یہاں کا معیار معمولی اور عوام کے معیار زندگی سے قریب تر رہا۔ دوسرے مدرسوں میں غیر ضروری مدات پر بڑی رقوم خرچ ہو جاتی ہیں مدرسہ دولت کے اس ضیاع سے بچا رہا اور وسائل زیادہ سے زیادہ فروغ تعلیم ہی پر خرچ ہوتے۔

(د) اس ادارہ کی ایک اور اہم خصوصیت اس کا نظام مشاورت ہے ماضی میں ہندوستان میں جو دینی مدارس تھے ان میں بالعموم سارا انتظام ایک فرد یا ایک خاندان کا ہوتا تھا لیکن دیوبند اس معنی میں منفرد ادارہ کا بانی ہے کہ سارے انتظامی امور کو ایک مجلس شوریٰ کے سپرد کیا گیا اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ایک مہتمم مقرر کیا گیا جس کے لئے ضروری تھا کہ سارے امور شوریٰ کے فیصلے سے طے کرے اور آخری فیصلہ شوریٰ کا فیصلہ ہو اس طرح اسلام کی جو اصلی جمہوری و شورائی روح تھی اسے یہاں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔

(ہ) دیوبند کی حیثیت صرف ایک مدرسہ کی نہیں بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی ایک کوشش تھی دیوبند کا یہ رول بعد کی تاریخ میں بہت نمایاں ہو کر ابھرا خصوصیت سے مولانا محمود الحسن صاحب مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی سرگرمیوں کے ذریعے۔ یہ ادارہ بعد میں انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز رہا یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اور اساتذہ نے ثمرۃ التربیۃ اور جمعیۃ الانصار کے نام سے انقلابی تحریکات شروع کیں جن کا مقصد انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور دوسری مسلمان حکومتوں سے آزادی ہند کے لئے مدد حاصل کرنا تھا۔ ریشمی رومال کی تحریک جو انقلابیوں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ بعد میں ترک کی مدد، تحریک خلافت، عدم تعاون کی تحریک، ترک موالات کی تحریک اور بالآخر کانگریس کی جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان تک دیوبند کے کارکن افراد بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ یہ ضرور ایک سانحہ ہے کہ ہندوستان کے اس عظیم دینی مرکز نے انگریزوں کی مخالفت میں ایک مدت تک متحدہ قومیت کے تصور کی تائید کی اور آج تک بھی وہ اسی فکر و نظریہ پر قائم ہے لیکن یہ آزادی کی تحریک میں سرگرم رہا۔ جدوجہد کا سہرا اس کے اساتذہ اور طلبہ کے سر ہے۔

[illegible]

اصول سب جگہ کارفرما نظر آتا ہے اور جدید تعلیم کی طرح طبی منتشر گرگی نظر نہیں آتی۔ جدید نظام طالب علم کو بیک وقت مختلف سمتوں میں لے جاتا ہے جس کے نتیجے میں طالب علم کی شخصیت تضاد اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ دیوبند کی تعلیم دنیاوی سہی، لیکن اس میں یک رنگی باقی رہتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص رنگ میں طالب علم کو رنگ دیتی ہے۔

(ح) چونکہ شروع ہی سے مقصد تعلیم کے ساتھ دینی اسلام اور مسلم ثقافت کا تحفظ تھا اس لئے دیوبند اصلاحی تحریک کا مرکز بھی رہا۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے جو جدوجہد غلط رسومات و بدعات کے خلاف شروع کی تھی وہ دیوبند میں جاری رہی اسی طرح نکاح بیوگان اور عورت کے حق وراثت کے بارے میں دیوبند نے سب اصلاحی کام سرانجام دیا۔ دینی امور میں لوگوں کی رہنمائی کے لئے دارالافتاء قائم کیا جس نے ملک اور بیرون ملک مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ دیوبند کے اساتذہ نے عیسائی مشنریوں اور ہندو آریہ سماجیوں کے اعتراضات کا جواب بھی دیا اور اس سلسلہ میں بہت وقیع لٹریچر تیار کیا جس کا اسلوب سادہ تھا۔ گرد و پیش کے مواد کی تلاش اور فراہمی میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا گیا۔ قرآن مجید کے پیغام کو عام کرنے کے لئے مولانا محمود الحسن صاحب نے اردو ترجمہ کیا جو قرآن کے مقبول تراجم میں سے ایک ہے۔ دیوبند کے ایک اور فرزند مولانا عبدالحق دہلوی نے تفسیر حقانی لکھی جس نے اسے دور کے کلامی مباحث کو بڑی خوبی سے سمیٹ لیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم نے علمی خدمات انجام دیں۔ اس طرح دیوبند نے اپنے دور میں علوم دینی کی خدمت کی روایت کو قائم رکھا۔ علماء کی اس لٹریچر نے خود اردو کی ترویج میں بھی بڑا حصہ لیا اور خصوصاً دینی بیس عوام میں اردو کی مقبولیت کا باعث ہوا۔

(ط) دیوبند کے نظام تعلیم میں اصولی طور پر صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت اور اصلاح باطن کا بھی اہتمام پیش نظر تھا اور یہاں کا نظام علم و تقویٰ کے امتزاج کی اس روایت کو زندہ رکھنا چاہتا تھا جو مسلمانوں نے اپنی ۱۲ سو سالہ تاریخ میں قائم کی۔ استاد اور شاگرد کا گہرا ذاتی ربط بھی اس کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک رہا ہے۔

(ی) دیوبند کے نظام تعلیم میں طلبہ کے تقریری اور تحریری مقابلے اسباق کارناموں پر انعامات اور طلبہ کی علیحدہ تنظیم جمعیۃ الطلباء بھی شامل تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی تربیت اور اجتماعی زندگی کے لئے تیاری ملحوظ تھی۔

دارالعلوم دیوبند ایک مدرسہ کی حیثیت سے ابھرا اور بہت جلد ایک تحریک کی حیثیت سے پھیلا۔ جلد ہی اسی اصول پر دوسرے مدارس قائم ہو گئے اور ان میں مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ امینیہ دہلی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انہی اصولوں پر چھوٹے چھوٹے مدارس ملک کے گوشے گوشے میں قائم ہوتے اور جہاں جہاں فرزندان دیوبند پہنچے وہ تعلیمی سلسلے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس دارالعلوم میں صرف ہندوپاکستان ہی کے نہیں بلکہ دیگر مسلم ممالک کے طلبہ بھی دینی تعلیم کے لئے آتے تھے۔ دیوبند کے فاضل علماء کیا اور لوگ ڈاسے لے کر سمندر اور عربی تک پھیلے ہوتے تھے۔ اس طرح یہ نظام صرف ایک ملک کا نظام نہ تھا بلکہ اسے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ سید رشید رضا ہندوستان آئے تو انہوں نے دیوبند کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو دیکھے بغیر ہندوستان سے واپس چلا جاتا تو میرا یہ تاثر ہوتا کہ ہندوستان میں علوم دینی ختم ہو رہے ہیں۔ دیوبند ہماری گذشتہ سو سالہ تاریخ میں روشنی کا ایک مینار رہا ہے اور اس نے ملک کی علمی ثقافتی اور سیاسی زندگی میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوموں کی تاریخ کو بنانے والے اداروں کا انحصار بلند و بالا عمارات اور ساز و سامان کی فراوانی پر نہیں، اخلاص نیت، پیہم توکل علی اللہ اور اعانت مسلمین پر ہے۔ یہ تو ہے دیوبند کا تاریخی کردار، لیکن ناانصافی ہوگی اگر ہم اسے اس جائزہ میں تصویر کے دوسرے رخ پر نگاہ نہ ڈالیں ہم دیوبند کی عظمت و خدمات کے دل سے معترف ہیں لیکن

جو گذر ہمد سے نظر آ سا گہ بھی بس ہے

(۱) دیوبند نے جو نصاب تعلیم رائج کیا وہ نئے دور کی ضرورتوں کو کما حقہٗ پورا نہ کر سکا۔ دراصل ۲، ۳ صدیوں سے دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا وہ جو کئی حیثیتوں سے خام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلامی نقطہ نظر سے مزید بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی لیکن دیوبند نے صرف یہ کیا کہ پرانے نصاب کو جوں کا توں لے لیا، بلکہ شروع میں قرآن و حدیث کو دینی روایت کے تحت جو مرکزی حیثیت حاصل تھی بعد میں وہ بھی اس حد تک نہ رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک لٹی ہوئی قوم کے باقی حصہ کو بچا لینے کا جذبہ اتنا غالب تھا کہ نئے تقاضوں اور نئی ابھرتی ہوئی علمی زندگی کو از سر نو آراستہ کرنے کی فکر نہ ہوئی جس طرح طوفان کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جانے والی کشتی کے ملاح ٹوٹتے ہوئے تختوں سے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح دم توڑتے ہوئے پرانے نظام تعلیم کے چند اجزاء کو سینے سے لگا لیا گیا اور بس اسی میں نجات سمجھی گئی۔ اس نصاب تعلیم میں نہ تو پورے قرآن پاک کا مطالعہ اور نہ ہی حدیث کے مطالعہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ صرف و نحو پر اتنی اہمیت ہے کہ ایک صاحب نظر مورخ کے قول پر اسے نظام تعلیم میں دینی تعلیم کا سارا زور صرف و نحو کے چند متون پر تھا اور صنائع و بدائع کے گورکھ دھندوں میں دفن ہو گیا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کی تعلیم کو اس میں کوئی اہم مقام حاصل تھا۔ عربی گرامر پر تو اس قدر اہمیت ہے لیکن عربی زبان و ادب کا کوئی ذوق نہیں پیدا کیا جاتا۔ منطق اور کلام کی پرانی اور فرسودہ کتابیں تعلیم کا جزو ہیں اور اسلام کو جو نئے فکری اور دینی چیلنج درپیش ہیں ان کی ہوا بھی اس نظام تعلیم میں نہیں لگی۔ فقہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے لیکن یہاں بھی تنگ نظری اور جمود و تقلید کا غلبہ ہے اور احکام کی ان بنیادوں اور اصولوں سے جو قرآن و حدیث میں ہیں طلبہ کو روشناس کرانے کی کوئی فکر نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تعلیم کا محور علوم دینیہ نہیں چند مخصوص کتابیں ہیں جن کی تکمیل کو تعلیم کی معراج سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر ان کتابوں کو سمجھداری سے پڑھا جائے تو آئندہ ان علوم کی معرفت کے دروازے کھل سکتے ہیں لیکن اس کی نوبت خال خال ہی آتی ہے۔ طالب علم کا ذہن کتاب کے الفاظ سے آگے نہیں بڑھ پاتا اور اس کی کوشش یہی ہے کہ اس کو رٹ لے یہ ذہن

کی علمی صلاحیتوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی تعلیم زنگ آلود ذہن تیار کر رہی ہے اور اس صیقل کا دور دور تک پتہ نہیں جو اس زنگ کو دور کر سکے۔

(الف) مولانا قاسم نانوتویؒ نے اپنی ایک تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ دیوبند کی تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبہ جدید تعلیم بھی حاصل کریں اور اس طرح علوم عاصرہ سے واقفیت ہو اور وقت کی ضرورت پوری ہو سکے۔ دیوبند کے مداحین اس بات کو بار بار پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیمی تحریک میں دور حاضر کے تقاضوں کا پورا احساس موجود تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مولانا مرحوم کے اس ارشاد کا کوئی اثر دیوبند نے قبول نہ کیا اور نہ کوشش کی گئی کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کو علوم جدیدہ سے آراستہ کر کے علمی جامعیت پیدا کی جاتی۔ اس ارشاد گرامی کی حیثیت ایک مقدس خواہش سے زیادہ اور جو آپ بھی ایسی جس کا آنے والوں نے احترام نہ کیا۔ یہی نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ دیوبند میں انگریزی کی تعلیم تک کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی گئی تاکہ کم از کم دنیا کی طرف کچھ کھڑکیاں تو کھلیں۔ اس میدان میں دیوبند کی ناکامی اس کے انقلابی مشن کو مجروح کرنے کا باعث بنی ورنہ کیا بعید تھا کہ دیوبند موجودہ صدی کی اصلاحی نشاۃ ثانیہ کا حقیقی مرکز بن جاتا۔

(ج) اصولی حیثیت سے تو تعلیم و تربیت کو مساوی اہمیت دی گئی لیکن عملاً تربیت کا پہلو کمزور رہا اور طلبہ میں ایک ظاہر پرستی پیدا ہوئی۔ یہ چیز نصاب تعلیم کے غیر فطری ہونے کا فطری تقاضا تھا، لیکن دوسرے مسائل سے اس کی کو بڑی حد تک دور کیا جا سکتا تھا، جو نہ کیا گیا اور اس کا سب سے نقصان دہ نتیجہ نکلا کہ دیوبند سے وہ انقلابی روح کمزور پڑ گئی جو ابتداً اس ادارہ کے پیش نظر بھی اور جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(د) ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ متحدہ قومیت کے لئے دیوبند کا ایک مورچہ بن جانا ایک تاریخی المیہ ہے اور ہم جیسے طلبا تاریخ کے لئے یہ ایک معمہ ہے۔ شکر ہے کہ اس فکر کا توڑ دیوبند ہی سے ہوا اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبان نے اسلامی قومیت کے تصور کو دلائل کی قوت اور ایمان کی حرارت کے ساتھ پیش کیا اور مسلمانان ہند کی صحیح اور بروقت رہنمائی کی۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود دیوبند کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی علوم اور روایات کو طوفان کے تھپیڑوں میں پڑنے سے نکالا اور آج بھی دینی مدارس کی شکل میں یہ عظیم خدمت جاری ہے۔ دیوبند کے نظام نے اپنی حد تک امت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے اور انگریز حکمرانوں اور مغربی تہذیب کے معاملے میں مفاہمت و مصالحت کے بجائے مقاومت اور ٹکراؤ کا علم بلند کیا ہے۔ اس وقت جب کہ انگریزوں کی کاسہ لیسی میں نجات کی راہ تلاش کی جا رہی تھی دیوبند نے معمولی وسائل کے ساتھ ایک آزاد محاذ کھولا اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے ایک حد تک بچایا جس کی رو میں وہ آ رہے تھے۔ دیوبند کا یہ کارنامہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بنا پر وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

---

## (ب) علی گڑھ

دیوبند کی تعلیمی تحریک مقاطعہ اور مقاومت کے رجحان کی نمائندہ ہے اس کے بالمقابل علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مصالحت و مفاہمت کی مظہر ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز ان کے پرانے تعلیمی نظام کو مٹانے کے در پے ہیں۔ دوسری طرف مشنری تعلیمی ادارے بڑی سرعت کے ساتھ تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں اور سرکار چڑھی ہوئی گولیوں کے ذریعے مسلمانوں کی دینی عقائد کو مجروح کر رہے ہیں جو نیا تعلیمی نظام لایا گیا تھا اور جسے سرعت کے ساتھ فروغ دیا جا رہا تھا وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی روح سے یکسر عاری تھا۔ اور ہندوستان کی نئی نسلوں کو لادینیت اور مغربیت کے رنگ میں رنگ رہا تھا۔ مگر یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اس نئی تعلیم سے ہندو بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسٹر ہیوم انگریزوں کا منظور نظر بن کر اسے ساڑھے سات سو سالہ دور غلامی کا حساب چکانا چاہ رہا ہے۔ اسی زمانہ میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکات ابھریں اور انہوں نے ہندوؤں میں جذبہ پیدا کیا کہ وہ بھی مسلمانوں پر ایک بالاتر قوم کی حیثیت سے غالب ہو سکتے ہیں۔ آریہ سماجی تحریک نے کھل کر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر حملے کئے اور ہندوستان کی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ہندوؤں نے شدھی کی تحریک چلائی۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم مخالف ملک سیاست کا بیج بو گیا اور یہ بات بڑی حد تک واضح ہو گئی کہ ان دونوں قوموں کو جدا گانہ طور پر اپنی سیاسی قسمت بنانا ہو گی۔ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی ظالمانہ اور منتقمانہ تھی وہ صرف ان کے نظام تعلیم ہی کو ختم نہ کر رہے تھے بلکہ پورے تہذیب و تمدن کو مٹا دینا چاہتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی حیثیت سے مسلمانوں کی کمر توڑ دیں۔ روزگار کے تمام دروازے مسلمانوں کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ ان کے پرانے نظام تعلیم کا ہر رشتہ معاشی اور انتظامی نظام سے منقطع کر دیا گیا تھا اور روزگار کی کنجیاں نئی تعلیم کو دے دی گئی تھیں۔ ان حالات میں ایک راستہ تو ان لوگوں نے نکالا جنہوں نے نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی اپنے ماضی کے نظام سے رشتہ کاٹنا گوارا نہ کیا۔ لیکن کچھ دوسرے حضرات نے صورت حال پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ مسلمان اپنے آپ کو انگریزوں سے لڑ کر نہیں بلکہ مل کر بچا سکتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ مسلمانوں کو ایک ساتھ دو دشمنوں سے نمٹنا ہے اس لئے یہ لڑائی بیک وقت نہیں لڑی جا سکتی، نیز ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے بعد مسلمانوں میں یہ دم خم بھی نہیں ہے کہ وہ اس وقت کی مادی طاقت کے بل بوتے پر طویل مدت تک کوئی لڑائی لڑ سکیں۔ بلکہ ان حالات میں لڑائی کے طرز پر سوچنا مسلمانوں کے لئے شدید خطرات کا حامل ہے۔ ان کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں سے وفاداری کا تعلق قائم کریں، انگریزی تعلیم حاصل کریں اور ملازمتوں میں اپنے لئے گنجائش پیدا کریں۔ ان حالات میں وہ اپنے کو بدلے بغیر جی نہیں سکتے۔

> چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اس نے رجحان کے سب سے بڑے علمبردار سر سید احمد خاں تھے۔ سر سید کا تعلق بالائی متوسط طبقہ سے تھا انہوں نے اپنی ساری عمر برطانیہ کی ملازمت میں گذار دی۔

لیکن اس زمانہ میں بھی وہ مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے رہے لیکن ان کے نقطہ نظر کو خواہ وہ کتنے ہی دبے الفاظ اور خوشامدانہ انداز میں کیوں نہ پیش کرتے ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" نے خاص نام پیدا کیا اور دوسری کتاب "وفادار ہندوستانی" زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ سیاسی حیثیت سے سرسید اس بات کے قائل تھے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کامل وفاداری کی روش اختیار کرنا چاہئے اور جہاد و مقاطعہ کا ہر تصور ختم کر دینا چاہئے۔ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار صرف نئی تعلیم ہی میں نہیں، نئی تہذیب کے قبول کرنے میں مضمر پاتے تھے اور اس سے بڑھ کر ان دونوں کاموں کو انجام دینے کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ معاشرتی اور مذہبی معاملوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں کہ مذہب کی انہوں نے ایک نئی تفسیر کی داغ بیل ڈالی جو اسلام میں ایک نو معتزلی تحریک کے مترادف تھی اور اس میں انہوں نے کوشش کی کہ اسلام کی ان تمام تعلیمات کو جو مغربی تہذیب سے متصادم تھیں، تاویل کی مدد سے بدل کر ان سے ہم آہنگ کر دیں اور معاشرے میں بھی مسلمان مغربی طور طریقوں کو اس درجہ اختیار کریں کہ انگریزوں کے ساتھ اس کے طریقے پر زندگی گزار سکیں۔ ان کے ذہن کا اندازہ ان کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے جو ان کی متعدد تحریروں میں سے ایک ہے۔

"ترکوں کا عام لباس مع ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے، میز کرسی پر بیٹھتے ہیں، چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ ان کے مکان کی آراستگی و طرز بالکل یورپینوں جیسا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو کم کوئی معلوم ہوتے ہیں امید ہے روز بروز درست ہوتے جائیں گے بس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ ہم اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور درستی و شائستگی میں قدم بڑھائیں"۔ ۹

اور یہ اس درستی اور شائستگی کی طرف پیش قدمی تھی کہ عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے اور داڑھی منڈانے کا جواز فراہم کیا حتیٰ کہ بائبل کو غیر محرف ثابت کرنے کی کوشش کی۔

ہمارے پیش نظر یہاں سرسید کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا نہیں، ہم یہاں یہ باتیں صرف اس لئے بیان کر رہے ہیں کہ وہ ذہن سامنے آسکے جو اس نئی تحریک کی پشت پر کام کر رہا تھا۔

تعلیم سے سرسید کی دلچسپی دیرینہ تھی۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں غازی آباد میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی پھر اسی طرح بنارس میں انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی ایک جگہ مرکز بنا کر مسلمانوں کی تعلیم کا ایک بڑا ادارہ قائم کریں اور اس کے لئے انہوں نے بالآخر علی گڑھ کو منتخب کیا جہاں حکومت نے برائے کنٹونمنٹ ایریا میں ایک زمین بلا قیمت دی جہاں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ قائم کیا گیا۔

سرسید نے انگریزوں کے تعلیمی نظام کو قبول تو ضرور کیا لیکن نظری طور پر اس کی چند خامیاں بھی بیان کیں جن میں قابل ذکر یہ ہیں

(الف) یہ مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔
(ب) ناظم تعلیمات کی گرفت بہت سخت اور اس کا طریقہ آمرانہ ہے۔
(ج) تعلیم کا نظام ہندوستانیوں کے لئے مشکل ہے۔
(د) تعلیمی کتب میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلام کے خلاف ہے[1]۔

یہ تھی سرسید کی تنقید انگریزوں کے نظام تعلیم پر۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ خود سرسید نے علی گڑھ میں جس نظام کا آغاز کیا اس کی کیا خصوصیات تھیں۔

(۱) علی گڑھ انگریزوں کے تعلیمی نظام اور اس کی ہیئت کو قبول کر کے اس کے اندر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش ہے یہاں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق نیا نظام بنایا جائے بلکہ یہ سمجھا گیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام میں مسلمانوں کے لئے پاؤں رکھنے کی جگہ فراہم کر لی جائے۔ یہ چیز علی گڑھ کے مزاج کا ایک جزو بن گئی اور علی گڑھ نے جو سانچہ بنایا وہ تبع اور مصالحت کے انہی رجحانات کا آئینہ دار ہے اس میں ایک طرف مغربی تعلیم کو من و عن لے لیا گیا اور اس تعلیم کے مزاج کو بھی نئے سانچوں میں نہ ڈھالا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں مسلمانیت کا اضافہ کرنے کے لئے دینیات کا ایک پیریڈ رکھا گیا اور ہوسٹل میں نماز، روزے اور دوسرے شعائر اسلامی کے لئے سہولتیں دی گئیں۔ متصادم عناصر کے اس اجتماع کو خود اس ادارہ کا اولین نام بالکل صحیح طور پر پیش کرتا ہے یعنی اینگلو محمڈن اورینٹل کالج

(۲) یہ کالج رہائشی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور اس حیثیت سے اس کا ایک ہوا کیرکٹر یک مخصوص مزاج بن سکا

(۳) یہ تعلیمی ادارہ مسلمانوں میں عام تعلیم UNIVESAL EDUCATION پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ متمول طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا تعلیم کے لئے فیس کا طریقہ رائج کیا گیا اور رہائشی ہونے کی وجہ سے صرف وہی لوگ اپنے بچوں کو بھیج سکتے تھے جو مصارف تعلیم کا گراں بار اٹھا سکتے تھے گویا (FILTERATION THEORY کا یہ MUSLIM VERSION تھا۔ اس حیثیت سے مسلمانوں کے اب تک کے نظام تعلیم سے ایک نمایاں انحراف بھی تھا۔

(۴) اس ادارہ میں اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ رکھے جائیں جس کا اصل مقصد تو شاید انگریزوں کو اپنی وفاداری اور حسن نیت ...

---

[1] اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ انگریزوں کے نظام تعلیم پر تو سرسید مرحوم کو یہ اعتراض ہے کہ کتب میں اسلام کے خلاف مواد ہے لیکن خود انہوں نے سب سے پہلے جس کتاب کو ترجمہ کے لئے منتخب کیا، اور ان کی سوسائٹی نے اسے شائع کیا وہ ایلفنسٹن کی تاریخ ہند تھی اور اصل کتاب میں دشمن اسلام مصنف نے جہاں حضور کے بارے میں العیاذ باللہ "پیغمبر باطل" کا لفظ لکھا تھا سرسید نے بھی بلا کم و کاست لفظ اسی طرح ترجمہ کر دیا۔

کا موقع دیا تھا لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اساتذہ کی گرفت کالج پر مضبوط تر ہوتی گئی اور مغربیت کی رو طلبہ میں تیزی سے سرایت کرتی چلی گئی۔ سرسید کی بڑی خواہش تھی کہ اس ادارہ کو ایک یونیورسٹی بنائیں لیکن اپنی زندگی میں وہ یہ کام نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے وقت کالج مالی بحران سے دوچار تھا ۵ ہزار کا قرض تھا۔ طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور یہ کشتی ہچکولے کھاتی نظر آتی تھی لیکن محسن الملک، نواب مہدی علی خاں نے ادارہ کو بڑی خوش اسلوبی اور جانفشانیوں سے چلایا اور اس میں دوبارہ زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اس کے بعد نواب وقار الملک نے باگ ڈور سنبھالی اور بالآخر ۱۹۲۱ء میں کالج مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔ علی گڑھ کی داستان میں برصغیر کے مسلمانوں کی ۹۰ سالہ تاریخ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس ایک ادارہ نے جو کچھ کیا اسے بلا مبالغہ انقلابی کہا جا سکتا ہے۔

یہ ادارہ ایک تعلیمی تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اور اس کے برابر اسی خطوط پر مسلمانوں کے تعلیمی ادارے قائم ہوتے گئے۔ علی گڑھ نے ادبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی میدانوں پر نہایت اہم اثرات ڈالے۔ ہم اب علی گڑھ کے تاریخی رول کا اجمالی لیکن تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اگر مسلمانوں کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے نہیں، بلکہ محض ایک قوم کی حیثیت سے لیا جائے تو علی گڑھ ان کے عہد زوال کا سب سے بڑا محسن ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس ہاری ہوئی فوج کی مانند سمجھا جس کے لئے سب سے صحیح حکمت عملی محض اس کو بچا لینا ہے جو اس کو بچانے میں عزت و عصبیت کی کتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اس حیثیت سے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے تعلقات انگریزوں سے استوار کرائے۔ بے اعتمادی کی فضا دور کی، انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کیں۔ کچھ سیاسی رسوخ دیا، کچھ ہم مسلمانوں کے حق میں کئے، ان میں تعلیم کی جوت ڈالی اور اس طرح جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے کم از کم تھوڑی دور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔

(۲) معاشی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے حصول اور روزگار کے دوسرے مواقع کے حصول میں علی گڑھ کا بڑا حصہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی کے دروازے بالکل بند ہو چکے تھے وہ اس نئی تعلیم کی وجہ سے پھر ایک حد تک کھل گئے اور اس نے مسلمانوں کو دوبارہ قدم جمانے کا موقع دیا۔

(۳) علی گڑھ ایک نئی ادبی تحریک کا بانی ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت آسان اور عام فہم اسلوب بیان ہے۔ اردو ادب کا نیا آہنگ بڑی حد تک علی گڑھ کا مرہون منت ہے۔ اور یہ اس کی عظیم ترین خدمات میں سے ایک ہے۔

(۴) علی گڑھ نے موجودہ صدی میں اور خصوصاً پہلی جنگ کے بعد ایک سیاسی کردار بھی ادا کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ علی گڑھ اس کے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کی خواہشات کے علی الرغم مسلمانوں کی نئی سیاسی بیداری کا مرکز بن گیا اور اس کا سب سے دلچسپ اور تاریخی پہلو یہ ہے کہ آخری دور میں مسلم قومیت اور دو قومی نظریہ کی تحریک کا گہوارہ علی گڑھ بنا۔ اس طرح جو ادارہ انگریزوں سے قرب و مفاہمت کے جذبے سے قائم ہوا تھا، وہی انگریزوں کے اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔

(۵) مسلمانوں کی گزشتہ ۵۰ سال کی نئی قیادت بڑی حد تک علی گڑھ نے فراہم کی۔

یہ ہیں وہ چیزیں جو علی گڑھ کے تاریخی کارنامے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اب ہم تصویر کے دوسرے رخ پر نگاہ ڈالیں گے

(الف) علی گڑھ کے نام اور اس کے اثر سے تعلیمی فکر کے مقابلے میں تقلیدی فکر نمایاں نظر آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے دین اور ان کی مخصوص ثقافت کی روشنی میں کوئی تعلیمی لائحہ عمل تیار کیا جاتا، ہندوؤں سے مسابقت کے جذبہ کے تحت ایک ایسی آسان اور پٹی ہوئی راہ اختیار کی گئی جس کا نہ کوئی تعلق مسلمانوں کی علمی روایت سے تھا اور نہ وہ ان کی تاریخ کے مخصوص تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ علی گڑھ نے انگریزی تعلیم ہی کے نہیں، مغربی تہذیب و تمدن کے دروازے بھی چوپٹ کھول دئے اور مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے شدید ترین ذہنی اور تمدنی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اکبر کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا۔

ابتدا کی جناب سید نے — جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی — قوم کا کام اب تمام ہوا

(ب) علی گڑھ نے دو متضاد عناصر کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی یعنی مغربی تہذیب اور اسلام۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مغربی تہذیب ہی مسلمانوں کو حاصل ہوئی اور نہ اسلام ہی پورے طور پر ان کو حاصل ہوا اور قوم میں وہ سب سے بڑا روگ پیدا ہوا جسے ہم تضاد اور منافقت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ بیک وقت دو متضاد سمتوں میں جانے والی کشتیوں میں سواری کرنے کے مترادف تھا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔[1]

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم — نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

(ج) علی گڑھ نے دینیات کے ایک سبجیکٹ کو اسلامی تعلیم کے مترادف قرار دے کر اسلامی تصور تعلیم کو ختم کر دیا۔ پھر تعلیم کو ایک تجارت بنا کر مسلمانوں کی تمام روایات کو مجروح کیا۔ نیز تعلیم کو اعلیٰ طبقہ تک محدود کر کے مسلمانوں کے اس مخصوص کارنامے کو بھی ملیامیٹ کیا جو تعلیم کے باب میں ان کا بے نظیر کارنامہ تھا یعنی عام تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) اس طرح علی گڑھ سے تو ایک تصور یا نئی روایت ابھری وہ مسلمانوں کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ یہ روایت مسلمانوں پر مسلط ہو گئی لیکن مسلمانوں کے مزاج نے آج تک اُسے قبول نہیں کیا ہے اور اسی نے اس کش مکش کو جنم دیا ہے جو آج ہمارے نظام تعلیم کی روح کو کھائے

---

[1] موج کوثر صفحہ ۲۴۳

(۵) علی گڑھ نے بظاہر تو اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا لیکن دراصل اپنی روح اور اپنے پروگرام کے اعتبار سے مادیت اور دنیا پرستی کو اس نے اپنا اصل مقصود ضرور بنایا۔ تعلیم کا پورا نظام اس طرح تشکیل پایا کہ طالب علم اسلام کے مزاج اور زندگی کی اصل قدروں سے کم سر بیگانہ ہو گئے اور ان کا واحد نصب العین دنیا کا حصول معاشی مسابقت میں اپنے لئے ایک مقام کی تلاش اور زیادہ صاف الفاظ میں سرکاری ملازمت ہو گیا۔ علی گڑھ کے اس مزاج کا اظہار اس تقریر میں بھی ہوتا ہے جو سید محمود نے ندوہ میں کی تھی۔ جس میں کہا تھا

"ہمارے دو کام ہیں۔ دین و دنیا۔ ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور ندوہ دین کا کام دے رہا ہے اس لئے ہمیں اس کے مقصد سے پورا اتفاق ہے"

درحقیقت یہ کہنا بھی یہ خیال بھی ہے کہ اسلام دین و دنیا کی ایسی ثنویت کا قائل نہیں ہے جس میں ایک گروہ دین کا اجارہ لے لے اور دوسرا دنیا کا۔ اسلام تو دونوں کے ایسے امتزاج کا قائل ہے کہ

"تا کس نہ گوید بعد از ایں من دیگرم تو دیگری"

(۶) علی گڑھ کا ایک بڑا ہی اہم پہلو سرکاری ملازمت کو جتنا بڑا مقصود بنایا ہے۔ یہ حسرت ہے کہ دور ساتھ کی حاصل ہوتی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ تجارت، زراعت اور حرفت کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح ایک آزاد معاشی پوزیشن ان کو حاصل رہی۔ ہندوستان کے نئے حالات میں مسلمانوں کے معاشی استحکام کے لئے ان ہی راہوں پر اس کی بڑی ضرورت تھی، لیکن علی گڑھ نے مسلمانوں کی تمام توجہات کو سرکاری ملازمت پر مرکوز کر دیا گویا سکالے کے دل کی آرزو بر آئی۔ انگریز یہ چاہتا تھا کہ مسلمان معاش کے آزاد ذرائع سے کٹ کر ان کی ملازمتوں کا محتاج ہو جائے اور علی گڑھ نے مسلمانوں میں یہی ذہن پیدا کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مسلمان کلرکی کے پیچھے اور ان کا ذہین ترین عنصر ڈپٹی کلکٹری کے پیچھے مارا مارا پھر رہا تھا اور اس سے اونچا کوئی مقام ان کے تصور میں نہ آتا تھا۔ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اس کا تجربہ خود سر سید مرحوم کو بھی ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے صاحبزادے قوم کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں، لیکن صاحبزادے کی نظریں سرکار کی ملازمت پر تھیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کی معاشی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے اور ملک میں بعد میں جو بھی معاشی ترقی ہوئی وہ بڑی حد تک ہندوؤں کے ہاتھوں ہوئی۔

(۷) ہم یہ بات بھی بڑے افسوس سے کہتے ہیں کہ علی گڑھ نے جو علمی معیار قائم کیا وہ بھی سطحی اور پست تھا چند استثنائی ناموں کو چھوڑ کر باقی تقریباً یہی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ڈگریاں دے دی جائیں جو کام کیسے ہی خلوص سے کیا گیا ہو اور جو اس کے پیچھے مسلمانوں کی ہمدردی کا کیسا ہی جذبہ کیوں نہ کار فرما ہو اس کا نتیجہ علم کی موت تھا۔ شروع میں سر سید مرحوم کے ذہن میں ضرور تھا کہ علی گڑھ ایک علمی مرکز بنے اور انہوں نے اپنے طور پر یہ کام انجام بھی دیا لیکن جو کہ دینی علوم پر خود ان کی نگاہ زیادہ گہری نہ تھی۔ اس لئے خود انہوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور جس نئے علم الکلام کا انہوں نے آغاز کیا اس نے مغرب کی قدروں کو اسلام میں تلاش کرنے اور مغربی افکار کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کرنے کی آسان راہ کھول دی۔ تحقیق اور فکر و کاوش کی راہ ضرور بند نہ ہوئی مگر جو کچھ علمی معیار سر سید نے قائم رکھا تھا علی گڑھ کی آئندہ نسلوں نے اس کو بھی قائم نہ رکھا، یہ ایک مبالغہ نہیں کہ تقسیم ملک تک علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ نے کوئی ایک بھی درجہ اول کی علمی اور تحقیقی کتاب پیش نہیں کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی خود نوشت "آشفتہ بیانی میری" میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن بڑی جستجو کے بعد علی گڑھ کے لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی جو فہرست وہ پیش کر سکے ہیں اس میں علی گڑھ کے اپنے مایہ ناز افراد کی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس کا علمی سکہ مانا جاتا ہو۔ ادب اور اسلوب بیان کے میدان میں تو علی گڑھ کا قابل قدر کارنامہ ضرور موجود ہے لیکن علم و تحقیق کا صفحہ سادہ ہے۔ اس کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں تحقیق کی روایات باقی نہ رہ سکیں بلکہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر تعلیم پانے والوں پر اس کا عام اثر ان کی ذہنی سطح پست ہونے کی صورت میں رونما ہوا۔ <u>صحافیانہ علم کو علم کی معراج سمجھا جانے لگا اور کتابی سطریں پڑھ کر علمی مباحثوں میں اظہار رائے کا چلن ہو گیا۔ مسلمانوں میں سہل انگاری پیدا ہوتی اور کامیابی کے لئے سفارش کا عام ہو گیا جس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وقت کی قدر و قیمت کا احساس کمزور سے کمزور تر ہونے لگا اور تعلیمی زندگی کا رنگ بھی بدل گیا اور بقول شیخ محمد اکرام</u>

"اساتذہ کا وقت عزیز ڈرامے، گنگ، رزم کی ترتیب، جوش معاشی، ضیافت بازی، کلب بازی، اگ بازی، اور پارٹی بازی کی نذر ہونے لگا"

الغرض سب کچھ اس سلیدی رجحان کا فطری نتیجہ تھا جو علی گڑھ نے اختیار کیا تھا۔ اور جس نے تعلیم جہاں تک تخلیقی صلاحیت کے سرچشموں کو خشک کر دی ہے اور فکر و نظر پر آکاس بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔

(۸) علی گڑھ کی پوری تاریخ اور اس کے سارے کردہ ذہن کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علی گڑھ ایثار و قربانی کی کوئی اونچی مثال قائم نہ کر سکا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ علی گڑھ کے لوگوں میں علی گڑھ سے محبت پائی جاتی ہے اور دوسروں کے مقابلے میں علی گڑھ برادری کا خاصا گہرا احساس ان میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں اساتذہ اور طلبہ دونوں جانب سے علم کی بارگاہ میں خلوص و ایثار اور قربانی کی جو مثالیں کی جاتی رہی ہے اس کی نظیریں علی گڑھ میں بس خال خال ہی ملتی ہیں۔ اس کی وجہ اصلی مقاصد سے تعلیم کو کاٹ دینا اور سب سے بڑھ کر تعلیم اور کردار سازی کے رشتہ کو منقطع کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لمبا دور علی گڑھ پر اسی ذہنی بزدلی کا گذرا ہے اور ملک کی قومی زندگی میں علی گڑھ کے لوگوں نے شرکت کرنے اور مسلمانوں کی قسمت اور سرنوشت کرانے سے احتراز کیا بلکہ اسی افسوس ناک مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جب محسن الملک نے اردو تحریک کے سلسلہ میں حکومت کے

بدعت کے خلاف ایک بڑی دور تک نظر آتی اور علی گڑھ کے لئے سرکاری امداد حاصل کرنے میں ترقی نظر آتی تو سید محمود صاحب نواب محسن الملک پر ڈالا جانے لگا اور سید محمود صاحب نے
سر انتونی میکڈانلڈ کو ایک خط لکھا جس میں یہ تک لکھ ڈالا کہ

"کالج کے اصلی خیر خواہوں کے لیے یہ امر سخت رنج و افسوس کا باعث ہوگا کہ میرے والد سر سید مرحوم کی وفات کے بعد بہت جلد کالج کے معاملات کی
دوست محسن کو نواب مشتاق حسین کی مسلسل کوششوں سے مضبوط رکھنے کے واسطے انہوں نے ساری عمر کوشش کی تھی کیونکہ وہ خالص خیراتی اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن تھا۔
ادنیٰ پارٹی پالیٹکس تک پہنچ گئی"

یہی وہ ذہن تھا کہ جس کی وجہ سے جب علی جوہر جیسے علی گڑھ کے سپوت کو خود اربابِ علی گڑھ کے مدمقابل کھڑا ہونا پڑا۔ مولانا محمد علی ہی کے سلسلے کی ایک اور مثال
میں علی گڑھ کی سرکار پرستی کی ذہنیت بالکل بے نقاب نظر آتی ہے۔ انگلستان سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا محمد علی نے اسے کو عام سا بنا دیا۔ پر علی گڑھ میں
مدرس کے لئے پیش کیا لیکن چونکہ محمد علی کو حکومت ناپسند کرتی تھی اس لئے انہیں جگہ نہ دیا گیا جس کا اعتراف خود محسن الملک نے ان الفاظ میں کیا کہ "لیکن وہ ذہنیت
جسے انگلش اسٹاف اس درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا، محمد علی میں موجود نہ تھی اس لئے مارلیس صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوئی

(موج کوثر صفحہ ۱۴۵-۱۴۶)

یہ ایک منفرد واقعہ نہیں، اس دور کے علی گڑھ کے ذہن کا عکاس ہے

(ج) کچھ عرصہ بعد تو علی گڑھ کے تعلیمی مزاج کی بحث اور بھی اور کا اضافہ یورپین اسٹاف کی موجودگی نے کر دیا۔ سر سید مرحوم کا اصرار تھا کہ یورپین اسٹاف ضرور رکھا جائے
اس پر دوسرے صاحبِ نظر ٹرسٹیوں نے اعتراض بھی کیا لیکن ان کی ایک نہ چلی اور اس جبر کا اثر یہ ہوا کہ علی گڑھ کی معاشرت پر برابر مغرب کا رنگ غالب آ گیا

(ط) ایک اور قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ جب استثنائی ادوار کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی علی گڑھ اسلام کے بین الاقوامی رنگ سے محروم رہا۔ ہندوستانی مسلمان ہمیشہ ہی سے اسلامی
عالمگیریت کے علمبردار رہے ہیں اور یہ چنگاری علی گڑھ کے نوجوان طلبہ کے سینوں میں موجود رہی ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں علی گڑھ کی زمامِ کار تھی انہوں نے
ترکوں کے علاوہ اسلامی بین الاقوامیت کے کسی جذبے کو پروان نہ چڑھایا لیکن چونکہ یہ احساس مسلمان کے رگ و پے میں موجود ہے اس لئے سعودی کوشش
کے باوجود اس جذبہ کو ختم نہ کیا جا سکا۔

یہ ہیں وہ اہم پہلو جن کی بنا پر علی گڑھ کی تعلیمی تحریک اسلامی قومی اور ملی نقطۂ نظر سے ایک کامیاب تحریک نہ رہی۔ اس کے نتائج بحیثیت مجموعی مایوس کن رہے اس
نے جو خدمات انجام دیں ہم اس کے منکر نہیں، لیکن ایک بے لاگ مبصر کی حیثیت سے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کو جو فکری، تہذیبی
اور تعلیمی مشکلات اور الجھنیں درپیش ہیں اور اس وقت ہم جس ثقافتی بحران سے دوچار ہیں وہ بڑی حد تک علی گڑھ اور اس کے ذہن کی پیداوار ہے مسلمانوں میں تعلیم
کا ماحول تو ضرور بڑھ گیا ہے لیکن جس مقصد کے لئے تعلیم دی جاتی ہے، وہ ناپید ہو گیا ہے آج جو اس کے باوجود صحیح خطوط پر تعلیمی تشکیل جدید کی راہ میں سب سے
بڑی رکاوٹ تعلیم کا وہی مزاج ہے جو علی گڑھ اور مغربی تعلیم کا پیدا کردہ ہے اور ہم نے علی گڑھ کی تحریک پر اتنی مفصل گفتگو اسی لئے ضروری سمجھی کہ تشکیل نو ان اصل خرابیوں
کے احساس کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ علی گڑھ بالکل ناکام رہا لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو نظام علی گڑھ نے جنم دیا، اسلامی نقطۂ نظر سے اور
مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی روایات کے نقطۂ نظر سے وہ نہ صرف غیر تسلی بخش بلکہ مضر اور نقصان دہ رہا ہے۔ شکر ہے کہ آخری زمانہ میں اس کا احساس خود اربابِ
علی گڑھ کو بھی ہو چلا تھا جس کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔

**مولانا محمد علی** اپنے ایک خط میں نواب محسن الملک کو ان کی اور علی گڑھ کی روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
"مگر جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزلِ مقصود تک ہرگز نہ پہنچائے گا"

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی      کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

نہ کعبہ کی راہ نہیں ہے، یہ ترکستان کا راستہ ہے۔ یہ غلطی آپ کے دل کی نہیں آپ کے دماغ کی ہے"
محمد علی کی علی گڑھ سے مایوسی ہی تھی جس نے انہیں جامعہ ملیہ قائم کرنے کی ترغیب دی جس کے پہلے وائس چانسلر وہ خود تھے۔

**نواب وقار الملک** سر سید کی پالیسی سے سخت غیر مطمئن تھے، اس کا اندازہ خود اس خط سے کیجئے جو سر سید نے ان کے نام لکھا ہے اور جس میں وہ لکھتے ہیں
"جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں، ہم انہیں امور کو کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس
کا کوئی علاج نہیں ہے، اور بعض کر دیا ہے کہ جو خدا کو منظور ہے، ہو گا"
پھر جب ان کے اپنے صاحبزادے مسٹر محمد احمد علی گڑھ کی تعلیم کے بعد ولایت سے میم لائے اور گھر واپس آنے کی بجائے بنگلور جا کر مقیم ہوتے تو اس ذاتی تجربہ
کے بعد انہیں اور بھی شدید صدمہ ہوا اور انہوں نے نئی تعلیم کے تلخ نتائج کو مجسم دیکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے سربراہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے
دوسرے بیٹے کو ندوہ بھیجا

**نواب وقار الملک** جو علی گڑھ کے معماروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اس سے اس قدر بددل ہوتے کہ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے جامعہ کی صدا کا
اسکیم میں کی اور ایک نئی تعلیمی تحریک عملی کی ضرورت کا اظہار کیا

**شبلی نعمانی** کی علی گڑھ سے بے اطمینانی اور مایوسی ایک کھلی ہوئی چیز ہے ۱۸۹۳ء میں ایک خط میں انہوں نے لکھا۔
"معلوم ہوا کہ انگریزی خواں قوم نہایت مہمل فرقہ ہے مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش نام کو نہیں۔ یہاں

میں جیرون کا ذکر نہیں آتا۔ اس حال کو ٹ تیلو لوں کی نمائش گاہ ہے۔"

آخری عمر میں ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"علمی سطح بہت گر چکی اور انگریزی تعلیم جہل کے برابر رہ گئی۔"

جو سرسید کے سب سے بڑے مداح ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

**حالی** "چھتیس[۲] برس کے تجربہ سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصل لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"

**مولانا حالی** کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انہیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔"

اور آخر میں جو علی گڑھ کے بانی سرسید کے ایک خط سے اقتباس پیش کرتے ہیں جو اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود مسلمان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔"

**علی گڑھ** ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم باب ہے آج ہم اس پوزیشن میں ضرور ہیں کہ گزشتہ ۹۰ سال کے پس منظر میں رونما ہونے والے واقعات اور تحریکات کا اندازہ جائزہ لے کر ایک رائے قائم کریں۔ جن مجبوریوں اور مشکلات میں علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا اور حالات کے دباؤ نے اس کا جو مزاج بنا اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ روش کسی ہی سوچ کر اختیار کی گئی ہو لیکن جس کی نگاہ پچھلے سو سال کی تاریخ پر ہے دیکھتا ہے کہ ایک اری ہوئی فوج کے شکستہ دل اور شکستہ سمت کمانڈر کی مجبوریاں اس کے پس پشت کارفرما تھیں۔ نتائج پر ہمیں کتنا ہی افسوس ہو لیکن علی گڑھ کے بانی اور اس کے رفقائے کار کے اخلاص میں ہمیں کوئی شک نہیں اور ان کی مجبوریوں کا ہمیں پورا احساس ہے۔

ایک اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ خواہ علی گڑھ تحریک سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف، مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ کے جدید دور پر اس ادارہ کے جو اثرات پڑے ہیں وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے ذریعہ فکر و نظر، سیرت و کردار اور اخلاق و معاشرت میں کیسی غیر معمولی، دور رس اور انقلابی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اکبر نے سچ کہا تھا۔

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ علی گڑھ ہی کا اثر ہے کہ ہندوستانی مسلمان اسلامی قومیت اور مسلم قومیت کے لطیف فرق کو محسوس نہ کر سکے اور گذشتہ ۴۰ سالہ سیاست میں جو ژولیدہ فکری رہی ہے وہ نئی تعلیم ہی کے اثرات کی پیدا کردہ ہے نیز آج پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے میں جو مشکلات حائل ہیں وہ بھی اسی ذہن کی پیداوار ہیں اور بہت سے ماہرین تعلیم اسلامی تصور تعلیم اور اسلامی نظام تعلیم کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں اور محض چند سالوں کے لئے دینیات کی تعلیم کو اسلامی تعلیم کے مترادف سمجھ رہے ہیں، وہ بھی اسی مخصوص ذہن کی پیداوار ہے۔ اگر ہمیں نظام تعلیم میں اسلامی بنیادوں پر ایک ہمہ گیر انقلاب لانا ہے تو ذہنوں سے علی گڑھ کے ماڈل کو ہٹانا ہوگا اور تعلیم کا ایک ایسا نظام تعمیر کرنا ہوگا جو اسلامی مقاصد، اسلامی اصول اور اسلامی مزاج کا آئینہ دار ہو۔

**(ج) ندوۃ العلماء (لکھنؤ)** جدید و قدیم کی کشمکش نے بہت سے ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت جدید و قدیم کا امتزاج ہے۔ ندوہ قدیم نظام تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے۔

اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی ضرورت یہ ہے کہ نظام تعلیم کی اصلاح ہے۔ شروع میں تو یہ کوشش کی گئی کہ تمام اسلامی مدارس ایک نئے نصاب پر متفق ہو جائیں لیکن جب اس میں کامیابی کا امکان زیادہ نظر نہ آیا تو کم از کم ایک ایسا مرکز قائم کر دیا جائے تا کہ جہاں نئی اصلاحات کو روبہ کار لایا جا سکے۔ اسی مقصد کے لئے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا۔ ندوہ کے بانیوں میں شبلی نعمانی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی، مولانا نذیر علی جو شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی وغیرہ ہم سال تھے۔ ندوہ جلد ہی ایک مرکز بن گیا اور اس کی مقاصد کی اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ بھی "الندوہ" کے نام سے جاری کیا گیا۔ ندوۃ العلماء کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ندوہ کی اولین خصوصیت پرانے نظام تعلیم کی اصلاح ہے اور یہ اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ پرانے نصاب تعلیم میں جو علوم مقصود اصلی ہیں ان کی کتابیں بہت کم اور جو علوم بالواسطہ مقصود ہیں ان کی کتابیں کثرت سے پڑھی جاتی تھیں۔ ندوہ نے اس کی کوتاہی نصاب میں دور کرنے کی کوشش کی اور وہ اس طرح کہ تفسیر، عقائد اور شریعت کے اسرار و حکم کو نصاب میں ایک اہم جگہ دی۔ ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا نیز یہ کہ فلسفۂ جدید اور انگریزی زبان کو شامل نصاب کیا صرف دکھ کے معاملہ میں ادب والنشاء کو زیادہ اہمیت دی اور عربی بول چال کی طرف بھی توجہ دی۔ اس طرح ایک نیا نصاب وجود میں آیا جس میں قدیم کے عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور قدیم کے ساتھ ساتھ جدید کی گنجائش بھی پیدا کی گئی

---

[۱] یہ سارے اقتباسات موج کوثر سے لئے گئے ہیں۔

(۲) پرانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے ندوہ نے تعلیم کے ساتھ تربیت کا ضروری اہتمام کیا۔ طلبہ کے لئے اقامت گاہ بنائی گئی اور استاد اور طالب علم کے پرانے رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔

(۳) علماء کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل میں، دونکہ سے احتراز کی بڑی اصرار کی گئی۔ اختلافی مسائل میں توسع اور اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور ان کے معاملات سے دلچسپی بھی پیش نظر رہی۔

(۴) ایک اہم خصوصیت علوم و فنون کے ساتھ عملی صنائع کی تعلیم بھی ہے گو اس پہلو سے عملاً زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔ لیکن تعلیم کا یہ وسیع تصور بہرحال سامنے ضرور رہا۔

(۵) ندوہ عملاً بھی جدید اور قدیم دونوں کا سنگم ثابت ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا اجتماع اس میں ہوا اور دوسری طرف شبلی کے ذریعے علی گڑھ اور مغربی دونوں سے فیض یاب ہوا۔

(۶) ندوہ کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ علمی و تعلیمی حیثیت سے عالم اسلام سے مربوط رہا۔ مصر کے علماء سے بلا واسطہ استفادہ کیا، عرب علماء کو تدریس کے لئے بلایا گیا۔ ندوہ کے اہل قلم سارے عالم اسلام کے ادبی رسائل سے استفادہ بھی کرتے رہے اور ان میں لکھتے بھی رہے۔ آج تک ندوہ نہ رسمیہ عام کتنے ہوتے ہیں۔

(۷) ندوہ تعلیم کے ساتھ علم و تحقیق کی روایت کا بھی امین رہا۔ ندوہ کا ملت کو سب سے بڑا علمی عطیہ جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے جو اس دور کے چوٹی کے علماء میں سے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ندوہ نے سینکڑوں اہل علم قوم کو دئیے اور سچی بات یہ ہے کہ دار المصنفین اعظم گڑھ نے جو عظیم خدمت علوم اسلامی، خصوصاً اسلامی تمدن و تاریخ کے میدانوں میں کی ہے وہ ندوہ والوں ہی کی وجہ سے ممکن ہوئی، اس لئے کہ ندوہ ہی کے نامور فرزند افراد نے اس ادارہ کو سیراب کیا۔

(۸) گو ندوہ نے مختلف ذرائع سے مالی اعانت وصول کی اور اس بارے میں اس کا مسلک دیو بند سے مختلف رہا لیکن بحیثیت مجموعی ندوہ نے اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان نہ کیا اور انگریزوں کے معاملے میں اس کا رویہ بڑی حد تک آزادانہ رہا۔ بلکہ ایک دور تو ایسا بھی گزرا جب وہ سرکار برطانیہ کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ ایک زمانہ میں حکومت نے ۵۰۰ روپے ماہانہ کی گرانٹ بھی دی لیکن عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں ندوہ نے یہ گرانٹ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح ندوہ کا سیاسی رول بڑی حد تک آزادانہ اور ملی عزائم و توقعات سے ہم آہنگ تھا۔

ندوہ کی یہ خصوصیات اور اس کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اور یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تحریک اسلامی کو جو مردان کار ملے ان میں دوسرے کے مقابلے میں ندوہ کے پیدا کردہ افراد زیادہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی قومی زندگی کے دھارے کو موڑنے میں ندوہ کوئی مؤثر اور محسوس حصہ ادا نہ کرسکا اور غالباً اس کی وجوہ یہ ہیں:-

(الف) ندوہ قدیم و جدید کے امتزاج کی ایک کوشش ضرور ہے لیکن اس کی بہترین اور مناسب ترین کوشش نہیں، ہم اگر ندوہ کے ان ناقدین سے اتفاق نہ بھی کریں جو یہ کہتے ہیں کہ ندوہ کی مثال آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہو، نہ تیتر رہا، اور نہ بٹیر۔ (ملاحظہ ہو نیا ریک رہا اور تسنیداہ ہے) لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ جس نوعیت کی تخلیقی و انقلابی جدوجہد کی ضرورت تھی وہ ندوہ نہ کرسکا۔ ندوہ کی پوری تاریخ میں ایک ٹھہراؤ اور اعتدالیت کی بجائے ایک سکونی کیفیت ہے۔

(ب) ندوہ نے نصاب کی حد تک تو نئے اور پرانے عناصر میں کچھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن زندگی کے رُخ کو موڑنے کے لئے پورے فکر اور تمدن و تہذیب کے پورے نظام کا جو نیا تصور ابھرنا چاہئے تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جدید تعلیم کے پیچھے ایک پورا تہذیبی نظام موجود تھا۔ پرانی تعلیم کے پیچھے بھی زندگی کا ایک مخصوص تصور پایا جاتا تھا۔ لیکن قدیم و جدید کے امتزاج کی جو کوشش ہو رہی تھی اس کی فکری و فلسفیانہ بنیادیں موجود نہ تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم ایک خاص فکر و تہذیب کی نمائندہ اور ایک انقلابی تحریک کی ہراول ہونے کے بجائے اس پورے ماحول میں ایک اجنبی سی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیم معاشرہ پر اپنا کوئی غیر معمولی ہمہ گیر اثر نہ ڈال سکی، اور تحریک اسلامی میں ندوہ کے پیدا کردہ افراد کے لئے کشش کا راز بھی یہی ہے کہ اس تحریک نے فکر و نظر اور تہذیب و تمدن کا وہ انقلابی تصور دیا جو اس نوعیت کی تعلیم کے خلاء کو پُر کر رہی تھی۔

(ج) ندوہ کی تعلیم میں یہ بات پوری طرح ملحوظ رہی کہ اس کے پیدا کردہ افراد زندگی کے ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کرسکیں۔ اس لئے ندوہ نے کچھ علماء و معلم تو ضرور دیئے لیکن ایسے افراد تیار نہ کئے جو زندگی کے ہر میدان میں اپنا مقام پیدا کریں۔

(د) ندوہ نے جدید علم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اس کا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ کی رسائی مغربی علوم کے اصل ماخذ تک نہ ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ وہ مغرب سے پورا استفادہ کرسکے اور نہ مغرب کے چیلنج کا مقابلہ کرسکے۔

ندوہ ایک مسلک جامع بنیں بلکہ ایک نئی کوشش ہی کے مترادف ہے۔ قدیم و جدید کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ندوہ نے روشنی کی ایک بھی سی شمع روشن کی۔ جو آں ہیبت تاریکیوں کا مقابلہ تو نہ کرسکی لیکن اس نے ان کے خلاف کچھ نہ کچھ احتجاج کو ضرور وجود بخشا۔

---

## (د) جامعہ ملیہ

پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ندوہ ہے تو نئی تعلیم میں پرانی تعلیم کی کچھ خصوصیات کو زندہ کرنے کی سعی جامعہ ہے۔

تحریک عدم تعاون نے ہندوستان میں قومی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا۔ شروع میں قومی تعلیم کی کوششیں بڑی حد تک ہندوؤں کے زیر قیادت ہوئیں اور جن مسلمان طلبہ نے انگریزوں تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا وہ بھی ان ہی نئے قومی تعلیمی اداروں میں داخل ہوگئے، لیکن چونکہ مسلمان ذہن ایک غیر اسلامی نظام تعلیم سے کبھی بھی اپنے کو ہم آہنگ نہ کرسکا اس لئے شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ قومی تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں کی ملی تعلیم کا انتظام ہو۔ فطری طور پر نگاہیں علی گڑھ کی طرف اٹھیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری گرانٹ کو مسترد کر کے اسے ملی بنیادوں پر از سر نو منظم کیا جائے۔ یہ گویا علی گڑھ کے لئے ناقابل ہضم تھی پر جوش طلبہ جب ارباب علی گڑھ سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے علی گڑھ

کو علی گڑھ ہی میں ایک نئی تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ یہی تھی جامعہ ملیہ اسلامیہ جو ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرگرمی میں قائم ہوتی اور جس کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا۔ ابتدائی زمانہ میں جامعہ اور علی گڑھ کی کشمکش رہی لیکن ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے دہلی منتقل ہو جانے سے یہ کشمکش سرد پڑ گئی اور دونوں ادارے اپنا مخصوص کردار ادا کرنے لگے۔

جامعہ کی خصوصیات یہ ہیں

(۱) جامعہ نے سیکولر تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا۔ اسی طرح سیکولر تعلیم میں محض دینیات کے اضافہ کو بھی ناکافی کہا۔ اس کے بانیوں نے یہ تصور دیا کہ تعلیم کو علوم جدیدہ اور دین کا جامع ہونا چاہیے اور طالب علم کو بیک وقت دونوں میں مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے لئے دین کی معمول تعلیم کا تقریباً ہر مرحلہ پر انتظام کیا گیا۔ قرآن پاک اور سیرت نبوی کے مطالعہ کو جزو نصاب بنایا۔ عربی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور علوم اسلامی میں اختصاصی تعلیم کی گنجائش پیدا کی گئی۔

(۲) انگریزی کے بجائے جامعہ نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ یہ صحیح ہے کہ اس بات میں اولیت کا شرف جامعہ عثمانیہ کو حاصل ہے جس نے ۱۹۱۸ء میں اردو کو یہ حیثیت دے دی تھی لیکن جامعہ کا کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ خصوصیت سے اس لئے کہ جامعہ عثمانیہ کا ادارہ بڑی حد تک حیدرآباد دکن تک ہی محدود تھا جب کہ جامعہ کی حیثیت ملک گیر تھی۔ یہ اقدام ایک انقلابی اقدام تھا اور اگر اس روش کو مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے اختیار کر لیتے تو آج ہماری کیفیت بڑی مختلف ہوتی۔

(۳) جامعہ کی ایک اور خصوصیت صنعت و حرفت کی تعلیم ہے۔ جامعہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا وہ واحد ادارہ ہے جس نے تعلیم کا رشتہ ملازمت سے کاٹ کر معیشت کے گونا گوں تقاضوں سے جوڑا اور حرفتی تعلیم کے ذریعے معاش کے آزاد ذرائع کا سد ولست کیا۔ اس طرح وقت کے ایک اہم تقاضے کو بھی پورا کیا گیا اور مسلمانوں کے پرانے اور ہمہ گیر و وسیع تصور تعلیم کو از سر نو رائج بھی کیا گیا۔ پھر اس کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ اس کے تعلیم یافتہ افراد انگریزوں کی حکومت کے دست نگر نہ رہے اور ان میں آزادی پسندی کا جذبہ پروان چڑھا۔

(۴) جامعہ نے تعلیمی ماحول میں بڑی سادگی قائم کی۔ اساتذہ اور طلبہ سب کی زندگی قناعت کا نمونہ تھی۔ مصارف تعلیم بہت ہی کم رکھے گئے اور معیار زندگی کو سادہ اور عوام کی زندگیوں سے قریب تر رکھا گیا۔ پھر تعلیمی ماحول میں اسلامی روایات کے قیام کی کوشش بھی کی گئی۔

(۵) جامعہ نے ایثار و قربانی کا بھی اعلیٰ نمونہ قائم کیا۔ خصوصاً جامعہ کے اساتذہ نے اسی اسپرٹ کا مظاہرہ کیا جو مسلمان معلمین تاریخ میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے اساتذہ نے نہایت معمولی مشاہروں پر خدمات انجام دیں اور اعلیٰ مقاصد کے لئے قربانی کی عمدہ مثالیں پیش کیں۔

(۶) جامعہ میں طلبہ اور اساتذہ کے تعلقات گہرے تھے اور جامعہ نے کردار سازی کو بھی ایک اہم مقصد کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھا۔

(۷) جامعہ کی علمی روایات زیادہ صحت مند اور امید افزا ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ نے اپنی علمی زندگی کو برقرار رکھا اور تحقیق و تصنیف کے میدانوں میں بڑی داد دیتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہم کی تصانیف علمی دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

(۸) جامعہ مختلف حیثیتوں سے ایک بڑا کامیاب تجربہ رہا لیکن یہ بھی قومی زندگی پر اپنے ہمہ گیر اثرات نہ ڈال سکی اور اس کی وجہ حکومت کی طرف سے مکمل عدم تعاون، اور وہ مشکلات ہیں جو ہر نئی راہ نکالنے والوں کو ایک مدت تک پیش آتی ہیں جس حیثیت سے جامعہ کا کردار دہنی پریشانی کا باعث ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جامعہ نے ایک وقت اسلامی اخوت اور متحدہ قومیت کا راگ الاپا اور ان میں جو بنیادی تضاد ہے اسے آخر تک بھی نہ محسوس کیا۔ جامعہ کانگریس کے ساتھ اس درجہ منسوب ہو گئی تھی کہ مسلمان اپنی آزاد قومیت کے احساس اور اس کو منوانے کی جدوجہد کے دوران اس اور نہ کو اپنا نہیں سکے اور نہ ان کا پیغام ان کی رگ و پے میں اتر سکا۔ ہماری نگاہ میں یہ جامعہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ راستے کی مشکلات اس کے قدم روک سکتیں اور نہ حکومت کی مخالفت اس کے لئے سنگ راہ ثابت ہوتی۔ فکر و نظر کا یہ تناقص اس کی پیش قدمی میں حائل ہوا اور یہ تجربہ اپنے صحیح رنگ میں نہ ہو سکا۔ یہ بھی جامعہ کی بدقسمتی ہے کہ اسلامیات کا شعبہ بڑی مدت تک ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہا جس کے علم و فضل کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن جس کے عقائد و تصورات امت کے تصورات سے مختلف تھے اور انکار حدیث کی بنا پر مسلمان قوم ان کے خیالات سے ابا کرتی تھی۔

---

## حرفِ آخر

گزشتہ صفحات میں ہم ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام، جدید تعلیم کا آغاز اور اس کا تاریخی ارتقاء اور مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ہم بحیثیت مجموعی، انگریزوں کی آمد سے لے کر تقسیم ملک تک کے بارے میں چند باتیں پیش کریں گے

(۱) ہماری نے لاگ رائے یہ ہے کہ انگریزوں کو اس ملک کی تعلیم سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے یہاں کے صحت مند اور ترقی پذیر نظام تعلیم کو ختم کیا اور نیا نظام قائم کیا جس میں نہ ملک کی ضروریات کا خیال رکھا گیا اور نہ ہی اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے تحت اسے پروان چڑھایا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز اور ڈنکن (Duncan) یہی کہتے رہے کہ تعلیم کو متحارب سیاسی گروہوں کے درمیان ربط و مصالحت کا رول ادا کرنا چاہیے۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں مشرقی ادب کے احیاء اور مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا گیا۔ لیکن ۱۸۳۵ء کی یادداشت میں اس تصور کو بھی مٹا دیا گیا اور صاف صاف یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ صرف مغربی علوم اور مغربی سائنس اور مغربی فلسفہ و ادب کی ترویج کی جائے۔ حد یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے مقاصد تعلیم کی نوعیت کی کسی چیز کا ذکر تک نہیں کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں لارڈ کرزن یہی چلاتے رہے کہ تعلیم کو دراصل ہندوستانی ذہن کی فطری خامیوں کو درست کرنے کا کام سرانجام دینا چاہیے گویا کسی دور میں بھی اور کسی سطح پر بھی ہندوستان کے مسائل پر غور نہ کیا گیا۔ نہ یہاں کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی مغربی تصورات تعلیم کی روشنی ہی میں مقاصد تعلیم پر کوئی توجہ صرف کی گئی۔ اس کے مقابلے میں جو کچھ کیا گیا وہ یہ ہے کہ تعلیم کو فلسفہ حیات، مقاصد تعلیم، اخلاقی اقدار اور حقائق زندگی سے کاٹ کر محض تمدنی خوشہ چینیوں اور ادنیٰ ملازمتوں کی

ایک نئی پود تیار کرنے میں استعمال کیا گیا۔ یہ ہندوستان ہی کا المیہ نہیں بلکہ خود تعلیم کا بھی المیہ ہے۔ تعلیم کو کسی تاریخی کسی دور میں دیکھا نصب العین ہو، اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ درحقیقت تعلیم کے مسئلے کی طرف حقیقی توجہ دی ہی نہیں گئی، بلکہ تعلیم کو محض سیاسی اغراض کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔

(۲) جو نیا نظام تعلیم اس ملک میں رائج ہوا وہ ملک کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا تھا اور نہ بین الاقوامی دنیا کی۔ تعلیم کا کوئی تعلق ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں کی تاریخ، تمدن اور ثقافتی ضروریات سے نہ تھا۔ بین الاقوامی سطح پر مشرق و مغرب کی جو کشمکش رونما تھی اور جو نظریاتی تصادم درپیش تھا اس تعلیم میں اس کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی نظام محض کچھ حضور نیچے تو پیدا کر سکا، لیکن ایسے انسان پیدا نہ کر سکا جو نئے حالات میں نئی راہیں نکال سکتے۔

(۳) تعلیم کے ساتھ جو سلوک انگریزوں نے کیا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت وہ ملک چھوڑ کر گئے ہیں ملک میں خواندگی کا معیار بمشکل ۱۱ اور اسکول گئے تعلیم یافتہ افراد کا تناسب ۵ سے بھی کم تھا، لیکن جس وقت انہوں نے اقتدار سنبھالا ہے خود ان کی سرکاری رپورٹیں یہ تسلیم کرتی ہیں کہ مدرسوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے افراد کا اوسط ۲۵ سے ۳۳ فی صد تک تھا۔ ایک طرف یہ حقائق ہیں اور دوسری طرف اس بات کا شور ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو تعلیم دی اور تہذیب دی۔ انگریز کا نام سر دیئے تعلیم ہے یا معلوم تعلیم کی تباہی کو کس نام سے پکاریں گے؟

(۴) نئے نظام نے جو تعلیمی طریقے اختیار کئے وہ غلط ہی نہیں تباہ کن بھی تھے۔ مقامی تعلیمی طریقوں کو یک سر نظر انداز کر دیا گیا اور وسط انیسویں صدی کے انگریزی نمونہ کو سامنے رکھا گیا جس کا کوئی تعلق یہاں کی تاریخ اور تمدن سے نہ تھا۔ انگلستان ایک صنعتی ملک تھا، جہاں معاشی ترقی ہو چکی تھی، دولت کی فراوانی تھی، شہری زندگی کا غلبہ تھا۔ ہندوستان نسبتاً ایک غریب خالص زراعتی ملک تھا، جہاں آبادی کی اکثریت دیہاتی تھی۔ ایسے ملک میں وہ طریقے کیسے چل سکتے تھے جو انگلستان میں رائج تھے۔ پھر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا کر عوامی تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے اور ہندوستان کی اپنی زبانوں کے ساتھ سوتیلی ماں والا سلوک کیا گیا۔ ان کے پیچھے اور ترقی پانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔

(۵) انگریزوں کے دور اقتدار میں ہندوستان کو معاشی اور معاشرتی حیثیت سے ترقی دینے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں ہوئی اور نظام تعلیم بھی اس ضرورت کی طرف سے قطعاً بے نیاز رہا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں تعلیم کا کوئی تعلق ملک کی تمدنی اور معاشی ضروریات سے نہیں اور یہ بھی اسی کا نتیجہ تھا کہ جدید تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتوں کی بے روزگاری میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور آج بھی ہند و پاکستان دونوں اس مسئلے سے دوچار ہیں کہ ایک طرف ملک کو تربیت یافتہ افراد کی شدید ضرورت ہے جو اس کی پسماندگی کو خوش حالی اور ترقی سے بدل دیں اور جن کے ہاتھوں ملک آگے بڑھ کر خوش حالی اور فراوانی کے کھیت بن جائیں اور دوسری طرف جیسے افراد ڈگریاں لے کر زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں بے روزگاری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان میں ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ گویا کہ وہ چوکور میخیں ہیں جن کو گول سوراخوں میں داخل کرنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

(۶) اس پورے دور میں کوئی تعلیمی منصوبہ کار فرما نظر نہیں آتا۔ کسی موقع پر بھی ملک کی تعلیمی ضروریات کو سامنے رکھ کر ان کو پورا کرنے کے لئے نقشہ کار نہیں بنایا گیا، صرف ایک گروہ کی مخصوص مصلحتیں نظر رہیں۔ اس کے آنے ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ان کو پورا کرنے کا شعور نہ تو یونیورسٹیوں میں تھا نہ نظام میں اور نہ شعبہ تعلیم میں نگاہ صرف وقتی مسائل پر رہی اور تعلیمی ماہرین اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکے۔ کسی معاملے میں دور اندیشی نظر آتی ہے تو وہ صرف یہ کہ مشرقیت کا ہر رنگ مٹتا چلا جائے اور مغربیت کا رنگ چڑھتا جائے، اس سے ہٹ کر اصل تعلیمی معاملات میں منصوبہ بندی ہے، نہ دور بینی ہے، نہ معاملات کا شعور ہے، نہ مسائل کا فہم ہے، اور نہ تنظیم کے ساتھ کوشش اور جد و جہد کی مثال ملتی ہے۔

(۷) جو بات اس نئی تعلیم کے حق میں زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں مغربی فکر و ادب تک رسائی ہوئی، مغرب کے اصول تنقید کی روشنی میں مشرقی علوم کا از سر نو مطالعہ شروع ہوا۔ ہندوستانی زبانوں، خصوصیت سے سنسکرت پر تحقیقی کام کیا گیا، طباعت و صحافت نے ایک حد تک ترقی کی، مغرب کے سیاسی نظام اور سیاسی جد و جہد کے اسالیب نے یہاں راہ پائی اور بالآخر انگریزوں کا مقابلہ انگریزوں ہی کے فراہم کردہ ہتھیاروں سے ہوا۔ لیکن ان تمام باتوں کو فراخ دلی سے مان لینے کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ سب یا ان میں سے کوئی نئے تعلیمی نظام کا مقصد نہ تھی۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک ضمنی ثمرہ کی ہے اور جو نقصان اس نظام نے پہنچایا اس کو ان معمولی سی بھلائیوں سے کوئی علاقہ نہیں۔

(۸) مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ دور سب سے زیادہ تلخ، سب سے زیادہ تباہ کن اور سب سے زیادہ مضر رساں رہا۔ اس لئے کہ نئی تعلیم میں اصل ہدف مسلمان ہی تھا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ انگریز اس حال میں کامیاب رہا اور اس نے محض تعلیم ہی کو تباہ نہیں کیا، بلکہ نئی نسل کے ذہن و فکر کو بھی بگاڑ دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا، ہمیشہ اس کے خلاف مثبت انداز سے تعاون کرتا رہا۔ لیکن یہ کوششیں زیادہ مؤثر نہ ہو سکیں اور ریاست کی ساری قوتوں کے ساتھ جو تباہ کن انقلاب برپا کیا جا رہا تھا اس کا راستہ نہ روکا جا سکا۔ پھر اس نئے سیلاب میں نہ رضا و رغبت بہہ گئے اور کچھ مجبوراً۔ لیکن اپنے کو سنبھالنا سب کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس وقت مسلمانوں کو جو تعلیمی مسئلہ درپیش ہے وہ دراصل اسی تاریخی صورت حال کا پیدا کردہ ہے۔ ہم ایک ایسے نظام تعلیم میں گھرے ہوتے ہیں، جو ہماری تاریخ، ہماری ثقافت، ہمارے مذہب، ہماری ملکی ضروریات، ہمارے ادب، ہماری روایات غرض ہر ایک کے لئے چیلنج ہے۔ ساری راہیں اس کے خلاف توجہ کیا ہیں، لیکن خود ہم خود اس نظام کا پیدا کردہ ہے وہ مستقبل کی شاہراہ کے نشانات دیکھنے سے معذور ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ تعلیمی نظام کے کسی ایک پہلو کی نہیں۔ پورے نظام کی اصلاح ہے۔ اس کے مقاصد، اس کے اصول تعلیم، اس کے نصاب، اس کا طریق تدریس، اس کا ماحول، غرض ہر چیز انقلابی تعمیر و تبدیل کا مطالبہ کرتی ہے اور مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اس وقت تک پوری نہیں ہو سکیں جب تک کہ اس پورے نظام کو از سر نو اسلامی بنیادوں پر استوار نہ کیا جائے۔ ہمیں اس نظام کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ ایک بالکل نیا نظام قائم کرنا ہے۔ جب تک تخریب و تعمیر کا یہ عمل بروئے کار نہ آجائے ہماری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور ہماری تاریخ کے تقاضے تشنۂ تکمیل رہیں گے۔

کرنل محمد خان

# یہ نہ تھی ہماری قسمت...

یہ کالج کے دنوں کا واقعہ ہے۔ ایک دن ہماری کلاس یعنی ایم اے فائنل کے لڑکوں میں خبر مشہور ہو گئی کہ ہمارے ایک منحنی سے ہم جماعت مولوی عبدالرحمٰن کو ایک ایف اے کی طالبہ کی ٹیوشن مل گئی ہے۔ خبر کا چرچا ٹیوشن کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ لڑکی کی وجہ سے تھا کیونکہ افواہ کی رو سے لڑکی حسین ہی نہ تھی بلکہ چار پانچ سال اپنے بیرسٹر باپ کے ساتھ ولایت رہ کر آئی تھی۔ فیشن کی کوئی ایسی ادا نہ تھی جو اسے یاد نہ ہو، انگریزی فر فر بولتی تھی اور کلاس میں اپنے پروفیسروں کے کان بھی کترتی تھی صرف اردو میں کمزور تھی۔ یہ کمزوری بھی اس نے حسن اور انگریزی کے زور سے کسی قدر چھپالی تھی اور باقی ماندہ کمی کو پورا کرنے کے لیے ٹیوشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

لڑکی کے کوائف سن کر مولوی عبدالرحمٰن کے ہم جماعت یعنی ہم لوگ رشک و حسد سے چور چور ہونے لگے کئی ایک نے مولوی صاحب کی داڑھی کے متعلق نازیبا باتیں بھی کہیں اور میاں میں ان بالوں کا ذکر کرنے آئے جن کی ٹھوڑی کے نیچے بال ہونے میں شک اس تمام غیبت کے باوجود مولوی عبدالرحمٰن کی داڑھی کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا کیونکہ سر سید کی لتاڑ سے آپ کے جو بال بیکا ہونے تھے ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے لطافت پکے تھے؛ چنانچہ اکثر حاسدوں نے مولوی عبدالرحمٰن پر داڑھی سمیت زبان درازی کی۔ ہم نے عالی ظرفی برقرار رکھی، لیکن اندر سے ہم بھی ویسے ہی حاسد تھے ہمیں قسمت سے اصل شکایت تو یہ تھی کہ اس ٹیوشن کے لیے ہم کیوں نہ چنے گئے یعنی ہم کہ سرخ و سپید بانکے سے لڑکے چھوٹے جوان رعنا تھے اور بیرسٹر صاحب کے گھر میں یوں لگتے جیسے رابرٹ ٹیلر کو لیوڈ رکھ لیا ہو، لیکن قرعہ پڑا تو وہ بھی مولوی عبدالرحمٰن کے نام جو اپنی موٹی چادر کی بکل میں یوں نظر آتے تھے جیسے سیشوں کے پیچھے سے اُگو ولاوڑ جھانک رہا ہو ہمیں اس لڑکی کے لیے ٹیوٹر چننے والوں پر بہت غصہ آیا۔ مولوی عبدالرحمٰن کو کسی لڑکے کا ٹیوٹر چن لیا جاتا، تو ہمیں قطعاً کوئی شکایت نہ ہوتی، لیکن ایک لڑکی کے لیے ان کا انتخاب قسمت کی سخت غلط بخشی تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ قسمت قد ناپ کر تقسیم نہیں کرتی۔ ہاں کبھی کبھی بی۔اے کے نمبر دیکھ لیتی ہے اور بی۔اے میں مولوی صاحب ہمیں کوئی دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے تھے بہرحال نمبر کم سہی، ہمارے دل کے ارمان اتنے کم نہ تھے اگر ہمارے نمبروں کے ساتھ ہماری حسرتوں کا شمار بھی کیا جاتا، تو ایگریگیٹ میں ہم ضرور اونچی پوزیشن حاصل کرتے اور یہ ٹیوشن بھی، کیونکہ ہمارا ایک ارمان ایسی ہی پیاری سی ٹیوشن کا بھی تھا لیکن دل کے ارمانوں کا قدر دان قیس کو نہ ملا، فرہاد کو نہ ملا، رانجھے کو نہ ملا، ہمیں کیونکر ملتا؛ چنانچہ بامر مجبوری ہم رشک اور حسد کو بھی پی گئے اور ایک دن سامنے سے آتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن ملے، تو انہیں مبارک باد پیش کر دی۔

مولوی صاحب نے حسد کے طوفان میں مبارک باد کی آواز سنی، تو ہمیں سینے سے لگا لیا بولے۔

"ساری کلاس میں ایک تم شریف لڑکے ہو۔" میں نے جلدی سینے بلکہ داڑھی سے الگ ہو کر کہا۔

"اور آپ شریف بھی ہیں اور قابل بھی۔ یہ ٹیوشن آپ ہی کا حق تھا۔"

مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں یوں تحسین کے پھول کم ہی دیکھے تھے چنانچہ ایک دفعہ پھر مجھے سینے سے لگانے کی ناکام کوشش کی۔ ادھر میں کچھ لڑکی کے متعلق جاننا چاہتا تھا سیدھے سیدھے پوچھا۔

"مولوی صاحب۔ لڑکی کیسی ہے؟"

"بڑے دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ ان کا ایک بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں۔ تین نوکر۔"

مجھے ماسٹر کے اعداد و شمار میں دلچسپی نہ تھی اس لیے بات کاٹتے ہوئے بولا

مولانا! یہ نہیں۔ لڑکی کیسی ہے؟

اور لفظ لڑکی پر زور دے کر اسے خوب اجاگر کیا تو مولانا کسی قدر حیرانی سے بولے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

مطلب یہ کہ لڑکی خوبصورت ہے؟

یوں دن دہاڑے لڑکی کی خوبصورتی کے متعلق سوال سن کر مولانا کے کان سرخ ہو گئے۔ بولے۔

"بھئی مجھے معلوم نہیں میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"دیکھا نہیں! پڑھاتے وقت آپ اپنی شاگردہ کے روبرو بیٹھتے ہیں یا پشت پلٹ کر؟"

"نہیں، یہ بات نہیں بیٹھتا تو سامنے ہی ہوں مگر میں نے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی۔"

"کیوں نہیں اٹھائی؟"

"بری بات ہے"

"لیکن آنکھ جھکا کر اس کے پاؤں تو دیکھتے رہتے ہوں گے۔ یہ کیسی بات ہے؟"

"پاؤں میں تو وہ چپل پہنتی ہے۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب ہماری سادگی پر مسکرائے۔ میں نے کہا۔

"مولوی صاحب! آپ بے شک نیک آدمی ہیں۔"

"آپ بھی تو ہیں"

یہ چار لفظوں کا جملہ مولوی صاحب نے اسی انداز سے ادا کیا جیسے بیک

ٹی وی کے اشتہار میں ایک سچ کتا ہے "بیلا مجھی تو ہے" اور رخصت ہونے سے پہلے آپ نے بالکل بچگانہ طور پر تیسری بار ناکام کوشش کی جی ہاں ہمیں بیسے، یعنی داڑھی سے لگانے کی۔

لیکن اب مولوی صاحب کی اور ہماری دوستی پکی ہو چکی تھی۔ ہر صبح مولوی صاحب سے گھر سے شام کے سبق کی بابت مشورہ اور غیر دلچسپ روداد سنتے۔ لڑکی نے جاری کی قسمت پر آنسو بہائے، لیکن جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو تاؤ دیتے اور مولوی صاحب ہمیں دعا دے کر رخصت ہو جاتے۔

ایک روز مولوی صاحب خلاف معمول ذرا پریشان حال نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔

"گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ ماں بیمار ہے، سال کی فصل بھی تیار ہے اور ٹیوشن میں ناغہ ہوا، تو بیرسٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ناراض کیوں ہوں گے؟ آخر مجبوری ہے۔ آپ بیرسٹر صاحب سے بات کر لیں۔"

"کہتے ہیں کہ سالانہ امتحان میں صرف دس دن باقی ہیں اور رضیہ اردو میں بدستور کمزور ہے۔"

"تو کیا ان کا خیال ہے کہ رضیہ کی اردو کی کمزوری ٹھیک نہ ہوئی، تو دشمن ملک پر حملہ کر دے گا؟"

مولوی صاحب میرا سوال ٹال گئے۔ غالباً سمجھ ہی نہ سکے اور بولے۔

"بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر جانا لازم ہے، تو اپنی جگہ کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤ۔ اب میں موزوں آدمی کہاں سے لاؤں؟"

معاً ہمیں خیال آیا کہ ہم آدمی بھی ہیں۔۔۔ اور موزوں بھی کہ اور خوبیوں کے علاوہ ہماری اردو بھی خاصی رواں ہے، لیکن یہ ہمارا خیال تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا یہی خیال مولوی عبدالرحمٰن اور بیرسٹر صاحب کو بھی آ سکتا تھا؟ بلا غرض اپنی خدمات پیش کرنا، تو شان کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس کے دامن کا ایک بار تھام کر ہم نے کہا

"ہاں۔۔۔ موزوں آدمی ملنا واقعی مشکل ہے۔ البتہ ناممکن نہیں۔"

مولانا بولے "بس ایک ہی صورت ہے"

"مثلاً ______؟"

"مثلاً یہ کہ اگر آپ حرج نہ سمجھیں، تو آپ دو روز میری جگہ پڑھا آئیں"

یہ تو وہی بات ہوئی کہ دعا منہ سے نکلی نہیں اور اجابت نے دروازہ آ کھٹکھٹایا۔ لیکن ہماری مسرت سے کہیں زیادہ ہماری حیرت تھی۔ ہمارے منہ سے کسی قدر اضطراری نکلا

"میں یعنی میں خود پڑھا آؤں؟"

"جی ہاں۔۔۔ آپ خود"

"مولانا آپ کی ذرہ نوازی ہے اور انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ بتائیں کہ کیا بیرسٹر صاحب بھی اتنے ہی ذرہ نواز ہیں؟"

"میں نے بیرسٹر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج شام میرے ساتھ چلیے گا۔"

یہ وہی کہانیوں والی بات ہوئی ۔۔۔ کہ شہزادی سامنے محل میں منتظر بیٹھی انتظار کر رہی ہے، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے شاہزادے کو فقط ایک اژدہا اور دو شیر ہلاک کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ان دونوں مہموں کی نسبت، ایک بیرسٹر کو راضی کرنا زیادہ دشوار تھا۔ پھر مولوی عبدالرحمٰن رخصت ہونے لگے، تو یک لخت بولے۔

"ہاں ایک بات، اگر آپ بُرا نہ مانیں؟" "ارشاد"

"کیا ہی اچھا ہو اگر آپ سوٹ کی جگہ اچکن پہن کر آئیں"

"لیکن میرے پاس اچکن تو ہے نہیں۔"

"کہیں سے مانگ نہیں سکتے؟"

"مولانا مانگ تو سکتا ہوں۔ پھر آپ کہیں گے کہ ایک داڑھی بھی لائیے"

"داڑھی نہیں، ٹوپی"

"قبلہ میں بیرسٹر صاحب کے گھر لڑکی کو پڑھانے جاؤں گا کہ جمعہ پڑھنے۔"

"بات یہ ہے کہ اچکن اور ٹوپی میں آدمی ذرا شریف دکھائی دیتا ہے۔"

اب مولوی عبدالرحمٰن سے کیا بحث کرتے کہ ہم نے بڑے بڑے انگریزوں کو اچکن اور ٹوپی پہنے دیکھا تھا۔۔۔ بہرحال انہیں یقین دلا کر ان کی خاطر۔۔۔ جو دراصل اپنی ہی خاطر تھی۔۔۔ اچکن اور ٹوپی کا انتظام کر دیں گے، اور آخر ایک مانگے تانگے کی اچکن ڈھیلی سی اچکن اور تنگ سی ٹوپی پیدا کر لی۔

شام بیرسٹر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دولت کدے سے ہو کر ادھر ہی جھک گئیں اور انہوں نے پھر اٹھنے کا نام نہ لیا۔ مولوی صاحب نے ہمیں بھی تلقین کی کہ نظریں اٹھانے سے پرہیز کریں، لیکن ہم سے کوشش کے باوجود دیدہ دلیری جاری رہی۔ بیرسٹر صاحب کے روبرو ہوئے، تو مولوی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ جواب میں بیرسٹر صاحب نے بظاہر تو ہماری مزاج پرسی کی، لیکن حقیقت میں ہمارا معائنہ کرنے لگے جو قلی معائنے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، یعنی ہمیں تو بہت الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن خود بہت اُلٹے پلٹے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سر زاویے سے ورمی ٹونی لگا کر ہمارے دل کی صحیح نبض سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر غالباً ہماری اچکن ٹوپی سے متاثر ہو کر فرمایا۔

"لڑکا شریف سی لگتا ہے"

پھر مولوی صاحب کو چھٹی دے دی اور ہمیں رضیہ تک پہنچا آئے۔

رضیہ ہماری توقع سے زیادہ حسین تھی۔ پہلی نگاہ ہی میں محسوس ہوا کہ ہمارا دل ۔۔۔ ہمارے ہاتھ سے نکل کر اس کے پاس چلا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال بھی ادھر ہی سے آیا۔

"تو آپ ہیں ہمارے نئے نویلے ٹیوٹر؟"

اب اس طرح سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ "تو آپ ہیں ہماری نئی نویلی شاگرد؟" لیکن یہی بات ہے جس کی سرکار میں ایک لمحے کے لیے ہماری شوخی نے سر جھکا دیا اور ہمارے منہ سے ایک بے جان سا جواب نکلا۔

"جی ہاں، بیا تو ہوں، ٹیوٹر نہیں ہوں۔ مولوی صاحب کی جگہ آیا ہوں"

"اس سے آپ کی ٹیوٹری میں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی کہ عارضی ہوں۔"

"تو عارضی ٹیوٹر صاحب ہمیں ذرا اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔" رضیہ کا اشارہ دیوانِ غالب کی طرف تھا۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"آپ دیوانِ غالب کو مصیبت کہتی ہیں؟"

"جی ہاں ۔۔۔ اور خود غالب کو بھی۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں، غالب پر یہ عتاب کیوں؟"

"آپ ذرا آسان اردو بولیے، عتاب کسے کہتے ہیں؟"

"عتاب غصے کو کہتے ہیں"

"غصہ، ہاں غصہ۔ اس لیے کہ غالب صاحب کا لکھا تو شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ

"پھر جناب نے پورا دیوان کیوں لکھ مارا؟"

"اس لیے کہ لوگ پڑھ کر لذت اور سرور حاصل کریں۔"

"نہیں جناب، اس لیے کہ ہر سال سینکڑوں لڑکیاں اردو میں فیل ہوں۔"

"میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے۔ فرمائیے آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟"

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرع پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دیکھا، تو غالب کی مشہور غزل تھی ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

میں نے کہا، "یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے، ذرا پڑھیے تو۔"

رضیہ بولی "میرا خیال ہے آپ ہی پڑھیں، میرے پڑھنے سے اس کی لاجوابی پر اثر پڑے گا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ باتونی بھی ہیں اور ذہین بھی، لیکن پڑھنے میں غالباً اناڑی ہیں۔ کہا،

"میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہ ہوگا۔ آپ ہی پڑھیں کہ تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور بیچ بیچ جیسے پہلی جماعت کا بچہ پڑھتا ہے۔

"یہ ۔ نہ ۔ تھی ۔ ہماری ۔ قس ۔ مت ۔ کہ وصل"

میں نے ٹوک کر کہا۔

"یہ وصل نہیں، وصال ہے۔ وصل کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔"

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم مسکرائے اور ہمارا اعتماد بحال ہونے لگا۔ **رضیہ بولی۔**

"اچھا وصال ہی سہی، وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں؟"

وصال کے معنی ہوتے ہیں ملاقات، محبوب سے ملاقات۔ آپ پھر مصرع پڑھیں۔"

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔"

"یہ وصال یار نہیں، وصالِ یار ہے۔ اضافت ہے۔"

"اضافت کیا ہوتی ہے، کہاں ہوتی ہے؟"

"یہ جو چھوٹی سی زیر لگی ہے نا آپ کو، اسی کو اضافت کہتے ہیں۔"

"تو سیدھا سادا 'وصالے یار' کیوں نہیں لکھ دیتے۔"

"اس لیے کہ وہ علما کے نزدیک غلط ہے۔" میں نے کسی قدر رعب سے کہا۔

"علما کا وصال سے کیا تعلق ہے؟"

علما کا تعلق وصال سے نہیں، زبان سے ہے۔"

"اچھا جانے دیں علما کو۔ شعر کا مطلب کیا ہوا؟"

"شاعر کہتا ہے کہ یہ میری قسمت میں ہی نہ تھا کہ یار سے وصال ہوتا۔"

"قسمت کو تو بیچ میں گھسیٹ لایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے چارے کا وصال نہ ہو سکا۔"

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"کیا وجہ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتے؟ آپ ٹیوٹر ہیں۔"

"شاعر خود خاموش ہے۔"

"تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی، مگر یہ تو ظاہری سی بات ہے کہ وصال میں فیل ہو گئے۔"

"جی ہاں، یہی احتمال تو یہی ہے، آگے پڑھیں۔"

رضیہ نے اگلا مصرع پڑھا اور ٹھیک پڑھا۔

"اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔"

"شاباش! آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔"

"اس شاباش کو تو میں بعد میں فریم کروں گی، اس وقت ذرا شعر کے پورے معنی بتا دیں۔" میں نے رضیہ کا طنز برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ غالب کہتا ہے قسمت میں وصال لکھا ہی نہ تھا، چنانچہ اب مرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر جیتا بھی رہتا، تو وصال کے انتظار میں ہی عمر کٹ جاتی۔"

"توبہ اللہ!"

نہ غالب اتنے ہی گئے گزرے تھے۔"

"گئے گزرے نہیں تو۔ غالب ایک عظیم شاعر تھے۔"

"شاعر تو بڑے ہوں گے، لیکن محبت کے معاملے میں گھسیارے ہی تھے۔"

"لاحول ولا قوۃ! آپ غالب کو گھسیارہ کہتی ہیں۔ وہ نجم الدولہ تھے۔"

شاہ دولہ ہوں گے          چھوٹے سر اور چھوٹے قد کے فاترالعقل لوگ جیسے ایک بزرگ کی نسبت سے شاہ دولہ یا شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں۔ پہلے وصال کو ترستے رہے۔"

"محترمہ شاعری میں فرضی باتیں ہوتی ہیں۔ غالب نے شعر لکھا ہے، عدالت میں حلفیہ بیان نہیں دیا۔"

"وکیل صفائی صاحب، آپ طرح سے بھی زیادہ چست نظر آتے ہیں۔ یہ فرمائیں کہ آپ کے غالب صاحب کی شادی بھی ہوئی یا نہ؟"

ہوئی۔"

کسی بوڑھی کزن سے ہوئی ہوگی۔"

"نواب زادی تھی اور بوڑھی بھی نہیں تھی، لیکن یہ خود بوڑھے ہی تھے۔"

"میں نہ کہتی تھی کہ کچھ ضرور تھی۔"

"لیکن محترمہ آپ کا پرچہ غالب کی شادی پر نہیں، غالب کی شاعری پر ہوگا۔"

"شاعر کو شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن اگر آپ نے امتحان سے پہلے دیوان ختم کرنا ہے تو جدا کرنا پڑے گا۔"

"مجھے امتحان کی فکر نہیں، پہلے غالب کا فیصلہ ہونا چاہیے۔"

"بہت اچھا، تو فرمائیں، غالب نے کیا قصور کیا ہے؟"

"غالب نے اوٹ پٹانگ شعر لکھ کر لوگوں کو الو بنا رکھا ہے۔"

"محترمہ الو تو شاعر یا لیلیٰ پر مرنے والے اور غالب کے چاہنے والوں میں تو اچھے اچھے لوگ ہیں مثلاً۔"

"آپ اچھے لوگوں کی فکر نہ کریں۔ ویسے میں نے آپ کو ان بندوں میں شامل نہیں کیا۔"

"مجھ پر یہ عنایت کیوں؟ میں تو غالب پرست ہوں۔"

"آپ کی جگہ اصلی ٹیوٹر نے رکھی ہے۔"

"تو مولوی عبدالرحمٰن کو آپ الو سمجھتی ہیں؟"

"غالباً ان کا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"

"محترمہ! ٹیوٹر اور الو؟"

"جی ہاں، وہ تہہ دل سے معتقد ہیں۔"

"اور ہم ___؟"

"آپ کی اور بات ہے۔"

" ہماری کہانی سنیے "

" بس آپ چند منٹ "

بڑی رعایت کی آپ نے ہمیں "

" تو آپ سنانا چاہتے ہیں کیا "

" ہم ہیں ہی سناتے ہیں "

" تو چلیے سیر کریں پہاڑوں کی پیالوں پر "

" اور اگر یہاں آنا چاہیں تو "

تو براہ مہربانی بہر صورت ٹیکسی میں مل کر آئیں "

ساتھ ہی رضیہ نے ہماری ٹوپی سے کر اچکن کے پچھلے رستے تک دیکھا اور بے اختیار

ہنس دی لیکن اسی میں ساتھ والے کمرے سے بیرسٹر صاحب کی آواز آئی۔

" بیٹی رضیہ آپ کی ٹیوشن کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب آئیے باہر چلیں "

تو جا رہی ہوں بیرسٹر صاحب خدا حافظ "

گویا آپ کا مطلب ہے کل نہ آؤں "

" اب اتنے جا رہی رہتے کل آئیے پرسوں آئیے اور آتے ہی رہیے "

" پرسوں تو مولوی صاحب آ جائیں گے "

" البتہ ان کی والدہ کو دو دن غصہ کرتا دیے دے گا "

اتنے میں بیرسٹر صاحب کی بجائے ان کا چہرہ نمودار ہوا اور میں نے آہستہ سے

خدا حافظ کہہ کر رخصت لی۔

دوسرے روز ہم گرتے پڑتے مل کر پڑھانے گئے سبق تو دوسرے شعر سے سب آگے

نہ پڑھا۔ لیکن ٹیوشن مجموعی طور پر کامیاب رہی تیسرے دن مولوی صاحب آ گئے

اور ہمیں دوستوں نے آگھیرا کہ دو دورہ ٹیوشن کی روداد سناؤ ہم نے روداد سنائی

تو اس پر ہماری کلاس کے، دس مسخرے لطیف نے ساری کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے

بلند آواز سے کہا۔

" خاموش اور سنیے میرا ستاروں کا علم کہتا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر ہمارے

ہم جماعت کی شادی ہو جائے گی۔ بتاؤ اس کی دلہن کا کیا نام ہوگا "

تمام کلاس نے لطیف کے ساتھ ہم زبان ہو کر کہا۔

رضیہ "

اور یہ کہہ کر مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور اودھم مچایا

قاری محترم - کیا آپ کو بھی میرے ہم جماعتوں سے اتفاق ہے۔ سنیے۔ اگلے سال رضیہ

سچ مچ دلہن تو بنی لیکن ہماری نہیں، مولوی عبدالرحمٰن کی۔ حادثہ یہ ہوا کہ ٹیوشن کے

بعد مولوی عبدالرحمٰن اور ہم سی ایس پی کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور

مولوی صاحب یہاں بھی ہمیں دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کامیابی کے بعد ان کے

لیے رضیہ سے شادی میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور وہ مولانا کی نہ بڑھ جوتی پہلے

مائی کے ہاتھوں دور کرا دی۔ خوشی ہے اس لیے کہ بقول مولوی صاحب ایک دن

انہوں نے کالی آنکھ سے رضیہ کو دیکھ لیا تھا اور دل میں عہد کر لیا تھا کہ داڑھی کیا چیز

ہے یہ تو دل تک تیار ہیں۔ اُدھر بیرسٹر صاحب تو مولوی عبدالرحمٰن کے نام کے ساتھ

ہی ایس پی دیکھ کر اس قربانی پر بھی مصر نہ تھے۔ رہے ہم تو جوں ہی مولوی صاحب

اپنی دلہن کو لے کر سپی ہوں، پر روانہ ہوئے ہم دلوا لی غالب کھول کر ایک لاجواب

غزل الاپنے لگے

کہ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا **

---

# دورانِ تعلیم، سیاست میں حصہ لینے کے آپ کس قدر حامی ہیں؟

حامی تو ہیں قدرتی بات ہے (فرح نوئین فارمیسی)

دورانِ تعلیم صرف محبت کی سیاست ہو (دینار بخاری - زوالوجی)

سیاست میں مت حصہ لو (فرمان علی زوالوجی)

تعمیری سیاست میں بھرپور حصہ لینا چاہیے (رئیس ساجد سوشیالوجی)

معمول کے جائز کی حد تک (الیاس شیخ - زوالوجی)

اس حد تک کہ تعلیم متاثر نہ ہو (مرزا ارشد اردو)

تعلیم و سیاست کا تعلق چولی دامن کا ساتھ (خالد حسن فلسفہ)

قومی مسائل میں بھرپور سیاست میں حصہ لینا چاہیے (محمد اسلم ریحانی)

میں بالکل مخالف ہوں (عتیق السلام سائنسات)

جمہور کے اعلیٰ میں ارباب سیاست (قاسم عباس تاریخ)

سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہیے (مسعود حسن [illegible])

کبھی حامی ہوا کرتا تھا (شوکت رانا فارمیسی)

جس سے پڑھائی کا نقصان نہ ہو (وقار احمد فزکس)

جائز حد تک (اکرم آرائیں فارمیسی)

طلبہ سیاست میں بھرپور حصہ لیا جائے (شاہد چوہدری عمرانیات)

با صلاحیت ووٹر کی حد تک (محبوب خان انگریزی)

تعلیم کی صحت مند سیاست ہے (جاوید اقبال سٹی کالج)

سیاست شجر ممنوعہ نہیں (حفیظ احمد ہیلی کالج)

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ (ظفر اقبال - ایم بی اے)

جس قدر لسّی کے (مظہر اقبال اکنامکس)

حامی نہیں البتہ پرجوش مبلغ ہیں (خالد منصور کیمیکل)

[illegible]

# اکبر الٰہ آبادی اور نظامِ تعلیم

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

توپ کِھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

یہ طفلِ ناداں، غریقِ غفلت، ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے، نظر نہیں ہے، بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

## عِلم

عِلم وہ خوب ہے جو حسنِ عمل تک پہنچے
ذوق قد خوب کہ جو رازِ ازل تک پہنچے

انسان سے یا بہت سے دلوں کو ہلا سکے
یا کوئی شئے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

اک علم تو ہے بُت بننے کا، اِک علم ہے حق پر مٹنے کا
اِس علم کی سب دیتے ہیں سند اُس علم میں ماہر کون کرے

## تعلیم

طاقت وہ ہے با اثر جو سُلطانی ہے
اُس جا ہے چمک جہاں زرافشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہُنر
اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

تعلیم و تربیت کا ہے اختلاف ہر جا
جو کورس ایک کا ہے وہ اور کا نہیں

دینی طریق کو اب سمجھتے ہیں اک تماشا
کالج کے کورس پر ہم گرتے ہیں بے تحاشا

# مقاصدِ تعلیم

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے کیا امید ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے وطن ہے ماؤف

کون کہتا ہے کہ علم نہ پڑھو عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معالی کو نہ بھول
راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو پھر کون بتائے راہِ خدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا تائیدِ مسافر کون کرے

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں
ناز بے حد ہیں مگر غیرتِ اسلام کہاں

ہم میں وہ خوبی و نکوئی نہ رہی
پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس اک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کارند
تا تو پا سے بکف آری وکنی عہدہ پری
طاعتِ حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے
شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

مسجد نے کہا میرا فسانہ بھی ہے اِک چیز
کالج نے پکارا کہ زمانہ بھی ہے اِک چیز

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظمِ ملت بی۔اے میں صرف روٹی

ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ تم اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز
گو کہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

صیاد ہنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے
بلبل کے لیے کیا مشکل ہے اُلّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

# جدید نظامِ تعلیم

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ طفلِ ناداں غریقِ غفلت ہوئے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

علوم ان کے، زباں ان کی، پریس ان کے، لغات اُن کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات اُن کے

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
یوں قتل سے بچوں کے، وہ بدنام نہ ہوتا

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

اغیار کے عمل کو ہوں گے کچھ اور میداں
ہم کو تو اب فلک نے کالج پہ رکھ لیا ہے

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

سند مجھ کو ملی تو جل گئے واعظ کہنے لگے
خوشی کی ہو گئی تکمیل باقی صرف لڈا ہے

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

تعلیم جنہوں نے پائی ہے وہ یہ تو نہیں ہیں بے حس ہیں
دعوے جو ہیں سمِ مذہب کے سب ان کے یہاں سے ڈسمس ہیں

مسٹر لفتلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی
سر پہ اس کی نامناسب ہے بلی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس
چارہ کیا تھا اے خدا۔ تعلیم ہی ایسی ملی

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

پڑھ کر انگریزی میں دانا ہو گیا
علم کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لُٹ گئے
واں نہ پہنچے اور [illegible]

مرزا غریب چُپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

کالج سے جنھیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے
مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

طفلِ مکتب کہ سخن بازِ زباں می گوید
شکوہ کم کن کہ چنیں گفت چناں می گوید
طبع او خود نو گُاف است دگردش سبقش
آں چہ بستند بروِ نقش ہماں می گوید

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا
قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایہ
کہتے تھے وَلد کو لوگ سِرُّ لابیہ
سِرُّ للماسٹر کا اب وقت آیا

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپہ شکسپیر
پڑھوگے حضرتِ سعدیؒ کی بوستاں کب تک

سعادت روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اِس بات کا ماہر نہیں ہوتا

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل
تمہارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

کہاں جہنّم و جنّت، کہاں عذاب و ثواب
دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں میں دھوم ہے
مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اِک دامِ بلا ہے
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے

حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پہ گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اُٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

وعظ کالج میں جو کہہ آتے ہیں اکبر اکثر
کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

نہ علمِ دیں ہے کہ راہِ خدا کے ہوں ہادی
نہ توپچی ہیں کہ زد میں رہے سب آبادی
گریجوئیٹ ہیں، کھاتے ہیں اور تنتے ہیں
بناتے اپنوں کو ہیں، دشمنوں سے بنتے ہیں

مذہب سے بے خبر ہیں، ہے ترک ان سے عربی
اسکول کی گرامر رٹنے میں عمر گذری
ہو ابن کا سبق ق اور بنت کا سبق قی
اس وقت میں کہوں گا تقوے کی ہے ترقی

ظاہر ہوئی کیشِ د کالج کی اک لکیر
آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

کہتے ہیں لڑکے بھی مگر کالج سے فرصت ہے کہاں
یہ ساری باتیں اک طرف اور پاس ہونا اک طرف

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیے

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر بستی
تال ہے ذکر ترقی سم ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دل سے ان کے یوں ہی گر مٹی
مسلم اُٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی

بزرگانِ ملت نے کی ہے توجہ
کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دبِ ہر گی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

دیکھ آئے قوم سُنتے تھے جسے
چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
بار آور پارک میں یہ ہوں گے کیا
گملوں ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے حج ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

## قدیم تعلیم

یہ اتنی گوشمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی
زبان آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے

مغرب کے مُرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر لے

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور ملیٹوں کی
سہی ہے تو بس علمِ دین و تقوے کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

## اساتذہ

نہیں اہلِ یقیں جب وہ تو یہ کیا مذہبی ہوں گے
اثر پڑتا ہے شاگردوں پہ استادوں کے باطن کا

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

ماسٹر صاحب کا علم اس وقت گو ہے نیک نام
اہلِ دانش میں مگر میرا فزوں ہے احترام
بات بالکل صاف ہے پیچیدگی کچھ بھی نہیں
میں ہوں سعدیؒ کا بھتیجا وہ ہیں ملٹن کے غلام

# تعلیمِ نسواں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش میں جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

کالج بنا عمارتِ فخر النسا بنی
شکرِ خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی
بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا
جن کو یہ ڈر ہے ان کی تو جانوں پہ آ بنی
لیکن نگاہِ نبض شناسانِ وقت میں
امراضِ قوم کے لیے عمدہ دوا بنی

مناسب ہے نئی تعلیمِ نسواں
یہی راہ آپ اب بے رد و کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی اک بات
میاں بدلے تو بیبیاں کیوں نہ بدلیں

مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو
[illegible]

[illegible]

تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

کر لیا بی بی نے ان کی انٹرنس اس سال پاس
والدہ صاحبہ تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

مغربی علم و ہنر تو خوب ہے اکبر مگر
اپنی اس تعلیم پر ہم آفریں کیوں کر کریں

لڑکے نئے طریق کی جانب جو کھنچ گئے
بوڑھوں کی آہ جانبِ چرخِ کہن گئی

تہذیبِ قدیم کے جب امکان تھے چیت
ملکی حالات سب رہے صاف و درست
تعلیمِ جدید نے کیا فتنہ بپا
اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت

مغربی تعلیم سے دلِ ایشیا کا ہے ملول
[illegible]

میں پرستش ہے مس گو آپ بی اے ہیں کہ ایف اے ہیں
یہ ہے جب رنگ دنیا کا تو سیکھیں علم دیں کیوں کر

نئے گملوں میں پڑ کر پھول جانا
خدا اور آنحضرت کو بھول جانا
بہت بے جا ہے یہ واللہ اکبر
ذرا سُن لو تو پھر اسکول جانا

اِک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا
اِک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ سایے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا
کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں
باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
بیزار وہ بت کلب میں یہ بن گئیں آیا
بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جب ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ
آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علومِ ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے
تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالق سے لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں
لندن کے بھی رسالوں میں گو مس نے سہی پڑھا
مطلب سے رکھنا چاہیے لیڈی کو سلسلہ
پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلیدِ مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

# امام غزالی کا تصورِ تعلیم

حسن نواز تارڑ
(صحافت)

عالم کے لیے مناسب ہے کہ وہ علمی مسائل کا مطالعہ کرتا رہے اس کا ذہن علم سے کٹ کر نہ رہ جائے علم بہت مشکل سے حاصل ہوتا ہے لیکن ذرا سی غفلت سے بہت جلد ذہن سے نکل جاتا ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے علم کی مصیبت نسیان ہے صاحبِ ایمان کے لیے تحصیلِ علم جس قدر ضروری ہے اسی قدر اس پر عمل کرنا بھی لازمی ہے بزرگوں نے تکمیلِ علم کے چار مرحلے بیان کیے ہیں :

(۱) طالب علمی کا دَور (۲) مکمل عالم ہو جانے کا دَور (۳) حاصل کردہ علم سے خود فائدہ اٹھانے کا دَور یعنی اپنے علم پر پہلے خود عامل ہونا (۴) علم کو دوسروں تک پہنچانے کا دور۔

عالم باعمل کی مثال ایسی ہے جیسے سورج کہ خود بھی روشن ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرتا ہے اور عالم بے عمل ایسا ہے جیسے چاقو چھری تیز کرنے کی سان کہ اوروں کو تیز اور دھار دار کاٹنے کے قابل بناتی ہے مگر خود کاٹ نہیں سکتی وہاں خداوندی ہے تم دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ دوسروں کی تو اصلاح کرتے ہو اور اپنی اصلاح سے غفلت برتتے ہو ایک جگہ ارشاد فرمایا كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اللہ کی نظر میں یہ بات بڑی ہی بھاری ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر خود عمل پیرا نہیں ہوتے گویا تمہارا اپنا عمل تمہارے قول کی تردید کر دیتا ہے قول و عمل کا یہ تضاد تو طالب علموں پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ ان کے اندر منافقت اور دو رنگی جنم لینے لگتی ہے۔

حدیث میں ہے قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو دیا جائے گا جس کو اللہ نے اس کے علم سے فائدہ حاصل کرنے سے محروم رکھا۔

ایک شخص نے ابو ہریرہؓ سے عرض کیا میں علم حاصل کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈر ہے کہ شاید عمل نہ کر سکوں

فرمایا تو پھر تیرے لیے علم نہ سیکھنا بہتر ہے۔

حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا ایک مرتبہ خرابی ہے اس شخص کے لیے جو علم حاصل نہیں کرتا اور سات مرتبہ خرابی ہے اس شخص کے لیے جو علم تو حاصل کرتا ہے مگر اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔

عالم سے جب کوئی بات پوچھی جائے، تو علم نہ ہونے کی صورت میں غلط سلط بتا کر پوچھنے والے کو گمراہ کرنے کے بجائے بلاتکلف کہہ دے "میں نہیں جانتا"

## طالب علم کے آداب

طالب علم سب سے پہلے اپنے اُستاد کو سلام کرے۔ اس کے سامنے بات چیت کم کرے استاد کھڑا ہو، تو وہ بھی کھڑا ہو جائے۔ استاد جب خطاب کر رہا ہو، تو نہ ہنسے نہ مسکرائے اگر وہ گھر جا رہا ہو، تو جب تک گھر نہ پہنچ جائے راستے میں اس سے کوئی بات نہ پوچھے استاد کے سامنے نہ بولنے کا مقصد یہ ہے کہ شاگرد ہمہ تن گوش اور یکسو ہو کر استاد کی بات سنے اور اس سے اچھی طرح استفادہ کرے بزرگوں نے کہا ہے، انسان استاد کے سامنے اس نرم زمین کے مانند ہو جائے جس میں بارش کو قبول کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے ادھر مینہ برستا ہے ادھر وہ سارے پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

اُستاد کے سامنے عجز و انکسار کا پیکر بن کر بیٹھے اُستاد کا دل سے احترام کرے، اس کے مزاج اور وقار کو ملحوظ رکھے۔ اپنے آپ کو بیمار جانے اور اُستاد کو طبیب حاذق۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے؛ شاگرد پر استاد کا حق یہ ہے کہ اس کے بھید کو نہ کھولے، اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے، اس کی لغزش کی تاک میں نہ رہے اور اگر لغزش ہو بھی جائے تو اس کو معذور جانے اس سے آگے بڑھ کر نہ بیٹھے اور اگر اسے کوئی حاجت پیش آئے، تو اس کی حاجت روائی میں سب سے سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔

## معلّم کے آداب

پہلے استاد خود اپنی اصلاح کرے، کیونکہ طالب علم اس کے کردار سے متاثر ہوں گے اچھا کردار ہوگا، تو یہی روش اختیار کریں گے، بدعملی کو اپنائے گا، تو طالب علم بھی اس کے نشانِ قدم پر چلیں گے شاگردوں کو ادب سکھانے کے لیے استاد کا خود بھی باادب ہونا ضروری ہے ان کے سامنے وقار کو ملحوظ رکھے اور کسی سے ہنسی مذاق نہ کرے، ورنہ وہ گستاخ اور بے حجاب ہو جائیں گے وقت بے وقت مار پیٹ سے کام نہ لے، طالب علم شور کرنے کے بجائے اور بگڑ جائیں گے شاگردوں کے غلیظ باتوں سے پرہیز کرے انہیں ایک دوسرے کی جاسوسی کرنے اور لوٹ کھانے سے روکے۔ انہیں غیبت اور بدگوئی کا عادی نہ بننے دے خود بھی جھوٹ، چغل خوری، تکبر اور غرور سے دامن بچائے اور اپنے شاگردوں کے دل میں بھی ان کی نفرت پیدا کرے، اخلاقی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے

الطاف حسن قریشی

## پاکستان کا وفادار ساتھی

# عبدالمالک شہیدؒ

پاکستان سے حوالوں کی سرحدوں سے نکل کر حقیقتوں کی طرف سفر کر رہا تھا اس وقت اسلامیہ کالج لاہور کے سترہ سالہ طالب علم عبدالمالک نے اپنا خون سحر میں گوندھا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے لالہ و گل اگنے لگے، درخت سایہ دار ہوئے اور پاکستان خوش رنگ بیل کی طرح شاخ شاخ زندگی پر نمودار رہا اور کروڑوں مسلمانوں کی بے مثل قربانی کے نتیجے میں ایک ولولۂ تازہ عطا کر گیا۔

عبدالمالک، پاکستان کے سفر کا سب سے مضبوط اور سب سے زیادہ وفادار ساتھی رہا۔ اس کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تو کوئی نہ کوئی عبدالمالک سربکف نکل آیا اور خون کے اجالوں سے ظلمتوں کے سائے دور کر دیے اور یوں حب الوطنی کا ایک نیا معیار ابھر آیا اور ابھرتا ہی رہا اور ادھر لٹیرے بھی قیامت کی چالیں چلاتے رہے اور پاکستان کا سفر کشمکش و تصادم کا سفر بن گیا کبھی اہل دغا غالب آ گئے اور کبھی اہل نظریات کھا گئے۔ بگڑے دلوں والوں کے سمجھداروں میں اور لیڈروں کی طلب گاریوں میں اور شکست و ریخت کی اندھیاروں میں عبدالمالک کا عزم، اس کی استقامت اس کا دیوانہ پن اور اس کے خواب مسکرائے، جھلملائے اور گنگنائے اور سرخیوں سے وطن کے نام و در ترئین کرتے رہے

آج ہم یہی داستانِ سرفروشی اور حکایت خود گمی بیان کرتے ہیں۔

پاکستان کے اندر سب سے پہلے، پاکستان ہی کے خلاف طوفان اٹھنے لگا تھا وہ لادینی اور اشتراکی عناصر جو اسلام کو اس کی عظمت، اس کی تاریخ اور اس کے شکوہ حکمرانی سے محروم کر دینا چاہتے تھے مسلم لیگ کی عدیم المثال مقبولیت کے پیش نظر اس میں شامل ہو گئے اور جب اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آئیں، تو پہلے دبے دبے اور پھر کھلم کھلا لادینی نظام کی باتیں کرنے لگے اقتدار سے وابستہ رہ کر اس عنصر نے اپنے لیے کام کرنے کی بنیادیں بھی قائم کر لیں اور حکومت کے اندر تعلقات کا جال بھی بچھا دیا۔

اسلام کے انقلابی تصور حیات اور اس کے مکمل نظام زندگی کے خلاف، بغاوت کے آثار سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں عوامی رنگ میں ظاہر ہوئے، عوامی مسلم لیگ کے نام سے "مسلم" کا لفظ نکالنے کی کامیاب کوشش اسی بارود میں ہوئی۔ ایک مؤثر طبقہ دین اور سیاست کی علیحدگی کا تصور مانند کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہی سیاسی تصور تھا جس کے خلاف علامہ اقبالؒ اور سید مودودی نے زبردست فکری جہاد کیا تھا۔ یہ فکری جہاد بدقسمتی سے بنگلہ زبان میں منتقل نہ ہو سکا اور مشرقی پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ اسلام کے عالمگیر تصورات اور اس کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام کے فلسفے اور بنیادیات سے آگاہ نہ ہو سکا۔ وہاں اسلام دینی مدرسوں کے علما اور روحانی پیشواؤں کے ذریعے پھیلا تھا جنہوں نے اپنے اخلاق حسنہ کی تاثیر قوت سے دل تو مسخر کر لیے مگر ذہنوں کو وافر غذا فراہم نہ کر سکے، چنانچہ یوں ہی دل پر عقل کا غلبہ ہونے لگا ذہن کا شعوری ڈھانچہ متزلزل ہو گیا اور سیاسی اور اقتصادی زندگی میں مغربی تصورات در آئے اور تہذیبی اور ثقافتی میدانوں میں ہندوانہ نقش و نگار پھیلتے چلے گئے

مشرقی پاکستان کے نوجوانوں میں اسلام سے منحرف ہونے کے اور بھی عوامل تھے جن کا تفصیل سے ذکر اس وقت مقصود نہیں مگر سب سے نمایاں سبب اسلامی لٹریچر کی کمیابی یا بے رونقی تھی۔ وہاں کی فکری اور جذباتی زمین بہت زرخیز تھی اور آج بھی بڑی زرخیز ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں صحت مند بیج پڑ گیا، وہاں ایسے ایسے شاہکار پیدا ہوئے جن کے عشق طاہر نے اسلامی تاریخ کا سب سے ایمان و رت تازہ کر دیا اور وہاں جو اسلامی انقلاب کے تقاضوں سے آشنا ہو گئے، وہ اسی کے ہو رہے اور اپنی ساری جوانیاں صلاحیتیں رضائے الٰہی کو نظر کر دیں۔ زبردست ثقافتی یلغار کے آگے اسلامی قدروں اور روایتوں کے چراغ اسی لیے جلتے رہے کہ انہی دیوانوں کا جیتا جاگتا خون شامل رہا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی ایک عرصے سے بنگلہ قومیت اور لادینیت کی آماجگاہ بن گئی تھی اسلامی ذہن رکھنے والے اساتذہ سمٹتے اور دبکتے چلے گئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اسلام جو خدا کے سوا کسی سے ڈرنا نہیں سکھاتا اور جس کے مسلک میں بے ہمتی، بے چارگی اور بے بسی حرام کے دائرے میں آتی ہے، اسی دین کے دانشور شیدائی پاکستان میں بے حوصلہ، ڈرپوک اور بزدل کیوں ہیں۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی اہل علم نے کسی جرأت اور صحافت کا اظہار کیا، مگر مشرقی پاکستان میں بیشتر فرزانوں کو دیوانگی سے محروم پایا اور وہ احساس خودداری حق کی لذت سے ناآشنا ہیں اور زندگی کا محض مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں عصبیت سے بے دھڑک کام کرتے ہیں اور بے لگام رہتے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں جب بنگلہ قومیت در و دیوار سے چمٹنے لگی اور اسلامی ذہن پر کاری ضربیں پڑنے لگیں اور پاکستانی تاریخ اور پاکستانی تحریک نگاہ کا کانٹا بن گئی تو نوجوان طلبہ کا ایک طبقہ غیرت و حمیت سے سرشار میدان عمل میں کود پڑا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں دوسری بار مارشل لا نافذ ہو چکا تھا اور یحییٰ خاں بھی اصلاحات کا بار بار ذکر کر رہے تھے جن کے سہارے گیارہ برس پہلے ایوب خان صاحب نے اپنی مسند اقتدار سجائی تھی، ایئر مارشل نور خاں تعلیمی تجاویز کا اعلان کر چکے تھے ان میں بعض باتیں بہت اچھی تھیں مگر ان کی پرداخت اس سے کسی طرح کم نہ تھی تاہم یہ بھی جانتے تھے کہ تعلیمی تجاویز اتنی معیاری کم اور انقلابی ہوں کہ ہر فرد یاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس کرے اور ایک زلزلہ سا آ جائے اور پھر

کچھ دیر کی گہما گہمی کے بعد ساری باتیں دفن کر دی جاتیں۔

اس تاریخی واقعے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایئر مارشل نور خان تعلیمی سفارشات کا اعلان کرنے کے بعد جٹ کی سی رفتار سے ڈھاکہ پہنچے اور یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا سے مختلف اداروں میں ملے۔ ان میں عوامی لیگ یعنی لادینیت اور چھ نکات کا نقطہ نظر جاری و ساری تھا۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اسلامی ذہن رکھنے والے طلبا کو ایک فاصلے پر رکھا اور انہیں ایئر مارشل نور خان کے قریب نہ آنے دیا۔ مگر اس پر یونیورسٹی میں ہنگامہ اٹھا اور پہلی بار لادینی قوتوں نے محسوس کیا کہ وہ جس کو بے دم سمجھتے تھے اس میں ابھی دم خم باقی ہے۔ بلکہ اس نو پیدا ہوا سے ہنگاموں کے نتیجے میں مسلم قومیت پر یقین رکھنے والے طلبا بھی ایئر مارشل نور خان سے ملے اور انہیں اپنے احساسات اور مطالبات سے پورے وزن کے ساتھ آگاہ کیا۔ طلبا نے سلیقے سے اپنے مطالبات لکھے ہوئے تھے اور ان کے حق میں سنجیدہ و مدلل اور باوقار دلائل دیے گئے تھے۔ نوجوان طلبا کی شائستگی، حب الوطنی کے جذبے سے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب نور خان بہت متاثر ہوئے مگر اکثریت کا ذہن وہ نظر انداز نہ کر سکے اور ہماری اطلاعات کے مطابق طلبا سے چھ نکات کے عملی امکانات اور مضمرات پر ارجو باتیں کرتے رہے۔ ہو سکتا ہے اس بات کا مقصد حقیقی مسائل کو سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا ہو مگر طلبا پر اس کا یہ اثر مرتب ہوا کہ انہوں نے اسے مرکزی حکومت کی شکست پر محمول کیا۔ چنانچہ ان کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے مارشل لاء کی موجودگی میں اسلام کے احساساتی قلعے پر آخری ضرب لگانے کا پروگرام بنایا۔

فیصلہ کن لمحات قریب آ رہے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعلیمی سفارشات پر مذاکرے کا اہتمام ہوا۔ اس کے لیے ۱۲ اگست کی تاریخ مقرر ہوئی یعنی اس تاریخ سے صرف دو دن پہلے جب پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اخبارات میں مذاکرے کی خبر شائع ہوئی کہ میرے سینے میں نامعلوم سا اضطراب ابھرنے لگا۔ میں یونیورسٹی کی فضا سے پوری طرح باخبر تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔ یہ اہتمام خالی نہیں۔ بندگی کی بہار لوٹنے کا بہانہ ہے۔ سخت بے چینی کے عالم میں شعور و آگہی کے کانٹے چبھتا رہا اور پھر وہی ہوا جو اپنا مقدر بن چکا تھا۔

۱۲ اگست ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں سب سے بڑا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جو مشرقی پاکستان کا مقدر قرار پایا۔ بات یہ طے ہونی تھی آئندہ ملک کا تعلیمی نظام اسلامی خطوط پر مرتب کیا جائے یا اسے سرتاپا لادینی بنا دیا جائے۔ نظام تعلیم اگر ایک بار سیکولر قرار پا جاتا ہے، پھر اسلامی دستور، اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کی تمام امیدیں اور آرزوئیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔

یونیورسٹی کے اسی مذاکرے میں مشرقی پاکستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں گہری دلچسپی لے رہی تھیں۔ بعد کے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی طاقتیں بھی اس مذاکرے کو سیاسی بیرومیٹر سمجھتی تھیں اور انہوں نے اپنے اپنے زاویوں سے نتائج کی راہیں تیار کی تھیں۔

اس مذاکرے میں سید و طلبا، و اساتذہ پس منظر میں غیر معمولی طور پر مستعد تھے۔ وہ مسلمان طلبا جو برسوں سے اسلام کا مذاق اڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اب جو اسلام کا گلا دبانے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ فضا اتنی ناگوار اور زہریلی تھی کہ اس میں صحت مند آدمی کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ اسلامی ذہن رکھنے والے طلبا کو بتا دیا گیا تھا کہ معرکہ کربلا دوبارہ پیدا ہونے والا ہے۔!

اس روز یونیورسٹی میں ہزاروں طلبہ امڈ آئے تھے۔ تلواروں کی دھاریں اور چھروں کی تیزیاں جوبن پر تھیں۔ آنکھوں میں نفرتوں کے انگارے دہک رہے تھے۔ سانپوں اور اژدہوں کی پھنکار بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے حرکت میں آ چکے تھے اور اسی مذاکرہ شروع ہو رہا تھا۔

اور پھر وہ مذاکرہ شروع ہوا جس میں اسلامی جمعیت طلبہ کے نمائندوں کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک بائیس سالہ طالب علم شمس الضحیٰ (سوشلسٹ لیڈر مجاہد ویگ (E P S L) کے رہنما) نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

- ہم اسلامیات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، ہمیں لادینی نظام تعلیم چاہیے"

اس پر غیرت عمرؓ کے وارث عبدالمالک نے اٹھ کر کہا۔

"یہ ہمارے دلوں کی آواز نہیں۔ ہم تو زندہ ہی اسلامی نظام تعلیم کے لیے ہیں"

اس اعلان حق پر یونیورسٹی کی فضا یکسر بدل گئی۔ ایمان کی والہانہ کیفیتیں شباب پر آ گئیں۔ لادینی قوتیں حالات کا رُخ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں اور جب عبدالمالک اپنے چند رفیقوں کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر نکلا، تو گھات میں بیٹھی ہوئی لادینی قوتوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ عبدالمالک کے سر پر لوہے کی سلاخ سے کاری ضرب لگی، خون کا فوارہ پھوٹا اور حق کی شہادت دے گیا۔ اسے ہسپتال میں لے جایا گیا، مگر ڈاکٹر نے سیاسی تعصب کی بنا پر طبی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ عبدالمالک کا خون بہتا رہا، بہتا رہا اور پھر وہ منجمد ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم بیٹھے ہی منجمد ہیں۔

قانون کے محافظ تماشا دیکھتے رہے۔ بے جان اور بے غیرت مارشل لاء اور ٹھٹھر گیا۔ وہ بالکلیہ سنگینیں اور شین گنیں دن کی روشنی میں پتھروں سے کچلے ہوئے معصوم عبدالمالک کی حالت دگرگوں اہم کار و قسموں کے آگے سرنگوں ہوتیں۔ وہ افسر اور وہ جوان، جو جوں ناحق پر خیمہ سادھے رہے ایسی عزت اور غیرت کی رسوائی کا سبب بنے جن اور بے رحم اور تنگ دل قیادت فطرت کے کوڑوں کی زد میں ہے اور جس تاریخ اس سے کب تک انتقام لیتی رہے گی۔ عبدالمالک کی شہادت پر اگر اہل درد جاگ اٹھتے، اہل دل آگے بڑھتے اور قانون اور انصاف حرکت میں آتا، تو پاکستان کا وجود مندمل نہ ہونے والے زخم سے بڑی حد تک محفوظ رہتا۔ قوم نے اس وقت جس کھلنڈرے پن کا مظاہرہ کیا اور عبدالمالک کے زخم کو اپنا زخم نہ سمجھا اور پیسے والے جن سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اس کا انجام سب کے سامنے ہے۔ المناک انجام جس سے تاریخ بھی لرز اٹھی ہے اور فطرت کا توازن بگڑ گیا ہے

مشرقی پاکستان میں عبدالمالک نے اپنے خون سے لادینیت کے سیلاب کے آگے دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس نے اس نظریے اور عقیدے اور قلعے کے لیے جان دی جو دونوں بازوؤں کے درمیان محبت اور یگانگت کا حقیقی رشتہ استوار کر سکتا تھا، مگر بے رحم انسانوں نے اس ایثار کا مذاق اڑایا۔ سیاسی پھبتیاں کسیں۔ جوں آتشیں حملے کیے اور پھر ان حملوں کی زد میں وہ مارک بستہ بھی آ گیا جو دونوں بازوؤں کو یکجا رکھے ہوئے تھا۔

پاکستان کا وجود منتشر ہو گیا، اس کا سفر بکھر گیا اور صفیں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہیں۔

***

# آخری خطاب

(یہ وہ یادگار تقریر ہے جو عبدالمالک شہید (طالب علم بائیوکیمسٹری آنرز ڈھاکہ یونیورسٹی، ناظم اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ) نے 'نئی تعلیمی فارمولا" پر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA) کے منعقد کردہ مجلس مذاکرہ میں (اگست ۱۹۶۹ء ڈھاکہ) کی، جس کے چند روز بعد قوم پرست کمیونسٹوں نے عبدالمالک کو یونیورسٹی کیمپس میں شہید کردیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تقریر (NIPA) کے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ محمود)

صدرِ محترم

اس وقت یہاں نئی تعلیمی تجاویز کی نظریاتی بنیادوں پر گفتگو ہو رہی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جن حضرات نے یہاں اس مذاکرہ میں حصہ لیا ان میں سے اکثر نے اصل موضوع سے ہٹتے ہوئے بہت سی غیر ضروری باتوں کو بھی چھیڑنے سے گریز نہیں کیا اور کچھ دانشور حضرات نے لفظ ثقافت پر گفتگو فرماتے ہوئے "ثقافت" سے "یکساں ثقافت" SINGLE CULTURAL PATTERN مراد لیا ہے حالانکہ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ مشترک ثقافتی اقدار کے معانی کبھی بھی "یکساں ثقافت" کے نہیں ہوتے۔

جہاں یہ "یکساں ثقافت" غیر فطری انداز میں معاشرے پر ٹھونسی جاتی ہے جس کی ایک واضح مثال سوویٹ روس کا معاشرہ ہے جہاں تمام ثقافتی اقدار کو مسمار کر کے ایک "یکساں ثقافت" تشکیل دی گئی، ہم بغیر کسی لگ لپیٹ کے یہ واضح کرتے ہیں یہ طریقہ غیر فطری ہے اور ہم اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے مخالف ہیں۔ ہمارا مطمح نظر اس پاکستان میں مشترک ثقافتی اقدار ہیں ثقافت کے نام پر ایک غیر فطری معاشرہ اور ایک غیر فطری نظام ہرگز ہرگز نہیں۔

اور جہاں تک آج کی مجلسِ مذاکرہ کے اس موضوع "کہ فی الحقیقت تعلیم کا مقصد کیا ہے؟" کا تعلق ہے اس سلسلہ میں میں کسی اور طرف جانے کے بجائے عظیم ماہرِ تعلیم ملٹن (MILLTON) کی صرف ایک بات کی جانب اشارہ کروں گا۔ اس نے کہا تھا:

"EDUCATION IS THE HARMONIOUS DEVELOPMENT OF BODY, MIND AND SOUL"

یہ جسم، یہ دماغ اور یہ روح کی متوازن ترقی (HARMONIOUS DEVELOPMENT) کسی نظریہ یا کسی آدرش کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ ہے وہ سوال جو میں ان حضراتِ گرامی سے پوچھنا چاہتا ہوں جو نظامِ تعلیم کو مثبت اور ہمہ گیر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے نظریاتی بنیادوں کی اہمیت سے انکاری ہیں۔

پھر اگلی بات جو آپ حضرات کے سامنے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ملٹن کے اس قول کو سامنے رکھتے ہوئے ایک زندہ قوم کے پیشِ نظر تعلیم کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ فرد میں صحیح متوازن جذبہ نسلی تعصبات سے پاک ملی تشخص پیدا کرے، مزید یہ کہ اس کی صحیح تشکیل کے ذریعہ ایک قومی فکر کا احیا ہو۔ ہر طلبہ کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے ایک مضبوط مشترک ثقافتی ورثہ اور اساسی نظریاتی بنیاد فراہم کرسکیں تاکہ اس رواں دواں زندگی میں روز افزوں برسات میں اگنے والے برساتی پودوں کی طرح کی اکاس بیل اس مشترکہ ورثہ کو متاثر نہ کرسکے، بلکہ اپنی کمزور بنیاد کے سبب اس کا حصہ بنتے ہوئے اپنے وجود کا خاتمہ کرنے ہی میں بھلا سمجھے۔

جو لوگ سیکولر یا لادینی نظامِ تعلیم کے خواہاں ہیں انہیں چاہیے کہ وہ عقل و خرد کی آنکھوں سے رات کے اندھیرے میں نہیں دن کے اجالے میں۔ مغربی سماج کی طرف دیکھیں۔ جہاں آزاد نظامِ تعلیم رائج کیا گیا اور اس کے متعلق وہیں کا مشہور فلاسفر اور ماہرِ تعلیم خود ہی بول اٹھا کہ

"تین قسم کی ترقی اہم ہے۔ علم اور تکنیک میں ترقی، انسان کی سماجی حیثیت میں ترقی۔ اور روحانیت و اخلاق میں ترقی۔ اور یہ آخری ترقی سب سے اہم۔ بنیادی اور ضروری ہے۔" !!

اس کے علاوہ مغرب کے مشہور و معروف دانشور مسٹر البرٹ شویزر (ALBERT SHAWAZAR) نے اپنی کتاب (TEACHING OF REVERACE FOR LIFE) میں اس بے دین، بے قید نظامِ تعلیم کو ایک نظریہ (آئیڈیالوجی) کے تحت استوار کرنے کا شعور دیتے ہوئے کہا ہے۔

"ہمارے اس دور کو روحانی اقدار کے احیاء کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک نئی تحریک نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE MOVEMENT) کی ضرورت ہے۔ ایسی نشاۃِ ثانیہ جس میں حضرتِ انسان نے یہ دریافت کر لیا ہو اور تمام ٹھوکریں کھانے کے بعد صدقِ دل سے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہو کہ۔ اخلاقِ عمل اور روحانی اقدار ہی دنیا کی سب سے اونچی۔ سب سے عظیم صداقتیں ہیں اور انہی کے ذریعہ۔ کرب و ابتلاء میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی انسانیت کی نجات ممکن ہے۔"

اس روحانی شاہراہ کے علاوہ انسانیت کی نجات کا کوئی اور راستہ ممکن نہیں! یہ بات مسٹر البرٹ نے جس قدر صاف اور بے لاگ پیرایے میں بیان کی ہے اس پر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اب اس سلسلہ پر مزید کوئی بات زیرِ بحث لانے کی گنجائش باقی نہیں رہی کیونکہ "جدت" کی عینک لگا کر معذرت خواہانہ انداز میں دلائل کی تلاش میں نکلنے والے متجددین کے سامنے۔ نام نہاد جدید۔ بے دین۔ مادہ پرست اور بے قید نظامِ تعلیم کے پروردہ عالم نے خود ہی ڈنکے کی چوٹ یہ اعترافِ حقیقت کیا اور مروجہ نظامِ تعلیم کی قلعی کھول کے رکھ دی ہے۔!

ہماری بدقسمتی ہے کہ ظہورِ پاکستان سے لے کر آج تک یہاں ایک بے دین، بے روح حتیٰ کہ خالص قومی بنیادوں سے عاری نظامِ تعلیم رائج ہے اور اسی نظامِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ اس نے آج یہاں ہمارے ہاں (MACULLAY'S BRAIN CHILDREN) (BROWN ENGLISHMEN) اتنی تعداد میں پیدا کر دیے ہیں جنہیں ہم سیکولر نظامِ تعلیم کی مالا جپتے ہوئے دیکھتے اور سنتے ہیں!

ہمیں بہرحال یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس نظامِ تعلیم کو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جب یہاں نافذ کیا گیا اور پھر جب یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کو سعید آقاؤں کی خواہش کے مطابق پوری طرح سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو تاجِ برطانیہ نے اس خلا کا جائزہ لینے کے لیے سر ولیم ہنٹر (W HUNTER) کو مقرر کیا، جس نے اپنی رپورٹ میں کہا؛

" THE TRUTH IS THAT OUR SISTEM OF PUBLIC INSTRUCTION IS OPPOSED TO THE TRADITION UNSUITED TO THE REQUIREMENT AND HATEFUIL TO THE RELIGION OF MUSSALMAANS"

جو دوست سوال کرتے ہیں کہ "اسلامی آئیڈیالوجی کیا چیز ہے؟" میں انہیں نہایت ادب سے کہوں گا کہ آپ براہِ کرم اس قدر بیگانگی کی بات کرنے کے بجائے ذرا سی تکلیف فرمالیں اور اسلامی نظریہ، اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں، مطالعہ کریں، تنقیدی مطالعہ کریں پھر بھی سوال کریں کہ تاکہ اسلامی نظریہ کیا ہے؟ جہاں اسلامی آئیڈیالوجی پر جس ثقافتی اقدار اور جس معاشرے اور سماج کی تعمیر کی گئی تھی وہاں یہ سرخ جنت روس کی مانند یکساں ثقافت جبراً مسلط نہیں کی گئی تھی، بلکہ مشترکہ سماجی اقدار کا نفاذ اور عملی ارتقاء مثبت رویوں کے ذریعہ معرضِ ظہور میں آیا۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں غیروں کی طرف دیکھ کر الٹی زقندیں لگانے کے بجائے اپنے روشن ماضی، درخشاں ورثے کو تسلیم کریں اور اس کا نفاذ کریں، تاکہ غلط معاملات طے کرنے کے لیے خوفناک سراب کی جانب لپکیں۔!

اگلی گزارش یہ ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لیے حاصل ہوا ہے اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے شیرِ بنگال اے کے فضل الحق نے مسلم لیگ پٹنہ کے اجلاس میں ۱۹۳۸ء کو فرمایا تھا کہ

"ہم (پاکستان میں) ایک اسلامی نظامِ تعلیم رائج کرنا چاہتے ہیں۔!"

یہی وہ . ..... ..... ۔!"

(تقریر ادھوری چھوڑنا پڑی چونکہ وقت ختم ہوگیا تھا)

***

• پروفیسر حمید احمد خاں (سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب)
• جسٹس اے آر کارنیلیس۔

# ذریعہ تعلیم ؟


## حمید احمد خاں
سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب


حقیقت یہ ہے انگریزی زبان کی تحصیل و تدریس پر زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے اور سچ پوچھیے تو میری معاش انگریزی زبان سے وابستہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ پاکستان میں جس قدر جلد ہم اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیں گے اتنا ہی زیادہ ہمارے لئے بہتر اور سود مند ہوگا۔ اردو کو بلا لحاظ علاقہ صحیح معنوں میں قومی زبان کی حیثیت دے دینا اپنے اندر بے شمار فوائد مضمر رکھتا ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس زبان کے ذریعے کم از کم مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے درمیان وحدت و یگانگت قائم کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اردو زبان کی ایک بین الاقوامی حیثیت بھی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمارے ساتھ وابستہ رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں معیار تعلیم یقیناً بہتر ہو جائے گا۔ اب تک صورت حال یہ ہے کہ طلبا بغیر سوچے سمجھے انگریزی کے فقرے رٹتے ہیں اور یہیں امتحان کی کاپیوں میں نقل کر دیتے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر طلبا کو اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ مہارت، ذہانت اور معقولیت کے ساتھ سوالوں کے جوابات دے سکیں گے۔ انگریزی کی بجائے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے جس میں ایک صدی سے مبتلا ہیں۔ جب تک ہم صرف انگریزی کتابوں کے ذریعے سے علم حاصل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم آزادی کے ساتھ سوچنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ ہمارے لئے ان تصورات اور معتقدات سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہونا قریباً ناممکن ہے، جو انگریزی کتابوں اور انگریزی تمدن میں سرایت کئے ہوئے ہیں خواہ بعض صورتوں میں یہ تصورات ہماری ملی روایات سے متصادم کیوں نہ ہوں۔ میکالے نے جب برصغیر میں انگریزی زبان کو ذریعہ تدریس بنانے کی سفارش کی تھی تو اس نے اس سفارش کے مقصد کو پیش کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "اس طریقے سے ہم ہندوستانیوں میں سے انگریز ذہن تیار کر سکیں گے"۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم نے نہ صرف ہمارے ذہنوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے بلکہ ہم اس احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ علوم و فنون کے سارے سرچشمے صرف یورپ میں ہیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جو قوم اس قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو وہ تحقیق و تخلیق کے میدان میں کب کوئی قدم اٹھا سکتی ہے۔

اردو زبان کی افادیت و اہمیت اتنی واضح ہے کہ اب کسی کو اس کے خلاف کھلم کھلا کچھ کہنے کی جرأت نہیں۔ تاہم اردو زبان کو تدریس اور دفتری زبان بنانے کے سلسلے کے معاملات پر چوٹ پڑتی ہے وہ مختلف حیلے بہانوں سے اردو زبان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اونچے سرکاری افسران یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اردو زبان کو دفتری زبان بنا لیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کے ماتحت کلرک ان سے زیادہ بہتر اردو لکھ سکیں گے اور یہ بات افسران کی اہمیت اور ان کے تفوق کے حق میں نہایت ہی مہلک ثابت ہوگی۔ موجودہ نظام تعلیم بنایا ہی اس اصول پر گیا ہے کہ ہر سال ایک ہزار کے قریب سی۔ایس۔پی آفیسر تیار ہوتے رہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے کلرک پیدا ہوں جو غلط انگریزی لکھیں تاکہ ان کے افسران ان کی غلطیوں کی اصلاح کر کے اپنے علمی تفوق کا رعب قائم رکھ سکیں۔

اس راہ کی دوسری بڑی رکاوٹ ہمارے اساتذہ ہیں جنہوں نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی، انگریزی زبان میں پرورش پائی، جنہیں وہ ہر سال طلبا کو لکھوا دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تدریس کے باعث کوئی طالب علم کسی استاد سے کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر کوئی سوال نہیں کر سکتا، کیونکہ اول تو وہ بات کو سمجھ ہی نہیں پاتا ہے اور اگر کچھ سمجھ بھی رہا ہو تو اسے سوال کرنے میں یہ خدشہ حائل رہتا ہے کہ کہیں وہ غلط انگریزی استعمال کر کے پوری جماعت کے لئے مضحکہ نہ بن جائے۔ یہ تمام باتیں استاد کو محنت و ریاضت سے بچائے رکھتی ہیں لیکن اگر اردو ذریعہ تعلیم بن جائے تو سب سے پہلے خود استاد کو اپنا موضوع اچھی طرح سمجھنا پڑے گا۔ پھر اسے اردو میں سمجھانے کے لئے اور بھی زیادہ محنت کرنا پڑے گی اور سب سے زیادہ نازک صورت حال کا سامنا اسے اس وقت کرنا ہوگا جب کوئی ذہین طالب علم سوال کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی مسلسل ریاضت و مشقت کا تقاضا کرتی ہے اور محنت و مشقت سے جی چرانا ہماری پوری قوم کا خاصہ ہو گیا ہے۔

عام طور پر اس بات اغیار کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس زبان میں درسی کتابیں موجود نہیں اور اس میں ہر موضوع کے مفاہیم و مطالب کے اظہار کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان میں ہر طرح کے علوم کو آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ درسی کتابوں کی کمی کی شکایت بھی کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ اول تو درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو چکا ہے اور مانگ کے بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ کام کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ درسی کتابوں کی فی الفور ضرورت نہیں۔ اگر اساتذہ اردو میں تدریس کا کام شروع کر دیں تو طلبا انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں سے از خود استفادہ کر لیں گے اور چند ہی سالوں کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں معیاری درسی کتابیں تیار ہو جائیں گی۔

یہ تمام باتیں اتنی صاف اور واضح ہیں کہ اوسط ذہن کا آدمی بھی انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن جب "عالی دماغ" حضرات ان حقائق سے پہلو تہی کرتے ہیں تو پھر عوام ان کی نیتوں پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو مجھے بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔

## اے۔ آر۔ کارنیلیس

آپ کے نظام تعلیم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اب بھی اردو زبان کو صرف ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ کسی زبان میں چند مضمون لکھوا دینے سے وہ زبان نہیں آتی۔ زبان اسی وقت آ سکتی ہے جب اس میں اور دوسرے مضامین بھی پڑھائے جائیں۔ جب تک اردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جائے گا موجودہ صورت حال میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ (HUMANITIES) علوم انسانی بڑی آسانی سے اردو زبان میں پڑھائے جا سکتے ہیں۔ انگلستان میں انگریزی کے ساتھ فرانسیسی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے، لیکن فرانسیسی زبان کی حیثیت وہاں ثانوی زبان کی ہے۔ یہ حیثیت پاکستان میں انگریزی زبان کو حاصل ہونی چاہیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ابھی تک انگریزی زبان سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کو عربی زبان میں علوم و فنون پڑھنے میں جو دقت پیش آتی ہوگی اس کا اندازہ میں اپنی ذات سے کرتا ہوں۔ مجھے اردو زبان پڑھنے میں اتنی وقت ہوتی ہے کہ جتنے وقت میں اردو کا ایک صفحہ پڑھتا ہوں انگریزی کے چھ صفحے پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ غیر مادری زبان میں انسان اپنا مافی الضمیر صحیح روح کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ انگریزی زبان میں مضامین پڑھتے ہیں تو آپ اصطلاحیں اور جملے کے جوڑے مفہوم کو سمجھے بغیر رٹ لیتے ہیں۔ آپ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ آپ نہ مفہوم سمجھ رہے ہوتے ہیں اور نہ سمجھنے پر قدرت رکھتے ہیں ........

زبان کا خیالات کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں، لیکن ہر زبان کا لفظ اپنا ایک تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتا ہے۔ جب آپ کسی زبان کا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو غیر شعوری طور پر اس لفظ کا پس منظر بھی جذب کر لیتے ہیں۔ یہ پس منظر آپ کے ذہن کو خاص خطوط پر ڈھالتا رہتا ہے اور بالآخر آپ اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں جو اس زبان کا تہذیبی اور فکری رنگ ہوتا ہے۔

## چند اقتباسات

"انگریزی ذریعہ تعلیم، شاگرد اور استاد دونوں پر شدید تعلیمی بوجھ ڈالتا ہے۔ انفرادیت کو سیج دیتا ہے، بے سمجھے رٹ لینے کی ہمت افزائی کرتا ہے، تعلیم کے عمل کو بے جان اور میکانکی بنا دیتا ہے اور دوسرے مضامین کے مطالعہ کے لئے بہت کم وقت چھوڑتا ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل ان کو غیر زبان سیکھنا۔ دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کا سیکھنا ہونا ہے اس بات پر اکثر بحث ہوتی ہے کہ کیوں سرکاری مدرسوں میں لیاقت کامل نہیں ہوتی۔

. . . اور کیوں وہ تعلیم انگلستان کے کالجوں کے برابر نہیں ہے؟ پس میری رائے میں اس کا سبب یہی ہے کہ انگلستان میں تعلیم ان ہی لوگوں کی زبان میں ہوتی ہے اور تمام علوم و فنون ان ہی کی زبان میں ہیں اور ہر وقت اور ہر محل پر ان کو اپنے علم کی ترقی کا موقع ہوتا ہے۔ برخلاف ہندوستان کے کہ ان کو دوسری زبان پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم و فنون کا گزر جاتا ہے۔"

"سر سید احمد خان"

وہ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک غیر ملکی زبان بہ ذریعہ تعلیم ہمارے طالب علموں پر بہت بھاری بوجھ ڈال دیتا ہے۔ زبان کے ہر قدم پر ایک شدید قسم کی رکاوٹ بنتا ہے اور ان کے سمجھنے اور جذب کرنے کی قوت کو گھٹا دیتا ہے۔ بہ کسی مضمون کی مبادیات کو سمجھنے، یا کسی بات کی تشریح پوچھنے کے بجائے زبان کی باریکیوں ہی میں اٹک جاتے ہیں۔ انہیں سب سے پہلے زبان کو سمجھنے کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اصل سبق کا نمبر آتا ہے۔ انہیں سبق کے ہر فقرے کو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنے کے پیچیدہ عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ان کا دماغ کچھ سمجھ نہیں پاتا اور سطحی معلومات کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔

---

ریاضی کو اردو زبان میں پڑھنے کی وجہ سے اس پر میری گرفت بہت مضبوط تھی، کیونکہ غیر مادری زبان مفہوم کی تہ تک پہنچنے میں مانع تھی۔ میری اپنی زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ اردو زبان صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے اور بعض مضمون کو سمجھنے کی قوت زیادہ کر دیتی ہے۔ آپ دور کیوں جائیے ہیں اپنے ملک کے مختلف تعلیمی اداروں کے تجربے سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔

ہمارے ملک میں پبلک اسکول کتنے طویل عرصے سے کام کر رہے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان اداروں نے ایسے افراد پیدا کئے ہیں جو تخلیقی ذہن رکھتے ہوں اور انہوں نے تحقیق یا علمی میدانوں میں کوئی قابل ذکر کام کیا ہو؟ مجھے یقین ہے کہ ان اداروں میں یہ صلاحیت اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ وہاں غیر ملکی زبان کا خول چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ خول شخصیتوں کو ایک خاص ڈھانچے میں تو ڈھال سکتا ہے لیکن اس میں گہرائی اور انفرادیت پیدا نہیں کر سکتا۔ انہیں لوگوں نے کچھ کام کیا ہے جو عام سکولوں میں پڑھے اپنے ہی ماحول سے وابستہ رہے اور اپنی ہی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان پبلک اسکولوں میں آپ کو دلوانے کہاں سے ملیں گے

قابل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی      کچھ ہوئے بھی تو یہی رند قدح خوار ہوئے

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

# لی ایلی۔ لما شبقتنی

جلتے بجھتے اس رات کے سایے تلے لمبے بالوں والے نوجوان نے
ایل ایس ڈی کا کیپسول منہ میں رکھا اور چلنے لگا۔
تاروں کی سڑک پر روشنیوں کی لکیروں کے درمیان ایک خوانچہ فروش بچے
نے پار کرنے کی کوشش کی، لیکن لمبی کار کی ہیڈ لائٹ کے آگے اس کا خون
آن سائن سا لگا۔
اگلی پچھلی گدی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے اپنے شیشوں سے شالیں سرکائیں۔
کڑے سے سرد پاسم کے آدمی نے اپنے پیلے دانت باہر نکالے کار کی ہیڈ
کی روشنیاں تیز ہو گئیں۔
کلب کے باہر لوگوں کا ہجوم آرکسٹرا کی دھن پر رو رہا تھا جو ماریک پر دوں میں دھندلائی نظر آ رہی تھی۔
دستکاری سکوں سے پیالے بیٹھوں میں ملبوس لڑکیاں ہاتھوں میں سارے کے سہارے پکڑے تھیں۔
نوجوان زندگی سے بیزار لے توجہی سے چلتا گیا۔
سیاہ پچھلی سڑک پر چلتے چلتے وہ شہر سے بہت دور نکل آیا، جہاں مٹی کی سڑک گزرے ہوئے قدموں کے نشان سنا رہی تھی۔
سامنے دریا کی لہروں کے ساتھ ساتھ معبد کے سنہری کلس کے سائے میں۔
رت گیری ساڑھی میں ملبوس صندلیں شانوں پر آسوسی بال بکھیرے اس
آئی۔
ون ہو تم؟ نوجوان نے پوچھا
دیوداسی!
میرے پاس آنے کا مقصد؟
میں معبد کے بڑے پجاری کا پیغام سنانے آئی ہوں کہ۔
سکون کی آشا چاہتے ہو تو آؤ میرے چرنوں میں پوتر ماحول کے باسی بن
میری جیسی سجاؤ گے!
لیکن یہ پیغام سناتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں۔ سمجھ
آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔
بھاگتے بھاگتے ان کے پاؤں سوج چکے تھے تھکن سے چور، وہ ایک جگہ گر پڑے۔
معبد کا بڑا پجاری جس کا سینہ سنگ سیاہ اور کاسہ سر پیتل کا تھا، اپنے
حواریوں سمیت ان کی طرف بڑھا اس کی ہمسفر اسے دیکھتے ہی سجدہ ریز ہو گئی۔
نوجوان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔
تمام رات ارد گرد کے چھوٹے پجاری اور معبد کی سیوا کرنے والے بڑے بڑے مختلف اوقات میں گستاخ دیوداسی کو اس کے احکام سے باخبر کرتے رہے۔
صبح ہونے تک اس کا موتیے اور گلاب میں گندھا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔
نوجوان ساری رات رسیاں کھولنے میں مصروف رہا اور صبح ہونے تک وہ ایک صحرا نورد قافلے کا ہمراہی بن چکا تھا۔
۔ قافلے والے سکون ڈھونڈنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے۔
چاندی کی جھانجھروں اور زیورات سے لدی پھندی عورت اسے اس وقت دیوداسی سے بھی خوبصورت لگی۔

— ❁ —

سب کی رگ میں خشک ہو چکی تھیں آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ ریتلی دھوپ میں اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے اپنے خشک گلے کو لعاب سے تر کیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ قافلے والے اس کی اس حرکت پر طنزیہ مسکرائے۔
اسے وہ لوگ دولتی زندگی میں اپنے آپ سے کہیں آگے نظر آئے۔
لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں سالار کے دلیر بیٹے نے اپنے باپ کی داڑھی پکڑی اور پوچھا بتاؤ ہم منزل پر کب پہنچیں گے۔
سالار راستہ بھول چکا ہے اس کی یادداشت جواب دے چکی ہے۔ جھانجھروں والی لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔ لوگوں نے اس کی تائید کی۔
اگلے دن سب میں آیا سالار بدل دیا گیا۔ اب ہم منزل کے قریب جلد پہنچیں گے
نئے سالار نے صندل کی صراحی میں سے کسی کو ایک قطرہ بھی پینے کے لیے نہ دیا۔
کچھ دن سالار کے خلاف کھسر پھسر رہی پھر سب نے یک زبان ہو کر کہا، اٹھو اور درختوں کے سایہ دار جھنڈ تک پہنچنے کی خود کوشش کرو۔
جھانجھروں والی لڑکی نے نقاب اتار کر پیچھے رکھا اور اونٹ کی باگ تیزی سے کھینچی۔ اپنے بیوں پر پلیلیں ساتے ہوئے مردوں اور عورتوں کے نعروں سے یا علی مدد اور یا صاحب کی صدائیں ٹکرا رہی تھیں۔
نوجوان نے بچے کھچے ایل ایس ڈی کے کیپسول کو ریت پر دے مارا اور ان کے پیچھے چل نکلا
سفر کرتے کرتے وہ بہت دور نکل آئے سامنے صحرا پر بادلوں کے غول اڑتے نظر آ رہے تھے۔
ان کی آنکھوں میں منزل پا لینے کی چمک عیاں تھی۔ لیکن وہ تھوڑی ہی دیر بعد تیز اور تند آندھیوں کی لپیٹ میں پکار رہے تھے۔
"ایلی ایلی لما شبقتنی"
اور نوجوان ریت پر گرے کیپسول کی تلاش میں واپس جا رہا تھا۔

محمد یسین

# ہندو استاد :

# مسلم طالب علم

ستمبر ۱۹۴۴ کے دوران میٹرک فائنل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ میرے بھائی جان محمد شریف مرحوم کا مری سے تبادلہ ہو گیا چونکہ میں وہاں زیر تعلیم تھا کفالت کا مسئلہ پیدا ہو گیا لہٰذا واپس اپنے ہی شہر حافظ آباد آنا ہوا والد بزرگوار انتہائی پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان اور مجلس احرار کے حامی تھے وہ مجھے داخلہ دلوانے کے لیے آریہ سماج ہائی سکول لے کر گئے جہاں کا ہیڈ ماسٹر دینا ناتھ تھا۔ اُس نے مجھے ملتے ہی اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے پڑھائی سے اکتاہٹ پیدا کرنے کی غیر محسوس انداز میں کوشش بھی کی اور والد صاحب سے کہا کہ دس پندرہ روز انتظار کریں پھر بتلا دوں گا۔ وہ گھر چلے گئے اور میں باقاعدگی سے اسکول آتا رہا۔ اسی اثنا میں اکتوبر آ گیا اور جب ہم نے پوچھا کہ "داخلہ کیا ہے؟" تو جواباً اُس نے نہایت کھردرے لہجے میں کہا "میاں اس اسکول میں کسی مسلمان طالب علم کے لیے کوئی جگہ نہیں"۔ یہ جواب سن کر غصہ تو بہت آیا، مگر کیا ہو سکتا تھا چاروں طرف سماج پر مذہبی ہندو چھائے ہوئے تھے۔ پس یہ جانتے کے باوجود کہ والد صاحب کانگرس کے حامی ہیں اور وہ انہیں اس حیثیت سے جانتا بھی تھا۔ مگر اس نے سیاسی وابستگی پر دھرم کے تعصب کو ترجیح دی گھریلو معاشی مجبوریوں اور کاروبار پر دارالتعلیم کی اس بے رُخی کے نتیجہ میں میرا دل فی الواقع تعلیم سے اکھڑ رہا تھا، لیکن والد صاحب کا اصرار تھا کہ تمہیں ضرور پڑھاؤں گا چاہے کتنی ہی معاشی دقت ہو۔ اسی عزم پختہ کے ساتھ وہ مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پُر چھوڑنے گئے، جہاں حسنِ اتفاق سے ہیڈ ماسٹر ایک نو مسلم تھے جنہوں نے سکھ مت سے اسلام قبول کرتے ہوئے محبوب الٰہی کا نام اختیار کیا تھا بہت نرم دل اور نیک دل شخصیت تھے انہوں نے داخل کرنے کا وعدہ تو کر لیا، لیکن کہا کہ اس وقت تک داخلہ ممکن نہیں جب تک دسویں کلاس کا انچارج ماسٹر کوشل سفارش نہ کر دے۔ کوشل بذات خود کانگریس کا پرجوش کارکن تھا اور دل میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی تعصب رکھتا تھا۔ کلاس روم میں ریاضی پڑھاتا اور اسکول ٹائم کے بعد اسکول بورڈنگ کی سپرنٹنڈنٹ شپ چلاتا۔ اب آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ گورنمنٹ کے اسکول میں میرا داخلہ روکنے کے لیے اس نے کس قدر گھٹیا حرکت کی

ریاضی کا ٹیسٹ لیا۔ خدا کے فضل سے پانچ میں سے چار سوال بالکل ٹھیک تھے لیکن اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتلایا کہ "یہ لڑکا غبی ہے اور نصاب کچھ نہیں جانتا"۔ ہیڈ ماسٹر نے فوراً مجھے طلب کیا اور خود اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس سے ٹیسٹ والا پرچہ حاصل کیا، درحقیقت معاملہ وہی تھا یعنی پانچ میں سے چار سوال صحیح —— " یہ تعصب اور بددیانتی دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے احساسات کا اظہار چہرے کے تاثرات سے دیتے ہوئے مجھے داخل کر لیا۔ اب کوشل نے بورڈنگ میں داخلہ دینے کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا، لیکن وہ بھی مسئلہ حل ہو گیا ——!

جب نتیجہ آیا تو کلاس میں بہترین پوزیشن حاصل کرنے والے پانچ لڑکوں میں سے ایک تھا۔ اسی جگہ میرا کلاس فیلو امر ناتھ ایک ہندو تھا جو تعلیم میں بھی بہت پیچھے، انگریزی میں کمزور اور جسمانی اعتبار سے نحیف تھا۔ اس کے برعکس اپنا کام صبح سویرے ورزش کرنا اور ڈسپلن تھا جس سے صحت بھی اچھی تھی اور عمر بھی اُس سے بہت زیادہ اچھی۔ میٹرک کے بعد والد گرامی نے پھر ایک ہندو پر اعتبار کرتے ہوئے امر ناتھ کے والد کو کہا کہ "اسے بھرتی کروا دو" وہ امر ناتھ اور مجھے لے کر ریکروٹنگ آفیسر کے پاس گیا یہ آفیسر بھی ہندو ہی تھا، انٹرویو ہوا۔ اچھا ہوا۔ امر ناتھ کا انٹرویو پھر ہوا، اس کے اور کچھ انٹرویو کے بعد اُس کی جسمانی حالت کی بنا پر ٹیسٹ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ رجوع دار گئے۔ انتظار ہوتے ہیں شاید آپ کو اس بات پر اعتبار نہ آئے کہ دیر تک کھڑے کھڑے ہم دونوں گپ شپ کر رہے تھے کہ امر ناتھ کا والد باہر آیا ـــ فاتحانہ اور رہبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا "یار چکا ہو گیا تیروں دی لوچ ایچ ملک لیا گیا ہے میرا پتر لفٹیننٹ بھرتی ہو گیا اے تے توں حوالدار ـــ حوصلہ رکھیں ماموں" میں اس کا منہ تکتا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیا ہم مسلمان بالکل ہی کھلونا ہیں ہندو سماج کے ہاتھوں ـــ یہ سوچتا ہوا میں ریکروٹنگ آفیسر کے پاس گیا اور کہا "سر! میرے سر! انٹرویو اور تعلیم بھی اُس سے بہتر" اُس نے بور میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مسٹر! تم سچ کہتے ہو ہاں، لیکن کیا خیال ہے ملازمت کرنی ہے یا" پھر مسکراتے ہوئے ٹھیکا دے کر کہا "ٹھیک" ـــ میں اپنا سا منہ لے کر باہر آ گیا ـــ اور سوچتا رہا کہ ہندو کا وار کتنا گہرا ـــ کتنا دور رس اثر ـــ اور کتنا تیز ہے ـــ !! آج یہ سوچ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندو یقیناً ہر دور میں اپنی قابلیت کی بنا پر نہیں، مکاری و عیاری کی بنا مسلمانوں کا حشر کر چکا ہوتا۔

محمد فاروق خان، میڈیکل طالبعلم

# کیڈٹ کالجز کی جعلی چمک

> طالبعلم محمد فاروق خان کو تین برس تک کیڈٹ کالج میں ابتداء اور کیڈٹ کالج کوہاٹ میں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان اعتراضات کا جواب دینا ضروری ہو گا ——— محمود

ملک کے تین چار گوشوں میں کیڈٹ کالجوں کے قیام کو ایک مدت ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں ان اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ فوج، سول سروس اور دیگر شعبوں میں آگے بڑھ چکے ہیں۔ بیوروکریسی میں بھی ان کی ایک معقول تعداد موجود ہے اور ملک کے دوسرے اونچے مناصب پر بھی ان اداروں میں پڑھے ہوئے طلبہ فائز ہیں۔

اتنا عرصہ گزرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تجربہ کامیاب رہا یا ناکام گیا، ان اداروں سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری ہوئیں یا نہیں اور یہ کہ آئندہ کے لیے ان کی کیا صورت گری ہونی چاہیے۔ راقم الحروف چونکہ خود ان میں سے دو اداروں میں پڑھ چکا ہے اس لیے ان سطور میں جو معروضات پیش کی جائیں گی، وہ ذاتی مشاہدات اور غور و فکر ہی ہوں گی۔ اس لیے ان کو محض کسی ناواقف حال کا تبصرہ نہ کہا جائے بلکہ اندر سے دروں خانہ کے جاننے والے ایک فرد کا تجزیہ کہا جائے۔

کیڈٹ کالجوں کا تجربہ اس مفروضے کے ساتھ شروع کیا گیا تھا کہ غریب اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے ذہین طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور ان کو ملک کی بہترین سہولتوں والے ماحول میں تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ ملک و قوم کی ترقی میں وہ اپنا کردار ادا کر سکیں۔ یہ ایک بہت اچھا مفروضہ تھا اور اس سے اختلاف کرنا محال ہے لیکن صورت حال اس کے برعکس تھی۔ کیڈٹ کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کی ایک عظیم اکثریت مراعات یافتہ طبقہ کی اولاد سے تعلق رکھتی ہے۔ ۷۶ء میں ہماری کلاس کے جن طلبہ میں مشکل دو ایسے طلبہ تھے جن کے والدین کی ماہانہ آمدنی ہزار روپے سے کم تھی۔ پانچ سو روپے سے کم آمدنی والے گھرانے کا کوئی فرد کیڈٹ کالج میں آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ آج یہ معیار یقیناً اور بھی اونچا ہو چکا ہوگا۔

اس سلسلے میں چند ایک بنیادی خامیوں کو دل سے صرف نظر کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام پالیسی ساز حضرات انتہائی سطحی انداز میں سوچتے ہیں اور سر دست یہ خیال لیے بغیر نظام کو تبدیل کیے محض چند اقدامات کے ذریعے خرابیوں کی حالت سنوارنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ داخلوں کا جو طریقہ ان اداروں میں رائج ہے، کیا وہ واقعی اس قابل ہے کہ اہل اور نااہل میں فرق کر سکے؟ انٹرویو میں طالب علم کی انگریزی بولنے کی استعداد کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی فرد چھ سات جماعتوں تک انگلش میڈیم سکولوں میں تعلیم حاصل نہ کر چکا ہو تب تک کیسے انگریزی میں روانی پیدا کر سکتا ہے جبکہ اردو میڈیم سکولوں میں تو انگریزی شروع ہی چھٹی جماعت سے ہوتی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایک غریب یا متوسط آمدنی والا فرد اپنے بیٹے کو پبلک سکولوں میں داخل کروانے کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس یہی نہیں کہ اس کا بیٹا انٹرویو میں دوسروں کی برابری کر سکے، موجودہ معاشرہ کی مخصوص کیفیت کی وجہ سے پہلے طبقے میں خود اعتمادی، بے باکی، شرم اور گھبراہٹ کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے جبکہ اونچے طبقے میں یہ خامیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

ان حالات میں کیڈٹ کالج میں کسی متوسط طبقے کے فرد کا داخلہ ایک معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ وہاں گفتگوؤں کی تمام تر محفلیں سرمایہ کی نمائش پر مرکوز رہتی ہیں۔ ساتھی آپس میں ایک دوسرے پر مالی لحاظ سے فوقیت جتلانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مراعات یافتہ طبقہ کی مخصوص اصطلاحات ہر زبان پر جاری و ساری ہوتی ہیں۔ ہر جگہ تعارف کے وقت یہ پوچھا جاتا ہے، تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں؟ آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب ایک طرف کوئی اپنے آپ کو میجر جنرل کا صاحبزادہ بتا رہا ہو تو کوئی کس طرح اپنی حقیقت بتا رہا ہو کہ وہاں کوئی ایسے آپ کو چپڑاسی کا بیٹا کہلوانے کی ہمت کر سکتا ہے؟

ان اداروں میں تعلیمی نظام یقیناً قابل رشک ہے۔ ہر سال بڑی تعداد میں طلبہ امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن تو خیر ایک معمولی بات ہے۔ مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کیڈٹ کالجوں میں میٹرک کا دو سالہ نصاب تین سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ کیڈٹ کالجوں کے مخصوص تناظر میں اگر اس حقیقت کو دیکھا جائے تو بہت بڑی کامیابیاں اپنا وزن کھو بیٹھتی ہیں۔

معلم کے میدان میں طلبہ میں رقابت کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، یہی جذبہ بعض اوقات حسد تک جا پہنچتا ہے۔ ہر ٹرم میں تعداد امتحان ہوتا ہے اور حاصل شدہ نمبروں کو ہمیشہ کلاس میں پوزیشن کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر کلاس میں تیس سے زائد طلبہ نہیں ہوتے۔ بہرحال کالج کا معیار یہی ہوتا ہے جس انداز میں اساتذہ کا معیار اور تجربہ سب سے بہتر ہے جبکہ کو اس میں کسی عام کالج سے برتر نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک اور شاید اب بھی جس انداز میں کریڈٹ سسٹم کا رواج بھی تھا یعنی استاد جس شاگرد سے خوش ہو جاتا، اسے کریڈٹ عنایت کر دیتا اور جس پر اس کی رگِ جلال پھڑک اٹھتی اس کو ڈیس کریڈٹ ——— نامی ایک حیثیت سے نواز دیا جاتا۔ اس کے لئے ہاتھوں کا استعمال بھی جائز ہے اور درشتی بھی دی جا سکتی ہے۔

اس صورت حال نے ایک بہت گندی ذہنیت کو جنم دیا ہے اور وہ ہے جو اساتذہ کے ذریعے سے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش۔ تقریباً ہر ایک طالب علم ۱۲-۱۱ [illegible] میں ہر ایک ہوتا ہے اور وہاں اس میں پیچھے رہ جانے والے کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اکثر اوقات سرد جنگ میں اس کو حاصل ہوتا ہے کیڈٹ کالج کے پورے نظام میں یہ روح

کارفرما ہے جو کہ فرد کی انفرادیت کو کچل دینے کا ذمہ دار ہے۔

کلاسوں کے علاوہ اوقات میں جبری پڑھائی کا نظام رائج ہے جس کو ( ) کہا جاتا ہے، اور یہ دو پیریڈ ہوتے ہیں جو سرپا تین گھنٹے پر محیط ہوتے ہیں۔ ان اوقات میں کوئی فرد اپنی کرسی سے ہل نہیں سکتا۔ اگر بدقسمتی سے اس کی کوئی کتاب الماری میں رہ گئی ہے تو بغیر اجازت لیے وہ کتاب نہیں اٹھا سکتا۔ آپس میں باتیں کرنے پر مکمل پابندی ہے، حتیٰ کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانا بھی منع ہے۔ بعض والدین اسی سخت ماحول پر ریجھ کر اپنے بچوں کو یہاں داخلہ دلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، مگر ان کو معلوم نہیں کہ اس جبری ماحول نے چند انتہائی بنیادی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جن پر بحث ابھی آگے آ رہی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ان اداروں میں بورڈ کے امتحانات کے وقت بھی یہی حالت ہوتی ہے، حالانکہ ان اداروں میں اسی طرح نقل چلتی ہے جس طرح دوسرے کالجوں میں۔ ممتحن کو اپنے ماں باپ کے عہدوں اور منصب سے مرعوب کرنا، ان کو سفارش دے کر پاس کروانے کی امید دلانا، اسی طرح کے دوسرے حربے عام ہیں، بلکہ اگر کسی فرض شناس ممتحن نے کسی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو کالج کا تمام سٹاف اس کی سفارش کرنے لگتا ہے، بلکہ ان کے پاؤں پڑنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے تاکہ بقول ان کے کالج کے تقدس پر کوئی آنچ نہ آئے یا ان کے صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ کہیں اس ادارے کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

اساتذہ کرام کی بھی چند خصوصیات ہیں۔ کالج میں گروپ بندی بہت عام ہے۔ نظریات کی بنیادوں پر نہیں، بلکہ پرنسپل کی حمایت اور مخالفت کی بنیاد پر۔ مختلف ہاسٹلوں کے ہاؤس ماسٹر صاحبان بھی آپس میں بیر رکھتے ہیں اور طلبہ کے سامنے بھی اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اساتذہ بھی کلاس میں اپنے مخالفین پر کیچڑ اچھالنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسی معمولی باتوں پر جھگڑے ہوتے ہیں کہ انسان کی عقل محو حیرت رہ جاتی ہے۔

طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی جاتی۔ کسی معاملے کے تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مطالعہ معلومات عامہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ طلبہ کی ذاتی طور پر تعلیم کے مختلف سوالوں کے متعلق کبھی (Guidance) نہیں کیا جاتا۔ اتنے عظیم ادارے سے ہر ذی شعور توقع رکھتا ہے کہ وہاں سائنٹفک انداز میں ہر فرد کے ( ) کو دیکھا جاتا ہوگا، مگر اس کا نام و نشان تک بھی نہیں۔

یہ تو ہوئی تعلیمی حالت۔ اب آئیے ذرا تربیتی نظام کا جائزہ لیں۔ یہاں سو فیصد طلبہ ہاسٹلوں میں رہائش پذیر ہیں اور ہاسٹل میں رہائش حاصل کرنا لازمی ہے تاکہ وہ کیڈٹ کالج کے مخصوص ماحول میں پروان چڑھ سکیں۔ اس لیے یہاں کے تعلیمی ماحول سے زیادہ تربیتی ماحول کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس تربیت کے دوران ان کو کچھ مخصوص طرز فکر عطا کیا جاتا ہے۔

ایک نووارد کو اس فضا میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے سینئر اور جونیئر کی تفریق کا احساس ہوتا ہے۔ جونیئر کسی سینئر کے کمرے میں نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ آزادانہ میل ملاپ اور گپ شپ کو بھی ناپسند کیا جاتا ہے۔ جونیئر کے سامنے سینئر تصور کرنا ایک اہم عنوان ہے۔ اس فضا میں اگر کوئی سینئر فرد کسی جونیئر سے تبادلہ خیالات کرے تو اسے برا اچھی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ مستقل تفریق بہت سی خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔ ماحول دبا دبا، گھٹا گھٹا ہوتا ہے، مصنوعی برتری کا غلط احساس ہوتا ہے اور یوں ساری فضا میں تعاون اور رحم کے جذبے نہیں، بلکہ ظلم کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔

صحت بحال رکھنے کے لیے صبح آدھ گھنٹہ پی ٹی اور شام کو ایک گھنٹہ کے لیے کھیل لازمی ہوتا ہے جو یقیناً ایک مستحسن بات ہے۔ ہر ایک فرد کو اس میدان میں اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور اچھے کھلاڑیوں کی عموماً حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ہاسٹل میں ذمہ داری کے بعض مناصب پر طلبہ کا تقرر کیا جاتا ہے۔ اس تقرر میں یوں تو سنیارٹی اور گیمز کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر اس کے لیے سب سے بڑا معیار خوشامد ہے، چنانچہ ہاؤس ماسٹر کا منظور نظر بننے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ طلبہ کے اندر ان مناصب پر پہنچنے کے لیے رقابت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے اور اس دوڑ میں ہر کوئی دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیڈٹ کالجوں کی مخصوص گھٹی گھٹی فضا میں ان کمانڈروں کے اختیارات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی فرد کو سخت سے سخت سزا دے سکتے ہیں، بلکہ انہیں دوسروں کو حکم دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب سزائیں اور احکام برسر عام ہوتے ہیں جس میں طالب علم کی عزت نفس کو جا بجا دھچکا لگتا ہے۔ یہ سزائیں کسی بھی ایسے کام پر دی جا سکتی ہیں جو کمانڈر کی طبع نازک پر گراں ہوئے ہوں۔ ان سزاؤں کا استعمال بے دریغ ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر ان اداروں میں طلبہ کی زندگی ایک ہی شکنجے میں کسی ہوتی ہے۔ صبح اٹھنے سے رات سونے تک ایک ایک لمحے کا پروگرام بنا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً صبح وسل کی آواز پر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اٹھ کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دس سیکنڈ کے اندر اندر اپنے بستروں سے نیچے ہوں گے۔ وسل کی آواز پر پی ٹی کے لیے جائیں گے۔ وہاں سے واپسی پر گھنٹی کی آواز پر ناشتہ ہوگا۔ اس کے فوراً بعد کلاسیں لگیں گی۔ کلاس ختم ہونے کے پانچ منٹ بعد کھانا ہوگا اور اگر کوئی دو منٹ لیٹ آ جائے تو اسے اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ کھانے کے بعد آرام ہوگا اور کوئی چاہے نہ چاہے اسے بستر پر لیٹنا ہوگا۔ پھر پریڈ کے لیے گھنٹی بجے گی اور سب لوگوں کو بستر سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا ہوگا۔ اس کے فوراً بعد کھیل کے لیے گھنٹی بجے گی اور اس کے بعد کھیل کھیلنے کے بعد پھر کھانا، پھر سٹڈی اور پھر لائٹ آف۔ اس کے ساتھ ہی تمام ڈسپلن کی روح کے مطابق طلبہ اپنے بستروں پر دراز ہو جاتے ہیں اور اگلی صبح وسل کی آواز پر جاگ اٹھتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی کا تصور بھی بڑا رنگین لگتا ہے۔ ہر وقت آپ کو ایک مخصوص وردی میں رہنا ہوگا۔ اس مقید زندگی کا سب سے بڑا اثر انسان کی ذات پر یہ پڑتا ہے کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی فکر سے کوئی راستہ نکالے اور کوئی ٹائم ٹیبل بنائے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ حالات کے دھارے پر بہنا ہی اصل زندگی ہے۔ اس کی زندگی اور مشین میں فرق کم ہی رہ جاتا ہے۔ اس کی زندگی کے سامنے چند مخصوص طور طریقوں میں ڈھلنے کے اور کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔ جب فکر کے دھارے پر قدغن لگ جاتی ہے تو انسان، انسان نہیں رہتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب سارے طلبہ ( ) بن جاتے ہیں ان کی فکر کو صحیح راستہ نہیں ملتا، اس لیے وہ کالج کے اصول و ضوابط کو توڑنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سگریٹ پینا، راتوں کو کالج سے باہر جانا وغیرہ، بلکہ اب تو ان تمام اداروں میں بعض اوقات بڑی بڑی چوریوں اور شراب نوشی کے واقعات منظر عام پر آئے ہیں۔ طلبہ کی اخلاقی حالت ان پابندیوں کی وجہ سے کچھ اچھی نہیں ہوتی، بلکہ ہر قسم کی اخلاقی کمزوریاں وہاں پائی جاتی ہیں۔

یہی طلبہ جب ان اداروں سے باہر آتے ہیں، تو آزادی کی فضا انہیں راس نہیں آتی۔ وہ ایسی محصور فضا میں شغل علم ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ بھلا اس کے بغیر وہ آزاد دنیا میں کیسے چل سکتے ہیں۔ کالج میں شاذ و نادر ہی کسی فرد کے سب ایک رنگ سے رنگے ہوتے ہیں مگر کالج سے باہر آتے ہی ان کی اکثریت بہک جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر طلبہ باہر کی فضا میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کالج کے اندر مختلف پابندیوں کے پیچھے ڈنڈے کا زور ہوتا ہے، مگر اخلاق و کردار کا نہیں، جس کی وجہ سے جونہی ڈنڈا ہٹ جاتا ہے تو لوگ وہی سب کچھ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کرنے لگتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ادارے کمیونسٹ ریاستوں کے اداروں سے کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔

یہاں میں نے کیڈٹ کالجوں کے محض چند ہی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے ورنہ ان اداروں میں قابل اصلاح پہلو اور بھی بہت ہیں، بلکہ یہاں کی ترجیحات میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ اس ضمن میں

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

# طالب علم
# میدانِ جنگ میں

یہیں احسن اور اس کے ساتھی محمد سنگھ ایک جنگل میں دیکھ رہے تھے کہ اس پر گولیاں چلانے والے مکتی باہنی اور کچھ گوریلوں کی ٹولیوں میں اور [illegible] خود کو بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مکتی باہنی کے گھیرے کو پوری طرح گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور انہیں بھاگنے کے لیے کوئی سمت نظر نہیں آتی۔ پہلے تو کیپٹن سمجھ رہا تھا کہ پاک فوج کا کوئی دستہ مدد کو آ پہنچا مگر جب مکتی باہنی کو گھیرے میں لے لیا گیا، تو وہ سخت حیران تھا کہ یہ کون ہے جو جانتا تھا کہ یہاں مکتی باہنی کو گھیرے میں لیا جا سکتا ہے، کیونکہ فوج اس علاقے سے بالکل ناواقف تھی اور اس کام کے لیے اس علاقے کے دشوار گزار راستوں اور اس خوفناک جنگل کے چپے چپے سے واقف ہونا لازمی تھا۔ وہ ابھی معمے کو حل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور پھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پورا جنگل گونج اٹھا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مکتی باہنی پر زوردار حملہ ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی اور جس طرح اس سے [illegible] آ رہی تھی اب کیپٹن نے اپنے ساتھیوں کو دوبارہ فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ [illegible] تخریب پسند گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے اور چند ہی منٹوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ تقریباً ۲۰ افراد تھے جن میں سے ۴ ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے۔ کیپٹن اور اس کے ساتھی جب انہیں حراست میں لینے کے لیے آگے بڑھے تو دوسری طرف سے کچھ اور لوگ بھی انہیں گرفتار کرنے کے لیے پہنچ چکے تھے اور ابھی تک پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ کیپٹن احسن تخریب پسندوں کی بجائے اسی کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف سے ایک بیس بائیس برس کا طالب علم تقریباً بھاگتا ہوا آیا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کیپٹن کو بتایا کہ اس کا نام خالد ہے اور وہ "البدر" کی اس کمپنی کا کمانڈر ہے اور کشور گنج کا رہنے والا ہے۔ اس نے اس مہم کے بارے میں کیپٹن کے استفسار پر بتایا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا ایک دستہ اس جنگل میں تخریب پسندوں سے پاک کرنے کے لیے آپریشن کے لیے جا رہا ہے، تو یہ سوچ کر کہ پاک فوج اس جنگل سے بالکل ناواقف ہے اور یہاں مکتی باہنی کی طاقت بھی کافی زیادہ ہے اس نے اپنی کمپنی کے ہمراہ جنگل میں داخل ہو کر مکتی باہنی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جہاں پہنچے یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا دستہ گھیرے میں آ چکا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب نے دیکھ لیا۔

کیپٹن احسان اور خالد اب گہرے دوست بن چکے تھے۔ اکثر تخریب پسندوں کے خلاف پاک فوج اور البدر کے مشترکہ آپریشن جاری تھے۔

ایک روز جب کیپٹن نے خالد سے کہا کہ اس علاقے میں مکتی باہنی کا لیڈر کوئی بڑا خطرناک آدمی ہے، وہ کئی تخریبی کارروائیوں کی قیادت کر چکا ہے۔ اسے پکڑنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے، تو خالد نے بتایا کہ وہ اسے پکڑنے کے لیے کئی بار مختلف جگہوں پر چھاپے مار چکا ہے اور آج بھی اس سلسلے میں وہ کشور گنج جا رہا ہے اور امید ہے کہ یہ چھاپہ کامیاب رہے گا۔ کیپٹن کے پوچھنے پر کہ وہ چھاپہ کن اطلاعات کی بنیاد پر مار رہا ہے خالد خاموش ہو گیا اور پھر کیپٹن کے اصرار پر اس نے صرف یہ کہا کہ تمام اطلاعات کو نہ بتا سکوں گا۔ کیپٹن نے پوچھا کہ وہ چھاپے میں کتنے آدمی ساتھ لے کر جا رہا ہے، تو اس نے کہا کہ میں اور میرے دو دوست ماجد اور سلیم ہی کافی ہیں۔ کیپٹن کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ ان تینوں کی دلیری اور [illegible] کا پہلے ہی قائل ہو چکا تھا اس لیے خاموش رہا۔

رات کے تقریباً ۱۱ بجے ہوں گے کہ خالد، ماجد اور سلیم کیپٹن کے پاس پہنچ گئے۔ کیپٹن نے دیکھا کہ ایک چوتھا آدمی بھی ان کے ساتھ ہے اور ان کی گرفت میں ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ چھاپہ کامیاب رہا ہے اور مکتی باہنی کا مقامی لیڈر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیپٹن کے پوچھنے سے پہلے ہی ماجد نے اس کی تصدیق کر دی اور پھر کیپٹن اس لیڈر سے مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا۔ مگر وہ کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کیپٹن نے اپنی رائفل کی نالی اس کے سینے پر رکھ دی۔ مگر اس نے کہا:

"کیپٹن صاحب! میں آپ کا دشمن ہی سہی، مگر خالد کا بھائی ہوں، کیا مجھے بھی گولی مار دو گے؟"

اور کیپٹن سناٹے میں آ گیا۔

اس نے تقریباً چیختے ہوئے اس سے پوچھا کہ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس نے دوبارہ یہی کہا کہ "میں خالد کا بھائی ہوں۔"

کیپٹن نے خالد کی طرف دیکھا، تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور اس نے کہا:

"ہاں، واقعی یہ میرا بھائی ہے۔ ہمارا باپ عوامی لیگ کا مقامی رہنما ہے، ہم دو بھائی ہیں اور میرا یہ بھائی مکتی باہنی کا لیڈر ہے۔"

کیپٹن نے بے بس ہو کر اپنی رائفل زمین پر پھینک دی اور کہا:

"اگر یہ ایک مجاہد کا بھائی ہے، تو اسے گولی مارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اور پھر رائفل خالد کے ہاتھ میں تھی۔

اس نے اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا: "تم اگرچہ میرے بھائی ہو، مگر اس وقت معاملہ پاکستان کی سالمیت کا ہے۔ پاکستان جو کہ اسلام کا ایک قلعہ ہے اور جس کی حیثیت ایک مسجد کی سی ہے۔ اگر تم اس مسجد کو نقصان پہنچانے سے باز آنے کا وعدہ کرو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ ساری زندگی یہ بات دہرائی جائے گی اور اس مسجد کی حفاظت کرنے میں کوئی خونی رشتہ میری راہ میں حائل نہیں ہو سکے گا۔"

اس کا بھائی اب بھی خاموش تھا۔ شاید وہ ہندوؤں اور علیحدگی پسندوں کے دیے ہوئے نام نہاد آزادی کے نعرے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا اور پھر اپنے بھائی کے جملوں کی صداقت پر بھی شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اس کا بھائی تھا۔

مگر۔ پھر گولی اس کے سینے سے پار ہو چکی تھی۔

ایک تخریب پسند زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا اور اس کا مجاہد بھائی عزم و استقامت کی تصویر بنا اس کے پاس کھڑا تھا اور پھر وہ آنکھوں میں آنسو لیے کیپٹن احسن سے لپٹ گیا جو کہ خود اس سارے منظر کو دیکھ کر رو پڑا تھا۔

نومبر کے وسط میں کیپٹن احسن کو ڈھاکہ جانا پڑا اور جب اس نے خالد سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا، تو اس نے اپنے وطن کا [illegible] کے لیے کیپٹن کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی۔

۲۲ نومبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیاں بھی شدت اختیار کر گئیں۔ کیپٹن احسن کو نارائن گنج بھیج دیا گیا۔ خالد نے یہاں پہنچ کر بھی اپنے نارائن گنج کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ملک دشمنوں کے خلاف کارروائیاں جاری رکھیں۔

نارائن گنج سے تقریباً دس میل دور ایک چھوٹا [illegible] میں جو کہ دریائے میگھنا میں کئی میل تک پھیلا ہوا ایک

حدیرہ سے ایک کتی باسی کا راستہ بڑا موزوں قائم تھا کیونکہ یہ اس پورے علاقے میں کتی باسی کا مرکز بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور چاندپور کے درمیان آنی تمام راہیں غیر محفوظ ہو گئی تھیں، چنانچہ ۱۴ نومبر کو کیپٹن احسن کو پاک فوج کے ایک دستے کے علاوہ البدر کے ۴۰ رضاکاروں کے ساتھ مل کر اپریشن کا حکم ملا۔ ان رضاکاروں میں ایک پلاٹون ایسی تھی جس میں خالد بھی شامل تھا اور ایک کمپنی اسی مہم کے لیے ڈھاکہ سے آئی تھی جس کا کمانڈر احمد تھا

حملے کے دوران کیپٹن نے محسوس کیا کہ اتنی طاقت کے ساتھ بستی پر قبضہ کرنا مشکل ہے، اس لیے اس نے کوریئٹنگ کی کہ اس کے خیال میں چونکہ مزید فوجی کمک کے بغیر یہاں قبضہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا اس لیے فی الحال حملے کو روک دیا جائے، مگر احمد اور خالد نے لڑتے رہنے پر اصرار کیا اور حملہ جاری رکھا۔ پھر کیپٹن نے وہ منظر بھی دیکھا جب خالد تقریباً رینگتے ہوئے کتی باسی کے مرکزی مورچے کے قریب پہنچ چکا تھا اور ۔ ایک دم آگ کے شعلے بلند ہوتے گئے

خالد وہاں آگ لگا کر واپس آچکا تھا

احمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے اتنا قریب جا کر گولیاں برسا رہا تھا کہ دشمن بھی چیخنے لگے، مگر اب بھی جب احمد پوری طرح دشمن کی زد میں تھا، وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا وہ پاک سرزمین کے ایک ایک انچ کو ملک دشمنوں سے پاک کر دینا چاہتا تھا اور پھر ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے سر میں لگی اور وہ اپنی حقیقی منزل کو پا گیا۔ اس کے دو ساتھی اسی حال میں ہتھیلی پر رکھ کر جسد کو واپس لے آئے

اب ایک بار پھر کیپٹن احسن نے حملہ روکنے کی تجویز پیش کی، مگر اب جب کہ ان کے کمانڈر کے جسم سے رستا ہوا گرم گرم خون البدر کے مجاہدوں کی آنکھوں کے سامنے تھا، انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا اور نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور پھر تھوڑے ہی وقت میں پورا علاقہ ملک دشمنوں سے پاک ہو چکا تھا

دوسرے روز خالد میمن سنگھ کے لیے روانہ ہو گیا

۳ دسمبر کو مغربی محاذ پر بھی جنگ چھڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی کیپٹن احسن کو واپس میمن سنگھ پہنچنے کا حکم ملا

مشرقی محاذ پر ایئر فورس نہ ہونے کے باوجود پاک فوج انتہائی دلیری کے ساتھ لڑ رہی تھی اور دشمن انتہائی کوششوں اور زبردست جانی نقصان اٹھانے کے باوجود سرحدوں سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا تھا اور پھر دشمن نے یہ دیکھتے ہوئے کہ پاک فوج کی پہلی دفاعی لائن کو بھی توڑنا اس کے بس کی بات نہیں، پاک فوج کے عقب میں چھاتہ بردار فوج اتارنی شروع کر دی۔ صورت حال اگرچہ بڑی نازک تھی مگر فوجیوں کے حوصلے اب بھی بلند تھے۔

اور پھر

۱۶ دسمبر کی صبح جب کیپٹن احسن نے خالد کو بتایا کہ پاک فوج ہتھیار ڈال رہی ہے تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا، مگر جب کیپٹن نے اسے بتایا کہ واقعی حقیقت ہے، تو اس پر گویا قیامت گزر گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ لڑکھڑا گیا۔ کیپٹن نے اسے سہارا دیا اسے پانی پلایا اور جب وہ ہوش میں آیا، تو اس نے آنکھیں کیپٹن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ کیپٹن نے اسے بتایا کہ فوج تو نہیں چاہتی تھی، مگر اسے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ خالد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اس نے کہا:

"کس نے حکم دیا ہے؟"

کیپٹن نے کہا "جنرل یحییٰ خان کا حکم ہے۔"

خالد گرجا "یحییٰ خان کا حکم ماننے والو! تمہیں بابائے قوم کا وہ حکم یاد نہیں کہ

"اگر کبھی پاکستان کی حفاظت کے لیے تمہیں جنگ کرنا پڑے تو پہاڑوں میں لڑنا، جنگلوں میں لڑنا، دریاؤں میں لڑنا، میدانوں میں لڑنا، آخر دم تک لڑنا اور کسی صورت میں دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا"

کیپٹن احسن خاموش تھا اور خالد کی آواز غصے سے بھرائی ہوئی اور رگیں کھنچ رہی تھیں

"دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے والو! تم صرف پاکستان سے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام سے غداری کر رہے ہو۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ سے غداری کر رہے ہو۔ اسلام کے اس قلعے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے بجائے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے والو! تم محمد عربی کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

خالد واپس جانے کے لیے مڑا، تو کیپٹن نے اسے روکتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ "اب جب کہ فوج ہتھیار ڈال رہی ہے، البدر کا لڑتے رہنا عقل مندی نہیں ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ ..."

ابھی کیپٹن نے اتنا ہی کہا تھا کہ خالد کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

"خاموش!" خالد گرجا "دیکھو! سلطان ٹیپو کیا کہہ رہا ہے: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور کیپٹن احسن پُرنم آنکھوں سے اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا

**

کیپٹن احسن جنگی قیدی ہو گیا

## بقیہ: کیڈٹ کالجز

اگر کوئی فرد بیرونی ماحول سے قطع نظر کر کے یا کیڈٹ کالجوں کے موجودہ نظام کو برقرار رکھ کر اصلاح احوال کی بات سوچتا ہے تو یہ ایک مبہم اور ناممکن بات ہے۔ جب تک رائج الوقت نظام کو جڑ سے اکھاڑ نہیں پھینکا جائے گا اور اسلامی نظام تعلیم کو عام ملک میں رواج دینے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی جائیں گی، اس وقت تک اصلاحات کی کوشش کرنا جڑوں کے بجائے پتوں کو پانی دینے کے مترادف ہوگا

کیڈٹ کالجوں کی سکیم بذات خود بہت اچھی ہے اور اسلام کی نگرانی کے تحت ان سے بہت مفید کام لیے جا سکتے ہیں، مگر بیرونی اصلاح جب لازمی ہے اور کوئی بھی تدبیر اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک تمام ماحول اس کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ بس ان اداروں کے موجودہ ماحول کا خاتمہ کیا جائے، ناروا پابندیاں ختم کر دی جائیں اور طلبہ کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور تعلیمی تربیت میں اس اصل اصول سے کام لیا جائے کہ جب تک کسی پابندی کے پیچھے دلیل اور حکمت نہ ہو، اس وقت تک اس کے ذریعے تربیت کا حاصل ہے۔ اگر ان اداروں کو واقعی ذہین لوگوں کے لیے کھولنا ہے، تو موجودہ نظام تعلیم کو ختم کر دینا ہوگا اور جب طلبہ ایک ایسے نظام تعلیم کے تحت پڑھیں گے جہاں مقابلہ مساوی سطح پر ہوگا تب صحیح طریقے سے مختلف طلبہ کو پرکھا جا سکے گا۔ جب ایسے طلبہ کو داخل کیا جائے تو ان کی تعلیم بالکل مفت ہونی چاہیے۔ واضح رہے کہ تعلیم مفت کرنے کا مطلب ـــــ ٹیوشن فیس ختم کر دینا نہیں

انحطاط کے اس دور میں باقی کالجوں کی نسبت کیڈٹ کالج اب بھی غنیمت ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی سے وابستہ افراد اگر اپنے چھوٹوں کو ان اداروں میں بھیجنا چاہتے ہوں، تو اس کے ساتھ وہ ان تمام خامیوں کو مدنظر رکھیں اور ایسے بچوں یا چھوٹے بھائیوں کو اخلاق و کردار کے اسلحہ سے لیس کریں۔ ان میں احساس خودی کو بیدار کریں، تنقید و محاسبہ کا جذبہ ابھاریں اور ملک کی سیاسی صورت حال اور عالمی حالات کے متعلق ان کو لٹریچر پڑھوائیں اور بحث مباحثہ میں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ تحریک اسلامی کے لٹریچر کی ایک کتاب کیڈٹ کالج کے پانچ سالہ تربیت سے کہیں افضل و برتر ہے۔ اس لیے ان طلبہ کو اس لٹریچر سے روشناس کرائیں تاکہ ان کا ضمیر بھی اور ذہن بھی تعمیر کر سکے۔ ان تمام امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے امید ہے کہ طلبہ پر ان کے منفی اثرات نہیں پڑیں گے۔

**

[illegible] میں مزاح فرماتے تھے مگر انسانی پاکیزہ مزاح۔ اُردو ادب میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتابیں "تعمیری ادب" کا عمدہ نمونہ ہیں
تعمیری ادب کے اہم اجزا سے ظاہر ہے کہ اس میں دل و دماغ اور فکر و نظر کے لیے "نگاڑ" کا نہیں "سدھار" کا وافر میٹیریل ہوتا ہے۔ تعمیری ادب جنگ میں سمندہ اور دلکش ہوتا ہے
[illegible] وہ ہے جو دل و دماغ کو بگاڑتا ہے اور سیرت و کردار میں آوارگی اور انتشار پیدا کرتا ہے۔ تخریبی ادب کی ہر صنف میں تخریب پائی جاتی ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی کی کتابیں تخریبی
ادب کا [illegible] نمونہ ہیں۔
[illegible] بات تو یہ ہے کہ تعمیری ادب میں ایمان و یقین کی روشنی پائی جاتی ہے اور تخریبی ادب میں حسی چٹخارے اور انکار ——— یا تشکیک و تذبذب، ———

خیال و فکر کی ستمگری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو بساطِ آگہی میں کچھ بھی نہیں (ماہر)

(۴) فی تو ادب، مقصدیت کے وہی سایے ہیں جن میں طاسی اور بے مقصدیت پائی جاتی ہے مرصاحب ذوق اور اہل نظر ان سایوں سے واقف ہے اخلاقی اور بامقصد افسانے اور نظموں سے
یہ غلط قسم کے ادبی سایے ٹوٹ گئے ہیں لیے مقصدیت کے مقابلہ میں مقصدیت اور فحاشی کے مقابلہ میں اخلاق و شائستگی لانے سے ادب [illegible] کا توڑ ہو سکتا ہے

(۵) اچھا ادیب بننے کے لیے ملحد ہونا، بالکل ضروری نہیں ہے۔ تمکنی دنیا کی سرسال کے ادب کی تاریخ معلوم ہے اُس کا تجزیہ کیا جائے تو اکثریت عالب ایسے ادیبوں، دانشوروں
اور شاعروں کی نکلے گی جو ایمان رکھتے تھے اور وہ ملحد نہیں تھے الحاد اور بے یقینی تو کمیونزم اور سوشلزم نے پھیلائی ہے۔ کارل مارکس یہودی سوشلزم کے فتنہ کا بانی ہے، ویسے قدیم
ایران میں بھی مزدک وغیرہ ملحد تھے۔ جن کی مساوات کا کاروبار اور تحریک ملتا ہے

(۶) پاکستان کے نصاب تعلیم کو نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ ہی ہونا چاہیئے جو کوئی اسے خیال خام یا ناقابل عمل سمجھتا ہے وہ صحت فکر سے محروم ہے اور پاکستان کے مقصد تخلیق کی یا تو اُسے
خبر نہیں ہے یا پھر وہ نظریۂ پاکستان یعنی "اسلام" کا دشمن ہے، علامہ اقبال کا کلام اور مولانا مودودی کی نثر پاکستان کے مقصد وجود سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں

## ممتاز مفتی (اسلام آباد)

مکرمی! ایڈیٹر محور۔ آپ کا خط ملا مسرت نہیں حیرت ہوئی آپ نے تکلیف فرما کر لفظ لفظ لکھا۔ یہ ساری نوازشوں کے ہے حوالوں کو نہیں ہونی چاہیے آپ کے مذاکرات میں میری شرکت
ممکن نہیں، ایک میں مفکر ہوں نہ ناقد ہوں دوسرے میرا ایمان ہے کہ بحث لاحق رفتہ کی ہے دیس میاستی ہے بحث سے کبھی کسی کا کچھ نہیں سنوارا ہے بگاڑا ہے۔ سوال میں ادب ٹھیک ہے طالعلم
ٹھیک ہے مقصدیت کو میں نہیں سمجھ پایا۔ یہ لفظ میرے سامنے آیا ہوا تھا اس کا ظاہر اور ہے باطن سیاست ہے۔ سیاست میرے نزدیک ہیرا پھیری ہے کچھ لوگ کہتے ہیں میں اس سیاست
کا حامی ہوں تم میرے حامی بن جاؤ نہیں تو ——— مجھے دھونس پسند نہیں۔ LIVE LET LIVE کا قائل ہوں

(۱) آپ کا پہلا سوال سیدھی بات کو دانشورانہ طور پر الجھایا ہوا ہے اکاؤنٹس کی بات کرنا بات کو الجھانا ہے سیدھی بات یہ ہے پڑھو پڑھو پڑھو لیکن پڑھنے کا دور ختم ہوا کتاب کا دور
ختم ہوا اب طالب علم کے لیے دو باتیں ہیں سیاسی تفریح اور امتحان پاس کرنا اور اس کے علاوہ جلدی جلدی جلدی۔

ادب ادب ہوتا ہے یا ادب ہوتا ہے یا نہیں ہوتا تعمیری اور تخریبی بے معنی صفات ہیں۔

(۲) درس گاہوں میں ہمیشہ مردے اکھاڑے جاتے ہیں جو نظریے رد ہو چکے ہوں وہ پڑھائے جاتے ہیں۔ جدید ادب نہیں پڑھایا جاتا درسگاہیں اور نصاب ماضی پرست ہیں

(۳) جس حد تک زندگی فحش ہے ادب بھی ہوگا اگر لڑکی اس لیے کپڑے پہنے تاکہ ننگی نظر آئے تو ادب کیا کرے البتہ زندگی سے زیادہ فحاشی آ جائے تو فحش ہوگا اس وقت مغرب کے
شہروں میں فحش ہی فحش ہے اس لیے وہ فحش نہیں رہا، نارمل ہو گیا ہے۔

(۴) ملحد ہو کر آپ اچھا ادب پیدا نہیں کر سکتے
اول تو آپ کا یہ مذاکرہ رسمی ہے سبھی لوگ رسمی بات کریں گے، افسوس کہ ہمارے نوجوان رسم کی زنجیروں کو نہ توڑ سکے،

## گوہر ملسیانی (صادق آباد)

(۱) ترقی پسند ادیبوں نے الحاد و شرک کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور خاص طور پر شاعری میں ایسے اشعار کی بھرمار ہے جن میں خدا، دین، پیغمبر، الہامی کتب وغیرہ
کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ ان ادیبوں نے اپنے لغو خیالات کو حسین الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اس لئے عام قاری شاید یہی سمجھتا ہے کہ ایک اچھا ادیب بننے کے لیے ملحد ہونا ضروری
ہے۔ مگر ان کے یہ شاہکار اپنی موت آپ مر جاتے ہیں ہمیشہ حق و باطل کی جنگ میں کامیابی حق کو نصیب ہوتی ہے اور دنیا میں وہ ادیب صف اول میں شامل ہوتے ہیں جنہوں نے الحاد و
شرک سے توبہ کی اس لیے میرے خیال میں یہ سوچ یکسر گمراہ کن ہے کہ اچھا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملحد ہو۔

(۶) جیسا کہ میں نے پہلے کسی جواب میں نصاب تعلیم کا ذکر کیا ہے کسی قوم کی ترقی اور تنزل کا دارومدار اس کے نصاب تعلیم پر ہے کیونکہ نوجوان نسل اپنے طریقے سے جب تک واقف
نہ ہوگی ایسی قوم اور ایسے ملک کے لیے معید ثابت نہیں ہوگی، چنانچہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں جو نعرہ لگایا گیا اور جسے ہم نظریۂ پاکستان کا نام دیتے ہیں وہ لاالٰہ کے
رموز میں پوشیدہ ہے اور اس کا حامل انسان عمل کا مرقع ہے کیونکہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا لحاظ عمل کا متقاضی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ پاکستان کے نصاب تعلیم میں نظریۂ پاکستان
کی روح اس طرح سمو دی جائے کہ وہ طلبہ کے ذہنوں کو متاثر کرتی جائے اور قلوب کو گرماتی جائے، چنانچہ نوجوانوں کے اندر جذبۂ عمل اُبھرے گا یہی نصاب تعلیم کا تقاضا ہے اس لیے
نصاب تعلیم کو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کرنا ایک عملی اقدام ہے

(قلمی مذاکرہ)

# ادیبوں کا خیال

پاکستان کے معروف ادیبوں کو اس نمبر کے لیے درج ذیل سوالنامہ بھیجا گیا۔ جس کے جوابات درج ہیں۔

(۱) طالب علم کے لیے اچھے تخلیقی ادب کو سمجھنے کی خاطر آپ کون سی کتابیں کون سی معیاری کتابیں مہیا کرنا پسند کریں گے ؟

(۲) درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے ادب کے انتخاب، مدوین اور ترتیب سے آپ کس قدر مطمئن ہیں ؟

(۳) تفریحی ادب، تعمیری ادب، تحریکی ادب، تینوں میں فرق ؟

(۴) ادب میں فحاشی اور بے مقصدیت کے کون سے سانچے ہیں کہ جن کے جاتے سے صاف ستھرا ادب تشکیل پا سکے ؟

(۵) کیا اچھا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملحد ہو ؟

(۶) نصاب تعلیم کو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کرنا آپ کے نزدیک خیالِ خام یا عملی بات ؟

## ماہر القادری (کراچی)

طالب علم کو تخلیقی ادب اور تعمیری ادب کو سمجھنے کے لیے ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں جو صحیح افکار کی ترجمان ہوں اور رسائل و جرائد میں صحت پائی جاتی ہو جسے "ترقی پسند ادب" یا "جدیدیت" کہا جاتا ہے اس میں بڑی کمزوریاں اور گمراہیاں ہیں۔ ایسی کتابیں نمایاں ہیں جیسے "ادب عالیہ" طالب علم کے ذہن و فکر اور شعور کی تربیت و تہذیب کرتا ہے۔ سب سے بڑی چیز ذہن و فکر کا سلجھاؤ ہے۔

(۲) درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے ادب کے انتخاب کے بارے میں راقم الحروف پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس انتخاب میں ناہمواری ملتی ہے مثلاً ——— لستی بھی، جسے عروض کی اصطلاح میں "منتشر گرہ" کہتے ہیں میں نے دو تین برس پہلے بچوں کے نصاب کی کتاب میں نامر کے بارے میں پڑھا کہ وہ "کال" بھی ہوتی ہے حالانکہ کالی کی جگہ "اودی" لکھا جانا چاہیے تھا۔ اس بات کو غالباً ۲۴ برس ہو رہے ہیں کراچی یونیورسٹی کے بی اے کے اردو نصاب میں میر تقی میر کی وہ غزلیں دی گئیں جو انتہائی پست اور سطحی تھیں۔ اب سے پچاس برس پہلے انگریز کے زمانہ میں میٹرک اور انٹرنس کا جو اردو نصاب تھا اس میں ایک بھی عاشقانہ غزل نہ تھی۔ درسی کتابوں میں بھی کئی برس سے سیاست داخل ہو گئی ہے مثلاً سندھ یونیورسٹی کے نصاب میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے والد کو "بڑے آدمی" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے نصاب کی تدوین میں بھی سفارشیں چلتی ہیں اور صورت حال کچھ "تخیل ماہی" کی سی پیدا ہو گئی ہے۔

(۳) تفریحی ادب اس ادب کا نام ہے جس میں تفریح و انبساط کے عناصر و عوامل جائز حدود میں پائے جاتے ہیں۔ تفریح زیادہ شوخ ہو جائے تو "پھکڑپن" بن جاتی ہے۔ تفریحی ادب دل و دماغ کی تفریح کے لیے بہت ضروری ہے۔ کوئی آدمی کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، اس کا دل بھی لطائف و ظرائف سے لطف لیتے، مسکرانے اور ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے خوش

# علامہ اقبال



شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لیے — کہہ گیا ہے حکیمِ قاآنی
"پیشِ خورشید برمکش دیوار
خواہی از صحنِ خانہ نورانی"

## تصورِ علم

علم از سامانِ حفظِ زندگی است — علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
علم و فن از پیش خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ زادانِ حیات

❦

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ — کیا ہے جس کو خدا نے دلِ نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

❦

## تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

❦

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

❦

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

❦

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

❦

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ مسرت نہ نگاہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

❦

## مغربی تعلیم اور اس کے نتائج

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم  ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

---

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا  کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

---

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

---

آہ مکتب کا جوانِ گرم خون  ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں!

---

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روارو  اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں  جس علم سے حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

---

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

---

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض  دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق  کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

---

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک  شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیمِ جدید  میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

---

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر  لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم  کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما  لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"

---

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی  قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر  وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

## پاک و ہند کے تعلیمی ادارے

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا  موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے  پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

## مسلمان طالب علم سے

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے  قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا  زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا  جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا  جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

صلاح الدین احمد

# تعلیم کے حزنیہ المیے

[illegible] برسوں پہلے ہمارے معاشرے میں ایک حوصلہ شکن سانحہ [illegible] کی برتری کو [illegible] اور اسے یہ یقین تھا کہ سورج چاہے مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہونے لگے، انگریز کا آفتاب اقبال کبھی غروب نہیں ہوگا اور اس کی سطوت اور حاکمیت کی دھوپ ہمارے وطن کے در و دیوار پر ہمیشہ تک پھیلی رہے گی۔

## کہن سال فرنگ

لیکن اس طبقے کی [illegible] اور [illegible] آرزوؤں کے باوجود [illegible] جنگ عالمگیر کے [illegible] مغرب کی [illegible] کرنے لگا اور آخر وہ وقت بھی آن پہنچا [illegible] کہن سال [illegible] مشرق کے [illegible] کم از کم جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا [illegible] آخری ایام ہی میں اس [illegible] اصلاحات کی تھیں [illegible] کے ساتھ اپنی زندگی کے شعبے سے مغربی [illegible] انگریزی [illegible] سے قطع [illegible] سودیشی چیزیں استعمال کرے، اپنی زبان بولے اور اسی میں لکھے پڑھے اور اپنی قومی تہذیب کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کرتے [illegible]

## تہذیبی غلامی

سیاسی غلامی اپنے ساتھ مختلف قسم کی [illegible] غلامیاں لیکر آتی ہے [illegible] ظاہری غلامی سے بہت زیادہ خطرناک اور [illegible] سیاسی استبداد سے اس قدر خائف نہیں ہوتیں [illegible] کیونکہ سیاسی تعلق [illegible] ایک [illegible] ہے [illegible] لیکن اگر کسی محکوم قوم نے حاکم قوم کی [illegible] غلامی قبول کر لی تو پھر [illegible] آزادی کے باوجود [illegible] ہمیشہ [illegible] آزادی کی روح [illegible] نہیں ہو سکتی

## ترکی کی مثال

ہمارے اپنے زمانے میں [illegible] ترکی آزاد ہوا اور اس نے [illegible] قومی زندگی [illegible] پہلا کام ترکی حکومت نے [illegible] یورپ اور ایشیا [illegible] عالم میں [illegible] مدارس بند کر دیے اور [illegible] اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی [illegible] ترکی کے [illegible] مصطفیٰ کمال نے ترکی [illegible] کے سلسلے میں [illegible] کام کیے [illegible] کا نام عظیم [illegible] اپنی قوم کی آنے والی نسل [illegible] ملک کی تعمیر [illegible] غیر ملکی [illegible] آزاد کر دیا [illegible] پورے اعتماد اور [illegible] کے ساتھ اپنے [illegible] اور خود [illegible] اپنے اسلاف سے ملا ہے اس کی [illegible] تہذیب کے لیے ایک [illegible] مستقبل تعمیر کرے [illegible] ایک غیر معمولی استقلال اور [illegible]

## بزور تقدیر

اس میں شک نہیں کہ ترکی نے اپنی آزادی بزور شمشیر لی تھی اور ہم نے محض بزور تقدیر [illegible] اس ملک نے اپنی سیاسی آزادی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی [illegible] آنے والی نسلوں کو ظاہری آزادی کے ساتھ ساتھ باطنی اور ذہنی آزادی کی نعمت سے مستفیض کیا جائے [illegible] ہم نے [illegible] اس [illegible] اہم دولت کے تحفظ کو [illegible] اور [illegible] سے پاؤں پھیلا کر سو گئے۔

## یہ قائدین کرام

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وطن عزیز بظاہر آزاد ہے لیکن درحقیقت [illegible] ورثے کے [illegible] اس ملک میں [illegible] اور ہمارے اکابر اور [illegible] قبول کیا [illegible] اس کے اعلیٰ [illegible] طبقے [illegible] آج ہمارا [illegible] طبقہ [illegible] کا [illegible] گیا ہے [illegible] کے مطابق قوم [illegible] اس طبقے نے ایک [illegible] احساس کمتری [illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible] حالات [illegible] اگرچہ [illegible] قابل برداشت تھی لیکن [illegible] اپنی نسل [illegible] اس کے گزشتہ صاحب [illegible] اور اس کا [illegible] طبقے کی اولاد [illegible] زندگی میں داخل ہوگی تو اس کے پاؤں [illegible] ہوگا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی نصب العین ہوگا اور نہ اسے اپنی منزل ہی کہیں نظر آئے گی

موجودہ صاحبِ ذوق لوگوں کا گذارہ کسی نہ کسی طرح اس لئے ہوتا جا رہا ہے کہ ہم ابھی دورِ تعمیر ہی سے گزر رہے ہیں۔ دورِ برسرِ اقتدار طبقے نے ملک کی پریشان صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے یہ آسانی پیدا کر لی ہے کہ پاکستان میں بھی ایک عرصۂ دراز تک وہی اسلوبِ کار، وہی روشِ زندگی اور وہی زبان سرکاری رائج رہے گی جو انگریز نے اپنے ورثے میں چھوڑی ہے۔ ہماری قسمت جیسے زبان کے معاملے میں حکومت کی منظوری حاصل ہے، آسانی سے سالہا سال تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارا عام ہماری زبان کا سا ایک طبقہ جو انگریزی سے متعلق ہے وہ حاکم بن جاتا ہے اور انسان اور زراعت سے اپنے تعلق کو ختم کر دیتا ہے۔ اصل مستحق آزادی کا زمانے کی روح کو سمجھ کر اور اپنی اولاد کے مستقبل کے لئے پورا احساس اور تعلق ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی میں یہی سہانے سپنے اور سنہرا معاشرہ اختیار کرے گی اور ملک کے دوسرے طبقوں پر برسرِ حاکم بن کر انگریزی ماحول کی صحبت کے وہ منتشر روایات اور کردار ہے کی جو ہمارے انگریزی حاکموں سے ملی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ دورِ ایام اور گردشِ زمانہ کے تاریک سے بالکل بے خبر اور بے پرواہ ہے۔ قطعِ نظر اس امر کے کہ اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس ملک کے وجود میں آنے کا حقیقی باعث کیا تھا اور پاکستان کی بنیاد کن اصولوں پر رکھی گئی تھی اور اس کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس طبقے کا کیا فرض ہے، جسے عوام کی رہبری اور ان پر حکومت کرنے کی سند عطا کی گئی ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر اور بے پرواہ ہیں، جو زمانے کی چند دنوں کروٹوں کے بعد ان کے اخلاف کو پیش آنے والے ہیں۔

## اپنا رنگ

زمانے کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمارا ملک ایک سرے سے لے کر دوسرے تک ایک نہایت گہرے رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ وہ اپنے ملکی تمدن اور ملی معاشرت کے سانچے میں ترقی کی شاہراہ پر نہایت استقلال اور سرعت سے گامزن ہے اور کوئی اس بات سے کہ وہ دنیا کی سیر اقوام میں شامل ہو جائے گا، وہ سرِ تسلیم خم کرتا اور نہ ہی رکتا ہے، بلکہ وہ اپنے مخصوص رنگ کو نکھار رہا ہے جس میں اس کی روایات اور عقیدے کی سچائی اور قدامت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی اور ہمہ گیری بھی جھلک رہی ہے۔ یہ اس کا اپنا رنگ ہے اور یہی رنگ اسے دنیا کی قوموں میں ایک مقامِ امتیاز دلائے گا۔

## وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ؟

اس کے برعکس ہم جمہوری اداروں اور ان جیسے ایوانوں سے آزاد کہلانے لگ گئے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ ہم کچھ ہی آزاد ہو جائیں اور اس رنگ میں رنگے جائیں جو ہمارا اصلی رنگ ہے جسے قرآن کی زبان میں صبغۃ اللہ کے مبارک نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ ہماری قوم کا رنگ ہے اور اس میں ہماری ملت کا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم نے اگر یہ رنگ اختیار نہ کیا اور اسی زندگی اور اپنی تہذیب کو اسی رنگ میں نہ رنگا تو یقیناً ہم بہت جلد حرفِ غلط کی طرح زمانے کی لوح سے مٹ جائیں گے۔ لیڈروں اور عوام کے نمائندوں کے لئے زندگی کی راہوں میں یقیناً کوئی مقام نہیں اور اگر قدرت کی جانب سے انہیں سانس لینے کی کچھ مہلت مل گئی ہے تو انہیں اسے زندگی نہیں سمجھنا چاہئے کہ حقیقی زندگی سے اس کا کوئی علاقہ نہیں اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب سیلِ زمانہ انہیں ایک تنکے کی طرح بہائے جائے گا، کیونکہ انہوں نے اس فرصت میں جو انہیں عطا ہوئی تھی، اپنی جڑیں جو ان کی زمین میں گاڑنے کی کوشش نہیں کی۔

وقت ہے کہ ہمارا متعدد طبقہ اب بھی یہ سمجھ جائے کہ زمانے کا ہر قدم آگے کی طرف اٹھ رہا ہے اور وہ عوام جن پر حکومت کرتے اور جن سے علیحدہ رہ کر بھی اپنے لئے نام رہبری حاصل کرتے کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں، بہت جلد بیدار ہونے والے ہیں اور جب وہ ایک مرتبہ بیدار ہو گئے تو انہیں سلا دینا ان زمانوں کے بس میں نہیں رہے گا، جنہوں نے ایک مصنوعی اور غیر حقیقی فضا میں نشوونما پائی ہے۔ اور جو ان کے جذبات و احساسات اور ان کے معاملات روزانہ واقعات سے نا آشنا ہیں۔ اس لئے یہ اس طبقے کے لئے فائدے کی بات ہے کہ وہ اس آنے والے وقت سے ڈرے اور اس خطرناک صورتِ حالات کا احساس کرے جو بہت جلد پیش آنے والی ہے۔

## مبارک ہیں وہ ....

مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے عوام سے رشتہ جوڑنے میں پہل کی اور اپنی اولاد کو انہیں روایات کے مطابق پرورش کیا ہے جو ہماری ملکی اور ملی تہذیب سے منسوب ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں ایک پاکیزہ مشرقی فضا پائی جاتی ہے اور جن کے بیٹے اور بیٹیاں اپنے دیس کی زبان بولتے ہیں، اور اسی میں اپنی روح کی تسکین تلاش کرتے اور پاتے ہیں اور مبارک ہیں وہ خاندان جن کے چشم و چراغ اپنے ملک و ملت اور اپنی تہذیب و تمدن کی محبت سے سرشار ہیں۔ ایک ایسی محبت سے جو ان کے ساتھ جوان ہوگی اور ان سے ایسے کارنامے انجام دلائے گی جو ان کے لئے اور ان کے خاندان اور ان کے وطن کے لئے سرمایۂ افتخار ہوں گے۔

## تاریخ کی شہادت

ہمارا یہ عقیدہ کوئی عارضی احساس نہیں بلکہ حقیقت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، اس برِ عظیم کے مسلمانوں کی گذشتہ صد سالہ تاریخ کے ایک نہایت سرسری مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان ایک سو برس میں ہمارے ان جتنے اکابر پیدا ہوئے انہوں نے یا تو مکتبوں میں تعلیم پائی، یا ایسے ابتدائی مدارس میں جہاں عوام کے بچے اپنی ملکی زبان میں تعلیم پاتے تھے۔ پھر ان کا جوہر کھل چکا، پھر وہاں سے نکل کر وہ اعلیٰ مدارس یا خود مدرسۂ زندگی میں داخل ہوئے اور قوم و ملک کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے۔ ان میں سے شاید ایک بھی عظیم انسان ایسا ہوگا جس نے ہمارے مسلمانوں کے کسی نیم مذہبی مدرسے یا امراء کی کسی مخصوص درسگاہ میں تعلیم پائی ہو۔ یہ سچ ہے کہ ان مدارس نے انگریز کے عہد میں بعض ایسے طلبہ ضرور پیدا کئے جنہوں نے وقتی استعمار کو تقویت پہنچانے میں حصہ لیا کہ یہی انہیں سکھایا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان مدارس کے اکثر فارغ التحصیل طلبہ حقیقی زندگی میں کوئی حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکے۔ کیونکہ وہ زندگی کے اس دھارے سے ہمیشہ جدا رہے تھے، جو قوم کی اجتماعی ترقی کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس میں ڈوبنا اور ڈوب ڈوب کر ابھرنا ہی قومی تاریخ کے واقعات کی تشکیل کرتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے طلبہ اپنے موروثی تعلقات کے باعث بعض ایسے مناصب حاصل کر لیتے ہیں کا سابقہ ہو گئے جو مخصوص مفادات سے منسوب ہوتے ہیں، لیکن اپنی بنیادی کمزوریوں کے باعث اپنے صاحبِ ملک و قوم کو کوئی صحیح فائدہ نہ پہنچا سکے۔

اکابر سے قطعِ نظر زندگی کی عام راہوں پر نظر دوڑائیے تو سوائے چند طالب علموں کے کہ جو محض تعلیم اور ساری تاریخ ہی سے حاصل کی جا سکتی ہیں، ان خاص مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کسی نمایاں زندگی پر نمایاں نظر نہیں آتے۔ مقابلے کے امتحان ہوں یا کسی آزاد پیشے میں داخلہ، ہم نے یورپی طرز کے مدارس کے طلبہ کو ان میں بھی ناکام

/

خصوصی حاصل کرنے بہت کم دیکھا ہے۔ یہاں یہی ہوتا ہے کہ وہی اسکول زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں جو زندگی کی جدوجہد میں عوام کے دوش بدوش عوامی مدارس میں پڑھتے پڑھتے اور زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرتے چلے آتے ہیں

## لڑکیوں کی تعلیم

لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کی تعلیم کا معاملہ بھی کچھ ایسی ہی نوعیت رکھتا ہے۔ ہماری لڑکیوں کو کیا ہے وہ کتنی ہی تعلیم حاصل کر جائیں [illegible] کرنے کے بعد گھر چلانا، ماں بننا اور ملک کے چلنے والے معاشرے میں کامیاب زندگی بسر کرنا ہے۔ [illegible] اس زندگی کو خوش اسلوبی اور اولاد کے گرد گھر میں ہے [illegible] اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔

## کانونٹ کی تعلیم

پھر اگر خدمت خلق کا سوال بھی سامنے ہو تو ملک کی نسوانی اکثریت کے دکھ درد میں شریک ہونے کی اہلیت پیدا کرنا ازبس ضروری ہے اور کسی لڑکی کے لئے کانونٹ کی تعلیم حاصل کر کے [illegible] محالات میں سے ہے۔ جس بچی کو ملک کی زبان ہی سے پوری واقفیت نہ ہوگی وہ بھلا عام عورتوں کے مسائل اور ان کے جذبات سے کس طرح واقف ہو سکے گی [illegible] ایسی تعلیم و تربیت سے حاصل ہے۔ وہ ایک [illegible] لڑکی کے گرد ایک ایسی دیوار کھینچ دیتا ہے جو عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ پختہ اور بلند ہوتی جاتی ہے اور پھر اسے پھلانگ کر باہر آنا سخت مشکل ہو جاتا ہے

ان کے علاوہ ایک لڑکی کے لئے سب سے مبارک اور اہم فطری رواج کا ہے۔ کانونٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی میں اس قدر اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی شادی کے بعد تبدیل شدہ صورت حالات کو آسانی سے قبول کرے۔ کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسی ہی جگہ بیاہی جائے [illegible] اور مغربیت ہی کا دلدادہ ہو۔ اس صورت میں اس کی ازدواجی زندگی اس کے لئے ایک عذاب بن جائے گی۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ انگریزیت اور مغربیت ہماری اساس نہیں ہے اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک خارجی لیبل کی ہے اور کون جانتا ہے کہ [illegible] اس تعمیر پر خرچ ہے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ [illegible] طور پر یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور [illegible] روایات اور اپنی تہذیب کے متعلق اپنی [illegible] کم ہمتی کے باعث اور ایک شدید احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے سبب سے اپنی بنیادی خوبیوں اور خصوصیات کو [illegible] اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو [illegible] سے معذور ہیں

## یہ فرنگی مدارس

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے وہ یہ کہ جو صاحب استطاعت لوگ اپنے بچوں کو عام مدارس میں اس لئے تعلیم دلوانا نہیں چاہتے کہ ان مدارس کی عام فضا خراب ہوتی ہے اور [illegible] طلبا کی وجہ سے کوئی استاد کسی طالب علم کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دے سکتا اور استاد عموماً کم استعداد ہوتے ہیں؟ وہ کیا کریں؟ وہ فرنگی مدارس میں اپنے بچوں کو بھیجنا پسند کرتے ہیں اور وہ ان مدارس کی تعلیم و تربیت کے نتیجے کے طور پر ان کے بچوں کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے، وہ اسے [illegible] اور خاموشی سے قبول کرتے ہیں۔

## سنجیدہ کوشش کی ضرورت

یہ سوال بظاہر بہت اہم ہے اور اس کا قطعی جواب آسان نہیں ہے، لیکن اتنی بات بالکل ظاہر ہے کہ ایسے والدین نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اب تک کوئی شعوری اور سنجیدہ کوشش نہیں کی، حالانکہ یہ بالکل ممکن تھا کہ موجودہ فرنگی طرز سے ہٹ کر وہ یہاں ایسے مدارس قائم کرتے جن میں اعلیٰ درجے کے مدارس جاری کئے جا سکتے تھے، جن میں طلبا کی تعداد نسبتاً کم ہوتی، جن میں اساتذہ کا معیار قابلیت و تربیت نسبتاً بلند ہوتا اور جن میں اخلاقی لحاظ سے ایک صحت مند فضا جاری و ساری رہتی۔ درحقیقت ہماری نسل بیدار تھی اور ہماری حکومت کی اس حکمت عملی سے جسے کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں [illegible] اور جسے چلتے جانے کی حکمت عملی کہا جا سکتا ہے، اس ضروری مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی ورنہ یہ بات کیا مشکل تھی کہ ہماری حکومت جو روپیہ ہر ماہ [illegible] مدارس کے خرچ پر ہوتا ہے، اس کا ایک معتد بہ حصہ ایک خاص جماعت کے طلبا کی مفت تعلیم و تربیت پر خرچ ہوتا ہے، وہی روپیہ ہمارے اپنے اعلیٰ درجے کے اپنے ہی مدارس کو حسن و خوبی سے چلانے پر صرف کیا جاتا، مگر یہ حکومت نے یہ درد سر مول لیا اور نہ والدین ہی نے کوئی اجتماعی کوشش اس بارے میں کی اور دونوں ایک ایسے المیہ سے جو ہر ماہ عدم تک جا پہنچا ہے، اور جو تھوڑے عرصے کے بعد ایک تلخ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے، اپنی نسلوں کی بربادی اور ملک کی تباہی کا منظر دیکھتے رہے اور اب تک برابر دیکھتے چلے جا رہے ہیں

## ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے سربراہ کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دلانا ہماری موجودہ صورت حال میں ممکن نہیں لیکن ایسا ضرور ممکن ہے کہ جو ملک کے والدین انہیں بیرونی مدارس میں تعلیم دلوا سکتے ہیں وہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کریں کہ جو تعلیم ہم ہمارے اعلیٰ مدارس میں ان کے بچوں کو مل رہی ہے کیا وہ واقعی اس قوم کے شایان ہے جو ابھی ابھی اسلام کا نام لیکر اور اسی کا واسطہ دیکر بظاہر آزاد ہوئی ہے اور جس کے سامنے روئے زمین کا ایک وسیع اور بے پایاں میدان موجود ہے اور جسے تاریخ میں پہلی بار ایک عظیم کردار ادا کرنا ہے

اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یقیناً نفی اور شدید نفی میں ہے۔ پھر کیا ہمارے اہل فکر پہلی بار ایک ٹھوس اور حقیقی قومی مسئلے پر غور فرمانے کی تکلیف گوارا کریں گے۔ اہل ہمت کے لئے کوئی منزل دشوار نہیں ہوتی اور یہ منزل تو کوئی ایسی کٹھن منزل بھی نہیں ہے۔

## تعلیمی منصوبہ بندی

حکومت اگر یہ کہے کہ ہماری صوبائی حکومت اپنے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کی مدعی ہے۔ یہ دعویٰ یقیناً درست ہوگا لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس روپے اور اس کے اخراجات میں منصوبہ بندی اور راہنما معلومات کا کتنا دخل ہے۔ حکومت کے وسیع ذرائع تعلیم کی سطح بلند تر کرنے کے لئے یقیناً اہل ہیں، لیکن ایسی کوششیں اگر کسی منصوبے کے تحت بروئے کار لائی جائیں اور باقاعدہ صحیح اعداد و شمار حاصل کر کے ہم کی سمت [illegible] جائے تو کام کی طوالت اور وقت بہت کم ہو جایا کرتی ہے۔

مثلاً ابتدائی، اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل معلومات کا فراہم کر لینا ضروری ہے:

1 - متوسط اور اعلیٰ طبقے کے کتنے طلبا فرنگی، نیم فرنگی اور مسیحی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں؟

2 - ان مدارس میں ان طلبا کی اپنی مذہبی تعلیم کا بھی کوئی اطمینان بخش انتظام ہے کہ نہیں، یا وہ صرف دینیات کے اثرات قبول کرتے ہیں؟

۳ مجموعی طلباء کے ساتھ مسیحی طلبا کی کتنی تعداد تعلیم پاتی ہے اور کل تعداد سے اس کی نسبت کیا ہے اور ایسے کیا خاص رعایات حاصل ہیں

۴ - ان مدارس میں پرائمری اور سیکنڈری درجے کے طلبہ کے لئے ان کے والدین کو اوسطاً ماہوار کتنی رقم ادا کرنی پڑتی ہے ؟

۵ ان مدارس کو صوبے کی حکومت کتنی مدد دیتی ہے ان کی اپنی آمدنی کتنی ہے اور مشنری سوسائٹیوں سے انہیں کتنی مدد ملتی ہے ؟

۶ - صوبے کے مختلف حصوں میں حکومت نے کتنے اعلیٰ درجے کے مدارس یا پبلک سکول جاری کر رکھے ہیں ؟

۷ - ان میں کس درجے تک تعلیم ہوتی ہے اساتذہ کا معیار و قابلیت کیا ہے اور طلبا کی کتنی تعداد ان میں ہر سال داخل ہوتی ہے اور کس تعداد کو داخلے سے انکار کر دیا جاتا ہے ؟

۸ - ایسے مدارس میں والدین کو فی طالب علم اوسطاً کتنا خرچ پڑتا ہے ؟

۹ کیا حکومت اصلاع یا ملک کے مدارس میں تعلیم دلوانے والے والدین اس امر کے لئے تیار ہیں کہ ان مدارس وغیرہ میں فیس کا وہی معیار مقرر کر دیا جائے جو مسیحی مدارس میں رائج ہے ؟

۱۰ ایسی صورت میں حکومت کی امداد کی رقم فی مدرسہ اوسطاً کس قدر کم ہو جائے گی اور اس سکیم میں کچھ اضافہ کر کے حکومت ایسے مدارس کی تعداد بڑھانے پر کس حد تک تیار ہو جائے گی ؟

۱۱ حکومت کے زیر انتظام اعلیٰ مدارس میں زیر تعلیم طلبا کا ذریعہ تعلیم کیا ہے اور کیا ان میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے یا نہیں کہ اردو کو کاملاً ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے اور انگریزی کو ایک ثانوی درجہ دیا جائے ؟

۱۲ وہاں کے علاوہ طلبا اور طالبات پر اسی تہذیب اور مذہب کے ساتھ اثرات ثبت کئے جاتے ہیں یا نہیں ، اگر نہیں تو کیوں ؟

۱۳ - اعلیٰ مدارس اور عام مدارس سے جو طلبا کامیاب ہو کر نکلتے ہیں ، ملک کے امتحانات اور کالجوں میں ان کے نتائج کیسے رہتے ہیں ؟

۱۴ سیکنڈری تعلیم کے عام اور خاص مدارس کے طلبا کالجوں میں کس نسبت سے داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی مابعد مدرسہ زندگی میں انہیں کیا مشکلات اور مراحل پیش آتے ہیں ؟

۱۵ - اجتماعی زندگی میں ایسے طلبا دوسروں میں کیا اور کس قدر فرق پایا جاتا ہے ، جو خاص اور معمولی مدارس میں تعلیم پائے ہیں ؟

۱۶ ڈگری کے امتحانات میں امتیاز اور مقابلے کے امتحانات میں کامیابی زیادہ تر کن طلبا کو حاصل ہوتی ہے ؟ انہیں جو عام مدارس میں تعلیم پا کر یونیورسٹی میں جاتے ہیں یا انہیں جو خاص مدارس سے سینئر کیمبرج اور ریسرچ کے لئے کالج میں شامل ہیں فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں

۱۷ - ملک کی پبلک لائف میں ایسے طلبا کا کیا حصہ ہے

۱۸ - حکومت عام مدارس میں تعلیم پانے والے طلبا پر فی کس کیا خرچ کرتی ہے اور خاص مدارس کی تعلیم کے مصارف میں فی کس اس کا کتنا حصہ ہے ؟

۱۹ مسیحی سکولوں کو پڑھانے کے لئے اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت یافتہ استانیاں اس وقت کتنی تعداد میں دستیاب ہیں ؟

۲۰ - کیا آئندہ اس قسم کے اساتذہ کے حصول کے لئے حکومت کوئی منظم کوشش کر رہی ہے ؟

۲۱ - کیا مسیحی پرائمری مدارس میں اعلیٰ درجے کے اساتذہ مہیا کئے جاتے ہیں اور انہیں مناسب تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ اس مسئلے پر غور کیا گیا ہے اگر جواب اثبات میں ہو تو علیحدہ تفاصیل کیا ہیں ؟

۲۲ کیا نصاب تعلیم میں کوئی یکسانی اور ہمواری اس طرح کی موجود ہے کہ ملکی، ملی اور قومی عناصر تعلیم کو ہر مرحلہ پر بچے کی زندگی سے قریب تر لائے جائیں اور کیا پرائیویٹ و مشنری مدارس پر اس ضمن میں کوئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں ؟

۲۳ کیا موجودہ خاص مدارس کے طلبا کے والدین سے کبھی اس امر کے متعلق کوئی منظم استصواب کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں ماحول کو کس طرح دیکھنا چاہتے ہیں ؟

۲۴ کیا اس امر کی کوئی منظم جانچ کی گئی ہے کہ خاص مدارس میں والدین اپنے بچوں کو اعلیٰ انگریزی پڑھوانا چاہتے ہیں یا نہیں ؟

۲۵ کیا بچوں کی سکول کی زندگی اور ان کی گھریلو زندگی کے درمیان مطابقت کا کوئی منظم سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے ؟

۲۶ - کیا خاص اور عام دونوں قسم کے مدارس میں طلبا کی اخلاقی نشوونما پر خاص توجہ دینے کا کوئی منظم دستور موجود ہے ؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں ؟

۲۷ کیا مسیحی اور مشنری مدارس کی اخلاقی فضا اور عام مدارس کی اخلاقی فضا سے بہتر ہیں یا ہوں اگر ہوں تو اس کے اسباب کیا ہیں اور اس کمی کے عام کرنے میں کیا دشواریاں حائل ہیں ؟

## اصل خطرہ

میری ناچیز رائے میں حکومت کو فوراً اس ضروری مسئلے کی طرف توجہ کرنی چاہئے کیونکہ اگر مستقبل قریب میں قوم کی لیڈرشپ قوم سے جدا ہو کر رہ گئی تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے اور ظاہر ہے کہ موجودہ دور کا تعلیم یافتہ طبقہ جو موجودہ حال پیدا کر رہا ہے جس طرح غیر شعوری طور پر بڑھ رہا ہے وہ ایک ایسی نسل تیار کر رہا ہے جو ملک کو زیادہ سے زیادہ مغرب کے طرز کے سول سرونٹ دے سکے گی یا ایسی مغرب زدہ عورتیں جو مستقبل کے کسی کام میں کوئی مفید کام نہ کر سکیں گی۔ اور اگر ملک کی لیڈرشپ صرف اسی طبقے سے حاصل کی جائے گی اس لئے یہ خطرہ ایک حقیقی خطرہ ہے اور ہم جس قدر جلد اس خطرے کا سدباب کر سکیں اسی قدر اچھا ہو گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم ؎

***

# مرحلہ در مرحلہ

(مقالہ نگار نے اس مضمون میں نظامِ تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر اٹھانے کے لئے اور اس کے نفاذ کا عملی نقشۂ کار واضح کیا ہے ——————— مدیر)

اگر ہمیں اپنے موجودہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کرنی ہے تو ہمیں ہر قدم پر ایک انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دئیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ یعنی مدارس کا نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک ایسا نظامِ تعلیم بنانا چاہئے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم اور ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔ اسی نظامِ تعلیم کا نقشہ اور اس کے قائم کرنے کا طریقہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

## مقصد کا تعین

اس نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل میں اولین چیز جسے ہم کو سب سے پہلے طے کرنا چاہئے یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد بس علم حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل غیر جانبدار تعلیم دی جانی چاہئے تاکہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل معروضی مطالعہ (OBJECTIVE STUDY) کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کر سکیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف [illegible] کیا کرتے ہیں، انسان نہیں کر سکتے۔ انسان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہرحال ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ زندگی میں اپنا مقصد رکھتا ہے اور وہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے جو کچھ بھی سنتا ہے اور جو کچھ بھی معلومات حاصل کرتا ہے اسے اپنی اس فکر کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے جو اس کے اندر بنیادی طور پر موجود ہوتی ہے۔ پھر اسی فکر کی بنیاد پر اس کا وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جس کو ہم اس کا کلچر کہتے ہیں۔ اب اگر ہم ایک کلچر رکھتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا ایک نظریۂ زندگی ہے، جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نسلوں کو اس غرض کے لئے تیار کرنا چاہئے کہ وہ ہمارے اس کلچر کو سمجھیں، اس کی قدر کریں، اس کو زندہ رکھیں اور آگے اسے اس کی اصلی بنیادوں پر ترقی دیں۔ دنیا کی ہر قوم اسی غرض کے لئے اپنا مستقل نظامِ تعلیم قائم کیا کرتی ہے۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں ہوئی جس نے ایسا نظامِ تعلیم خالص غیر دینی بنیادوں پر قائم کیا ہو جو اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دیتا ہو اور اپنے ہاں ایسے غیر جانبدار نوجوان پرورش کیا کرتی ہو جو تعلیم سے فارغ ہو کر آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کریں کہ انہیں اپنی قومی تہذیب کی پیروی کرنی ہے یا کسی تہذیب کی۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی آزاد قوم معلوم نہیں ہوئی جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کئے بغیر اس کے سانچے میں اپنی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔ یہ بات کہ کوئی قوم اپنے لئے دوسروں کا تجویز کردہ ایک ایسا نظامِ تعلیم اختیار کرے جو اس کے نوجوانوں کی نگاہ میں اس قوم اور اس کے مذہب، اس کی تہذیب، اس کی تاریخ، ہر چیز کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دے اور ان کے دل و دماغ پر انہی لوگوں کے تصورات و نظریات کا نقشہ لگا دے جنہوں نے اس کے لئے یہ نظام تجویز کیا ہے، تو میرے نزدیک یہ ایسی بدترین حماقت ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ عقل قوم بحالتِ ہوش و حواس نہیں کر سکتی۔ یہ حماقت اگر پہلے ہم کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے کر رہے تھے تو اب آزاد ہونے کے بعد اسے جوں کا توں جاری رکھنے کے لئے کوئی معنی نہیں۔ اب تو نظامِ زندگی ہمارے اختیار میں ہے۔ اب لازماً ہمارے پیش نظر تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب کو اور ہماری قومی تہذیب ۔۔۔ ہماری قومی تہذیب ہمارے دین کے سوا اور کیا ہے؟ لہٰذا ہمارے دین کو اچھی طرح سمجھتے ہوں، اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں، اس کے اصول کو جانتے ہوں اور ان کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہوں، اس کے مطابق مضبوط سیرت اور اعلیٰ اخلاق رکھتے ہوں اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔

## دین و دنیا کی تفریق مٹادی جائے :-

دوسری چیز جو ہمیں اس نظام تعلیم میں بطور اصول کے پیش نظر رکھنی چاہئے اور جس کی بنیاد پر ہمارا سارا نظام تعلیم بننا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہم دین اور دنیا کی اس تفریق کو ختم کردیں۔ دین و دنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے، یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں، اپنے نظام تمدن میں اور نظام مملکت میں دین اور دنیا کی تفریق کے اس تخیل کو قبول کرلیں۔ ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دینی ہو اور ایک تعلیم دنیوی۔ اس کے برعکس ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری پوری کی پوری تعلیم دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔ دنیوی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو سمجھیں اور دنیا کے سارے کام چلانے کے قابل ہوں اور دینی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو دین کے نقطہ نظر سے سمجھیں اور دین کی ہدایت کے مطابق اس کا سارا کام چلائیں۔ اسلام وہ مذہب نہیں ہے جو آپ سے یہ کہتا ہو کہ دنیا کے کام آپ جس طرح چلاتے رہیں اور بس اس کے ساتھ چند عقائد اور عبادات کا ضمیمہ لگاتے رہیں۔ اسلام زندگی کا محض ایک ضمیمہ بن کر کبھی قائم نہیں رہا اور نہ آج رہ سکتا ہے۔ وہ تو پوری کی پوری زندگی میں آپ کا رہنما اور پوری زندگی کے لئے آپ کا طریق عمل بننا چاہتا ہے۔ وہ دنیا سے الگ محض عالم بالا کی باتیں نہیں کرتا بلکہ پوری طرح دنیا کے مسئلے پر بحث کرتا ہے۔ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے، اس دنیا میں آپ کس غرض کے لئے آئے، آپ کا مقصد زندگی کیا ہے۔ کائنات میں آپ کی اصل پوزیشن کیا ہے اور اس دنیا میں آپ کو کس طریقے سے کن اصولوں پر کام کرنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت میں جو کچھ بھی آپ کو پھل ملنے والے ہیں وہ اس بات پر منحصر ہے کہ دنیا کی کھیتی میں آپ کیا بوتے ہیں۔ اس کھیتی کے اندر زراعت کرنا وہ آپ کو سکھاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں آپ کا سارا طرز عمل کیا ہو جس کے نتیجے میں آپ کو آخرت میں پھل ملے۔ اس قسم کا ایک دین کیسے یہ بات گوارا کرسکتا ہے کہ آپ کے ہاں ایک تعلیم دینی اور دوسری دنیوی ہو۔ یا ایک دنیوی تعلیم کے ساتھ محض ایک مذہبی ضمیمہ لگا دیا جائے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری تعلیم دینی نقطۂ نظر سے ہو۔ اگر آپ فلسفہ پڑھیں تو دینی نقطۂ نظر سے پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان فلاسفر بن سکیں، آپ سائنس پڑھیں تو ایک مسلم سائنٹسٹ بن کر نکلیں، آپ تاریخ پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان مؤرخ بن سکیں۔ آپ معاشیات پڑھیں تو اس قابل بنیں کہ اپنے ملک کے پورے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ آپ سیاسیات پڑھیں تو اس لائق بنیں کہ اپنے ملک کا نظام حکومت اسلام کے اصولوں پر چلا سکیں۔ آپ قانون پڑھیں تو اسلام کے معیار عدل و انصاف پر معاملات کے فیصلے کرنے کے لائق ہوں۔ جس طرح اسلام دین و دنیا کی تفریق مٹاکر پوری کی پوری تعلیم کو دینی بنادینا چاہتا ہے اس کے بعد کسی جداگانہ مذہبی نظام تعلیم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کے ہی کالج آپ کے لئے امام اور مفتی اور علماء دین بھی تیار کرسکیں گے اور آپ کی قومی حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لئے سیکرٹری اور ڈائرکٹر بھی۔

## تشکیل سیرت :

تیسری بنیادی چیز جو ہمیں نظام تعلیم میں ملحوظ رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس میں تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ محض کتابیں پڑھا دینے اور محض علوم و فنون سکھا دینے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ایک ایک نوجوان کے اندر اسلامی کیریکٹر پیدا ہو، اسلامی طرز فکر اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو۔ خواہ وہ سائنٹسٹ ہو، خواہ وہ علوم عمران کا ماہر ہو، خواہ وہ ہماری سول سروس کے لئے تیار ہو رہا ہو۔ جو بھی ہو اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کیریکٹر موجود ہونا چاہئے۔ یہ چیز ہماری تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہونی چاہئے۔ جس آدمی میں اسلامی اخلاق نہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بہرحال ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔

ان اصولی باتوں کی وضاحت کے بعد اب میں تفصیل کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ وہ اسلامی نظام تعلیم جس کو ہم یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں اس کا عملی نقشہ کیا ہے۔

## ابتدائی تعلیم

سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کو لیجئے جو اس عمارت کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھائیے جو آج کل آپ کے پرائمری سکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کئے گئے ہیں اور آئندہ کئے جائیں، ان سب سے فائدہ اٹھائیے، لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو ان کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں۔

اوّل یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔ اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے آیات الٰہی پھیلی ہوئی ہیں جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمران ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لیے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے پرائمری سکول کے آخری مرحلے تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس بھی اسی طرز پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں، حتیٰ کہ وہ الف سے انار اور ب سے بم نہ سیکھے بلکہ اللہ سیکھے۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اول روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کردے اور ان کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحل تعلیم تک جب کہ وہ ڈاکٹر بنیں گے یہی بنیاد اور یہی جڑ کام دیتی رہے گی۔

دوم یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔ وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا ہے ان کی قدر اور ان کی رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے ان کے لئے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں اور طرح طرح کی بددیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلے ہیں جہاں طوطے مینا اور گائے بیل کے سبق تو پڑھائے جاتے ہیں، مگر اخلاقی سبق نہیں پڑھائے جاتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر طالب علم کو جو تعلیم دی جائے اس کی رگ رگ میں اخلاقی مضامین پیوست ہوں۔ اس کے اندر رشوت خوری کے خلاف شدید جذبۂ نفرت ابھارا جائے، اس کے اندر حرام طریقوں سے مال کمانے اور کھانے والوں پر سخت تنقید کی جائے اور اس کے برے نتائج بچوں کے ذہن نشین

سکھنے جائیں۔ اس کے علاوہ جھوٹ ہے، دھوکے اور فریب ہے، خود غرضی اور نفس پرستی، چوری اور جعل سازی ہے، بد دیانتی اور خیانت ہے، شراب اور سود اور قمار بازی ہے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت دلوں میں بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ان رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ اخلاقی برائیوں کا اتنا بھی ہو اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں یہاں تک کہ ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ واہ واہ کرنے اور بڑھاوا دینے والے۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے ان کو دلنشین انداز میں بیان کیا جائے ان کی طرف رغبت دلائی جائے، ان کی تعریف کی جائے، ان کے اچھے نتائج تاریخ سے مثال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے ان کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں حقیقت میں انسانیت کے لئے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دلنشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصلی خوبیاں کیا ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں ان کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاس عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندی حدود کا، اکل حلال اور ترک حرام کا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہنے کا سبق دیا جائے اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشو و نما پائیں۔

سوم یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے مبادی حقوق اور اساسات بچوں کے ذہن نشین کرا دئے جائیں۔ اس کے لئے اگر دینیات کے ایک الگ کورس کی ضرورت محسوس ہو تو بنایا جا سکتا ہے لیکن بہر حال صرف اسی ایک کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روح تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہئے کہ بچہ یہ محسوس کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہ کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لئے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

چہارم یہ کہ بچوں کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دئے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہییں۔ ان کو صرف بیان ہی نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کیا جائے جس سے بچے یہ محسوس کریں کہ ہمارے لئے یہی احکام ہونے چاہئیں۔ یہ احکام بالکل برحق ہیں اور ہم کو ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے ان احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

**ثانوی تعلیم:** اس کے بعد ہائی سکول کی تعلیم کو لیجئے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز جسے میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے حدیث عربی میں ہے ابتدائی صدیوں کے فقہا اور علماء نے جتنا کام کیا ہے وہ سب عربی میں ہے اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس میں اسلامی ذہنیت اچھی طرح پیدا ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لئے ہم عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی سکول سے فارغ ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عربی عبارت کو صحیح پڑھ اور سمجھ سکے۔ ثانوی تعلیم کا دوسرا مضمون قرآن مجید ہونا چاہئے جس سے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ وقت بچانے کے لئے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ہائی سکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان قرآن کے ذریعہ پڑھائی جائے۔

تیسرا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہئے جس میں طلبا کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں۔ انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے۔ انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے۔ ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کئے جائیں کہ وہ محض اپنے باپ دادا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ ان کی اپنی رائے بن جائیں۔

اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات کو بھی ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ ساتھ بیان کیا جائے اور تاریخ سے نظیریں پیش کر کے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور کتابی نظریے نہیں ہیں بلکہ عمل میں لانے کے لئے ہیں اور فی الواقع اس سیرت و کردار کی ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے طلبہ خود ان اوصاف کو برا سمجھیں ان سے بچیں اور اپنی سوسائٹی میں ان صفات کے لوگوں کو ابھرنے نہ دیں اور اسلام جن اوصاف کو مقصود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں۔ انہیں اپنے اندر نشو و نما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔

میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ مفصل احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اس کو شخصی اور رواجی زندگی، خاندانی زندگی اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق ان تمام ضروری احکام سے

واقف ہونا چاہیے جو ایک جوان آدمی کے لئے درکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان احکام کو تفصیل کے ساتھ جانے کہ مفتی بن جائے لیکن اس کی معلومات اتنی ضرور ہونی چاہئیں کہ وہ اس معیار کی زندگی بسر کر سکے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہئے۔ کیسی توبہ ہو کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو حتیٰ نکاح، طلاق، رضاعت اور وراثت کے متعلق کوئی سرسری علم بھی نہیں ہوتا اور اس نادانی کی وجہ سے بسا اوقات وہ شدید غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے سخت قانونی پیچیدگیاں واقع ہو جاتی ہیں۔

تاریخ کی تعلیم میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی سکول کے طلبہ (جن غریبوں کو آج تک تاریخ انگلستان پڑھائی جا رہی ہے) نہ صرف اپنے ملک کی تاریخیں پڑھیں بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی تاریخ سے واقف ہوں۔ ان کو تاریخی اعتبار سے واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ جان لیں کہ اسلام ایک ازلی و ابدی تحریک ہے۔——— ان کو سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ ان مثالی شخصیتوں سے روشناس ہو جائیں جو ان کے لئے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک کی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ بھی ان کے سامنے آ جانا چاہئے تاکہ وہ جان لیں کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں۔ جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی سکول کے مرحلے میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے۔ مثلاً ہائی سکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہئے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلبہ کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہئے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالب علموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں اور باقاعدہ بھی کوئی ایسا طالب علم مدرسے میں نہ رہنا چاہئے جو مدرسے کے اوقات میں نماز نہ پڑھتا ہو۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ نماز ہی وہ بنیاد ہے جس پر عملاً اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے۔ یہ بنیاد منہدم ہو جانے کے بعد اسلامی زندگی کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لحاظ سے بھی آپ کو سوچنا چاہئے کہ ایک طرف تو آپ ایک طالب علم کو یہ بتاتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور تیرے خدا نے تجھ پر فرض کی ہے۔ دوسری طرف آپ اپنے عملی برتاؤ سے زور بہ بات اس کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اس فرض کو فرض جانتے اور مانتے ہوئے بھی اگر تو ادا نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ اسے دانستہ منافقت کی اور [illegible] اور دوہری سیرت کی مشق کرا رہے ہیں۔ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ یہ تعلیم و تربیت پا کر جب وہ باہر نکلے گا تو آپ کے تمدن اور آپ کی ریاست کا ایک فرض شناس کارکن ثابت ہوگا؟ جو اپنے سب سے بڑے فرض کی چوری میں مشاق ہو جانے کے بعد تو وہ ہر فرض میں سے چوری کرے گا، خواہ وہ سوسائٹی کا فرض ہو یا ریاست کا یا انسانیت کا۔ اس صورت میں آپ کو اسے ملامت نہ کرنی چاہئے بلکہ اس نظام تعلیم کو ملامت کرنی چاہئے جس نے اول روز سے اس کو یہ سکھایا تھا کہ فرض ایک ایسی چیز ہے جس کو فرض جاننے کے بعد بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایسے نوجوانوں کو خدا سے بے وفائی سکھانے کے بعد آپ ہرگز امید نہ رکھیں کہ وہ قوم، ملک، ریاست، کسی چیز کے بھی مخلص اور وفادار ہوں گے۔ تعلیم کے کورس میں خدا خیالات اور معیاری اوصاف بیان کرنے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے اگر سیرت و کردار کو ان خیالات اور معیارات پر قائم کرنے کی عملاً کوشش نہ کی جائے۔ دل میں اونچے خیالات رکھنے اور عمل ان کے خلاف کرنے سے ذہن اور سیرت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی سیرت ہی بودی اور کھوکھلی ہو وہ مجرد اپنی ذہنی اور علمی طاقتوں سے کوئی کارنامہ کر کے نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے ہمیں ثانوی تعلیم کے مرحلے میں جب کہ نئی نسلیں بچپن سے جوانی کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ایک ایک لڑکے اور لڑکی کے اندر مضبوط سیرت پیدا کریں اور انہیں یہ سکھائیں کہ تمہارا عمل تمہارے علم کے مطابق ہونا چاہئے۔ جس چیز کو حق جانو اس کی پیروی کرو جسے فرض جانو اسے ادا کرو۔ جسے بھلائی جانو اسے اختیار کرو جسے برا جانو اسے ترک کر دو۔

جہاں تک ثانوی مرحلے کے عام مضامین کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ جاری رہیں گے۔ البتہ ان کے نصاب کی کتابیں اسلامی تصورات کی روشنی میں اور ان کے ساتھ از سر نو تیار کرنا پڑیں گی۔

**اعلیٰ تعلیم**

اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کو لیجئے۔ اس مرحلے میں ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے لئے ایک عام نصاب ہو جو تمام طلبہ اور طالبات کو پڑھایا جائے خواہ وہ کسی شعبۂ علم کی تعلیم حاصل کر رہے ہوں، اور ایک نصاب خاص ہو جو ہر شعبۂ علم کے طلبہ و طالبات کو ان کے مخصوص شعبے کی مناسبت سے پڑھایا جائے۔

عام نصاب میں میرے نزدیک تین چیزیں شامل ہونی چاہئیں

(۱) قرآن مجید اس طرح پڑھایا جائے کہ ایک طرف طلبہ قرآن کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہو جائیں اور دوسری طرف ان کی عربی اس حد تک ترقی کر جائے کہ وہ قرآن کو ترجمے کے بغیر اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

(۲) حدیث کا ایک مختصر مجموعہ جس میں وہ احادیث جمع کی جائیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر، اس کی اخلاقی تعلیمات پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوں۔ یہ مجموعہ بھی ترجمے کے بغیر ہونا چاہئے تاکہ اس کے ذریعے سے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان دانی میں بھی ترقی کر سکیں۔

اسلامی نظام زندگی کا ایک جامع نقشہ جس میں اسلام کی اعتقادی بنیادوں سے لے کر عبادات، اخلاق، معاشرت، تہذیب و تمدن، معیشت، سیاست اور صلح و جنگ تک ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ معقول اور مدلل طریقے سے بیان کیا جائے، تاکہ ہمارا ہر تعلیم یافتہ نوجوان اپنے دین کو اچھی طرح سمجھ لے اور جس شعبۂ زندگی میں بھی وہ آگے کام کرے اس میں وہ اسلام کی اسپرٹ، اس کے اصول اور اس کے احکام کو ملحوظ رکھ کر کام کر سکے۔

خاص نصاب ہر مضمون کی کلاسوں کے لئے اسلامی تصورات کی روشنی میں اور ان کے پس منظر کے ساتھ الگ پڑھایا جائے اور وہ صرف اسی مضمون

کے لئے ہو۔ مثلاً

جو طلبہ فلسفہ لیں ان کو دوسرے فلسفیانہ نظاموں کے ساتھ اسلامی فلسفہ بھی پڑھایا جائے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اسلامی فلسفہ سے مراد وہ فلسفہ نہیں ہے جو مسلمانوں نے ارسطو اور افلاطون اور فلاطینوس وغیرہ سے لیا اور پھر اس کو انہی خطوط پر آگے بڑھایا اور اس سے مراد وہ علم کلام بھی نہیں ہے جسے یونانی منطق و فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے متکلمین نے اس غرض کے لئے مرتب کیا تھا کہ اسلامی حقائق کو اپنے وقت کے فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں اور منطق کی زبان میں بیان کریں۔ یہ دونوں چیزیں اب صرف اپنی ایک تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ انہیں پڑھانا ضرور چاہئے مگر اس حیثیت سے کہ تاریخ فلسفہ کے دو اہم ابواب ہیں جو معمولی تخصیص بالعموم نظر انداز کر کے طالبان علم کے ذہن پر یہ اثر جمائے رہتے ہیں کہ دنیا کے عقلی ارتقاء میں قدیم یونانی فلاسفہ سے لے کر آج تک جو کچھ بھی کام کیا ہے، یورپ کے لوگوں نے کیا ہے۔ لیکن مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کا یہ کام نہ "اسلامی فلسفہ" تھا اور نہ اسے اس نام سے آج ہمیں اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہئے۔ یہ سب غلط فہمی کا بلکہ گمراہی کا موجب ہوگا۔ "اسلامی فلسفہ" دراصل کوئی مرتب شدہ چیز نہیں ہے بلکہ اسے اب نئے سرے سے ان بنیادوں پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہمیں قرآن میں ملتی ہیں۔ قرآن مجید ایک طرف انسانی علم و عقل کے حدود بتاتا ہے، دوسری طرف وہ محسوسات کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ تیسری طرف وہ منطق کے ناقص طریق استدلال کو چھوڑ کر عقل عام کے مطابق ایک سیدھا سادا طریقہ استدلال بتاتا ہے اور ان سب کے ساتھ وہ ایک پورا نظریہ کائنات و انسان پیش کرتا ہے جس کے اندر ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ان بنیادوں پر ایک خاص استدلال ایک نیا علم النفس مرتب کیا جا سکتا ہے جسے اب مرتب کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہمارے فلسفہ کے طلبہ فلسفے کی قدیم و جدید کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر پھنس کے نہ رہ جائیں بلکہ اس سے نکلنے کا راستہ بھی پائیں اور دنیا کو ایک نئی روشنی دکھانے کے قابل ہو سکیں۔

اسی طرح تاریخ کے طلبا کو دنیا بھر کی تاریخ پڑھانے کے ساتھ اسلامی تاریخ بھی پڑھائی جائے اور فلسفہ تاریخ کے دوسرے نظریات کے ساتھ اسلام کے فلسفہ تاریخ سے بھی روشناس کیا جائے۔ یہ دونوں مضمون بھی تشریح طلب ہیں، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں جو عام غلط فہمیاں موجود ہیں ان کی وجہ سے میرا مدعا آپ کے سامنے واضح نہ ہوگا۔ اسلامی تاریخ کا مطلب بالعموم مسلمان قوموں اور ریاستوں کی تاریخ یا ان کے تمدن اور علوم و آداب کی تاریخ سمجھا جاتا ہے اور اسلامی فلسفہ تاریخ کا نام سن کر معاً ایک طالب علم ابن خلدون کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ میں علم تاریخ کے نقطہ نظر سے ان دونوں چیزوں کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کرتا، نہ یہ کہتا ہوں کہ یہ چیزیں پڑھائی نہ جائیں مگر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ دو الگ چیزیں ہیں اور ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کو اسلام کے فلسفہ تاریخ سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اسلامی تاریخ کا اطلاق دراصل جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کے دوران میں اسلام کے اثرات کا جائزہ لیا جائے جو مسلمان ہونے والی قوموں کے حالات، علوم، آداب، اخلاق، تمدن، سیاست اور بحیثیت مجموعی پورے اجتماعی طرز عمل پر مترتب ہوئے اور اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا جائے کہ ان کے اثرات کے ساتھ دوسرے غیر اسلامی اثرات کی آمیزش کس کس طرح ہوتی رہی ہے اور اس آمیزش کے نتائج رونما ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح اسلامی فلسفہ تاریخ سے مراد درحقیقت قرآن کا فلسفہ تاریخ ہے جس میں وہ ہمیں انسانی تاریخ کو دیکھنے کے لئے ایک خاص زاویہ نگاہ دیتا ہے، اس سے نتائج اخذ کرنے کا ایک خاص ڈھنگ بتاتا ہے اور قوموں کے بننے اور بگڑنے کے اسباب پر مفصل روشنی ڈالتا ہے۔ افسوس کہ اسلامی فلسفے کی طرح اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ تاریخ پر بھی اس وقت تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے جو نصاب کے طور پر پڑھائی جا سکے۔ ان دونوں موضوعات پر اب کتابیں لکھنے اور لکھوانے کی ضرورت ہے تاکہ اس خلا کو بھرا جا سکے جو ان کے بغیر ہماری تعلیم تاریخ میں رہ جائے گا۔

جہاں تک علوم عمرانی (SOCIAL SCIENCE) کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک میں اسلام کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے اور ہر ایک میں وہ اپنے اصول رکھتا ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی تعلیم میں اس علم سے متعلق اسلامی تعلیمات کو بھی لازماً شامل ہونا چاہئے، مثلاً معاشیات میں اسلامی اصول معیشت اور سیاسیات میں اسلام کا سیاسی نظریہ اور نظام وغیرہ۔ رہے سائنسی علوم مثلاً کیمسٹری، طب اور سائنس کے مختلف شعبے، تو ان سے اسلام بحث نہیں کرتا، اس لئے ان میں کسی خاص اسلامی نصاب کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے لئے وہی عام نصاب اور اخلاقی تربیت کافی ہے جس کا ابھی ابھی میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

## اختصاصی تعلیم

اعلیٰ تعلیم کے بعد اختصاصی تعلیم کو لیجئے جس کا مقصود کسی ایک شعبۂ علم میں کمال پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں جس طرح ہمارے ہاں دوسرے علوم اسلامیہ کی اختصاصی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اب قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم اسلامیہ کی اختصاصی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہئے تاکہ ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے مفسر، محدث اور فقیہ اور علمائے دین پیدا ہو سکیں۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے اس کی تعلیم تو ہمارے لاء کالجوں میں ہونی چاہئے۔ اس کے لئے ہم کو تعلیم کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس مسئلے پر اس سے پہلے میں اپنے دو لیکچروں میں مفصل بحث کر چکا ہوں جو ۱۹۴۸ء میں لاء کالج لاہور میں ہوئے تھے۔ یہ دونوں لیکچر "اسلامی قانون" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے یہاں اس بحث کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ رہے قرآن و حدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ، تو ان کی اختصاصی تعلیم کے لئے ہماری یونیورسٹیوں کو خاص انتظامات کرنے چاہئیں جن کا مختصر خاکہ یہاں پیش کرتا ہوں:

میرے خیال میں اس مقصد کے لئے ہمیں مخصوص کالج یا یونیورسٹیوں کے تحت الگ شعبے قائم کرنے ہوں گے جن میں صرف گریجویٹ انڈر گریجویٹ داخل ہو سکیں۔ ان اداروں میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہئے

(۱) عربی ادب، تاکہ طلبا میں اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد پیدا ہو، اس کے بعد اسکے ساتھ وہ عربی زبان لکھنے اور بولنے پر بھی قادر ہوں۔

(۲) علوم قرآن میں پہلے اصول تفسیر اور فن تفسیر کے مختلف اسکولوں کی خصوصیات سے طلبا کو آشنا کیا جائے اور پھر قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرایا جائے۔

(۳) علوم حدیث، جن میں اصول حدیث، تاریخ علم حدیث اور فن جرح و تعدیل پڑھانے کے بعد حدیث کی اصل کتابیں ایسے طریقے سے پڑھائی جائیں کہ طلبہ ایک طرف خود احادیث کو پرکھنے اور ان کی صحت و سقم کے متعلق رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں اور دوسری طرف حدیث کے معتبر ذخیرے پر ان کو عبور حاصل ہو جائے۔

(۴) فقہ، جس کی تعلیم لا کالجوں کی تعلیم فقہ سے ذرا مختلف ہو۔ یہاں صرف اتنا کافی ہے کہ طلبہ کو اصولِ فقہ، تاریخ علم فقہ، مذاہب فقہ کی امتیازی خصوصیات اور قرآن و حدیث کے نصوص سے استنباط احکام کے طریقے اسی طرح سکھائے جائیں۔

(۵) علم العقائد، علم کلام اور تاریخ علم کلام، جسے اس طریقے سے پڑھایا جائے کہ طلبہ اس علم کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور متکلمین اسلام کے پورے کام پر ان کو جامع نظر حاصل ہو جائے۔

(۶) تقابل ادیان جس میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تعلیمات سے، ان کی امتیازی خصوصیات سے اور ان کی تاریخ سے طلبہ کو آشنا کیا جائے۔

اس علم سے جو لوگ فارغ ہوں، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ آپ ان کی ڈگری کا نام کیا رکھیں مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں آئندہ انہی لوگوں کو "علمائے دین" کہا جانا چاہئے جو اس ڈگری کو حاصل کریں اور ان کے لئے ان تمام اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں جو دوسرے مضامین کے ایم اے اور پی ایچ ڈی حضرات کو مل سکتی ہیں۔

**لازمی تدابیر** یہ ہے میرے نزدیک اس نظام تعلیم کا نقشہ جو موجودہ دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کے نظام کو ختم کرکے اس ملک میں قائم ہونا چاہئے۔ مگر اصلاحِ حال کی ساری کوشش لاحاصل رہے گی جب تک کہ مذکورہ بالا اصلاحات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل اقدامات بھی نہ کئے جائیں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو اسلامی فکر رکھتے ہوں، اسلامی نظام تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا چاہتے بھی ہوں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے، نہ کہ ان لوگوں کے ہاتھوں جو نہ اسلام کو جانتے ہوں، نہ اس کے نظام تعلیم کو، اور نہ اس کے قیام کی کوئی خواہش ہی دل میں رکھتے ہوں۔ اس طرح کے لوگ اگر زمام کار پر قابض رہیں اور پھر ہم رات دن کی چیخ و پکار سے دباؤ ڈال ڈال کر ان سے یہ کام زبردستی کراتے رہیں تو بادل ناخواستہ وہ اس طرح کی ضمنی اور سطحی اصلاحات کرتے رہیں گے جیسی اب تک ہوتی رہی ہیں اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لئے معلمین اور معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیں اور آئندہ کے لئے معلمین کی ٹریننگ میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔ جو شخص تعلیم کے معاملہ میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ نظام تعلیم میں نصاب اور اس کی کتابوں سے بڑھ کر استاد اور اس کا کریکٹر اور کردار اہمیت رکھتا ہے۔ فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت نہیں دے سکتے جو ہمیں اپنے نظام میں مطلوب ہے۔ دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بگڑے ہوئے کارکن زیادہ تر موجودہ نسل ہی کو بگاڑتے ہیں مگر نظام تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا بھی ناس کر دیتے ہیں جس کے بعد مستقبل میں بھی کسی اصلاح و فلاح کی امید باقی نہیں رہتی۔

آخری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم گاہوں کا پورا ماحول بدل کر اسلام کے اصول اور سیرت کے مطابق بنانا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہر، یہ از فرق تا بقدم مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ، یہ کالجوں کے ناچ گانے اور اجتماعات کے طریقے اگر یہ سب کچھ آپ کے ہاں یوں ہی جاری رہے اور ان میں سے کسی چیز کو بھی آپ بدلنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر ختم کیجئے اصلاح تعلیم کی ساری اس گفتگو کو، اس لئے کہ اس ذہنی و تہذیبی غلامی کے ماحول میں ایک آزاد مسلم مملکت کے وہ باغیرت شہری اور کارکن و کارفرما کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے جنہیں اپنی قومی تہذیب پر فخر ہو اور اس بے سرلی کی آب و ہوا میں کبھی ایسے مضبوط کردار کے لوگ پرورش نہیں پا سکتے جو اصول اور ضمیر کے معاملے میں کوئی لچک کھانے کے لئے تیار نہ ہوں۔ یہ ماحول برقرار رکھنا ہو تو پھر ہمیں سرے سے یہ خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے کہ یہاں ہمیں ایک ایماندار اور باضمیر قوم تیار کرنی ہے۔ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ ایک طرف آپ اپنی تمام حرکات و سکنات اور پورے ماحول سے اپنی نئی نسل کے ذہن پر فرنگی تہذیب و تمدن اور فرنگی زندگی کا رعب بٹھاتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ زبانی باتوں سے ان کے دلوں میں اپنی قومی تہذیب کی قدر پیدا ہو جائے۔ ایک طرف آپ اپنے ماتحتوں میں زور دار ایسے جوانوں کو ایمان اور ضمیر کا تعلق توڑنے اور ضمیر کے خلاف بولنے کی مشق کراتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ ان کے اندر راست بازی اور حق پرستی پیدا ہو۔ ایک طرف آپ ان کو وہ سارے انتخابی ہتھکنڈے اپنے کالجوں ہی میں برتنے کا خوگر بنا دیتے ہیں جنہوں نے ہماری پوری سیاسی زندگی کو گندا کرکے رکھ دیا ہے اور دوسری طرف آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہاں سے نکل کر وہ بڑے ایماندار اور کھرے ثابت ہوں گے۔ ایسے معجزات کا ظہور صریحاً محال ہے۔ اگر ہم اپنی قومی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنے کے واقعی خواہشمند ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول کی تطہیر سے اس کا آغاز کرنا ہوگا۔

# "حسین منظر"

[illegible] ٹرانسپورٹ [illegible]

بہت لگائے پھرتے [illegible]

آج کل کی بات ہے ایک دوست نے بتایا کہ انہوں نے راوی کے کنارے پاس [illegible] کچھ دل کش مناظر کے فوٹو لینے کے علاوہ دو بڑے ہی مزیدار فوٹو لیے ہیں ایک سورج غروب ہونے کا منظر ہے اور دوسرا چلتی ہوئی گاڑی کا۔

[illegible] میرے دل کو اتنی ٹھیس لگی اور میرے جذبات کو اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ جذبات کی شدت سے میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

وہ [illegible] خیال میں مجھے نئے دن اور جشن کا راہ اور رستہ جانے کیا کیا سمجھ رہے تھے اور اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ بھی کوئی وقت ہے جب فوٹوگرافی کی جائے۔

کیا انسان آج اس حالت میں ہے کہ اس کے مختلف مناظر محفوظ کرنے کے [illegible] کی جائے!

مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انسانیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے انسانی قیاس و گمان کے نصف النہار تک پہنچنے کے بعد اپنے ساتھ پوری انسانیت کو غروب میں غائب ہو رہی ہے۔ انسان کے اعمال بادلوں کی مجسم شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔ بادلوں کے درمیان انسانیت کا جنازہ قضا و قدر کے کندھوں پر آسمان کی [illegible] روانہ ہونے کو ہے۔

کیا بہتر یا حسین ہے؟

زمان و مکاں کی گاڑی انسانیت کو لیے ہوئے اپنی منزل کی طرف دوڑتی جا رہی ہے اس گاڑی کے ایک ڈبے میں انسان کے بچے درد و کرب سے کراہ رہے ہیں اور ان کا باپ اور اس کی ماں سہمے ہوئے ایک دوسرے کو تک رہے ہیں۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑے جا رہی ہے، کتنا دل کش منظر ہے!!

انسانیت کی گاڑی کو چلانے والے ڈرائیور اور کنڈکٹر انسان ہونے کے [illegible]

بھانت بھانت کے درندے اور جنگلی جانور ہیں

یہ انسان نما حیوان اپنی درندگی اور حیوانیت سے جنگلی جانوروں کو بھی مات کر چکے ہیں

یہ حیوان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے انسانیت کی عقل اور اس کا ضمیر نگلنے کے بعد اب اس کے جسم کو ہاتھوں میں لیے ہوئے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔

ایک دوسرے کے منہ سے نوالے چھینتے ہوئے اور غذا کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گاڑی کو تیزی سے چلا رہے ہیں۔

انسانیت کی گاڑی کس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔

اس سے زیادہ حسین سین شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئے!!

مگر جلد ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہر روز غروب ہونے کے بعد اگلے دن سورج پھر بھی تو نکلتا ہے۔

اور گاڑی میں انسانیت کے بعض بچے گاڑی کے رخ کو بدلنے میں مصروف بھی تو ہوتے ہیں

اور کتنا دل کش اور حسین وہ منظر ہو گا:

• جب میں یا میرا کوئی دوسرا انسانی بھائی ہاتھ میں کیمرہ لیے اس سین کا فوٹو لے رہا ہو گا۔

• جب انسانیت کا سورج مشرق سے طلوع ہونے کے بعد نصف النہار کی طرف بڑھ رہا ہو گا۔۔

• اور جب انسانیت اپنے بچوں کو زمان و مکاں کی گاڑی میں لیے ہوئے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہو گی۔

کتنا حسین منظر ہو گا!!

اور فوٹوگرافی کے لیے کتنا موزوں وقت ہو گا!!!

عابدہ اقبال راسا



# دو لمحوں کی چاندنی

وہ سپیدۂ سحر کے لرزتے قہقہے سن کر بیدار ہوا۔ اپنے سامنے سجے گلاب کو غور سے دیکھا فرطِ مسرت سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ اس پر چند لمحے حیرت سے دیکھ رہا تھا
اس نے دیوانہ وار ہاتھ بڑھایا اور جذبات کی شدت میں کھل کے رہ گیا۔ اس خوشی کی مٹھاس کا اسے کوئی احساس تھا۔ گلاب کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا: آج
میں دُکھوں سے کتنا بے یار ہوں۔ شبنم کے چند قطرے ہاتھوں پر گرے۔ انمول موتی۔ وہ اپنی خوشی چھپا نہ سکا۔ لرزتی ہوئی آواز میں چیخ اٹھا اور خود کو وقت کی لہروں
کے سپرد کر دیا۔ بہاروں میں شدید نگہبانی کی۔ خزاؤں میں اس کی اُداسی پر ٹوٹ کے رویا۔ ساون میں اس کے جوان ہونے کا انتظار کیا۔ اس محنت کے سامنے سُرخ
مالی کے ناطے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ لیکن زمانے سے آنکھ مچولی کھیلنا معمولی بات نہیں۔ آس پاس چاروں طرف اس کے پڑوسی، برسوں کے ساتھی۔ بچپن کا یارانہ، بچپن سے
جوانی تک کا اکٹھا گزارا زمانہ بھی کیا خوب ہوتا ہے۔ قہقہے دوستیاں چلتی ہیں۔ اب جھریاں چہرے پر اپنا گھر تلاش کر رہی ہیں، اس نے ٹھنڈی سانس میں خود کو گرم کر دیا۔
اگر یہ ساتھ بھی نہ ٹوٹ سکیں تو محبت کیسی۔ یوکلپٹس نے مایوسی سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ مگر اس نے اتنا کہہ کر منہ موڑ لیا "مجھے تمہاری تھکن
کا احساس ہے دوست، مگر کیا کروں محبت چھوڑنے کا حوصلہ نہیں"

رات کی بڑھتی سیاہی نے پوری کائنات پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ "جوانی بھی کیا چیز ہے" گلاب نے بھرپور انگڑائی لی اور پھر جلد بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ
نہ کر پایا ہو۔ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ گرم ہاتھوں کے لمس نے اسے چونکا دیا۔ "تمہاری جوانی کو گرم سرد موسم سے بچانے کے لیے ابھی میرے بوڑھے ہاتھوں کی ضرورت ہے"
آہستہ آہستہ نیند غلبہ پانے لگی، خواب اس پر مسلط تھے جنہیں وہ مسلسل جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بوڑھے ہاتھ گلاب کو اپنی حفاظت میں لیے سردی کی شدید
برداشت کر رہے تھے۔ چاند ایک لمحہ کو نکلا پھر گہرے بادلوں میں غائب ہو گیا۔ اچانک یوکلپٹس کا پورا وجود لرز اٹھا۔ آدھی رات ہونے کو ہے ساتھی۔ سلم پر شرارت
چھوڑ دو۔ کانٹوں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا "میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ لیکن اس بڑھاپے میں بھی تمہارے لیے راحت لایا ہوں۔ اگرچہ تمہارے لیے اس
ملا کے ملدوں میں ٹھٹھر رہا میرے لیے کوئی بڑی قربانی نہیں تمہاری پارسائی کے لیے اپنی عزت، شہرت اور تعمیر کے لیے جوانی کا لہو دیا ہے۔ مجھ سے رسوائیاں سمیٹی نہیں جائیں گی
مجھے رسوائیاں نہ دو۔ گلاب دھیرے سے مسکرایا اور کانٹوں کی چبھن تیز ہوتی گئی۔ بوڑھے جسم سے گویا بجلی کی رستا تار چھو گئی۔ اس نے گلاب کے تیور محسوس کر لیے
"تو گویا یہ اس لذت سے آشنا ہے" بوڑھے کے رگ و پے میں نفرت کی لہر دوڑنے لگی۔ اس کی ساری محبتیں دم توڑ گئیں۔ چند لمحے برسوں پر محیط تھے۔ ایسی خوفناک
رات کبھی دیکھنے میں نہیں آئی گلاب کی مسکراہٹ اسے زہر لگنے لگی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے بڑھے اور پوری قوت سے گلاب کو مسل گئے اس نے لرزتے ہاتھوں سے ساری
پتیاں اکٹھی کریں جیسے کوئی فنکار شکستہ شاہکار کے ریزے جمع کرے۔ وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا رات وہ اسے دل کے ریگستان رکھ کے رسا۔ گلستانوں کی نرم
مٹی۔ ہمیشہ کی کونپلوں اور سبزہ کر دیا۔ وہ انجام سے بے خبر تو نہ تھا۔

# مروّجہ تعلیم اور نقائص

موجودہ نظامِ تعلیم میں ضرورت سے زیادہ زور تعلیم کے افادی اور عملی پہلوؤں پر دیا گیا ہے، اور اس کے انسانی اور مقصدی پہلو سے صرف نظر کر لیا گیا ہے۔ یہ نظام زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے لیے تڑپ پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو محض کلرک اور عمّال بنا سکا۔ ان کی اخلاقی اور سماجی بہبود کو کوئی اہمیت نہ دی، نہ ان کی شخصیت کے سنوارنے اور ان کی تخلیقی قوتوں کے اظہار کے لیے کوئی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی، انہیں صرف کمانے کا ایک سامان مستقل کا معیار بنایا۔

عوام کی زندگی، ان کی ثقافت، اور ان کے معاشرے سے تعلیم کا کوئی تعلق باقی نہ رہا اور جس تعلیم کا اس ثقافت اور معاشرے سے تعلق باقی نہ رہے، جس میں وہ کی جا رہی ہے، وہ لامحالہ بانجھ اور حیات کُش ثابت ہوگی، بلکہ وہ معاشرہ کے انحطاط اور انتشار کا باعث بنے گی اور اسے پارہ پارہ کر کے رکھ دے گی۔

موجودہ تعلیم میں نہ صرف دینی عنصر کا فقدان ہے، بلکہ وہ معاشرے کو دین سے کاٹ کر الگ کر دینے والی ہے۔ ملت کے دین و ثقافت سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں اور طالب علموں کو پڑھائے جانے والے مضامین کی بنیاد نسل پرستی اور الحاد پر ہے۔ ہماری نوجوان نسلوں کے ذہن و اخلاق پر نہایت تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف خود اس تعلیم کے نقادوں نے بھی کیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی ایک رپورٹ کہتی ہے کہ مشاہدہ کرنے والے دشواری پر بہت جلد واضح ہوگا کہ لامذہبی اور دہریت کے مغربی تعلیم کا رواج کیا گمراہ کن نتائج کا سلسلہ ہے۔ آگے چل کر اسی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

"درس گاہوں میں نہ وہ حیات روحانی ہے جو طالب علم میں سوز دل پیدا کرے، نہ وہ وحدت اجتماعی ہے جو اس کی وفاداری کو استوار کر سکے، نہ وہ دینی و اخلاقی شعلہ ہے جو اس کے دلوں کے چراغ روشن کرے۔" پنجاب یونیورسٹی انکوائری کمیٹی رپورٹ ۱۹۳۲ء

اس تعلیم کی فطرت ہی یہ تھی کہ وہ ہماری نوجوان نسلوں کے دین، ثقافت اور قومی خودی پر ڈاکہ ڈالے اور انہیں مغربی سامراجیوں کا محض حضوری بنا کر رکھ دے۔ کسی نظام تعلیم کی سب سے بڑی کسوٹی وہ جوہر ہے کہ انسانوں میں جو وہ پیدا کرتا ہے اور موجودہ تعلیم نے مسلمانوں میں زندگی کے مقاصد عالیہ کے لیے کوئی تڑپ بیدار کرنے کی بجائے اس نے دینی محرومی، ذہنی غلامی، اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کی اقدار کو ختم کر دیا ہے۔ ایسے ہی کارِ زار سے دلبرداشتہ ہو کر اکبر الٰہ آبادی کی زبان سے کہلوا دیا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم نے بچوں کے کردار سازی کے نہایت اہم اور بنیادی کام کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں محض خالی خولی چند اصول اور نظریے پڑھائے جاتے ہیں لیکن ایک صحت مند اخلاقی اور حیات بخش فضا میں طالب علم کا کردار ڈھالنے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ طالب علم کو اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے والے ان گنت حالات کا سامنا ہے لیکن ان سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کی کوئی اعانت اور رہنمائی نہیں کی جاتی۔ تعلیم، اخلاق کے مابین یہی وہ تفریق ہے جس نے ہماری درس گاہوں کو بگاڑ کا سرچشمہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ سیاسی اور معاشی بگاڑ جو ہماری سیاست کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے

تعلیم کی اس خرابی ہی کی پیداوار ہے ہمارے طالب علموں میں روز بروز بڑھتی ہوئی بے انضباطی فطری نتیجہ ہے، ہمارے معلموں کی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے بے تعلقی اور بچوں کی کردار سازی سے مجرمانہ غفلت کا۔ اس تعلیم سے اس سے بہتر اور کیا توقع کی جا سکتی ہے

۳ : تیسرا بڑا مسئلہ جو آج ہمارے سامنے ہے، وہ دو متضاد نظام ہائے تعلیم کا متوازی وجود ہے۔ ہمارے ملک میں ایک نظام تعلیم رائج نہیں ہے بلکہ دو نظام ہائے تعلیم بیک وقت رائج ہیں جو تعلیم پانے والے افراد کو دو مختلف اور قطعی متضاد خطوط پر تیار کرتے ہیں یعنی اسکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم اور مدرسوں اور دارالعلوم کا نظام تعلیم کسی ملک کے لیے اس سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں بیک وقت دو نظام ہائے تعلیم پائے جائیں، لیکن ہمارے ملک میں دوعملی موجود ہے اور پورے تعلیمی سرچشمے کو مسموم کر رہی ہے سکول اور کالج ایک قسم کے افراد ڈھال رہے ہیں، مدرسے اور دارالعلوم اس سے بالکل مختلف قسم کے اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قومی ذمہ داریوں کے لئے ممد ثابت ہونے کے قابل نہیں

بلکہ ادارہ انسانی اور مادی وسائل اس دوعملی کی نذر ہو رہے ہیں مگر قوم اس نام نہاد "جدید" اور "قدامت پسند" اور "ترقی پسند" کے درمیان ششدر کھڑی ہے۔ اس دوعملی اور نزاع نے قوم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اس صورت حال کو اب زیادہ دیر باقی نہیں رہنا چاہیئے، بلکہ ان دو مختلف نظاموں کو ایک ایسی وحدت میں سمو دینا چاہیئے جو یکساں طور پر دینی، فکری، معاشی اور سیاسی قیادت کو جنم دے سکے۔

۴ : موجودہ نظام تعلیم کا چوتھا نقص اس کی محض نظریاتی خصوصیت ہے چونکہ اس تعلیم کے رائج کرنے والوں کا اصل مقصد محض کلرک اور عمال پیدا کرنا تھا اس لیے اس نے ملک کی ضرورتوں سے یکسر غفلت برتی۔ ہماری قوم کی عظیم اکثریت کو اعلیٰ علمی تعلیم کی ضرورت نہیں بلکہ بنیادی اور معقول پیشہ وارانہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر ملک کو سائنس دانوں، دستکاروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ نظام تعلیم قطعی طور پر اس ضرورت کو پورا کرنے کے بھی لائق نہیں ہے یہ قطعی طور پر یک رخا ہے جب تک عملی نقطۂ نظر سے اس نظام تعلیم کی اصلاح نہیں کی جاتی اور اسے ملک کی ضروریات کے مطابق نہیں ڈھالا جاتا، یہ نظام تعلیم حیات و ترقی کا سرچشمہ ہرگز نہیں بن سکتا۔

۵ : اس کا ایک اور نقص ابتدائی مرحلے میں خصوصی تعلیم و مہارت ہے علم کو خانوں اور ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مضامین کی اس گوناگونی میں خود وحدت علم کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے اگرچہ ایک طالب علم کو چند خاص مجموعہ مضامین پر عمدہ اسباق مہیا ہو جاتے ہیں، مگر باقی تمام مضامین اور علوم اس کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں یہ مہارت خصوصی طالب علم کو زندگی کے دوسرے حقائق سے غافل کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ کم سے کم کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے لگتا ہے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اندیشہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب اس کا سارا علم لاشئے ہو کر رہ جائے ——— علاوہ ازیں اسے جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں کوئی نظم و وحدت نہیں ہوتی اس طرح منفرد شعبوں میں تعلیم پانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم زندگی اور علم کو منتشر اجزا کی حیثیت سے دیکھتا ہے، اور علم و وحدت اور اس کے مقاصد کے ادراک سے قاصر رہتا ہے یہ بات نہ صرف ہماری بلکہ پوری مغربی تعلیم کے متعلق صحیح ہے۔ اور ہمارے دور کی سب سے بڑی ضرورت اسی کثرت میں وحدت پیدا کرنا ہے۔

۶ . ایک اور بڑا نقص اس نظام کا یہ ہے کہ یہ طالب علم میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے تخلیقی کوششوں میں اس کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ طالب علم کو محض مغرب کا اندھا نقال بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم اس غیر معقول اور غیر تخلیقی انداز فکر کا بہت بڑا سبب ہے۔ جب طالب علم کو غیر ملکی اور نامانوس زبان میں کوئی چیز پڑھائی جاتی ہے، تو وہ اس کے مطالب کے فہم سے بالکل قاصر رہتا ہے لیکن چونکہ اسے لامحالہ امتحان پاس کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ رٹائی شروع کر دیتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی فکر بالکل کند ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ ہر اس چیز کو بغیر نقد و جرح کے قبول کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، جو اسے پڑھائی جائے یہ انسانی ذہن کے قتل عام سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

۷ : آخری چیز اور جو کچھ اہم نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ موجودہ نظام میں تعلیم ایک خوش قسمت طبقہ کا حصہ ہے۔ جو لوگ امارت کے سائے میں آنکھیں کھولتے ہیں صرف وہی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں، اور نادار طبقہ کی صلاحیتیں تاریک گلی کوچوں میں دم توڑ دیتی ہیں۔

# علم حاصل کرنے والو

# تمہارے علم کا حصول ؟

محمد انور، میڈیکل کالج

اے علم حاصل کرنے والے! علم کی پہلی شاخ پر سب سے پہلے پھوٹنے والی کلی تمہیں یہ درس دیتی ہے کہ علم حاصل کرنے کا کوئی مقصد بھی ہوتا ہے۔ تمہارے نزدیک یہ مقصد صرف نمایاں حیثیت سے زندگی بسر کرنا ہی ہے ——— تم علم اس لیے حاصل کر رہے ہو کہ عالی شان کوٹھیوں [illegible] میں سرد کی محفلیں منعقد کر سکو اور دودھیا عماروں اور جنگلوں میں نہیں بلکہ زندگی کی شاہراہ پر تاکہ دوسرے بھی جان لیں کہ تم عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہو ——— تم علم اس لیے حاصل کر رہے ہو کہ کسی سے ملتے وقت تمہارے ہاتھ میں ایک بہترین ملاقاتی کارڈ اور تمہارے سینے پر ایک ملمع زریں درجہ کا تمغہ ہو اور اس طرح تم اپنی "نمایاں" زندگی کا مظاہرہ دکھا سکو ——— اور یا پھر اس لیے کہ تم ایک عظیم الشان مملکت کے وزیر اعظم بن سکو۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نظم و نسق کو خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا، بلکہ صرف اس لیے کہ لاکھوں کروڑوں لوگ تمہیں جہاں پناہ اور عالی جاہ کے خطاب سے پکاریں

اے علم حاصل کرنے والے! تم علم اس لیے حاصل کر رہے ہو کہ تم ایک مدرسہ یا کالج کے پرنسپل بن سکو۔ اس لیے نہیں کہ کوئی دوسرا تدریس کے فن سے واقف نہیں اور نہ کسی خاص تعلیم کا ماہر ہی ہے بلکہ صرف اس لیے کہ جب تم فور ڈور سے کاروں میں بیٹھے ہوئے دفتر کو جا رہے ہو تو کالج کے لڑکے تمہیں تعظیماً سلام کر رہے ہوں اور راہرو ایک دوسرے کو اشاروں سے بتا رہے ہوں کہ یہ ہیں فلاں کالج کے پرنسپل صاحب! ——— اور یا پھر تم علم اس لیے حاصل کر رہے ہو کہ تم کسی مرکزی عبادت گاہ کے امام بن سکو۔ اس لیے نہیں کہ کوئی دوسرا اپنے قلب کی گہرائیوں میں الہامی علم رکھتا ہی نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ تمہیں بھی خس کی ٹٹیاں اور محل کے پنکھے میسر ہوں ——— اور کسی قابل یادگار تہوار کے موقع پر ہزاروں، لاکھوں انسان تمہارے پیچھے اٹھتے بیٹھتے ہوئے دکھائی دیں اور اس طرح تم بھی نمایاں زندگی بسر کر سکو ——— یہ ہے تمہارے حصول علم کا مقصد! اور یقیناً یہی ہو گا تم سے علم حاصل کرنے والوں کے حصول علم کا مقصد!!

اے علم حاصل کرنے والے! اگر تم علم اس لیے حاصل کر رہے ہو کہ دکھی اور زخمی انسانوں کا علاج کرو اور آسودہ و خوشحال لوگوں کے لیے سڑکیں اور پل بناؤ ——— اور یا پھر حاصل کیا ہوا علم بھی صرف دوسروں تک پہنچاؤ تو بھی تجربہ کے بعد تمہارے حصول علم کا مقصد صرف نمایاں زندگی بسر کرنا ہی نکلتا ہے ——— کیا تم ایک ایک انسان کی مرہم پٹی صرف اس لیے کر رہے ہو کہ ہزاروں اور لاکھوں کو ایک بار ہی موت کے گھاٹ اتار سکو؟ کیا تم سڑکوں کا ایک ایک فٹ اور پلوں کی ایک ایک اینٹ صرف اسی لیے مضبوط بنا رہے ہو کہ انسانیت کا قتل عام کرنے کے لیے ان پر سے گزر سکو! ——— اف!

پھر کیا تم دوسروں کو علم صرف اس لیے دے رہے ہو کہ وہ بھی تمہارے جیسی نمایاں زندگی بسر کر سکیں ——— کیا اپنی زندگی نمایاں بنانے کے لیے دوسروں کو گاجر مولی کی طرح اڑا دینا ہی تمہارے حصول علم کا مقصد ہے؟ ——— کیا یہی ہے تمہارے حصول علم کا مقصد؟

اے علم حاصل کرنے والے! اگر علم اس لیے اور صرف اسی لیے حاصل کر رہے ہو کہ نمایاں زندگی بسر کر سکو ——— حصول علم سے تمہارا مقصد روٹی کے چند نوالے، سونے کے چند سکے اور عزت کے چند سلام ہی نہیں اور اگر یہی ہیں تو تم ان پر اکتفا کرنے والے نہیں ——— بلکہ تم یہ چاہتے ہو کہ بھوک سے مرتے ہوئے انسان تمہارے ہی ساتھ [illegible] لٹکے ہوئے دیکھیں، میلے کچیلے کپڑوں کی صورت کو ترسنے والے تمہارے ہی ہم سر تمہارے سکوں کی جھنکار سنیں ——— اور اخلاق و کردار کی حدود پھلانگ کر سلام کرنے والے تمہیں سلام لیتے ہوئے دیکھیں، تمہیں دیکھیں اور صرف دیکھیں ہی نہیں بلکہ نمایاں زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھیں ——— یہ ہے تمہارے حصول علم کا مقصد! یہی تھا پہلے علم حاصل کرنے والوں کے حصول علم کا مقصد! اور یقیناً یہی ہو گا تم سے علم حاصل کرنے والوں کے حصول علم کا مقصد!!!

## کیا علم کی حقیقت یہی تو نہیں ؟

اے علم حاصل کرنے والے! علم تمہیں کوئی ایسی نعمت عطا نہیں کرتا جو خود تمہارے اندر ——— تمہارے قلب کی گہرائیوں اور تمہارے ضمیر کے گوشوں میں ——— پہلے سے موجود نہ ہو ——— علم تو صرف ان لبادوں کو اتارتا ہے جن سے تمہارے نفس اور تمہارے ماحول نے تمہاری ہی حقیقت کو یوں پوشیدہ کر رکھا ہوتا ہے کہ تم باوجود اس کے مالک ہونے کے اس سے بے خبر ہوتے ہو ——— علم جب تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں دیتا جو خود تمہارے [illegible] نہ ہو تو کیوں نہیں تم علم اس لیے حاصل کرتے کہ اس سے اپنے سامنے ہوئے لبادوں میں پوشیدہ اور زمانے کی [illegible] اپنی ہی حقیقت کو پالو ——— نہ صرف یہ ——— بلکہ اپنے آپ کو پانے کے بعد اس میں جہاں بھر کے لبادوں اور [illegible] کو مدغم بھی کر سکو ——— علم تو تمہیں اپنی ہی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ دنیا کے گمنام ترین گوشے اور زندگی کی نمایاں ترین شاہراہیں اس کے سامنے یکساں ہیں۔ اس کی تو صرف یہی حقیقت ہے کہ وہ تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** شاید اگر تمہیں طالب علم نہیں، مگر پھر بھی تم علم حاصل کرنے میں مصروف ہو ۔۔۔ کیونکہ علم صرف وہی نہیں جو تم بڑی بڑی درس گاہوں اور موٹی موٹی کتابوں میں بحر علم کے صرف ایک قطرہ کی حد تک ملتا ہے ۔۔۔ بلکہ کھیتوں میں ہل چلاتے، کارخانوں میں مزدوری کرتے اور بچوں کو دودھ پلاتے ہوئے بھی تمہیں علم ملتا ہے بشرطیکہ تمہارے قلب میں اس حقیقت تک پہنچنے کی آرزو ہو ۔۔۔ زندگی کے ایک ایک قدم اور ہر قدم کی ایک ایک جنبش تمہیں علم کے خزانوں سے نوازتی ہے اور گلستان کائنات کا ایک ایک پھول اور ہر ایک پھول کی ایک ایک پتی تمہیں علم کی نعمتوں سے سرفراز کرتی ہے، بشرطیکہ تمہارے دل میں اس حقیقت سے ملنے کی تمنا ہو ۔۔۔ اگر تم ان جلیوں اور نعمتوں سے آشنا علم حاصل کر سکو کہ علم کی ابتدا اور انتہا کی جان لو تو سارا جہاں طالب علم ہے کہ تم علم حاصل کرنے میں مصروف ہو۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** علم صرف وہی نہیں جو استاد کے سفید چاک سے سیاہ تختہ پر لکھے کے بعد تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے اور جو پروفیسر اپنے لیکچر کے پرسحر الفاظ سے تمہارے کانوں کے پردوں کو مرتعش کرنے کے بعد تمہارے ذہن کو پارسل کر دے ۔۔۔ اور جو ادیب اپنے مضمون کے دقیق نکتوں کے ذریعہ علم کی حقیقت کے متعلق تمہارے ذہن کو خیالات کی صورت میں پہنچا دیتا ہے ۔۔۔ بلکہ حقیقی علم جس کی ایک سطر کو تم علم سمجھ بیٹھے ہو تو وہ پوری عبارت ہے جو کائنات کے اس عظیم الشان بورڈ پر مختلف رسالوں میں مختلف استادوں نے مختلف رنگوں اور مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی ہے ۔۔۔ اور وہ پورا لیکچر ہے جو زندگی کے اس لامتناہی مکتب میں معلم حقیقی اس کائنات کے رقص اور اس میں اٹھتے ہوئے بادلوں کی گرج، گرتی ہوئی بجلیوں کی کڑک، ابھرتے ہوئے سورج کی چمک اور لہراتے ہوئے پھولوں کی مہک کی صورت میں دے رہا ہے۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** کل کی امتحان گاہ میں ایک طالب علم کو عمل امتحان کی بھٹیوں میں سے گزر کر محنت کی سند حاصل کرنی پڑتی ہے ۔۔۔ اور اس لیے تمہیں مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں عطا کرنے کے بعد علم حاصل کرنے یا نہ کرنے کے متعلق مکمل آزادی دی گئی ہے تاکہ اس طرح تم اپنی تقدیر کی کاشت کرنے کے بعد خود ہی اپنے علم کی فصل کاٹو ۔۔۔ نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرو بلکہ محنت کی سند پانے کے لیے اس حاصل کیے ہوئے علم سے کمزور اور نالائق طالب علموں کو علم حاصل کرنے میں مدد دو ۔۔۔ اور اس طرح اندھوں کو سہارے کے لیے عصا کا کام دو اور چٹان کی طرح ہر قوم کے لیے علم و محنت کے نمونوں کا فریضہ سرانجام دو ۔۔۔ تمہیں طالب علموں کے گلستان میں ایک ایسے لازوال پھول کی طرح کھلنا چاہیے جو محنت کے امتحان میں پاس ہونے کی سند لینے کے بعد اس قابل ہو کہ محنتی خود اسے توڑ کر اپنے محبوب ترین ٹیبل پر رکھ لے ۔۔۔ نہیں نہیں بلکہ وہ خود محبت کے پاؤں سے چلتا ہوا اپنے محبوب کے پاس پہنچ سکے۔

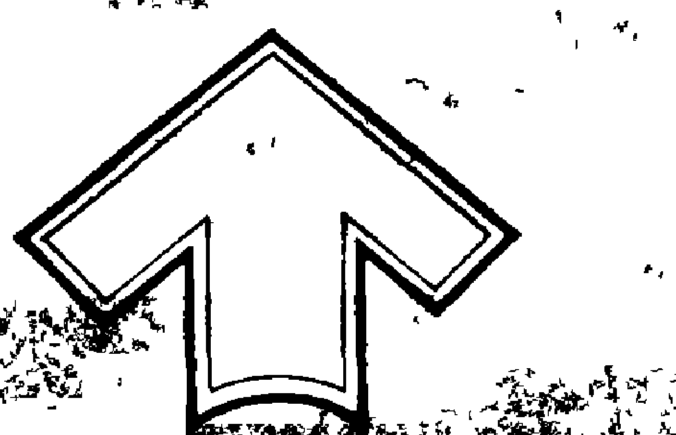
## آؤ کہ امتحان گاہ کو چل پڑیں

**اے علم حاصل کرنے والے!** آج تک تم محنت کی دنیا سے بے حرکتوں کی فضا میں بیشتر ٹیوٹروں سے علم حاصل کرتے رہے ہو اور اب تم اس بات کے خواہش مند ہو کہ آسودہ طالب علم لائبریریوں میں بیشتر ٹیوٹروں کے بطن میں علم حاصل کرنے کے علاوہ کتابوں کے ذریعے جسم بھی دیمک بنے رہیں ۔۔۔ اور پھر تم ان علم حاصل کرنے والوں کو ملامت کرتے ہو جو تمہیں اچھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے تمہارے ساتھ محبت کا سلوک کرتے ہیں اور اچھی بھی ایسا جو اپنی علمی سفر کی انتہا تو درکنار اس کی ابتدا سے بھی ناواقف ہو اور راستے ہی میں کتابی پھولوں سے جی بہلا رہا ہو ۔۔۔ ایسے ان ساتھیوں سے نفرت کرنا چھوڑ دے جو تم سے محبت کرتے ہیں اور انہیں نصیحتیں دینے سے بھی باز رہو کیونکہ علم کی لگاتار بارش اور محبت کے مسلسل تجربے نے ان کی آنکھیں کھول دی ہیں ۔۔۔ تجھے اس محبت کا واسطہ ہے جو تجھے نفرت کرنے کے ساتھ ہے کہ تو نفرت سے نفرت اور محبت سے محبت کرنا سیکھ۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** آؤ کہ دنیا کے جلیل القدر انسانوں کے خزانوں کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ اس بہترین سرمایہ میں سے جو کچھ کہ ہم حاصل کر چکے ہیں اسے لٹانا بھی شروع کر دیں ۔۔۔ آؤ کہ انسانیت کے ہی بہترین سرمایہ سے بھوکی اور ننگی انسانیت کو لباس اور شانتی کے چند نوالے اور صدق و آشتی کے چند لباس دے دیا کریں ۔۔۔ آؤ کہ کائنات کے بے پایاں خزانوں سے اخلاق کے پھل ان انسانوں کے دستر خوان پر چنیں جو رنگ رنگ کے ادنیٰ کھانوں کے نشہ میں بھی بھوکے فاقہ کش رہتے ہیں ۔۔۔ آؤ کہ آسمانی سمندر کے شفاف پانی سے انسانیت کی سحر زمین کو سیراب کریں تاکہ انسانی پودوں کی ڈالیوں پر اخلاق کے ایسے رنگین پھول کھلیں کہ فرشتے بھی وہاں سے گزرتے ہوئے مہک مہک سے دم بخود ہو جائیں ۔۔۔ آؤ کہ دوسرے ساتھیوں کو بھی انسانیت کے دل کے لہو سے ماضی کے عطر سے پھر پور اس لافانی سمندر تک پہنچانا شروع کریں جس میں کہ ہم خود تیرتے رہے ہیں ۔۔۔ آؤ کہ انسانیت کو انسانیت سے آشنا کریں۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** آؤ کہ زندگی کے راز کو بے نقاب کریں کتابوں کی قطاروں اور شیلفوں کی لائبریریوں میں نظر سے غائب ہونا تو تم جانتے ہی ہو آؤ کہ اب زندگی کے راز کو جاننے اور پانے کا طریقہ بھی جان لو ۔۔۔ اگر آج مقصد زیست کی محنت جتانے کے لیے کسی بغاوت کی ضرورت ہے تو آؤ کہ ہم نظام ہائے حیات کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیں جو ظاہری جاہ و جلال اور مادی آب و تاب کے زور سے ہماری محنت کے وجد آمیز رقص کو بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔۔۔ جو ہمارے ہی گاڑھے پسینے اور سرخ خون سے بنی ہوئی شراب سے ہماری محنت کے آتشیں شعلوں کو بجھانا چاہتے ہیں ۔۔۔ جو سونے چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کی جھنکار میں ہماری محنت کے بربط سے نکلتے ہوئے گیت کو کچلنا چاہتے ہیں ۔۔۔ آؤ کہ ظلم و تشدد کی اس تیرہ و تار فضا میں انقلاب و بغاوت کی شمع علم کے تیل اور محنت کی دیاسلائی سے اس طرح جلائیں کہ تیرگی بھی فطری موت مرنے کے بعد روشنی کی گود میں جنم لینے پر مجبور ہو۔

**اے علم حاصل کرنے والے!** اگر آج محنت کی اندھی امتحان گاہ میں قربانی کے لیے ایسے علم حاصل کرنے والوں کی ضرورت ہے کہ جو علم کے مالی فوائد کو قربان کر کے محنت کے لافانی لذت اٹھانے کو تیار ہوں ۔۔۔ تو آؤ کہ ہم محنت کے گیت گاتے ہوئے اپنی اس منزل کی طرف پرواز کریں، جہاں علم کی رسائی ہی نہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لیے صرف والہانہ محنت کی ضرورت ہے ۔۔۔ اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے عالم سفلی کے پر سطوت تاجداروں کے ہاتھوں سے قہر و غضب کے تازیانوں کو یوں خوش آمدید کہیں جیسے کہ محبت کے رباب کے تاروں کو مرتعش کرنے کے لیے یہ مضراب کا کام دے رہے ہوں ۔۔۔ جیسے کہ محبت کی وادی میں خوشگوار پھولوں کی نکہت کی پرواز کے لیے یہ جھونکوں کا کام دے رہے ہوں ۔۔۔ آؤ کہ علم کی پگڈنڈی کو چھوڑ کر محبت کی شاہراہ پر چلتے ہوئے اپنی منزل زیست کی طرف پرواز کریں ۔۔۔ آؤ کہ ان حوصلہ ہارنے والے مالیوں کو تسلی دیں جن کے ہاتھ انسانیت کے لیے محبت کے پھول توڑتے ہوئے چھلنی چھلنی ہو گئے ہیں اور خود ان کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی ہمت بڑھائیں۔



# علمی تحقیقات

## کیوں اور کیسے

ادارہ معارف اسلامی کراچی (ISLAMIC RESEARCH ACADEMY) کی افتتاحی تقریب میں پاکستان کے اہل علم حضرات، دانشوروں اور طلبہ سے عالم اسلام کے عظیم مفکر اور صدر اکیڈمی نے یہ فکر انگیز خطاب فرمایا۔ خطاب کی اہمیت کے سبب مدیر طلبہ و طالبات کرتے ہیں (محمود)

دنیا میں جتنے علوم و فنون ہیں وہ سب درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ایک حصہ تو خالص ان معلومات پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کو دنیا اور اس کی زندگی اور خود اس کی اپنی زندگی کے متعلق مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ اس چیز کا ہوتا ہے کہ حاصل شدہ معلومات کو ہر گروہ اور ہر قوم اپنے ذہن اور اپنے طرز فکر اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب کرتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ روئے زمین پر جو غذا کا سامان پھیلا ہوا ہے وہ قریب قریب سب مشترک ہے۔ مگر ان چیزوں کے جو خام ابتدائی عناصر ہوتے ہیں وہ ایک ہی قسم کے مواد انسان کی غذا کے لئے اس زمین پر موجود ہیں لیکن ہر قوم کے لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اسی مواد کو اپنے اپنے مخصوص طریقوں سے کام میں لاتے ہیں اور اپنے لیے مختلف شکلوں کی غذائیں تیار کرتے ہیں۔ انسانی معاملات علمی معلومات کا بھی یہ حال ہے کہ جہاں تک حقائق اور اشیاء کا تعلق ہے یعنی جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو دنیا میں موجود ہیں اس کے بارے میں معلومات کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں، فرق اس وقت واقع ہوتا ہے کہ ان معلومات کو جمع اور مرتب کرتے وقت آدمی جس طرح پر سوچتا ہے اور جو نظریہ رکھتا ہے، اس کے مطابق ان کو مرتب کرتا ہے کہ کسی کا طرز زندگی کیا ہے کس نظام فکر و عمل پر کہ ... اور اسی وجہ سے تہذیبوں کی شکلیں مختلف ہوتی رہتی ہیں چنانچہ تمام دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں ہیں وہ ان معلومات میں تو جو انسان کو حاصل ہیں لیکن ہر تہذیب نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان معلومات کو مرتب کیا ہے اور اس سے ایک نظام فکر و عمل بنایا ہے۔ اور اسی نظام فکر و عمل کا نام ایک خاص تہذیب ہے۔ ہر تہذیب کے امتیازی خطوط اور امتیازی خدوخال اسی چیز کی بدولت پائے جاتے ہیں۔

### جمود و انحطاط کا نتیجہ

اب اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی قوم اپنی موجودہ سوچنا اور تحقیق کرنا اور معلومات جمع کرنا اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دے تو وہ جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے، جمود کا نتیجہ آخر کار انحطاط ہوتا ہے

[...] ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی قوم پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے۔ جب کسی دوسری قوم کا غلبہ ہو جاتا ہے تو لامحالہ وہ محض سیاسی اور معاشی حیثیت ہی سے غالب نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑھ کر اس کا غلبہ فکری حیثیت سے ہوتا ہے یعنی اس کی تہذیب مغلوب قوم کا یہ رسوخ ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دوسروں کا لیس خوردہ کھاتا ہے۔ جتنی تحقیقات دوسرے کرتے ہیں، ان کو جمع دوسرے لوگ کرتے ہیں، ان کو مرتب کر کے ایک فلسفۂ حیات دوسرے لوگ بناتے ہیں ایک نظام فکر و عمل دوسرے لوگ تیار کرتے ہیں اور یہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور ان کی ہر چیز کو قبول کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل جب بڑھتا جاتا ہے تو آخر رفتہ رفتہ مکمل تک پہنچ جاتا ہے کہ اس مغلوب قوم کی انفرادیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ دنیا میں ہوتی ہے اور پھولی رہی ہیں ایسی قومیں دنیا میں گذری ہیں جو اس طرح سے مٹیں کہ اب اُن کی تہذیب صرف تاریخ کا سرمایہ ہے اور دنیا میں کہیں ان کا وجود [...]

اسلامی تحریک جب دنیا میں اٹھی تھی اس وقت مسلمانوں نے دوسری قوموں پر محض سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان بھی اس وقت ایسے تھے جو تحقیقات کا کام کرنے میں سب سے پیش پیش تھے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطۂ نظر سے ایک نظام فکر اور اپنے عقیدے کے مطابق مرتب کیا، چنانچہ ایک ایسی غالب تہذیب اس کی بدولت وجود میں آئی جس کے رنگ میں دنیا رنگتی چلی گئی۔

**فنِ طب اور مسلمان**

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے فن طب تک کو اس طرح سے مرتب کیا کہ طبّی کتابوں کو آپ پڑھتے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عقیدہ رکھنے والی کسی قوم کی کتابیں ہیں۔ آغاز خدا کی حمد سے کریں گے دوائیں اس طرح سے منتخب کریں گے کہ اس کے اندر حرام اجزاء شامل نہ ہوں، حلال چیزوں سے نسخے مرتب کریں گے جگہ جگہ بیان اس طرح سے کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے ان دواؤں کے اصلی خواص دوا کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ بیماریوں کی شفاء اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ان دواؤں کا کارگر ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی بدولت ہے۔ نسخہ پر بھی لکھیں گے بسم اللہ کہہ کر رکھیں گے — اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں گے کہ رہنمائی فرمائیے۔ یہ ساری چیزیں کتابوں میں الحقیقت میں تھا اور یہی معلومات تھیں جو دنیا کا کوئی طبیب فراہم کرے گا لیکن ان سب کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنے عقیدے اور اپنے طرز فکر کے مطابق انہوں نے ڈھالا۔

میں نے طب کی مثال اس لئے دی کہ طب سے متعلق آدمی یہ سمجھے گا کہ اس کا کسی عقیدے سے کیا تعلق ہے؟ لیکن آپ دیکھئے کہ جب کوئی عقیدہ اور مسلک رکھنے والا گروہ ہوتا ہے تو وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور وہی چیز پھر غالب ہو جاتی ہے۔

**مسلمانوں کی تہذیب کے عروج کا دور**

مسلمانوں کے اس کام کا اثر یہ ہوا ہے کہ صدیوں دنیا یہ سمجھتی رہی کہ اگر ہدایت ہے تو مسلمانوں کی ہے۔ تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے مسلمانوں کے خلاف تعصب رکھتے تھے مگر تقلید انہی کی کرتے تھے۔ دنیا میں مسلمانوں نے شرک کی جڑ کاٹ دی تھی اور توحید کو اس قوت کے ساتھ پھیلایا اور توحید کی اساس پر ایک نظام فکر اس قوت کے ساتھ مرتب کیا کہ مشرکین کے لئے یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ شرک بھی حق ہے وہ مشرکین جو کبھی کہا کرتے تھے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص ۵) یہ کیسی عجیب بات ہے کہ سارے خداؤں کو ختم کر کے اس شخص نے ایک خدا بنا دیا۔ کہاں تو وہ وقت تھا جب وہ سمجھتے تھے کہ شرک حق ہے اور توحید عجیب بات ہے اور پھر کہاں یہ صورت حال ہو گئی کہ اتنی مدت نہ گذری کہ مشرکین کے لئے یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ کئی خدا ہیں انہوں نے اپنے عقیدوں کی تاویل اس طرح سے کرنی شروع کر دی کہ ہم جانتے تو ایک ہی خدا کو ہیں لیکن یہ دوسری چیزیں جو ہم کر رہے ہیں یہ اسی خدائے ایک تک شفاعت کا ذریعہ و وسیلہ ہیں۔ مختلف مشرک قوموں کے اندر توحیدی مسلک و مذاہب پیدا ہو گئے۔ خود آپ کے اس ملک میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح سے مسلمانوں کا مرتب کردہ فلسفہ اور ان کی مرتب کردہ سائنس اور ان کے مرتب کردہ علوم عمرانی یہ ساری چیزیں دنیا پر چھا گئے اور چھائی چلی گئیں۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی جو تحریک اٹھی تھی وہ مسلمانوں ہی کے سکھائے ہوئے علوم کی بدولت اٹھی تھی جو کچھ اسپین میں مسلمانوں کے علوم و فنون تھے اور جو ان کی درسگاہیں تھیں ان سے استفادہ کر کے جو لوگ تیار ہوئے تھے وہی لوگ مغرب میں اس تحریک کے موجب ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یورپ کے اہل علم عربی زبان میں لکھنا اور بولنا باعث فخر سمجھتے تھے بہت سے لوگ ایسے تھے جو ان کے مذہبی پیشوا [illegible] میں شمار ہوتے تھے، لیکن وہ اپنے پرائیوٹ خطوط عربی زبان میں لکھتے تھے اس زمانے کے لوگوں کی شکایات آج تک لکھی شکل میں موجود ہیں کہ ہماری قوم کے اہل علم و فکر پر عربی زبان اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ وہ اپنی پرائیوٹ زندگی تک میں عربی زبان کو استعمال کرتے ہیں اور اپنی قومی زبان کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کا نتیجہ تھا کہ اس وقت علمی تحقیقات کا کام مسلمان کر رہے تھے اور دوسری قومیں ان کا لیس خوردہ کھاتی تھیں ان کے مرتب کردہ علوم کو سیکھتی تھیں جس طرح پر مسلمانوں نے ان کو مرتب کیا تھا اس طرح پر وہ ان کو پڑھتی تھیں اور حاصل کرتی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ ان کی ذہنیتیں اسلام کے طریقہ پر ڈھلتی تھیں حتیٰ کہ مغرب میں جو مسیحی متکلمین کا ایک گروہ گذرا ہے اس کی کتابیں آپ پڑھئے — آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے متکلمین کی اور ان کے علم کلام کی جوں کی توں نقل اتاری جا رہی ہے وہی مسائل ہیں وہی اصطلاحات ہیں، وہی بحثیں ہیں۔ بجز اس کے کہ انہوں نے مسیحی عقیدے کو اس کے اندر شامل کر دیا ہے لیکن آپ مسیحی متکلمین کی تحریروں میں اور مسلمان متکلمین کی تحریروں میں بجز تثلیث اور ابنیت کے عقیدے کے اور کوئی فرق نہیں پائیں گے۔

**مسلمانوں کا تحقیقات چھوڑ دینا**

اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں مسلمانوں نے نئی تحقیقات کا کام قریب قریب ترک کر دیا جو کچھ علوم اوائل میں تھے انہی کو پڑھتے پڑھاتے رہے۔ انہی کے اوپر حاشیے چڑھاتے رہے۔ حاشیے در حاشیے لکھتے چلے گئے لیکن نئی تحقیقات اور

علوم و فنون میں آگے بڑھنے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا اور دوسری طرف اسی زمانہ میں اہل مغرب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تحقیقات علمی شروع کی انہوں نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں انہوں نے ان کو مرتب کرکے نئے فلسفے اور نئے نظامہائے فکر و عمل کی تشکیل شروع کر دی اس کا نتیجہ جو ہوا وہ یہ کہ ایک طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف اس علمی تحریک کی بدولت مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے جب وہ نئی نئی معلومات جمع کریں گے اور نئی نئی تحقیقات کریں گے تو ذرائع اور وسائل ان کے ہاتھ میں ہوں گے ان کے ذہنوں میں زندگی اور بیداری پیدا ہوگی اور آپ اس کو چھوڑ دیں گے تو آپ کے اندر لامحالہ جمود اور تعطل پیدا ہوگا آپ اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے اٹھارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان اتنا نمایاں فرق ہوگیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہوگئے اور مغربی قومیں ان پر غالب آتی چلی گئیں۔ دو سو برس جمود میں لگے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان مغلوب ہوتے چلے گئے اور مغربی قومیں غالب آتی گئیں اٹھارہویں صدی سے مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورش اور ان کی فتوحات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ علمی تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کے کیا فوائد حاصل کئے

جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ جمود کا لازمی نتیجہ انحطاط ہے اور انحطاط کا لازمی نتیجہ مغلوب ہو جانا ہے لیکن اگر علمی تحقیقات کی جائیں اور مسلسل کی جائیں اور نئی نئی معلومات فراہم کی جائیں اور ان کی بنا پر نئے سرے سے فلسفۂ زندگی تیار کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرکت پیدا ہوتی ہے طاقت پیدا ہوتی ہے اور اس قوم کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غلبہ حاصل ہونے کے بعد جمود ہی نہیں ٹوٹ جاتا بلکہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوم غالب ہے اور جو تحقیقات کر رہی ہے علوم و فنون کو جمع کر رہی ہے معلومات فراہم کر رہی ہے اور ان کو مرتب کرکے ایک تہذیب بنا رہی ہے وہ لامحالہ اپنی تہذیب کے ساتھ غالب آتی ہے محض اپنی سیاست اپنے اسلحہ اور اپنی قوت ہی سے غلبہ نہیں پاتی بلکہ اس کی پوری تہذیب مغلوب قوم پر غالب آنی شروع ہو جاتی ہے یہ نقشہ پہلے بھی ہم دیکھ چکے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

## مغربی تہذیب کا غلبہ

اسلام کے غلبہ کے دور میں تمام دنیا یہ محسوس کرتی تھی کہ تہذیب ہے تو مسلمانوں کی تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے اور فکر و علم ہے تو مسلمانوں کا ہے اب اس کے برعکس یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ خود مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اتر گئی کہ کوئی تہذیب ہے تو اہل مغرب کی ہے کوئی تمدن ہے تو اہل مغرب کا ہے اور علم و فن جو کچھ بھی ہے اہل مغرب کا ہے ہمارا کام ان کا لیس خوردہ کھانا ہے، ہمارا کام ان کے پیچھے چلنا ہے، ہمارا کام ان کی تقلید کرنا ہے۔ یہ عملاً صورت پیدا ہو چکی ہے، چاہے زبان سے انکار کریں چاہے زبان سے ہم مزاحمت کرنے کی کوشش کریں اور زبان سے ہم اظہار نفرت کریں لیکن دیکھئے عملاً کیا ہو رہا ہے؟ عملاً یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے اوپر مغرب کے افکار اور فلسفے، ان کے طرز زندگی، ان کی تہذیب اور تمدن سب کچھ چھایا جا رہا ہے اس سے میں جو بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی چاہتے ہیں، اپنی بقا چاہتے ہیں اور اپنا ارتقاء چاہتے ہیں، تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم نئے سرے سے علمی تحقیقات کا کام کریں۔

## نقصان دہ تحقیقات

اس سلسلے میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ علمی تحقیقات کس نوعیت کی ہمیں مطلوب ہیں ایک تو وہ ریسرچ ہے جو مغربی محققین ہم کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بے مقصد اور بے رنگ ریسرچ محض ریسرچ برائے ریسرچ ہے۔ مثلاً کتابوں کو ایڈٹ کرنا، ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ان کی عبارتوں کے فرق کو دکھانا اور مصنفین کے سن وفات وپیدائش کو جمع کرنا اور اسی قبیل کی جو ریسرچ ہے۔ یہ بے مقصد اور بے معنی ریسرچ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علم و تحقیق میں مددگار ہوتی ہے لیکن بجائے خود یہ وہ ریسرچ نہیں ہے جو کسی قوم کو زندگی کی حرارت عطا کرنی اور جذبات کی حرکت پیدا کرے یہ مقصدی اور بامعنی ریسرچ ہے اہل مغرب ایک ریسرچ اور کرتے ہیں وہ خاص قسم کی ریسرچ ہے وہ اس مقصد کے تحت ہے کہ ان کے پاس وہ طاقتیں فراہم ہوں کہ جو ان کو دنیا پر غالب کر سکیں۔

ایک اور قسم کی ریسرچ جو اب ہمارے ملک میں شروع ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ریسرچ تو اسلام کی کی جائے، مگر اس غرض کے لئے کہ ایک نیا اسلام تصنیف کیا جائے جو تمام مغربی افکار اور معیارات کے بالکل مطابق ہو۔ یعنی جو کچھ مغرب میں حلال ہے وہ حلال ثابت کیا جائے جو کچھ مغرب کی نگاہ میں حرام ہے اسے حرام ثابت کیا جائے اور اسلام کو کسی نہ کسی طرح ڈھال کر ایسا دکھایا جائے کہ گویا یہ بھی مغربی تہذیب و تمدن کا ایک دوسرا ایڈیشن ہے یہ ریسرچ بھی ہمارے کسی کام کی نہیں ہے

## اسلامی طریق تحقیق

ہم جو ریسرچ چاہتے ہیں، اور جس غرض کے لئے چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق علوم و فنون کی تحقیقات کی جائے اور تحقیقات کرکے اسلام کے نظام فکر و عمل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا جائے اس سلسلے میں چند مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں اور انہی مقاصد کی تحصیل کے لئے ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا کام جو ہم کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اس کو توڑ ڈالا جائے ایک معقول اور مدلل علمی تنقید کے ذریعے یہ بات ثابت کی جائے کہ مغربی علوم و فنون میں جتنے حقائق اور واقعات ہیں وہ دراصل تمام دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہے اور اس کے ساتھ کسی تعصب کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن ان معلومات و حقائق کو جمع کرکے جو فلسفۂ حیات اہل مغرب نے بنایا ہے وہ قطعی باطل ہے ان کو مرتب کرکے جو طرز فکر اور کائنات کے متعلق جو تصور اور انسان کے بارے میں جو تصور انہوں نے قائم کیا ہے اور جس کے اوپر اپنی پوری تہذیب کی عمارت

انہوں نے اختیار کی ہے وہ ساری کی ساری از اوّل تا آخر باطل ہے۔ جو معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCES) انہوں نے مرتب کئے ہیں جو معاشی فلسفہ ([illegible]) انہوں نے گھڑا ہے وہ سرتاسر فتنہ و فساد ہے وہ انسان کی فلاح کے لئے نہیں بلکہ انسان کی بربادی کے لئے ہے اور جو دنیا کی ایسی تباہی کے لئے ہے۔ یہ پہلا ضروری کام ہے جس کے ذریعے سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر مغربی فکر و فلسفے کا جو سحر ہے وہ ختم ہو جائے گا جس کے بغیر مسلمانوں کو اس ذہنی مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کی حالت سے نہیں نکالا جا سکتا اور جب تک وہ اس ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہیں اس وقت تک آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ مقلدانہ زندگی چھوڑ کر مجتہدانہ زندگی اختیار کریں گے اس وقت تک ان کا کام آنکھیں بند کر کے اہل مغرب کے پیچھے چلنا ہے۔ اس حالت کو آپ نہیں بدل سکتے جب تک کہ اس سحر کو نہ توڑ دیں اور اس حقیقت کو واضح نہ کر دیں کہ علمی حقائق اور چیز ہیں اور علمی حقائق کو مرتب کر کے ایک فلسفۂ زندگی اور نظام حیات مرتب کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ حقائق اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں لیکن [illegible] ان کو مرتب کر کے جو فلسفۂ حیات بنایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔

۲۔ اس کے بعد دوسرا کام کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم و فنون کو نئے اسلوب ـــــ اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔ اسی طرح اسلام کے مطابق ایک فلسفہ درکار ہے جو انسان کے ذہن کی اس تلاش کو تسکین دے کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر یہ تسکین اس عقیدے کے مطابق ہو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے۔ حقیقت کی تلاش اور اس کی تڑپ انسان کی فطرت میں ہے، وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مگر تلاش حقیقت کے مختلف راستوں میں سے صحیح راستہ ہمارے نزدیک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ اس راستے کے مطابق تلاش حقیقت اور کائنات کی حقیقت اور حیاتِ انسانی کی حقیقت پر اس کے خیال کو ایک فلسفے کی شکل میں مرتب کیا جائے تاکہ آدمی کو اس کے مطابق ڈھالا جائے اور ظاہر ہے یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک فلسفۂ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب نہ کریں۔ اس کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ کی یونیورسٹیوں میں اور آپ کے کالجوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نصاب کے جو علوم پڑھائے جاتے ہیں یا دوسرے فلسفیانہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ان کو بدل دیا جا سکے اور ان کی جگہ کوئی دوسرا فلسفہ پڑھایا جا سکے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ روس میں مغربی تہذیب سے بالکل مختلف ایک تہذیب اٹھانے کی کوشش کی گئی اور جب روسیوں نے کمیونسٹ طرز فکر کو اختیار کیا تو وہ کسی طرح سے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ جس کو وہ بورژوا فلسفہ کہتے ہیں وہ ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جائے کیونکہ کمیونسٹ اس کو اپنے وجود کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں اور ناگزیر ہے کہ وہ ایک کمیونسٹ فلسفہ مرتب کریں اور اسے اپنی نئی نسلوں کو پڑھائیں کہ جب تک وہ اس بورژوا فلسفے کو نہ ہٹا دیں گے اور اس کی جگہ پیوستہ اپنا فلسفہ ذہنوں میں نہ بٹھائیں گے اس وقت تک نہ نقطۂ نظر بدل سکتا ہے نہ ایک کمیونسٹ نظام کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمارے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ایک اسلامی فلسفہ مرتب کریں، تمام علوم جو ہیں ان کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔ بلاشبہ واقعات اور حقائق وہی رہیں گے جو دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہیں لیکن ان واقعات اور حقائق سے ایک پورا نظام فکر و عمل مرتب کرنا خواہ وہ معیشت کا علم ہو خواہ قانون و فلسفہ قانون کا علم ہو غرض جتنے بھی علوم عمرانی ہیں ان میں سے ہر ایک کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ان کو اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب نہ کیا جائے گا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ نئے علوم نہ پڑھائے جائیں گے اس وقت تک آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ یہاں کبھی اسلامی تہذیب اٹھ سکے گی بلکہ اس کا باقی رہنا بھی مشکل ہے

## نظام تعلیم کی اصلاح

کیونکہ آپ اپنے گھروں میں اپنے بچے کو چاہے یہ عقیدہ دیں کہ خدا ایک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی تھے اور چاہے آپ اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیں کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے یہ کام بھی چھوڑ دیا ہے اور اپنے بچوں کو وہ مشنریوں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ جو عقیدہ چاہیں ان کے ذہنوں میں اتار دیں۔ بالفرض بعض لوگ احتیاطاً یہ ساری باتیں اپنے بچوں کے ذہن میں اتار بھی دیتے ہیں لیکن وہ بچے جب کالجوں میں جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے یہ صورت آتی ہے کہ تمام علوم جو وہ پڑھ رہے ہیں ان کے اندر خدا کہیں بیچ میں آتا ہی نہیں۔ وہ سائنس پڑھ رہے ہوں یا علوم عمرانی کبھی ان کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کائنات کے اندر خدا کا بھی کوئی کام ہے۔ وہ بھی کوئی کچھ کر رہا ہے۔ ان کے سامنے یہ آتا ہی نہیں کہ رسولوں نے بھی کوئی علم الاخلاق [illegible] رسولوں نے بھی کوئی فلسفہ بتلایا ہے بلکہ اس کے برعکس ـــ ایک علم جو وہ پڑھتے ہیں وہ ان کے ذہنوں میں یہ بٹھاتا ہے کہ اسلام نے معاذ اللہ بہت سارے غلط کام کر ڈالے ہیں۔ مثلاً اس نے سود کو حرام کیا گویا نعوذ باللہ ایک بڑا فضول کام کیا کہ اس سے یہ کام کوئی معاشی نظام نہیں چل سکتا، اور کوئی (FINANCIAL STRUCTURE) معاشی ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلام نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دیا گویا معاذ اللہ بڑا وحشیانہ کام کیا۔ پھر اس نے زنا پر سخت اور تعزیری چیزیں یہ خواہ مخواہ اتنی سخت رکھیں کہ کوڑے مار مار کر کسی کی پیٹھ کی کھال اڑا دی جائے یہ بھی جیسے بہت وحشیانہ کام کیا۔

ذرا سوچئے! اس طرح کا طرز فکر جب ان کے سامنے آئے گا تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اسلامی تہذیب کے سچے دل سے قائل اور اس کے پیرو کبھی ہو سکتے ہیں! اور پھر یہی لوگ جو ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، وہی آپ کے ملک کا نظام چلاتے ہیں وہی آپ کے ملک کے سیکرٹری بنتے ہیں، وہی جنرل بنتے ہیں، وہی آپ کی حکومت کے کارپرداز بنتے ہیں۔ ان کے دماغ میں یہ بات کیسے اتر سکتی ہے کہ یہ اسلام چلنے کے قابل ہے اور چلانے کے قابل ہے۔ چنانچہ آپ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک بڑے گروہ سے بات کر کے دیکھ لیں۔ آپ کو تھوڑی ہی دیر میں

محسوس ہو جائے گا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام اس زمانے میں چلنے والی چیز نہیں ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سارے علوم انہوں نے جس انداز سے پڑھے ہیں اس کی وجہ سے ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی طرز زندگی یا نظام تھا۔ مغربی نظام زندگی سے بہتر ہو سکتا ہے اور وہ چل بھی سکتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قابل عمل صورت وہی ہے جو مغربی طرز زندگی کی ہے کیونکہ ایک چیز چل رہی ہے، کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے جب کہ دوسری چیز معطل ہے اور اس کا کوئی اثر ان علوم و فنون پر نہیں ہے جن کو وہ پڑھ رہے ہیں۔ پھر تنقیدی کام کے ساتھ ساتھ دوسرا تعمیری کام جو ناگزیر ہے اور جسے کرنے کی شدید ضرورت ہے، وہ یہ کہ تمام علوم کو اسلام کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے تاکہ ہماری نئی نسلیں اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے پوری طرح مطمئن ہو جائیں اور انہیں اطمینان ہو کہ یہ چیز چلنے کے قابل ہے اور ان کے اندر یہ ارادہ پیدا ہو کہ اس کو چلایا جائے۔

اس کے بعد جو تیسرا کام ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ ایک نصاب مرتب کیا جائے جو اس طرز پر تعلیم کے قابل کتابیں تیار کرے۔ ورنہ ابھی تک حال یہ ہے، اور یہ کہ نیچے سے اوپر تک جس کو دیکھئے وہ یہ بات کہتا ہے کہ ہم اسلامی تعلیم اس ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ یہ مختلف علوم جو ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں ان پر کتابیں بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے تیار کی جائیں۔ میں آپ سے ابھی عرض کر چکا ہوں کہ کمیونسٹ اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ اکنامکس کی ایسی کتابیں پڑھائیں جو بورژوا اکانومسٹ نے لکھی ہیں، وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں کہ وہ ایسا فلسفہ یا تاریخ پڑھائیں جو سرمایہ داروں کے حامی فاضلوں نے مرتب کیا ہے۔ غرض اسی طرح وہ صرف سوشل سائنس ہی نہیں، اپنے لوگوں کو نیچرل سائنس بھی بورژوا لوگوں کی لکھی ہوئی پڑھانے کے لئے تیار نہیں، بلکہ وہ ایک سوویٹ سائنس تیار کر رہے ہیں۔ یعنی معاملہ علوم عمرانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ سائنس کو بھی وہ کہتے ہیں کہ یہ سوویٹ سائنس ہے۔ تمام سائنٹفک کتابوں کو انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے مرتب کیا ہے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کمیونسٹوں کی نئی نسل کی پرورش سرمایہ داروں کے مرتب کردہ سائنسی ذخیرہ سے کریں۔

ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ تمام اوقات (گھنٹوں) میں تو ہم وہ علوم پڑھائیں جو مغربی مصنفین کی کتابوں میں ملتے ہیں اور صرف ایک پیریڈ میں لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ایک ہستی کا نام خدا ہے جسے تم کو ماننا چاہئے اور ایک نبی کو اللہ نے رسول بنا کے بھیجا تھا لیکن اس خدا اور اس رسول کا کوئی مظاہرہ (manifestation) ان کی باقی ساری پڑھائی میں نظر نہیں آتا بلکہ اس کے برعکس تمام علوم و فنون اس طرز پر پڑھائے جاتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب نے مرتب کیا ہے، یا ہمارے ہاں کے ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں جو اہل مغرب کی نقل پر لکھی جانے کے عادی ہیں۔ اس سے آپ یہ توقع رکھیں کہ آپ کے ہاں وہ نسل کبھی تیار ہو سکے گی جو یہاں اسلام کا احیا کرے اور احیا کرنا تو درکنار اسلام کو باقی رکھ سکے۔ یہ راستہ سیدھا ایسی الحاد اور … کو ختم کرنے کی طرف جا رہا ہے۔ یہ دور ہماری افراد تک معمولی علمی سازش سے اور ہماری حکومت اور ہمارے رہنما اور ہمارے بااثر طبقے خواہ وہ کسی کے ہوں خواہ صحافیوں کے اہل مغرب کے سامنے یہ نقشہ پیش کر رہے ہیں کہ ہم میں اور تم میں کسی لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں ہے جو تمہاری تہذیب ہے وہ ہماری تہذیب، جو تمہارا تمدن وہ ہمارا تمدن، جو تمہارے اخلاق وہ ہمارے اخلاق، جو تمہاری قدریں وہ ہماری قدریں۔ حتیٰ کہ ہم اس بات کو بھی مان گئے ہیں کہ جس جس حرام کو انہوں نے حلال کیا ہے وہ ابھی حلال ہے اور یہ غلطی جاری تھی کہ اسے حرام قرار دے دیا تھا، غلط فہمی تھی کہ وہ حرام ہے۔ اس صورت حال میں کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ یہاں اسلام باقی بھی رہ سکے گا؟ کیا آپ یہ توقع کریں کہ وہ نسلیں جو اس طریقے پر پرورش پا رہی ہیں اور یہ ذہن رکھنے پا رہی ہیں، وہ یہاں کبھی اسلام کے احیاء کے لئے بھی کام کر سکیں گی اور اسلامی تہذیب و تمدن کی علمبردار بن سکیں گی۔

**عربی میں کام**

اس کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ جو کچھ مرتب کیا جائے وہ صرف اردو میں ہی نہ ہو بلکہ انگریزی اور عربی زبانوں میں بھی ہو یعنی ترجمہ کا کام بھی ساتھ ساتھ کرتے چلے جائیں اور انگریزی اور عربی دونوں میں ان چیزوں کو لائیں۔ عربی میں لانا اس لئے ضروری ہے کہ ملایا سے لے کر اٹلانٹک تک عام مسلمان قریب قریب عربی زبان بولتے ہیں ان کی زبان عربی ہے۔ اس وقت ان کی سولہ سترہ آزاد ریاستیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے اور دنیائے اسلام کا دل ہے۔ جب تک قرآن مجید سے مسلمان استفادہ کریں لامحالہ وہ قرآن مجید کی زبان یعنی عربی زبان کی اہمیت محسوس کریں گے اور اس کا اثر ہوگا۔ لہٰذا اگر وہ زبان لکھ کر اشاعت کرنے لگے، اگر اس زبان میں لوگوں کو نئی وحی ملے، اگر اس زبان میں لوگوں کو الحاد ملے تو آپ اندازہ کیجئے کہ اس سے زیادہ خطرناک کیا ہو سکتا ہے۔ مزید برآں افسوس کی بات یہ ہے کہ عرب ممالک کے مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور تمدن کا غلبہ ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہم ان سے بہت پہلے مغرب سے مغلوب ہوئے تھے لیکن اتنے مغلوب ہم نہیں ہوئے جیسے کہ وہ ان سے متاثر ہوئے۔ درآنحالیکہ وہ ہمارے بعد مغلوب ہوئے۔ جس زمانے میں اس وقت عرب ممالک میں ان کے کار فرما زیادہ تر مغربی ذہن کے لوگ ہیں اور اسلامی علمی کام وہاں بہت کم ہو رہا ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر کے ٹھیک مطابق ہو تاہم وہاں بھی کام ہو رہا ہے اور یہ خیال کرنا کہ وہاں کام نہیں ہو رہا ہے یہ غلط ہے، وہاں بھی کام ہو رہا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہاں جو کچھ کام ہو رہا ہے اس کا معتد بہ حصہ اردو میں منتقل کریں تاکہ وہاں کی تصنیفات کو اردو میں منتقل کریں تاکہ یہ ایک مشترک ذخیرہ بن سکے اور دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی ایک صحیح اسلامی ذہن پرورش پا سکے اور وہاں کے کارفرما بھی اس بات پر مطمئن ہو سکیں کہ اسلام کو چلایا جا سکتا ہے اور ان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ اس کو چلائیں اور ان کو وہ طریقہ معلوم ہو جس سے اسلام کو چلایا جا سکے۔ اس ضرورت کو ہم بھی پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور عرب ممالک میں بھی بعض حلقوں میں یہ کام ہو رہا ہے۔

## انگریزی خوانی

انگریزی میں اس کی متعدد وجوہ سے ضرورت ہے اور آپ خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ انگریزی میں اس چیز کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اوّل تو خود ہمارے ملک کا ما لائق طبقہ انگریزی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں کچھ پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہے اور ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہے اور ہمارے اونچے طبقے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے لئے اردو زبان میں اپنا نام لکھنا بھی مشکل ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے آدمی کو خیال پیدا ہوا کہ ان کے صاحبزادے جو انگلستان میں ہیں ان کو کچھ اسلام سے واقفیت پیدا ہو، چنانچہ ایک صاحب ان کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ اردو زبان میں کوئی دینی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ اردو زبان میں وہ کچھ پڑھ ہی نہیں سکتے۔ لامحالہ ان کو انگریزی میں تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی حالانکہ وہ اسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی ملک میں ان کا پورا خاندان پیدا ہوا ہے لیکن وہ اس ملک کی زبان سے واقف نہیں ہیں کہ دین کی تعلیم اردو میں حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد کوشش کی گئی کہ کسی طرح وہ کم از کم قرآن مجید کو پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو ان کو اس قابل بنانے میں ایک مہینہ لگا کہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورۂ فاتحہ پڑھ سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ کافی دنوں تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ الٹا کیسے لکھا ہوا ہے، یعنی جو سیدھا ہے ان کے نزدیک الٹا ہے چونکہ ساری عمر ان کی ادھر سے اُدھر لکھنے اور پڑھنے میں گزری ہے اس لئے ادھر سے ادھر جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسا کوئی زبان ہی الٹی لکھی جاتی ہے۔ یہ طبقہ ہمارے ہاں موجود ہے اور یہی طبقہ ملک کے معاملات کو چلا رہا ہے۔ اسی کے ہاتھوں میں ملک کی باگیں ہیں۔ اب کہاں یہ لڑائی لڑی جائیں کہ پہلے اردو سیکھو تو ہم تمہیں دین سکھائیں گے، اس لئے ہمیں ان کے لئے اسی زبان میں بھی مواد فراہم کرنا ہے جس میں وہ سیکھ سکتے ہیں تاکہ کم از کم ان کے عقیدے اور ایمان کو تو بچایا جا سکے۔

اس کے علاوہ باہر کے ملکوں میں اگر آپ اسلام کی تعلیم کو پھیلانا چاہیں تو کم از کم ہمارے لئے انگریزی ہی وہ واسطہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہم یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یوں تو تنہا ایک انگریزی ہی بین الاقوامی زبان نہیں ہے، دوسری زبانیں بھی ہیں جن میں اسلام کے متعلق لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پاس انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں نشر و اشاعت کے ذرائع نہیں اور اگر ایک مرتبہ انگریزی زبان میں اسلامی علوم کو ان کی صحیح شکل میں پیش کیا جائے تو اس کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمے ہونے کا امکان ہے۔ مثلاً ہماری ایک کتاب ہے جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اب اس ترجمے سے جرمن زبان میں اور جاپانی زبان میں بھی ترجمے ہوئے ہیں اور دوسری زبانوں مثلاً فرنچ میں بھی شروع ہو گیا ہے جرمن دوسری زبانوں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کام اللہ کے دوسرے بندے کریں گے۔ بالفعل ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ انگریزی زبان میں اسلام کے متعلق صحیح معلومات ہم پہنچا سکیں۔ یہ دنیا میں اسلام کی ترویج کا ایک اساسی ذریعہ ہے جو پوری طرح استعمال کئے جانے کی شدید ضرورت ہے۔

## نو مسلموں تک علم پہنچانا

ہمارے پیش نظر اس کے ساتھ ساتھ دو کام اور بھی ہیں اگرچہ اہمیت میں کم ہی سمجھے جائیں لیکن فی الواقع ان کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ ایک کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو مسلمانوں کی آبادیاں منتشر ہیں وہاں اُن کی نئی نسلوں کے ارتداد کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ویسٹ انڈیز میں اور دوسرے دور دراز کے جزائر میں، خود امریکہ کینیڈا اور جنوبی امریکہ کے مختلف حصوں میں جو مسلمان آباد ہیں منتشر ہیں، وہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ کفار کی حکومت بھی ہے اور اکثریت بھی ہے۔ ان کی تعلیم کا سارا انتظام غیر اسلامی ہے مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی ایک خاص انتظام نہیں ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسلیں روز بروز غیر مسلم اکثریت میں جذب ہوتی چلی جا رہی ہیں ان کو اسلام کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ہم مسلمانوں کی اولاد ہیں اور اس لئے ہم مسلمان ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن کی ضروریات کے مطابق کچھ مختصر نصاب ایسا تیار کر دیا جائے کہ کم از کم وہاں کی جو نئی مسلمان نسلیں ہیں وہ مسلمان رہ سکیں اور ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو سکیں۔

## فقہی نصاب

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی کوششوں کے نتیجے میں جو جو افراد اسلام قبول کریں ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کے بغیر کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

اس مقصد کے لئے ایک ایسا مختصر سا نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ضروری فقہی مسائل پر مشتمل ہو تاکہ جو جو لوگ اسلام قبول کرتے جائیں وہ اس کی مدد سے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں وہ جان سکیں کہ طہارت اور نجاست کیا چیز ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔ طہارت کیسے حاصل کی جائے۔ نماز کیسے پڑھی جائے۔ روزے کے احکام کیا ہیں۔ زکوٰۃ کے احکام کیا ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود اسلام کی تبلیغ کر سکیں۔ اس کے لئے ان کو ایسا مواد فراہم کر کے دیا جائے جس سے وہ اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور اس کی تبلیغ کر سکیں۔ اس چیز کے لئے بھی کچھ چیزیں تیار کرنا ہمارے پیش نظر ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی کے ماسوا اگر دوسری زبانوں میں بھی اس کا انتظام ہو سکے تو خصوصاً کہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ یہ کام سواحلی زبانوں میں بھی کریں تاکہ افریقہ میں یہ چیزیں پھیل سکیں۔ جیسے جیسے دوسری افریقی زبانوں میں یہ کام کرنے کے امکانات ہوتے جائیں گے انشاء اللہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

یہ اس کام کا ایک مختصر سا نقشہ ہے جو ہمارے پیش نظر ہے ہم نے یہ کام جس غرض کے لئے شروع کیا ہے اور جس ضرورت کو سامنے رکھ کر شروع کیا ہے اس کی وضاحت مختصر طور سے میں نے آپ کے سامنے کر دی ہے۔ وما علینا الا البلاغ

[illegible] گرجیتال

# شاگرد اور استاد

## جستہ جستہ

استاد کی نگاہ اور دعا دونوں میں اثر ہوتا ہے اور بلاشبہ شاگرد کی ذہنی اور روحانی زندگی پر استاد کی شخصیت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے یہاں ہم بعض معروف شخصیات کے اپنے اساتذہ اور تعلیم کے حوالے ذاتی مشاہدات اور واقعات پیش کرتے ہیں

(محمود)

## امام ابو یوسفؒ

امام ابو یوسفؒ کے والد ایک غریب آدمی تھے ان کو اگرچہ بچپن میں لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا لیکن باپ کی مرضی یہ تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی محنت کریں اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں تاہم جب بھی آپ کو موقع ملتا علما کی صحبت میں جا بیٹھتے ایک دن امام ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس میں جا بیٹھے کہ ان کے باپ نے ان کو وہاں سے زبردستی اٹھا لیا گھر پر آکر کہا بیٹا ابو حنیفہ تو صاحب رزق کی طرف سے اطمینان رکھتے ہیں تم ان کی حرص کیوں کرتے ہو امام ابو یوسف نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے امام ابو حنیفہؒ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ یعقوب اب نہیں آتے؟ ایک دن ابو یوسف خود حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی امام اعظمؒ نے چلتے وقت ایک تھیلی حوالے کی گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سو درہم تھے امام صاحب نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو چکیں تو مجھ سے کہنا اس طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے یہاں تک کہ آپ نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور استاد وقت ہو گئے۔

## علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے کالج کے زمانہ میں مولوی میر حسن سے بہت کچھ حاصل کیا اپنے شفیق اور بے مثل استاد کو آپ نے کبھی نہ بھلایا ولایت گئے تو ان کی یاد کی تڑپ ساتھ تھی اور سعادت مند تو مولوی صاحب کی عقیدت و محبت ان کے دل کو گرمائے رکھتی تھی اقبالؒ نے ولایت جانے سے قبل دعا کی:

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی — رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

علامہ اقبال کو جب سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے میرے استاد محترم مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے حکومت نے یہ شرط منظور کر لی اور انہیں یہ خطاب دے دیا گیا

## مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں طالب علمی کے زمانے میں بھی بہت ذہین وفطین اور برجستہ گو تھے ایک واقعہ انہی کی زبانی سنیے

"میں جن دنوں پٹیالہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک رنگین مزاج استاد مکھن لال جی مجھے پڑھایا کرتے تھے یہ استاد صاحب افیمی تھے اور ساری لڑکوں سے افیم کی چسکی لیا کرتے تھے

ہر لڑکا اپنی باری آنے پر دو آنے کی افیم لا دیتا تھا ایک دن مکھن لال افیم کی چسکی لے کر عجیب ترنگ میں آئے فرمانے لگے، دیکھو لڑکو! ایک مصرع دیتا ہوں جو لڑکا دوسرا مصرع کہہ کر شعر پورا کرے گا اسے ایک چسکی معاف ہو گی مصرع یہ تھا:

[illegible]

[illegible] بڑے حاضر جواب تھے۔ [illegible] شعر ہو گیا:

[illegible]

بولو ہوتا کہیں کا چپڑاسی ماں جایا تیری حماقت سے

[illegible] کو پہلے مصرعوں سے گرگا اٹھا [illegible] آدمی تھا اس کے مصرعے کے جواب میں دو مصرعے حاضر تھے، جوش ملیح آبادی [illegible]

[illegible] کسی روز بڑا شاعر ہے [illegible] دو شکیاں صاحب !

## مولانا مفتی محمد شفیع

[illegible] العلوم دیوبند کا ذکر آئے تو آنکھوں کے سامنے برصغیر پاک و ہند کی علمی اور دینی تاریخ ابھرنے لگتی ہے اس سرزمین سے وہ ہستیاں اٹھیں جنہوں نے انسانی کردار کے نہایت [illegible] نقوش تاریخ پر ثبت [illegible] سے تحریک آزادی کے پیچھے بے لوث اور بے غرض انسان تیار کیے مفتی شفیع مرحوم اپنے اساتذہ کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

میں ابھی چھوٹا سا ہی تھا، ان دنوں دار الحدیث کی بنیادیں کھدر رہی تھیں ان کے قریب ہی بہت بڑا تالاب تھا۔ اس لیے بنیادیں پندرہ پندرہ فٹ گہری کھودی گئی تھیں۔ ایک رات زور کی بارش ہوئی اور بنیادوں میں پانی بھر گیا اور پورا علاقہ جل تھل ہو گیا بنیادوں میں پانی بھر جانے کی وجہ سے تعمیر شدہ عمارت کو بھی شدید خطرہ تھا۔ ایک طالب علم نے شیخ الحدیث حضرت [illegible] کو اطلاع دی اسے بے حد افسوس ہے پوری بات سنی اور کسی گھراہٹ کے بغیر فرمایا: اچھا ہم کرتے ہیں "دس منٹ بعد شیخ الحدیث اپنے گھر کی بالٹیاں جمع کر کے دو تین طلبہ کے ساتھ بنیادوں تک پہنچ گئے اور پانی نکالنے لگے جلد ہی یہ بات دار العلوم میں پھیل گئی اور سارے طلبہ اور اساتذہ پہنچ گئے میں بھی تماشائی کی حیثیت سے اا اور پھر تھے کے ہاتھوں سے [illegible] ایک [illegible] کے اندر بنیادوں سے پانی نکالا جا چکا تھا اس کے بعد شیخ الحدیث طلبہ کی معیت میں تالاب میں نہانے لگے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ طلبہ اور اساتذہ میں [illegible]

ایک بار شیخ الحدیث طلبہ کے ہمراہ شکار کو نکلے چار پانچ میل چلنے کے بعد انہوں نے لمبی لمبی گیسر گھاس دیکھی یہ گھاس سردیوں میں بڑی گرم اور نرم رہتی ہے آپ نے فرمایا "آؤ اسے کاٹتے ہیں" چنانچہ سب گھاس کاٹنے لگے اور پانچ چھ بڑے بڑے گٹھڑ تیار ہو گئے طالب علم سوچنے لگے انہیں اٹھا کر کون لے جائے گا اتنے میں حضرت سب سے بڑے گٹھڑ کی طرف بڑھے، اسے سر پر رکھا اور فرمایا السلام علیکم دوستو! میں تو چلتا ہوں ۔ ہائے یہ سادی سیرتیں کہاں روپوش ہو گئیں"

## شورش کاشمیری

آغا شورش کاشمیری اپنے ایک ہندو استاد کے بارے میں رقمطراز ہیں

" ہمارے ہیڈ ماسٹر پنڈت رام رتن دیو سماج کے ہائی کے استاد تھے کئی شرارتیں ان میں ڈھلی ہوئی تھیں ان کی زبان پر الفاظ بہت ملائم تھے ان کی شخصیت کا اثر اتنا گہرا [illegible] طلبہ بے ادب ہونے سے ڈرتے تھے ان کی تنبیہ کے بول دل پر نقش ہو جاتے تھے ایک دن میں ان کے بیٹے سنیل کمار کے ساتھ ان کے گھر گیا ہم دروازے تک پہنچے ہی تھے دیکھا [illegible] کی آواز آ رہی تھی ہم ٹھٹھک کر رہ گئے تو پنڈت جی کی سسکی سنائی دی۔ سنیل کمار نے گھبرا کر پوچھا۔

"بابا جی کیا ہوا ؟"

ادھر میں بھی پریشان ہو گیا پنڈت جی ہوا کیا ؟"

رومال سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہنے لگے

"بعد الکہ میں نے ساری عمر کسی طالب علم کو نہیں مارا۔ کوئی خرابی پیدا ہوئی، زبان سے سمجھا دیا اور وہ طالب علم کے لیے کافی ہوتا آج نون جماعت کے ایک [illegible] کی [illegible] حرکت پر میں نے تھپڑ رسید کر دیا میں بہت پچھتایا کہ میرا عہد ٹوٹ گیا دل سے جو عہد کیا تھا " چالیس سال بعد اس شعر میں دلائل سے ان الفاظ میں کیا جادو تھا قلم بیان کرنے سے قاصر ہے لیکن آج کے استادوں کی عظیم اکثریت ان اوصاف سے محروم ہو چکی ہے۔

اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو باپ کو استاد کو

دیکھے بڑھتا آپ سے شاگرد کو اولاد کو !

## ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا کہنا ہے میں ایف اے کا امتحان دے رہا تھا کو مور کے بڑے کالجوں سے کوئی بھی پرائیویٹ کالجوں کے طلبہ کے داخلوں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا مجھ سے کسی نے کہا لالہ گھسیٹا رام پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو۔ میں گیا، ایک بار پکارا گیا کرسی پر سے ایک شخص اٹھا [illegible] سے کہا، بٹھایا فارم لیا دستخط کیے اور کہا، کاکا جی، جب بھی کوئی کام ہو بے تکلف آ جایا کرو پھر بڑے انکسار سے ہنستے کہا اور رخصت کیا۔ میں جو کہ بیسیوں [illegible] بڑے بڑے پرنسپل کے دفتروں کے سامنے دھکے کھا رہا تھا، حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا، شائستگی پر تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے۔

# نصابِ تعلیم

(اس مختصر مضمون میں نصابِ تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالتے وقت پیشِ نظر رکھی جانے والی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے ———— نورؔ )

سب سے پہلی چیز جو اس نظام میں ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت ملا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے

## پہلی خصوصیت

علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں تقسیم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے، اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو، اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصورِ دین کا تقاضا یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے، ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطہ نظر سے خالی رہیں، اور کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ پرورش پائے گا کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا۔ اس کے لئے یہ دونوں دو مختلف عنصر ہوں گے اور ان کے درمیان توافق پیدا کر کے ایک ایسی ہموار زندگی بنانا اس کے لئے مشکل ہو گا جو اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کے مصداق ہو سکے۔

مثال کے طور پر اگر آپ تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، حیوانات، نباتات، ریاضی، ہیئت، معاشیات، سیاسیات اور دوسرے تمام علوم ایک شخص کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اول سے آخر تک کسی جگہ خدا کا نام نہیں آتا، نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس حقیقت سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ آیاتِ الٰہی ہیں، نہ قوانینِ طبعی کا ذکر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، نہ واقعات کی توجیہ اس حقیقت سے کی جاتی ہے کہ ان میں کسی مدبرِ دانا کا ارادہ کام کر رہا ہے، نہ عملی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جاتا ہے کہ ان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے، نہ معاملاتِ زندگی کی بحث میں اس ضابطے کا کہیں بیان آتا ہے جو ان کو چلانے کے لئے خدا نے بتایا ہے، نہ سرگزشتِ حیات میں اس کے الٰہی مبدأ و معاد کی بحث کسی جگہ آتی ہے، تو علوم کے اس پورے مجموعہ سے اس کے ذہن میں دنیا اور دنیا کی زندگی کا جو تصور پیدا ہو گا وہ خدا کے تصور سے بالکل خالی ہو گا، ہر چیز سے اس کا تعارف خدا کے بغیر ہو گا، اور ہر معاملہ میں وہ اپنا راستہ خدا اور اس کی رضا سے الگ بنائے گا۔ پھر جب تمام شعبوں سے نقطہ نظر اور معلومات کی یہ ترتیب لئے ہوئے ایک شخص الگ سے خدا کا ذکر سنے گا اور ان مباحثِ زندگی اور قوانینِ اخلاق اور ان ضوابطِ شرعی کی تعلیم حاصل کرے گا جنہیں آپ دینیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس نقشے میں خدا کو اور اس سے تعلق رکھنے والی ان ساری چیزوں کو کہاں جگہ دوں۔ پہلے تو اسے خدا کی ہستی کا ثبوت ہی درکار ہو گا، پھر وہ اس بات کا ثبوت مانگے گا کہ مجھے اس کی ہدایت درکار ہے اور اس کے پاس سے ہدایت آئی بھی ہے یا نہیں، اور ان سب باتوں کے بعد بھی اس کے لئے ایسی دنیوی معلومات کو اس چیز کے ساتھ یک جان کر کے ہم رنگ نقشہ بنانا مشکل ہو گا، خواہ کسی نہ کسی طرح ایمان لے آئے مگر بہرحال اس کے لئے دین جس اس کی زندگی نہ ہو گا، بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جائے گا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظامِ تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہئے۔ شروع ہی سے ایک بچے کو دنیا سے اس طرح روشناس کرائیے کہ گویا وہ خدا کی سلطنت ہے، اس کے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں، ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور

قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے اس کا اور ہر شے کا براہِ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ دنیا کی جن قوتوں اور اسباب کو حاصل ہیں اور جو اشیاء اس کے لئے مسخر ہیں، سب کی سب خدا نے اس کو دی ہیں ان سب سے خدا کی مرضی کے مطابق اور انکے بتائے ہوئے طریقے پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جوابدہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہئے البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکل اسلامی نقطۂ نظر سے ہو۔ مگر اس کے خلاف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں کہ یہ خیالات اور مخصوص علمی نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقصد حیات، اصولِ اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے پیوست کئے جائیں اور دوسروں کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ ان کی فکری اساس، منزلِ مقصود اور راہِ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ تمام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کر دے گا اور جب اس طریقے سے تعلیم دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس دینیات کے لئے کسی علیحدہ کورس کی کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہ سکتی

## دوسری خصوصیت

دوسری اہم خصوصیت جو اس نظامِ تعلیم میں ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعہ علم جاننے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے، اور اس کی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے، جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بد اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں، وہ اس کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دی جائیں اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہئے۔ زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہئے اس کی عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقے پر برتنے کے لئے تیار کی جائے اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اس سے مدد لے سکے اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ معلومات کے اس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبے کا ایک ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے مثال کے طور پر چند شعبوں اور ان کے طریق تعلیم کی تشریح کروں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میرے ذہن میں اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہئے اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن کا علم پڑھایا جائے تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں ان کی تہہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقلِ انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود سے وہ محدود ہے۔ استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں کس طرح انسان واقعات اور حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیالات کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔ مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے فی الواقع ضروری ہے، اس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (OBSERVATION) اور استقراء (INDUCTION) سے کس طرح کام لینا چاہئے، کن امور مابعد الطبیعی کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک مجمل اور مطلق حکم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے، بلکہ انسان کو تخیلات لاطائل کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کرنے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اس کو تمام مذاہب فلسفہ کی سیر کرا دی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیئے گئے تھے

انہیں کس طرح اس نے اوہام کو حقیقت سمجھا ہے اور اس نے کس طرح اس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کئے بغیر ان حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اس کے بس کی چیز ہی نہ تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی، کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹکا، کدھر مسلمان فلاسفر قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے۔ متکلمین کے مختلف اسکولوں نے مدتوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں، ان میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز کیا۔ فلسفہ و تصوف کے مختلف مذاہب نے مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کیسے مختلف مذاہب بن گئے، ان مختلف مذاہب میں حق کیا ہے اور باطل کی آمیزش کیسی ہوئی اور کن راہوں سے آئی۔ کون سے مابعد الطبیعی تصورات ہیں جنہوں نے ایسے میں جڑ پکڑ لی ہے۔ ان سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تو فضول و ذہنی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعے کے بعد طالب اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے اور جب اہلِ علم جرح و تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کر دے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے

ایک تیسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہئے جس میں قرآن کا فلسفہ تاریخ، مقصد، مطالعہ تاریخ اور طریقِ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق کو بے رنگ نگاہ سے دیکھے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ نوعِ انسان کی سرگزشت

اور تہذیب انسانی کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرکے افراد کی فلاح و خسران اور سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے متعلق اصول مستنبط کرکے مدارت اس بات میں حاصل کیے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے اسے معلوم کرکے جو اوصاف انسان کو اوپر اٹھاتے ہیں اور جو اسے پستی کی طرف لے جاتے ہیں ان سے واقف ہو اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتدا سے آج تک سیدھا کھنچا ہوا ہے جو انسان کی منزل کا اصل راستہ ہے اس خط سے ہٹ کر جو ٹیڑھی راہیں یا باتیں جانب دور نکل گئیں اسے ماتو حقیر کا کسی کی طرف پیٹھ پڑا اور یہ خیر انسانی منزل کا یہ کس طرح سے انسانی طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ ہے اور کسی بے جا رعایت کے بغیر اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے تو کوئی قوم بھی اس کی چہیتی نہ رہی اور نہ کسی کے خلاف اس کے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہا، جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا تو اسے لاگ طریقہ پر ڈالے گا اور صلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرے کو الگ اور کھوٹے کو الگ کرکے سامنے رکھ دے گا ان ذہنیت کے بعد اسے تاریخی وسائل و ماخذ اور آثار قدیمہ اور واقعات سے بطور خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے اور اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ جاہل مورخین کے چڑھائے ہوئے رنگوں سے اصل حقائق کو الگ کرکے خود بے لاگ رائے قائم کرسکے

ایک اور شعبہ علوم عمرانی (SOCIAL SCIENCES) کا ہونا چاہیے جس میں پہلے قرآن اور حدیث۔ انسانی تمدن کے مبادی اصول بیان کیے جائیں پھر تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کرکے پورا معاشرہ کی رہنمائی میں جو تمدن سے بنے ان کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے بتایا جائے کہ ان قواعد (FUNDAMENTAL PRINCIPLES) پر کس طرح ایک صالح نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست، تدبیر مملکت اور تعلقات بین الاقوامی کی عمارت اٹھتی ہے، پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح ان ہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشو و نما سے جو نئے طرز عمل پیدا ہوتے ہیں ان صالح مدن میں جذب کرنے اور ایسے مختلف مقام مقرر کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی مدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے کہ تمدن کے ان اساسی اصول اور الہٰی حدود کے قریب رہنے اور ان سے انحراف کرنے کے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں اور دوسری طرف اسے دور جدید کے سیاسی، معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے الہٰی ہدایت سے بے نیاز ہو کر بطور خود اپنی زندگی کے لیے جو راستے تجویز کیے ہیں وہ کہاں تک اس کے لیے موجب سعادت یا شقاوت ہیں

سائنس کی مختلف شاخوں کے لیے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں جن میں قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاکر نہ صرف اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثار فطرت کے مزید مشاہدات اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی ان ہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیے ہیں اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے، نہ اس کے موضوع کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے لیکن چونکہ یہ اسی صنعت کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لیے اس کے ذریعے مطالعہ سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظام کائنات کا بنیادی فارمولا معلوم ہو جاتا ہے بلکہ قریب قریب ہر شعبہ علم میں اسے ایک صحیح نقطہ آغاز (STARTINGPOINT) اور تلاش و تجسس کے لیے ایک صحیح سمت (DIRECTION) بھی مل جاتی ہے وہ شاہ کلید (MASTER-KEY) جس کی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اس کا بہت سا وقت گتھیوں کے سلجھانے اور سلجھا کے پھر الجھا جانے میں ضائع نہ ہو۔ موجودہ سائنس کی گمراہی میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائق واقعہ کے مشاہدہ کی حد تک تو ٹھیک رہتا ہے، مگر جب حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات بناتا ہے تو کائنات فطرت کے مدار و غایت سے ناواقف ہونے کے باعث ٹھوکریں کھاتا جاتا ہے اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوت محنت ضائع ہوتی ہے بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کرکے عملیات کی بناء اٹھائی جاتی ہے تو وہ فساد تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ رکھ کے مرتب کرے گا اور مزید حقائق دریافت کرکے ان سے صحیح نظریات نکالنے لگے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا ان سائنٹفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائے جن میں آج وہ مبتلا ہے

جن علوم کو اس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے ان کے لیے بھی الگ الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔ مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے۔ مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کرکے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدماء محدثین کے کام سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے اور سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں اور ان سے وہ نتائج اخذ کیے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہادات اور آئمہ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات میں ان کی تصریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، ہر دوسرا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے۔ اور زندگی کے دور بدور بدلنے والے معاملات و مسائل پر اصولی قانون اسلامی کو منطبق کرکے فقہ کے ان حصوں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ جو ذہنیت علم انسانی کام انجام دیں گے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول کے متعلق ان ہی سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی عام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے گا۔

صبا شاہد
(سابق ایڈیٹر عصمت)

# انگریزی درسگاہوں کا زہر

ذیل میں ہم نے بڑی محنت اور جستجو کے بعد انگلش میڈیم سکولوں کے بارے میں ایسی معلومات جمع کی ہیں جو قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی اور اہل نظر کو دعوت فکر دیں گی۔

[illegible] یہ ملک [illegible] تہذیب کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اپنی تہذیب کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، دفتروں میں، بازاروں میں، دکانوں، گھروں، گلیوں اور محلوں میں، مگر وہ کسی جگہ دکھائی نہ دی۔ ہر طرف ایک ایسی تہذیب اور تمدن جلوہ فرما ہے جسے یہاں سے نکالنے کی کوشش میں ہم نے بے انتہا قربانیاں دی تھیں۔ یقین ہو گیا کہ ہمیں بھی امرت کے روپ میں زہر دیا گیا ہے۔ اس زہر کی تلاش میں نکلا، تو سامنے ایک عمارت دکھائی دی جس کی پیشانی پر پرانے آقاؤں کی زبان میں کچھ لکھا تھا۔ اندر جھانکا، ایک خوبصورت سبزہ زار پر ننھے منے معصوم بچے اور بچیاں نظر آئے۔ ان کے لباس غیر ملکی تھے اور زبان بھی غیر ملکی۔ قریب کھڑے ہوئے ایک بچے نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ بیچارے کو یاد ہی نہ رہا کہ اپنے ملک کی زبان میں گفتگو کرنا جرم ہے۔ ایک استاد نے اُس کی بات سن لی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکے چلے گئے لیکن اس بچے کو ایک گھنٹہ تک دھوپ میں کھڑے رہنے کی سزا ملی۔ اس کا خوبصورت چہرہ پسینے سے تر ہو گیا، نظریں شرم و ندامت سے جھک گئیں اور وہ ایک غیر ملکی زبان میں قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے لگا کہ آئندہ ملکی زبان میں گفتگو نہیں کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک استانی صاحبہ کے ساتھ سکول میں گھوم رہا تھا۔ استانی صاحبہ اینگلو انڈین تھیں اور منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولتی تھیں۔ سکول کی عمارت صاف ستھری اور وسیع و عریض تھی۔ آراستہ پیراستہ کمرے، ہرے بھرے لان، خاکی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے صاف ستھرے بچے دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ معلوم ہوا سٹاف میں کُل ۲۱ ملازم ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ تھی:

غیر ملکی عیسائی ——— ۵
ملکی عیسائی ——— ۹
ملکی مسلمان ——— ۶
مولوی صاحب ——— ۱

تین پادری تھے، ان میں سے ایک ملکی تھے، دو غیر ملکی۔ چھ مسلمان اساتذہ میں سے دو کے نام بدل چکے تھے۔ ایک صاحب کا نام مسٹر شے تھا۔ تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ زمانہ طالب علمی میں ان کا نام ملک شیخ تھا۔ اس سکول میں آکر اپنے آپ کو مسٹر شیخ کہلانے لگے۔ بعد میں مسٹر شے بن گئے۔ ایک اور استاد محترم کے نام کا ایک حصہ نیک (معنی پارسا) تھا، انہیں یہ معنی کچھ زیادہ پسند نہ تھے، چنانچہ وہ نیک کے بجائے نک (NECK) (معنی گردن) ہو گئے۔ سفید براق لباس پہنے

پادری صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ آنکھوں میں نرمی اور شفقت، ہونٹوں پر مسکراہٹ، بڑی محبت سے پیش آئے۔ انہوں نے پاکستانیوں کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی۔ میں فخر سے پھولا نہ سمایا۔

مولوی صاحب سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ انہیں اس وقت ملازم رکھا گیا تھا جب حکومت کی طرف سے تمام تعلیمی اداروں میں دینیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اُن کا لباس بے حد معمولی تھا۔ بیچارے کچھ پریشان سے نظر آئے۔ معلوم ہوا دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں انہیں تدریس کے لئے وقت بھی کم ملتا ہے اور معاوضہ بھی کم۔ ہفتے میں ایک دو بار کسی جماعت کو دینیات پڑھانا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ بولے اکثر طلبہ پیریڈ سے غائب رہتے ہیں، آ جائیں تو دلچسپی نہیں لیتے۔

انہوں نے بڑے دکھ سے شکایت کی کہ طلبہ اُن کے لباس اور وضع قطع کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تنخواہ کے بارے میں پوچھا، انہوں نے ٹالنا چاہا۔ بہت اصرار کے بعد بتایا ۹۰ روپے ماہوار ملتے ہیں۔

مولوی صاحب کسی مستند دینی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہ تھے۔ صرف قرآن مجید حفظ کر رکھا تھا۔ چند ماہ قبل ایک سرکاری افسر کے بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، انہی افسر نے سکول میں ملازمت دلوائی۔

استانی صاحبہ سے درخواست کی چند طلبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے عجیب نظروں سے دیکھا، بہرحال اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد دس طلبہ میرے سامنے تھے۔ ان کی عمر سات برس سے گیارہ برس تک تھی۔ تین لڑکیاں تھیں، سات لڑکے۔ بات چیت انگریزی زبان میں ہوئی۔ چھوٹے بچے بالکل انگریزی بولتے تھے۔ کسی لفظ پر رک جاتے تو ترجمہ طلب نگاہوں سے استانی صاحبہ کی طرف دیکھتے۔ وہ جملہ مکمل کر دیتیں۔ اس گفتگو سے حسب ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

- دس میں سے چار طالب علم بالائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تین اعلیٰ متوسط طبقے سے آئے تھے۔ دو ملکی عیسائیوں کے بچے تھے۔ ایک زیریں متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔
- دس میں سے صرف ایک طالب علم کے گھر میں انگریزی زبان رائج تھی۔ باقی نو گھرانوں سے آئے تھے جہاں بات چیت ملکی زبان میں ہوتی تھی۔
- تین طلبہ کے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، چار معمولی تعلیم یافتہ، لیکن دولت مند

کی اولاد تھے۔ ایک طالب علم تعلیمی اعتبار سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ دو طلبہ معاشرتی اور معاشی لحاظ سے ادنیٰ طبقے سے آئے تھے مگر عیسائی ہونے کی وجہ سے انہیں مراعات حاصل تھیں۔

- گھر کے اندر اور دوستوں کے حلقے میں صرف تین طلبہ اپنے اصلی ناموں سے پکارے جاتے۔ سات کو پیار کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ سکول میں عام نام یہ تھے: ڈول، ٹینی، ٹنی، کل، بابی، ڈکی، کینڈی، ایری، پیٹر رودر، ڈونکل، بنجو وغیرہ۔
- دو بچے والدین کو ڈیڈ اور ممی کہتے تھے۔ صرف ایک بچی ابا، اماں کے نام سے پکارتی تھی۔
- گھر سے سکول آتے وقت ایک طالب علم السلام علیکم کہتا تھا، باقی ہائی، ہائی۔

ان کی معلومات عامہ کا اندازہ کرنے کے لیے چند سوال بھی پوچھے۔ پہلا سوال تھا:

- "کسی قومی تہوار کا نام لیجیے۔"

طلبہ کے جواب بالترتیب یہ تھے:

کرسمس، کرسمس، عید کرسمس، ایسٹر، کرسمس، اتوار، عید مبارک، کرسمس، شب برات۔

- "عید الفطر اور عید الضحیٰ کے معنی بتائیے۔"

اس سوال کا جواب صرف ایک بچی نے دیا۔ عید الفطر میٹھی عید ہوتی ہے، عید الضحیٰ بکرے عید۔ فطر اور اضحیٰ کے معنی کوئی نہ بتا سکا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ کیوں منائی جاتی ہیں۔

- "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کب اور کس شہر میں پیدا ہوئے؟"

کب کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ شہر کا نام یہ بتائے گئے:

عرب، عرب، عرب، صحرائے عرب، مکہ مدینہ، مکہ مدینہ، مدینہ، مدینہ، مکہ۔ ایک طالب علم نے کوئی جواب نہ دیا۔

- دس میں سے صرف دو طلبہ کو نماز یاد تھی۔ ان میں سے بھی ایک طالب علم مکمل سورۃ فاتحہ نہ سنا سکا۔ ایک بچی نے غلط سلط نماز سنائی مگر دعائے قنوت پر پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔
- "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ظالموں نے کیا سلوک کیا؟"

دس کے دس طلبہ نے بتایا: وہ مصلوب کر دیے گئے تھے۔ کوئی طالب علم مسلمانوں کے اس عقیدے سے آگاہ نہ تھا کہ انہیں زندہ اوپر اٹھا لیا گیا ہے۔

- "پاکستان کس نے بنایا؟"

سات طلبہ نے قائداعظم کا نام لیا۔ ایک نے مسٹر محمد علی جناح کہا۔ ایک کے خیال میں قائد ملت پاکستان کے بانی تھے۔ ایک طالب علم نے یہ اعزاز صدر محمد ایوب خان کو دیا۔

میں سوال پوچھ رہا تھا اور استانی صاحبہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ آخر وہ بولیں۔

"مجھے پیریڈ لینا ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

میں نے طلبہ کا شکریہ ادا کیا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔ سکول کی عمارت کا ایک چکر لگایا۔ گرجا گھر دیکھا جس کی دیواروں پر اور برآمدوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی رنگین تصویریں تھیں۔ میں نے بھی بڑے اشتیاق سے یہ تصویریں دیکھیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انگلش میڈیم سکول دیکھنے کی غرض سے مجھے مغربی پاکستان کے بیشتر بڑے بڑے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مشنری اداروں کے تحت تقریباً تمام سکولوں میں گرجا گھر عمارت کا ایک لازمی جزو ہے۔ کئی مقامات پر جگہ کی تنگی کے باعث چھوٹے بچوں کی کلاسیں بھی گرجے میں لگتی تھیں۔ استانی صاحبہ سے معلوم ہوا اکثر اوقات یہاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ چونکہ انگریزی میڈیم سکول ہے اس لیے فلمیں سب کی سب انگریزی ہوتی ہیں۔ انگریزی فلمیں چھوٹے بچوں کے ذہنوں پر بڑے گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔

اگرچہ میں نے جس سکول کا ذکر کیا وہ غیر اقامتی تھا۔ سوچا اچھے اچھے اقامتی سکول بھی دیکھے جائیں۔ مغربی پاکستان کے ایک مشہور اقامتی سکول میں پہنچا اور ابتدائی کلاسوں کے طلباء سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جس عمارت میں بچے مقیم تھے، وہ گرجا گھر کے بالکل سامنے تھی۔ سکول ۱۵ ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مسجد اس جگہ سے کوئی پون میل کے فاصلے پر ہوگی۔ رہائشی کمروں کی دیواروں پر وہی تصویریں نظر آئیں جنہیں اصولاً گرجا گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ بچوں کا ڈرائینگ ورک بھی دیکھا۔ چند بچے متبرک تصویروں کی نقل اتار رہے تھے۔ یہ سکول کسی مشنری ادارے کے تحت نہ تھا۔ اس کے باوجود ہیڈ مسٹریس اور کئی استانیاں عیسائی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ بولیں:

"آپ نے گرجا نہیں دیکھا۔ اندر سے بہت خوبصورت اور آرام دہ ہے۔ ہمارے بچے اکثر شوق سے وہاں جاتے ہیں اور وہیں بیٹھ کر سبق تیار کرتے ہیں۔"

سوچا وہ دماغ کتنے دُور رس تھے جنہوں نے بچوں کے رہائشی کمروں کے سامنے گرجا گھر تعمیر کیا۔ بچوں کا روزمرہ معمول یہ تھا: صبح اُٹھ کر ناشتا کرنا اور سکول جانا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک کلاس میں پڑھنا۔ بارہ بجے کھانے کے لیے واپس ہاسٹل میں آنا۔ دوپہر کے دو گھنٹے کھیل یا تفریح میں بسر کرنا۔ تین بجے سے شام پانچ بجے تک کھیل کے میدان میں حاضری۔ پانچ بجے چائے پینا (سب چھوٹے بچوں کو دودھ ملتا ہے)۔ بعد ازاں سبق یاد کرنا، تصویریں بنانا اور ایسے ایسے مشاغل میں وقت گزارنا۔ لائبریری میں بیشتر کتابیں انگریزی کی تھیں۔ اُردو کی دس بیس کتابیں نظر آئیں جو سب کی سب مسیحی اداروں کی شائع کردہ تھیں۔ کہانیوں کی یہ کتابیں اکثر چھوٹے بچوں کو دی جاتی تھیں۔ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس جملے پر نظر پڑی:

"جاوید بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہر اتوار کو باقاعدہ گرجے میں جاتا تھا۔"

ایسی کتابیں پڑھ کر ایک بچہ کیا مفہوم سمجھے گا؟ اچھا بننا چاہے، تو اسے بھی ہر اتوار گرجے جانا چاہیے۔

چھوٹے بچوں کے بعد میں نے بڑے بچوں سے ملنے کا منصوبہ بنایا ___ انگریزی میڈیم کے ایک بہت بڑے مشہور تعلیمی ادارے میں استاد صاحب نے میرا تعارف آٹھ طلبہ سے کرایا۔ یہ طلبہ میٹرک کا امتحان دینے والے تھے۔ ان کی عمریں ۱۴ سے ۱۸ برس تک تھیں۔ استاد صاحب کو کام تھا، وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اتفاق سے طلبہ کا ریڈ ہال تھا۔ ہم لان میں بیٹھ گئے۔ خاصی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ طلبہ انگریزی اس طرح بولتے تھے جیسے ہالی ووڈ کی فلموں میں اداکار بولتے ہیں۔ ایک گھنٹا اور بار بار انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ بعض اوقات وہ کسی جملے پر اٹک جاتے۔ شاید انگریزی زبان ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر بات چیت ایسی زبان میں ہونے لگتی جو اُردو، انگریزی اور چند علاقائی زبانوں کا معجون تھی۔

آٹھ طلبہ میں سے تین نے بیٹلز (BEATLES) کی طرح کے بال رکھے ہوئے تھے۔ ایک کے ہونٹوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہلکی سی سرخی استعمال کی گئی ہے۔ باقی طلبہ اس طالب علم کو مس ___ کے نام سے پکارتے تھے۔

سات طالب علموں نے انتہائی چست کپڑے پہن رکھے تھے، ایک کا لباس سستا مگر آرام دہ معلوم ہوتا تھا۔

دو طالب علموں نے قمیصوں کے بٹن کھول رکھے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کس کے سینے پر بال زیادہ ہیں۔

یہ طلبہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سکول میں بھی اساتذہ طلبہ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے خاصی کرخت اور بیہودہ زبان استعمال کر رہے تھے۔ استاد قریب سے گزرے تو ایک طالب علم نے نعرہ لگایا!

" BARKING DOGS SELDOM BITES

دوسرے نے صرف اتنی مکمل کر دی، سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مخصوص مواد تاریخ کی عدم موجودگی میں اکثر ہمیں ایسے ہی خوبصورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چند نام جو میں نے ان کی گفتگو سے اخذ کیے یہ ہیں:

"MR LAZY, MR PUSSY, MR DONKEY, MR KINGSTORK, MR PIGGY"

ان طلبہ سے براہ راست سوال کرنا تقریباً ناممکن تھا میں نے دوران تکلف ہونے کی ٹھانی تاکہ باتوں ہی باتوں میں معلومات حاصل کر سکوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے:

"شہر میں کون کون سی فلمیں چل رہی ہیں؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ لاہور میں لڑکیوں کی قمیصیں پھر سے لمبی ہو رہی ہیں؟ اور منی سکرٹ کا رواج ہونے والا ہے؟"

آخری سوال سن کر ایک طالب علم نے سرسے کی ٹیبل پر ہاتھ مارا اور بولا:

"YOU GOT A SWEET HEAR"

اس نے گفتگو رخ ہی پھیر دیا کہ گیا جواب دینے کے لیے میں وہیں الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ دوسرا بولا

"O, COME ON, TELL US THE TRUTH YOU ARE NOT AN OLD CAT MUST HAVE ONE SWEET HEART AT LEAST".

اس بات پر سب نے زور زور سے قہقہے لگائے مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ایک صاحب تو سب سے پھر اپنی سویٹ ہارٹ کی باتیں کرنے لگے۔ سننے والوں کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے۔ وہ لڑکا جسے اس کے ساتھیوں نے مس کے خطاب سے سرفراز کیا تھا لڑکی طرح شرمانے لگا۔ ایک طالب علم بولا:

"آج شام کا ہیرو کون ہے؟"

سب نے ہاتھ کھڑا کیا۔

یوں کام نہیں چلے گا ٹاس کرو۔ مس نامی لڑکے نے احتجاج کیا۔

ٹاس کے بعد جیتنے والا لڑکا اور "مس" آپس میں گلے مل رہے تھے۔

"وہ کون سی شخصیت ہے جس نے آپ سب کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟" میں نے سوال کیا

جواب کا خلاصہ یہ ہے

ایلوس پریسلے (امریکی گلوکار) ایلوس پریسلے۔ قذافی۔ نانی ڈورس (امریکی ایکٹر) ذوالفقار علی بھٹو، راک ہڈسن (امریکی ایکٹر)، رکشی شہید، سامنتھا راڈی (امریکی ایکٹرس)

آخری نام پر چار پانچ طلبہ نے یک زبان کہا

"ہاں ہاں سامنتھا راڈی ہماری پسندیدہ شخصیت ہے"

"مجھے اس لیے بھی پسند ہے، تم نے تو صدر ناصر کا نام لیا تھا"

"قذافی کی ایک بات مجھے بہت پسند ہے" وہ بولا "میں سمجھا تھا کہ ناصر کی عرب پسندی یا دانی محبت، خلوص اور لگن سے متاثر ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ قذافی اپنے ملک میں مولویوں کا صفایا کر رہا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو اپنے ملک کے سارے مولویوں کو ... وہ فقرہ نامکمل چھوڑ کر دانت پیسنے لگا۔

"میرے خیال میں صرف اتنا کافی ہے کہ ان سب کی داڑھیاں منڈوا دی جائیں"

دوسرے نے اظہار خیال کیا

تعلیم سے فارغ ہو کر آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

میں پاک فوج میں جانا چاہتا ہوں "یہ اس طالب علم کا جواب تھا جس نے عزیز بھٹی کو اپنی محبوب ترین شخصیت قرار دیا تھا اس کے ماتھے پر عزم و ہمت کے آثار دکھائی دیتے۔

صدر ناصر کو پسند کرنے والا طالب علم سی ایس پی بننے کا خواہشمند تھا۔

تین طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تعلیم سے زیادہ سیاحت (بلکہ آوارگی) کے شوقین ہیں

دو طالب علم بڑے زمینداروں کے چشم و چراغ تھے۔ وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے

ایک طالب علم ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔

دوران گفتگو یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ طلبہ ایک نہایت ماڈرن لڑکے کو مولوی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ استفسار کیا تو پتہ چلا کہ وہ طالب علم ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے والد ملک سے باہر ہیں والدہ کبھی کبھار اس کا حسب ریاست کرنے کے لیے اپنے ملازم کو بھیج دیتی ہیں جو باریش ہیں۔ بے تکلف دوستوں میں اس طالب علم کو مولوی صاحب کے نام سے کیا جاتا ہے۔ میری طرف دیکھ کر وہ بولا:

"میں بارہا امی سے کہہ چکا ہوں کہ ملازموں کو یہاں نہ بھیجا کریں اور اگر بھیجنا ضروری ہے تو پہلے ان کی داڑھی صاف کرا دیں مگر وہ سن کر ہنس دیتی ہیں۔ یہ ذات شریف اس مرتبہ آئے تو ملنے سے انکار کر دوں گا"

بھٹو صاحب کو پسند کرنے والے طالب علم سے بھی گفتگو ہوئی کہنے لگا

"بھٹو مجھے صرف اس لیے پسند ہے کہ دوسروں کی نسبت سمارٹ اور خوش پوش ہے اگر سیاستدان نہ ہوتا تو بالی وڈ کے بڑے سے بڑے ایکٹر کا مقابلہ کر سکتا تھا خصوصاً فیس ایکسپریشنز (FACE EXPRESSIONS) میں اس کے"

اوپر کی چند مثالوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سکولوں میں کس قسم کی پود تیار ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان سکولوں کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں ان اداروں کی آمد اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے

موجودہ دور کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے ان سکولوں کے بارے میں کہا

"میرے خیال میں پبلک سکولوں کو زمین بوس کر دینا چاہیے ۔۔۔ ان کی بنیادوں میں نمک بو دیا جائے (تاکہ دوبارہ سرسبز نہ ہو سکیں)"

برصغیر میں انگریزوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی یہ محسوس کر لیا کہ جب تک یہاں کا نظام تعلیم اپنی مرضی کے مطابق مرتب نہ کیا جائے حسب منشا نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے وہ چاہتے تھے کہ ملک میں برطانوی سامراج کے لیے نوجوانوں کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو مغربی تہذیب سے مرعوب اور متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرے سے نفرت کرتی ہو اور مقامی باشندوں سے الگ تھلگ رہے۔ اس خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور اپنے دوسرے خوشامدیوں کے بچوں کے لیے پبلک سکولوں کی طرز پر اقامتی درسگاہیں بنائیں۔ ان درسگاہوں میں ایچی سن کالج لاہور، لارنس کالج گھوڑا گلی، دہلی کالج اور ایگلا کالج کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کالجوں میں داخلے کے لیے نام نہاد شرفا کی ایک فہرست بنائی گئی تھی۔ صرف انہی لوگوں کے بچوں کو داخل کیا جاتا، جن کا نام فہرست میں شامل ہوتا۔ بعض اوقات گورنر کی ذاتی درخواست پر بھی داخلہ مل جاتا تھا۔ اس دور میں پڑھائی سے زیادہ اٹھنے بیٹھنے کے مغربی آداب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ان سکولوں کے ساتھ ساتھ مشنریوں نے بھی خاص تعلیمی ادارے قائم کیے۔ مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے پردے میں مخصوص نظریات اور عقائد کی تبلیغ کی جائے۔ پاکستان بننے کے بعد اصولی طور پر یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ ہم نے یہ ملک تہذیب اور مغربی سامراج

کے پاکستان کی صورت بنی لیکن بدقسمتی سے برسرِ اقتدار لوگ مغربی تہذیب سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہیں ایسے اداروں کا وجود ضروری معلوم ہوا، چنانچہ یہ ادارے باقاعدگی سے اپنا کام کرتے رہے۔ پہلے صرف وہ لوگ بچوں کو ان سکولوں میں بھیج سکتے تھے جن کا نام ایک خاص فہرست میں شامل ہو تقسیم کے بعد یہ پابندی ختم کر دی گئی اب ہر وہ شخص اپنے بچوں کو یہاں داخل کرا سکتا تھا جس کے پاس دولت ہو ایسے اداروں کی سرپرستی زیادہ تر ان طبقوں نے کی۔

۱۔ وہ طبقہ جو مغربی تہذیب کا پرستار ہے

۲۔ ایسے لوگوں کی وفاداریاں تقسیم کے بعد بھی انگریزوں کے ساتھ تھیں

۳۔ وہ طبقہ جو نظریہ پاکستان پر یقین نہ رکھتا تھا۔

۴۔ ضعیف الضمیر لوگ

۵۔ وہ دولتیے جنہیں روپیہ اچانک ہاتھ لگا تھا اور نام نہاد ترقی کی راہ پر سب سے آگے نکلنا چاہتے تھے۔

۶۔ نام و نمود کے شوقین

۷۔ وہ صنعت کار اور جاگیردار جو تعلیم یافتہ نہ تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کا بچہ انگریزی بولتا ہوا نظر آئے۔

۸۔ تعلیم یافتہ اور متوسط طبقہ کے افراد جو اعلیٰ طبقہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اس مقصد کے حصول کے لیے بچوں کو وسیلہ بنایا اور انہیں ایسے تعلیمی اداروں میں داخل کرایا جہاں امرا کے بچے پڑھتے تھے

آج کل ملک میں جو انگلش میڈیم سکول کام کر رہے ہیں انہیں آسانی کی خاطر درج ذیل قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے

۱۔ وہ غیر سرکاری پبلک سکول جو مشنری اداروں کے تحت نہیں ہیں، ان میں ایچی سن کالج لاہور، لارنس کالج گھوڑا گلی، علی گڑھ پبلک سکول ماکا منڈی، حبیب پبلک سکول کراچی، مرزا سکھیہ سکول اور اس قسم کے دوسرے ادارے شامل ہیں کچھ ادارے اقامتی ہیں بعض مقامات پر مقامی طلبہ DAY SCHOLARS بھی داخل کر لیے جاتے ہیں بالعموم ان اداروں کو بورڈ آف گورنرز چلاتا ہے حکومتِ تعلیم سے باقاعدہ گرانٹ ملتی ہے۔

۲۔ افواجِ پاکستان کے سکول ان میں پاک فضائیہ کے دونوں سکول سرِفہرست ہیں یعنی پی اے ایف سکول لوئر ٹوپہ، پی اے ایف سکول سرگودھا دوسرے اداروں میں کیڈٹ کالج حسن ابدال، ملٹری کالج سرائے عالمگیر جہلم، کیڈٹ کالج کوہاٹ اور کیڈٹ کالج پٹارو کے نام قابلِ ذکر ہیں یہ ادارے بھی بورڈ آف گورنرز کے تحت ہوتے ہیں بورڈ کا چیئرمین علاقے کا انسپکٹر جنرل آف ٹریننگ ہوتا ہے

۳۔ سرکاری پبلک سکول تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کرتے ہوئے محکمہ تعلیم نے ہر ڈویژن میں ایک پبلک سکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے ڈویژنل پبلک سکول متعدد مقامات پر قائم ہو چکے ہیں۔

۴۔ کنٹونمنٹ پبلک سکول یہ سکول کنٹونمنٹ بورڈ کے ماتحت ہوتے ہیں۔

۵۔ مشنری اداروں کے تحت کام کرنے والے سکول ان میں اقامتی ادارے بھی ہیں غیر اقامتی ادارے بھی اقامتی سکولوں میں برن ہال ایبٹ آباد، سینٹ ڈینی ہائی سکول، سیکرٹ ہارٹ سکول لاہور، کرائسٹ سکول مری، جیسس اینڈ میری کونونٹ مری وغیرہ شامل ہیں۔

غیر اقامتی سکولوں میں گرامر سکول کراچی، سینٹ انتھونی سکول لاہور، سینٹ پیٹرک ہائی سکول کراچی، گرامر سکول کوئٹہ، سینٹ گریگوری سکول ڈھاکہ زیادہ مشہور ہیں اس قسم کے اداروں میں سے بعض براہِ راست مشنریوں کے تحت کام کرتے ہیں اور بعض دوسرے مشنریوں سے متعلق ہیں

۶۔ انگریزی میڈیم سکولوں کی آخری اور سب سے عام قسم وہ چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ ادارے ہیں جو آپ کو شہروں اور قصبوں میں جا بجا ملیں گے کسی اچھے سے مکان پر کنڈرگارٹن اور داخلہ شروع ہے کا بورڈ لگایا اور پڑھائی شروع ہونے لگی۔

اوپر ہم نے ان سکولوں کا ذکر کیا ہے ان سب میں قدرِ مشترک انگلش میڈیم ہے انگلش میڈیم کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا گیا ہے ایک مختصر سا جائزہ ہمیں سمجھنے میں مدد دے گا عام طور پر انگلش میڈیم کے حسبِ ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں

۱۔ ہمارے ہاں انگریزی زبان کو وہی اہمیت حاصل ہے جو برطانوی عہد میں تھی انگریزی دفتری زبان ہے اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انگریزی داں ہونا ضروری ہے مقابلے کے امتحانوں میں سارے پرچے انگریزی زبان میں حل کیے جاتے ہیں، چنانچہ اس صورت میں ترقی کے خواہش مند طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی لکھ پڑھ اور بول سکیں انگلش میڈیم سکولوں میں سارے مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے تصور کیا جاتا ہے کہ طلبہ انگریزی زبان پڑھنے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کر لیں گے۔

۲۔ سماجی (SOCIAL) اعتبار سے انگلش میڈیم سکول کی نسبت بلند درجہ سمجھے جاتے ہیں بہتر ماحول، صاف ستھری عمارت، اچھا سٹاف اور طلبہ پر ذاتی توجہ ان سکولوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۳۔ انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کسی مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہیں، تو انہیں آسانی رہتی ہے، کیونکہ انہوں نے اس خاص مضمون کی تعلیم انگریزی زبان میں حاصل کی ہے۔

ظاہر ہے فوائد کے ساتھ ساتھ انگلش میڈیم کے نقصانات بھی ہوں گے حسبِ ذیل نقصانات قابلِ ذکر ہیں :

۱۔ بچے کا بہت سا وقت صرف انگریزی سیکھنے پر صرف ہو جاتا ہے، حالانکہ اس وقت میں وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا

۲۔ دوسری زبان کی نسبت اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا بہت سہل ہے بچے کے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا

۳۔ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے زبان کے ساتھ ساتھ طلبہ غیر محسوس طور پر انگریزی تہذیب سے متاثر ہوتے ہیں (GOOD MORNING DADY) اور تسلیمات جانِ ہم معنی سہی، تہذیب و مزاج کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو دونوں فقروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۴۔ انگلش میڈیم سکولوں کے بیشتر اساتذہ عیسائی ہیں مسلمان اساتذہ کی اکثریت مغربی تعلیم یافتہ اور اسی تہذیب سے پیار ہوتی ہے اساتذہ کی شخصیت چونکہ طلبہ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے، اس لیے طلبہ اسی تہذیب میں ڈھل جاتے ہیں جو ان کے اساتذہ کو پسند ہو

۵۔ نصابی کتب میں قومی عنصر بہت کم ہے گو اب انگریزی کی کتابیں ملک میں بھی لکھوائی جا رہی ہیں، لیکن بیشتر سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں ابھی تک بیرونِ ملک چھپی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کتابوں پر غیر ملکی رنگ غالب ہوتا ہے اور یہ اپنے ساتھ ایک مخصوص تہذیب کی بُو باس لے کر آتی ہیں۔

۶۔ انگریزی زبان پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے طلبہ دوسری غیر ملکی زبانیں نہیں سیکھ سکتے انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کرنا پڑے، تو ہمارے ہاں چینی، جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانیں جاننے والے ہزاروں طلبہ تیار کیے جا سکتے ہیں

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ روس، چین، فرانس اور جرمنی سے ہمارے بہتر تعلقات کے باوجود پاکستانی طلبہ اُن ملکوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نہیں جا سکتے، کیونکہ انہیں متعلقہ زبانوں پر عبور نہیں۔

۷۔ انگریزی میڈیم نے ملک میں بے شمار عیسائیوں، مغرب پرستوں اور ایسی تہذیب سے محبت کرنے والوں کو نہایت مؤثر اور منفعت بخش کام مہیا کیا ہے۔ ایک صاحب کی یہ بات بجا ہے کہ انگریز جاتے ہوئے "اپنے ہم مذہبوں، بہی خواہوں اور شہزادیوں کے لیے معاش کا نہایت ہی نفع بخش اور مستقل بندوبست کر گئے ہیں"۔ ان سکولوں کے اساتذہ کا تجزیہ کیا جائے، تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ استثنائی صورتیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں، لیکن زیادہ تر وہی اشخاص اس پیشے سے منسلک ہیں جو مذہباً عیسائی ہیں یا پھر مغرب پرست مسلمان۔ اینگلو انڈین لوگ بھی خاصے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

۸۔ ان سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ چونکہ ایک خاص طبقے سے آتے ہیں، اس لیے عوام سے اُن کا رشتہ ویسے بھی دُور کا ہوتا ہے۔ یہاں کی تعلیم و تربیت اور ماحول انہیں عام لوگوں سے مزید دُور لے جاتا ہے۔ وہ سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر پہنچتے ہیں، تو مکمل طور پر صاحب بن چکے ہوتے ہیں۔ بات چیت کا انداز، رہن سہن اور اندازِ فکر ہماری معاشرتی قدروں سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ عوام کا خادم سمجھنے کے بجائے وہ خود کو آقا سمجھتے ہیں۔

۹۔ انگریزی میڈیم کے اقامتی سکولوں میں ایک طالب علم کے لیے والدین کو ۳ سو سے ۴ سو روپے ماہوار تک خرچ ادا کرنا پڑتا ہے۔ غیر اقامتی سکولوں کی فیسیں ۴۰ روپے سے ۱۵۰ روپے تک ہیں۔ گویا ایک طالب علم پر اقامتی سکولوں میں اوسطاً ۴ ہزار روپے سالانہ اور غیر اقامتی سکولوں میں ۹ سو روپے سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ملک کی فی کس اوسط آمدنی ۵۳۰ روپے سالانہ ہے۔ ملک کی کل آمدنی میں سے ۳۲ فیصد دفاع پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ باقی ۶۸ فیصد میں تعلیم کے علاوہ باقی تمام مدوں پر بھی خرچ اٹھتا ہے۔ کوئی جمہوریت پسند ملک ایسے اداروں کو برداشت نہیں کر سکتا جہاں ایک طالب علم پر اتنے اخراجات اٹھتے ہوں۔ عام لوگوں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ امرا کے بچوں کو۔ دردِ دل رکھنے والے ماہرینِ تعلیم کا اندازہ ہے کہ انگلش میڈیم کا ایک اقامتی سکول بند کر کے کم از کم

- چار مڈل سکول کھولے جا سکتے ہیں
- انگریزی میڈیم سکولوں سے بھی اونچے دس پرائمری سکول بن سکتے ہیں

برٹرینڈ رسل نے بھی جمہوری نقطۂ نظر سے برطانیہ کے سکولوں کی مخالفت کی تھی۔ ہمارے دانشوروں کو بھی اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان سکولوں میں تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ کہنے کو یہ بات کہی جا سکتی ہے، لیکن ثبوت کے بغیر کیونکر تسلیم کر لیا جائے۔ طوالت کے پیشِ نظر ہم سال بہ سال اعداد و شمار پیش نہیں کر سکتے، تاہم ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ اور میٹرک کے نتائج دیکھ سکتا ہے۔ یہ امتحانات ایسی کسوٹی ہیں جن پر اُردو میڈیم اور انگریزی میڈیم کے طلبہ جانچے جا سکتے ہیں۔ فوج کے ایک سکول چھوڑ کر باقی انگلش میڈیم سکولوں کے نتائج کسی لحاظ سے بھی عام ہائی سکولوں اور ہائر سیکنڈری سکولوں سے اچھے نہیں ہوتے۔ فوج سے متعلق سکولوں کے نتائج صرف اس لیے بہتر ہوتے ہیں کہ وہاں داخلے کی شرائط بہت کڑی ہوتی ہیں۔ صرف ان طالب علموں کو داخلہ ملتا ہے جو ٹیسٹ میں اعلیٰ نمبر حاصل کریں۔ اگر ان سکولوں میں داخلے کی شرط صرف دولت ہو، تو ان کے نتائج کبھی اتنے اچھے نہ ہوں۔ عام کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ کی رائے میں انگریزی میڈیم کے طلبہ غلط سلط انگریزی بولنے، بہت بیش قیمت کپڑے پہننے اور اپنے آپ کو دوسرے طالب علموں سے بلند و برتر سمجھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ انگریزی میڈیم سکول اصل میں تعلیم کی غرض سے نہیں، بلکہ مخصوص عادات و نظریات کو پھیلانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اس لیے اب تک وہاں تعلیم پر کم اور غیر تعلیمی مشاغل اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

انگریزی میڈیم سکولوں کے طلبہ فی طالب علم ۳ سو سے ۵ سو تک ماہوار خرچ کرتے ہیں۔ اب ذرا ہم اپنے ہاں آمدنی کا جائزہ لیں۔ پوسٹ گریجویٹ ایم اے، ایم ایس سی، ایم بی بی ایس، ایم ایس سی انجینئرنگ، ایم کام طلبہ شروع میں جن اسامیوں لیکچرار، انجینئر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ وغیرہ پر فائز ہوتے ہیں، وہاں سرکاری مشاہرہ اوسطاً ۴ سو سے ۶ سو تک ہوتا ہے۔ اس بات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو طالب علم میٹرک اور ایف اے یا ایف ایس سی کے دوران تین سو روپے ماہوار خرچ کرتا تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر چار پانچ سو روپے ماہوار میں کیونکر گزر بسر کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ زیادہ تر افراد ملک چھوڑ کر باہر جانا پسند کرتے ہیں اور بعض جائز یا ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی بھی کمی نہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بیکار رہتے ہیں۔ ان کے مالی حالات بہت اچھے ہوتے ہیں اور تنخواہ کے چار پانچ سو کی خاطر دن بھر مغز کھپانا نہیں چاہتے۔ مالی پوزیشن مضبوط ہونے کی وجہ سے انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ مجموعی طور پر ملک و قوم کو اُن کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ سرمایہ جو ان پر خرچ ہوا تھا بے کار جاتا ہے۔

اب ہم باری باری ان تمام سکولوں کا جائزہ لیں گے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا۔ سب سے پہلے مشنری سکولوں کو لیجیے۔ یہ سکول تعلیم سے زیادہ مخصوص مذہب و عقائد کو پھیلانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اور مصر، عرب جمہوریہ نے مشنری سکولوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سکول ہمارے مذہب، تہذیب، معاشرت اور اخلاقی قدروں کی پامالی میں بڑی تندہی سے مصروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے دینیات لازمی کر دی ہے، اس لیے یہ سکول مضر نہیں رہے۔ اس لازمی دینیات کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اصل چیز تو وہ مغربی ماحول ہے جو معصوم بچوں کے ذہنوں پر غلط اثرات ڈالتا ہے۔

اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مشنری اداروں کی طرف سے یہ صفائی پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے آج تک ایک مسلمان کو بھی عیسائی نہیں بنایا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایک مشہور مشنری ادارے کے سربراہ سے اُس کے کارناموں کی رپورٹ طلب کی گئی تو اس نے کہا "ٹھیک ہے کہ ہم نے دس برس میں کسی مسلمان طالب علم کو عیسائی نہیں بنایا، لیکن یقین جانیے کہ ہم نے کسی مسلمان کو مسلمان بھی نہیں رہنے دیا"۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر مشنری ادارے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں مشنری اداروں کی تعلیم سے متاثر ہوتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ان سکولوں کی لڑکیاں اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے ماحول سے اس درجہ کٹ جاتی ہیں کہ گھروں میں رہنا اور کام کرنا انہیں باعثِ عار محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم یہاں مثالیں پیش نہیں کر سکتے، تاہم گرد و پیش کا جائزہ آپ کو اس امر سے بخوبی آگاہ کر سکتا ہے۔

ہماری رائے میں حکومت کو اس سلسلے میں فوری قدم اٹھانا چاہیے اور ان اداروں پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ جب تک یہ ممکن نہ ہو، دانشوروں کو کوشش کرنی چاہیے کہ عوام کو اُن سے دُور رہنے کی ہدایت کریں۔ عام سکولوں کی حالتِ زار دیکھ کر والدین مجبور ہو جاتے ہیں کہ بچوں کو انگریزی میڈیم سکولوں میں بھیجیں۔ ضروری ہے کہ اُردو میڈیم سکولوں کا معیار بلند کیا جائے، نئے سکول کھولے جائیں، تاکہ والدین بچوں کو مشنری اداروں میں بھیجنے پر مجبور نہ ہوں۔

افواجِ پاکستان کے سکول انگریزی میڈیم ہونے کے باوجود نسبتاً بہتر ہیں۔ حقائق نے ثابت کر دیا ہے کہ مذہب بہت بڑی طاقت ہے۔ ان سکولوں میں مغربی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذ-

(باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

# "ط" سے طالبعلم
# "ط" سے طوطا

عطاء الحق قاسمی

## قاسمیات

"ا" سے استاد اور "ط" سے طالب علم بنتا ہے۔ "ا" اور "ط" کے درمیان خاصا فاصلہ ہے، شاید اسی لیے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان بھی یہ فاصلہ اتنا ہی ہے۔ ط سے طالب علم کے علاوہ طوطا بھی بنتا ہے۔ طوطا جو توپ چلاتا ہے، ان دنوں ایک سیاسی طوطا بھی توپ چلانے کی فکر میں ہے مگر اس نے غلطی سے توپ کا رخ اسی طرف کیا ہوا ہے، لیکن ہمیں اس سے کیا، طالب علم سے طوطے کی طرف تو دھیان محض اس لیے گیا تھا کہ دونوں کا علم رٹا رٹایا ہوتا ہے ورنہ طالب علم، طالب علم ہے اور طوطا طوطا، چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک!

●

طالب علموں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اور یہ قسمیں ان کے اختیار کردہ مضامین سے ترتیب پاتی ہیں مثلاً ہم ایم اے اردو کے طالب علم ہوتے ہیں جن سے ملیں تو وہ "ایوب اردو" کے طالب علم لگتے ہیں بعض طالب علم جغرافیے میں مہارت حاصل کرتے ہیں اس قسم کے ایک طالب علم نے اپنے ایک مضمون میں اس ماہرانہ رائے کا اظہار کیا تھا کہ لڑکوں کو "جغرافیہ" نہیں کہا جاتا ہے ہماری ملاقات نفسیات میں ایم اے کرنے والے طلبہ سے بھی ہے، ان میں سے بعض نفسیات کا مطلب ترکیب نفس سمجھتے ہیں اور بعض اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے رضاکارانہ طور پر خود کو نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ اس ضمن میں انہیں "فرسٹ ہینڈ انفارمیشن" حاصل ہو اور پھر وہ اپنی نفسیاتی الجھنوں کی روشنی میں دوسروں کی نفسیاتی الجھنیں دور کر سکیں

●

لیکن صاحب، ہماری دوستی اگر آج تک کسی سے نبھی ہے، تو وہ تاریخ کے طالب علم ہیں۔ اگر ان کی گفتگو میں تاریخ کا حوالہ نہ ہو تو تاریخ سے سبق سیکھے گا، تاریخ بنائے گا اور تاریخ کے خود کو دہرانے کا ان میں سے تاریخ کے ایک طالب علم تو تاریخ کے سخت ہی طالب تھے۔ کیونکہ وہ تاریخ کے قائل ہونے کے باوجود اس ضمن میں اپنی انفرادی آرا بھی رکھتے تھے، مثلاً ان کا کہنا تھا کہ تاریخ کے طالب علم کو تاریخ سے سبق سیکھنا نہیں چاہیے بلکہ تاریخ کو سبق سکھانا چاہیے سو انہوں نے تاریخ کو وہ سبق سکھایا ہے کہ بیچاری ابھی تک اپنی جیدما سہلا رہی ہے، تاہم انہیں تاریخ بنانے کا بھی بہت شوق تھا اور بزرگوں نے کہا ہے کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، چنانچہ انہوں نے ہر قیمت پر اپنا یہ شوق پورا کیا۔ ان کی بنائی ہوئی تاریخ گلی گلی محلے محلے میں دستیاب ہے کسی بھی تھڑے کی ماں سے طلب کریں البتہ جہاں تک تاریخ کے خود کو دہرانے کا تعلق ہے تو تاریخ کے یہ طالب علم اس کے دل سے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تاریکی دور میں وہ تمام چیزیں دہرائیں جنہیں گذشتہ تاریخ تباہ کن ثابت کر چکی تھی ان سب امور کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایک روز صبح کے وقت وہ تاریخ تاریخ کرتے ہوئے اٹھے، تو ان کے اپنے کیلنڈر کی تاریخ بدل چکی تھی

●

ط سے طالب علم بنتا ہے اور ط سے طوطا بھی۔ دونوں توپ چلاتے ہیں طالب علم کا توپ چلانا اس کا امتحان دینا ہوتا ہے کیونکہ وہ امتحان دینے کو توپ چلانے ہی کے برابر سمجھتا ہے اور طوطا اپنے مالک کی خوشنودی کے لیے توپ چلاتا ہے۔ طوطے کے توپ چلانے سے پہلے اس کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہوجاتا ہے اور جب وہ توپ چلا دیتا ہے، تو مجمع چھٹنا شروع ہوجاتا ہے لہٰذا طوطے کو توپ چلاتے دیکھئے کہ یہ ایک بے ضرر حرکت ہے اور اس سے لوگوں کا دل بہلتا ہے۔!

**

# وقت کی پکار

جواں قلم کاروں سے

نسیم حجازی (ایبٹ آباد)

"یاسر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہر وقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا مقصد کیا ہے۔ بعض آدمیوں میں قوم کا سپاہی بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ قدرت انہیں قوم کی عزت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی ہے، لیکن وہ شاعر، نقال اور گویے بن جاتے ہیں۔ بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور وہ قوم کی بدقسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ بعض قدرت کی طرف سے مجدد یا مصلح کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں صحیح درجے کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے، ایک ادیب ہے۔ اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مسکراہٹ کا کام دیتی ہے۔ وہ ایک مصور ہے جس کے دل میں قدرت نے قوس و قزح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ وہ ایک مغنی ہے جس نے پرندوں کے نغمے چرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔ قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ شاعر پھولوں کی مسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچوں کی چیخ سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ جھنجھوڑتا ہے۔ مصور قلم پھینک کر تلوار اٹھا لیتا ہے اور مغنی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کے بجائے تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سنائی دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی غیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں جو موجودہ حالات میں ہمارے لئے بے حد خطرناک ہے۔ دشمن لیس کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے "ٹھہرو میں تمہیں ایک نیا گیت سناتا ہوں۔ میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔ یہ ادب برائے ادب ہے۔ یہ نئے دور کی ابتدا ہے۔" ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے رباب کے تار درست کر رہا ہے۔ یاسر مجھے تمہاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں، بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تم نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی طرف توجہ دی ہے جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ تمہارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو۔"

ان کے خیال میں شعر میں کوئی خاص انداز بیان اور کوئی نادر بات ہونی چاہیئے۔

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

شعر میں غیر زبان کی وہی تراکیب لانی چاہئیں جو زبان پر بار نہ ہوں کیونکہ اسے غیر شاعر نہیں سمجھ سکتے۔ نادر ترکیب کا استعمال ہی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے۔ متقدمین میں ایہام گوئی کا رواج عام تھا مگر استاد اسے ناپسند کرتے تھے۔

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

شاعر کے کلام کو پاک کرنے کی کوشش بھی میر صاحب کے نزدیک ضروری ہے۔

ہم حرفوں کے شاعر کا بھی یاروں کو نہیں
اس پہ رکھتے ہیں شعر میری صحت سے پہل

ان کے نزدیک شاعر کو محاورے میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ جو طرز کلام اور انداز شعر گوئی میر نے اختیار کیا وہ تمام صنائع بدائع کا حاوی اور جامع تھا اور یہی ان کو پسند بھی تھا۔ اس لیے کہ زمانے کی روش یہی تھی مگر اس سے صرف شعر کے خارجی پہلو پر روشنی پڑتی تھی مگر داخلی اوصاف کے متعلق بھی ان کے یہی خیالات تھے۔ شعر جذبات دل کا آئینہ ہونا چاہیے اور جو کچھ کہا جائے اسے تاثیر اور تاثر کے ساتھ روح و جسم کا سا قرب حاصل ہو۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے جمع کیے تو دیوان کیا

یہ حقیقت ہے کہ جس قدر دل گداز ہوگا اتنا ہی اثر لے گا اور اگر غور کیا جائے تو ان کی شاعری میں ہر کوئی نیا مضمون دکھائی دیتا ہے۔ گہرا فلسفۂ حیات ملتا ہے۔ ہر دیار عشق کی کوئی انوکھی تصویر ہی نظر آتی ہے مگر پھر بھی درون سلیم کو ماننا پڑتا ہے کہ مجموعی طور سے ان کے اشعار میں ایسی خوبی ہے جو دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کو اردو کے شعراء میں خدائے سخن کا مرتبہ عطا کرتی ہے۔

**

دم توڑتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ابھرنے والے تعلیمی چہرے کے حوالے سے مشرقی پاکستان کے آخری سیکرٹری تعلیم مسعود مفتی کی زبانی

# ایک اور چہرہ

وہ پچیس سالہ نوجوان افسر تھا اور میرے ماتحت کام کرتا تھا خوش شکل خوش پوشاک خوش کلام گفتگو میں بیباک مگر لہجے میں مرتب۔ جذباتی سوچ اور حساس دار وہ بھی بنگالی مسلمان سے مختلف بنگالی ہندو کا گرویدہ یوم ایمان سے لاتعلق اور ریوم مدر لاسلام پر فدا اسلام کے رشتے سے نفرت سے عاری مگر کلچر کی یگانگت کا پجاری ۲۰۴۷ والے ایک پاکستان کے پیروکار ۱۹۴۷ء والے دو پاکستانوں والے ریزولیشن کا نقیب ۱۹۴۷ء میں برعظیم کی تقسیم پر شاکی اپنے کلچر کی جڑیں محمد بن قاسم کی بجائے سومنات میں ڈھونڈنے والا معاشرتی اقدار پر مٹی کے رشتے کو ترجیح دینے والا قائداعظم کے ذکر پر بھی چپ خاموشی اختیار کرنے والا

مجھے اس نے اس کی مکمل تصویر کا اندازہ اس طرح ہوا کہ میں سرکاری کاموں کے علاوہ اس سے حالات حاضرہ پر بھی بات کیا کرتا تھا دفتر میں یا گھر میں چائے پیتے ہوئے کافی طویل نشست ہوتی شروع میں وہ محتاط تھا مگر چند نشستوں کے بعد کھل گیا لہٰذا ان تبادلہ خیالات کی بجائے گفتگو بحث کا رنگ اختیار کرنے لگی اس وقت افسر اور ماتحت کا رشتہ ختم ہو جاتا اور دو روٹھے ہوئے بھائیوں کی شکوہ طرازی کا انداز بن جاتا

میں نے یہ طرز رد اس لئے اختیار کی تھی کیونکہ وہ اس نسل کا بھرپور نمائندہ تھا جو پچھلے تیس سال کے غلط نظام تعلیم کی پروردہ تھی میں اس نسل کے دل و دماغ میں جھانکنا چاہتا تھا جس کے لاشعور نے اس سے شعور کو گمراہ کر دیا تھا لاشعور ہندو پروپیگنڈے سے متاثر تھا مگر شعور اس کیفیت سے لاعلم تھا تحریک پاکستان سے تو پاکستان کی دہلیز پر ہی دم توڑ دیا تھا مصلحتوں نے اس کی یاد کو بھی گھر میں نہ گھسنے دیا اور اس کی تاریخ نصابی کے ستر میں کھو گئی ایسے میں مشرقی پاکستان کی نئی نسل نے آنکھ کھولی تو اس کا شعور ایک خلا سے دوچار ہوا اس خلا کو ان کے لاشعور نے اپنائیت اور راہبوں کی عیرت کے تصور سے پُر کیا

وہ نوجوان افسر اس نسل کی نمائندگی کرتا تھا اس نے روپ کا پہلا انکشاف مجھے اپنی تعیناتی کے چند ہی روز بعد ہو گیا جب وہ ایک وفد کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا وفد میں محکمے کے چند اور افسر بھی شامل تھے انہوں نے ایک روز پہلے کا اخبار "پاکستان آبزرور" میرے سامنے پھیلا دیا اور ریڈیو پر کے چند جملوں کی طرف توجہ دلائی جن میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اسی فی صدی اساتذہ ہندو ہیں انہوں نے احتجاجی انداز میں کہا کہ اخبار نے بالکل غلط تاثر دیا ہے اور مطالبہ کیا کہ اس کی فوراً تردید جاری کی جائے۔

"تردید کا فائدہ کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا

"یہ خواہ مخواہ ہندوؤں کو بدنام کرنے کی کوشش ہے اور قابل مذمت ہے"

مجھے ابھی چارج لیے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور میں ان افسران کو اچھی طرح جانتا بھی نہ تھا اس کے باوجود طویل بات چیت ہوئی جس میں وہ بار بار اصرار کرتے رہے کہ فوری تردید ہونی چاہئے۔ کافی بحث کے بعد میں نے فیصلہ دیا کہ میں تردید کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ ہم تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ کی تعداد کے متعلق صحیح اعداد و شمار بھی پریس کو بتائیں۔

وہ اس پر آمادہ نہ تھے اس پر مزید گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر جب وفد کے اراکین واپس گئے تو وہ کافی ناخوش نظر آتے تھے

دوسرے دن اسی افسر نے فائل پر لکھ کر بھجوایا کہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے ہمیں فوراً تردید کر دینی چاہیئے۔

میں نے لکھا کہ جب تک میں صحیح صورت حال کے متعلق اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر لیتا تردید کیسے کر سکتا ہوں

ایک ہفتے بعد فائل دوبارہ آئی اس افسر نے عذر لکھنے کے بعد پھر اپنی بات دہرائی تھی کیونکہ اعداد و شمار اکٹھے نہیں ہو سکے تھے۔

میں نے لکھا اگر صحیح اعداد و شمار اکٹھے نہیں ہو سکتے تو کم از کم اندازہ ہی بتایا جائے۔

اس کے بعد فائل نہیں آئی اور معاملہ ختم ہو گیا

مگر میں ہوا کا رُخ پہچان گیا تھا جو کئی چہروں پر بھی ہوائی ڈھول اڑا کر لے گئی تھی

چند روز بعد ایک ڈپٹی کمشنر کی طرف سے رپورٹ آئی کہ رات کے وقت پاکستانی فوج نے ایک سکول کے چوکیدار اور چپڑاسی کو حراست میں لے لیا ہے اور زدوکوب بھی کیا ہے

اس رپورٹ پر اسی نوجوان افسر نے نوٹ لکھا کہ ہمیں فوراً مارشل لاء حکام کے پاس احتجاج کرنا چاہیئے کہ وہ سکولوں کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فوج کو تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی ان کے سٹاف کو ہراساں کرنا چاہیئے۔

میں نے لکھا کہ ہمیں اس کیس کے تمام حالات کا اندازہ نہیں اس لیے مارشل لاء والوں کو لکھنے کی ضرورت نہیں علاوہ ازیں کوئی عمارت یا علاقہ قانون سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خصوصاً جب کہ حالات جارحیت کے قریب ہوں۔

دو گھنٹے بعد فائل پھر واپس آ گئی اس افسر نے لکھا تھا کہ احتجاج کرنا مناسب ہو گا ورنہ محکمے کے لوگوں میں بددلی پھیلے گی کیونکہ سیکرٹری تعلیم مغربی پاکستانی ہے اس لیے ان کے حقوق کا تحفظ نہیں ہو رہا۔

اس پر میں نے اسے بلایا اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ میں ذاتی طور پر اس کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر اس کے اور باقی محکمے والوں کے جذبات اتنے ہی نازک ہوں تو

میں تو یہی فائل میں دے کر مارشل لا والوں کو بھجوا دیتا ہوں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے

اس نے گھبرا کر فائل اٹھائی اور جلدی سے باہر نکل گیا

چند ہفتے بعد میرا اوا قفہ ہوا۔

مئی کے مہینے میں جب ہم مغربی پاکستان سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوئے تو عزیزوں اور دوستوں کی آنکھوں نے آنسو بہائے ہاتھوں نے امام ضامن باندھے اور زبانوں نے ذاتی حفاظت کے ڈھیروں مشورے دیئے جن میں ریوالور کا حصول بنیادی مشورہ تھا، چنانچہ ڈھاکہ پہنچے تو سب کی جیبوں میں ریوالور اور دستوں میں ذاتی حفاظت کے داؤ پیچ تھے، مگر چند ہی دن کے قیام میں اندازہ ہو گیا کہ سب حفاظتی تدابیر بے معنی ہیں ہمارے سب سے بڑے دشمن تھے مسموم فضا، خوف و ہراس، باہمی بے اعتمادی علاقائی منافرت اور دردناک سازشیں . . ان پر ریوالور کون چلاتا، اور کہاں چلاتا اور پھر یہ ساری ہوائیں ہمارے اردگرد تانے بانے بن رہی تھیں کیونکہ ہر مغربی پاکستانی ایک علامت تھا جس کے اردگرد سازشوں اور نفرتوں کے جھونکے کاٹ رہے تھے صرف اتنی کو اندازہ تھا کہ وہ کب اور کہاں اپنا گھیرا تنگ کر کے ہر کر کر ڈالیں گے ہمارا کام صرف انتظار کرنا تھا، کیونکہ وار کرنے کا فیصلہ بھی ان کا تھا اور پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی تھی اگر وہ وار کرنے کا ارادہ نہ کرتے تو ہم محفوظ تھے، لیکن اگر وہ وار کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ہم کسی طرح بھی محفوظ نہ تھے اور ہمارا ریوالور کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا، کیونکہ ہم بنگالیوں میں اس طرح گھرے ہوئے تھے جیسے مچھلی پانی میں گھری ہوتی ہے کسی کے لئے یہ مشکل نہ تھا کہ خاموشی سے چھرا گھونپ دیتا پیچھے سے گولی چلا دیتا، کھانے میں زہر ملا دیتا، راہ چلتے مشین گن سے چھلنی کر دیتا، دفتر میں ملاقات کے دوران حملہ کر دیتا یا کسی اور طریقے سے اچانک حملہ کر دیتا۔ اس لئے چند ہی دن قیام کے بعد میں نے ریوالور صندوق میں بند کر دیا اور خدا کے بھروسے پر کھلے بندوں گھومنا پھرنا معمول بنا لیا۔

## ہر حقیقت کو مامد ارِ تماشا دیکھا

مگر اس لغزش یا اس احتیاط پابندی کا اثر ضرور تھی کہ ہم لوگ سینما دیکھنے نہیں جاتے تھے سکیورٹی والے پھر جوانوں کی مسلسل نصیحت تھی کہ اندھیرے کمرے میں گھری کرسی میں مکمل کرنا محسوس ہونا لقوائی نہیں، حماقت ہے۔ اس محرومی کا بدل یوں ہوا کہ ہماری درخواست پر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ والے ہر دس پندرہ دن بعد اپنے آڈیٹوریم میں کوئی بنگالی یا انگریزی فلم دکھا دیا کرتے تھے مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والے لوگ بیوی بچوں سمیت آ کر فلم دیکھا کرتے تھے اور اکثریت بنگالیوں کی ہوتی تھی۔

ایک دن ایک نوجوان افسر میرے دفتر میں آیا کہنے لگا" سر آپ کل فلم دیکھنے آئیں گے؟"

"کون سی فلم ہے؟"

"مجھے نام تو معلوم نہیں، مگر انفارمیشن والے کہتے ہیں کہ بہت اچھی فلم ہے"

"پھر بھی کتنی اچھی؟"

"وہ کہتے ہیں کہ ایسی فلمیں کبھی کبھار ہی ملتی ہیں، اور یہ بھی ایسی ہی ہے"

"اس دفعہ تو میرا موڈ نہیں ہے شاید نہ آ سکوں"

"نہیں سر۔ کل آپ ضرور آئیے"

اس دن میں کسی اور مصروف تھا اس لئے ٹالتا رہا، مگر اس کے اصرار پر ارادہ بدل گیا اور اگلے روز صبح وہاں پہنچ گیا فلم اتوار کو ہوتی تھی۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے قریباً سبھی افسران وہاں موجود تھے مگر بنگالیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ میں نے سوچا کہ فلم کا چرچا کافی ہو چکا ہے یقیناً اچھی ہو گی تھوڑی دیر بعد فلم شروع ہوئی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس کا عنوان THE TRAIN تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمنوں کو فرانس خالی کرنا پڑا تو ان کے ایک جرنیل نے حکم دیا کہ نادر تصاویر، آرٹ گیلریوں سے اتار کر حفاظت سے بند کی جائیں اور ایک ریل گاڑی میں احتیاط سے رکھ کر جرمنی منتقل کر دی جائیں۔ جب حاکم غیر ہوں اور حکم بندوق کی نالی سے نکلے تو انکار کی مجال کسے، چنانچہ فرانسیسی افسردہ دلوں خاموش چہروں اور سست ہاتھوں سے تعمیل کرتے رہے مگر جب ریل گاڑی روانہ ہوئی تو ریلوے کے اہلکاروں نے ایسی ایسی ترکیب کے مطابق اسے رستے ڈالے کہ تصاویر کو فرانس سے جرمنی منتقل کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

یہ فلم اسی عدم تعاون کی داستان تھی اور اس میں شک نہیں کہ واقعی اچھی فلم تھی۔

فلم کی نوعیت سے اس نوجوان افسر کے اصرار کا مقصد آشکارا ہو گیا۔ جب لبوں پر مہر ہو تو انسانی عقل نت نئی زبانیں تراش لیتی ہے۔ آنکھوں کی زبان، خاموشی کی زبان، ضمیر کی زبان، علامت کی زبان۔ سمجھانے والا کبھی گرفتار ہو جاتا ہے کہ ہر حلقۂ زنجیر زبان بن جائے۔ کبھی یہ پابندی ہو جاتا کہ اس کا دوران سکن زبان بن جائے

اسی طرح یہ فلم نہ تھی بلکہ زبان تھی۔ یہ ایک مکتبۂ فکر کے لوگوں کا منشور تھا جو علامتی انداز میں ہم تک پہنچ رہا تھا فلم کی کہانی کے ماحول اور مشرقی پاکستان کے ماحول میں بہت مطابقت تھی یعنی حاکم وقت کے ساتھ عدم تعاون کی خاموش اور مؤثر مہم اس کے احکام کے نفاذ میں اڑچنیں ڈالتا کہ گرفت نہ ہو سکے بظاہر سر تسلیم خم، مگر باطن وہ کرتی جو ایجاد کر عمل با عیار۔ ہاتھوں سے سلام میں میں دشنام سرکاری ملازموں کی اکثریت اسی مسلک پر کاربند تھی چند ایک ان کے برعکس بھی تھے، مگر وہ کھل کر سامنے نہیں آتے تھے، کیونکہ وہ اکثریت سے خوفزدہ تھے اور حکومت سے بددل۔

فلم ختم ہوئی، ہال میں روشنیاں چمک اٹھیں سکرین کی دنیا سے نکل کر ناظرین اپنی دنیا میں واپس آئے اور جانے کے لئے اٹھنے لگے معمول عود کر آیا۔ رسم جاگی اور ہاتھ ملنے لگے خدا حافظ کی آوازیں آنے لگیں وہ نوجوان افسر مجھ سے کافی دور دروازے کے قریب بیٹھا تھا وہ چاہتا تو وہیں سے باہر نکل سکتا تھا مگر وہ التزام سے میری طرف آیا مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر خدا حافظ کہنے کی بجائے خاموش رہا اور ہم دونوں نے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے دو حریف کشتی سے پہلے اکھاڑے میں ملاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ کی گرفت میں طنز یہ گرمجوشی تھی۔ مگر بار جھکنے میں ڈھکا چھپا چیلنج تھا۔ اور آنکھیں — ؟

ان کی آنکھوں میں زباں ہو جیسے

یہ تاریک ہال ایک لیبارٹری تھی اور یہ علم ایک تجربہ تھی جس نے ہمارا جو رشتہ ذرا ابھار کر نمایاں کر دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان سے جانے والے سبھی بڑے افسران، بنگالی اہلکاروں کے ہم عصر میں اسی تکلف دہ رشتہ میں منسلک تھے۔ ان کے مابین ایک بے روح تعلق تھا۔ مصنوعی رواداری بھی اور خاموش تصادم بھی تھا۔

اگلے دن ہم دونوں دفتر میں تھے، وہ میرے کمرے میں چائے پی رہا تھا اور حالات حاضرہ گفتگو کا موضوع تھے۔ مگر آج وہ پرانے انداز میں دلائل دینے کی بجائے یہ مؤقف اختیار کر رہا تھا کہ وقت ہی صحیح فیصلہ دے سکے گا۔ اس پختہ اعتقاد کے ساتھ کہ وقت اس کے حق میں ہے گویا جو نقشہ گزشتہ روز کی فلم نے پیش کیا تھا وہ اس کا منطقی نتیجہ بتلا رہا تھا۔

چودہ اگست کی آمد آمد تھی۔

ایک سرکاری مراسلہ دفتروں میں گھوم رہا تھا کہ تمام سرکاری ملازموں کے لئے لازمی ہے کہ وہ پریڈ دیکھنے آئیں — سکولوں کے بچوں اور بچیوں کی پریڈ جس کی سلامی کمشنر ڈھاکہ لیں گے

چند روز کے بعد ایک اور مراسلہ ملا۔ تمام سرکاری ملازموں کو گتے کے بلے مہیا کئے جائیں گے جن پر لکھا ہوگا "پاکستان زندہ باد" اس بلّے کو اپنے سینے پر لگانا ہوگا حبِ وطن سے خالی سینوں پر نعرۂ وطن کوئی نئی بات نہ تھی۔ خود فریبی مسلمانوں کی پرانی رسم ہے۔ نیچا ایمان، اونچا اعلان، تیرہ سو برس کی تواریخ نے بار بار بتایا ہے

بے مدرسہ ہے حرم کی آتش

دین میں کھوٹا دنیا میں بھی کھوٹا ہوتا ہے منافقت جب عادت بن جائے تو پھر کیا گھر کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو — لیکن اگر نسل بدلنے سے دل بدلے جا سکتے تو پتھروں کی بجائے کاتب بیچے جاتے اور دنیا کے سارے ہنگامے سرد پڑ جاتے۔

گیارہ اگست کو شیخ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ شروع ہوا اسی شام کو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں یہ زوردار دھماکہ ہوا۔ دیواریں شق ہوئیں۔ چند کھڑکیاں اڑ گئیں بہت سے شیشے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اگلے دن گوپال گنج کے قریب ایک پولیس چوکی پر حملہ ہوا جس میں انتظامی آدمیوں کا سارا اسٹاف مارا گیا۔ دو دن بعد ہم اگست آگیا دفتروں میں چھٹی، آسمان پر بادل۔ فضا میں دھماکوں کی بازگشت اداس اور ویران سڑکیں۔ یہ تھا ۱۹۷۱ء کا چودہ اگست ڈھاکہ میں پاکستان کا آخری یوم آزادی۔ پریڈ گراؤنڈ میں تماشائی لگے تھے ہر چہار طرف رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ سرخ ہرے اور رنگین کرسیاں تھیں کرامام بے جان چیزیں جس کے لئے تیار کی گئی تھیں مگر جاندار مدعوئین جس پر آمادہ نہ تھے۔ یہ جوش و جذبے کے اعمال در مسلکوں کے اندر۔ منتظمین آنے والوں کو مرتبے کے مطابق بٹھا رہے تھے۔ بیٹھنے والے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے، سمٹے سمٹائے ہوئے جیسے آنے پر نادم ہوں اور زبانِ حال سے واضح کر رہے ہوں کہ

میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

گرمجوش معانقے مفقود تھے پر شور مصافحے غائب تھے فاصلوں سے مسکراہٹوں کے پیغام نہ تھے نظریں ملیں تو فوراً جھک گئیں۔ ہاتھ اٹھے تو فوراً گر گئے۔ بات چلی تو فوراً رک گئی آگے والے اٹھ کر کھڑے نہ ہوتے تھے پیچھے والے سرک کر آگے نہ آتے تھے جو جہاں تھا خاموشی سے بیٹھا تھا چاہے اسے پریڈ نظر آتی تھی یا نہیں۔

کچھ فاصلے پر مجھے وہ نوجوان افسر نظر آیا۔ نہ معلوم اس کے دامن میں اتفاق سے کرسیاں خالی تھیں یا وہ جان بوجھ کر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے سینے پر "پاکستان زندہ باد" کا ملا کافی نمایاں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نمایاں ماتھے کی تیوری اور چہرے کی بیزاری تھی۔ ماحول سے ناتا توڑنے کی دانستہ کوشش میں وہ کرسی پر اپنے پہلو بدل رہا تھا کہ اس کی ساری توجہ سامنے والی پریڈ گراؤنڈ پر نہ ہو سکے تاکہ ادھر ادھر نظر بھٹکی رہے۔ اسی کوشش میں اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی، مگر وہ اس قدر برافروختہ تھا کہ مجھے بھی پہچاننے سے انکاری ہو گیا۔ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ عادت ہی ہو سکتی تھی کہ احتجاج مکمل بے اعتنائی کی صورت میں واضح کر دیا جائے اور ہر اس چیز سے بے رخی برتی جائے جس کا تعلق پاکستان سے ہو چاہے وہ جشن پاکستان ہو یا پاکستان کی سالمیت چاہنے والے لوگ ہوں۔

پریڈ شروع ہو گئی۔

بینڈ کی دھنوں کے ساتھ مختلف سکولوں کے بچوں کی ٹولیاں مارچ کرتی ہوئی گزرنے لگیں بے حس، لاتعلق اور غیر مدنانی، آنکھیں انہیں بلا دیکھے دیکھنے لگیں۔ اگر وہ دیکھتی تھیں تو صرف اتنا کہ کون شعف سے مارچ کر رہا ہے اور کون مجبوری سے چل رہا ہے اس لحاظ سے جشن کی پریڈ کم تھی اور ماتمی پریڈ زیادہ تھی، جس میں مجسمے کی آنکھیں اپنے سامنے سے گزرنے والے لوگوں میں سے مجرم کو شناخت کر رہی تھیں۔ سرکاری ملازموں کے اس مجمع کے سامنے سے گزرنے والوں میں سے وہ عام لوگ مجرم تھے جن کے سینے پر رسمی بلّے کی بجائے پیشانی پر پاکستان کی پُرخلوص حمایت درج تھی۔ یہ سب مستقبل میں دار پر چڑھائے جائیں گے

میں نے ویسے ہی سر گھما کر دیکھا تو وہ نوجوان افسر اپنی ڈائری میں کچھ درج کر رہا تھا۔

میں سوچتا ہی رہا کہ یہ کیا لکھ رہا ہے

پانچ ستمبر کو عام معافی کا اعلان ہو گیا۔ جن لوگوں نے یکم مارچ سے پانچ ستمبر تک سیاسی نوعیت کے جرم کئے تھے انہیں معافی مل گئی اور ان سے اپیل کی گئی کہ اگر وہ ہندوستان میں پناہ گزین ہیں تو بلا خوف و خطر واپس آ جائیں۔ اس رعایت کا اعلان باغی فوجیوں، باغی پولیس والوں اور وسعت میں قتل عام کرنے والوں پر بھی تھا۔ چھ ستمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان و ہند جنگ کی یاد میں یوم دفاع منایا گیا تو اخبارات میں بڑی نمایاں خبریں تھیں جن میں ایسے باغیوں کو جیل سے رہا ہوتے دکھایا گیا تھا

چند ہی دنوں بعد دہشت انگیزی کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہوگیا۔ پہلے سے زیادہ بم پھینکے جانے لگے۔ پاکستان کے حامی عناصر کے قتل بڑھ گئے اور فوج اور پولیس پر اچانک حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔

اس پس منظر میں اس نوجوان افسر کے رویے میں بھی سختی آنے لگی۔ ہماری گفتگو اس سے پہلے انگریزی اور اردو میں ہوتی تھی مگر اب وہ اردو بولنے سے کترانے لگا اور ہم ساری بات چیت انگریزی میں کرنے لگے۔

اسی دوران گفتگو کے دوران میں نے اس سے پوچھا "آپ کے خیال میں مشرقی پاکستان کے موجودہ حالات کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ منہ سے دھواں چھوڑا اور اعتماد سے کہنے لگا "علیحدگی۔"

"کیا اس سے کمتر کوئی حل نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر مغربی پاکستان کا کیا مستقبل ہوگا؟"

"میرا جواب وہی ہے جو ۱۹۴۶ء کے متعلق تھا۔"

"اور پھر ۱۹۴۷ء میں ساری بنگالی قوم پاکستان میں کیوں شامل ہوئی؟ حتیٰ کہ سلہٹ میں رائے شماری کرائی گئی تو ووٹ پاکستان کو ملے۔"

"اس وقت ہم جذبات کی رو میں بہہ کر اندھے ہوگئے تھے۔ اب ہماری آنکھیں کھلی ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت کا فیصلہ صحیح ہو اور آج کل آپ جذبات کی رو میں بہہ کر اندھے ہو رہے ہوں۔"

"نہیں۔ یہ درست نہیں۔"

"کیوں؟"

"کوئی قوم جوش جذبات پر کبھی رضامند ہوتی ہے جب اس نے سوچ سمجھ کر اور عقل و دانش سے کام لے کر ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا ہو۔ ہم آج کل ہوش سنبھالے ہوئے ہیں اس لئے یہ شعوری فیصلہ ہے۔ جذباتی نہیں۔"

"جوش تو ۱۹۴۷ء میں بھی بہت تھا۔"

"مجھے تو نہیں معلوم۔"

"ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ بھیانک فسادات بنگال میں ہوئے اور پھر بہار میں۔"

"فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج کل بھی ہندوستان میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ ہم انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"شاید اس لئے کہ آپ کا کوئی قریبی عزیز نہیں مارا گیا۔"

"نہیں۔ اس لئے کہ فسادات کسی مقصد کے بغیر ہوتے ہیں اور ان میں جو خون ۱۹۴۷ء میں بہا وہ ضائع گیا۔ ہم جو خون آج کل بہا رہے ہیں وہ ایک واضح مقصد سے ہے اور وہ ضائع نہیں جائے گا۔"

"مقصد تو ۱۹۴۷ء میں بھی تھا۔ مگر آپ یہ بتائیے کہ کیا ہندو یہ فسادات بغیر کسی مقصد کے کرتا ہے؟"

"ہندو کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"مسلمانوں کو مسلسل کمزور کرنا، انہیں ڈرا دھمکا کر ہندو ثقافت کی طرف مائل کرنا، ان پر ہندوستان میں عرصۂ حیات تنگ کر کے برعظیم سے اسلام کو ختم کرنا۔"

"یہ محض جذباتی باتیں ہیں۔"

"سپین کی تو تاریخ نہیں پڑھی آپ نے؟"

"میں اس برعظیم — اپنی دھرتی — کی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے دوسری قوموں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں اپنے ماضی سے واسطہ رکھنا ہے۔"

"آپ کے ماضی میں مسلمانوں کا ہزار سالہ دور حکومت بھی تو ہے۔"

"مگر ماضی تو اس ہزار سال سے پرے بھی ہے۔"

"آپ اس ماضی سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں سارے ماضی سے تعلق رکھتا ہوں۔ جس میں وہ ماضی بھی شامل ہے۔"

"کیا آپ کے ماضی میں یہ حقیقت شامل نہیں کہ ایک ہزار سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہندو آپ کو اچھوت سے بھی بدتر سمجھتا تھا؟"

"مجھے تو یہ بات تعصب زدہ پروپیگنڈا لگتی ہے۔"

"میری بات پر شاید آپ اعتبار نہ کریں لیکن اپنے بزرگوں سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہندو سمجھتا تھا کہ مسلمان کو پانی پلانے سے اس کا دھرم پلید ہوجاتا ہے۔ اول تو وہ پانی پلانے سے ہی انکار کر دیتا تھا لیکن اگر کبھی رفاہ عامہ کے لئے سبیل لگاتا تو وہاں ہندوؤں کو گلاس میں پانی ملتا لیکن اگر کوئی مسلمان پانی مانگتا تو اسے یا تو اوک سے پانی پینا پڑتا یا وہ لمبے کھوکھلے بانس کے ایک سرے پر منہ لگاتا اور پانی پلانے والا بانس کے دوسرے سرے میں گڑوی یا لوٹے سے پانی ڈالتا۔"

"میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سنی۔"

"یہ بھی نہیں سنا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے گھروں میں کھانے کے کمرے یا باورچی خانے میں جانے کی اجازت رہتی۔ اگر کوئی مسلمان غلطی سے وہاں چلا جاتا تو ہندو تو فرش ہی دھلوایا کرتے کونے وغیرہ دھلاتے۔"

• ہر شخص کو اپنی PRIVACY کا حق ہے۔ ۔۔ کوئی زیادہ خلوت پسند ہیں تو کوئی کم۔ اگر ہندو زیادہ خلوت پسند ہے تو ہمیں اسکی خلوت میں مخل نہیں ہونا چاہیے"

• یہ خلوت کی نہیں حقارت کی بات ہے۔

"جو بھی ہماری خلوت میں مخل ہوتا ہے ہم اسے حقارت سے دیکھتے ہیں ایک ہی گھر کے لوگ بعض اوقات اپنے اپنے کمروں میں اکیلا رہنا چاہتے ہیں تو ایک قوم کے افراد دوسری قوم کے لوگوں سے اپنے چند گوشے کیوں نہیں چھپا سکتے؟"

"اگر کوئی آپ سے کہے کہ آپ ہندو ہو جائیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟"

وہ ہنسنے لگا: "سر اب آپ بحث کی بجائے فلر کر رہے ہیں۔"

بیل کی گھنٹی بجنے لگی میں ادھر متوجہ ہو گیا۔ بیل ختم ہوا تو سرکاری بات چھڑ گئی اور وہ بات ختم کر کے اپنی فائل اٹھا کر چلا گیا۔

وہ چلا گیا تو مجھے اپنے عہدے کی کرسی گویا ڈسنے لگی اور سیکرٹری تعلیم کے کمرے کے در و دیوار سراسیمہ دکھائی دینے لگے کہ پچھلے چوبیس برس کے نظام تعلیم نے ایسی نسل کھڑی کی ہے جسے یہ بھی اندازہ نہیں کہ پاکستان کیوں بنایا گیا تھا۔

میں نے ماتھوں کو دیکھا تو وہ بھی میرا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی

میں گھبرا کر اٹھا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

ہمارے باہمی تعلقات میں تصادم کی صورت کبھی بھی نہیں ابھری بلکہ ایک پیار کا رکھ رکھاؤ تھا جس کی وجہ سے وہ ایسا دل کھول کر مجھ سے بات کر لیتا تھا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود احترام کی فضا کبھی مجروح نہیں ہوئی۔ بہت کھرے انداز میں تبادلۂ خیالات ہوتا اور راست گوئی میں دونوں طرف کوئی جھجک نہ تھی۔ اس وجہ سے مجھے اس کے دل و دماغ میں جھانکنے کا پورا موقع ملا اور مجھے اس کی ہم عمر نسل سے گہری ہمدردی ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ گمراہ نسل تھی جو غلط راستے پر محض اس وجہ سے چل پڑی کہ صحیح راہ دکھانے والے پاکستانی کوتاہ اندیش تھے اور فرض ناشناس بھی۔ اور غلط راہ دکھانے والے ہندوستانی دوراندیش تھے اور سازشی بھی۔ والدین بچے پر توجہ نہ دیں تو وہ ہمسایوں یا نوکروں سے گھل مل جاتا ہے، اور انہی کی عادات اختیار کرنے لگ جاتا ہے۔ معصوم اس گمراہ نسل کا بس تھا لیکن اس سے بڑی بھیانک نسل کا تھا۔

۱۹۴۷ء میں دو قوموں کے ساتھ دو رویوں نے بھی جنم لیا۔ ایک طرف پاکستان کی کامیابی کے بعد کاہلی ابھری۔ دوسری طرف ہندوستان میں ہار کے بعد جہد ابھری۔ ۱۹۴۷ء میں مقصد سامنے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں مقصد بازی جیتی تو ہم نے سامان حرب اتار کر رکھ دیا اور سستاتے ہوئے سو گئے۔ ہندو ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے مقصد سامنے رکھ چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو ان کی ساری سوچیں اور کوششیں اسی مقصد کے تعاقب میں لگ گئیں۔ ہماری مقصد فراموشی اور ان کی مقصدی لگن دو مختلف رویے تھے۔ مشرقی پاکستان کی نئی نسل ان دو رویوں کا لازمی نتیجہ تھی۔ جب ہم نے اپنے بچوں کی انگلی چھوڑ دی تو دوسروں نے تھام لی اور قدم قدم اپنے ساتھ چلانے لگے اور بالآخر اُدھر لے گئے جدھر وہ لے جانا چاہتے تھے۔

ان دو رویوں نے ہماری نئی نسل کو کس طرح نئے انداز میں ڈھالا؟ اس کی داستان طویل ہے مگر دو لفظوں میں بیان ہو سکتی ہے "نظام تعلیم"

نظام تعلیم سوچوں کے دھارے ڈھالتا ہے۔ ایک خاص انداز میں صحرائی ہوا کی طرح جو ایک طرف چلنے لگتی ہے تو اگر کوئی پیدا ہو جائے اس سے متاثر ہونے لگتے ریت اڑا اڑا کر اس جھاڑی یا پودے کے گرد جمع ہونے لگتی ہے اور ایک چھوٹا سا ٹیلہ ابھرتا ہے۔ ہوا اور ریت اور ریت لاتی ہے اور ٹیلے کا ابھار بڑا ہونے لگتا ہے جو بڑھتے بڑھتے ریت کا تودہ اور پھر پہاڑ بن جاتا ہے مگر اس کی شکل ہوا کے رخ کے مطابق ہے جدھر سے ہوا آتی ہے اس طرف ٹیلے کی ڈھلوان اور جدھر ہوا جاتی ہے اس طرف چابک سا کٹاؤ۔ تودے کی شکل ہوا کے رخ کی نشاندہی کرتی ہے جس نے اسے ڈھالا ہے کچھ وقت کے بعد ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تودوں کی ڈھلانیں بھی بدل جاتی ہیں۔

نظام تعلیم ایک خاص رخ میں چلنے والی ہوا ہے جس کے رخ کا تعین ہر قوم کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ساحلی کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا چوبیس برس تک پاکستان کے مخالف رخ میں چلتی رہی اور نئی نسل کے ذہنی تودوں کے گرد آہستہ آہستہ دو قومی پہاڑ بن گئے جن کی ڈھلانیں ایسی تھیں جیسے کوئی پاکستان دشمن کاریگر اس ہولناک رخ کے تعین میں سب سے بڑا حصہ ہندو اساتذہ کا تھا اس کے بعد ان عناصر کا تھا جو یا تو ہندوستان کے ایجنٹ تھے یا اپنے طور پر نظریۂ پاکستان سے بیر رکھتے تھے یہ عناصر بڑے مؤثر طریقے سے پالیسی مرتب کرنے والے اداروں میں داخل تھے

محکمہ تعلیم کے بجٹ کا سب سے زیادہ حصہ پرائمری تعلیم پر خرچ ہوتا تھا مگر ملک بھر میں ایک بھی پرائمری سکول سرکاری نہ تھا۔ تمام سکول پرائیویٹ تھے اور حکومت سے گرانٹ لیتے تھے مگر پرائیویٹ ہونے کی وجہ سے سٹاف اپنی مرضی سے بھرتی کرتے تھے یعنی حکومت مالی بوجھ تو اٹھاتی تھی مگر اس کے پاس انتظامی اختیارات نہ تھے۔

اس بندوبست کے تحت پرائمری سکولوں میں بڑی تعداد میں ہندو اساتذہ چھائے ہوئے تھے اور ہر جھاڑی یا پودے کے گرد ریت کا چھوٹا سا ٹیلہ بناتے رہتے تھے

دیگر سکولوں اور کالجوں میں صورت حال ذرا مختلف تھی کیونکہ ان میں زیادہ تر سرکاری ادارے تھے جن میں ہندو اساتذہ کم ہی لئے جاتے تھے، مگر اس سطح پر بھی پرائیویٹ ادارے ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کو ہم پرائیویٹ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہی وہ سالمیتی گورنمنٹ کا ادارہ تھی لیکن یہاں بھی بیس کے قریب ہندو اساتذہ تھے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کارروائی کے بعد تعلیمی ادارے دو تین ماہ بند رہے اور جب رفتہ رفتہ کھلنے لگے تو مسلمان اساتذہ کی بہت بڑی تعداد

بہرحال پھر بھی ہندو اساتذہ کم و بیش سبھی حاضر ہو گئے تھے اور بڑی تندہی سے اسی مذموم کاروائی میں مصروف رہے جب حکومت کی متعدد اپیلوں پر طلبا سکولوں اور کالجوں میں آنے لگے تو یہ اساتذہ ان کو غلط سلط افواہوں سے بھگانے کی کوشش کرتے۔ پہلے یہ عمل کافی حد تک محدود تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت پکڑتا گیا اور وہ زیادہ دلیری سے مانگ وہل پاکستان کیخلاف اکسانے لگے۔ نوبت یہ اس حد تک پہنچی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہندو پروفیسروں نے ایک [illegible] پاس کیا کہ ان کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا جائے کیونکہ وہ دلجمعی سے درس و تدریس کا کام نہیں کر سکتے

سات دسمبر کو ایک فکر رہے تھے مانا کہ آج جاج کالج کے اساتذہ بہت خوش تھے کیونکہ ہندوستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے اور ان کا ہندو دانشور دیوتاؤں کی طرح کالج میں ایسے گھوم رہا تھا جیسے اس نے کالج کے ہر شخص پر بڑا ہی احسان کیا ہے۔

ریت کے چھوٹے ٹیلے دو رہے تھے جو اب پہاڑ بن چکے تھے۔

اساتذہ کے علاوہ نصابی کتب بھی ہوا کے رخ کو ادھر ہی چلا رہی تھیں

چھٹی یا ساتویں جماعت کی ایک درسی کتاب میں پاکستان کے مختلف حصوں کے متعلق ایک مضمون تھا بظاہر معصوم اور سیدھا سادا معلوماتی مضمون۔

میٹرک کے لئے انگریزی گرامر کی کتاب میں بظاہر ایسی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اسے پروپیگنڈا کے لئے استعمال کیا جا سکے مگر اس میں التزام یہ تھا کہ گرامر کی مختلف تراکیب کی تشریح کے لئے جو فقرے بنائے جاتے تھے ان میں زیادہ تر نام ہندوؤں کے تھے اور ذکر بھی ہندو رسومات یا کلچر کا ہوتا تھا مسلمانوں کے نام یا کلچر کے نشان خال خال ہی تھے۔

کالجوں میں انگریزی نثر کی جو کتب تھیں ان میں نصف سے زیادہ مضامین کلکتہ کے پروفیسروں نے لکھے تھے حالانکہ مشرقی پاکستان کے پروفیسر انگریزی لکھنے میں اچھے خاصے تھے۔ یہی حال بنگالی کی نثری کتابوں کا بھی تھا۔

میٹرک یا کالج کے لئے تاریخ کی ایک درسی کتاب میں سب سے نمایاں تصویر ٹیگور کی تھی۔ دوسری نمایاں تصویر رانا سانگا کی تھی اور پھر اکبر اعظم کی جس کے سیکولر ہونے کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان بادشاہ کی تصویر نہ تھی۔

تاریخ کی کتاب ہو یا بنگالی اور انگریزی نثر کی کتاب ہو ان میں کسی نہ کسی رنگ میں ۱۹۴۰ کے پاکستان ریزولیوشن کا ذکر ضرور ہوتا تھا جس میں دو اسلامی ریاستوں کے قیام کا تقاضا تھا اور ۱۹۴۶ کے ریزولیوشن کا ذکر دوسری کتابوں میں تو کجا تاریخ کی کتابوں میں بھی نہ تھا کیونکہ اس میں ایک پاکستانی ریاست کا ذکر تھا غالباً ۱۹۶۷ یا ۱۹۶۸ میں مرکزی حکومت کی ہدایت پر نصاب میں ایک نئی کتاب کا اضافہ کیا گیا جس کا نام تھا "ولیسو کرتشٹی" یہ کتاب تحریک پاکستان اور اس کے محرکات کے متعلق تھی اس کتاب کے خلاف صوبہ بھر میں شدید تحریک چلائی گئی کہ اس کے پڑھنے سے بچوں کے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے حکومت نے بالآخر کتاب نصاب سے خارج کر دی۔

اس نوجوان افسر سے گفتگو کے بعد میں پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو یہ ساری جزئیات ٹوٹتے تاروں کے شراروں کی طرح میرے ذہن میں لپک گیا۔ کراہیں اور میری رگ رگ کو جھنجھوڑ دیا۔ ہلچل زدہ ذہن لئے میں سڑک پر بلا مقصد گھومتے ہوئے ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا

اس نسل پر الزام ہے کہ اس نے وطن سے نفرت کی اور وطن کے دشمن سے محبت کی۔ اس نے دو قومی نظریے کی نفی کی جس پر پاکستان کی عمارت کھڑی ہے اس نے ان حالات کو فراموش کر دیا جن کی وجہ سے پاکستان کا وجود ناگزیر تھا اس نے اپنی تاریخ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنا ماضی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ اسے کانوں اور غیروں کی زبانوں سے پرکھا۔ اس کا یقین دھندلا اور عمل الٹا ہے۔

ناہموار خیال سے سڑک کے پتھر روڑوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس نسل پر الزام بے شک درست ہے ـــــ مگر یہ ملزم نہیں ہے اصل ملزم وہ نسل ہے جس پر یہ الزام نہیں لگایا جاتا۔ یعنی بزرگ نسل جس نے پاکستان حاصل کیا تھا اور پھر وہ بڑی دیدہ دلیری سے ان نعروں کو تار تار کرنے لگے جو سفر کے دوران اس نے پرچم پر رکھے تھے ان کی بجائے تاریخ کی مردہ قوموں کے کفن کی دھجیاں اٹھا کر سینے پر سجا لئے گئے عہد توڑ ڈالے اور کہنہ فرسودگیوں کو نئے نام دے کر سمجھ کر اپنا لیا مگر پرانی بیچ کر نئی نسل کو تربیت دینے کی بجائے اس کے سامنے جسم و روح کی سٹریپ ٹیز STRIP-TEASE کرنے لگے۔ مرشد علی برادران، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ مشرقی، علامہ اقبال اور قائداعظم کی دی ہوئی پاکستانیں نوچ نوچ کر اتار دی گئیں اور بالآخر اندر سے اکھاڑ دیں اور انیسویں صدی کا وہ گھن زدہ زوال پذیر کردار بحال کر دیا گیا جس نے ہند کی اسلامی سلطنت کو فرنگی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ بزرگ نسل نے نئی نسل کو اگر کچھ بتایا تو صرف یہ کہ غنڈہ ہیرو ہے، شرافت گناہ ہے، دیانت داری بزدلی ہے موقع پرستی عقلمندی ہے، بے اصولی اصل ہے۔ با اصولی بے عقلی ہے جو شاید عبادت ہے، اخلاقی جرأت حماقت ہے، خود احتسابی بغاوت ہے اور سیاست رشوت ہے۔ جب سوچ کا ہر دھارا الٹا بہنے لگا تو نظام تعلیم کی کجی بھی نظر نہ آئی اور اس کے نتیجے میں نئی نسل کے وطنیت کے تصور کو بھی گھن لگ گیا

میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ پاکستان سے غداری اسی نسل نے کی ہے جس نے پاکستان بنایا تھا ـــــ معماروں کی غداری بدترین غداری ہوتی ہے ایسی عمارت کے مکین ہمیشہ بے چھت کے رہ گئے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

مگر کیا ایک نظریاتی سلطنت کی نئی نسل کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کے ساتھ اس کے بزرگوں نے بے ایمانی کی ہے

میں نے سوچا کہ اس نوجوان افسر سے دریافت کروں گا۔

اس کا جواب کیا ہو گا؟ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر ذہنوں کے مدوجزر کون ناپ سکتا ہے اور جب دل و دماغ میں بغاوت کا دھواں گھوم

ا ہو تو سرحدوں کی بجائے دھماکے ابھرتے ہیں۔ ایسے دھماکوں کی نسل کو نگل سکتے ہیں

چند روز بعد میں نے اپنے ایک دو دوستوں کو دوپہر کھانے پر بلایا تو اس نوجوان افسر کو بھی مدعو کر لیا۔ کھانا چینی ریستوران میں تھا۔ فارغ ہونے کے بعد او مہمان تو چلے گئے مگر ہم دونوں چائے کی ایک اور پیالی پینے کے لئے رک گئے۔ باتیں ادھر ادھر سے گھوم پھر کر وہیں آگئیں جو ہمارا مسلسل موضوع ہوا ہے۔ اسی گفتگو میں مجھے یہ سوال پوچھنے کا بھی موقع مل گیا

اس کا جواب بالکل واضح اور غیر مبہم تھا

" پاکستان کی بزرگ نسل نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے ڈھلے ڈھلائے نظریات ہم پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اگلی نسل کو اپنا راستہ خود متعین کرنے کی اجازت دی ہے۔ میں آج کا باشندہ ہوں اور مجھے اپنے بزرگوں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جن افکار کی جڑیں ان کے ماضی میں ہیں وہ میرے افکار نہیں بن سکتے۔ میری سوچیں وہی ہیں جو میرے مشاہدے اور تجربے سے بنی ہیں"

میں نے کہا "قوموں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک نسل کا تجربہ دوسری نسل تک سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہے۔ اس سے قومی ذہن بنتا ہے اور ادراک کا دھارا بنتا ہے۔ مثال بالکل سائنس کی ترقی کی طرح ہے۔ ایک نسل کا نئی ریسرچ کے بعد ایجادات کرتی ہے اور اگلی نسل ان ایجادوں کو من وعن قبول کرتی ہے اور پھر اپنے تجربوں سے ان ایجادات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر ہر نسل پچھلی نسل کے تجربے سے منہ موڑ کر دور اول والی ریسرچ سے شروع کر دے تو سائنس کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح دو قومی نظریے میں سرسید کا تجربہ، علی برادران کی ہندوؤں سے مایوسی، علامہ اقبال کا فکر اور قائد اعظم کا کرب شامل ہے۔ اس نظریے کو تشکیل دینے میں کم و بیش ایک صدی اور چار پانچ نسلوں کا ایندھن جلا ہے اور یہ احساس کشید ہوا ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے دونوں قوموں کا اکٹھا گزارہ ممکن نہیں۔ اب آپ اس سبق سے کیسے آنکھیں بند کر سکتے ہیں؟"

وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ "سر، اس کا جواب تو بالکل صاف ہے کہ ہماری نسل اس نظریے سے آنکھیں بند نہیں کر رہی بلکہ یہ نظریہ ہم تک اس انداز میں پہنچا ہی نہیں جس انداز میں بزرگوں نے اسے محسوس کیا تھا"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیا آپ اسے بزرگوں کی کوتاہی تسلیم نہیں کرتے؟"

"بالکل نہیں۔ میں تو اسے بزرگوں کا احسان مانتا ہوں۔"

"اگر آپ کے بزرگ آپ کو کھانے کے آداب، پہننے کے انداز، محفل کے آداب اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سکھاتے تو کیا آپ اسے بھی ان کا احسان سمجھتے؟"

"جی نہیں یہ مثال غیر متعلق ہے۔ میں غور و فکر کی بات کر رہا ہوں۔ اس میں ہمیں آزادی دے کر انہوں نے احسان کیا ہے۔ انہیں دو قومی نظریے میں جان نظر آتی ہوگی، مگر ہمیں تو کوئی جان نظر نہیں آتی۔ غالباً آج کل یہ نظریہ باطل ہے۔"

"باطل تو نہیں ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے دوسری قوم کے افراد کو اکثریتی ہمسائے کے طور پر نہیں دیکھا۔ ہزار سال ایک ہی محل میں بیٹھنے کے باوجود اس تہذیبی فاصلے کو محسوس نہیں کیا جو ہمیں پلید اور ان کو پاک اور برتر بناتا ہے۔ وہ معاشی جبر عام نہیں دیکھا جو کسی مسلمان کو باعزت روزی کمانے سے روکتا تھا۔ آپ کی بڑی نسل نے ہندو کو وحشی اکثریت کے روپ میں دیکھا تھا جو درندگی پر آمادہ تھی۔ مگر آپ کی نسل نے ہندو کو اپنے ملک میں مسکین اقلیت کے طور پر دیکھا اور دوسرے ملک میں امن پسند صلح کا روپ دھارے دیکھا۔ آپ کو اس کی گہری ریاکاری کا اندازہ نہیں۔ اسی لئے آپ پہچان نہیں پاتے کہ اس ملک میں اور ہمسایہ ملک میں ہندو کے دونوں روپ دھوکا اور فریب ہیں۔ اگر آپ پچھلی نسل کے سبق کو بھول گئے تو آپ کو پھر ایک صدی اور تین چار نسلوں کو ذلت، اور آزار کے دوزخ میں جھونکنا پڑے گا تب کہیں جا کر آپ یہ سبق سیکھیں گے۔"

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا گلا اور دھیمے انداز میں کہنے لگا "سر، اس کا فیصلہ وقت کرے گا"

"میرے عزیز" میں نے کہا "اگر آپ حقیقت پسند ہیں تو وقت کے فیصلے خوشگوار ہو سکتے ہیں لیکن اگر آپ خوش فہم اور انانیت زدہ ہیں تو وقت کے فیصلے بڑے سفاک ہو سکتے ہیں"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا "سر آج کا کھانا بہت اچھا تھا"

دن گزرتے گئے۔ وقتاً فوقتاً ہماری گفتگو ہوتی رہی کبھی براہ راست اس موضوع پر اور کبھی ضمناً اور سرسری۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ میں اپنے ارادے میں ایک حد تک ہی کامیاب ہو سکوں گا۔ اس کا ذہن سمجھنے میں تو مجھے کامیابی ہو رہی تھی مگر اس کا ذہن بدلنے میں کامیابی کے آثار نہ تھے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر پر سختی سے قائم تھا بلکہ اب تک مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مکتی باہنی کی مدد درمے، درمے اور سخنے ہر انداز میں کر رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مارشل لا والوں کو بھی علم تھا مگر وہ بلا خوف و خطر اپنے کام میں مصروف تھا۔ حالانکہ مارچ کے ایکشن کے بعد فوج نے اسے تھوڑی دیر کے لئے گرفتار بھی کیا تھا، پھر عدم ثبوت کی بنا پر وہ رہا ہو گیا۔ مگر یہ جھٹکا بھی اس کی حوصلہ شکنی نہ کر سکا تھا۔

ایک دن میں دفتر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا کہ اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اپنے ایک اور دوست کے ساتھ اوپر آ رہا تھا اور دونوں سخت غم و غصے کی حالت میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار بولا "دیکھئے سر، فوج کتنے ظلم کر رہی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"ہم دونوں ابھی ابھی تین لاشیں دیکھ کر آ رہے ہیں۔ ہسپتال کے پاس، نالے پر سڑک کا پل ہے۔ اس کے نیچے تین لاشیں پڑی ہیں"

"موت کیسے واقع ہوئی؟"

"گولیاں لگنے سے"

"کون لوگ ہیں وہ؟ کسی نے شناخت کیا ان کو؟"

"ابھی تک ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔"

"جب تک شناخت نہ ہو، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر تو وہ مکتی باہنی کے حامی تھے تو حالات فوج نے مارا ہوگا لیکن اگر وہ پاکستانی ذہن کے مالک تھے تو ممکن ہے مکتی باہنی والوں نے انہیں مارا ہو۔ ذرا صحیح حالات کا اندازہ ہو، تبھی کچھ کہہ سکتے ہیں نا؟"

مگر وہ یہ دلیل قبول کرنے کو تیار نہ تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ فوج نے انہیں مارا ہے۔

ناچار مجھے کہنا پڑا کہ خانہ جنگی کے حالات میں قتل و خون تو ہوتا ہی ہے جس طرح مکتی باہنی والے فوج اور پولیس والوں پر اچانک حملے کر کے انہیں قتل کرتے ہیں اور ان کو گوارا کرتے چلے جاتے ہیں، اسی طرح فوج والے بھی ایسے ہی اقدام کرتے ہیں۔"

مگر وہ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور اصرار کرتے رہے کہ فوج کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے، یہ سراسر ظلم ہے۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ مکتی باہنی والے قتل و غارت کرنے میں حق بجانب ہیں مگر فوج کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

میں نے سوچا یہ شیخ مجیب الرحمٰن کا طرز استدلال ہے جو تعلیم یافتہ بنگالیوں میں بھی سرایت کر گیا ہے اور اس کی گونج ہم ہندوستان ریڈیو پر بھی سنتے ہیں مگر ہمارے ذرائع ابلاغ اتنے کمزور ہیں اور اپنے نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوششیں اتنی ادھوری ہیں کہ ہمارے ہر عمل کی ظلم کے طور پر تشہیر کی جاتی ہے۔

لاشوں کے متعلق اصل حقیقت کا پتہ نہ چل سکا جیسا کہ مشرقی پاکستان میں اکثر ہوتا تھا جب تقدیر گردش میں ہو، تدبیر میں کھوٹ ہو اور ضمیر میں تعصب ہو تو اصلیت افواہوں کی دھند میں کھو جاتی ہے اور حقائق مخفی صداؤں کی طرح قیاس کے آسمانوں میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں۔ طرفین ان صداؤں کو اپنے اپنے روپ میں پیش کرتے ہیں اور مذہبی جنگوں کا سا جنون ہر طرف چھا جاتا ہے۔ جنون جب بڑھتا ہے تو مقابلہ خیر و شر کے درمیان نہیں رہتا بلکہ شر اور شر کے درمیان ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سچ اور جھوٹ کی حد فاصل مٹ جاتی ہے، ظلم اور زیادتی کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور تمام قانونی اور اخلاقی معیار معدوم ہو جاتے ہیں۔

بالکل یہی ایسا ہی مقام تھا جب ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کیا تھا چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے، سلہٹ اور جیسور کے علاقے میں تین طرف سے پیش قدمی کی۔ حملے میں ایئرفورس بھی استعمال کی گئی۔ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی بارہ ڈویژن فوج حملہ آور تھی اور پاکستان ریڈیو کے مطابق اور محاذ بھی کھلنے کی توقع تھی۔ پھر یہ محاذ کھل بھی گئے مگر ہم نے بین الاقوامی محاذ پر کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اقوام متحدہ میں بھی دہائی نہ دی کہ ہم پر حملہ ہوا ہے۔ دس دن تک حملہ اسی طرح چلتا رہا اور مشرقی پاکستان میں سوالیہ نظریں آسمان کی طرف اٹھ اٹھ کر حیرتوں پر شک کرتی رہیں اور پاک وطن کو اپنا کہنے والے محب وطن پاکستانی زبان حال سے ارباب اقتدار سے سوال کرتے رہے۔

یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

ان دس دنوں میں میری کی ملاقات اس نوجوان افسر سے ہر روز ہوتی تھی مگر ملاقاتوں کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اب وہ بحث سے بچتا تھا اور ملک کے حالات پر بات چیت کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ ہی یہ تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا ہوا ہے۔

"اگر یہ حملہ ہوتا تو پاکستان یقیناً اقوام متحدہ میں شور کرتا۔" اس نے ایک مرتبہ معنی خیز انداز میں کہا تھا مگر اس سے زیادہ گفتگو پر آمادہ نہ تھا مگر میرے بہاری ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا کہ اس افسر کو حملے کی خبر سب سے پہلے اسی ڈرائیور نے بتائی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ بے ساختہ ہنسا تھا اور بول اٹھا تھا "اب دیکھنا؟"

حملے کے دس دنوں میں ہمیں یقیناً تشویش تھی مگر وہ افسر بڑا مطمئن نظر آتا تھا، جیسے جام جمشید نے اس پر مستقبل آشکارا کر دیا ہو اور اسے حالات کا پانسہ اپنے حق میں پلٹنے کا یقین ہو۔ مجھے یوں لگتا جیسے اس کی خاموش دھمکی زبان حال سے ہمیں دھمکا رہی ہو "اب دیکھنا"

پھر تین تاریخ کی رات کو ڈھاکہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ رات تین بجے کے قریب ہوائی حملے سے در و دیوار لرز اٹھے اور پھر پوری جنگ شروع ہو گئی۔ رات کا باقی حصہ اور اگلا سارا دن ہوائی حملے جاری رہے۔ حملوں میں بمشکل آدھ پون گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا۔

چار تاریخ کی صبح کو میں ہماری اور ہوائی جہازوں کی DOG FIGHT کے سائے میں گاڑی چلاتا گورنمنٹ ہاؤس ایک میٹنگ کے لئے گیا مگر میٹنگ ملتوی ہو گئی تھی۔ وہاں سے سول ڈیفنس کا کنٹرول روم دیکھنے کے بعد میں ساڑھے دس بجے کے قریب دفتر پہنچا۔ وہاں ہو کا عالم تھا۔ دو چار لوگ آئے تھے اور باقی لوگ ادھر ادھر سے فون کر کے صورت حال کا پتہ کر رہے تھے۔ میں نے حاضر لوگوں سے کہا کہ جو کوئی بھی فون پر مل سکتا ہے اسے دفتر آنے کو کہا جائے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں کافی لوگ پہنچ گئے۔

ہمارا دفتر سیکرٹریٹ کی عمارت کی چھٹی منزل پر تھا۔ اس نوجوان افسر کا کمرہ عمارت کی بیرونی طرف تھا اور وہاں سے ایئرپورٹ صاف نظر آتی تھی اس

لئے جب ہوائی حملے کا سائرن ہوتا تو ہم لوگ بھاگ کر اس کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور حملہ ختم ہونے تک وہیں رہتے۔

کمرے میں بیک وقت پندرہ بیس لوگ ہوتے مغربی پاکستانی اور مشرقی پاکستانی، وطن دوست بھی اور وطن دشمن بھی، رفیق بھی اور رقیب بھی —— ایئرپورٹ پر جارحانہ لپکتے جھپٹتے ہندوستانی ہوائی جہاز، نیچے سے دفاعی توپوں کی چنگھاڑ، فضا میں گولوں کے دھماکے اور کمرے میں دل گرفتہ لوگوں کا ہجوم، دلوں کی متضاد وابستگی پہ تمام کوائف مل کر علامتی انداز میں برعظیم کی صورت حال کی مکمل تصویر پیش کرتے تھے انتشار زدہ گھر میں خارجی کا تصادم، انتشار زدہ برعظیم میں دو قوموں کا تاریخی اور اصلی تصادم، اس کمرے کی محدود فضا میں یہ لامحدود عناصر سمٹ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے وہاں عجیب قسم کا کھچاؤ تھا کیونکہ ایئرپورٹ پر ہر دھماکا کوئی ردعمل پیدا کرتا تھا یہاں سموں میں قربت تھی مگر دلوں میں فاصلے تھے۔ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے لوگ مخالفت میں جڑ الٹے تھے۔ اس مخالفت کی تسکین سامنے والے منظر سے ہوتی تھی ہندوستانی جہاز غوطہ لگا کر نیچے آتا اور توپیں دھڑا دھڑ فائر کرتیں۔ وہ بچ کر نکل جاتا تو ایئرپورٹ سے دھوئیں کا بادل اس کی کامیابی کا پھریرا بن کر ابھرتا اور ہمارے درمیان چند چہرے دمک اٹھتے اور چند ایک ماند پڑ جاتے۔ اگر کسی جہاز کو توپ کا گولہ لگ جاتا تو کچھ لوگ اچھل پڑتے اور کچھ ڈھیلے پڑ جاتے کمرے کے باہر تیسرے بارود کی جنگ تھی کمرے کے اندر حرکات و سکنات کی جنگ تھی۔ باہر حریف آزادانہ گتھم گتھا تھے۔ اندر حریف مصالحانہ متحمل تھے باہر وقت کی کلائیاں مروڑ کر فیصلے کی کوشش تھی اندر مناسب وقت کے انتظار میں انگلیاں بھینچ رہی تھیں باہر دشمن دست و گریباں تھے، اندر دشمن دوستوں کی طرح تماشہ دیکھ رہے تھے اس ستم ظریفانہ تضاد کی وجہ سے کمرے کا چپہ چپہ طنزیہ انداز میں تمام چہروں کو گھور رہا تھا

میں بار بار کنکھیوں سے اس نوجوان افسر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بول رہے تھے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ ہم میں سے نہ تھا بلکہ مخالف فریق کے ساتھ تھا۔ اس کی امید اور امنگیں ہندوستانی ہوائی جہازوں کی پرواز کے ساتھ ابھرتی ڈوبتی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن ہماری دھڑکنوں سے الٹ تھی اور فتح و شکست کے متعلق اس کی دعائیں ہماری دعاؤں سے مختلف تھیں۔

دشمن نے بڑا حملہ کیا۔ پہلے چھ ہوائی جہاز دو دو کے گروپ میں آتے تھے اس دفعہ بارہ ہوائی جہاز ایئرپورٹ پر لپکے چلے آئے

نیچے سے بیالیس طیارہ شکن توپیں دھڑا دھڑ فائر کرنے لگیں

ایک جہاز غوطہ لگاتے لگاتے ایک دم اوپر اچھلا۔ اگلے لمحے شعلوں کا ایک ایسا گز سا تھا جیسے غالب نے کہا تھا۔

ایک لگا آتش زرد سر کھلا

پھر یہ شعلہ سی لکیر بن گیا اور ہوائی جہاز فضا میں ہی جل کر تحلیل ہو گیا کیونکہ کوئی حصہ نیچے گرتا نظر نہیں آیا

"وہ مارا"

"نعرۂ تکبیر"

"شاباش"

ہم لوگ خوشی سے دیوانے ہو کر چلاتے۔ جس کے منہ میں جو آیا نعرہ بن گیا دو ایک بنگالی بھی خوش ہوئے مگر زیادہ تر خاموش رہے کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

اس بزم میں مجھے نہیں نظمی حیلہ کہ

وہ سوچتے تھے کہ بزم اٹھے گی تو معلوم کیا رنگ کھل ہو۔ بساط بچھی رہے گی کہ الٹ جائے گی۔ ساقی بدمست ہو گا یا خاک بسر اس موقع پر معلوم اہل بزم کا کیا بنے گا۔ اس کی تحسین اس وقت کا بالہ نہ بن جائے اچھا کچھ خوشی اور مایوسی دونوں مصلحت کے غلاف میں چھپی رہیں۔

میں نے اس نوجوان افسر کی طرف دیکھا ہندوستانی ہوائی جہاز جلنے سے اس کا صدمہ صاف عیاں تھا۔ چھپانے کی کوشش میں اس نے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں لے کر لائٹر سے سلگانے لگا مگر ہاتھ اس بری طرح کانپ رہے تھے کہ سگریٹ شعلہ نہ پکڑ سکا۔

اس نے زور سے لائٹر بند کیا سگریٹ ہونٹوں سے باہر کھینچا اور پیٹھ موڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

بمباری جاری رہی۔ اگلے روز، اور اس سے اگلے روز حتیٰ کہ سات مارچ کو شکست کے آثار نظر آنے لگے

میں روزانہ دفتر جاتا، فائلوں کی آمد و رفت قریباً قریباً بند ہو چکی تھی۔ میں کبھی کمرے میں کرسی پر سر تھامے بیٹھا رہتا کبھی ریڈیو پر خبریں سنتا کبھی اس افسر کے کمرے سے ایئرپورٹ پر بمباری دیکھتا۔

اب ماحول میں تبدیلی کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ ماضی سے رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ حال میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور ایک بالکل مختلف مستقبل جھانک رہا تھا ایسے میں لوگوں کا ضبط خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ ان کے محتاط انداز چھوٹ گئے اور رائے کا اظہار برملا ہونے لگا اس لئے ہم دونوں کی گفتگو میں بھی حالات حاضرہ پھر سے موضوع ہونے لگے بغیر کسی شعوری ارادے کے باتوں کا دھارا اس طرف چلنے لگا جیسے ہوا کا رخ بدلنے سے پتوں کے ہلنے کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ اب اصولی بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ ہم قیاس آرائی کرتے تھے کہ کیا بنگلہ دیش آزاد رہے گا یا ہندوستان کا ایک صوبہ بن جائے گا ان دنوں وہ بہت فکرمند تھا

"اگر بنگلہ دیش پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا تو یہ بہت برا ہو گا۔ ہم ان کے دوست رہنا چاہتے ہیں مگر غلام نہیں بننا چاہتے . . ہم ہندوستان کی پناہ میں رہنے کو بھی برا نہیں سمجھتے مگر ان کی غلامی میں نہیں جانا چاہتے۔"

"پناہ اور غلامی میں تھوڑا ہی فرق ہے"۔ میں نے کہا

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، مگر خاموش رہا جیسے میرے ساتھ متفق ہو مگر اظہار کرنے سے گھبرا رہا ہو۔ پچھلے سات ماہ کے مسلسل اختلاف کے بعد اب اتفاق

کرنا خاصا مشکل تھا

تیرہ دسمبر کو سوموار تھا ہم لوگ گورنمنٹ ہاؤس میں تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ دفتر جانا سے ساڑھے سو روپے ٹیکسی میں ساڑھے دس روانہ ہوگیا باہر نکلتے ہی ہوائی حملے کا سائرن سا مگر دفتر پہنچنے تک کوئی ہوائی جہاز نہ آیا

سکرٹریٹ قریباً ویران تھا جیسے میدانِ جنگ کا ہو اور اداسی روحوں کی تلاش میں گھوم رہی ہو۔ کا پارک کسی گھنے سرکی طرح صاف اور چٹیل تھا سنسان شہر کی گلیوں کی طرح ساکت تھا۔ کئی سرکاری عمارات کی سیڑھیاں بھکاری کی طرح دامن پھیلائے پڑی تھیں نہ کوئی تیزی سے اترنے والا نہ کوئی اب کر چڑھنے والا مگر کبھی کبھی اوپر یا نیچے کی منزلوں سے پاؤں کی دھمک سنائی دے جاتی جس سے اندازہ ہوتا کہ عمارت میں اکا دکا لوگ گھوم رہے ہیں چوکیدار اور چپراسی بھی حال حال ہی تھے اس لئے زیادہ رکھے رہتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر بعد دو نوجوان افسر بھی آگئے کیونکہ اس کا کمرہ بھی بند تھا میری میز پر کوئی فائل نہ تھی اور فون کی گھنٹی خاموش تھی۔ علیک سلیک، دو ایک رسمی جملے اور پھر ہم خاموش بیٹھ گئے کبھی کبھی فضا میں توپوں کے دھماکے گرج اٹھتے یا ہوائی حملے کا سائرن گونجنے لگتا۔ اس سے خاموشی ٹوٹ جاتی مگر خاموشی کا احساس قائم رہتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آج امریکہ ریڈیو نے کہا ہے کہ ڈھاکہ کے قریب ہندوستانی چھاتہ بردار فوج کے اترنے سے صورت حال بہت بدل گئی ہے اور اب چند گھنٹوں میں ڈھاکہ کی جنگ شروع ہو جائے گی اور گلی کوچے میدانِ جنگ میں بدل جائیں گے۔ نہ معلوم جنگ کیا رخ اختیار کرے اور کن گھروں میں لڑائیاں ہوں گی۔ اُدھر سکیورٹی کونسل میں کل رات امریکی مندوب نے بہت سخت اور تیز تقریر کی اور ہندوستان کو مطعون کرتے ہوئے فرمایا کہ اس جنگ میں امریکہ براہ راست مداخلت کر سکتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ محکمہ تعمیرات کے سیکرٹری بول رہے تھے۔ عظیم پورہ کے گورنمنٹ کوارٹرز فوری طور پر فوج کو چاہئیں۔ وہاں کے مکینوں کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل دلوا دیں۔

میں نے وائس چانسلر سے رابطہ قائم کیا انہوں نے بتایا کہ تین ہوسٹلوں میں ہسپتال قائم ہو چکا ہے۔ چوتھے میں جگہ بنا دیتے ہیں۔

میں نے سوچا ڈھاکہ کی جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

گیارہ بج چکے تھے۔ ویرانی، خاموشی، بیکاری اور غیر یقینی صورت حال سے تنگ آ کر میں نے ریڈیو لگا دیا۔ ادھر ادھر سوئی گھمائی تو ریڈیو آسٹریلیا لگ پڑا۔ اناؤنسر نے بتایا کہ جیسور کا جو علاقہ پاکستان سے چھین لیا ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں "بنگلہ دیش" کے "صدر" نذر الاسلام اور "وزیر اعظم" تاج الدین نے ہندوستانی علاقے سے آ کر شرکت کی اور دھواں دھار تقریریں کیں جلسے کی کارروائی کا ریکارڈ پیش کیا جا رہا تھا

بلند بانگ تقریریں ہوئیں جن میں پاکستان شیطان تھا اور ہندوستان فرشتہ تھا۔ ظلمت کے دور کے اختتام کی خوشخبری تھی اور سنہری زمانے کی آمد کی نوید تھی بے تحاشا طعنے تھے، اونچے دعوے تھے، سانچ کو آنچ تھی اور دروغ کے پاؤں تھے۔

بیچ بیچ میں نعرے گونجتے تھے فلک شگاف اور پرجوش نعرے۔

مجیب الرحمٰن زندہ باد

اندرا گاندھی زندہ باد

اندرا مجیب بھائی بھائی

کوسیجن مجیب بھائی بھائی

نعروں کی گونج گرج یوں لہر در لہر اٹھتی تھی جیسے حد نظر تک پھیلا ہوا بیکراں سمندر ہو۔ یہ گونج ایک تاریخی تعبیر کی مانند ابھر رہی تھی۔ وقت کے کنار میں یہ فاتح کی للکار تھی جسے دو افراد ایک اداس اور ویران کمرے میں طربیہ کی علامتیں سن کر ریڈیو پر سن رہے تھے اور کمرے کی اداسی اور ویرانی ان دو شخصیتوں کے تضاد سے اور بھی پریشان تھے۔

گزشتہ سات ماہ سے ہم دونوں نظریاتی حریف بیکس مروت شریک تھے ہمارے دل کڑوے تھے مگر نگاہیں میٹھی تھیں۔ زبانوں میں کاٹ تھی مگر لحاظ تھا۔ ہماری مخالفت پر وضع داری کا پردہ تھا اور حفظ مراتب کی روک تھی۔

مگر ریڈیو سے ابھرنے والے نعروں نے گویا سب پردے چھڑ جھڑ پھاڑ دیئے۔ ہم دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے کسی تیسرے نے ہمیں ایک دم کر دیا ہو اور ہماری نظریں ملنے کی ہمت نہ ہو۔ حقائق مخفی ہوں تو نے صبر، مستور ہوں تو قابل برداشت مگر مشہود ہوں تو بعض اوقات ناقابل برداشت بن جاتے ہیں۔ یہ نعرے ایسی ہی سفاک حقیقت تھے جس کے بے رحم تاثر نے ہم دونوں کا حریفانہ روپ ایک دم آشکارا کر دیا تھا

یہ نعرے پاکستانی فوجوں کی پسپائی کے بعد پاکستانی علاقے میں پاکستان کے خلاف بلند کئے جا رہے تھے اور پاکستان کے ساتھ سہری لگا رہے تھے۔

یہ نعرے اُس کے لئے امرت اور میرے لئے زہر تھے۔

یہ نعرے سات ماہ کی اصولی بحثوں کے بعد اُس کی جیت اور میری ہار کا اعلان تھے۔

اُس کا سینہ فخر سے ابھر رہا تھا اور میرا سر ڈوب رہا تھا۔

اس کا وطن نمودار ہو رہا تھا اور میرا وطن دور سرک رہا تھا۔

ایک ہی قسم کے نعروں کے دو متضاد اثرات سخت تکلیف دہ تھے حفظ مراتب چور چور ہو گیا، وضعداری تار تار ہو گئی، مروت شرمانے لگی اور نظروں میں اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ تھوڑی دیر تو ہم اس کیفیت کی بھرپور گرفت میں بیٹھے رہے۔ پھر اس نے ہمت کر کے ٹرانزسٹر کی سوئی گھما ڈالی۔

ڈھاکہ ریڈیو سے اعلان ہو رہا تھا کہ دو بجے غیر معینہ عرصے کے لئے کرفیو لگ جائے گا۔

ہم دونوں نے ابھی ابھی گھڑیاں دیکھیں —— ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"اوہ!" وہ گھبرا کر بولا "میری گاڑی تو اڑھائی بجے آئے گی۔"

"گھبراؤ نہیں میرے پاس گاڑی ہے۔"

وہ بازار بھی جانا چاہتا تھا تاکہ کچھ چیزیں خرید سکے۔

ہم دونوں بازار پہنچے تو ایک بھگدڑ سی مچی تھی۔ لوگ بھاگم بھاگ گھروں کو جا رہے تھے دکانداروں کے پاس گاہکوں کا ہجوم تھا کیونکہ لوگ کرفیو کے دوران کے لئے خریداری کرنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود دکاندار آہستہ آہستہ دکانیں بڑھا رہے تھے

وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی مگر مجھے ہر چہرہ اداس لگتی تھی۔ شاید یہ میری ذہنی حالت کا نتیجہ تھا۔ مگر وہ بھی خاموش تھا اور جب میں نے اسے گھر کے سامنے اتارا تو مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "سر پتہ نہیں اب کہاں اور کس حالت میں ملاقات ہو گی لیکن اگر —— کسی وقت میری ضرورت ہو —— تو بلا تکلف یاد فرمایئے گا۔"

اور پھر وہ تیزی سے مڑ کر گھر میں داخل ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ ہم کو ابھی تک سیکورٹی کونسل سے امیدیں ہیں کہ شاید جنگ بندی ہو جائے، مگر اسے خوب اندازہ ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب ڈھاکہ میں پاکستان کوئی دم کا مہمان ہے اس کے بعد اسے میری حیثیت کا بھی اندازہ ہے اور ابھی کا بھی

میں جب گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا تو کرفیو شروع ہو چکا تھا۔

رات ڈیڑھ بجے پتہ چلا کہ ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ سے بیس میل دور ہیں اور ان کے ساتھ مکتی باہنی کے بیس ہزار رضاکار بھی شامل ہیں۔ اسی وقت اسلام آباد اور کراچی سے رابطہ قائم ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ کل گورنمنٹ ہاؤس خالی کر دیا جائے اور سب لوگ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ریڈ کراس کی پناہ میں منتقل ہو جائیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح پتہ چلا کہ روس نے سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی کا ریزولیوشن ویٹو (VETO) کر دیا ہے۔

اب ڈھاکہ کی جنگ ناگزیر تھی اور کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی، بلکہ شہر پر ایک دو ہوائی حملے تو بھی ہو چکے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے ائیر پورٹ اور انڈسٹریل ایریا پر ہوتے رہے تھے۔

ہم اپنا بچا کھچا سامان باندھ رہے تھے۔

مجھے کسی نے کہا کہ میرا فون آیا ہے۔

"ہیلو"

وہی نوجوان افسر بول رہا تھا۔

"سر، مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ہوٹل میں جا رہے ہیں؟"

"ہاں یہی فیصلہ ہوا ہے۔"

"سر، یہ بہت اچھا فیصلہ ہے —— میں نے یاد دلایا تھا کہ اگر کوئی بھی خطرہ ہو تو مجھے نہ بھولئے گا"

یہ میرا حریف بول رہا تھا جو اب جنگ جیت چکا تھا۔

میرے ہار شکست تھی میرے اب رکیت تھی۔ میرے اور موت کے سائے تھے ایسے میں ہمدردی کے دو بول اتنے اچھے لگے کہ اندیشے چھپے۔

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مگر اندیشے خود ہی شرمندہ ہو گئے اور پگھل کر گہرے تاریکی ڈوب گئے جو اس کی ہمدردی نے پیدا کیا تھا فون بند کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ دو نسلوں کی محبت مر گئی مگر انسانیت بچ گئی۔ شاید یہی انسانیت صبح کے بھولے ہوئے کو شام تک گھر واپس لے آئے۔

مگر ہوائی حملے کے سائرن نے چیخ کر پوچھا کون سا گھر؟ —— گھر تو ٹوٹ رہا تھا نئی نسل اپنا گھر الگ بسا رہی ہے ایسا گھر جسے انہوں نے برق سے روشن کیا ہے —— خدا خیر کرے

ٹیلیفون کی ملاقات کے بعد یہ ہمارا آخری رابطہ تھا۔ اس کے بعد وہ نئے ملک کے رواق میں گم ہو گیا اور میں زنداں کی گمنامی میں کھو گیا۔ ایک دفتر کے شریک کار دو مختلف ملکوں کی بین الاقوامی سرحد کی اوٹ میں ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔

زنداں میں خیال کی بیاباں نوردی عروج پر ہوتی تو ماضی کے گوشوں میں دور تک بھٹکتی پھر جاتی کسی گوشے میں اس نوجوان افسر کا چہرہ ابھرتا تو میں سوچتا کہ اسی طرح کی بھٹکی ہوئی نئی نسل صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں ہے بلکہ اس کی کافی بڑی تعداد مغربی پاکستان میں بھی ہے مختلف صوبوں میں ملازمت کے

دوران کئی مگر میری ان سے مڈبھیڑ ہوئی تھی مگر اس وقت میں اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے پیچھے ہوئے قدم انہیں ہم سے کتنی دور لے جاسکتے ہیں اس میں دیکھ چکا تھا کہ بابائی تلخیاں جیتے کر مارجینگ س جاتی ہیں اور دینی فاصلوں کے درمیان رفتہ رفتہ ملکی سرحدیں اُگ آتی ہیں وہ نوجوان اس بنگلہ دیش کے طلوع کی کہانی کا عنوان تھا اور مجھے ایسے ہی عنوانات مغربی پاکستان کے در و دیوار پر چپکے نظر آتے تو میں بے کل ہو کر سوچنے لگتا کہ کیا یہی کہانی وہاں بھی دہرائی جائے گی۔

اس کہانی کا ماحصل یہ تھا کہ نظریاتی مملکت ہمارے نظریئے سے انحراف کرنا ایسا جرم ہے جو پوری نسل کے زمرے میں آتا ہے

## بقیہ : انگریزی درسگاہوں کا زہر

پڑھا دیا جائے اور اسلامی؟ ۔ سچ کر صرف ہی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جانے تو رہا بات ہماری افواج کے حق میں بہرحال سوال سمجھ میں نہیں آتا کہ افواج یا سول کے لیے انگریزی میڈیم اور مغربی تہذیب کی کیا ضرورت ہے ایک اُستاد نے بتایا طلبہ کے لیے GOOD MORNING کی جگہ السلام علیکم کہنے کی اجازت پر کوئی ڈیڑھ برس تک کوشش کرنی پڑی حکام کو اعتراض تھا کہ فوج میں GOOD MORNING اور GOOD EVENING کہتے ہیں، اس لیے سکول میں بھی بچوں کو یہی الفاظ استعمال کرنے چاہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی ایک مخصوص طبقہ دوسروں کی نسبت فائدے میں رہتا ہے صرف قابلیت کی بنا پر بچوں کا انتخاب کر کے انہیں بلا معاوضہ تعلیم دی جائے، تو پھر متوسط اور غریب طبقے کے بچے بھی ان اداروں میں تعلیم حاصل کرسکیں گے

غیر سرکاری پبلک سکولوں میں مغربی تہذیب، بے تحاشا اخراجات اور صرف ایک مخصوص طبقے کے بچوں کا داخلہ غور طلب مسائل ہیں

سب سے آخر میں ان عام انگلش میڈیم سکولوں کو لیجیے جو آپ کو ہر محلے میں نظر آتے ہیں۔ اُردو میڈیم سکولوں میں فیس سرکاری شرح کے مطابق رکھی پڑتی ہیں، لیکن انگلش میڈیم سکول

مگر تعلیم کے نزدیک خاص قسم کے ادارے SPECIAL TYPE OF INSTITUTION کی حیثیت رکھتے ہیں انہیں حسب خواہش فیس لینے کی آزادی ہے دوسری طرف عوام بھی انگریزی میڈیم سکولوں میں بچوں کو پڑھانا پسند کرتے ہیں ان حالات کے پیش نظر کاروباری لوگوں نے جا بجا نام نہاد انگریزی سکول کھول رکھے ہیں اس قسم کے دس سکولوں کا جائزہ لینے سے پتا چلا کہ ان میں سے صرف پانچ رجسٹرڈ ہیں فیسوں کی شرح دس روپے سے پچیس روپے تک ہے یہ تمام سکول کنڈرگارٹن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ ان میں سے کم منتظمین کو کنڈرگارٹن طریقہ تعلیم کے معنی معلوم ہیں

عام سکولوں کا معیار کیونکر بلند کیا جائے؟ انگریزی سکولوں کو کس طرح ملک و قوم کے لیے مفید بنایا جائے؟ وہ کون سے طریقے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ معیاری سکول کھولے جاسکتے ہیں؟ مثالی سکول کھولنے میں درد دل رکھنے والوں نے کیا کوششیں کیں اور وہ کہاں تک کامیاب رہے؟ اس موضوع پر ہم تجربہ کار ماہرین تعلیم سے رابطہ پیدا کر رہے ہیں، آئندہ کسی نشست میں ہم اس موضوع پر اپنے قارئین کے لیے جامع، مستند اور مفید معلومات پیش کریں گے

## موجودہ نظامِ تعلیم "آئیڈیل" دلوانے میں کس قدر کامیاب؟

معاوضت ایک طرف رہی یہ تو "سیلپر" بھی نہیں (راحہ منور۔ تعلیم و تحقیق)

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (سلیم حیتانی۔ اردو الوحی)

میں اس نظامِ تعلیم سے مطمئن نہیں تو پھر "آئیڈیل" کیسے؟ (نشاط بیگ فارمیسی)

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (رئیس شاہد۔ سوشیالوجی)

نامکمل عدم اطمینان بخش ہوسکے سب "خواب نگر" ہے (صالحہ سلیمان صحافت)

مگر تو اہل مدرسے کاٹ دیا اور "آئیڈیل" ڈگریوں سے (طارق رحمٰن ارضیات)

اگر اس سے مراد سیں ہیں تو جواب نفی (عتیق السار باٹنی)

آئیڈیل تو کجا "۱۰۰" سنا دے خوش قسمتی (اشفاق مہر فارمیسی)

ہیں جی کیا کہا "صرف در کر" کرتا ہے (الیاس احمد۔ زوالوجی)

آئیڈیل کے لیے تو نہیں البتہ دال روٹی چلانے میں مدد دے ہی دیتا ہے۔ (شگفتہ ملک۔ فارمیسی)

ہرگز ناکام ہے (سلمیٰ رشید، زوالوجی)

بلکہ چھینتا ہے (نوازکھوکھر۔ سوشل ورک)

قطعاً نہیں (ظہیر بابر۔ کیمیکل ٹیک)

ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا (ذوالفقار چیمہ۔ لاء کالج)

یہاں تعلیم اور آئیڈیل کا چینل خراب ہے (مہر عبدالغفار۔ عربی)

آئیڈیل بھی تو خوابی رہنا ہے جس کا اعتبار نہیں (مسعود احمد۔ لاء کالج)

کیوں دل جلانے کی بات کرتے ہو (یاسمین حمید فلسفہ)

خوشی سے مر جاتے اگر اعتبار ہوتا (حمزہ۔ عربی)

آئیڈیل کانچ جیسا نازک، نظام پتھر جیسا سخت (راجہ شفقت۔ فلسفہ)

یہ خود حاصل کیا جاتا ہے مانگا نہیں جاتا (مقصود احمد۔ ہیلی کالج)

جناب! آئیڈیل عقیدے کی پختگی کے ذریعے ملتا ہے (ماجد عرفان۔ ہیلی کالج)

میجر سعید ٹوانہ

**ہم کہاں کھڑے ہیں**

# عسکری تربیت گاہیں

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

## کامیاب جنگی طاقت

نیا فوجی نصاب بنانے سے پہلے تو اس میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا ہمیں "جنگی طاقت" درکار ہے یا "کامیاب جنگی طاقت" میں قطر کی فوج میں تھا تو ایک دن کمانڈر نے پوچھا آپ کا اس فوج کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے جواب دیا میں اس کو فوج نہیں کہوں گا یہ تو صرف پولیس کی مدد کرنے کا فوجی دستہ ہے" وہ پریشان ہو گئے۔ تو میں نے کہا کیا آپ ایسے ہمسایوں سے جنگ لڑ سکتے ہیں سعودی عرب، ایران، ابوظبی آپ کے ہمسائے ہیں کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ ان سے لڑ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو یہ "جنگی طاقت" نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج کے پاس "جنگی طاقت" موجود تھی۔ مگر "کامیاب جنگی طاقت" نہ تھی۔ ۱۹۶۵ء میں گو ہندوستان کی "جنگی طاقت" ہم سے کئی گنا تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ ویت نام میں امریکہ کے پاس "جنگی طاقت" تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی برخلاف اس کے ویت نام کے پاس "جنگی طاقت" امریکہ کے معیار کی نہ تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت ہوئی۔ ہٹلر کے پاس "جنگی طاقت" تھی مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ عرب اسرائیل جنگوں میں ہمیشہ عربوں کے پاس زیادہ "جنگی طاقت" تھی مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ ماؤزے تنگ کے پاس جنگی طاقت (بمقابلہ چیانگ کائی شیک) بہت کم تھی اگرچہ کم تھی وہ "کامیاب جنگی طاقت" تھی ہمیں "جنگی طاقت" درکار نہیں ہے، بس صرف "کامیاب جنگی طاقت" درکار ہے۔

اس لیے کسی فوج کے پاس اسلحہ ہو اور اسلحہ کی سکھلائی ہو، تو وہ فوج نہیں بن جاتی جب تک کہ اس کی "جنگی طاقت" متحارب فریق سے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو جائے ہر ملک کو اپنے ہمسایوں کے حساب سے اپنی جنگی طاقت استوار کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ ملک ہمسایہ کے مقابلہ میں "جنگی طاقت" میدان میں نہیں لا سکتا تو اسے معاہدات اور دوسرے ڈپلومیسی کے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔

## پاکستان کے دشمن ممالک

پاکستان کے ہمسایہ ممالک تین قسم کے ہیں کمیونسٹ ہمسایہ ممالک یعنی چین اور روس اسلامی ہمسایہ ممالک یعنی افغانستان اور ایران اور ہندو ہمسایہ ملک ہندوستان، فرض کیجیے سرکاری سطح پر اگر پاکستان میں کمیونزم ہو، تو اس کا ٹکراؤ تین طرح کا ہوگا اوّلاً چین کا حامی بن کر روس کے خلاف یا روس کا اتحادی بن کر چین کے خلاف دوم ہندوستان اگر کمیونسٹ ہو رہا ہے، تو اس کے ساتھ دوستی ورنہ معاندانہ۔ سوم مسلم ممالک سے ٹکراؤ بالخصوص ایران کے ساتھ یہ تو وہ صورت ہے جب پاکستان خدانخواستہ کمیونسٹ ہو جائے۔ اگر پاکستان اسلامی مملکت رہتا ہے، تو اس کے ٹکراؤ دو قسم کے ہیں اوّلاً ہندوستان کے ساتھ کہ وہ ہندو کی ریاست ہے۔ دوم کمیونسٹ ممالک کے ساتھ اگر افغانستان اور ایران اسلامی تشخص رکھتا ہے، تو ان کی طرف سے خطرہ نہیں اگر تشخص کسی سپر پاور کا رہین منت ہے، تو اس سپر پاور سے بالواسطہ ٹکراؤ ہمارا مسئلہ واضح ہوگا ——— اس لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ پاکستان کو اسلامی ریاست رہنا ہے اور ہمارا فوجی نصاب "ایک اسلامی ریاست کے ٹکراؤ" کی بنیاد پر مرتب کرنا ہوگا اور افواج کی جنگی کارکردگی اسلامی نصب العین کی رو سے مرتب کرنا ہوگی، یعنی ہندوستان اور کمیونسٹ ممالک کے خلاف کامیابی جنگی طاقت کے اصول پر افواج استوار کرنی ہوگی

## جدید جنگی سٹائل اور پاکستان

اس کے بعد ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے وہ ہے جنگی سٹائل کا مسئلہ فی زمانہ ہر فوج کے پاس ٹینک ہیں۔ ہوائی جہاز ہیں۔ مشین گنیں ہیں راکٹ ہیں۔ سادہ اور توپخانہ

مگر ہر ایک فوج کا جنگی سٹائل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر جرمن جنگی سٹائل، روسی جنگی سٹائل، اسرائیلی جنگی سٹائل، امریکی جنگی سٹائل، چینی جنگی سٹائل وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً جرمنی کا جنگی سٹائل ایک مختصر فوج کا تھا جو آناً فاناً اسلوحی ورن بدل کر دیتے سے تعداد میں زیادہ اور کمزور دشمن پر حاوی آ جاتی تھی۔ اس سٹائل کی رو سے اس کا ٹینک ہلکا ہوتا تھا اور دور مار توپ کی جائے نسبتاً چھوٹی توپ ہوتی تھی وہ ٹینک زیادہ سے زیادہ تیز رفتار تھا اور اس کی CRUISING RANGE دور مار صلاحیت نسبتاً زیادہ تھی۔ اس ٹینک کے ساتھ مختصر مگر ہوائی فوج تھی جو ٹینک کی رفتار کے ساتھ چل سکتی تھی۔ اس فوج کی جو ٹینک کے ارد گرد استوار تھی عسکری صلاحیت اس کے ورن گھٹانے بڑھانے کی صلاحیت کی رہین منت تھی۔ اس فوج وسیع محاذ پر دشمن کو الجھا کر لاک کر دیتی تھی۔ پھر اسا عسکری ورن کسی ایک جگہ اچانک بڑھا کر حملہ کر کے دشمن کی دفاعی لائن میں شگاف ڈال دیتی ہے اور اس شگاف سے پوری فوج نکل کر دشمن کے عقب میں گھس کے عقب۔ سیڈ کوارٹرز سپلائی لائن پر حملہ کر دیتی تھی جس سے بھاری نقصان ہوتا اور سست الوجود دشمن بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ اگر ہمیں مکمل میکانکی صلاحیت جیسی جرمنی کی تھی یعنی سندھ کے ریگستان میں میسر آ جائے۔ تو اس فوج کی نگرانی اور معاونت کے لیے اچھی اور بھرپور مار کی صلاحیت رکھنے والی ہوائی فوج درکار ہو گی اور ایسی صلاحیت کی مدد سے ہم سندھ کا صرف دفاع کر سکیں گے بلکہ سندھ کے محاذ سے نکل کر دشمن کے عقب، گہرے عقب اور علاقہ یعنی پنجاب کے محاذ کے عقب میں اہم فوجی کارروائیوں کی صلاحیت رکھیں گے۔ جہاں تک سندھ کے محاذ پر ہمارا جنگی سٹائل جرمن ہو جانے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ اس محاذ کی فوج ٹینک کے ارد گرد تشکیل کی جائے اور اس ٹینک کے ہمراہ مختصر سی انفنٹری ہو اور اس زمینی فوج کی نگرانی اور حفاظت کے لیے ایک خصوصی ہوائی فوج ہو جو ریگستان میں دشمن کے ٹینک اور توپ خانہ اڑانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جیسا کہ سندھ کے محاذ میں فوج کی ترتیب پنجاب اور کشمیر سے مختلف ہونی چاہیے اسلحہ مختلف ہو گا، جنگی منصوبے مختلف ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

دوسری جنگِ عظیم کے روس کا جنگی سٹائل پیدل فوج کے ارد گرد تشکیل دیا گیا تھا گو ۱۹۴۳ء میں روسی افواج تدریجاً ٹینک کے ارد گرد منظم ہونے لگیں۔ اس میں پیدل انفنٹری کو میدان جنگ میں تقویت دینے کے لیے ٹینک، توپخانہ، انجینئرز، ہوائی فوج وغیرہ تھی۔ دفاع میں روسی فوج کی بڑی مہارت تھی۔ روسی محاذ میں سردیوں میں چونکہ دلدل وغیرہ نہ ہوتی تھی اور جرمن ٹینک افواج وسیع محاذ پر متحرک صلاحیت حاصل کر لیتی تھیں اس لیے انہیں روکنے کے لیے سہ در سہ دفاعی لائنیں بنانے کا کام شروع ہوتا تھا اور جس میں پوری روسی قوم مرد و زن اور بچے سب کھدائی کرتے تھے اور روسی افواج ان دفاعی لائنوں کی آڑ میں ٹینکوں کی متحرک صلاحیت کو کمزور (صرف سامنے سے حملہ آور) کر کے قلعہ بند فوج کا دفاعی رد عمل اختیار کرتی تھیں یعنی دشمن کے حملہ کو روکنا، تھکانا پھر اس پر جوابی حملہ شروع کرنا۔ روس میں بہار، خزاں اور گرمیوں میں دلدل کی وجہ سے ٹینک کی متحرک صلاحیت ختم ہو جاتی تھی اس لیے روسی انفنٹری توپ خانہ کی مدد سے دشمن کے ٹینکوں کو روک سکتی تھی اس لیے بات کو جرمن مشینیں کہ روسی انفنٹری کے عقب میں گھس جاتے اور جنہیں ٹینکوں کی مدد سے بھگایا جاتا۔

اب صاف ظاہر ہے کہ ہم سندھ کے ریگستانوں میں روسی سٹائل نہیں اپنا سکتے۔ ہندوستان نے اپریل، مئی ۱۹۶۵ء میں رن کچھ کے ویرانوں میں ایسی پیدل فوج کو بغیر دفاعی لائنوں کے بغیر پورے سلسل دفاع میں لگا دیا۔ نتیجتاً ہمارے ٹینک افواج کے عسکری ورن کو بدل بدل کر حملے کیے اور ان کے دفاع کو روند دیا۔ لعنیہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیلی مختصر فوج جو جرمن سٹائل پر استوار کی گئی تھی۔ نے مصری انفنٹری کے پورے سلسل دفاع کو عسکری ورن بدل بدل کر الٹا دیا۔ گو مصر نے ایک مثالی فوج کو چار جگہ پورے سلسل میں لگایا تھا، لو اسرائیلیوں نے ایک ٹینک بریگیڈ سے پے در پے چار حملوں میں اس مثالی کو روند دیا یعنی ۱:۱۳ کی عسکری کثافت (ملک کس کس ۱:۸۰۰ کی عسکری کثافت) سے دشمن پر حاوی ہوتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے محاذ پر پیدل فوج کو تقویت دیتے ہوئے دفاعی لائنیں بنا کر دفاع کرنا ہو گا اور اسی طرح اسی پیدل فوج کو ہوائی جہاز، ٹینک، توپخانہ، مارٹر وغیرہ کی تقویت دے سکتے ہیں۔

اس لیے ہمارا مسئلہ پنجاب میں یہ ہو گا کہ سرحدی دریاؤں کو صحیح طریقہ سے دفاعی لائن میں تبدیل کیا جائے اور ان کی اثر مرتب کی جائے پھر وسیع محاذ پر آناً فاناً اپنی عسکری کثافت بڑھا کے دشمن کے حملوں کو پسپا کرنے کی صلاحیت حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی سپاہ کی ٹریننگ، اسلحہ اور نصاب لحاظ سندھ مختلف ہو گا۔ یہاں دفاع اہم ہے جب کہ سندھ میں حملہ یا جوابی حملہ یہاں دفاع اور اس کی بنیاد سندھ کی تربیت ہو گی جب کہ سندھ میں حملہ اور ہوائی حملہ اور حملہ در حملہ کی جنگی ٹریننگ حاصل کرنی ہو گی۔ یہاں (یعنی پنجاب میں) قلیل علاقہ دے کر جوابی حملہ کی پوزیشن حاصل کرنی ہو گی جب کہ ریگستان کے محاذ پر کثیر علاقہ دے کر جوابی حملہ کی پوزیشن حاصل کرنی ہو گی۔ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے سندھ، پنجاب، آزاد کشمیر وغیرہ میں مختلف جنگی سٹائل اپنانے ہوں گے۔

آزاد کشمیر کا جنگی سٹائل سنائپر وار کا ہونا چاہیے تاکہ وسیع محاذ پر پھیلے ہوئے سنائپرز (SNIPERS) دشمن کو الجھائے رکھیں۔ اگر دشمن بڑھے تو یہ پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر دشمن منتشر ہو کر بڑھے تو ہم اپنی قوت مرکوز کر کے اپنی فیصلہ کن طاقت کسی ایک مقام پر مرکوز کر کے دشمن کو دو یا تین جگہوں سے کاٹ دیں اور اس کے گہرے عقب میں فوجی کارروائی کا آغاز ہو۔ اگر دشمن مرکوز ہو کر بڑھے تو اس کو کسی جگہ لا کر شکست دی جائے۔ دوسرا اس کے علاوہ یہ ہے کہ گوریلے عقب میں جا کر اس کی سپلائی لائن توڑ کر دفاع احیاء کیا جائے تاکہ وہ مجبوراً پیچھے ہٹے اور اس طرح ہر قدم سے دو چار ہو جائے۔ پہاڑی علاقوں میں افواج کی سپلائی مشکل کام ہے اس لیے خود ہمیں اپنی فوج مختصر رکھنی چاہیے اور دشمن کی کثیر فوج کی سپلائی لائن توڑ کر اس کو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے دیا جائے۔ پھر ہم اگر کشمیر میں پوری فوجی قوت جھونک دیں گے تو نہ کشمیر لے سکیں گے نہ پاکستان بچا سکیں گے بالخصوص پنجاب نہیں بچا سکیں گے۔ کشمیر لینے کا راستہ یہ ہے کہ جنگ میں دشمن کی پوری افواج کو فیصلہ کن شکست دی جائے۔ کشمیر پر ہی صرف چڑھائی نہ کی جائے۔

## نعرۂ تکبیر بمقابلہ نعرۂ تکبیر

اب ہمارا اسلامی تشخص ہے تو افغانستان کو ہم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر بالفرض اگر افغانستان روس کی شہ پر ہم سے الجھتا ہے تو اس پاکستانی فوج کا جنگی سٹائل کیا ہو گا؟ یہ دیکھنا چاہیے کہ افغانستان کی مشرقی علاقہ کی پٹی میں آباد ہے جو پہاڑی ہے۔ ۹۰ فیصد علاقہ غیر آباد ہے اور افغانستان کی ۹۰ فیصد فوج مشرقی پٹی میں ہے اور اس مشرقی (... ERN BELT)

13 ... [illegible]

میں دشمن کی عسکری کثافت جنگ کے وقت ہم سے زیادہ ہوگی۔ اس لیے ہمیں جنگ سے پہلے افغانستان کے غیر آباد ۹۰ فی صد غیر آباد علاقہ پر لڑنی ہے۔ بلکہ افغانستان کی افواج ... کو فارغ کریں گے مستقبل کا اس سے بہت زیادہ متحرک صلاحیت درکار ہے جو ہم پیدا کریں جو افغانستان سے خود اس کے ملک کے اندر حملہ پسپا کر سکیں۔ افغانستان سے مقابلہ میں دفاعی مدد ہمارے لیے سراسر خودکشی کے مترادف ہوگا اور اگر ہم اتنی متحرک صلاحیت پیدا کریں تو یقیناً افغانستان ہم سے دفاعی معاہدہ کرے گا کہ جنگ ... ہم کبھی افغانستان کے دماغ میں یہ خیال ڈالنے کو کہیں گے۔ سب سے نزدیک افغانستان سے جنگ کا کوئی جواز نہیں۔ اگر چھوٹا بھائی غلطی بھی کرے، تو ہمیں بڑے بھائی اور بڑے بھائی کے ... سے حل لینا چاہیے۔ مگر جیسے ہی ... کہ حملہ اگر کوئی مسلم ہمسایہ ممالک کسی سپر پاور کی شہ پر ہم سے فوجی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو بعد ازاں ... اس میں کاسا جنگی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ مگر میں کسی قومی ... مسلم ملک کے خلاف ہو، ... حق میں نہیں اور پوری پاک فوج کا یہی ذہن ہے۔ نعرہ تکبیر نعرۂ تکبیر سے ہمیں لڑ سکا۔ یہاں سے ہماری فوجی جبلت کا کوئی جواز نہیں اور ہری ایران سے جنگ ممکن ہے کیونکہ اگر کوئی جنگ لڑنا ہی پڑ جائے تو دو سو میل ریگستانی سرحدی علاقہ سے فائدہ اٹھا کر پیچھے ہٹ سکتا ہے اور جب چاہے بڑھ کر قبضہ کر سکتا ہے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ ایران حملہ ... ہم جنوب مشرقی بلوچستان سے افواج پیچھے سے آگے نہیں ... ایران کو قبضہ رکھنے کے خاطر وہاں افواج رکھنی پڑجائیں گی تاکہ سپلائی لائن کی طوالت کی وجہ سے افواج کو اس ویران علاقے میں دکھا سکائے ... جنگ سے بالآخر موقع مل جائے گا کہ طوفانی طاقت سے بڑھ کر دشمن کو تتر بتر کر دیں۔ دراصل ایران اور پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن یہ ہے کہ پاکستان ایران کی ایک طرح کی فرسٹ ڈیفنس لائن ہے۔ ایران کے دماغ کا پہلا علاقہ پاکستان ہے۔ ایران سمجھتا ہے کہ پاکستان کے ختم ہوتے ہی ... ہندوستان کی افواج اور اس کے دروازوں پر دستک دے رہی ہوگی۔ اس لیے ایران ہمیشہ پاکستان کی جنگ میں مدد کرے گا۔ اس لیے حریف نہیں حلیف ہے۔ ایران کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح وقت پڑنے پر ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

# پاکستان کا جنگی سٹائل

اب ہم نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان کا جنگی سٹائل سندھ میں کچھ ہوگا، پنجاب میں کچھ اور کشمیر میں بالکل اور مغربی محاذ یعنی افغانستان کے خلاف بالکل دوسری قسم کی افواج درکار ہوں گی اور ایران سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کبھی ایران دھوکا دے گا تو خود پریشان ہوگا۔ ایران خود ہی معاملہ کو کس طرح سنبھال سکتا ہے؟ ایران سے جنگ پاکستان کی افواج کی نہیں ہوگی کم از کم ایران اسلامی ہمسایہ ہے جس کے خلاف جنگی تیاری کی ضرورت نہیں (ابھی ایران میں کمیونزم کا خطرہ نہیں) اس لیے دیکھے کہ ہمارا مرکزی محاذ ہندوستان کے خلاف ہے۔ مسلم پاکستان کو اصل خطرہ ہندوستان کی جانب سے ہے اور ہمیں سندھ، پنجاب اور کشمیر میں محاذوں پر مختلف سٹائل کی جنگی قوت درکار ہوگی۔ اس لیے ہر سٹائل کی جنگی قوت کا رخ صاف مختلف ہوگا اسلحہ مختلف ہوگا، ٹریننگ مختلف ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

اب یہاں ہماری دشواریاں ہمارا راستہ روک لیتی ہیں اور ان دشواریوں کو حل کیے بغیر ہم دفاعی لحاظ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

- پہلی دشواری یہ ہے کہ ان وسیع محاذوں پر عسکری لحاظ سے متحرک کرنے کے لیے ہماری افواج بہت کم ہیں۔ اس لیے کوئی فوج یعنی پوری قوم کی عسکری تربیت کرنے کی ضرورت ہے
- دوسری دشواری یہ ہے کہ ہمارا بیشتر اسلحہ ۱۹۷۰ء کا امریکن قسم کا ہے اور بوسیدہ ہے۔ چینی اسلحہ کی ... سکتی ہے نہ کوئی اس کے "سپیئر پارٹ" فراہم کرتا ہے۔ پوری افواج کو از سر نو مسلح کرنے کی ضرورت ہے

پہلی دشواری کی نشاندہی اس طرح ہوتی ہے کہ اگر تمام محاذوں پر بیک وقت ہماری جنگ ہو جائے، تو ہم ان کو مشترکہ ... سپاہی اور ہر ٹینک اور ہر توپ میدان میں لا کھڑا کریں۔ عسکری کثافت ... ہے ... اس لیے ہمیں تمام محاذوں پر بیک وقت افواج منتشر کرنے کے بجائے فیصلہ کن معرکوں سے دشمن کو شکست دے کر اپنا دفاع کرنا ہے۔ چنانچہ ہماری قلیل عسکری کثافت ہمیں ایسی جنگی سٹائل اپنانے پر مجبور کرتی ہے یعنی وسیع محاذ پر افواج منتشر کرنے کے بجائے منتخب محاذ پر افواج مرکوز کرنا۔ وسیع محاذ پر دفاع کی بجائے مخصوص مقامات کا دفاع کرنا۔ مختلف اطراف سے بڑھتی ہوئی افواج کو روکنے کی بجائے ایک منتخب طرف کی دشمن کی فوج کو ... کر شکست دے دینا یعنی دفاع بذریعہ حملہ بعد حملہ کا جامہ یہ ہو کہ جلد از جلد دشمن سے نپٹ کر وہ رخ موڑ جائیں تاکہ دوسرے دشمن کی طرف توجہ دے سکیں۔ اس کو ہم انگریزی میں دفاع بذریعہ فیصلہ کن معرکہ جات کہیں گے۔ اس طرح جنگ کا فوجی نصاب بالکل مختلف ہوگا۔ چین کا جنگی سٹائل ماؤزے تنگ فکر کا نتیجہ ہے اور ماؤزے تنگ نے جس قسم کی جنگوں کے لیے ایسا فکر مرتب کیا تھا۔ پہلا مثلاً روس ہمارے ملک پر قبضہ کرلے، تو کیا کرنا چاہیے۔ تو کرنا یہ چاہیے کہ اس کو بڑھ کر قبضہ کر لینے دو۔ افواج کو دور دراز ... اگر مسلح رہنے کا حکم دو۔ شہروں، گلیوں میں ... ) کو تنگ کرو۔ ستاؤ اور لڑاؤ۔ دشمن بڑھے تو ہٹ جاؤ۔ دن کو اسے اپنا کام کرنے دو۔ رات کو ہتھیار نکال کر اس کے مورچوں پر حملہ کرو اس کی سپلائی لائن توڑ دو۔ اس کو (FABIAN TACTICS) کہتے ہیں جسے روم کے جرنل فیبیئس نے ہینی بال کو پریشان کیے رکھا۔ آج کل انگلینڈ اور یورپ بھی ایسی خطوط پر سوچ رہے ہیں کہ اگر روس یورپ پر حملہ کرے، تو ہم کیا کریں۔ اب نیٹو کو وہ لوگ ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ روس کے پاس تقریباً ۱۸۰ سے ۲۵۰ ڈویژن فوج ہے اور امریکہ کی صرف ۲۰ ڈویژن فوج متوقع ہے اور وہ بھی واپس جا رہی ہے۔ اس لیے (NATO) کو توڑنے کے بعد یہ فلسفہ پیدا ہوا ہے کہ روس کی یورپ کی گلیوں میں رسوائی کرو۔ اس کے سپاہی کا جینا حرام کر دو۔ تاکہ وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ اگر پاکستان پر کوئی بڑی طاقت حملہ آور ہوتی ہے، تو ہمیں از خود اپنی فوج کو چھپا دینا ہوگا اور اس کی ترتیب طویل مزاحمت اور ان کے اسلحہ سے ان کے خلاف جنگ کی تربیت دینی ہوگی۔ قبضہ آسان ہوگا، مگر قبضہ قائم رکھنا ناممکن بنا دو۔

پاکستان پر حملہ کے لیے کمیونسٹ روس کی جنگی پالیسی یہ ہوگی کہ آناً فاناً اس کی ائیر فورس ہمارے تمام ہوائی اڈوں پر اتر جائے گی اور ہوائی اڈوں پر قبضہ کے بعد اس کے ٹرانسپورٹ طیارے انہیں ہوائی اڈوں میں اس کی فوج کو اتارنا شروع کر دیں گے اور جنگ وہ پہلے ہی دن ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ روس کی ائیر فورس کو اس کام کے لیے ٹریننگ دی گئی ہے اور (DVINA) کی فوجی مشقوں (۱۹۷۰ء) میں ان کی ڈویژن ۲ منٹ میں ایئر شفٹ ہو جاتی ہے یعنی جہازوں سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کے بعد ۲ منٹ بعد ان کی ائیر فورس اپنی پوری

عسکری قوت میں آ جاتی ہے یعنی وہ ۲۰ منٹ ہمارے لیے انتہائی ضروری ہیں کہ جن کے اندر اندر ہم دشمن سے پاؤں پٹ لیں، ورنہ اس کی سٹریٹجی کامیاب دیکھ کر اپنی سٹریٹجی کا رخ بدل لیں

چنانچہ ماؤزے تنگ کا فکر (FABIAN TACTICS) کا اس طرح مرتب ہوا کہ جاپانی (OCCUPALION ARMY) کو منصہ کر دیا گیا جب جواں لائی نے ماؤزے تنگ کے کہنے پر ۔ اسے پائے تیار کیے اور ہر سپاہی کو ہر روز ایک گولی (ISSUE) ہوتی تھی اور اس کو ہر روز ایک جاپانی مارنا ہوتا تھا چنانچہ ۳۰ دن میں ۳ جاپانی مارے گئے اور ایک سال کی مزاحمت میں آدھی جاپانی فوج ختم ہو گئی اور یہ سب سے سستا اور اعلیٰ طریق جنگ تھا۔ سپاہی سویلین کپڑے پہنے ہوتے اور جاپانی کہیں بھی نے حملہ کر سکتے تھے کہ باوجود منصہ رہا۔

ماؤزے تنگ کا دوسرا فکر گوریلا جنگ کا تھا اور اس کا ابتدائی دور LETTER 11 چار سوالات تھا، 11-LEPTER "ENEMY ADVANCES, WE RETNEAT. ENEMY STOPS, WE HARASS. ENEMY RETREATS, WE PURSUE"

دشمن بڑھے تو ہم پسپا ہوں گے دشمن رکے تو تنگ کرو۔ دشمن پسپا ہو تو تعاقب کرو۔ یعنی دشمن سے ٹکر لینا نہیں بلکہ الجھائے رکھنا اس گوریلا جنگ کی سٹریٹجی تھی اسے بچاؤ کے باوجود دشمن کی تباہی کا مقصود تھا

ماؤزے تنگ کے عسکری فکر کا تیسرا دور فیصلہ کن معرکوں سے دفاع کرنے کا ہے جس میں دشمن کی کثیر افواج ۲-۳ لاکھ گھیرا ڈالی جاتیں اور ماؤزے تنگ گھیرا ڈالنے ہوئے دشمن کے ایک کالم کو خود حوالی گھیرا ڈال کر انتہائی مستعدی سے تباہ کر دیتے تھے اور پھر اسی کالم کے علاوہ سے راہ فرار اختیار کرتے نکل جاتے اور دشمن کچھ عرصہ تک گھیرا ڈالنے کی پالیسی اختیار نہ کر سکتا بلکہ سیدھا بڑھتا، تو FEINT دے کر ایک علاقے (مارو) پر فوجی اجتماع کرے جب دشمن اس جانب اپنے حفاظتی دستے RESERVES روانہ کر دیتا تو یہ متحرک صلاحیت سے دوسرے مارو میں مرکوز ہو کر جوابی حملہ کر کے دشمن کو حیت کرا کر نکل جاتے جب دشمن دونوں کالموں سے بڑھتا، تو یہ خود بالعموم ایک کالم کو کبڈی کی طرح بڑھ کر تباہ کر دیتے تھا سمجھ وری فوجی قوت مرکوز رکھے دشمن کو تنگی کا باعث بنانے کے بعد اس کو تباہ کرنے کا رحجان تھا۔ ماؤزے تنگ کو چیانگ کائی شیک سے پانچ دفعہ گھیرے میں لیا۔ ماؤزے اس پر ایک مضمون لکھا کہ گھیراؤ اور گھیراؤ کے توڑ کی سٹریٹجی کیا ہونی چاہیے جس کو انگریزی میں ("ENCIRCULEMENTS AND SUPERVISION AND HO. TO COUNTER IT?") کہا جا سکتا ہے۔

جب پاک افواج ملک وقت تمام محاذوں پر منتشر ہوں گی، تو تمام علاقے موثر دفاعی اور جوابی حملہ کی عسکری طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہو جائیں گے۔ اس کو ہم انگریزی میں (WEAK EVERYWHERE AND STRONG NOWIHRE کہیں گے یعنی ہر جگہ کمزوری اور کہیں مضبوطی نہیں" مسٹر پی پاکستان میں ہم نے دفاعی جنگ کے ابتدائی علاقہ میں پوری فوج منتشر کر کے دشمن کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اس کو الجھا کر کاٹ کر کے عقب میں چلا جائے اگر ہم پوری قوم کو میدان جنگ میں لانے کی ٹریننگ دے دیں تو (FABIAN TACTICS) سے بھی دفاع ہو سکتا ہے اور تمام علاقوں پر روسی نظریات دفاع کے مطابق بھی دفاع ہو سکتا ہے اگر ہم عوامی فوج نہیں بنائے تو ہمیں لاچار علاقہ کی قربانی دے کر فتح حاصل کرنے کی سادہ سی سٹریٹجی اختیار کرنی ہوگی۔ عوامی فوج کے بغیر کل علاقوں کا دفاع ممکن نہیں چھوٹی فوج کو تو صرف فتح حاصل کرنے پر مامور کرنا چاہیے۔

# جنگی قوت

دراصل آج کی دنیا میں دو قسم کی جنگی قوت ہیں۔ اولاً "جنگی قوت"۔ دوم "کامیاب جنگی قوت"۔ سٹریٹجی کے لحاظ سے دو قسم کی فوجیں ہیں۔ اولاً وہ جو علاقہ کے دفاع اور علاقہ حاصل کرنے پر لگ جاتی ہیں (VICTORY-ORIENTED ARMY) دوسری وہ فوج جو صرف اور صرف فتح حاصل کرنے پر مامور ہوتی ہے پہلی قسم کی فوج جنگی قوت ہوتی ہے دوسری قسم کی فوج کامیاب جنگی قوت کہی جاتی ہے مگر جنگی قوت کامیاب جنگی قوت بن سکتی ہے بشرطیکہ اس کو ذہن کا لالچ نہ ہو۔ صرف فتح حاصل کرنا اس کا نصب العین ہو اس لیے ہماری فوج کو (MOTTO) بطور (VICTORY - NOT TERRITORY) اپنانا ہوگا تب ہی ہم جنگ میں کامیاب ہو سکیں گے

# نصاب اور مستقبل

اب ایک ایسی فوج کی ٹریننگ کا نصاب، اسلحہ جنگی حکمت عملی کیا ہوگی جو:

ا۔ مختلف علاقوں میں مختلف جنگی سٹائل اختیار کر سکیں۔ یا

ب۔ جو فیصلہ کن معرکوں سے دشمن کو شکست دے سکیں

نصاب 'ا' کے لیے تو ہمیں جرمن عسکری تھیوری، روسی عسکری تھیوری اور ویت نامی ملٹری تھیوری کو اپنانا ہوگا نصاب "ب" کے لیے ہمیں چینی عسکری تھیوری کو اپنانا ہوگا۔

مگر میری دانست میں فلسفہ جنگ اب ایک قدم اور آگے بڑھ چکا ہے اور جنگ میں ایک نادر پہلو نظر آنے لگا ہے اور وہ یہ ہے کہ مستقبل کی افواج انتہائی متحرک صلاحیت اختیار کر جائیں گی مثال سب جیسے اسرائیلیوں نے یوگنڈا کے (ENTEBBE) کے اڈے پر ہزاروں میل دور سے حملہ کیا۔ حملہ نو ۱۹۷۵ء میں میں جاکر اس طریق جنگ کا انکشاف میں نے اپنی پہلی کتاب ("FUNDAMENTAL RULLS FOR THE ORGANISATION of MILTARY VICTORIES") یعنی بنیادی اصول تنظیم عسکری فتوحات کے صفحہ ۱۸ پر کر دیا تھا جس میں یہ کہا تھا کہ مستقبل کا جنگی سٹائل یہ ہوگا کہ فوج آپ کے ہوائی اڈے پر فاتا ہزارہا میل دور سے کوئی فوج

بکھر جائے گی اور راستے ہی آپ کی ہوائی طاقت ماؤ کرے گی۔ پھر اس فوج کے ٹرانسپورٹ طیارے انہیں ہوائی اڈوں پر حملہ آور کی جنگی مشین اتاریں گے اس لیے سرحدوں پر جنگی تصورات ختم ہو جاتے۔ ملک درمیان میں مختلف ممالک کے وجود دو ملک ایک دوسرے سے اس طرح جنگ لڑ سکیں گے مثلاً پاکستان اور اسرائیل اس جنگ کا خاصہ یہ ہوگا کہ دشمن کی ہوائی قوت کو اپنے طیاروں کے بجائے ایسی پیدل فوج کو پیراشوٹ کے ذریعے ان اڈوں پر اتار کر تباہ کیا جائے گا۔ پھر اسی ہوائی قوت سے اس کی بکتر بند فوج تباہ کی جائے گی پھر اپنے بکتر بند افواج سے اس کی بھاری انفنٹری کو روند دیا جائے گا اور یہ تمام کام ایک ساتھ ہوگا اور اس طرح فتح ہم ۳ دنوں میں مل جائے گی۔

سب سے پہلے یہ تھیوری روس نے جاپانی فوج KUOMINTURNG ARMY کے خلاف استعمال کی جب جرمنی کی فوجی قوت توڑنے کے بعد روسی افواج مشرق میں مرکوز کی گئیں اور ۱۰ دن میں ۱۰ لاکھ جاپانی فوج کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد روس نے پیراشوٹ انفنٹری میں بہت ترقی کی اور طرح طرح کے بڑے بڑے پیراشوٹ ایجاد کیے اور انفنٹری کی تربیت یہ تھی کہ پیراشوٹ کو بالکل زمین کے پاس آکر کھولتے تھے وہ FREE FALL کرتے تھے اس طرح کم سے کم وقت میں وہ سپاہی زمین پر اتر کر اپنی عسکری قوت بحال کر لیتا تھا روسی نظریہ کے مطابق دشمن کے ہوائی اڈوں کو تباہ کرنے کے لیے ٹینک اور بکتر بند توپیں بھی اتاری جاتی تھیں جو ہوائی اڈے کے حفاظتی عملہ کو تباہ کرکے قبضہ دلوا دیتی تھیں حال ہی میں اسرائیل نے اپنے ٹینک اتارنے کی بجائے یوگنڈا کی آرمڈ کاروں پر پہلے قبضہ کیا پھر ان بکتر بند دستوں سے ہوائی اڈے پر SURPRISE ATTACK کیا اس طرح اب ایک نیا جنگی داؤ ہمارے سامنے آیا ہے کہ پیراشوٹ انفنٹری اتر کر دشمن ہی کے بکتر بند دستوں پر قبضہ کرکے دشمن کے ٹارگٹ اتار دے یا اگر کسی طرح پیراشوٹ سے پہلے پانی کے جہاز یہ اتر ممکن ہو جائے، تو دشمن کے ہوائی اڈے پر اتر کر ان پر قبضہ کرکے انہیں کے جہازوں سے انہیں کے ان مادہ ہوائی جہاز ڈبو دیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ مستقبل کا پیدل فوجی ایک سپر مین ہونا چاہیے ہم جب یہ کہتے ہیں کہ انفنٹری جنگ کی ملکہ ہے۔ INFACTRY IS QUEEEN OF BATTLE تو اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان چاہے کتنے ہی تباہ کن ہتھیار۔ اسلحہ و وسائل کیوں نہ بنالے ایک انسان تن تنہا یا دستے کی صورت میں سب تباہ کر سکتا ہے۔ انسان مقابلہ مشین ہی اصل انفنٹری کا ماٹو ہے۔ اور جب ٹریننگ میں ہم انسان کو مشین تباہ کرنا سکھادیں، تو مشین کی سبقت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان سے بہتر مشین ایجاد نہیں ہو سکتی۔

# غریب ملک مہنگا اسلحہ

ایک اور مشکل ہمارے سامنے ہے اور وہ یہ کہ آج کل زمانہ تمام جنگی ماہر SOPHISTICATED ARMAMENTS مہنگے اور نایاب جنگی ہتھیاروں کو ترجیح دیتے ہیں آپ کسی جنگی ماہر سے پوچھیں کہ آپ کی فوج کو کیا درکار ہے، تو وہ کہے گا، جدید ٹینک جدید میزائل جدید راڈار جدید الیکٹرانک اسلحہ وغیرہ وغیرہ خواہ ان کا ملک امیر ہو یا غریب سب کی حد وجہد یہی ہے کہ مہنگا اور نایاب اسلحہ ملے۔ جدید ٹینک جو برطانیہ اور فرانس مل کے بنا رہے ہیں، اور اسے مستقبل کا ٹینک کہا جا رہا ہے اس کی قیمت چار سو ٹینک دس لاکھ پونڈ کے حساب سے طے کی گئی ہے۔ یعنی ڈھائی لاکھ پونڈ کا ایک ٹینک اس ٹینک کا ایمونیشن بھی مہنگا ہوگا الغرض ڈھائی لاکھ کا ایک ٹینک ہوا، تو ۱۰ ٹینک خریدنے کے لیے ملک کی تجوری خالی ہو جائے گی، روس کے پاس دوسری جنگ عظیم کے بعد ۵۰،۴۰ ٹینک ہیں جیسا کہ اتنے جدید ٹینک خریدنے کے لیے سعودی عرب جیسے کئی ممالک کی تجوری خالی ہو جائے گی) اب اس ۵ لاکھ کی قیمت کے ٹینک کو صرف ۱۰ روپے کے راکٹ اور بارود سے اڑا دیا جا سکتا ہے، اس لیے قیمت کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام دنیا کی افواج سستے اور مہلک ہتھیار بنا رہی ہیں ٹینکوں کو ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں انفنٹری کے مہلک اینٹی ٹینک ہتھیاروں کا سامنا کرنا پڑ گیا اور ان کا (ٹینکوں کا) بہت نقصان ہوا۔

پاکستان جیسا ملک ٹینکوں کو جدید بنائے، تو اسال تک اس کی تمام فصلیں رہن رکھی جائیں گی اور پھر اتنی قیمت ادا کرنے کے بعد ضروری نہیں کہ فتح مل جائے فتح اسلحہ سے نہیں، اسلحہ کو استعمال کرنے کے طریقوں سے ملتی ہے۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جنگ لڑنے کا ایک امیر آدمی کا طریقہ ہے، دوسرا غریب آدمی کا امیر ملک کی جنگ اور طرح ہے، غریب ملک کی جنگ اور طرح دونوں کا اسلحہ مختلف ہوگا۔ غریب ملک کا اسلحہ امیر ملک کے اسلحہ کو توڑنے اور اس سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہوگا آج کے زمانے میں جنگی قوت پیدا کرنے کے لیے مہنگا طریقہ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور سستا طریقہ مثلاً ویت نام میں امریکہ مہنگے طریقے سے جنگ لڑ رہا تھا اور شمالی ویت نام سستے طریقے سے جنگ لڑتا تھا جنوبی ویت نام کے جرنیلوں نے ایک امریکی جرنل سے شکایت کی اور کہا کہ ہمیں بجلی کا پٹرول، لاریاں دو۔ ڈالر دو۔ طیارے دو۔ ٹرانسپورٹ طیارے دو پھر ہم جنگ لڑ سکیں گے پھر فتح ہوگی۔ اس پر امریکی جرنل نے پوچھا کہ تمہارا ہی ایک ہم وطن جرنل گیاپ ہے۔ اس کو تو کوئی بجلی کا پیڑ نہیں دیتے۔ نہ لاریاں مل رہی ہیں، نہ ڈالر نہ طیارے پھر وہ کس طرح کامیابی سے تمہارے ساتھ جنگیں لڑ رہا ہے اس پر جنوبی ویت نام کے جرنل خاموش ہو گئے اس کا ماٹو (۱۹۶۵ء) یہ ہے کہ جنوبی ویت نام کے جرنل مہنگے طریقے یعنی امریکی جنگ کے عادی ہو چکے تھے اور جرنل گیاپ سستے طریقے یعنی (POOR MAN'S WAR) کا عادی ہو چکا ہے یہ لوگ جدید سامان اور (SOPHISTICATED EQUIPMENT) کے جنگ نہ لڑ سکتے تھے اور اس کو اس قسم کے ساز و سامان کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس لیے کسی فوج کی تربیت میں یہ مد نظر بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے کہ آیا ہم غریب آدمی کی جنگ لڑ سکتے ہیں یا امیر آدمی کی جنگ ابھی پاکستان امیر آدمی کی جنگ نہیں لڑ سکتا اس لیے اسے مندرجہ ذیل پالیسیاں بنانی درکار ہیں:

- اپنے ٹینکوں کو عرب ممالک کے ہاتھ اچھے داموں میں بیچ دیں جہاز بیچ دیں اور تمام بھاری اور امپورٹڈ ساز و سامان بیچ کر خود فروخت کر دینا چاہیے وہ اس لیے کہ جب ہم اسلحہ امپورٹ کریں گے، تو اس کا ایمونیشن بھی امپورٹ کرنا ہوگا اور اس کے کل پرزے بھی باہر سے آئیں گے پھر اس طرح جو فوج تیار ہوگی وہ ماتو ۷ گھنٹوں کی بھرپور جنگ کے بعد ایمونیشن اور سپئیر پارٹس وغیرہ کے لحاظ سے ختم ہو جائے گی یا ۵ گھنٹے یا ۱۰ گھنٹے یا ۵ گھنٹے۔ پس ہر جدید فوج کی عمر ایک بیٹری کی طرح چند سو گھنٹے ہوتے ہیں۔

سٹریٹجی کی رو سے اگر کسی ملک کی فوج کو ختم کرنا ہو، تو یہ اندازہ لگائیے کہ بھرپور جنگ وہ کتنے گھنٹے کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ پس اتنے گھنٹے لڑو پھر جب اس فوج کی صف آرائی ٹوٹ جائے تو تازہ دم فوج لا کر اس کو ختم کر دو۔ آج دنیا کی تمام فوجیں (جو خود اسلحہ نہیں بناتیں اور اسلحہ کے لحاظ سے خود کفیل نہیں) سٹریٹجی آف ایکس ہاسٹ سے ختم کی جا سکتی ہیں۔ اس میں بہادری اور صلاحیت کام نہیں دیتی، بس ہمیں اپنی فوج کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ اگر دشمن ۱ سال بھی لڑے، تو ہم لڑتے رہیں یہ بات تین چیزوں کی متقاضی ہے۔

- دشمن سے شدید تعرض کا جذبہ تاکہ مزاحمت مسلسل اور دیرپا ہو۔
- جدید اسلحہ SOPHISTICATED EQUIPMENT سے پیرا
- ہتھیاروں میں خود کفیل صلاحیت یا دشمن کے ہتھیاروں سے اس کے خلاف جنگ در جنگ کی صلاحیت۔ ہمیں افواج کی ٹریننگ میں ان عناصر کا خیال رکھنا ہوگا۔

اب میں افواج کی ٹیکنیکل اصلاحات کی طرف آتا ہوں۔ ان اصلاحات کے بعد ہی افواج نئے طور طریقوں سے ترتیب پا سکتی ہیں۔

## یک شخصی کمان کی بحالی

جنگ کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ فوج یک شخصی کمان کے اصول پر لڑائی جائے اس کو ہم انگریزی میں (ONE-MAN-COMMAND) کہتے ہیں۔ اب ایک مثال سے میں اپنا مدعا پیش کرتا ہوں۔ پاکستان قومی اتحاد کی حالیہ تحریک میں میں نے دیکھا کہ مال روڈ پر تقریباً ۵ سپاہیوں کا ایک دستہ مارچ کر رہا تھا اور تقریباً ۳ ہزار لوگ ان پر پتھراؤ کر رہے تھے مگر ۳ ہزار میں ایک قیادت نہ تھی اور وہ ایک شخص کے حکم پر عمل نہ کر رہے تھے نتیجہ یہ تھا کہ ۵ سپاہیوں نے حملہ بول بول کر ۳ ہزار کو منتشر کر دیا۔ وہ ۵ سپاہی ایک انسپکٹر پولیس کے احکامات کو من و عن پورا کر رہے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ فوج وہ ہے جو ایک شخص کے حکم پر من و عن کام کرے۔ انگریزی میں ہم کہیں گے

THERE IS NOT TO REASON WHY
THERE IS BUT TO DO AND DIE

(فوج کا ڈسپلن یہ ہے کہ پوری فوج ایک شخص کے حکم پر من و عن اور بھرپور جذبے سے حکم بجا لائے۔ ڈسپلن وہ سیمنٹ ہے جو فوج کی عمارت کو کھڑا کرتا ہے بغیر ڈسپلن کے فوج ایک ہجوم ہے۔ روم یعنی قدیم روم کی ڈویژن کا نام تھا جب یہ ڈویژن دشمن سے لڑتی تھی، تو ایک شخص کے حکم پر عمل کرتی تھی اور دشمنوں کے پشتے لگا دیتی تھی۔

مسٹر بھٹو نے اقتدار ملتے ہی فوج میں یک شخصی کمان کا اصول ختم کر دیا اور کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کر دیا اور تینوں سروسز کو آزاد کر دیا نتیجہ یہ تھا کہ تینوں سروسز ہمہ وقت بحث مباحثہ میں الجھ کر رہ گئیں اور بحث کے گنتار کر حضور افواج کی تینوں سروسز کی چپقلش کے اعداد دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ اب فوج میں کمانڈر انچیف کا عہدہ دوبارہ بحال کیا جانا ضروری ہے۔ یک شخصی کمان کا اصول یہ ہے کہ فتح کی تمام ذمہ داری ایک شخص پر ہو لہٰذا اس کے سر شکست کی تمام ذمہ داری بھی ڈالی جائے۔ جب ایک شخص پر فتح کی تمام ذمہ داری ہو گی اور شکست کی صورت میں وہی مجرم گردانا جائے گا، تو کمان صحیح ہو جائے گی۔ کمان کی اصلاح کے سلسلے میں اور بھی تجاویز ہیں، مگر وہ کسی اور وقت پیش کروں گا۔ اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ پوری فوج کی ترتیب اس انداز کی ہو کہ وہ من و عن خوش اسلوبی کے ساتھ اور وفاداری کے ساتھ ایک شخص کے احکامات کو مانے اور حکم ملنے پر آگ میں کود پڑے۔ فوج کی مادی اور کمی کوئی شے نہیں اصل چیز تو ڈسپلن ہے۔ ایک چھوٹی فوج جس میں یہ ڈسپلن ہو گا وہ بڑی سے بڑی فوج پر حاوی ہو گی اس لیے ٹریننگ سکولوں میں اس ڈسپلن کی داغ بیل اچھی عمدہ طریقے سے رکھنا ہو گی کہ سپاہ احکامات بجا لانے کی ماہر بن جائیں۔ اگر ہر آدمی کی ایک سوچ ہو گی، تو وہ فوجی دستہ ہو گا اگر اس فوجی دستے کی ۱۰ سوچیں ہوں گی، تو وہ MOB ہوگا۔ کسی اچھی فوج کا ڈسپلن ہی اس کی قابلیت کا اصل معیار ہے۔ الحمد اللہ کہ افواج پاکستان میں یہ معیار اونچے درجے کا ہے، مگر اس کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

## مشرقی پاکستان، ناکام حکمت عملی

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جنگ میں تو افواج کو مرکوز کرتے ہیں اور مارشل لا لگا ہو تو افواج کو منتشر کر دیتے ہیں۔ مارشل لا میں سیکٹر کمانڈر ہوتا ہے اور اس کی علیحدہ فوج ہوتی ہے اور پورے ملک میں فوج بکھری ہوتی ہے۔ اب جنگ مارشل لا میں اگر جنگ لڑنے سے پہلے ہماری فوج پورے ملک کے علاقے میں بکھری ہو گی اور ہر فوج دوسری سے علیحدہ علیحدہ ہو گی اور ہر فوج اپنے (زون) سیکٹر کمانڈر کے ماتحت ہو گی، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کمانڈر انچیف کی جنگ نہیں ہو گی بلکہ سیکٹر کمانڈر کی جنگ ہو گی جنرل نیازی صاحب نے مشرقی پاکستان کی جنگ اس طرح لڑی کہ مشرق کا محاذ ایک ڈویژن کے سپرد کر دیا۔ شمال دوسری ڈویژن کے سپرد کر دیا اور مغربی محاذ تیسرے ڈویژن کمانڈر کے سپرد کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جنگ نیازی صاحب کی نہ رہی کیونکہ انہوں نے تو اپنی افواج کو سیکٹر کمانڈروں کو تحفتاً عطا کر دیا تھا وہ تو ٹیلیفون ایکسچینج جا کر بیٹھ گئے۔ جنرل الف سے پوچھا "سناؤ بھئی کیا خیال ہے حالات کیا ہیں" جنرل ب سے بھی پوچھا۔ جنرل پ سے بھی پوچھا اور سب اچھا۔ بس کر آرام سے لیٹ گئے نیازی صاحب نے تو دفاعی ذمہ داری اپنے ماتحت کے سپرد کر دی تھی دفاعی جنگ کی ذمہ داری کبھی بھی ماتحتوں کے سپرد نہیں کی جاتی یہ ہمیشہ کمانڈر انچیف کی جنگ ہوتی ہے اس میں کمانڈر انچیف دشمن کا پلان وقت سے پہلے دیکھتا ہے اور جنگ سے پہلے دفاعی ردعمل اور رد یلغار کا طریقہ جمع کر لیتا ہے پھر پوری فوج کو چابکدستی سے حرکت دے کر دفاعی ردعمل کرتا ہے دفاع تو رد یلغار کا دوسرا نام ہے۔ دشمن یلغار کرتا ہے یعنی (OFFENSIVE) لیتا ہے اور دفاعی کمانڈر اس یلغار کو روک کر جوابی یلغار سے ہڑپ کر دیتا ہے۔ اس کے لیے کبھی کبھی ابتدائی علاقہ دے کر جوابی یلغار کرنی پڑتی ہے کبھی سب سے زیادہ علاقہ دے کر۔ اس لیے یہ دفاع تو کمانڈر انچیف کی جنگ ہوتی ہے اور جو کمانڈر انچیف یہ ذمہ داری اپنے ماتحت کو دے دے وہ (SECTORISATION) کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اس میں وہ فوج اپنی بھرپور قوت استعمال نہیں کر پاتی اور شکست کھا جاتی ہے۔

جنرل سائی صاحب اگر محاذوں سے افواج پیچھے ہٹا کر مرکوز کر لیتے اور اس مرکوز فوجی قوت سے دشمن کے ساتھ چند فیصلہ کن معرکوں میں اپنی بھرپور قوت استعمال کرتے تو دشمن کے پھیلاؤ کی وجہ کوئی بھی حاصل ہو سکتی تھی دشمن کو ایک دوسرے سے منقطع بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے وسائل اس کے خلاف استعمال ہو سکتے تھے لیکن ECTORISATION سے اور افواج کو پورے سرحدی علاقے پر برابر برابر تقسیم کر کے جنگی بے بصیرتی STRATEGIC IMMATURITY کا مظاہرہ ہوا۔

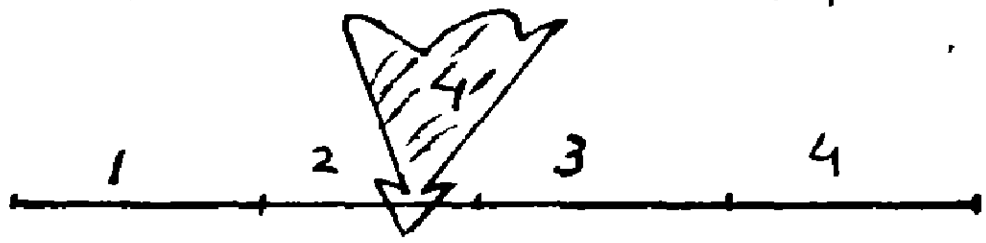
اعلیٰ عسکری اداروں میں جو کمانڈر تیار کیے جاتے ہیں انہیں تربیت کے دوران مندرجہ ذیل فوجی غلطیوں سے پرہیز سکھایا جانا ضروری ہے:

• جنگ میں افواج کو سیکٹروں میں تقسیم نہیں کرنا

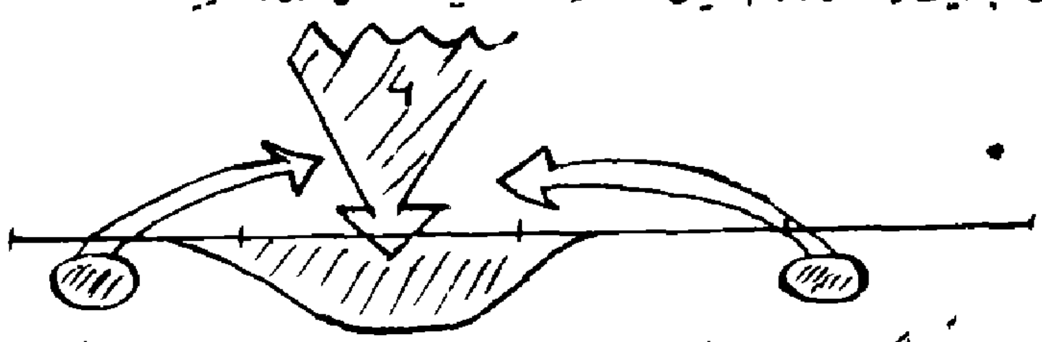
# فوج کی تقسیم

THERE SHOULD BE NO EQUALITAXIANISM IN WAR

• افواج کی سرحدات پر مساوی مساوی تقسیم نہیں کرنا افواج کو زکوٰۃ کی طرح سرحدوں پر بانٹ کر مستقر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مرکوز رکھ کر معرکے جاری رکھنے چاہییں اعلیٰ جنگی بصیرت یہ ہے کہ اہم محاذ پر اہم فوجی کثافت مرکوز ہو اگر دشمن جنگ کسی اور محاذ سے قوت سے آئے تو غیر اہم علاقوں سے اپنی افواج نکال نکال کر اہم محاذ پر بھیجی جائیں آپ کو ایک مثال سے یہ سمجھاتا ہوں:




یہ چار عدد ڈویژن سرحد پر کھڑے ہوتے ہیں دشمن اپنی ۴ ڈویژن سے ایک جگہ حملہ کرے، تو غالباً وہ ۱/۴ ۱/۱ کی نسبت سے عسکری وزن ڈال رہا ہے ۴ ڈویژن اگر پوری ڈویژن سرحد پر حملہ کرے تو یہ ۱/۴ کی عسکری کثافت ہو گی مگر اگر وہ چار ڈویژن ایک بریگیڈ یا ایک بٹالین کے علاقہ پر حملہ کریں تو یہ ۱/۱۲۰ ۴۰ کی عسکری کثافت ہو گی۔ حالانکہ دونوں افواج کی ڈویژن کی تعداد برابر ہے یعنی دونوں کے پاس ۴ عدد ڈویژن ہیں اسرائیلیوں نے ۱۹۶۷ء میں مصری فوج کو ۱/۴۸ کی عسکری عددی کثافت سے روند ڈالا، لہٰذا فتح ان کی رہی اب ایک اچھا دفاعی کمانڈر ۴ ڈویژن کے حملے کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل عسکری قوت پیدا کرے گا۔




افواج وہی ہیں یعنی ۴ ڈویژن مگر ۴ ڈویژن کے حملے کو دو ڈویژن سے روکا اور دو عدد ڈویژن اس وقت جوابی حملے میں پھینکی جب دشمن تھک کر چور ہو گیا اور کم از کم ۱/۲ کی عسکری کثافت اہم رخ پر دفاع کے لیے مرکوز کی گئی۔

سبق یہ ہے کہ جنگ میں عسکری کثافت بلیش بندی سے لگانا۔ دوران جنگ صحیح عسکری کثافت حملے کے رخ سے آنا۔ دشمن افواج کو تھکانے کے لیے قلیل افواج کا استعمال اور جوابی حملے کے لیے محفوظ فوج کے ہاتھ میں رکھنا یہ جرنیل کا فرض ہے اور اگر آپ کسی فوج کو علاقے پر پھیلا دیں گے، گویا وہ فوج جنگ کی بجائے مارشل لاء چلا رہی ہے، تو اس فوج کی شکست یقینی ہے علاقے کے لحاظ سے افواج بانٹنا فوجی مساوات ہے یہ کوئی جنگی بصیرت نہیں بلکہ فوجی بیماری ہے جو کسی بھی فوج کو قتل کر سکتی ہے

• جنگ میں فتح کی تعلیم کی جاتی ہے تعلیم کا نعم البدل شکست ہے عسکری تعلیم ایک مدرسے جو مشکل سے سیکھا جاتا ہے سکھایا بھی جاتا ہے، مگر یہ علم سیکھنے کے لیے سوچ کا منفرد انداز درکار ہے۔

میں نے "نوائے وقت" میں "سوچ کا انداز" کے عنوان سے کچھ مضامین لکھے اور یہ دلیل دی کہ جب ایک فوجی کمانڈر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہو جائے گا وہاں دوسرا فوجی کمانڈر یہ کہے گا صورت حال اتنی مخدوش نہیں اور پیش بندی کر کے سو جائے گا۔ کمانڈر کی "سوچ کا انداز" فتح حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم نکتہ ہے ۱۹۶۵ء میں میرے کمانڈر نے حکم دیا کہ فلاں حکمت کے مورچے بناؤ تاکہ دشمن ٹینکوں سے حملہ کرے تو مدافعت ہو سکے "میں نے عرض کیا" اگر دشمن فاصلہ بہر سے ٹینک لا کر یہاں حملہ کرے، تو ہمیں یہاں دفاع کرنے کی بجائے فی الفور دوسری طرف سے فاصلہ لے لینا چاہیے۔ چونکہ اس جگہ سے اس کی فوج یہاں پر حملہ آور ہو رہی ہے" لیس کمانڈر نے اس تجویز کو پسند کیا۔

ہینی بال روم پر فاتح بن کر قبضہ کر گیا تو روس فوج کے سپہ سالار سکیپیو SCIPIO نے کہا تم میرا ملک لے لو، میں تمہارا ملک لے لیتا ہوں چنانچہ سکیپیو نے بڑھ کر ہینی بال کا ملک لے لیا اور ہینی بال کو مجبور کر دیا کہ وہ روم پر قبضہ چھوڑ کر اپنے ملک کی مدافعت کرے یہاں سکیپیو نے ضروری اقدامات کر لیے اور جب ہینی بال اس کے جال میں آ گیا، تو اس کی فوج کو ختم کر دیا سکیپیو اس وقت ۳۲ سال کا تھا اور ہینی بال دنیا کا مشہور جرنیل تھا سکیپیو نے صرف سوچ کے منفرد انداز سے ہینی بال کو شکست دی۔

# مختصراً ——— نکات

اب ہم اس تمام مضمون کا ماحصل ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ مقصد کو سامنے رکھے بغیر کوئی جنگی ترتیب ممکن نہیں۔ مقاصد یہ ہیں:۔

- ہماری جنگی طاقت ہمیں کامیاب جنگی طاقت درکار ہے، اس لیے نصاب میں فتح کو اہمیت ہو۔ زمین کے قبضہ کو اہمیت نہ دی جائے۔
- ہماری افواج کے اسلامی تشخص کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف اسلام کے دشمنوں سے نپٹنے کی جنگی تیاری کرنی چاہیے۔
- ہمارا نکراؤ ہندوستان سے ہے۔ اگر کوئی بڑی طاقت ہم پر حملہ آور ہو تو اس کو طویل عرصہ تک مزاحمت دے کر پسپائی پر مجبور کرنا ہمارا فوجی مقصد ہو اور اسی بنیاد پر فوج کی ترتیب کی جائے۔
- سندھ میں جارحانہ متحرک صلاحیت کا سٹائل اپنانے سے ہم سندھ کا دفاع کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں روسی جنگی سٹائل اپنانے سے پنجاب کا دفاع ممکن ہے۔ آزاد کشمیر میں افواج پاکستان کو مجبوریوں کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں، اس لیے وہاں چھوٹی سپاہی فوج سے بڑی فوج کو الجھائے رکھنے کی سٹریٹجی ہو اور اسی بنیاد پر یہ افواج کی ترتیب کی جائے۔
- افغانستان اور ایران سے جنگ کی نا ممکن ہو۔ البتہ اگر افغانستان روس کی شہ پر حملہ کرتا ہے، تو صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے اگر افغانستان حملہ پر بضد رہے، بالفعل بلا صبر ہمیں انتہائی متحرک صلاحیت کا مظاہرہ کر کے جنگ افغانستان کی سرزمین پر لے جانی چاہیے اور اسی کی ترتیب اس طرح کر دی جائے۔ (حملہ کر کے کبھی ایسی لوٹ نہ سکے)
یا تو ہم عوامی فوج بنائیں۔ اس صورت میں علاقہ کا تحفظ ممکن ہے۔ جب تک عوامی فوج نہیں بنتی، علاقے کا دفاع نظر انداز کر کے صرف فتح پر نظر رکھنی چاہیے اور تمام ترتیب ان خطوط پر ہو۔
- افواج کو از سر نو ملک کے اندر بنانے جا سکنے کے قابل اس کی ضرورت ہے۔ اسلحہ وہ چاہیے جو گھر گھر بنایا جا سکے۔ امریکہ سے آنے اور عین جنگ کے وقت امریکہ اس کا ایمونیشن نہ دے اور ( ) لگا دے۔ اسلحہ پولیس یہ ہو کہ دس سال بھی جنگ لڑنی پڑے تو لڑ سکیں۔
- ہم تمام محاذوں پر افواج کو برابر برابر تقسیم نہیں کر سکتے۔ نہ تمام محاذ اہم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کسی ایک محاذ پر پوری قوت مرکوز کرنے کا جنگی سٹائل اپنانے کی ترتیب دی جائے۔
- دفاع بذریعہ فیصلہ کن معرکہ جات کی جنگی ترتیب کا اصول اپنایا جائے۔
- سپر پاور حملہ کرے تو (FABIAN TACTICS) استعمال کیے جائیں، مزاحمت جاری رہے اور دشمن کا اتنا نقصان ہو کہ وہ پسپا ہو اور کبھی حملہ کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کی فوج کو ایک دلدل میں پھنسا ہمارا نصب العین ہو۔
- ہمیں ماؤزے تنگ کے جنگی فکر کا مطالعہ درکار ہے اور پوری قیادت اس فکر سے رہنمائی حاصل کرے۔ ہمیں چینی طریق جنگ سمجھا اور اس کو رائج کرنا ہے۔
- ہماری فوج علاقہ لینے اور علاقہ بچانے کی رسیا نہ ہو۔ بلکہ فتح لینے اور شکست دینے کی رسیا ہو اور تمام ترتیب اس نکتہ کو سامنے رکھ کر کی جائے۔
- مستقبل کی جنگی حکمت عملی دور مار صلاحیت جسے اسرائیل LONG ARM کہتے ہیں، کے مطابق افواج تیار کی جائیں۔
- ہماری لانگ آرم نہ صرف دہلی مورچوں تک ہو بلکہ آلی مورچوں (دشمن کی مورچوں) کے خلاف بھی ہو۔
- ( SOPHISTICATED ) اسلحہ کو چھوڑ کر ( INDIGENOUS ) اسلحہ استعمال ہو۔ امیر ملک کی جنگ چھوڑ کر غریب ملک کی جنگ کا سٹائل اپنایا جائے۔ ایسی حالت کی جائے کہ دشمن کے اسلحہ سے دشمن کے خلاف کارروائی کرنے کی ترتیب دی جائے۔ دشمن کی اسلحہ کی فیکٹریوں پر ہمارا قبضہ بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اس کی فوج کا ہے۔
- فتح اسلحہ سے نہیں اسلحہ کے صحیح اور بر وقت استعمال سے ہوتی ہے۔
- اچھا تو یہ ہے کہ بھینچو اور بڑا اسلحہ بیچ دیا جائے اور اس رقم سے سستا اور مہلک دفاعی اسلحہ خریدا جائے اور دفاعی اسلحہ کو اس خوبی سے استعمال کیا جائے کہ اس سے حملہ اور گھیرے کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔
- دشمن ہماری افواج کو تھکا کر ختم کرنا چاہے گا۔ اس لیے ہماری ترتیب یہ ہو کہ اس سٹریٹجی کو فیل کر دیں۔
- فوج یک جمعی کمان کے تحت استوار کی جائے اور ڈسپلن یہ ہو کہ پوری فوج ایک کمانڈر انچیف کے حکم پر جان کی بازی لگا دے۔
- زمانہ امن میں تو فوج سیکٹروں میں منقسم ہو سکتی ہے مگر زمانہ جنگ میں نہیں۔ یہی جنرل سٹاف کی ترتیب ہو کہ خطرہ دیکھتے ہی افواج کو مرکزی کمان میں لے آئیں۔
- فوجی مساوات (MILITARY EGALITARIANISM) جنگ کا اصول نہیں۔ اس لیے اپنی افواج کو سرحدات پر برابر برابر تقسیم کرنے کے بجائے دشمن سے مقابلہ میں اعلیٰ عسکری کثافت سے حاصل کی جائے۔ اہم محاذ پر زیادہ فوج اور غیر اہم محاذ پر کم فوج کا اصول رہنا چاہیے اور متحرک جنگ میں اس اصول کو مدنظر رکھا جائے۔
- فوج صرف فتح کی تعلیم کی ٹریننگ سے۔ صرف فتح، صرف فتح، صرف فتح۔ باقی ہر چیز غیر اہم ہے۔ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر فوجی نصاب مرتب کیے جائیں اور افواج کی ٹریننگ ہو۔

# علم علم

• اقبال • آزاد
• گاندھی • ٹیگور

## اقبال

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے، اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے تحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ بولہب را حیدر کرار کن۔ اور اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کے لیے سراسر رحمت ہے۔" اقبال

موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالانکہ اسلامی تمدن کے تعمیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دینی تعلیم نے اس کو مذہبی عقائد سے متزلزل نہ کیا ہو، اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے سرمایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشے میں سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت دور ہٹا دیا ہے۔ مخوفِ تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابلِ تقلید مثالیں اسے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استفصانا اور استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقل و ادراک کی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت اجانبِ اپنا ہمدرد کار رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آمیز لہجے میں پکار اٹھتے ہیں ؎

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے — دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کا یہ کلام کہنا ہے کہ ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا نے جو مغربی تہذیب کے بارے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ طول العمر جھگڑا کیا۔ آج ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے چارا شیخ خود بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کو سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب علمانہ زندگی سے چونکہ گزشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو تہذیب سے قریب کا تعلق ہے لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے روحانی طور پر بمنزلہ ایک روحانی لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورتِ حال اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز کلامِ مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کی ماہیت اور نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

## ابوالکلام آزاد

میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گذشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور اس کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گذشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع و اطوار، اخلاق و عادات، طریق بود و ماند یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیے۔

اخلاق و تمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا اور جدید تہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی بھی چڑھائی گئی۔ خیر مضائقہ نہیں، خرید و فروخت کا معاملہ ہے اور متاع بے بہا ہاتھ آتی ہو تو دل و جان تک کو اس کی قیمت میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب کچھ دے کر وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھ آئی؟

علم؟ نہیں۔ اخلاق؟ نہیں۔ تہذیب و معاشرت؟ نہیں۔ ایک پوری انگریزی زندگی؟ نہیں۔ ایک اچھی مخلوط معاشرت؟ یہ بھی نہیں۔ پھر کیا؟ بدبختی ہے کہ جیب اور ہاتھ دونوں خالی ہیں ؎

آئندہ گذشتہ تمنا و حسرت است ۔۔۔ یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

## موہن داس گاندھی

موجودہ نظام تعلیم ناقص و خام ہے۔

(۱) مقامی اور ہندوستان اپنے تمدن و تہذیب سے بالکل قطع نظر کر کے اس کا خمیر غیر ملکی تہذیب و تمدن سے اٹھایا گیا ہے۔

(۲) یہ قلب و اعضاء کی تہذیب سے صرف نظر کرتا ہے اور ساری اہمیت محض دماغ کو دیتا ہے۔

(۳) غیر ملکی زبان کے ذریعے حقیقی معنوں میں تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی۔

یہ نظام تعلیم کسی بھی شکل و صورت میں ملک کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ انگریزی نے جسے اعلیٰ تعلیم کی ہر شاخ کے لیے ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ اقلیت اور ناخواندہ اکثریت کے درمیان ایک مستقل خلیج پیدا کر دی ہے۔ یہ علم کے عوام تک نفوذ کرنے کی راہ میں حائل ہے۔ انگریزی کی غیر معمولی اہمیت نے تعلیم یافتہ طبقے پر ایک ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جس نے اسے ذہنی طور پر زندگی بھر کے لیے ماؤف کر دیا ہے اور خود اپنی ہی سرزمین کے لیے ان کو اجنبی بنا دیا ہے۔"

## سی کیورا

(۱) دوسری قوموں کی غلامانہ نقالی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود ہم آج تک ایک تعلیم یافتہ قوم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ جن نوجوانوں نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی ہے ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ حالات یا اصولوں کے انطباق کی قابلیت سے محروم ہیں۔ اپنی کتابی معلومات کو اپنے آس پاس کے ماحول کے مطابق نہیں ڈھال سکتے اور اپنے قلب کو حصول علم کی بے غرض تمنا سے خالی پاتے ہیں۔

(۲) ہمارے ملک کی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی تعمیر اس زبان تاریخ اور فلسفے کی بنیاد پر نہیں ہوئی جو ہمارا اپنا سرمایہ ہے بلکہ ان کو نظر انداز کر کے ایک دوسری زبان، دوسری تاریخ اور دوسرے رسم و رواج کا پیوند اس میں لگا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول گھر کا تتمہ اور تسلسل نہیں بلکہ ایک دوسری دنیا کا چھ گھنٹے کا خواب کا سا عمل ہے۔ طالب علم کی نظر میں اسکول کی حیثیت ایک نمونہ کی سی ہوتی ہے، وہ اسے اپنا مطمح نظر بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسے گھر کی دنیا غلط اور کسماندہ محسوس ہوتی ہے۔ اسے اس زبان پر شرم آتی ہے جو اس کے والدین بولتے ہیں۔ ان کی روایات، ان کے رہن سہن، عادات و اطوار حتیٰ کہ مذہب جسے وہ بہت عزیز رکھتے ہیں سب سے وہ بھاگتا ہے اور ایسی دنیا تلاش کرتا ہے جو اس نے سکول میں دیکھی تھی۔ اور وہ اپنے آس پاس کی حقیقی دنیا سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ یہ طالب علم اپنے مذہب اور روایات سے بھی جاتا ہے اور کسی دوسرے نظام کو بھی اختیار نہیں کر پاتا۔

(۳) مذہب کے بغیر تعلیم کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے میں مذہب کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہی یہ ہے کہ ان کی تعلیم میں مذہب کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ عقائد اور روایات پر صدیوں کی تاریخ سے اب مذہب کا جزو بن گئی ہیں ان کو نظر انداز کر کے تعلیم آخر کیسے دی جا سکتی؟ طالب علم کو موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ ایک مربوط اور منظم طریقے سے اپنے مذہب کا مطالعہ کرے۔ اس نظام کا تیار کردہ طالب علم ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اپنے مذہب کے ذکر پر کچھ محجوب اور شرمندہ ہو جاتا ہے اور اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں اپنے والدین اور بزرگوں کی خاطر وہ ظاہراً کچھ رسوم کی پابندی تو کرتا ہے لیکن اسے کسی ایک طرف ایمان و ایقان حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا دماغ چوں چوں کا مربع ہوتا ہے جہاں حقائق و اوہام، تاریخی واقعات اور کہانیاں اور یقین و شبہات مجہول طریقے سے ملے جلے ہوتے ہیں۔

# منحوس گدھ

(حافظ محمد ادریس سابق صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین)

کوئل کی کوک اور برکھا رُت کی آمد کی خوشی دینے والے ہواؤں کے دوش پر رواں دواں دریا اُبل کیسے ولولہ انگیز ہوتے ہیں وہی کلیاں کھل جاتی ہیں مگر آج سے چند سال پہلے اسی دلآویز موسم میں ایک اَن جانی آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ اگست کی ایک سہانی صبح کی داستان ہے ہم آنے والی آفت سے بالکل بے خبر برکھا کی بہاروں سے پوری طرح لطف اٹھانے کے منصوبے بنا رہے تھے مگر شام کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور آسمان میں گدھ منڈلا رہے تھے ہم بے خبر تھے ایک گدھ بھی ضرور پرواز کر رہا تھا اچانک مجھے دادی اماں کی آنکھوں میں گدھوں کو یوں اُڑتے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے دیکھا ہم نے اس کی تاکید کی وجہ دادی اماں سے پوچھا، وہ گدھ دیکھ کر خود ہی پریشان ہو جاتی ہیں ہم ہوئے تھے کہیں یہ بہت منحوس ہے جب یہ آسمان پر منڈلاتا ہو تو ضرور کوئی آفت آنے والی ہے

دادی اماں لوگوں کا رنگ روپ اور حسب نسب ہو چکا ہے میں ان کی بے شمار دوسری باتوں اور یادوں کی طرح جب کبھی اب یہ قصہ یاد کرتا ہوں تو مجھے ان کی سادہ لوحی پر حیرانی ہوتی ہے مگر اس کی توجیہہ کرنے لگتا ہوں جو کہ ہر طرح سے ہمارا اس کا سلسلہ رہا ہے اور کاشتکاروں کا سب سے بڑا سہارا ان کے مویشی ہوتے ہیں اور گدھ دراصل انہی پر سوار ہوتے ہیں جب کوئی جانور مر جاتا ہے اس سے دیہاتی لوگوں کے گدھ کو دیکھ کر ہی یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ کسانوں کا کسان مرگ کی نسبت سا لگا ہے مسلم اس سے پہلے ہم دوں کا گوشت کھا کر انسانوں کو بیماریوں کی مدد کا کام کیا جاتا ہے ہوا سی رستے کو وہ کام دے رہا ہے ہیں

بابا کا مزار کس حالی اور دادی اماں کی کم علمی کے باوجود گدھ کی منحوسی میں ہے کہ دیکھئے ایک بار صاحب مری رنگ دے میں سرایت کر گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دادی اماں کا ہر خیال درست ہے۔ شاید گدھ واقعی منحوس جانور ہے اس سے اس کی پناہ مانگو میں نے دل ہی دل میں سوچا، دیکھیں کل دن میں کون کون سی مشکل پیش آتی ہے دراصل ہم نے چار سے گدھ کی نحوست ہی کیا ہے۔ ہم نے اسی سوچ میں تھا کہ میرے دوست ندیم آصف اور طاہر سے کھیلنے میرے ہوسٹل کے گیٹ پر سوار ہو کر میں نکلے ہی اس طرف میں کھڑا تھا

سب لڑکے کا دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ اس کو ماں کی گھر انکل سلام کرتے ندیم نے جلدی جلدی بتا دیا کہ ہوسٹل کی گرائونڈ کی یہ پہلا موقع تھا کہ کبھی ندیم میرے پاس آیا ہو اور جانے اس نے چپ ہو کر سب سے بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے پوچھا اسی طرح جلدی کیا ہے، انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا سب ساتھ گئے آپ ہمارے پیچھے تو تو کرنے کا ارادہ کر لیں سے سب کا مقصد صرف بلا مقصد پھرنا ہے ندیم نے کہا ہم نے آپ کی پرواہ کے خلاف رات ہی فیصلہ کر لیا تھا اگر ہم نہیں کھیلیں گے، مگر صبح سب مطلع صاف ہو گا تو پکنک پر جائیں گے

مگر کہاں جائیں گے میں نے پوچھا

دریا کے کنارے سب سے مزہ رہے گا کوئل کی کوک کہے گی ہم آم کھائیں گے اور کشتی بھی چلائیں گے یہ سارا پروگرام سے کل ہی کالج سے حاصل کر لیا تھا ہم ابھی جا کر اچھی سی کشتی مخصوص کر لیں گے ندیم نے جواب دیا۔

میرا جی نہیں چاہ رہا تھا میں نے دادی اماں کا بہانہ کیا تو ندیم نے مجھے بزدلی کا سرٹیفکیٹ دے دیا جس کی تصدیق آصف اور طاہر نے کر دی اب مجھے جانا پڑا ہم چاروں دوست ٹکٹ کا اہتمام سے جوں ہی موٹی تازی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے

دریا کے کنارے والی فضا دلآویز اور سماں انتہائی سحر انگیز تھا بوڑھا ملاح کناروں کو دعوت مسرت دے رہا تھا کبھی کبھار ان کا ملاح کناروں کو علانیہ طور پر لہروں کو چھو کر جاتا دریا میں کوئی کشتی نظر آتی کشتی والے گرانی سے ہمارا پاس رکھ کر واپس کر دیا اور کہا "نا جی" کوئی کشتی نہیں مل سکتی ہم سب کو ندیم پریشان ہو گیا اور ہم تینوں نے اطمینان کا سانس لیا

کافی دیر بعد لوگوں کا ہجوم کم ہو کر مسافر کچھ کم ہوئے تو ہمیں یوں معلوم ہوا تھا جیسے کشتی کی سواری اور ہجوم کا رہے ہیں ندیم کنارے پر بیٹھا پاؤں پانی میں ڈالے گدھ کی موجودگی سے ہٹنے لگا دریا میں بڑی بڑی لہریں تیز چل رہی تھیں چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ایک رنگین سی لکڑی کا بڑا سا بیڑا نظر آیا وہ ہماری طرف ادھر ہی چلا آ رہا تھا مگر اس کی

چھ میں ہوجوں کے شور میں ڈولی جا رہی تھی اس کے حسرت بھرے خوبرو چہرے کو دیکھ کر کہا اسے بہو جو مرتضیٰ کا کیونکر کیا کہ مدیم سے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دریا میں چھلانگ لگا دی اس کی طرف سے گزر رہا تھا ایک معصوم کی آہ و بکار پر ماموں مسائل سا صفا رہے وہ سب اچانک چٹائی کے مصروں کا مداوا رہا معاملہ کرے وسے وہ لکڑی کے بکسے کی طرف تیرا اب تک بھی مجھے معلوم ہوا کہ ہم جانتے تھے عالم ہوجوں کی بے رحم موجوں کا مدا سے پر کھڑے بہتے کے بڑھے اور مردوں کھلے رہا تو رکھے اس سطر کو دکھ رہتے تھے سرراں یہ مدیم کے لیے دعائیں کر رہے تھے اور دل میں اس مد بےاما سے کے بے شک مددات موجوں تھے

مدیم لکڑی تک پہنچ گیا اس کا رُخ کنارے کی طرف کیا اور دھکیلنا شروع کر دیا سر بھی دریا کے کنارے کنارے مغرب کی طرف چل پڑے تھوڑی دیر کے بعد مدیم لکڑی سمیت کنارے کے بالکل قریب پہنچ گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا خون ہی لکڑ کنارے پر لا چھوڑ کر لڑکے نے چلا کر کہا اس لکڑی کے اندر ایک سانپ ہے لکڑی میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اسی سوراخ سے اچانک ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا سانپ نکلا اور بجلی کی تیزی کے ساتھ لکڑی کے اس سرے کی طرف دوڑا جس کو مدیم نے پکڑ رکھا تھا اگلے ہی لمحے اس سانپ نے مدیم کو دائیں کلائی پر ڈس لیا اور پھر اسی رو میں جاری کے ساتھ پانی میں غائب ہو گیا کنارے پر کھڑی ہوئی عورتوں کی چیخیں نکل گئیں مدیم وہاں سے نکلا لوگوں سے اس کی معلومات کے مطابق مشورے دیتے شروع کیے کسی نے کہا تارو اور باندھ دو کوئی کہنے لگا فوراً حاجی نام دین روٹی والے کے پاس لے چلو وہ یہاں سے قریب ہی ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں عرض ایک ہجوم سا سر ہے اتنا بارش کھول گئے تھے مدیم نے اس بچے کی طرف دیکھا جس کی جان بچا کر وہ لایا تھا اس کی نگاہوں میں حسرت بھی تھی مگر اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو کہہ رہے تھے کوئی پروا نہیں میں نے اپنا فرض ادا کر دیا موت کا ذرا سا خوف جو دل میں آگے وہ سکتا ہے دیکھے۔

تھوڑی ہی دیر میں مدیم کا کالا سے پھول جیسا چہرہ سیاہ ہو گیا پھر وہ بے ہوش ہو کر گرا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ کوئل کوک رہی تھی، کہ آسمان میں اُڑ رہے تھے اور مجھے وارث اماں کے الفاظ یاد آ رہے تھے "یہ کہہ سب سے بہتر یہ ہے" ہماری آنکھوں سے بھری ٹوٹی گزر گئی معلوم کہاں تھی ہمارا مدیم ہم سے جدا ہو گیا تھا ہم سب بے بس تھے کہ عالم جاں تھا اسی دن ہم مدیم کی لاش کو لے کر ضلع جہلم کے ایک دور افتادہ گاؤں ڈھوک کریم داد جاں کی طرف جا رہے تھے جہاں اس کی ماں اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے اس کے سر پر سہروں کا سہرا باندھنے کے لیے بےچینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی پرنصیب ماں کو کیا خبر تھی اب وہ تمام عمر کسی کے ہاتھوں میں مہندی نہ لگا سکے گی اور پھولوں کا سہرا باندھنے کی بجائے اب وہ اپنے جوان سال لختِ جگر کی قبر پر پھول چڑھائے گی

مدیم ضلع جہلم کے ایک وضع دار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اس کے والد کرنل راجہ محمد اسلم پاک فوج کے سینئر افسروں میں سے تھے اور ۶۵ء کی جنگ میں جمہ جوڑیاں محاذ پر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے تھے مدیم اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور میڈیکل کالج میں فائنل ایئر کا طالب علم تھا میں مدیم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ہم دونوں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی میں زیر تعلیم تھے مدیم کے والد کرنل اسلم آیا کرتے تھے اور مدیم کے ساتھ مجھے بھی بہت پیار کرتے وہ بہت زیادہ دس سال اور وہ تھے سب سارے کالج میں ایک سوال مرنے کے سے بہتر نہ تھے ہم کیسے بھی بھائی ہو جو بھی کوئی رنگ کا نہ دیا ایک بچہ تو کرنل صاحب کا رنگ متغیر ہو جاتا وہ ملک کی بدحالی کا رونا روتے اور سرمایہ داروں کی ہوس مالی کا رونا روتے۔ جاگیرداروں کا بڑھتا ہوا عمل دخل اور سیاسی جماعتوں کی ہوس اقتدار مصورہ ملک کی سیاسی ابتری کا ذمہ دار ٹھہراتے مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ مرحوم نے جاگیر دار ملکیت کو جسے اپنی عمر بھر کی کمائی کا ثمر سمجھتے تھے وہ خود بھی اس سلسلے میں رحمی سے کار بند تھے ان کے ہاں ایک لڑکا مدیم اور ایک لڑکی سائرہ تھی

ہم کھانیاں سے گزر کر جہلم کی سنگلاخ زمین میں داخل ہو رہے تھے شام کی تاریکی اُس دن سے لبریز تھی اور دل ملامت سے بھاری ہم سوچ رہے تھے کہ مدیم کی ماں کی خدمت میں کیا تحفہ لے کر جائیں گے۔ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا کہ ہم ضلع جہلم کے ایک بے نام گاؤں میں پہنچ گئے ٹرک ایک شکستہ حویلی کے سامنے رکا اور ہم نے دیکھا مدیم کی لاش کے ساتھ ہی مدیم کی لاش اتار رہے تھے مدیم کی ماں اچانک بہت پوری سی رکی اور کر گری ہر طرف کہرام مچ گیا رات کی دوسری آبادیوں سے بھی لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور چاروں طرف آہ و بکا اور ہم چارپائیوں پر بیٹھے لوگوں کے بے شمار سوالات کا سامنا کر رہے تھے اگلی صبح تک معلوم نہیں کتنے ہزاروں لوگوں نے مدیم کی موت کا دکھ درد اپنا بنایا یہ سورج کے طلوع ہوتے ہی مدیم کو غسل دے کر اور خوشبو میں بسا کر دفن کرنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں مجھے مدیم کے چہرے کی شگفتگی اور جاذبیت آج بھی یاد ہے اس کا چہرہ اپنی سدا بہار مسکراہٹوں کے ساتھ گویا الوداعی سلام کہہ رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ کرنل شہید کی روح مدیم کی روح سے ہمکلام ہے اور باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں میں دونوں روحوں کی گفتگو سن رہا ہوں مدیم کی روح اپنے باپ کی روح سے مخاطب ہے ابو آپ اس ملک کی خوشحالی کے لیے ہر وقت دعا کرتے تھے آپ کہا کرتے تھے کہ دکھوں کو بے پناہ کرنا اور ان کی مشکلات دور کرنا اسلام کا سبق ہے اب مجھے سامنے کھڑا کر کے کس کو بچانے جان کر دے کر چکا رہے گی اور کل اسے ڈولی میں کون ڈالے گا، ہاں اب مجھے جواب دو کہ سائرہ کا محافظ کون ہو گا اور امی کیسے دیکھ کر اسے دل کو ٹھنڈا کرے گی، ہاں ابا، میں پوچھتا ہوں یہ سب بڑی حویلی اور باغ اور ملک میں پیدا ہوا روپیہ اور سرسبز کھیتیاں کس کے کام آئیں گی"

میں اسے خیالات کی دنیا میں گم تھا کہ مجھے ایک اندوہناک چیخ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا مدیم کی امی نعش پر جھکے کا جنازہ اٹھتے دیکھ کر فرط غم سے بے ہوش ہو کر گر پڑی تھیں ان کا لخت جگر انہیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے رہا تھا ان کے لیے دنیا اندھیر ہو چکی تھی اور زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو چکی تھی

میں اب ہر سال مدیم کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے جاتا ہوں مجھے ہر سال میں ایک بڑھیا ملتی ہے جو سمجھ سے ایک سوال کرتی ہے "میرا مدیم کب آئے گا؟ کیا کالج سے اسے چھٹی نہیں ملتی" اس کے بیٹے بیٹیوں میں مل جاتے ہیں یہ مدیم کی بدنصیب ماں ہے میں جب بھی اس بڑھیا کو دیکھتا ہوں مجھے اپنے کالج کی وہ بدنصیب عورت یاد آ جاتی ہے جسے بہت عرصہ ہوا اٹھارہ سال ہو گئے تھے وہ بھی اسی طرح سامنے گاؤں کے قبرستان میں ہر بار سے پوچھا کرتی تھی میرا اسجاد کہاں ہے؟ میرا اسجاد تو کبھی نہیں رکھا میرا اعجاز کب آئے گا؟ مجھے مرنے اور کے پاس لے چلو [illegible]

[illegible]

لیکن اسے کسی ایک طرف ایمان و ایقان میں [illegible] سکا۔

شبہات مجہول طریقے سے ملے جلے ہوتے ہیں۔

# تعلیمی ضرورت

از حمود الرحمٰن
سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ علم کا یہ تصور کہ اس کا حصول ذہنی قوتوں کے ابھار اور لطیف انسانی جذبات کی تہذیب کی خاطر ہو، اب چند لوگوں کے وقتوں کی بات ہو گئی ہے۔ آج کے دور کا رجحان یہ ہے کہ تعلیم کو بس معاش کا ذریعہ بنا لیا جائے، بجائے اس کے کہ اس سے تربیت و تہذیب حاصل کی جائے۔ آج ہمیں جس علم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے جو ہمیں امراض کا خاتمہ کرے، انسانیت کے دکھوں کو دور کرے، ضروریات پوری کرنے کے لئے قدرتی ذرائع کو بھرپور استعمال کرنے، بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے خوراک و رہائش کا انتظام کرے، تمام طبعی تکالیف کو اس کی کم سے کم حد تک محدود رکھے اور ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل بنائے جس میں ہر کسی کے لئے مسرت سے ہمکنار ہونے کا امکان ہو۔ یہ سب کچھ اتنا مفید ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے ضروری ہونے کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ذرا ٹھہر کر سوچے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اگر اعلیٰ تعلیم سے محض یہی کچھ مراد لے لی جائے تو اعلیٰ تعلیم اپنے حقیقی مفہوم کو کھو دے گی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی ترقی میں ان کی نسبت جنہوں نے فوری عملی نتائج کی خاطر اصلاحات کیں ان لوگوں کا زیادہ اہم حصہ رہا ہے جنہوں نے علم کی خاطر حصول علم میں اپنے کو کھپا دیا خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم رہی ہو۔

جوں جوں انسانی علم میں اضافہ ہو رہا ہے، انسانی مسائل کی پیچیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر وہ قدم جو بنی نوع انسان کی مادی ترقی میں آگے اٹھتا ہے۔ نئی خواہشات، نئے مسائل اور کچھ نئی مایوسیاں ساتھ لاتا ہے۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں یہ ترقی تباہی و بربادی کے ان آلات کے ساتھ مربوط ہے جن سے انسانیت کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے۔ اور کیا یہ بوالعجبی نہیں کہ ایک طرف ہم انسانی مسرت میں اضافہ کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم زیادہ تیز رفتاری سے اوہام و تشکیک کا شکار ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح اپنے کو مستقل پریشانی اور تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ جس شدت و بیباکی سے ہم نے قدرت کو فتح کرنے کا آغاز کیا ہے، اس نے ہم کو یہ تقریباً بھلا ہی دیا ہے کہ ہم دراصل انسان ہیں اور محض جسم اور ذہن ہی نہیں، روح بھی رکھتے ہیں۔ جس طرح جسم کی نشوونما کے لئے غذا اور ذہن کی اصلاح کے لئے علم ضروری ہے، اسی طرح روح کی بالیدگی کے لئے ایمان ناگزیر ہے۔ ایمان کا ضیاع شدید ترین جسمانی امراض سے زیادہ خطرناک مرض ہے۔ قدیم انسانی تاریخ کے ماہرین ہم کو یہ بات باور کراتے ہیں کہ بہت سے قدیم قبائل محض اس لئے صفحہ ہستی سے مٹ گئے کہ ان کا اپنے طریقہ حیات پر ایمان نہ رہا تھا۔ ہم کو یہ غلطی نہ دہرانی چاہیئے۔ اگر ہمیں اپنی بقا عزیز ہے تو ہمیں انسانی اقدار پر اپنے ایقان کو حیات نو دینی چاہیئے اس لئے کہ تعلیم، جو ہمیں محض یہ بتائے کہ جسم کو برقرار رکھنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں جس کے پیش نظر محض ہمارے ذہن کی نشوونما ہو، نامکمل ہے، جب تک کہ وہ ہمیں انسانی اقدار پر ایمان عطا نہ کرے اور یہ صرف ایمان ہی ہے جو ہماری روح کو شاد کام کر سکتا ہے۔

آج ہم ایک نئے اجتماعی نظام کی تشکیل میں مصروف ہیں، لیکن یہ نظام کیا شکل اختیار کرے گا؟ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں میں کن اقدار کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ ہم کو یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ مستقبل میں ہمارے ملک کا دارومدار اور قوم کی قسمت کا اصل انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس نوعیت کے انسان پیدا کر رہے ہیں۔ ہم نے معاشرتی استحکام، عدل اجتماعی اور فرد کے حقیقی مقام کا نصب العین اپنے سامنے رکھا ہے۔ اگر ہمیں اس نصب العین کے حصول کی راہ میں آگے بڑھنا ہے تو ہماری یونیورسٹیوں کو —— جو ہمارے نظام تعلیم کی اعلیٰ آزمائش اور انتہا کا محور ہیں —— ایسا نصاب تعلیم و تربیت وضع کرنا چاہیئے جو صرف مفید علم میں اضافہ ہی کا باعث نہ ہو بلکہ ہمارے نوجوانوں میں واضح فکر، صائب فیصلے، شدید عصبیت اور منظم دیانتدارانہ اخلاق کی صفات پرورش کرے اور ان اعلیٰ انسانی اقدار کا صحیح شعور عطا کرے جو صرف فرد کی آرزوؤں کی تسکین ہی کے لئے نہیں بلکہ وسیع پیمانہ پر قومی امنگوں اور تمناؤں کو پالنے کے لئے ناگزیر ہے —— ہم میں سے جو خدا پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لئے ایک مرکزی نقطہ پہلے ہی سے موجود ہے۔

تعلیم فرد کی ذہانت کو ترقی دینے کے لئے محض مشقوں کا نام نہیں —— اس کا مقصد فرد کو صرف اس کی اپنی ذات کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے آس پاس

لینے والوں اور اس کے ماحول کے بارے میں بھی علم فراہم کرتا ہے۔ فرد اپنی اجتماعی گروہ کسی طبقہ یا کسی قوم کے ایک فرد کی حیثیت ہی سے زندہ رہ سکتا ہے وہ تعلیم نہیں جو اس کو اس کے گروہ، طبقہ یا قوم سے کاٹ دے اور وہ تعلیم ہو ہی نہیں سکتی جو اس اجتماعی نظام کی جڑیں کاٹنے والی ہو اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم، فرد کو معاشرہ کے ایک بہترین رکن کی حیثیت سے تیار کرے تو ہمارے نظام تعلیم کو لازماً ہمارے نظریات کا عکاس ہونا چاہیئے۔

مغربی طرز کا نظام تعلیم جو ایک صنعتی معاشرے کی ضروریات کے جواب میں تشکیل پاتا ہے اصل اہمیت وجود و بقاء کے لئے مادی کشمکش اور مقابلہ کو دیتا ہے۔ اس برصغیر کے مفکرین نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ہے۔ جس طرح ہر یورپی چیز جس کو پہلے پہل اچھا سمجھا گیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ملمع اترا بالکل اسی طرح یہ مادہ پرست نظام تعلیم کے نقائص بھی واضح ہونے شروع ہو گئے رابندرناتھ ٹیگور جو مغربی سائنس اور تمدن کے حامی تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ نظام تعلیم مقامی ماحول سے کٹا ہوا ہے انہوں نے مغربی طور طریقوں کے ساتھ غلامانہ تعلق کے خلاف متنبہ کیا اور کہا کہ اگر تعلیم کو فی الواقع مفید بنانا ہے تو اسے ان لوگوں کی معاشی، سماجی، معاشرتی اور روحانی زندگی سے مربوط و ہم آہنگ ہونا چاہیئے جنہیں وہ دی جاتی ہے ٹیگور ان لوگوں میں سے تھے جنہیں جدید سائنس کی افادیت کا احساس نہ ہو لیکن ان کا یہ ایقان تھا ہمارے لئے مناسب ترین تعلیم وہی ہو سکتی ہے جو ملک کے اپنے تہذیب و تمدن کے ساتھ جدید سائنس کے اصولوں کو سمو کر تشکیل پائے

علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا کہ تعلیم کا اصل مقصد فرد کی شخصیت کی نشوونما اور اس کا ارتقاء ہے ـــــــ ان کی نظر میں جس فرد کا ملت سے ربط نہ ہو وہ کچھ بھی نہیں ـــــــ فرد صرف اس صورت میں کسی حقیقی وجود کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ اجتماع کے مقاصد کو جذب کرے اور اپنی شخصیت کے ذریعہ ان کا اظہار کرے، اس لئے ہماری نظر میں تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ فرد کی اس طرح کہ ہمہ گیر تربیت ہو، اس نقطہ نظر سے اگر علم کی کامیابی کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ فرد میں ان نظریات کا حقیقی شعور جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہے کس حد تک پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ دنیوی زندگی میں کامیابی میں اس کا کیا حصہ ہے یا یہ کہ ملازمت کی تلاش میں وہ کیا مدد دیتی ہے، اور روحانی کیفیت پر غالب ہے جس کا عظیم مفکر کانٹ کہنا ہے:

"بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری فکر نظام نظرت سے نتائج اخذ نہیں کرتی بلکہ اس پر اپنے نتائج ٹھونس دیتی ہے"

مختصر یہ کہ یہاں آدمی کا اپنا نقطہ نظر ہے جو کام کرتا ہے اور شے کی تعبیر کرتا ہے اس طرح سائنس جو خود نہ مادی ہے اور نہ روحانی۔ ہمیں کائنات کی بے شمار تعبیرات کی طرف لے جاتی ہے، یہ تعبیرات مادی بھی ہو سکتی ہیں اور روحانی بھی مغربی تہذیب کی بنیاد چونکہ مادیت پر ہے اس لئے اُس کے سائنسی علوم میں بھی مادیت ہی کی روح رچی بسی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید سائنسی علوم کا مطالعہ اسلام کے ثقافتی حقائق کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان کے مطالعہ کے دوران اس نقطہ نظر کا اختیار کرنا اسلام کے خلاف ہے جو مغرب کی مادی تہذیب کے ساتھ مخصوص ہے سائنس کی درس و تدریس مغرب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ آج عالم اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایک نئے فلسفہ یا نقطہ نظر کی نہیں بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ سائنسی اور تکنیکی آلات کی ہے اس مسئلے کا بہترین حل میرے خیال میں یہ ہے کہ مغرب کے طبیعی علوم اور بیان کردہ طریق پر تو ہمارے اسکولوں میں بے شک رائج کر دیئے جائیں مگر یورپی فلسفہ، ادب اور سماجی علوم کو وہ بنیادی اہمیت حاصل نہیں رہنا چاہیئے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے ناپختہ ذہن چھوٹی عمر میں مغربی تہذیب کے منفی پہلو کا ادراک نہیں کر سکتے اس لئے اس کی ظاہری چکا چوند سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اس طرح شروع ہی سے اُن کے دل میں مغربی تہذیب کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف مطالعۂ تاریخ کے نقطہ نظر سے ہی دیکھ لو صورتِ حال کی بڑائی ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے مغربی مؤرخین تاریخ عالم کی تعبیر خالص اپنے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ اُن کے تاریخ پیش کرنے کا جس کا اعتراف وہ کبھی نہیں کرتے ـــــــ یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ مغربی نسلیں اور ان کی تہذیب دنیا کی ہر نسل اور تہذیب سے اعلیٰ اور برتر ہے اور اسی طرح وہ باقی دنیا پر مغرب کے تسلط کی اخلاقی توجیہ فراہم کرتے ہیں۔ مطالعۂ تاریخ کا یہی خود مرکزی (SELF-CENTERED) غلط نگاہ ہے جس نے اب حال ہی تک مؤرخین کی لکھی ہوئی دنیا کی تاریخوں کو مغرب کی تاریخ بنا دیا تھا ان تاریخوں میں غیر یورپی اقوام کا تذکرہ اس حد تک کیا جاتا تھا جس حد تک یورپ کے مستقبل پر وہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہوں گویا باقی ساری دنیا یورپ ہی کے لئے تخلیق کی گئی ہو اور دنیا کی باقی تہذیبیں محض اس لئے پروان چڑھی ہوں کہ مغربی تہذیب کی عظمت ان کے مقابلہ میں ذرا زیادہ شان و شوکت سے واضح ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تاریخوں کا مطالعہ غیر یورپی نوجوانوں میں اپنی تہذیب تاریخی ورثے اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تعلیم نہایت منظم طور پر غیر یورپی نوجوانوں کو اپنی تہذیبوں سے متنفر کرانے ساتھ ساتھ مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کا سبق بھی دے رہی ہے۔

پس اگر ہم اسلامی اقدار کا تحفظ اور احیاء چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید چھوڑنا پڑے گی حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اپنانے کے نقصانات اُن چند مادی فوائد سے کہیں زیادہ ہیں جن کی خاطر ہم اس تہذیب کے دلدادہ ہوئے ہیں۔

اگر ماضی میں مسلمانوں نے سائنسی تحقیق سے صرفِ نظر کیا ہے تو آج وہ اپنی اُس غلطی کا تدارک مغربی علوم سے نہیں کر سکتے

اگر ہم اسلام کو بحیثیت ایک تہذیبی عامل اور تمدنی طاقت کے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب کی ذہنی فضا سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا جو ہم پر حملہ آور ہے۔ مغربی اطوار کی پیروی کرتے کرتے مسلمان آہستہ آہستہ مغربی نقطہ نظر بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں کیونکہ خارجی مظاہر میں تقلید ان نظریات کو قبول کرنے کی طرف بھی مائل کر دیتی ہے جو اس خارجی مظاہر کی بنیاد ہیں۔

# جگرِ لخت لخت

ع "پھر جمع کرتا ہوں جگرِ لخت لخت کو"

جناب انہاں جامعہ کے طلبہ وطالبات کے جگر گوشوں
لہو کے قطروں - اور سوچ کے سمندروں کی لہری
اڈاریوں سے آپ کو متعارف کرانے ہیں جن کا کلام کم ہے
اس میں قصور ان کا ہے - کہ بقیہ شعر' سادہ ہی اچھے' ہے

## انتخاب

### "انقلاب"

محمد اکرم ناصر ...

وقت کا لمحہ لمحہ صدا دے رہا ہے
اٹھو جلد خوابوں کی دنیا سے نکلو
تم آتش فشاں ہو تو لاوا بکھیرو
وگرنہ سنو ——
کہ یوں سوئے رہے
برف گرتی رہی ——
دیکھنا ایک دن تم بھی جسم باؤ گے

*

### شاہد سلیم

(شعبہ عمرانیات)

میری سوچ کا سمندر درپن
سات سمندر تک پھیلا ہے
مٹھی میں تتلی تھی شاید
رنگ ہتھیلی پہ پھیلا ہے
رات کا سناٹا اور آئیں
جانے کس کا گھر اجڑا ہے

### زندگی

عبدالرؤف نظامی

(شعبہ ارضیات)

یہ عظیم کائنات
یہ کائنات رنگ و بو
اور رنگ و بو کی محفلیں
ان محفلوں میں رونقیں
پھر رونقوں میں شور ہے
اس شور میں اٹھتی صدا
یہ صدائے من و تو
اس صدا میں سوز ہے
اس سوز میں تاثیر ہے
تاثیر میں اخلاص ہے
اور اخلاص ہی ہے زندگی
"زندگی بے بندگی شرمندگی"

# غزل

**سعید ظفر** (شعبۂ اُردو)

تتلیاں ساری کتابوں میں سجائی جائیں گی
اور پھولوں میں پڑا بس دیکھتا رہ جائیگا

سال بھر کیا، عمر بھر تو میری آنکھوں میں دیکھ
ان نگاہوں میں مگر تو ہی بسا رہ جائے گا

وہ چلی جائے گی ڈگری لے کے بوڑھی ماں کے گھر
تو اسے کیمپس کے پل سے دیکھتا رہ جائیگا

سب گلابوں کو سجا لے گا کوئی کالر نواز
اور بھونرا اپنا سر نوچتا رہ جائے گا

نوچ لے گا وہ تری آنکھوں سے ہر اک خواب کو
اور آنکھوں کے لیے اک رتجگا رہ جائے گا

*

**طارق عزیز طارق** (شعبۂ اُردو)

سبز ان تنگ و ترنگ درختوں پر ہے برف کی اک چادر
پھر بے حال بہاروں سے پکھیرو اُڑے، رُت بدلی
پھر سے ٹھنڈی آہوں میں اب جلتے بجھتے دیے ہیں
پھر بے چین سمے نے گھر میں ڈیرے ڈالے، رُت بدلی
اس موسم کے پہلے پنچھی لوٹ کے آئے پھر اپنے دیس
سوکھی شاخیں، ٹوٹ رہے ہیں پیلے پتے، رُت بدلی

**ناصر حمید حمیدی** (شعبۂ سماجیات)

ہم کڑی دھوپ میں تنہا ہی چلے تھے یارو
دشتِ فرقت میں کہیں سایۂ دیوار نہ تھا
وہ شفق رنگ غزالوں کی نشیلی آنکھیں
کون کافر لبِ ساغر کا گنہ گار نہ تھا
شہرِ آشوب میں ناصر سے جدائی توبہ
وقت اس قدر پہلے سرپیکار نہ تھا

*

**خاور منصور** (یونیورسٹی لاء کالج)

لطافتوں کا وہ پیکر تھا آنکھ نے دیکھا
چراغِ دل سے مگر روشنی سی کی تو سہی
نہ سوچ پھیل گیا غم کئی زمانوں پر
یہ دیکھ دوستی اس بُت سے کچھ بڑھی تو سہی
یہ اور بات کہ غم کا مداوا ہو نہ سکا
خوشی تو یہ ہے کہ بات اس نے اب سنی تو سہی

*

**بشریٰ بیٹ** (شعبۂ اُردو)

مجھ کو دامن میں چھپایا بس غبارِ راہ نے
دور تک دشتِ محبت میں کوئی سایہ نہ تھا
دل بھی تڑپا میں بھی تڑپی رات کے پچھلے
اور تھا کھڑکی میں کوئی چاند کا سایہ
میں نے غم بانٹے ہیں بشریٰ بے نوا کلیاں
یوں تو میرے پاس اس جیون کا سرمایہ نہ تھا

عظمیٰ سلیم

(جاوید اقبال راستیل ورک)

# نئے دنوں کی بات

تم رات بھر جاگتی رہی ہو
صبح کا تارا نمودار ہونے تک
چھت پر منڈیروں کا سہارا لیے
تمہارا وجود
سرد موسم میں کہر اور دھند میں لپٹے اندھیرے چھپائے رہے
اسے تمہارا درد سمونے کی کوشش کرتے رہے
سفر ——
میں نے کرب جھیلے اور ہر ساعت اداسی سوچوں کے دکھ جھیلے ہیں
سکوں ——
مصنوعی لفظوں کے عذاب سے میں بھی تھک گیا ہوں
اس تپتی دوپہر میں
گھنی دار شاخوں کی تلاش میں ہوں
کہ میں نئے سورج کی ان کرنوں کی حدت ، برداشت کرنے کے قابل نہیں
جو اپنے ساتھ مہذب حدت بھی لائی ہیں
سماعتوں کے ارتکاز سے
تخلیقی ساعتیں جہنم سادی میں روشنی بکھرنے سے تو جل لگتی ہے

ایسے میں تخلیقی لمحے بارش کے قطرے بنتے ہیں
قوس قزح نکھرتی ہے ، رنگوں کے جادو پھیلتے ہیں
میرے گھر میں بہت حبس ہے
چاہتا ہے آج بارش برسے
ہم خوب اودھم مچائیں
راحتوں کا احساس اتنا ہی ضروری ہے
دکھوں کا اس کا انکار

زہر کے پیالے اور سقراط کے مقدس ہونٹوں کی توہین
کہ سچائی
ابدی مسرت زہر کا پیالہ
اس کا سچا اظہار میری جاں
نیند سے بوجھل پلکیں
حقیقتوں کی شکست کا اعلان ہیں گی
کل نئے پرچم نئے اسلحہ
انسانی اذہان کی تخلیق میں پوشیدہ مفاہیم کا ادراک
سو ہم اس وراثت کی جنت عدن میں واپس لوٹتے ہیں
یہ واپسی          کی میعاد ہے
کہ دکھ ہماری میراث نہیں
ہم آئندہ نسلوں کی وراثت بھی
راحت تجویز کرتے ہیں
ماتم رسمی ہے
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کلیاں روشنی کا احساس دلاتی ہیں
تمہارے ہاتھ میرے ہاتھ میں ہیں
ہم نئے عہد کی آمد کا گجر بجاتے ہیں
صحرا میں دور نخلستانوں کا نشان
تاریک رات کے بعد صبح کے تارے کی یقینی امید
خوشیاں —— ابدی راحتیں
زہر کے پیالے میں بھی اٹکھیلیاں

ہمارے پیار کا عہد نامہ
اور نئے عہد میں محبت کرنے والوں کا مینی فیسٹو

## شمشاد اختر (شعبۂ سماجیات)

میں بار بار تقاضائے وصل کرتا ہوں
وہ بار بار بہانے بناتا رہتا ہے
میری نگاہ کے بکھراتے آبگینوں میں
تیرا سراپا صنم جھلملاتا رہتا ہے
اسے بھی دیکھ ستاروں کو دیکھنے والے
جو تیری یاد میں آنسو بہاتا رہتا ہے
میری نظر کا تجسس میری لگن کا خلوص
حریمِ ناز میں ہلچل مچاتا رہتا ہے

## محمد علی نوید (شعبۂ فارسی)

رنگ سی رنگ میں ملبوس بہاراں کی طرح
وہ اکیلا ہے مگر پورے گلستان کی طرح
جاگتی آنکھوں سے جو خواب کبھی دیکھے تھے
اب انہیں ڈھونڈتا ہوں عمرِ گریزاں کی طرح
عجب حسن کا موسم ہے کہ اب گلشن میں
پھول بھی کھلتے ہیں تو چاکِ گریباں کی طرح

---

# پہچان

سلیم منصور خالد
(شعبۂ سیاسیات)

برفانی تاریک فضا میں
رات کے اندھے سناٹے میں
سوچ کے جھولے جھول رہا تھا
پہچانوں میں اپنے من کو
تیرے من کو
میرے ہمدم
تو نے کیسا جسم لیا ہے
چٹیل، جھلسے اور پتھریلے شہرِ جفا میں
من کی دنیا، من کی بستی، دل کے نگر اور شہرِ وفا میں
بس تو ہے اک زندہ لاشہ —— زندہ انساں

ورنہ اک اک انگ ہے پتھر
پھر بھی تو ہے
جیون ساتھی، پیارا ساتھی
سچ سچ کہہ دے
آخر اپنا جرم ہی کیا ہے
مجھ سے تو کیوں بیگانہ ہے
کیا ——
میں بھی بن جاؤں بیگانہ
توڑ کے جام و مینا سارے
پیس کے سب برلان کے پتھر
قریہ قریہ، بستی بستی
ہر سورج کو، ہر چندا کو، ہر تارے کو
نوچ کھسوٹ پھر توڑ کے سب کو
ہر دو لوں کو را کھ بنا کر

جھوٹے نقلی دیپ بجھا کر
ایک دیا ایسا بھی جلاؤں
دھیرے دھیرے، ہولے ہولے
اپنے ان بے بس ہاتھوں سے
ایک مجسم پیکر ڈھالوں
الفت اور اخلاص کا پتلا
جس میں ہو سورج کی حدت
جس میں ہو چندا کی ٹھنڈک
اور چمک جھلمل تاروں کی
تیرے نینوں کے درپن میں
اپنے من کو خود پہچانوں
ورنہ جیون ہے لاحاصل
مجھ کو اس کی تاب نہیں ہے
شاید رسا یہ خواب نہیں ہے !

ڈاکٹر سید عبداللہ (سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج)

# شاہراہِ تعلیم

پچھلی صدی میں بعض ایسے ارباب فکر بھی گذرے ہیں جو کہتے تھے کہ تعلیم تو ایک گھوڑا گاڑی ہے اس پر بیٹھ جائیے، سواری کیجئے، پھر واپس آکر گھوڑے طویلے میں باندھ دیجئے اور گاڑی کو شہتوت کے درخت کے نیچے۔ پھر ضرورت ہو تو پھر جوت لیجئے پھر چھوڑ دیجئے۔ پھر لیجئے بس تعلیم سے آدمی کا اتنا ہی تعلق ہوتا ہے ضرورت کے لئے استعمال کیجئے پھر اسے دل و دماغ سے نکال کر اسی طرح طاق پر رکھ دیجئے جس طرح سوتے وقت کوئی آدمی عینک کو طاق پر رکھ دیتا ہے۔ یہ دلیل دینے والے بھی شاید دل میں یہ سوچتے ہوں کہ تعلیم نہ گھوڑا گاڑی ہے اور نہ عینک بلکہ فرد اور سوسائٹی کے جسم و جان دونوں سے گہرا تعلق ہے اس واسطے سے مذہب، اخلاق، معاشرت، سیاست غرض زندگی کا داخلی اور خارجی ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے اسی لئے اکبر نے کہا تھا کہ

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اگر غور کیا جائے تو تعلیم اتنا وسیع عمل ہے جس کی حدیں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اس کا تعلق تو انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ طہارت اور معاشرت سے بھی ہے اور اخلاق شہریت سے بھی ہے ایک جامعی اور باثروت گھرانے سے بھی ہے اور اگر امام غزالی کی بات مانیں تو رضائے الٰہی اور عقبیٰ سے بھی ہے

میری نظر میں تعلیم ایک مقدس سماجی ادارہ ہے جو کل زندگی کا قائم مقام ہے لہٰذا تعلیم کی آخری اور صحیح منزل فرد اور سماج کی کل زندگی کو صرف متاثر کرنا ہی نہیں بلکہ اسے سنوار کر باثروت بامعنی اور انسانیت کے لئے اور ذات کے لئے خوشگوار بنانا ہے اس منزل تک پہنچنے کے کئی راستے انسانوں نے اپنی تاریخ میں تجویز کئے اور آج بھی دنیا کی مختلف ترقی یافتہ اقوام اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی بصیرت کے مطابق ان راستوں کی نشاندہی کر رہی ہیں ہر ملک کی تعلیم کے کچھ مخصوص مقاصد ہوتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں میں یہ کوشش کروں گا کہ اپنے ملک کی تعلیمی منزلوں کے بارے میں کچھ گفتگو کروں۔ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر پاکستانی تعلیم کی چند ایسی خصوصیات کا شمار کیا جاتا ہے جن کا پاکستان کے نظام تعلیم میں ہونا ضروری ہے۔

ایک اہم خصوصیت تعلیم میں مقصدیت کا ہونا ہے کہا جاتا ہے کہ تعلیم جو بھی ہو مفید ہوتی ہے لیکن یہ خیال درست نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ (اے خدا مجھے بے نفع علم سے بچانا!) اس کے صاف صاف یہ معنی ہوئے کہ بعض علم ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے نفع ہوتے ہیں بے نفع علم کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ مگر اس دور تعلیم میں بے نفع تعلیم وہ ہوگی جو تعلیم پانے والے کو اس کے مقصود تک نہ پہنچائے۔ یہ مقصد روحانی بھی ہو سکتا ہے اور ذہنی و فکری بھی، عملی بھی ہو سکتا ہے اور اقتصادی اور معاشی بھی۔

ہمارے دور میں تعلیم کا ذکر اس لئے کیا کہ آج کل تعلیم ایک منظم سماجی ادارہ ہے اور ہر سماجی ادارے کی طرح یہ بھی ایک پلاننگ چاہتا ہے اور چونکہ اس کا تعلق اب بیشتر حکومت سے ہے، ————— اس لئے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ تعلیم کے وسائل کہاں تک موجود ہیں اور وہ مقاصد جو قومی لحاظ سے ملکی ضرورتوں کے سلسلے میں مد نظر ہیں وہ کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا یہ سارا عمل تنظیم کا محتاج ہے یعنی کہہ دینے سے اور سوچنے سے نہیں ہوگا ورنہ وہی حال ہوگا کہ ایک طالب علم کا ہوا تھا جو پڑھتا کم تھا صرف اپنے استاد کی قبر کے پاس کتاب کھول کر بیٹھ جاتا تھا اور زور زور سے دعا کیا کرتا تھا۔ اے اللہ علم نافع عطا کر۔ کئی مہینوں تک یہ عمل اس نے جاری رکھا مگر اس کو اپنی کتاب کا پہلا سبق بھی یاد نہ ہوا۔ آخر ایک دن طیش میں آکر کتاب کے ورق پارہ پارہ کر دیئے اور استاد اور استاد کے استاد کو برا بھلا کہا مگر بازاروں میں جا کر بیٹھ گیا اور کہا: لعنت ہے علم پڑھنے والے پر اور پڑھانے والے پر۔ سب سے اچھا علم وہ ہے جو شام کو کھانے کے لئے چار پیسے تو دلوا دے

## بے کار اور بے نفع تعلیم

انگریزی دور کے آخری حصے ہی میں یہ صورت حال پیدا ہو چلی تھی کہ بہت سے لوگ اپنی تعلیمی تحصیل کو بیکار اور بے مصرف سمجھنے لگے تھے کیونکہ تعلیم کا مقصد واحد نرا تے نوکری تھا۔ اس لئے بے روزگاری پیدا ہوئی اور یہ صورت حال کم و بیش اب بھی موجود ہے یہ بھی تجربہ ہے کہ ۹۰ فی صدی اشخاص اس لئے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں کہ شاید اس کے بعد انہیں نوکری یا عہدہ مل جاتے سو کہ نہیں ملتا اس لئے بے اطمینانی اور پریشانی کا سامان ان کے مقدر میں کم سے کم اتنی ہی عقل مل جاتی جتنی روزانہ لکڑہارے کو حاصل تھی۔

اگر تعلیم کا ایک مقصد نوکری بھی ہے تو تعلیم کے ارباب اختیار کا قوم کی طرف سے پہلا فرض یہ ہے کہ تعلیم کے موجودہ راستوں کو فوراً بدل ڈالیں یورپ کی ہر مثال صحیح نہیں مگر ہر مثال غلط بھی نہیں۔ یورپ میں اسکول دو طرح کے ہیں ایک وہ اسکول جن میں تعلیم برائے تعلیم ہوتی ہے دوسرے وہ اسکول جن میں تعلیم برائے معاش ہوتی ہے۔ ان اسکولوں کے چند ابتدائی برس یکساں ہوتے ہیں۔ پھر ہر سال کے میلان راستے بدل جاتے ہیں۔ تعلیم برائے معاش کی مدت کم ہوتی ہے اور فراغت کے بعد لوگ ایسے ایسے معاش میں جذب ہو جاتے ہیں اور اوپر کے اس بے پناہ ہجوم سے بچ جاتے ہیں جو آج کل ہمارے یہاں نظر آتا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پاکستان ایک زراعتی ملک ہے اس میں صنعتی ترقی ابھی نہیں ہوئی اور جہاں تک زراعت کا تعلق ہے وہ پرانے طریقے پر چل رہی ہے۔ لہذا اسی میدان کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد معمولی تعلیم پانے والے آدمی کو کیا خاص فائدہ؟ یہ اعتراض درست ہے لیکن کسی جرأت مند قیادت کو کسی نہ کسی دن، بیکار اور بے نفع تعلیم کے راستے بند کرنے ہوں گے۔ یہ بھی پچھلی صدیوں کی غلطیوں اور مجبوریوں بلکہ نقصوں میں سے ایک ہے کہ لوگوں کو مقامی، دیہی پیشوں سے متنفر کر کے بابو بنا دیا گیا تھا۔ یہ اسی زمانے کا تحفہ ہے کہ بابو بننا ترقی ہے سب سے بہتر ہے۔ اور جولاہا ہونا اور نائی ہونا ایسا گناہ ہو گیا تھا کہ لوگ اپنی ذات کو چھپانے لگے تھے تاآنکہ گاندھی نے جولاہا پن کو اس پیشے سے کچھ داغ دھونے کا اعلان کیا ہو رہا ہے۔ باپ ہل چلا رہا ہے بیٹا بیکار میٹرک پاس، اسے پاس اپنے گاؤں کے تکیے یا گھر میں یا قصبے کے قہوہ خانے میں سگریٹ پی رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی پہلی کتاب میں یوں خوشخبری دی تھی کہ بیٹا جب بڑا ہوگا تو آپ بھی کھائے گا اور باپ کو بھی کھلائے گا مگر یہاں کیا ہے — بیٹا بڑا ہو کر اور میٹرک پاس کر کے باپ کی کمائی اڑا رہا ہے اور کچھ کمانے لگا تو صرف اپنا حقہ سگریٹ چلا رہا ہے اور باپ مشقت کے مارے مرا جا رہا ہے۔

لیکن کیا کہا جاتا ہے کہ لوگ بابو بننے کو ہر حال میں اچھا سمجھنے لگے ہیں، تو ہم کیا کریں کہ دیہی اور مقامی پیشے پھر پسندِ خاطر بننے لگیں اس کی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی مگر ایک دھندلی سی روشنی یہ سمجھا رہی ہے کہ حکومتی اور غیر حکومتی ذرائع کو کام میں لا کر بکثرت ٹیکنیکل اسکول کھولے جائیں۔ اور ملکی مصنوعات کے حق میں رائے عامہ پیدا کی جائے اور غیر ملکی درآمد کو محدود کر کے ماسوا مشینی آلات کے لوگوں کو ملکی وضع اور ملکی اشیاء استعمال کرنے پر مائل کیا جائے۔

## یونیورسٹیاں یا ٹیکنیکل اسکول

مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں بڑے بڑے سیاستدان اپنے اپنے علاقے میں محض تفاخر کے لئے یونیورسٹیاں کھلوانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ گویا یونیورسٹی لنگڑی بھی ہو تو بڑی بات ہے مگر بہت کم کوشش اس کی کی جاتی ہے کہ دیہی آبادیوں میں ٹیکنیکل اسکول کھلوائیں۔ دیہاتی صنعتوں اور دستکاریوں اور پیشوں کو ترقی دلائیں اور چل پھر کر لوگوں کو سمجھائیں کہ تعلیم کے ساتھ دستکاری اور ہنر کوئی عیب کی بات نہیں میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس زرعی معیشت والے ملک میں صنعتی ملکوں کے مطالبات فی الحال کامیاب نہیں ہو سکتے — اس ملک کی اوّلیں معیشت کی ترقی، زرعی طرز زندگی کے اصول پر ہوگی اور اس کے لئے واحد حل سادہ ٹیکنیکل تعلیم کا فروغ ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی مسئلے کی کلید یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مفید پرائمری تعلیم ہو اور یونیورسٹیاں بقدر ضرورت ہوں اور میں ارباب تعلیم سے التجا کرتا ہوں کہ وہ علاقائی یونیورسٹیوں کے چکر میں نہ پھنسیں ملک میں کم یونیورسٹیاں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر جتنی ہوں عمدہ ہوں۔ عجیب بات ہے کہ بیکار یونیورسٹیاں تو ہر گلی کوچے میں موجود ہوں گی مگر اسکولوں کی حالت ابتر۔ آپ نے دیہاتی اسکولوں کو دیکھا ہوگا۔ ان کا ماحول جیسے ویرانے کا کوئی گوشہ، اساتذہ نادار، سامان ندارد، ٹاٹ غائب، ماحول غلط، عمارت میر تقی میر کے گھر کی طرح۔ پوری فضا ایسی جیسی ایک میراثی کے بچے نے بیان کی تھی "چھت نہ دیوار تی یہ سب تکلف کیوں ہے"، اس لئے کہ ہمارے ملک میں سیاست کا کام زیادہ ہوا ہے اور تعلیم بھی ایک شعبہ سیاست بنتی جاتی ہے خصوصاً علاقائی سیاست کو خوش کرنے کے لئے تعلیم کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں بکثرت کھلتی جاتی ہیں اور بچے کی تعلیم غائب۔

آپ صاحبوں کو شاید اس کہانی سے دلچسپی نہ ہوگی مگر آپ کے علم میں اضافہ ضرور ہوگا کہ اب ملتان، سرگودھا، لائل پور اور پنڈی کو نیم یونیورسٹی کا درجہ مل رہا ہے ان جگہوں میں یونیورسٹی کی تعلیم جاری ہو رہی ہے۔ حالانکہ نہ اساتذہ موجود نہ سامان میسر۔ لیکن غیر مفید یونیورسٹیاں کھلتی جا رہی ہیں جن کی حقیقت میں کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ ملک میں دو دو تین تین ایک ہی فیکلٹی سے متعلق پیشہ ورانہ یونیورسٹیاں بھی اس طرح کھل رہی ہیں گویا کالج ہیں جن کی ہر آبادی کو ضرورت ہوتی ہے میں باادب عرض کرتا ہوں کہ اس غریب ملک میں جس میں روپیہ بھی کم ہے اور ماہرین بھی کم — پیشہ ورانہ یونیورسٹی سارے پاکستان میں، ایک ایک بڑے پیشے کے لئے ایک ایک ہی ہونی چاہئے اس سے بیکار رقابت سے بچاؤ اور کفایت شعاری کے علاوہ مختلف علاقوں اور خطوں کے لوگوں کے باہم میل جول کے مواقع نکلیں گے اور اس سے بھی بڑی بات ماہرین کی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ جو شخص ڈگری یافتہ ہوتا ہے وہ ضرور ماہر ہوتا ہے۔ ماہر تو وہی ہوتا ہے جو تجربہ رکھتا ہے اور مدتیں اس فن کی آبیاری میں گزار چکا ہوتا ہے ؎

کرم کہ رندوں نے عمریں گزار دیں ساقی ؛ مزاج دانیِ پیمانہ و سبو کرتے

## تعلیم نسواں کا مقصد

بے کار تعلیم کے سلسلہ میں مجھے ایک اور نازک مرحلے سے بھی دوچار ہونا ہے اور وہ ہے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ — اصولاً تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن عورتوں کی تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا کوئی مقصد ضرور متعین ہونا چاہئے۔ بیشک عورتیں تعلیم حاصل کریں مگر کسی معین مقصد کے تحت اور وہ مقصد ایسا ہو جو نسوانی زندگی اور نسوانی تقاضہ حیات سے ہم آہنگ ہو۔ میں جب عورتوں کو غیر مفید تعلیم کے چکر میں دیکھتا ہوں تو مجھ پر گہری پریشانی محیط ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کا سارا اسلوب غلط ہے۔ وہی مردوں کی نقالی، جس سے طبقہ نسواں میں بے روزگاری اور مسرفی تعلیم سے بیزاری بڑھ رہی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی مخلوط تعلیم کا رواج عام بھی قابل غور ہے میرے خیال میں طریق تعلیم سراسر غیر مفید اور رسمی طرز تعلیم ہے اس میں پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کے مابین، افہام و تفہیم کے وہ مواقع نہ ممکن ہیں نہ مناسب جو استاد کے صدق اور ذوق تحقیق کا جزو لازم ہے۔ عوام کی تعلیم کی بیرل بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر لڑکی کو ملازمت کرنی ہے ایک ایسے ملک میں جس میں خود مردوں کے لئے کھپت کافی نہیں تو ہر لڑکی کو ملازمت کہاں مل سکتی ہے؟ میرے خیال میں [illegible]

ملازمت کے لئے پڑھنے کے غلط رجحان نے پاکستانی معاشرت میں مغربی بے اطمینانی کا ایسا بحران پیدا کر دیا ہے جس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جس کے ماتھے پر دو آنکھیں ہیں اور ان کی آنکھوں میں نور اور ان کے پیچھے ادراک و دیدۂ عبرت نگاہ بھی ہے جو سفید اور سیاہ میں فرق کو محسوس کرتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اب ہمارے ملک کے مردوں نے عورتوں کے متعلق سوچنا شروع چھوڑ دیا ہے اور اس کو وہ خوشامد سے صنف نازک کی رعایت کہتے ہیں ــــ حالانکہ یہ صنف نازک کے بارے میں تغافل یا غفلت ہے۔ لوگوں کو عورتوں کے متعلق سوچنا چاہیئے اور اس طبقے کی بہتری اور مستقبل پر ضرور رکھنی چاہیئے۔

## اہلیت و استحقاق کا اعتراف

پاکستانی نظام تعلیم کا دوسرا اثر جمہوریت اصول ہے۔ جمہوریت کی غیر اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ قانون اور شہریت کی نظر میں ملک کا ہر شہری برابر ہو وہ ملک کے فوائد اور وسائل سے اپنے حق کے اندر رہ کر استفادہ اٹھاتے اور ملک کے قواعد و ضوابط کی اطاعت کی ذمہ داری میں کسی شخص کو دوسرے کے مقابلے میں رعایت یا امتیاز حاصل نہ ہو۔

ہماری تعلیم میں یوں تو جمہوری اصول نافذ ہے اور مسلمانوں کی معاشرتی حس نے کبھی وہ تفاوت روا نہیں رکھا جو مثلاً جنوبی افریقہ یا امریکہ میں ہے پھر بھی انگریزی کے زمانے میں بعض ایسے نظام رائج ہو گئے ہیں جن میں امیر و غریب کا فرق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ فرق بھی اب خاصا کم ہو رہا ہے۔ پھر بھی بعض گوشے ایسے ہیں جن میں دانستہ یا نادانستہ اس تفاوت کو نبھایا جا رہا ہے۔

## تعلیم میں دو عملی

تفاوت کی یہ عملی شکل وہ دو عملی ہے جو اس وقت ہماری تعلیم میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف ملک کے عام اسکول ہیں جن میں غریبوں کے بچے پڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف پبلک اسکول ہیں جن کا ذریعہ تعلیم ابھی انگریزی ہے اور معاشرت کے لحاظ سے بھی وہ ملک کے جمہوری اسالیب زندگی سے مختلف ہیں۔ ان میں امراء کے بچے پڑھتے ہیں یا ان غرباء کے بچے جن کے ذہن پاکٹ کی کمزوری کے باوجود امیرانہ ہیں، یہ وہ گنگوا تیلی ہیں جو تیل نکالتے نکالتے جب اونگھ لیتے ہیں تو اپنے آپ کو راجہ بھوج کے محل میں محسوس کرتے ہیں مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کل جائیداد سو کنال تھی وہ بچے کی تعلیم میں اٹھ گئی اس قسم کے گنگوا تیلی اس ملک میں بہت پیدا ہو رہے ہیں۔

یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ میں صاف ستھرے اسکولوں کا مخالف ہوں میں جب پبلک اسکولوں میں جاتا ہوں تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے صفائی، سلیقہ، نکھار، سنوار، سجاوٹ قطار اندر قطار، گل و گلشن بہار اندر بہار ــــ ایسے نونہالوں کو صاف ستھرے لباس میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہاں کے بچے کم عمر ہو کر بھی انگریزوں سے بہتر انگریزی بولتے ہیں ــــ خوب اچھی، ویسی نہیں جس کی شکایت سردار کرنیل سنگھ کو ہوتی تھی۔ انگلستان میں فرفر انگریزی بولنے والے بچوں کو اس نے سن کر کہا تھا 'واہ بھئی استاد نے صدقے تے وی وی ورے سر کھاندے نہیں انگریزی بول ہی نہیں سکدے۔ ایتھے تو چھیاں ستاں ورھیاں وچ ہی خوب بولن لگ پیندے' غرض ستھرے انگریزی والے بچوں کو سن کر کرنیل سنگھ کو کوئی شکایت نہ رہے اور مسئلہ یہ ہے کہ ان اسکولوں میں تعلیم بھی اچھی ہوتی ہے اور یہ بھی خوشی کی بات ہے لیکن اس فضا میں پہنچ کر مجھے فوراً وہ لاکھوں کروڑوں بچے بھی یاد آ جاتے ہیں جن کو قدرت نے پسے ہوئے ماں باپ کے گھر پیدا کیا۔ یہ وہ بچے ہیں جن کے پاس بعض اوقات قلم دوات کتابیں تک بھی نہیں ہوتیں۔ ان کروڑوں کے اندر سے محض روپیہ کے زور سے محض چند زرداروں کے بچوں کو اعلیٰ اور خوب صورت تعلیم دلا کر ایک اعلیٰ اور برتر طبقہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ جس کو بظاہر ملازمت میں ترجیح ملے گی کیونکہ اس کا کلچر اعلیٰ، اس کی تعلیم خوبصورت اور اس کی TURN OUT چاق و چوبند اور اس کی انگریزی بھی ایسی کہ کرنیل سنگھ بھی باغ باغ ہو جاتے۔ پھر کیا وہ کروڑوں بچے ازلی ابدی بدقسمت اور محروم ہیں جو عوامی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور اگر ہیں تو اس کی ذمہ داری تقدیر پر ہے یا ملک کے نظام تعلیم پر یا ماں باپ پر؟

میں مانتا ہوں کہ ملک میں چند پبلک اسکول بھی مفید ہی ہوں گے مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہر سال پبلک اسکولوں کی تعداد اور ان کے لئے عوامی خزانہ سے گرانٹ بڑھ رہی ہے، اس کے جال بچھائے جا رہے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے ملک کا نظام حکومت اس تعلیمی دو عملی کو ختم کرے اور ملک کی پبلک کا روپیہ فرسٹ کے پبلک اسکولوں پر ضائع نہ کیا جائے۔ داخلے کا حق برابر اور قابلیت پر ہونا چاہیئے۔ ملازمتوں کا اصول صلاحیت و استعداد کے سوا کچھ نہ ہو تعلیم کا نصاب اور ذریعہ تعلیم یکساں ہو کسی کے مقابلے میں ماسوائے قابلیت کے کوئی ترجیح نہ ہو۔ اقبال کے اس شعر کو ہم کتنی بار دہراتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

تو مساوات کے اس سبق پر تعلیم اور قومی زندگی میں عمل کیوں نہیں کرتے؟ طول کلام سے بچنے کے لئے میں پبلک اسکولوں کے کلچرل اثرات کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تہذیبی اقدار کے اعتبار سے بھی یہ اسکول ہماری توقعات کو پورا نہیں کرتے جو ہم ان سے ان کے کثیر اخراجات کی وجہ سے رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں صفائی کی ایک نئی قسم نشوونما پا رہی ہے اس کی سب سے بڑی سرپرستی یہی پبلک اسکول ہیں۔ معترض کہہ سکتا ہے کیا آپ گندے اسکول چاہتے ہیں؟ اگر سب اسکول ستھرے نہیں ہو سکتے تو چند ستھرے اسکولوں کو باقی رہنے دیجئے۔ ــــ لیکن میں نے کب کہا کہ میں ستھرے اسکول نہیں چاہتا۔ ایک منصوبے کے تحت تعلیم میں معیاریت کا اصول نافذ کر دیجئے۔ اس سے سکولوں میں ہجوم کم ہو جائے گا۔ اور ہجوم کم ہونے کی صورت میں سب اسکول ستھرے بھی ہو سکیں گے۔ لیکن سادگی اور ملکی وضع اور کفایت شعاری لازمی شرط ہے پبلک اسکولوں کے متعلق میرا اختلاف تہذیبی وجوہ کے علاوہ اس وجہ سے بھی

بعلم نہیں بلکہ ایک غیر ملکی زبان ہے۔ ایک ہی ملک کے ذریعۂ تعلیم کے بارے میں یہ دو عملی ناقابل فہم بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔

**استعداد کی اساس پر انتخابیت** ۔یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس کو رفع کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ ملک کا ہر فائدہ۔ ہر چیز۔ ہر کسی کو یکساں مل جائے۔ یہ سخت غلط فہمی ہے لارڈ مارلے نے کہا تھا "جمہوریت کے متعلق بدترین بات یہ ہے کہ اس نظام میں لوگ زندگی میں ایسے مقام و مرتبہ کو حصول جاتے ہیں" مگر جمہوریت والوں مرتبیری کی قائم مقام نہیں۔ جمہوریت ہر گز یہ حق نہیں دیتی کہ جو شخص جس چیز کا مستحق نہیں وہ بھی اسی کو مل جائے۔ کسی شے کے حاصل کرنے کے لئے استحقاق ضروری ہے اس کے لئے محنت اور استعداد دونوں لازم ہیں جمہوریت تو ہمارے لئے صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ محنت اور استعداد کے باوجود ہم کسی دوسرے آدمی کے مقابلہ میں محروم نہ کر دیئے جائیں۔

جمہوریت کی غلط تعبیر کی وجہ سے ہم بعض اوقات حکومت اور معاشرے سے معنوی چیز توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور فرق مراتب اور استعداد و استحقاق کی بستوں کو نظر انداز کر کے اس چیز کی اکر رد کرنے لگتے ہیں جس کی آرزو تو جائز لیکن اس کا حق ہم نے پیدا نہیں کیا ہیں اعلیٰ اور اعلیٰ تر تعلیم میں جمہوری اصول کو نافذ کرانے کے لئے انتھک حامیوں میں سے ہوں لیکن مجھے اکثر یہ احساس ہوا ہے کہ اعلیٰ اور اعلیٰ تر تعلیم میں انتخابیت کا قدرتی اصول کبھی نہ کبھی نافذ کرنا پڑے گا ورنہ بیکار تعلیم کی اتنی افراط ہو جائے گی کہ لوگ جہالت کو تعلیم پر ترجیح دینے لگیں گے اعلیٰ تعلیم میں ہجوم کا آپ کیا جانتے ہیں مطلب کیا ہے کالجوں میں جماعتیں جلسۂ عام بنتی جا رہی ہیں۔ استاد کم بھول رہا کم ہیں تو ہر طالب علم کے ساتھ استاد کا رابطہ شخصی نہیں ہو سکتا اور اعلیٰ تعلیم کے معیار حال سے گہری واقفیت کا کام ناممکن ہو جاتا ہے ایسے طلباء کو ڈگری تو حاصل ہو جاتی ہے مگر علم کی روح ان کے دل اور کان کے قریب بھی نہیں جاتی۔

بعض لوگ انتخابیت کو مخصوص مفادات کی خاطر پسند کرتے ہیں لیکن میں مخصوص مفاد والے گروہ میں سے نہیں ہوں میرا تعلق عوام سے ہے لہذا انتخابیت کے حق میں بات کہنے والے ہر کسی کو بدگمانی کی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ انتخاب ایک معصوم مگر قومی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے عمدہ نتائج کے سلسلے میں نہایت ناگزیر تجویز ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز امراء کے مقابلے میں غرباء کے لئے زیادہ مفید ہوگی کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ذہانت کا چراغ غریبوں کے گھر میں زیادہ روشن رہتا ہے اس کے باوجود انتخاب کے چند ناگزیر اصول ہیں جن کے بغیر عوام و جمہور کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ اول یہ کہ سچی ذہانت کو دستور بنایا جائے کہ لئے پبلک اور حکومتی سطح پر ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں کہ غربت ذہانت کے اظہار میں مانع نہ ہو۔ وظائف کا وسیع نظام تیار کیا جائے۔ معیار تاسی کے امتحانات کو لائق اعتماد بنایا جائے تاکہ یہ شبہ نہ رہے کہ کوئی شخص اثر و رسوخ سے شعبۂ امتحانات یا ممتحن کی مہربانی سے ایک لائق مگر غریب آدمی سے بڑھ گیا۔

## پاکستانی نظام تعلیم

ان سب باتوں کے باوجود پھر لوگ جمہور میں ایسے بھی نکل آئیں گے جو اعلیٰ تعلیم میں داخلے کے معیار تک نہیں پہنچ سکیں گے تو میں خلوص سے عرض کروں گا کہ ہر تعلیم میں خارجی پرائیویٹ امتحان کے راستے کسی پر بند نہ ہونے چاہئیں۔ یوں کسی کا جی چاہے تو پرائیویٹ امتحان والوں پر یہ بات پہلے سے ظاہر کر دے کہ امتحان کا پرائیویٹ نظام باقاعدہ نظام کے برابر نہیں ہوگا عام رہتے ہیں بھی اور ملازمتی انتخاب میں بھی ——— ؟ اس صورت میں وہ اعتراض بھی رفع ہو جائے گا کہ باقاعدہ تعلیم اور بے قاعدہ تعلیم میں جو قدرتی فرق ہے وہ ملحوظ نہیں رکھا گیا اور کالج اسکولوں میں ہجوم بھی کم ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ پرائیویٹ امتحان کی اجازت اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس ملک میں لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لوگوں کا پیٹ پورا نہیں بھرتا پچھلی صدی سے اس وقت تک تعلیم تعلیم کی اتنی رٹ لگی ہے کہ بعض اوقات مذہب تک کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور لوگوں کا طرز عمل یہ ہو گیا تھا کہ مذہب کی تعلیم ہو نہ ہو انگلش کی تعلیم ضرور ہو۔ اور بڑے مزے بات کی یہ ہے کہ تعلیم کے اس بخار میں مذہبی تعلیم والے کو لوگ تعلیم یافتہ کہتے ہی نہ تھے تعلیم یافتہ صرف وہ جس نے سرکاری مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہو خصوصاً انگریزی کی ——— اس لحاظ سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور علامہ سلیمان ندوی تک کو تعلیم یافتہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب انگریزی تعلیم کے شوق کی وجہ سے ہوا تھا اور وہ شوق اس طرح بدستور موجود ہے اور لوگ اس طرح لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں لہذا ان پر تعلیم کے دروازے بند کرنا آسان کام نہیں۔

> پہلے غم یہ تھا کہ بالوں میں نہیں تاثیر
> وہ جو مضطر ہیں تو اب رنج اثر ہے درپیش

لہذا اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہر تعلیم میں پرائیویٹ امتحان کے راستے سب کے لئے کھول دیئے جائیں اس کھولنے کے ساتھ کہ یہ امتحان تعلیم کے شوق کی تسکین کے ہوں گا ——— اور عین ممکن ہے کہ کسی نازک وقت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ کھیپ بھی ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہو جائے۔

درحقیقت مسئلہ ایک ہے اس کو دہراتے رہنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو انتخابیت اور پرائیویٹ امتحان کے امتزاج سے ہمیشہ کے لئے حل کر لیا جائے ——— اگر یہ نہیں کیا جائے تو گلگت سے لے کر کراچی اور چاٹگام تک ہر گاؤں میں پڑھنے والوں کے جلسہ ہائے عام کا اہتمام کر دیجئے۔ اسی صورت میں لاکھ لاکھ آدمی رہتا ہیں ——— اور دو دو استاد۔ اور لاؤڈ اسپیکر کی اجازت تو اس کام کے لئے مل ہی جائے گی۔ آپ ہی فرمایئے کہ تعلیم کی کون سی شکل ہوگی ایسی تعلیم سے بے تعلیمی اچھی، کم از کم جاہل آدمی پتے ہوتے کو یہ اقرار تو ہوتا ہے کہ میرے پاس ڈگری نہیں میں بے علم ہوں مگر موجی دروازے کے جلسوں کی مانند جماعتوں میں تعلیم پاکر یہ اقرار بھی کوئی کرے گا کہ میں بے علم ہوں پسند کرے ہیں تو چاہتا۔

## تعلیم میں پاکستانیت کا مقصد

کسی اصول پاکستانی نظام تعلیم کے لئے یہ بڑی بنیادی بات ہے کہ اس کے نصابوں سے پاکستانی قومیت کا جذبہ ترقی کرے۔ مگر ابھی تک یہ سوال پریشان کن ہوتے ہیں کہ پاکستانیت ہے کیا؟ ذاتی طور پر میرے نزدیک پاکستانیت، اسلامیت ہے تصور کرنے کا مثالی نقش ہے۔ عملی لحاظ سے پاکستانیت کا مطلب ہوگا۔ پاکستان سے محبت اس بنا پر کہ یہ وہ خطہ ہے جو ہمیں اس مخصوص دین ایک مخصوص طرز زندگی اور مخصوص تاریخی اور ملک کی دوسری رنگ کی بنا پر حاصل ہوا ہے اور اب ہم اس میں نہ صرف ان کو اقدار سے خود مستفید ہوں گے بلکہ اس کی اقدار کو، ایک تہذیبی اور روحانی تجربے کے طور پر آگے بھی پھیلائیں گے۔

کچھ لوگ پاکستانیت کے لئے یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستانی قومیت کا مطلب پاکستان کے جغرافیے سے محبت ہے یا اس کے دریاؤں سے محبت ہے جو ہمیں اس کے طفیل ملی ہیں، مگر میرے نزدیک یہ پاکستانیت کافی نہیں ———— اتنی محبت تو اس یورپ سے آنے والے امریکی کو بھی ہے جو میرے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور زبان سے محبت کا اعلان بھی کرتا تھا اور جناح کیپ سے بھی سر پر تھا اور دلچسپ یہ کہ اس کی بیوی ریشمی نادو پٹے سے آراستہ ہو کر چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "دیکھئے نا میں بھی پاکستانی خاتون ہوں کیا یہ غلط ہے؟" اور تھوڑی دیر تک مجھے بھی اس کے پاکستانی ہونے کا خیال ہی رہا۔

لیکن ظاہر ہے کہ پاکستانیت اس سے کچھ زیادہ ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میرے نزدیک پاکستانیت عقیدہ بھی ہے اور عمل بھی ———— عقیدے کی حد تک پاکستانیت ہے۔ پاکستان کے جغرافیائی وجود اور اس کی وحدت پر یقین رکھنے کے علاوہ ان اقوال و کوائف پر بھی ایمان جن سے اس کے وجود و تعمیر کے استدلال کی عمارت قائم ہوتی۔ عمل کے لحاظ سے اس قومی کردار کا مظاہرہ جو پاکستانی شہری کی پہچان کا وسیلہ ثابت ہوگا۔

تعلیم پاکستانیت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نصاب اس طرح مرتب کئے جائیں کہ طلباء کے ذہن پر ملکی اور قومی وحدت کا نقش جم جائے پاکستانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ علاقائیت ہے یعنی علاقائیت کی وہ قسم جو سرحدوں میں علاقے کا تصور پہلے رکھے اور ملک کا بعد میں۔ اس مقدس سرزمین کو سب سے بڑا خطرہ (امریکیت کے علاوہ) یہی علاقہ پرستی ہے جو بدقسمتی سے تعلیم میں بھی گھس آئی ہے۔ اور ہماری بے بسی و بیکسی کو ملاحظہ فرمایئے کہ ہم اس کے خلاف کھل کر آواز بھی بلند نہیں کر سکتے۔ منتظمین کچھ تو سیاسی مصلحتیں بالکل بجا مگر ملک کی قومی وحدت کے مسئلے میں ایمان پختہ رکھنا اور کھری کھری بات کہنا بے حد ضروری ہے۔

## ملک بھر میں یکساں پرائمری نصاب

تعلیم میں اس کی روک تھام کی ایک صورت یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے ملک بھر میں نصاب یکساں ہو۔ نصابوں میں علاقائی مضامین بھی رکھے جائیں ——— لیکن علاقائی کہہ کر نہیں، پاکستانی کہہ کر ——— وارث شاہ پاکستان کے مشہور شاعر تھے شاہ عبداللطیف بھٹائی پاکستان و بھارت کے مشہور صوفی تھے جن کا پیغام عالمگیر اسلامی روحانیت کا ترجمان تھا۔ رحمان بابا ——— اسلام اور پاکستان کے بہت بڑے صاف گو اور صاف زبان شاعر تھے وغیرہ وغیرہ۔

علاقائی ہیروؤں اور علاقائی شاعروں اور علاقائی ناموروں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ان کے اپنے خطے سے باہر کے لوگ بھی انہیں اپنا سمجھیں۔ غرض تعلیم کو اگر ملکی وحدت کا ذریعہ نہ بنایا جاتے تو تعلیم ہی کی بدولت یہ ملک پاکستان نہیں علاقستان بن کر پارہ پارہ ہو جائے گا۔ تعلیم کا پاکستانی رنگ اس بات سے بھی ظاہر ہوگا کہ اس میں اسلامی اقدار کے نفوذ کے لئے کیا صورت اختیار کی گئی ہے۔ ہمارے ملک کی تعلیم کی ایک اہم منزل یہ بھی ہونی چاہیے کہ فارغ التحصیل لوگ ان اقدار کے نہ صرف پابند ہوں جو اسلام نے دی ہیں بلکہ ان پر فخر بھی کریں اور ان کے ذریعے ایک ممتاز قومی سیرت پیدا کر کے دنیا کے دوسرے لوگوں سے الگ پہچانے جائیں۔ اپنی عربی اور انگریزی کی وجہ سے نہیں بلکہ اعلیٰ کردار اور سیرت، حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کی وجہ سے۔ تعلیم میں اسلامیت کا پیوند نہ صرف عقیدے کے ذریعے ہو بلکہ ان عبادتوں کی صورت میں بھی جن پر اسلام نے زور دیا ہے۔

آج کل بعض ممتاز لوگ شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ مسلمان ہونے کے لئے اسلامی روح کو سمجھ لینا کافی ہے اسلام کے ارکان اور شعائر کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا کہ یہ خطرناک مغالطہ ہے۔ سنو جو ہمارے مدنظر روح ہے اس روح کو پیدا کرنے کے لئے بھی تو رسمیات سے گذرنا اور ان پر عمل کرنا لازم ہوگا۔ دنیا بھر کا مسلم اصول ہے کہ کوئی سیرت جسم و شکل کے بغیر ممکن نہیں۔ میں علی وجہ البصیرت عرض کرتا ہوں کہ پاکستان میں بے رنگی کی یہ بیرنگی اس سہل نگاری اور عیش کوشی کی پیداوار ہے جس کے نزدیک پارسائی کی پارسائی سے غرض ہے مگر اس کے اعمال سے کوئی غرض نہیں۔ یعنی اسلام کے نام سے فوائد حاصل کرنے چاہیں مگر دیانت داری کے ساتھ اسلام تک پہنچنے کی کوشش ترک کی جاتے۔ یہ فلسفہ یہ کہنے کے برابر ہے کہ آم کے پیڑ سے مالی سے آم مل سکتے ہوں تو آم پر چڑھنے کی کیا ضرورت ہے مگر صاحبو خود ہی انصاف کرو آم سے پھل حاصل کرنے کے لئے آخر کسی کو مالی بھی تو بننا پڑے گا۔ میں نے تعلیم کی کتابوں میں صاحب پشاوری اپنے مدرسے میں عمل صالح کی مشق کرایا کرتا تھا اور عبادت اس کے نظام اوقات میں شامل تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ملک میں اگر کوئی شخص یہ مشورہ دے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ لیکن میں نے پشاوری کا نام لے کر یہ مشورہ دینے کی جرأت کر ہی دی ہے۔ تعلیمی نظام میں عملی عبادت کے لئے ایک گھنٹہ مخصوص کرانے کی درخواست میں براہ راست مدارس کمیٹی سے بھی کر چکا ہوں اور اب بھی کروں گا۔

یہ ماننے کو شاید ان لوگوں کا بھی جی چاہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسمیات اور عقیدوں کی بات کے ساتھ ساتھ روح کی بات بھی لازم ہے۔ تو چلئے کبھی کبھی دوسروں کا کہا بھی مان لیا جانا چاہیے اور مجھے اقرار ہے کہ ان سب عقیدوں اور عبادتوں کے بعد بھی عین ممکن ہے کہ انسانیت کی تمام لطافتیں نہ پیدا ہوں جو عبادتوں اور عقیدوں کے تعلیم میں مرہون ہونے کے باوجود بھی مفقود ہیں۔ تو اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ بچوں کو انسانی دکھ درد سے آشنا کرنا ضروری ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانیت کی روح اوروں کے دکھ درد کو سمجھنے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ جنت کے میوے دل کی آگ سے پکتے ہیں ——— اور یہ میوے مرنے سے پہلے بھی اس زندگی میں بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔

اس غرض کے لئے پڑھنے والوں کی جذباتی زندگی میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔ اعلیٰ شہ پاروں نے لئے جذباتی توازن تعمیر کا کام دیا ہے اس سے وہ سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے جو بڑے بڑے کام کرتا ہے گویا تعلیم کے ہر شعبے کو مذہبی اور تخیلی ادب سے جس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے بہرہ ور رکھنا لازم ہے اور یہاں پہنچ کر تعلیم دین اور ادب ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی مشورہ مشہور سائنس دان ڈاکٹر میڈر نے دیا تھا اور کہا تھا وہ لوگ بے نصیب ہیں۔ جو جنرل تعلیم، سائنسی تعلیم اور ٹیکنیکل تعلیم میں فاصلہ رکھتے ہیں۔ تعلیم کا بہترین حل یہی ہو گا کہ ہر تعلیمی سلسلے کو تھوڑی تھوڑی دوسرے تعلیمی سلسلے کی بھی خبر ہو ورنہ یک رُخے، کھردرے، ادھورے اور بے ثمر لوگ پیدا ہوں گے اور ڈاکٹر میڈر کے بعد کہیں یہ ڈر سا رہتا ہے کہیں پاکستان میں بھی ایسے ہی لوگ تو پیدا نہیں ہو رہے؟

میاں احمد

# طلبہ کے نفسیاتی مسائل

جوانی میں امنگوں، ولولوں اور خواہشوں کی فراوانی ہوتی ہے۔ جذبات میں شدت بھی ہوتی ہے اور احساس کے زخم کھلے رہتے ہیں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتی ہیں یہ دور حساس دور ہے۔ سخت ہی ہے نام رہے ماں سکوں پراہ دیکھیں یہی۔ اس سلسلہ میں بعض مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں ذہنی اختلافات، جنسی اور تعلیمی مسائل سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں

## والدین اور نوجوانوں کے باہمی تعلقات

بچے کی ذہنی، جسمانی اور جذباتی نشوونما پر والدین کے رویوں اور طرز فکر کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ بچپن کے حالات، واقعات انسان کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ جونہی بچہ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھتا ہے تو والدین اس سے کچھ اس قسم کی توقعات رکھتے ہیں کہ اب وہ ایک ذمہ دار فرد بن گیا ہے۔ اسے وہ ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں لیکن آزادی دینا پسند نہیں کرتے۔ اگر نوجوان سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے برا بھلا کہتے ہیں اور اگر کوئی اچھا کام کرے تو تعریف نہیں کرتے۔ ان متضاد رویوں کے خلاف لڑکوں کے دل میں اپنے والدین کے خلاف جذبات پیدا ہوتے ہیں چونکہ ہمارے معاشرے میں والدین کو بہت بڑا سمجھا جاتا ہے اور ان کے احترام کے تصورات وابستہ ہوتے ہیں اس لیے اگر والدین کی طرف سے کوئی زیادتی ہو تو لڑکے یہ سوچتے ہیں کہ یہ تصورات ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اور وہی ایسے منفی حالات کے ذمہ دار ہیں۔ ایک سوچ یہ کہ والدین زیادتی نہیں کر سکتے دوسری طرف عملاً ان کی طرف سے زیادتیاں ہوتی ہیں تو اس سے تضاد اور کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں ایک فطری بغاوت اور انحراف کا رد عمل ہوتا ہے وہ احساس کرتے ہیں والدین کے خلاف سوچ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ والدین بھی انسان ہیں ان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں لڑکوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ والدین بھی انسان ہیں اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں وہ اسے بچوں سے بھی زیادتی کر سکتے ہیں۔ وہ اگر اس قسم کا رویہ روا رکھیں تو ان کے خلاف سوچیں پیدا ہوں گی۔ ان سوچوں سے کسی جرم میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ کسی طرح والدین کو یہ احساس ہو جائے کہ غلطی پر ہیں مگر اس کوشش میں والدین کے احترام کو ہر صورت نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک دوست لیتا چاہیئے میرے پاس ایک لڑکی کو اس کے والدین لائے وہ ان سے ہمیشہ نالاں رہتی تھی اور والدین اس سے پریشان تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا جھگڑے کا سبب کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ میرے والدین یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مرضی سے شادی کروں میں خود ان کے خلاف نہیں اور ہمیشہ ان کے کہنے سے انکار کرتی ہوں۔ لڑکی نے جب سبب بتایا تو میں نے اس کو سمجھایا کہ ان جیسے میں برائی نہیں ہے تم اس پر عمل کرو اس سے مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور اختلافات کم ہوں گے۔ اس لڑکی نے میری بات پر عمل کیا۔ چند روز بعد وہ میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ والدین کے رویے میں تبدیلی آگئی ہے اور وہ اس سے اچھا سلوک کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنا پر بہت سی الجھنیں پیدا نہیں کرنا چاہئیں

## نوجوانوں کے خیالات

اس عمر میں جنسی خیالات لامحالہ آتے ہیں ان سے کسی طرح بھی بچاؤ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے معاشرے میں جنسی خیالات اور جنسی مسائل پر گفتگو کرنا اور جنسی خیالات کو جرم سمجھا جاتا ہے لہٰذا جب بھی کسی لڑکی یا لڑکے کے ذہن میں اس قسم کے خیالات آتے ہیں وہ احساس جرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایک طرف اقدار ہیں جو اس کے تحت الشعور میں گھر کر چکی ہیں دوسری طرف فطری جذبات کا بہاؤ ہے جسے وہ نہیں روک سکتے۔ لڑکوں میں لڑکیوں کے لیے اور لڑکیوں میں لڑکوں کے لیے فطری طور پر کشش ہوتی ہے کہ وہ دیکھے مگر وہ ان کی باتیں کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی حال لڑکیوں کا بھی ہے۔ لیکن وہ ان باتوں اور ایسے کو جرم بھی تصور کرتے ہیں اور انہیں ہمیشہ یہ خیال ستاتا ہے کہ وہ کوئی برائی کر رہے ہیں اس طرح ان کے تصورات میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ بات صاف طور پر کہہ دینا مناسب سمجھوں گا کہ حالات پر بہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اس عمر میں جنسی خیالات پیدا ہونا فطرت کا تقاضا ہے اور اگر اس عمر میں پیدا نہ ہوں تو اس صورت میں یہ خدشہ ہونا چاہیے کہ کوئی نقص تو نہیں ہے۔ چونکہ یہ فطری امر ہے اس لیے اس سلسلے میں احساس جرم محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلام میں بھی خیالات پر کوئی پابندی نہیں۔ عمل کی سزا ملتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نیکی کے بارے میں سوچنے اور کرنے کے لیے جائے اور پھر نیکی کرے، ہر مرحلے کا ثواب حاصل ہوتا ہے، لیکن برائی کی صورت میں سوچنے کا کوئی گناہ نہیں۔ برائی کرنے پر گناہ شمار ہوتا ہے۔

## طلبہ اور اساتذہ کے تعلقات

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی اساتذہ طلبہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے وہ ان کو حسب منشا دیتے لیکن ہمیشہ یہی ادب میں ملا رکھتے ہیں وہ طلبہ کی تحقیر کرتے ہیں۔ ہتک آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ناانصافیاں ہیں۔ اساتذہ کے بارے میں بھی ہمارے معاشرے میں روایتی تصور یہی ہے کہ وہ باپ کے برابر ہوتے ہیں ان کا احترام ہم پر فرض ہے۔ اس روایتی تصور کا ذکر کرتے ہوئے ہم یہ بھی کہوں گا کہ اوصاف بھی معلم میں اور اساتذہ اگر یہ چاہتے ہیں کہ طلبہ ان کی دل سے عزت کریں تو انہیں چاہیے اپنے کردار کا بلند معیار قائم کرنا چاہیے

جہاں تک سرپرستی معلومات کا تعلق ہے یونیورسٹی میں بھی اساتذہ، طلبہ کی خاطر خواہ راہنمائی نہیں کرتے، ان کی صحیح طریقے سے رسائی نہیں کرتے، اور ان کے مسائل کو تعاون اور اشتراک کی فضا میں حل کرنے نہیں کرتے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جب ان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی طلبا پر ڈالتے ہیں۔ جب وہ خود کوئی بات نہیں سمجھا سکتے، تو طلبہ پر غصہ آتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ نالائق ہے۔ وہ طلبہ سے ان کے مسائل پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے اس کے علاوہ طلبہ کے ساتھ ناانصافیاں بھی کی جاتی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ ذاتی تعلقات کی بنا پر پرورش دی جاتی ہے اگر حالات اس قسم کے ہوں پیدا ہوں گے طلبہ پڑھائی میں پوری طرح دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ ان تمام باتوں کا بیان میں نے اس لیے کیا کہ طالبات ان مسائل حل کرنے کا ایک طریقہ رکھی ہے کہ ان کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ اس طرح وہ باتیں سامنے آتی ہیں جو تحت الشعور میں الجھن کا باعث بنی رہتی ہیں۔ آپ بھی مسائل کا حصہ پہچاننے سے جائزہ لیں اور ان کو حل کرنے کے لیے حل کی کوشش بھی کریں۔ اگر حالات میں نہیں آتے، تو اس کے لیے خود کو مجرم نہ سمجھیں کیونکہ ان مسائل کا تعلق پورے معاشرے سے ہے جب تک معاشرے میں ہمہ گیر انقلاب نہیں آتا ان کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں ہو گا۔ آپ اور اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ان ناانصافیوں سے گھبرا کر آپ کو ہی نہیں ہارنا چاہیئے۔

(آج ...)

وصی اللہ

# فنی تعلیم : اہمیت

تعلیم کا مقصد طلبا کے طرز فکر و عمل میں اچھی تبدیلی لانا سمجھا جاتا ہے اور جوں جوں انسانی تمدن زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے تعلیم کے دو بڑے مقاصد سامنے آ رہے ہیں۔ اولاً یہ کہ طالب علم کو بہتر کسب معاش کے قابل بنایا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی شخصیت اور کردار میں نظریہ مقاصد حیات کے مطابق تبدیلی لائی جائے۔ مثال کے طور پر پاکستانی معاشرہ میں متعلمین کی بہت بڑی اکثریت اب محض اس لئے تعلیم حاصل نہیں کرتی کہ وہ تعلیم کے ذریعہ زیادہ بہتر زندگی گزار سکے گی، بلکہ اس کے سامنے تعلیم کے ذریعہ حصول معاش کے بہتر طریقے سیکھنا اور اختیار کرنا زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے۔ محض اخلاقی اصلاح و بہتر تعلیم کا مقصد نہیں رہی، جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر سمجھی جاتی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانہ آغاز میں جو مسلمان طلبہ وہاں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو اگر تعلیم حاصل نہ کرتے تو ان کی معاشی حالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے تعلیم کو ایک زیور سمجھ کر حاصل کرتے تھے تاکہ زیادہ مہذب اور متمدن سمجھے جائیں۔ آج اس کے برعکس تعلیم کا حصول زیادہ تر کسب معاش کے تقاضوں کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور جو لوگ تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کا معاشی مستقبل مختصر حالات میں تاریک سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ملک کے اقتصادی حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کی وجہ سے زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ آئیے ان تبدیلیوں کا جائزہ زیادہ گہرائی میں جا کر لیں۔

اقتصادی اعتبار سے ایک قدیم اور پسماندہ معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں پیدائش دولت کے وسائل محدود ہوں اور فی کس آمدنی میں قابل ذکر تبدیلی ممکن نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں مثلاً قابل کاشت زمین کا بیشتر حصہ چند خاندانوں کی ملکیت میں رہتا ہے اور آبادی کی اکثریت مزارع ہوتی ہے کاشتکاری کے قدیم طریقوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں قابل ذکر اضافہ ممکن نہیں ہوتا۔ زراعت کی طرح صنعت و تجارت پر بھی چند افراد کی اجارہ داری ہوتی ہے اور صنعتی پیداوار بھی قدیم طریقوں کی وجہ سے محدود رہتی ہے۔ امیر اور غریب افراد کے درمیان فرق اقتصادی اعتبار سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ غریب طبقہ اکثر حالات میں اپنی معاشی حالت بہتر بنانا خارج از امکان سمجھنے لگتا ہے اور تقدیر پر شاکر رہنے کی کوشش کرتا ہے اس کے برعکس امیر طبقہ کو جو وسائل حاصل ہوتے ہیں وہ ان وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ معیار حیات کے معاملہ میں بھی امیر اور غریب طبقہ کے بیچ بہت فرق ہوتا ہے۔ امرا اور متمول افراد جن باتوں پر نظری اعتبار سے غریب لوگوں کے ساتھ متفق ہوتے ہیں، ان کے طرز عمل کے ساتھ انہی باتوں کا سروکار تقریباً بالکل نہیں ہوتا۔ سیاسی قوت بھی امیر طبقہ کی دست نگر رہتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ کچھ عرصہ قبل اور اب بھی اپنی بہت سی خصوصیات میں اسی قسم کا پسماندہ معاشرہ تھا اور ہے۔ ایسے معاشرہ میں تعلیم کا کام زیادہ تر تہذیبی اور ثقافتی وسعت کا ہوتا ہے اور غریب افراد کی بہت بڑی اکثریت تعلیم کو اپنے حیطۂ اختیار سے باہر یا اپنے مقاصد زندگی کے لئے بے فائدہ تصور کرتی ہے اور زیادہ تر امرا افراد ہی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی فکر کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاشرہ میں جب کوئی اقتصادی تغیر واقع ہونے لگتا ہے تو اس کی ابتدا میں تعلیم ہی کے بعض اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً مختلف علوم کی ترقی سے پیدائش دولت کے جو نئے طریقے دریافت ہوتے ہیں جب غریب افراد کی ایک قابل ذکر تعداد کو ان کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے ذرائع سوچنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے ہر ایک اس بات سے اتفاق کرے گا کہ پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پیدائش دولت کے قدیم طریقوں سے پوری نہیں کی جا سکتیں۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے ہمیں ہل کے بجائے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد اور دوسرے جدید طریقوں کو اختیار کرنا پڑے گا۔ ہماری قدیم کھڈیاں ضرورت کا کپڑا تیار نہیں کر سکتیں۔ بڑی بڑی ملوں کا قیام اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء ضرورت بھی بغیر جدید صنعتی ترقی کے اتنی تعداد میں نہیں بنائی جا سکتیں کہ لوگ عام طور پر خوشحال ہو سکیں۔

صنعتی معیشت کی جانب یہ قدم بعض ملکوں میں معاشرہ کے تعلیم یافتہ افراد کی تحریک پر اٹھایا جاتا ہے جیسا کہ برطانیہ اور امریکہ میں ہوا اور بعض ملکوں میں برسر اقتدار طبقہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ پیدائش دولت کے جدید طریقوں کے استعمال سے زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ ان حالات کے پیدا کرنے میں تعلیم ایک نہایت اہم عامل کی حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہے چونکہ تعلیم ہی کے ذریعہ لوگوں کو پیدائش دولت کے جدید طریقوں کا علم ہوتا ہے اور تعلیم ہی انہیں ایسے طریقوں کے استعمال کی ترغیب دیتی ہے، چنانچہ ایسے امرا افراد جو اپنے علاقہ کے اقتصادی وسائل پر پہلے سے اجارہ رکھتے ہیں ایسے علاقوں میں تعلیمی سہولتوں کے عام ہونے کی شدید مزاحمت کرتے ہیں اور اس بات سے خوف کھاتے ہیں کہ ان کے غریب مزارع اور مزدور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی غربت پر قانع نہیں رہیں گے اور ان کی اطاعت و خدمت میں فرق واقع ہونے لگے گا۔

بہرحال ایک مرتبہ اگر کسی قوم کے جسم میں تعلیم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل جراثیم مرنے لگتے ہیں، چنانچہ ان تمام ملکوں میں جہاں تعلیم عام کی گئی اور اس کا معیار بلند ہوا اقتصادی ترقی ہو کر رہی۔ جوں جوں عوام میں تعلیم پھیلنے لگتی ہے وہ ایک ایسے زمانے کا دھندلا سا خواب دیکھتے

میں جب خرمت غیر ضروری ہو جائے گی اور اشیائے ضرورت اس قدر وافر تعداد میں پیدا ہوں گی کہ ہر ایک کی بنیادی ضروریات زندگی آسانی سے پوری ہو سکیں گی لوگ مالی وسائل پس انداز کر کے صنعتوں میں لگاتے ہیں اور پیدائش دولت کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار آبادی میں اضافہ کی رفتار کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے ساتھ صنعتی پیداوار میں اضافہ تجارت کی ترقی کا موجب بنتا ہے اور روزگار کے نئے نئے مواقع عوام کے لئے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ صورت اگر استحکام کے ساتھ جاری رہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہر قسم کی زندگی لیے صنعتی پیداوار کے لئے بنیادی اہمیت کی صنعتیں ملک میں قائم ہو جاتی ہیں اور پیداوار میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ خوشحالی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی صنعتی ترقی کے لئے تعلیم ہی عوام کو بنیادی طور پر تیار کرتی ہے۔ اگر کسی قوم کی افرادی طاقت پیدائش دولت کے جدید طریقوں میں تربیت یافتہ ہو تو وہ قدرتی وسائل کی کمی پر بھی قابو پا لیتی ہے۔ جرمنی اور جاپان دوسری جنگ عظیم میں تباہی کا ڈھیر ہو گئے تھے مگر ان کے تربیت یافتہ شہریوں نے پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں انہیں اقتصادی ترقی کی اسی منزلوں پر پہنچا دیا جن کا جواب وہ جنگ کی تباہ کاری سے پہلے دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہمیں بھی آزاد ہوئے تقریباً اتنا ہی عرصہ گزرا ہے، تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہماری پسماندگی میں بہت تھوڑا فرق واقع ہوا ہے۔ اس لئے تعلیم کو آج کل انسانی وسائل میں سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے۔ جس طرح قدرتی وسائل مثلاً زمین، جنگلات، معدنیات وغیرہ میں سرمایہ لگا کر پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے اسی طرح انسانی وسائل میں سرمایہ لگا کر منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم اور آمدنی کے تعلق کا تناسب ۹۰ سے ۹۵ فیصد تک پایا گیا یعنی جن افراد نے تعلیمی ترقی کی ان میں سے ۹۵ فیصد لوگوں کی آمدنی بھی بڑھتی گئی۔

اقتصادی ترقی کے تقاضوں کے تحت ہمارے ملک میں سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس کی جا رہی ہے بلکہ جہاں تک حصول معاش کا تعلق ہے فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عربی، فارسی، اردو وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی جتنی طب، انجینئرنگ اور دوسرے ٹیکنیکل شعبوں میں نفع بخش ہوتی ہے۔ جو علوم کچھ عرصہ پہلے تک مہذب اور متمدن بننے کی خاطر پڑھے جاتے تھے آج ان کی تعلیم اکثر اوقات بے روزگاری کی طرف لے جاتی ہے اور جن ٹیکنیکل شعبوں میں تربیت کی ضرورت صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑھتی جاتی ہے وہاں روزگار کے درخشاں مواقع بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اب کے طالب علم کو یہ کہہ کر شرم دلانا کہ تم محض پیسہ کمانے کی خاطر تعلیم حاصل کر رہے ہو چنداں موثر نہیں رہا۔

زراعت میں ٹریکٹروں اور دوسرے جدید آلات اور طریقوں کا استعمال رفتہ رفتہ زیادہ افراد کا اس پیشہ سے منسلک رہنا مشکل بنا دے گا۔ دس ایکڑ رقبہ کاشت کرنے کے لئے جہاں پہلے پانچ افراد کی ضرورت ہوتی تھی اب دو تین افراد ہی یہ کام بہتر طور پر انجام دینے کے لئے کافی ہوں گے جس کا نتیجہ دیہات کی آبادی کچھ اس وجہ سے اور کچھ بعض دوسری وجوہ سے شہروں کا رخ کرے گی۔ پاکستان کی شہری آبادی میں اضافہ کی رفتار آج کل ۳۰ فیصد سالانہ ہے جب کہ کل آبادی تقریباً تین فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ جو لوگ دیہات کے ماحول سے اٹھ کر شہروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں معاشرتی اعتبار سے ان کی زندگی میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کل وہ ایک ایسی آبادی میں رہتے تھے جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو اپنا جانتا تھا۔ مخلص روابط میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے اور ان پر اخلاقی و معاشرتی اقدار کا حامل ماحول اس کی زندگی پر اثر انداز رہتا تھا۔ آج انہوں نے کسی شہر کے محلہ میں کرایہ کا مکان لے کر رہنا شروع کیا اور ماحول اور ہمسایوں کی اجنبیت نے ان تمام اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے بندھن ڈھیلے کرنے شروع کر دیے جن کا پاس انہیں اس سے قبل خدا کے خوف کی وجہ سے نہیں تو خلق کی شرم کی وجہ سے ضرور ہوتا تھا۔ جوان بھائی نہیں تو کم از کم بڑے بڑے کنبے جو دیہات اور قصبات میں ساتھ رہتے تھے اب چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی شکل میں دور دراز اور مختلف مقامات پر رہنے لگے جہاں انہیں حصول معاش کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

پھر بدلتے ہوئے اقتصادی نظام میں کچھ لوگ اچانک امیر ہو گئے اور بے اندازہ سہولتیں اور مواقع جو انہیں یکایک مل گئے ان کے کردار میں غیر موافق تبدیلیوں کا سبب بنے۔ ان حالات میں پاکستانی معاشرہ میں عام طور پر ایک ایسی فضا قائم ہوتی جا رہی ہے جس میں لوگ جہاں اقتصادی ترقی کے لئے دیوانہ وار کوشش کر رہے ہیں وہاں ذہنی سکون اور اخلاقی استحکام میں کمزوری پیدا ہو جانے کے باعث نئے حالات سے ہرگز مطمئن نہیں اور عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی اصلاح جلد کی جائے ورنہ خدا معلوم معاشرہ کا کیا حشر ہو گا۔

## بقیہ : نفسیاتی مسائل

**مخلوط تعلیم** بعض نفسیاتی حقائق کے مطابق مخلوط تعلیم دونوں صنفوں کے لئے باعث پریشانی ہوتی ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے ماہرین تعلیم کی اکثریت رائے رکھتی ہے کہ مخلوط تعلیم میں طلبہ بہت سے نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دی جانی چاہئے، لیکن ان کا بنیادی کام ذمہ داری سنبھالنا، بچوں کی پرورش اور خاوند کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنا ہے۔ لڑکیوں کو پہلے اس کی تربیت دی جائے۔ اس کے بعد وہ چاہے کوئی بھی علم حاصل کریں، سائنس، طب اور عمرانی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل کریں، بہتر ہو گا لیکن موجودہ حالات میں لڑکیاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں اور ان کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوتا جیسے ایک ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن میں مکمل مہارت رکھتا ہو، اس کے بعد وہ تاریخ، فلسفہ، مذہب اور دوسرے علوم کا جتنا چاہے مطالعہ کرے یہ اس کی خوبیوں میں اضافے کا باعث ہو گا لیکن اگر وہ اپنے پیشے میں ناکام ہے اور دوسرے علوم میں دسترس رکھتا ہے تو یہ اس کی خوبی نہیں ہو گی۔ لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دی جانی چاہئے جس میں ان اولین مقاصد کی تکمیل ہو جو ایک عورت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا کام گھر میں جنت آباد کرنا ہے۔

# ہم اس نظامِ تعلیم کے مخالف ہیں

شہید عبدالمالک لادینی نظام تعلیم کا مخالف تھا۔ اس نظام کو بدل کر اسلامی نظام تعلیم نافذ کرنے کے عظیم مقصد کی آبیاری اس نے اپنے خون سے کی، لیکن افسوس کہ ناکامیوں پر ناکامیاں آتی رہیں، مگر آج بھی ہم پر وہی نظام تعلیم مسلط ہے جو پہلے تھا۔ پاکستان کا ہر باشعور نوجوان عبدالمالک کی طرح اس نظام کا مخالف ہے، اور یہ مخالفت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسے پوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاتا اور پورے سانچے کو اسلام میں ڈھالا نہیں جاتا۔ ذیل کا مضمون پاکستان کے طالب علموں کے انہی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے

کسی لاگ لپٹ کے بغیر ہم بالکل صاف صاف عرض کرتے ہیں کہ

ہم ـــــ پاکستان کے طالب علم

موجودہ نظامِ تعلیم کے مخالف ہیں ـــــ!

ہم اس کے پہلے دن سے مخالف رہے ہیں اور جب تک اسے تبدیل کر کے ہمارے شایانِ شان تشکیل نہیں دیا جاتا،

ہم اس کی مخالفت کرتے رہیں گے،

اس کے خلاف ہماری آواز بلند ہوتی رہے گی ہم جو اس نظام کا براہِ راست شکار ہیں جو خود اس کے کڑوے کسیلے پھل سمیٹ رہے ہیں۔

آنکھوں دیکھتے اسے گوارا کر لیں؟

کیا فریاد کی لے بھی نہ اٹھائیں؟

ـــــ ✻ ـــــ

کہا جاتا ہے ـــــ

تم بس اپنے پڑھنے سے کام رکھو،

نظامِ تعلیم کا غم کیوں کرتے ہو؟

ہم کہتے ہیں ـــــ

ہماری آنکھوں کے سامنے،

ہمیں تباہ و برباد کیا جائے ــ ؟

باعزت اور درخشاں مستقبل کا گلا گھونٹا جائے،

امیدوں کے دیے بجھائے جائیں،

غلامی کی بیڑیاں مضبوط کی جائیں ـــــ

ـــــ اور ہم

تباہ و برباد ہوتے رہیں

اپنی دنیا لٹواتے رہیں،

اپنا دین بگڑنے دیں اور

ـــــ چین کی نیند سوتے رہیں؟

صدائے احتجاج بھی بلند نہ کریں،

اس نظامِ تعلیم کے خلاف!

ـــــ جو ہمیں اپنے دین اور اپنی اقدار سے دور لے جا رہا ہے ـــ یہ

ـــــ جو ہم میں دنیا کو اسلام کی شمعِ ہدایت سے منور کرنے کا جذبہ نہیں جگاتا۔

ـــــ جو ہم میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا نہیں کرتا، نہ دیانت و اخلاق، نہ دلیری و شجاعت، نہ قربانی و سرفروشی۔

ـــــ اور جو ہمیں اچھی تعلیم بھی نہیں دیتا۔

ـــــ ✻ ـــــ

اس نظامِ تعلیم نے ہم کو دیا کیا ہے؟

بس ایک ڈگری ـــــ

ـــــ جس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد ـــــ دنیاوی آرام و آسائش ہے۔

ـــــ جس کی بلند ترین اخلاقی قدر اپنا مفاد ہے۔

ـــــ جس کے فکر کی آخری سطح ـــــ مغرب کی نقالی ہے ـــ

اور پھر بھی ہم نے اس نظامِ تعلیم کو سینے سے لگا رکھا ہے

ہم کو کیا پڑی ہے اور بھلا کسی قوم [illegible] دوسروں کا پس خوردہ
کھائیں اور مگن رہیں۔ ہماری اپنی شاندار روایات ہیں اپنی درخشاں
[illegible]
ہم اپنا ایک الگ، منفرد، ممتاز اور برتر وجود رکھتے ہیں،
پھر ہمیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہم !
اپنے وجود کے تحفظ کی فکر نہیں کرتے
اور دوسری کم تر قوموں کی ظاہری چکا چوند پہ فریفتہ ہو کر،
اپنے کو ان میں گم کیے دے رہے ہیں۔

---

وقت کا دریا رواں ہے !
یہ کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔
ہم بہت سو لیے، ۲۵ سال کی نیند بہت طویل ہوتی ہے۔
—— موقع ہے کہ اب بھی ہم جاگ جائیں۔
ہم بہت کھو چکے۔
ایک سے دو ہو گئے۔
اسی نظامِ تعلیم کے ہاتھوں ——
موقع ہے کہ اب بھی ہم بیدار ہو جائیں
اور اپنے مستقبل کی فکر کریں —!
اس سے پہلے کہ ہماری ہستی گم ہو جائے
اور ہماری داستاں تک بھی نہ ہو —— !
داستانوں میں ——!!

تاریخ کی کیسی ستم ظریفی ہے
کہ یہ ملک
جو حاصل ہی اسلامی تہذیب کے قیام کے لیے کیا گیا
تھا !
جو حاصل ہی اسلامی کلچر کے قیام کے لیے کیا گیا
تھا !
وہاں ۳۱ سال بعد،
ہم طالب علم، اپنے بڑوں کو
جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمارے کئی ساتھی
عبدالمالک سے لے کر ——
ابو محمد تک ——
عبدالوحید سے لے کر ——
سہیل شامی تک ——
اس مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں
کہ شاید
ان کی مظلومانہ شہادت قوم کو جھنجھوڑ دینے کا باعث بنے ؟
اور آج بھی ——
اسی مقصد کے لیے
سروں پر کفن باندھ کر
مستقبل کو رنج کرتے ہوئے
بزرگوں کو اُٹھانے
سوتوں کو جگانے
—— اور جاگتے ہوؤں کو تیز تر گامزن کا درس دیتے ہوئے!
کیا —— کیا ہمارے بزرگ
ہماری اس پکار پہ
—— لبیک نہ کہیں گے؟
—— لہو کی پکار ہے کہ لبیک کہو!
—— لبیک، لبیک !
منزل قریب ہے
اس انقلاب کی
سعادت کی زندگی ——!!
شہادت کی موت —— !

امتیاز عاصی (شعبۂ اردو)

[illegible] حسرتوں کا لہو چاٹتے رہے
بستی کے لوگ سو گئے ہم جاگتے رہے
اپنے تو اختیار میں محرومیاں ہی تھیں
جو راہ میں ملا اسے بھی بانٹتے رہے
اپنی کسی نگاہ میں بھی تو جگہ نہ تھی

# پطرس بخاری

# انجام بخیر

*([illegible] حالتِ زار کے موضوع کو طنز و ظرافت کے لطیف احساس سے چھیڑا ہے)*

**منظر**

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ ایک طرف خالی پیٹی ہے جس پر سے تمام کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر، ملٹن، ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دیے جاتے ہیں۔ باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی [illegible] آدھی رات ہو لی ہے۔ اس کے [illegible] آواز بھی [illegible] ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ لڑکوں سے لیکن چہرے پر گزشتہ تدریسی اور حرص ناکامی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کیے اندر داخل ہوتے ہیں۔)

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہیچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو! اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے! اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

پطرس: کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے [illegible] کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے [illegible]

دوسرا طالب علم: اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: یہ نہ کہو! یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اس کا معاوضہ مجھے اس وقت مل گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت جھلکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ مقدس معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری سرگرم شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بے قراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ بیک [illegible] زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان! مجھ حقیر کی نذر قبول کر۔ (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے فرشتے! میرے ہدیے کو شرف قبولیت بخش۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو ممنون فرما۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس: (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے۔ (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے! ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لیے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس: (دعا میں سر بسجود ہو کر) باری تعالیٰ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمرے کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں، لیکن ہماری کم مائگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے، اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار روشنی چھا جاتی ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس ۔ اے خدا کے دیانتدار اور مخلص بندے! ذرا یہاں تو آئیو۔

ملازم (باہر سے) اے میرے خوش حال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا کہ تعمیل فرمان

کا کام ہے۔

ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دوگنے لمبے ہو گئے

ہیں۔

پطرس ۔ انتظار کی گھڑیاں کس طرح شہریں ہیں گھنٹوں کے کھٹکے کی آواز کس

خوش اسلوبی سے میز کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر کھجا کر پڑھتا ہے)

پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اخباروں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب

کے پیچھے چھپا دیتا ہے۔

پطرس ۔ آہ مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ

سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس ۔ اے مرد و بیشہ انسان مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاءِ علم کی ایک کرن

بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں

تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا ہے

خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی کے

ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر، دنیا امید پر قائم ہے اور

مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ مینڈ زور سے

بجنے لگتا ہے)

پطرس ۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں

کا سا غرور ہم سے دور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے۔ ایک طویل وقفہ جس کے

دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ مینڈ بدستور بج رہا ہے

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے

تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے۔

پطرس (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا

ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں، اور عرض حال کروں

پطرس ۔ (دل میں) میں اس بارے میں ناآشنا ہوں، لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے

کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آ جائیے۔

دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباسِ فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے

وقار ٹپک رہا ہے لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال

بہت پوچ خیال ہے علم بڑی نعمت ہے لہٰذا اے محترم اجنبی ان انباروں سے چند ضخیم کتابیں

انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور

علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہو چکا ہے۔

اجنبی ۔ اے برگزیدہ شخص میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس ۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی ۔ اے ذی علم محترم، گو تم میری صورت سے واقف نہیں، لیکن میں تشنۂ تعلیم کا اسیر

ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کسی یار حاصل کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا میری اس کوتاہی اور

غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس ۔ اے خدا کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں!

اجنبی ۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو، کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور

برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں

فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں

اے شریف اور رحم دل انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔

پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی سب زور سے چیختا ہے

پطرس ۔ ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آ گیا، لیکن حضور والا آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا

میرے لیے اس قدر باعثِ فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی ۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت

نادم ہوں۔

پطرس (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی ۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور

کریں، تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں

پطرس ۔ آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں۔ گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور

زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا لا کر باہر چلے جاتے ہیں)

اجنبی ۔ (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم شاہزادہ ویلز وائسرائے ہند اور

کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایماء پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی

کے طور پر پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں (حسرت آمیز آواز سے) ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے ورنہ

ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا!

پطرس ۔ (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا۔ اشرفیاں۔ جواہرات۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ (آنکھیں

بند ہونے لگتی ہیں)

اجنبی! ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس نہ لوٹائیے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

(گانا۔ آج موری انکھیاں برسائیں)

پطرس ۔ اے اجنبی تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں؟ اور تو کانپ کیوں رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے

تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے

میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کہ میرے مطالعے

کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہیں چار پانچ سو روحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی ۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو، میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات

سے مستفید ہوں!

پطرس ۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوکھلی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور

پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پراسرار نور

چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بدستور مینڈ

بج رہا ہے۔)

# یہ تعلیم اور مسلم طلبہ

امین احسن اصلاحی

(جناب مولانا امین احسن اصلاحی نے یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مشہور تفسیر "تدبر قرآن" کے مصنف نے فرمایا ۔)

مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے میں مختصراً آپ کو اس صورت حال کی طرف توجہ دلاؤں گا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس ملک میں پیش آئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جس طرح سیاسی حیثیت سے ہم کو حاکم کی جگہ محکوم اور والی روانی کی جگہ غلام بنا دیا اسی طرح انقلاب نے علمی اور تہذیبی حیثیت سے بھی آپ کو سیادت کے مقام سے نکال کر دوسروں کی تقلید اور پیروی کے درجہ تک گرا دیا۔ اس سے پہلے آپ اس ملک میں حاکم تھے اس وجہ سے آپ کے علوم و فنون آپ کی تہذیب اور روایات ہر چیز کو بالادستی حاصل تھی۔ لیکن جب آپ محکوم بن گئے تو قدرتی طور پر ساری کی ساری چیزیں آپ سے آپ اس ملک میں بےاعتبار بن گئیں اور اس قوم کے دین و تہذیب اور علوم و فنون کو رہنمائی کی جگہ حاصل ہوئی جس نے اس ملک میں آپ کی جگہ حکومت کی مسند سنبھالی۔ اس صورت حال کے بہت سے نتائج اور ہیں جن میں ان کی طرف مختصراً اشارہ کروں گا۔

(۱) سب سے پہلی چیز جو عالم کا فطری تقاضا ہے جب کوئی قوم کسی قوم پر غالب آجاتی ہے تو اس کا یہی تقاضا ہے کہ وہ محکوم قوم کے دین، تہذیب، روایات اور علوم و فنون کو بالکل تباہ کر دے، اور اس کی جگہ اپنے دین، روایات اور علوم و فنون کو رواج دے۔ دنیا کی پچھلی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسی وجہ سے ملک کے ہر گوشے سے ہمارا اپنا رنگ مٹ گیا۔

(۲) دوسری چیز جس نے فکری اور نظری اعتبار سے ہم کو حاکم قوم کے آگے بالکل بےبس کر دیا، وہ وہ ساری معلومات و ہیبت اور انگریزوں کے غلبے کے بعد ہماری قوم کے نام کمانے پیسے اور خوشحال ہونے کی پالیسی میں پتی کھائی گئی وہ سکی کرے۔

## علوم اور ہنر کو ہوا سو جدھر کی

اور ہمارے علمی لیڈروں نے یہ صورت اس زور سے پیش کی کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہمارا دین اور ہمارے علوم و فنون سب خود ہماری نظروں میں بےوقعت ہو کر رہ گئے اور حکمران قوم سے جن چیزوں کو اہم اور معتبر سمجھا جاتا تھا، ہم نے پوری چابک دستی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں ان کی دھجیاں اڑا دیں۔

ظاہر ہے کہ کسی قوم کا مذہب، روایات اگر خود اس کی نظروں میں بےحیثیت ہو جائیں تو پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو سنبھال نہیں سکتی، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر ہم نے اپنے کانوں کی سماعت اور آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ہماری قوم کا تقریباً سارا اونچا طبقہ نہ صرف یہ کہ اپنی تمام اصلی خصوصیات اور صفات سے بالکل ناآشنا اور محروم ہو گیا بلکہ وہ اس کی یاد سے بھی شرم محسوس کرنے لگا۔

(۳) تیسری چیز جس نے خاص طور پر اس ملک میں ہمارے مذہبی شعور کو کچلنے پر ہمارے حکمرانوں کو ابھارا، وہ ردعمل تھا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ساری قوم کے مذہبی طبقات پر ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جس گروہ نے اس ملک میں انگریزوں کے اقتدار کو گوارا نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت میں جدوجہد کی وہ ہمارے علماء کا گروہ ہے اس وجہ سے ہمارے حکمرانوں کو ہماری مذہبی اور قومی روایات اور دینی تعلیم کی طرف سے سخت اندیشہ لاحق ہو گیا۔ وہ اس ملک میں اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے اس بات کو ضروری سمجھنے لگے کہ ہر گوشۂ زندگی سے اسلام اور اسلامی روایات کو یک قلم مٹا دیں چنانچہ ایک عرصے تک انہوں نے اسلام دشمنی کے ہر ہر حربے سے یہ مہم جاری کی کہ خود دینی تحریکات مولانا سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی یاد دلوں میں تازہ کر سکتے ہیں، وہ سب پورا کر دیے جائیں۔ تاکہ مسلمانوں کو کبھی اپنے ماضی کی طرف توجہ کرنے کا کوئی حوصلہ پیدا ہو سکے۔

ان حالات میں انہوں نے اس ملک کے لیے جو تعلیمی پالیسی تجویز کی وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ملک میں ایسا نظام تعلیم جاری کیا جائے جو انگریزوں کی کاربری کھینچنے والے پیدا کرے۔ اسی تعلیمی پالیسی پر یونیورسٹیاں اور کالج قائم ہوئے جن میں آپ تعلیم پا رہے ہیں۔ اس تعلیمی پالیسی کو سرسید مرحوم نے جوں کا توں قبول کر لیا اور اپنی قوم کو دعوت دی کہ نجات اور ترقی کا راستہ انگریزی تعلیم میں ہے، اور حالات نے ان کی اس دعوت کے اندر ایسی کشش پیدا کر دی کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہماری قوم کا تمام ذہین طبقہ انگریزوں کے دفاتر میں کلرکی کی جگہ حاصل کرنے کے لیے کالجوں میں پہنچ گیا۔

---

اس تعلیم نے آپ کو غلامی کے فن سے آشنا کیا، لیکن ایک آزاد قوم کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کے اٹھانے کی کوئی صلاحیت پیدا نہ کی۔ اس کے ذریعے سے آپ نے دوسروں کے علوم و فنون اور تہذیب کے متعلق تقلیدی طور پر بہت کچھ جانا، لیکن خود اپنے مذہب اور علوم و فنون کی آپ کو ہوا تک نہ لگی۔ اس تعلیم سے دوسروں کے احکام بجا لانے کی صلاحیت تو پیدا ہو گئی لیکن ایک حکمران قوم کے فرائض انجام دینے کے لیے یہ تعلیم بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس تعلیم سے صرف محکومانہ ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے۔ دوسرے آزاد ممالک میں بھی اس تعلیم نے انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی۔ روح و اخلاق کی تعلیم سے یہ بالکل عاری ہے، اسی لیے اس تعلیم نے انسان کو طالب اور چالاک تو بہت بنا دیا، لیکن دانش مند اور خردار نہیں بنایا۔ اس نے سائنس کے زور سے ساری دنیا کو ایک مکان تو بنا دیا مگر انسان کو اس میں بھائی بھائی بن کر رہنا نہ سکھایا۔ اس نے ہر شخص کے ہاتھ میں ایک خونخوار تلوار تو دے دی، مگر جس رہنمائی حق شناسی کی ضرورت تھی وہ نہیں بخشی۔ اس کمی کا نتیجہ وہ فساد فی الارض ہے جس میں ساری دنیا آج مبتلا ہے۔

---

بہرحال یہ آپ کی موجودہ ضروریات کے بالکل ناکافی ہے۔ اب اس ملک کے حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ اب آپ غلام نہیں، بلکہ آزاد ہیں، اس لیے اس تعلیم سے آپ کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں

(باقی صفحہ ۲۰۴ پر)

(وقار انبالوی)

# جب ہم پڑھتے تھے

موجودہ صدی کا پہلا دہا تھا جب ہم اپنے گاؤں سے متصل ایک مڈل سکول کی پرائمری جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اس وقت بھی پہلی مائیکی پہلی کی کوئی تقسیم نہ تھی سیدھی سادی پہلی جماعت تھی۔ پہلی جماعت کے مدرس میاں جی برکت علی تھے جو ہماری مسجد کے اعزازی پیش امام بھی تھے چونکہ صرف پرائمری پاس تھے اس لئے ان کو صرف چھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ میری جماعت میں مجھ سمیت صرف تیس لڑکے تھے جو کھدر کے کپڑے ہی پہنتے تھے۔ ان تیسوں کی طرف دیکھ کر میاں جی برکت علی کہا کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ جن بچوں کو ابھی سے مول کے کپڑے پہنا کر فضول خرچی کی ترغیب دی جاتی ہے یہ بڑے ہو کر اپنا گھر کیسے چلائیں گے ان کی ساری کمائی تو کپڑے ہی پر اٹھ جایا کرے گی اور پھر وہ اپنی کھدر کی چادر سے اپنا چہرہ پونچھ کر کہتے بھئی دیکھو، کپاس میرے اپنے کھیت میں پیدا ہوئی۔ میری والدہ نے اسے چرخی میں اوٹا۔ رمضان ملاں نے اسے دُھنا جو ہر گھر سے ہر فصل پر پانچ سیر دانے لیتا ہے۔ پھر اسی والدہ اور ہمشیرہ نے بلا مزدوری اس کو کاتا اور گاؤں کے جلاہے نے اسے بنا۔ دھوبی نے اس کی پان نکالی اور جب دھل دُھلا کر آیا تو ماں نے کرتہ، پگڑی اور یہ تہبند سیا اور چادر میں اڑھائی پاٹ جوڑے اور خود ہی سی لی۔ کہو ہمارا کیا خرچ ہوا؟ تم لوگ چھ پیسے گز کی گبرون، دُکتی، حریر مدہ سے ہو چار آنے گز کا ململ لیتے ہو۔ چار آنے قمیص کی سلائی اور چار آنے شلوار کی سلائی دیتے ہو۔ بھلا اس فضول خرچی سے کیا فائدہ؟

پہلی جماعت میں ہمیں اردو کا قاعدہ پڑھایا گیا اور تختی پر الف بے لکھنا سکھایا گیا۔ سرکنڈے سے قلم بنانے کا رواج تھا لیکن پہلی جماعت کے طالب علم بنانے کے مکلف نہیں تھے یہ کام دوسری تیسری جماعت کے طلبہ رضاکارانہ انجام دیتے تھے۔ پہلی سلیٹ سامنے رکھ کر حروف لکھے جاتے اور ان کے نیچے بٹھائے جاتے۔ استاد ہمیں سمجھاتے کہ الف کا طول قلم کے قط کے کتنے نقطوں کا ہونا چاہیئے اور ب کا کتنا۔ دائرے بنانے بس کی بات نہ تھے اور اس پر گوشمالی ہوتی رہتی تھی۔ دس تک پہاڑے یاد کرنے ضروری تھے۔ حاضری اور چھٹی کا ان دنوں کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ سورج نکلتے ہی مدرسے پہنچنا ہوتا تھا۔ دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے گھروں میں کھانا کھانے چلے جاتے۔ دوسرے گاؤں سے آنے والے بچے اپنا دوپہر کا کھانا ساتھ لاتے تھے اور پاس کے کنوئیں پر کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کھاتے۔ کھانے کے بعد پھر پڑھائی شروع ہوتی۔ عصر کے وقت کھیل کے لئے لڑکے جمع ہو کر اپنی اپنی عمر کے مطابق تھوڑی دیر کھیلتے کودتے اور مغرب سے پہلے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

شرارت اور کھیل کود ہم بھی کرتے لیکن اس زمانے کی شرارتوں میں طلبہ آپس میں الجھے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی شکایت بھی استاد کے احترام کے پیش نظر استاد سے نہیں کرتے تھے۔ استاد ان دنوں دری پر بیٹھتے تھے اور ان کے سامنے دو رویہ طالب علموں کی قطار ہوتی جو بوسیدہ ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ جب تک استاد دری پر بیٹھا رہتا بچوں کی کیفیت یہ ہوتی کہ دم بخود رہتے اور چپکے چپکے ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے رہتے۔ شرارت کی سزا میں پہلی جماعت میں صرف مرغا بنتے لیکن اوپر کی جماعتوں میں بدنی سزا بھی ملتی تھی جو عموماً سلیٹ یا تختی کمر پر مار کر دی جاتی تھی، کبھی کبھی قمچی سے بھی خبر لی جاتی تھی پھر استاد سزا دینے میں آزاد تھا۔ ایک دن ایک لڑکا بہت خوش خط تھا میں نے حسد کے مارے اس کی دوات میں ریت بھر دی۔ استاد نے اس قدر رول ہاتھ پر مارے کہ دایاں ہاتھ سوج گیا۔ روٹی کھانے گھر گیا تو دادی اور اماں نے ملامت کی کہ بائیں ہاتھ سے کھانا مکروہ ہے۔ میں نے عذر کیا کہ دائیں ہاتھ پر پھوڑے کا نشان تو سوج گیا۔ اتنے میں ایک ہم جماعت آیا تو اس نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دادی اور اماں نے کہا اچھا ہوا تیری سزا یہی تھی۔

دوسری جماعت کے استاد ایک ہندو تھے جن کا بایاں ہاتھ کلائی کے پاس سے سوکھا ہوا تھا لیکن طبیعت کے دھیمے تھے۔ پہاڑوں کے معاملے میں بہت سخت تھے لیکن اردو میں ان کا علم سماعی تھا لغوی یا قیاسی نہیں تھا۔ مولانا آزاد کی کتاب سے ہم ماری کا سبق پڑھایا تو لفظ بگٹٹ کا تلفظ انہوں نے ٹگ ٹٹ کرایا۔ معائنہ کے لئے ایک بڑے ہی خوش باش اے ڈی آئی صاحب آئے ان کا نام میر لال تھا۔ طلبہ کو بات بات پر ہنساتے تھے، اردو سننے لگے تو ایک لڑکے نے ٹگ ٹٹ پڑھا دوسرے نے بگٹٹ پڑھا، میں نے ڈرتے ڈرتے ٹگ ٹٹ پڑھا۔ وہ بولے! تم استاد سے نہیں پڑھتے کیا؟ میں نے جواب دیا کہ جناب استاد نے تو ٹگ ٹٹ ہی پڑھایا تھا لیکن میرے چچا نے بتایا کہ لفظ بگٹٹ ہے۔ وہ کہنے لگے تمہارے استاد سچے ہیں یا چچا؟ استاد بولے کہ یہ لڑکا بہت نا سمجھ ہے۔ اے ڈی آئی صاحب اپنی ہنسی نہ روک سکے اور مجھے ایک پیسہ انعام دے کر اگلی جماعت کی طرف بڑھ گئے۔ کون یقین کرے گا کہ میں نے ایک پیسے کا پونڈا خرید لیا تو شام تک اس کے رس سے پیٹ بھرا رہا۔ دوسری جماعت کے استاد پرائمری کے بعد جے وی کا امتحان بھی دے چکے تھے اس لئے انہیں آٹھ روپے ملتے تھے اور جے وی ہونے پر ان کو بڑا ناز تھا۔

چوتھی جماعت سے فارسی شروع ہوتی تھی اور پانچویں جماعت میں گلستان پڑھائی جاتی تھی لیکن تختی اور سلیٹ یہاں بھی بدستور ساتھ تھی۔ قلم بنانے کی مشق کرائی جاتی تھی اور اچھی قلم نہ بنا سکنے پر انگلیوں پر سوٹیاں پڑتی تھیں۔ میرے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر آج بھی ایک گٹا ناخن کے قریب اس سزا کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ چوتھی پانچویں جماعت کے استاد ایک ہی تھے۔ انہوں نے میرے دادا کے وقت میں پڑھانا شروع کیا تھا۔ میرے والد بھی ان سے پڑھے۔ انہوں نے پورے تریپن برس اسی سکول میں تعلیم دی۔ فارسی کا مذاق بہت اچھا رکھتے تھے اور جب ہیڈ ماسٹر ان کے کمرے میں آتے تو دونوں فارسی میں باتیں کرتے اور بات بات میں شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے یعنی سعدی کے اشعار پڑھتے رہتے۔ ہیڈ ماسٹر لالہ منشی رام بھی انہی کے شاگرد تھے اور میرے والد صاحب کے ہم جماعت تھے لیکن مڈل پاس کرنے کے بعد نارمل کر چکے تھے اس لئے درجے میں استاد سے بھی بڑھ گئے۔ تاہم وہ ان کا ادب استاد ہی کی طرح کرتے تھے۔

چھٹی جماعت سے مڈل کی پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ مضامین یہ تھے اردو کورس، فارسی (بہار دانش)، جغرافیہ ہندوستان، تاریخ ہند، الجبرا، جیومیٹری، حساب، دیہاتی [illegible]

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

# تعلیم — بگڑے پہلو

میں ایک ایسے نظام کو کیسے پسند کر سکتا ہوں جو قوم میں ہمیشہ کے لئے ستم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں ہاں ستم قاتل۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس نے پوری قوم کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ کھوکھلا، بالکل کھوکھلا۔ اگر ہم قوم کو صحیح معنوں میں صحت مند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان ترقی کے مدارج میں تھے۔ اس وقت حصول علم کے لئے زندگیاں وقف ہوتی تھیں اور علم و فضل کی تحصیل پر فخر و ناز کیا جاتا تھا۔ دل و دماغ کو منور کرنے کی برکات اور عمل صالح بھی جاری تھی۔ اس برعظیم میں جب مغربی تعلیم کا اجرا ہوا تو اس کے متعلق مسلمانوں کا طرز عمل ابتدا میں مخاصمانہ تھا اور بعد میں انہوں نے اس تعلیم کو بنیادی تقاضے کے طور پر ایک آلۂ قدرت کے طور پر برداشت کرنا۔ اس نے کبھی ہمارے دل کو نہیں لبھایا اور نہ کبھی ہماری مکمل وفاداری حاصل کی۔ آزادی کے بعد یہ طرز عمل بدل جانا چاہئے تھے،

مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ ہمارا نظام تعلیم ہماری امانت اور روحانی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی حاصل نہیں کر سکا۔ وہ ایک غیر ملکی پودا ہی رہا اور اسی طرح ہماری طرف تک یہ پہنچا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں کوئی تاثر پیدا نہیں کرتا اور وہ اب تک روزی کمانے کا آلہ ہے، اور ایک ایسی قوت نہیں بن سکا جو روح کو بلند کر سکے۔ محض ایک مادی کا حصہ ہے اور سرچشمۂ نور نہیں بن سکا ہے۔ وہ اساسی غیر دلچسپ اور بے کیف ہے، حتیٰ کہ ہاتھ کی محنت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہاتھ کی محنت میں کبھی کبھی کمال حاصل کر کے فنی تخلیق کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب ہم اگر سلسلے آپ کو ایسے حصار میں نکیر لگا ہوا دیکھ رہے ہیں جو کہ دائرے کے گرد بنے ہوئے ہیں کہ اس سے پیدا ہوتا ہے، تو ہمیں اس پر حیرت و استعجاب نہیں ہوا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک ایسے کنارے پر آ گئے ہیں جس سے آگے اور منزل اور جب تک ہمیں کوئی راہ باہر جانے کے لئے نہیں ملتی ہم کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اگر میں حقیقت حال کی طرف توجہ مبذول نہ کراؤں تو اپنے فرض میں سخت کوتاہی کروں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں ملک میں اعلیٰ تعلیم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے۔ باوجود اس کے کہ حکومت نے جامعات کو کثیر رقوم بطور امداد دی ہیں اور اس روپیہ کو قابل اساتذہ کے تقرر، اچھی عمارتوں اور سازوسامان کی بہم رسانی پر صرف کر کے اس کا بہترین استعمال کیا گیا ہے، تعلیمی معیار نہ صرف ناکام ہیں بلکہ انحطاط پذیر ہو رہے ہیں۔

تعلیم کے عام طور پر دو مقصد قرار دیئے جاتے ہیں۔ پہلا مقصد طلبا میں علم کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں علم کی مقدار اسی قدر بڑھ گئی ہے کہ پورے علم کو طلبا میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اور کسی زمانے میں بھی غالباً یہ صورت نہیں تھی کہ تمام علم منتقل کر دیا جاتا ہو، لیکن اس زمانے میں خصوصیت سے جب دنیا کے تمام جانوں سے علم کے ہر شعبے میں ہزاروں کتابیں چھپ کر سامنے نکلی ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی جامعہ کسی علم کو طالب علموں میں پوری تفصیل کے ساتھ منتقل کر دے اور چونکہ علم کو بالتفصیل منتقل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اب سے کئی سال پہلے سے یہ امر عام طور پر تسلیم ہو رہا ہے کہ استاد کے سامنے صحیح مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ طالب علم کے دل میں علم کا شوق پیدا کر دے اور اس مضمون سے جو وہ پڑھاتا ہے دلچسپی پیدا کرے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ طالب علم میں تنقید کی قابلیت پیدا کرے تاکہ جب اس کے سامنے کوئی بیان آئے تو اس کی قدر و قیمت پرکھ لے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کثرت سے علمی مباحث پر تحریر کیا جاتا ہے اور نسبتاً ایسے خام خیال بھی سامنے آ جاتے ہیں جن کی تردید لازمی ہوتی ہے۔ اس لئے طالب علم میں مضمون سے دلچسپی اور قوت فیصلہ پیدا کرنے کے دو کام دراصل استاد کے فرائض ہیں اور اس کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔ ایک اور اہم ذمہ داری بھی استاد اور ان اداروں پر جو اساتذہ پر مشتمل ہیں، عائد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ طلبا میں ایسا کردار پیدا کریں کہ جو علم انہیں حاصل ہو رہا ہے اس کا وہ صحیح استعمال کر سکیں اور اس کا غلط استعمال نہ کریں تاکہ علم ان کے لئے باعث رحمت ہو اور معاشرے کا کیمیا بن جائے۔

اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے نظام تعلیم میں یہ مقاصد پورے ہو رہے ہیں، تو یہ ایک صریح غلط بیانی ہوگی۔ ہمارے پڑھے لکھے افراد اس توقع پر پورے نہیں اترتے کہ وہ معاشرے کے مسائل کی اس اونچ نیچ سے واقف ہوں جس سے واقفیت معاشرے کو دراصل توجہ سے میسر آ سکتی ہے اور جس سے ادنیٰ عدم توجہی معاشرے کو بگاڑ سکتی ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ ہمارے ہاں کردار کی کمی صرف جاہل طبقے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے سب سے اعلیٰ ڈگری یافتہ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور ان سے بھی جس کردار کی توقع کی جا سکتی ہے وہ ان میں نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ادارے صاحب کردار طالب علم پیدا نہیں کر سکتے تو ان اداروں کی بڑی سخت کوتاہی ہے۔ اور اگر استاد کی صحبت اور تربیت اور تعلیم کا اثر طالب علم قبول نہیں کرتا تو یقیناً کہیں نہ کہیں ہم میں کھوٹ موجود ہے اور اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کھوٹ کس جگہ ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے ہم نے انتہائی سنجیدگی سے اپنا محاسبہ کیا ہے۔

شاید ہم طلبا میں یہ جذبہ پیدا نہیں کر سکے ہیں کہ وہ ہماری زیادہ عزت کریں۔ اس لئے کہ اپنے روزمرہ کے تدریس کے فرائض پورا کرنے کے بعد ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ کوئی نصب العین اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرا سکیں، اور جو کچھ تھوڑی بہت پند و نصیحت کرتے ہیں اس پر بدقسمتی سے ہم خود عمل نہیں کرتے۔ غالباً ہم نے طلبا میں وہ دلچسپی لینے کے لئے تیار نہیں جو ہمیشہ استاد کو لینی چاہئے۔ کبھی کبھی ان خوبیوں کا مشاہدہ کرنے کے برعکس جن کی عموماً استادوں سے توقع کی جاتی ہے وہ ہماری خامیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی موقع علمائے طبع کی جگہ ہمارے حلقے میں کم ہمتی کی جگہ بے رخی کو، اور گرم جوشی کی جگہ سرد مہری کو دیکھ کر ان میں ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے واسطے نوجوانوں کی تربیت سے انہیں نہ صرف ان کی ضروریات کو سمجھنا چاہئے، بلکہ خود اپنے رویے کو ان ضروریات کے مطابق بنانا چاہیئے۔ اس میں ہماری

کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلبا پر ہمارا اثر کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم مشنری سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد محض معلومات بہم پہنچانے سے زیادہ طلبا میں حصولِ علم اور خود زندگی سے متعلق صحیح رویہ پیدا کرنا ہے۔ ہمارے نوجوان رہبری کے لیے تعلیمی اداروں کے سامنے جس حد تک دوسرے معاملات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے اساتذہ کے معاملے میں سرد اور [illegible] زیادہ قابل اعتبار سمجھتے ہیں، اس حد تک ہمیں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ایسا اعتبار قائم کرنے کے لیے ہمیں بہت سی محنت کرنا پڑے گی۔ مراد یہ ہو جانے سے یہ ہوگا کہ ہمیں اس سلسلے میں جیسا کچھ کرنا چاہیے وہ ہم کر رہے ہیں۔ ہم اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری بس کلاس کے کمرے تک ہی محدود رہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہی تعلیم و تربیت کا فرض بھی اس وقت تک پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ طلبا کے دماغ کو اس کے لیے تیار نہ کیا جائے اور انہیں یہ یاد نہ کرایا جائے کہ نظم و ضبط، تہذیب، مذہبی اور معقول فکر تعلیم کی ضروریات میں سے ہیں۔

اس کی ایک اہم اور سب سے بڑی وجہ خود معاشرہ ہے۔ ان متضاد مؤثرات میں سے جو ہمارے نوجوانوں کی سیرت کو تشکیل دے رہے ہیں ہم صرف ایک قوت موثر ہیں۔ مؤثر ترین تعلیمات خود معاشرہ ہے کیونکہ ہمارے نوجوان اسی معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں۔ اچھا ہو یا برا اس معاشرے کا ہر اثر ساتھ کے ساتھ ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور ان کے کردار و گفتار پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے اور معاشرے کے یہ لاتعداد مؤثرات اس قدر گہرے، اس قدر پیچ در پیچ اور پرکار ہوتے ہیں کہ ہم ان کے تمام ہی نتائج کا تدارک نہیں کر سکتے۔ ہم نوجوانوں کی صحیح تربیت کے لیے معاشرے کی مدد تو کر سکتے ہیں لیکن ہم کبھی بھی معاشرے کا بدل نہیں بن سکتے۔ اس لیے اگر حسب منشا تعلیم ہم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہم بہتر خدمات انجام دیں تو سب سے پہلے معاشرے کو چاہیے کہ اپنے کردار پر غور کرے اور ہمارے نوجوان جن مؤثرات میں ہیں ان کا محاسبانہ جائزہ لے۔

آج عملاً صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ ہم اس نظام تعلیم سے جو فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ بھی نہیں اٹھا رہے ہیں۔ ہم تعلیم کا مقصد صرف یہ سمجھے ہیں کہ ہمیں کسی نہ کسی قسم کی کوئی سند حاصل ہو جائے خواہ وہ سند صحیح طور پر کسی علم کی سند ہو یا محض لاعلمی کی غمازی کرتی ہو۔ یہ سند ایک حد تک اور ایک زمانے تک کام آ سکتی ہے۔ یہ سند اگر اچھی ہو تو اس سے یہ کام آتی ہے کہ جب کسی جگہ درخواست دی جائے تو وہ شخص یا ادارہ جسے کسی کی ضرورت ہو یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شخص نے فلاں امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا ہے، لیکن اگر سند اور طالب میں ایسا تفاوت پیدا ہو جائے کہ سند سے طالب کا اندازہ ہرگز نہ لگ سکے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ سند کچھ عرصے کے بعد اسی قدر قیمتی نہ ہوگی جتنا قیمتی وہ کاغذ ہوتا ہے جس پر یہ چھاپی جاتی ہے۔ ایسی اسناد کا تقسیم کرنا جن سے صحیح طالب نہ پہچانا جائے محض کاغذ کا خراب کرنا ہے۔ ان حالات میں اساتذہ کے لیے دستور ہو گیا ہے۔ طلبا مروجہ امتحانوں کے طور طریقے استعمال کر کے ایسی سہل حاصل سندوں کے لیے شور بازی کرتے رہتے ہیں، جن کے حصول میں کوئی محنت نہ کرنی پڑے یا اصل علم کو کسی سے کام مل جائے۔ انہیں عمومی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور بعض اخبارات اس قسم کے مطالبوں کو تقویت پہنچانے کے لیے خبریں اور مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی شورش کے مضمرات کو کوئی بھی نہیں سمجھتا اور سب مل کر اس کی برابر کوشش کرتے ہیں کہ تعلیمی معیاروں کو اور زیادہ پست کر دیا جائے۔ طلبا اور ان کے والدین اور ان کے حامی خود کسی نے اس کھیل کو بڑی ہنسی خوشی سے کھیلتے ہیں۔ اب ہم سند یافتہ جاہلوں کی ایسی نسلیں پیدا کر رہے ہیں جو سراسر جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔

تحصیل اسناد کے لیے یہ جنون اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ اصلی تعلیم کا یہ مقصد کہ معلومات اور ہنر حاصل ہوں، فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ امتحانات میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور بدترین صورت حال یہ ہے کہ بعض کالج بھی اسی طرح بے ایمانی، بدعنوانی کی لت [illegible] سرپرستوں کے سامنے [illegible] تعلیمی ادارے جنہیں مسلمان کسی زمانے میں متبرک سمجھتے تھے آج جس تیزی سے ان میں ڈوب گئے ہیں اور جو لوگ اس قسم کی اسناد کا سہارا لیے رہے ہیں، ان کے زمانوں میں تعلیم کا مقصد اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیمی نظام کے ایک اور بنیادی نقص کی طرف بھی توجہ دلاؤں گا اور وہ ہے بالعموم انگریزی ذریعہ تعلیم کا استعمال۔ ہم جدا ایسے مفید مواد [illegible] زبان سے دلچسپی اور محبت ہے، اور یہ خیال تو [illegible] یہ ہے کہ اردو سے محبت کو تعصب کی کوتاہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارا فکر بہت ہی گھٹیا قسم کا ہے [illegible] تصور میں اپنی زبان کی اہمیت کم آتی ہے۔ ایک اور مجلس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جہاں تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تعلق ہے، مجھے کسی گروہ کی طرف سے اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا کہ اپنی تمام قوم کے احساس کمتری سے۔ یہ احساس کمتری ہی تو ہے جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر ہم [illegible] زبان استعمال کریں تو ہماری قابلیت اعلیٰ اور اگر ہم اردو زبان استعمال کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہماری تعلیم مکمل نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ملک کے تعلیم یافتہ ہر مجلس میں حتی الوسع اردو کا استعمال کریں، تاکہ لوگوں کے ذہن سے یہ احساس کمتری مٹ جائے اور وہ یہ سمجھیں کہ قابلیت کا تعلق کسی زبان سے نہیں۔ ہماری بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہر غلط چیز کو قابلیت سمجھتے ہیں۔ آپ یاد رکھیں کہ زبان اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہے، خود علم نہیں ہے۔ زبان محض ایک [illegible] رکھتی ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم ایک مقصد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ قطع نظر اس کے کہ اردو زبان کی اہمیت کیا ہے اور اس کو [illegible] محبت ہے، انگریزی کے استعمال سے کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ محض ایک معلم کی حیثیت سے میں بعض مشکلات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں [illegible] سے زیادہ مشکل یہ پیش ہوتی ہے کہ وہ پہلے اپنے خیالات میں سلجھاؤ پیدا کرے۔ اگر اس کا مطالعہ وسیع ہے اور اگر اس کے خیالات میں سلجھاؤ ہے تو پھر [illegible] طرح نہیں کرے کہ طالب علموں کو اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت اور مشکل نہ آئے۔ اپنے دماغ سے دوسرے دماغ میں خیالات منتقل کرنا آسان [illegible]

غلط فہمی بڑی ہے عالم الفاظ میں اکبر
بڑی دشواریوں کے بعد اکبر کام چلتا ہے

یہ تو اس زبان کے متعلق ہے، جو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اب آپ لیں ایک غیر زبان کو تو یہ دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہمارے ۹۵ فی صد اساتذہ کی انگریزی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکیں اور اگر وہ اس کے مدعی ہیں، تو ان کا دعویٰ [illegible] اگر کسی نے سوال اس شخص کی جو اپنے خیالات کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے، تو آپ اس کی دشواریاں بھی دیکھیں، جو ان کو حاصل کرنے کے لیے [illegible]

اگر چہ جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ زبان سوں اور استاد و شاگرد کی کل متاع ذہن ہوں، تو فکر کی تربیت نہیں ہو سکتی اور نہ دماغ کسی نئی چیز کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ کوئی فکر ہوتے دماغ میں داخل ہو جائے کوئی ایج یا کوئی نئی چیز پیدا ہو سکے۔ ہمارے ہاں کی کیفیت یہ ہے کہ میری جامعہ میں کہہ سکتا کہ ۹۵ فیصد سے زیادہ طالب علم ایسے داخل ہوتے ہیں جنہیں انگریزی پر اتنا عبور حاصل نہیں ہوتا کہ وہ سیدھے سادے حالات کو صحیح طور پر ادا کر لیں اور ان میں یہ قابلیت تو یقیناً نہیں ہوتی کہ کسی پیچیدہ مضمون پر ان کے سامنے تقریر کی جائے تو اس کی تمام باریکیاں ان پر روشن ہو جائیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایک تو طالب علم کی توجہ مضمون سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک مصیبت میرے سر آ پڑی ہے۔ اس مصیبت کو امتحان تک کسی نہ کسی طرح سر پر ملے۔ امتحان کے بعد مجھے یوم نجات منانے کا موقع ملے گا۔ اس لئے اس کے دل میں کبھی صحیح شوق پیدا ہی نہیں ہوتا۔ شوق پیدا ہوتا ہے، اس چیز سے جو دل میں جگہ لے، شوق پیدا ہوتا ہے اس چیز سے جو دماغ میں سما سکے۔ جو چیز دماغ میں آتی ہی نہیں اس سے شوق کیسے پیدا ہوگا؟ اس محفل میں بہت سے اساتذہ اس جامعہ کے موجود ہیں اور کئی حضرات بھی ایسے موجود ہیں، جو معلم ہیں۔ وہ شہادت دیں گے کہ طالب علم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ استاد چند سوال اچھی طرح سمجھا دے۔ سمجھانے کے معنی یہ ہیں کہ لیکچر رٹ لیے۔ ایسے مشکل دور ایسے اچھے ہوں کہ اگر انہیں امتحان کی کاپی میں منتقل کر دیا جائے تو پرچہ حل ہو جائیں۔ ہوتے ہوتے اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ طالب علم آٹھ یا دس متوقع سوال اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ اگر پاسہ سیدھا پڑ گیا اور سوال یاد کئے ہوئے میں سے آ گئے تو پھر کیا کہنا وارے نیارے ہیں۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ سوالات کے متعلق مشق نہ ہو اور استاد کے دماغ میں نہ ہو تو پھر یہ ہوتا ہے کہ ہر چند وہ سوال نصاب میں شامل ہوں اور ہر چند ان کا معیار زیادہ سخت نہ ہو، طالب علم جسے پڑھنے سے اب اتنی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ سلیبس بھی پورا کر کے نہیں دیکھتا اور اکثر استاد بھی نہیں پڑھتے۔ دونوں یہ کہتے ہیں کہ سوالات نصاب سے باہر ہیں۔ لہٰذا واویلا ہوتا ہے کہ طالب علم امتحان کے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک شور اٹھتا ہے تمام شہریوں کی طرف سے کہ ارباب جامعہ کو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے کہ پرچہ کیسے بنائیں۔ اخبار یہ لکھتے ہیں کہ یہ تو ستم ہو گیا۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ سوال نصاب کے اندر تھے یا نہیں، لیکن کہتے سب یہ ہیں کہ ساری غلطی جامعہ کی ہے۔

حقیقتاً یہ درست بھی ہے۔ جامعہ کی غلطی اس وجہ سے ہے کہ جامعہ کو کبھی تو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ یہ نظام، یہ طریقہ شروع سے لے کر آخر تک غلط ہے۔ اس زمانے میں کہ اس میں انگریزی جاننے والے استاد موجود نہیں ہیں، سکولوں کے اساتذہ کی انگریزی کی قابلیت بہت محدود ہے، یہ کیفیت یہ ہے کہ کالجوں میں بھی کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح طور پر انگریزی میں اپنا مفہوم ادا کر سکیں، تو ایک موقع، ایک لمحہ فکر کا ایسا بھی ہونا چاہیے کہ ارباب جامعہ یہ سوچیں کہ اگر یہ سب غلط ہے تو ہم اس میں شریک کیوں ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اصل میں ایک ہی طریقہ ہے، ایک دیانتدار آدمی کے لئے، یا تو وہ یہ کہے کہ صاحب یہ نظام سارا غلط ہے، سراسر وقت اس میں خراب ہو جاتا ہے، اساتذہ کا وقت اس میں خراب ہوتا ہے، طلبا کا وقت اس میں خراب ہوتا ہے۔ یہ کس محکمے میں آ سکے۔ تمام قوم کو گرفتار کر رکھا ہے کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور بڑی بڑی اسناد حاصل ہو جاتی ہیں، مگر رہتے ہیں جاہل کے جاہل۔ آپ لوگوں میں سے بعض حضرات ایسے ہوں گے، جنہیں شاید انگریزی سے تعلق نہ ہو۔ اکثر تو ایسے ہیں جنہیں تعلق ہے، اور آپ ہم لوگوں سے پوچھئے، جو اس راستے سے گزر چکے ہیں جنہیں حقیقت معلوم ہے، ان لوگوں کی قابلیت کی، جنہوں نے تمام عمر ایسی زبان کے ذریعے پڑھا ہے اور پڑھایا ہے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ ہم میں سے چند افراد اپنی ذہانت کی وجہ سے ایسے درجے پر ضرور پہنچ گئے ہیں کہ جن میں وہ قابلیت موجود ہے، جو اساتذہ میں ہونی چاہیے لیکن جس قسم کی قابلیت دوسرے ممالک کی جامعات کے اساتذہ میں ہونی چاہیے وہ افسوس ہمارے ہاں بالعموم پیدا نہیں ہوئی۔ اگر ہمارے ملک میں پیدا ہوتی تو ہم اپنے طالب علموں کو غیر ممالک میں تعلیم کے لئے کیوں بھیجتے۔ کیا ہمارے طالب علم کند ذہن ہوتے ہیں یا ہمارے اساتذہ ذہن میں کم ہیں۔ ساری دقت یہ رہی ہے کہ

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

ہمارا قصہ یہ ہے کہ ایک ایسی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے پر تمام قوم مجبور ہے، جو نہ صرف اس کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی ثقافت، عقائد اور روایات کسی چیز سے لگا نہیں کھاتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ سنگین اور خطرہ کی بات یہ ہے کہ نہایت چالاکی سے ہماری کتابوں میں ایک ایسا ماحول پیش کیا جا رہا ہے، جو ہمارا ماحول نہیں ہے، وہ مغربی ممالک کا ماحول ہے۔ پہلی نظر میں یہ بات کچھ زیادہ خطرناک معلوم نہیں ہوتی، لیکن گہری نظر سے دیکھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس سے زیادہ قوم کے لئے اور کوئی خطرناک بات نہیں ہو سکتی۔ جب طالب علم کتابوں میں ایک ایسے ماحول کے مرقعے دیکھتا ہے جو اس کے لئے اجنبی ہے تو اس کا پہلا اثر تو یہ پڑتا ہے کہ اسے اپنے گرد و پیش کے بارے میں کوئی کشش پیدا نہیں ہوتی۔ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد طالب علم میں تجسس کے شوق کو ابھارنا ہے۔ اب جو تعلیم شوقِ تجسس کا گلا گھونٹ دیتی ہے وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے سود مند کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ سوال نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنا ایک تجربہ سناتا ہوں۔

ایک دفعہ میں ایم اے کے طلبہ کو پڑھا رہا تھا۔ کالج کا لان تھا اور اس کے اردگرد ہمارے ہاں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں نے طلبہ سے ان پھولوں اور درختوں کے نام پوچھے۔ ایک لڑکا بھی ان پھولوں اور درختوں کے نام نہ بتا سکا۔ یہ سانحہ معمولی نہیں ہے۔ جب کوئی اغیار(?) اگر آج کسی قوم کو مردہ بنا دینا چاہتا ہے تو وہ ہمیشہ نظام تعلیم ایسا بناتا ہے جس میں قوم کی ثقافتی زندگی بالکل منعکس نہیں ہوتی۔

کتابوں میں غیر ملکی ماحول کا طلبہ پر اس سے بھی زیادہ خطرناک اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر لحظہ اپنے ماحول سے نکل کر اس ماحول میں جذب ہونے کے لئے بے قرار رہتے ہیں جس کی تصویر وہ کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تعلیم یافتہ افراد یورپ و امریکہ کی طرف بڑے شوق سے لپکتے ہیں۔ دراصل وہ اس ماحول کو ایک نظر دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں، جسے وہ روز پڑھتے اور جسے نگاہ(?) سا کر کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان یورپ جا کر واپس پاکستان آنا پسند نہیں کرتے۔ وہ آ کر واپس جائیں؟ آپ نے ان کے ذہنوں کو جس ماحول کے لئے تیار کیا تھا وہ انہیں مل گیا۔ اب گوہرِ مقصود کو چھوڑ کر کیسے چلے آئیں۔ سوچئے تو سہی ہمارے نوجوانوں کے ماحول اور ملک کے معاشرتی ماحول میں ہر لحظہ کشمکش جاری ہے۔ یہ کشمکش زندگی کی حرارت کو چوس رہی ہے۔ ایسے میں زندگی میں نئے معانی کہاں سے پیدا ہوں گے۔ ہم اپنے نونہالوں(?) کو دوسروں کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ سوچئے ہم اپنی ساری ایسی نادانی سے دوسروں کی جھولیوں میں ڈال رہے ہیں۔ ہمارے سکول، ہمارے کالج، ہماری یونیورسٹیاں سارے سب

قیمتی سرمائے کو دوستی دشمنی اپنے ہاتھوں سے باہر منتقل کر رہے ہیں۔ کاش ! ہم سمجھ سے کام لیں۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایمان کی بازی لگا کر اپنے بچوں کو انگلش ورس کاموں میں بھیجتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے نکلتے ہیں تو ان کے دل میں نور ایمان کا ایک تنکا بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر بھی ہم اسکول والوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم نہیں، انگریزی زبان آجاتی اور وہ اچھی ملازمتیں پا لیتے ہیں۔ ہمیں قطعاً اس سے کوئی تعلق نہیں کہ ہماری اولاد کا کیا بنے گی، بے دین اٹھے گی، کیا اٹھے گی۔ ہمیں بس اس چیز سے تعلق ہے کہ جب یہ ہمارا لڑکا کسی اسکول میں جائے گا تو انگریزی اس طرح سے بولے گا کہ انگریز کا ماتحت ہو کر کرسی پر موجود رہے وہ مزے سے ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ہمارا نہیں ہوتا اور اس کی خاطر ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ ہماری اولاد مسلمان رہے یا نہ رہے، کیا بات ہے ہمارے دل میں بھی اسلام کی کرسی ہوتی [illegible] ہے تو ہمیں برے کاموں سے روکے گی اور نیک کاموں کی رغبت دے گی۔

میں ان کوتاہیوں کا سارا الزام معاشرے کے سر تھوپنا نہیں چاہتا۔ میں اس مرض کو صرف یہ عرض کروں گا کہ ہمارے معاشرہ کو جو عارضہ لاحق ہوگا ہے اس کا بنیادی سبب کیا ہے کیونکہ حال میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم زندگی کی کسی سمت کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ ہم بے مقصد، بے جادہ منزل کو ستی شکستہ پھر رہے ہیں۔ ہماری مثال ایک ایسے پیتے کی ہے جس کا پیوار سلامت نہیں اور جسے جو موج جہاں چاہے اچھال دے اور جب چاہے غرقاب کر دے۔ پھر وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے پست سمت ہیں کہ محض حیوانی زندگی کی سطح سے بالاتر کسی اور سطح تک پہنچ کر جینے کی آرزو تک نہیں کر سکتے۔

یہ حالات بڑے حد درجہ فکر اور افسردگی پیدا کرنے والے ہیں، مگر ان کا اظہار ضرور ہونا چاہئے۔ ان کا مسلسل اعادہ کر کے قوم کے کانوں کو اس آہنگ سے بھر دینا چاہئے کہ وہ بیدار ہو کر خطرے کا احساس کریں اور سچا ذکی تدابیر اختیار کریں۔

**

---

## بقیہ : جب ہم پڑھتے تھے

سائنس اور مساحت کے عملی اسباق جو پرائمری میں صرف زبانی پڑھے تھے۔ ان عملی اسباق میں زمین کی پیمائش، رقبہ، جریب کشی، کلاس کا استعمال، عرض، مساوی الاضلاع مستطیلوں، مثلثوں اور اسڈے بیڈے اضلاع والے زمین کے ٹکڑوں کا رقبہ اور نقشہ بنانے کے دوسرے اسباق۔ صبح کے وقت خدا کی حمد، اور اپنے ورد ختم کی سلامتی کی دعا کے بعد ڈرل ہوتی تھی جس کے کاشن انگریزی میں ہوتے تھے۔ اس کے لئے ایک اسامی ہر مڈل میں ورزش ماسٹر کی ہوتی تھی اور شام کو وہی جمناسٹک کراتے تھے جس میں ڈنگر لینا اور پیرل بار کی مشقیں ضروری تھیں۔ ان سے طلبہ دراصل بے حد لطف رہتے تھے لیکن حد ادب سے باہر نہیں نکلتے تھے۔

مڈل کی جماعتوں کے لڑکے مدرسے خود اعتمادی سے پڑھتے تھے کہ مڈل پاس کرنے کے بعد یا مدرس بن جائیں گے یا پٹواری اور عموماً اس زمانے میں یہ تعلیم کی حد ہوتی تھی۔ چند گنتی کے لئے شہروں کا رخ کرتے تو ہائی سکولوں میں داخلہ لیتے۔ صورت یہ تھی کہ مڈل پاس لڑکوں کو پہلے دو سال صرف انگریزی کی جونیئر کلاس کا امتحان دینا پڑتا تھا اور پھر نویں اور دسویں کا۔ انبالہ چھاؤنی میں سید محمڈن ہائی سکول میں یہ دو سال گزارے تھے کہ انبالہ شہر میں مسلم ہائی سکول قائم ہوا اور وہاں داخلہ لیا۔ یہاں شرارتوں کا سدان سکول کی سست بورڈنگ ہاؤس میں رہا وہ تھا لیکن یہ شرارتیں بھی آپس تک ہی محدود تھیں۔ آج کے ہائی سکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ کسی طرح سے پیچھے صدی کے دوسرے دہلے میں لوٹ جائیں اور پھر یا سکول یا کالج جائیں اور پھر اپنے ہم جنسوں میں یہ کہہ کر اتنائے پھریں کہ

استاد کی چھاتی پہ چڑھ کے خوب بچھاڑا

لیکن وقت کس کا لحاظ کرتا ہے !

**

---

## بقیہ : مغربی تعلیم اور مسلم طلبہ

اب ضروری ہے کہ آپ کا نظام تعلیم مل جائے اور اس کی جگہ وہ نظام تعلیم آئے جو آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اپنے کانوں سے سننا اور اپنی عقل سے سوچنا سکھائے جو سب سے پہلے آپ کو مسلمان ہونے کی حیثیت کی ذمہ داریاں سکھائے، اور پھر اس کائنات پر اس نگاہ سے غور کرنے کی قابلیت پیدا کرے جو ایک مسلم کی نگاہ ہوتی ہے۔ [illegible]

اب صرف وہ نظام تعلیم آپ کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے جو خدا شناسی اور خود شناسی پر مبنی ہو جو آپ کو خدا کی صفات، اس کی مرضیات اور احکام، اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے احکام و تعلیمات سے آشنا کرے، اور تمام علوم و فنون پر اس ناقدانہ بصیرت کے ساتھ نظر کرنے کی قابلیت بہم پہنچائے جس سے آپ حق و باطل میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کر سکیں اور انسان نے علوم و فنون کے نام سے رطب و یابس جمع کر رکھا ہے، اس کے کھوٹ اور سچ کو الگ الگ کر کے دنیا کو دکھا سکیں۔

**

# اسلامی یونیورسٹی — ایک نقشہ، ایک خاکہ

*دنیائے اسلام میں تعلیم کے نظام پر جس انداز میں معاملہ ہو رہا ہے جس طرح سے تربیت دی جاتی ہے اور پھر جو پھل پک کر تیار ہو رہا ہے وہ کسی کی چشمِ حال سے اوجھل نہیں۔ اس صورت میں نظامِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے سوزِ دل میں ڈوبے ہوئے قلم سے ایک جامع تعلیمی نقشہ کا مہیا کیا ہے۔ (مدیر)*

مختلف مسلم ممالک میں اس طرح کی تحریریں کی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں بنیادی تغیرات کیے جائیں اور ایک ایسے جدید طرز کے اسلامی تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں جو مسلم نوجوانوں کو اسلام کے نصب العین کے مطابق دنیا کی رہنمائی کے لیے تیار کر سکیں، لیکن اس سلسلے میں اب تک جتنے ادارے قائم ہوئے ہیں ان کے نقشے اور کام کو دیکھ کر عالمِ اسلامی کے اصحابِ فکر میں سے کوئی بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ اس وقت درحقیقت عالمِ اسلامی کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نہ تو ایک دارالعلوم یا کلیۂ شریعہ ہے جو قدیم طرز کے علماء تیار کرے، اور نہ ایک جدید یونیورسٹی جو مغربی علوم کے ماہرین پیدا کرے، بلکہ وہ ایک ایسی جامعہ ہے جو دنیا میں اسلام کے علمبردار تیار کر سکے۔

انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک تمام مسلمان ملکوں میں اس وقت دو طرح کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ ایک نظامِ تعلیم خالص مغربی ذہن و فکر رکھنے والے اور مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگے ہوئے آدمی تیار کر رہا ہے اور اسی کے تیار کیے ہوئے لوگ مسلم ممالک کی حکومتوں کے تمام معاملات چلا رہے ہیں۔ انہی کے ہاتھ میں معیشت کا سارا کاروبار ہے۔ وہی سیاست کی باگیں تھامے ہوئے ہیں اور وہی تمدن و تہذیب کی صورت گری کر رہے ہیں، لیکن یہ لوگ بالعموم دین کے علم و فہم سے عاری اور مغربیت سے مرعوب و مغلوب ہیں۔ اس لیے یہ دنیا بھر میں امتِ مسلمہ کی گاڑی کو روز بروز نہایت تیزی کے ساتھ اسلام کی مخالف سمت میں لیے جا رہے ہیں۔ دوسرا نظامِ تعلیم علومِ دین کے علماء تیار کر رہا ہے جو دنیوی علوم سے بالعموم ناواقف ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے بس مذہبی شعبوں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں کہیں بھی ان قابلیتوں اور ان اوصاف سے متصف نہیں ہیں جن سے یہ زندگی کی گاڑی کے ڈرائیور بن سکیں۔ ہر جگہ یہ صرف ایک بریک کا کام دے رہے ہیں جس کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ملحد ڈرائیور جس تیزی کے ساتھ امت کی گاڑی کو مخالف سمت میں لے جانا چاہتا ہے اس میں رکاوٹ پیدا کرے اور رفتار کو سست کرتا رہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر مسلمان ملک میں یہ بریک روز بروز کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، بلکہ بعض ملکوں میں تو بدمست ڈرائیور اس بریک کو توڑ چکے ہیں اور بے لگام ہو کر راستہ بے تحاشا اپنی قوم کو دوڑائے لیے جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ باقی مسلمان ملکوں میں وہ وقت آ جائے جب کہ ہر جگہ یہ بریک ٹوٹ چکا ہو، ہمیں ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیے جس سے بیک وقت دین و دنیا کے عالم تیار ہوں، جس سے نکلنے والے بریک کی جگہ نہیں، بلکہ امت کی گاڑی کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہوں اور اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی اور دنیوی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مغربی طرز کے نظامِ تعلیم سے فارغ ہونے والوں کی بہ نسبت فائق تر ہوں۔

اس ضرورت کو مسلم دنیا کا کوئی تعلیمی ادارہ پورا نہیں کر رہا ہے۔ عالمِ اسلامی کے تمام اہلِ فکر پریشان ہیں کہ اگر ایسا ایک نظامِ تعلیم قائم نہ ہوا تو امتِ مسلمہ کو دین و اخلاق کی مکمل تباہی سے کیسے بچایا جا سکے گا۔ اس طرح کا نظامِ تعلیم بنانے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ صرف حکومتیں ہی فراہم کر سکتی ہیں اور مسلم ممالک کی حکومتیں جیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، ان کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میرے ذہن میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک تعلیمی ادارے کا جو خاکہ ہے اسے عالمِ اسلامی کے سامنے پیش کر دوں۔ شاید کہ اہلِ علم و فکر اسے پسند کریں، اور دنیا کی کوئی مسلم حکومت اس کو جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو جائے، یا اللہ کچھ اہلِ ثروت و اہلِ خیر اصحاب کا سینہ اس کام کے لیے کھول دے۔

اس یونیورسٹی کے لیے میں اپنی تجاویز نہایت اختصار کے ساتھ سطورِ ذیل میں پیش کرتا ہوں:

سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا مقصد واضح طور پر متعین کر دیا جائے تاکہ اس کا سارا نظام اسی کے لحاظ سے وضع کیا جائے، اس میں کام کرنے والے بھی اس کو نگاہ میں رکھ کر کام کریں اور اسے دیکھنے والے بھی اس معیار پر جانچ کر اسے دیکھ سکیں کہ وہ اپنے مقصد کو کہاں تک پورا کر رہی ہے۔ میرے نزدیک اس کے مقاصد یہ ہونے چاہییں:

۱۔ وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دورِ جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے لائق ہوں۔

۲۔ اس کو اپنا دائرۂ کار صرف علومِ اسلامیہ تک محدود رکھنا چاہیے۔ دوسرے علوم اس میں اس حیثیت سے پڑھائے جائیں کہ وہ علومِ اسلامیہ کے لیے مددگار ہوں، نہ اس حیثیت سے کہ اس یونیورسٹی کو ان کے علوم کے ماہرین تیار کرنے ہیں۔

۳۔ اسے لازماً ایک اقامتی یونیورسٹی ہونا چاہیے جس میں طالب علم ہمہ وقت رہیں اور اساتذہ بھی یونیورسٹی کے حدود میں سکونت پذیر ہوں۔

۴۔ اسے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے کھلا ہونا چاہیے تاکہ ہر جگہ کے طالب علم آزادی کے ساتھ اس میں آ کر داخل ہو سکیں۔

۵۔ اس کا پورا ماحول ایسا ہونا چاہیے جو طلبہ میں تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنے والا اور ان کے اندر اسلامی ثقافت کو مستحکم کرنے والا ہو۔ اس کو مغربی ثقافت کے اثرات سے محفوظ رکھا جانا چاہیے تاکہ اس کے طلبہ میں وہ شکست خوردہ ذہنیت پیدا نہ ہونے پائے جو مغرب سے مغلوب اور مرعوب ہونے والی قوموں میں ہر جگہ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی حدود میں مغربی لباس کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے۔ اس میں طلبہ کے کھیل اور تفریحات کے لیے بھی مغربی کھیلوں کے بجائے گھوڑے کی سواری، تیراکی، نشانہ بازی

اسلحہ کا استعمال موٹر سائکل اور موٹر چلانے کی مشق اور ایسی ہی دوسری تفریحات رائج کی جانی چاہئیں اس کے ساتھ انہیں کسی حد تک فوجی تربیت بھی دی جانی چاہیے۔

۶۔ اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب بھی صرف علمی قابلیت کی بنا پر ہی نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کے تمام اساتذہ اپنے عقائد و نظریات اور اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے صالح اور متقی ہونے چاہئیں اس جامعہ کے دو گری سکالر میں کے بعد ایسے اساتذہ کو عالم اسلامی کے مختلف ممالک سے منتخب کیا جائے جو اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد و افکار کے لحاظ سے پورے مسلمان ہوں، عملاً احکامِ اسلامی کا اتباع کرنے والے ہوں اور مغربی ثقافت سے شکست خوردہ نہ ہوں، بلکہ میں تو یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جامعہ کے لیے جن اساتذہ کو منتخب کیا جائے، ان کے متعلق یہ اطمینان بھی کر لیا جائے کہ ان کے گھر والے بھی حدودِ شرعیہ کی پابندی سے آزاد نہ ہوں، اس لیے کہ جامعہ کے حدود میں اگر طلبہ کے ساتھ ایسے اساتذہ رہیں جن کے گھر کی خواتین تبرجِ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور جن کے گھر سے نغموں کی آواز بلند ہوتی رہیں، تو طلبہ کو ان سے کوئی اچھا سبق نہ مل سکے گا۔

۷۔ اس کے طلبہ کو ایسی تربیت دی جانی چاہیے کہ ان میں خصوصیت کے ساتھ حسبِ ذیل اوصاف پیدا ہوں

الف۔ اسلام اور اس کی تہذیب پر فخر اور اسے دنیا میں غالب کرنے کا عزم۔
ب۔ اسلامی اخلاق سے اتصاف اور اسلامی احکام کی پابندی
ج۔ دین میں تفقہ اور مجتہدانہ بصیرت۔
د۔ تنگ نظری اور فرقہ بندی سے پاک ہونا۔
ھ۔ تحریر و تقریر، اور بحث کی عمدہ صلاحیتیں اور تبلیغِ دین کے لیے مناسب قابلیتیں۔
و۔ جفاکشی، محنت، چستی اور اپنے ہاتھ سے ہر طرح کے کام کرلینے کی صلاحیت۔
ز۔ تنظیم و انتظام اور قیادت کی صلاحیتیں۔

۸۔ اس میں صرف وہ لوگ شامل کیے جانے چاہئیں جو ثانوی تعلیم کے مرحلے سے فارغ ہو چکے ہوں، عرب ممالک سے آنے والے طلبہ براہِ راست اس میں داخل ہو سکتے ہیں، لیکن غیر عرب ممالک کے طلبہ اگر عربی زبان میں کافی استعداد نہ رکھتے ہوں، تو ان کے لیے کم از کم ایک سال کا کورس الگ ہونا چاہیے، تاکہ انہیں عربی زبان کی کتابوں سے استفادے کے قابل بنایا جاسکے۔

۹۔ اس کی تعلیم کو ۹ سال کے تین مرحلوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مرحلۂ اولیٰ ۴ سال مرحلۂ ثانیہ تین سال اور مرحلۂ ثالثہ دو سال۔

۱۰۔ مرحلۂ اولیٰ میں حسبِ ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہیے اور ان کو تعلیم کی چار سالہ مدت پر مناسب طریقے سے تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔

الف۔ عقائدِ اسلام، اس تفصیل کے ساتھ کہ قرآن و سنت کی رو سے اسلام کے عقائد کیا ہیں اور ان کے حق میں کیا نقلی اور کیا عقلی دلائل ہیں۔ اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں میں اختلافِ عقائد کیسے اور کس ترتیب سے رونما ہوا ہے اور اسی لحاظ سے دنیائے اسلام میں اس وقت کتنے مذہب پائے جاتے ہیں۔ اس درس کو بیانِ علمی کے حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہیے اور حربِ عقائد سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

ب۔ اسلامی نظامِ حیات۔ اس مضمون میں طلبہ کو پورے اسلامی نظام سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے۔ ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر گھر اور خاندان سے لے کر معیشت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات تک مسلم سوسائٹی کی زندگی کے مختلف شعبوں کو وہ کن اصولوں پر منظم کرتا ہے اور اس سے پوری اسلامی تہذیب کی کیا شکل بنتی ہے۔

ج۔ قرآن۔ چار سال کی مدت میں پورا قرآن مختصر تفسیر کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ اس کے لیے تفسیر کی کوئی خاص کتاب مقرر کرنے کے بجائے استاد کو خود کتبِ تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے اس طرح قرآن کا درس دینا چاہیے کہ طلبہ کتاب الٰہی کا مقصود و مدعا ٹھیک طرح سمجھ لیں اور جو شکوک و شبہات ان کے ذہن میں پیدا ہوں وہ رفع کر دیے جائیں۔

د۔ حدیث۔ اس مضمون میں اجمالاً تاریخ علمِ حدیث اور اصولِ حدیث اور دلائل حجیتِ حدیث سے طلبہ کو ضروری حد تک آگاہ کرنے کے بعد درس کے مجموعوں میں سے کوئی ایک کتاب مکمل پڑھا دی جائے، مثلاً منتقی الاخبار یا بلوغ المرام یا مشکوٰۃ المصابیح۔

ھ۔ فقہ۔ اس مضمون میں تاریخِ فقہ اور اصولِ فقہ پر ایک ایک مختصر کتاب پڑھانے کے بعد طلبہ کو فقہ کی تعلیم اس طرح دی جانی چاہیے کہ وہ مسائلِ فقہیہ میں مختلف فقہا کے مذاہب سے بھی واقف ہو جائیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ماخذِ شریعت سے ائمہ مجتہدین نے کس طرح مسائل کا استنباط کیا ہے۔

و۔ تاریخِ اسلام، اس کا آغاز تاریخِ عرب سے کیا جائے اور پھر خصوصیت کے ساتھ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے دور کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پڑھانے کے بعد مختصراً پوری اسلامی تاریخ سے طلبہ کو روشناس کرا دیا جائے۔

ز۔ علومِ عمرانی (SOCIAL SCIENCE) خصوصاً معاشیات، سیاسیات اور سوشیالوجی۔ ان مضامین کی تعلیم کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جانا چاہیے جو اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کے ساتھ تعلیم دے سکیں، مغربی افکار و نظریات جوں کے توں طلبہ کے ذہن میں نہ اتار دیں۔

ح۔ ادیانِ عالم، خصوصاً یہودیت، عیسائیت، بدھ مذہب اور ہندو مذہب سے اجمالی واقفیت۔

ط۔ جدید مغربی افکار کی مختصر تاریخ اور ان کے مذاہب، خصوصاً مغربی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ۔

ی۔ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی میں سے کوئی ایک زبان۔

۱۰۔ مرحلۂ ثانیہ میں پانچ فیکلٹیاں ہونی چاہئیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام اور تاریخ۔

۱۱۔ تفسیر کی فیکلٹی میں حسبِ ذیل مضامین ہونے چاہئیں:

۱۔ تاریخ القرآن

تاریخ علم تفسیر، اور مفسرین کے مختلف مذاہب اور ان کی خصوصیات

۲۔ اختلاف قرأت

۳۔ اصول تفسیر

قرآن مجید کا تفصیلی اور گہرا مطالعہ

۔ مخالفین کی طرف سے قرآن پر آج تک جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا جائزہ اور ان کے جوابات ۔

احکام القرآن

حدیث کی فیکلٹی میں

تاریخ تدوین حدیث

علوم حدیث اپنے تمام شعبوں کے ساتھ ۔

حدیث کی امہات کتب میں سے کوئی ایک کتاب تفصیلی تنقید کے ساتھ ۔۔۔ طریقہ پر احادیث کو پرکھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے ۔

کتب صحاح پر ایک جامع نظر

حدیث پر مخالفین کی طرف سے اب تک جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا ۔۔۔ جوابات ۔

فقہ کی فیکلٹی میں

اصول فقہ ۔

تاریخ فقہ ۔

۳۔ فلسفۂ قانون جدید

۔ رومی و ایرانی قوانین ، یہودی شریعت ، جدید وضعی قوانین اور اسلامی قوانین کا تقابلی مطالعہ ۔

۵۔ فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب اور ان کے اصول

۶۔ قرآن وسنت سے براہِ راست استنباط مسائل کی مشق ۔

۷۔ اہل سنت کے چاروں مذاہب کی فقہ اور اس کے ساتھ فقہ ظاہری ، فقہ زیدی اور فقہ جعفری بھی ۔

۱۴۔ علم الکلام کی فیکلٹی میں

۱۔ مبادی منطق

۲۔ فلسفۂ قدیم و جدید ۔

۳۔ مسلمانوں میں علم کلام کے آغاز سے اب تک کی تاریخ اور ان مذاہب کی تفصیل جو اندرونی اور بیرونی اثرات سے مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئے ہیں

۴۔ علم الکلام کے مسائل اور ان میں قرآن وسنت کی رہنمائی ۔

۵۔ اسلام پر مخالفین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ اور اس کے جوابات

۶۔ تقابل ادیان خصوصاً مسیحیت کی تاریخ ______ اور اس کے علم کلام کا تفصیلی مطالعہ ۔

۷۔ مسیحی مشنریوں کا کام اور ان کے طریقے

۔ تاریخ اسلام کی فیکلٹی

۱۔ فلسفۂ تاریخ بمقصد مطالعۂ تاریخ اور طرز مطالعۂ تاریخ قرآن مجید کی رو سے ۔

۲۔ فلسفۂ تاریخ کے مختلف مذاہب ابن خلدون سے اب تک ۔

۔ تاریخ عرب و مشرق اوسط قبل اسلام ۔

۔ تاریخ اسلام عہد نبوی سے اب تک بلحاظ فکر ، علوم ، اخلاق تمدن و سیاسیات !

۔ تجدید و احیائے دین کی تحریکات

۔ مسلمان ممالک پر مغربی استعمار کے غلبے کی تاریخ اور اس کے اثرات و نتائج ۔

۔ درجۂ ثالثہ میں داخل ہونے والا طالب علم مذکورہ بالا فیکلٹیوں میں سے کسی ایک میں خاص موضوع پر دو سال تک علمی تحقیق کرنے کے بعد کوئی مقالہ پیش کرے گا جس کو اہل علم جانچنے کے بعد اسے سند فضیلت دیں گے ۔ !

۔ اس جامعہ کے لیے ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہونی چاہیے جس میں جامعہ کی مذکورہ بالا ضروریات کے مطابق وسیع پیمانے پر کتابیں فراہم کی جائیں ۔ !

۔ ایک کمیٹی کا تقرر اس غرض کے لیے کیا جائے کہ جامعہ کی تعلیم کے مختلف مراحل اور شعبوں کے لیے مناسب کتابوں کا انتخاب کرے ۔

۔ ایک اکاڈمی ( ACADEMY ) کا قیام اس غرض کے لیے کہ جامعہ کی ضروریات کے لیے مناسب ترین کتابیں تیار کرے ۔ !

**

# ہمارے دینی مدارس

میں اس سخت جان دینی نظامِ تعلیم کے حق میں اپنے جذبۂ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال تک برقرار رکھا ہے۔ وہ اشخاص اور ادارے بڑے ہی قابلِ قدر ہیں جنہوں نے اسلام کے بالکل خلاف کام کرنے والے نظامِ اجتماعی کے دائرے میں بہت ہی کم مدتوں میں دینی تعلیم گاہوں کو چلایا اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کر کے ایک بے لوث خدمت کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر قابلِ داد ہیں وہ فرزندانِ ملت بھی جنہوں نے دنیوی ترقیوں سے قطع نظر کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے زندگیاں کھپا دیں۔ انہیں قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔

یہ اعتراف میرے دل میں ہمیشہ رہا اور ہمیشہ رہے گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اسی دینی نظامِ تعلیم کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور بڑی بے چینی سے یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تعمیری تبدیلیاں جلد از جلد واقع ہونی چاہئیں ورنہ جو کچھ جس ڈھب سے چل رہا ہے زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ میرے اندر ان سرگرمیوں کے لیے محض تنقیص اور تحقیر کا جذبہ نہیں رہا، لیکن میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجود ہیں اور اگر ان کو زیرِ بحث نہ لایا جائے تو وہ ہمیشہ موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی اس عظیم الشان کام کے اصل مقصد کو نقصان پہنچا رہی ہے اور مزید نقصان پہنچائے گی۔ میرا جذبۂ خیر خواہی دامن گیر ہو کر تقاضا کرتا ہے کہ میں بزرگانِ ملت کو ان کمزوریوں کے ازالے کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کروں کہ وہ اپنے سے ایک ادنیٰ آدمی کی بات سننے کے لیے اونچا ظرف رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تعلیم کی تمدنی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسان سازی کے پروگرام میں سب سے پہلے خاندان، پھر مکتب، اور پھر معاشرے کا مجموعی ماحول حصہ لیتا ہے۔ مکتب کے اثرات تربیتِ فکر و عمل میں اس بنا پر بہت زیادہ دخیل ہوتے ہیں کہ ہر ادارہ ہمہ تن اسی مقصد کے لیے وجود میں آتا ہے اور اس کے اندر طلبہ دن کا ایک بڑا حصہ اخذ و اکتساب میں گزارتے ہیں۔ تعلیم ایک نسل کے نظریاتی و تجرباتی سرمائے کو بعد کی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ متفرق تجربات چونکہ کسی نظریے ہی کے گرد مجتمع اور مرتب ہوتے ہیں، اس لیے کسی نظامِ تعلیم میں سب سے بڑی اہمیت نظریے کی ہوتی ہے۔ ہر نظریہ ایک خاص طرز کا کردار پیدا کرتا ہے اس وجہ سے ہر نظامِ تعلیم انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے ایک سانچے کے طور پر کام کرتا ہے۔ پس تعلیم دراصل زندگی کے فلسفے اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اسلوب و فن پر مشتمل ہوتی ہے۔ تعلیم کی تمدنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ درسگاہ بہت سے انقلابوں کی پرورش گاہ ثابت ہوتی ہے اور معلم ایک چلتے ہوئے نظام کو زیر و زبر کر دینے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

تعلیم کی یہی اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر ہماری تاریخ میں تعمیر و اصلاح کے داعی جب کبھی سیاست کے دائرے میں خوفناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوئے ہیں، تو انہوں نے بلا تامل تعلیم کے مورچے سنبھال لیے ہیں۔ ملوکیت کے دورِ استبداد میں اصلاح پسند عناصر نے فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈمیوں کو قائم کیا اور ان کے ذریعے نوجوان طاقت کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریۂ حق اور نظامِ خیر و فلاح کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ علمی اور تحقیقی لٹریچر تخلیق کیا تاکہ معاشرے کے مجموعی ماحول پر زیادہ اثر انداز ہوا جا سکے۔ اسی طرح تاتاریوں کی تاخت کے بعد جب دوسرا بڑا دھکا تعمیری رجحانات کو پہنچا تو اسی کے ردِ عمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظامِ تعلیم و تربیت تھا۔ اس کا اصل منشا یہ تھا کہ ناسازگار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دیے جائیں جن میں سچی خدا پرستی، دنیا سے بے نیازی، ایثار و قربانی، حسنِ خلق اور دعوتِ الی اللہ کا ولولہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایہ محفوظ کرنے کا ایک عبوری دور گزارا جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں، تو اس سرمائے کو اجتماعی دائرے میں کھپا دیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصد سے غافل کا موجب بن گیا اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے انہدام کے بعد جب نظامِ حیات کی باگ ڈور پوری طرح الحاد اور سیکولرزم کے قبضے میں چلی گئی، تو دعوتِ اسلامی کے علمبردار مسجدوں اور حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے اپنے طرزِ خیال کے کردار تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر بڑا اثر ڈالا ہے، لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین اور اس کے وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور ہماری دینی درس گاہیں فقط خطیب، مناظر، مفتی، اور مدرس پیدا کرنے کے لیے رہ گئیں۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اوّلاً ہمیشہ ایک انقلابی و تعمیری رجحان کے تحت رونما ہوئی ہیں۔ ان کا مقصد نظامِ حق کے ایسے علمبردار پیدا کرنا تھا جو نظریۂ اسلامی کے امانت دار ہوں اور دنیاوی مفاد کو ترک کر کے رضائے الٰہی کے لیے انقلابی تحریک برپا کرنے میں موزوں وقت پر حصہ ادا کر سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جب کہ حق و باطل کی کشمکش زور وں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، ہمارے دینی مراکزِ تعلیم اس معرکے کی پشت پناہی اور اس میں بہترین افراد سے کمک پہنچانے کا فریضہ ادا نہیں کر رہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دینی مدارس کی روح میں جمود آ گیا ہے اور یہ زندگی کے اسلامی نظریہ و اسلوب کی تعلیم سے طلباء کو کما حقہ مالا مال کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔ یعنی آئندہ دور اور اجتماعی ماحول کی ضرورت کے مطابق ذہن اور کردار کی تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ بس اب کسی تامل کے بغیر اس تعلیمی نظامِ کار پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس پر اگر اس نظام کے کارپردازوں میں سے کچھ بھی لوگ غور و فکر کے لیے تیار ہوں تو چار نکات ایسے ہیں کہ جن کو پیشِ نظر رکھ کر دینی مدارس کی موجودہ ہیئت میں تغیر [illegible]

## ایک اجتماعی نظامِ زندگی

ہماری دینی درسگاہوں کے کارپرداز پہلا نکتہ یہ سامنے رکھیں کہ انہیں زندگی کے سیاسی و معاشی مسائل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہیں دینی ہے، بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظامِ زندگی کی تعلیم دینی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے سے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقائد اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، انفرادی اخلاق و آداب کا ایک ضابطہ اور اس کے متعلق واعظانہ تبلیغات، فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ و مجادلانہ طریقِ فکر اور مسلمانوں کے پرسنل لاء کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی ذہن سے عائلی بیاری۔ بس ان چیزوں پر ہمارے دینی مدارس کا نظامِ تعلیم مشتمل ہے۔ یہ نظامِ تعلیم برسوں کی کاوش کے بعد بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالمگیر پیمانے پر زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکیں، جن کے پاس اعلیٰ درجے کے عقلی معیارات موجود ہوں اور جو ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لیں۔

## فعّال و متحرک انسان

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ عرض ہے کہ کسی بھی نظریہ و فکر کے لیے صرف ایسے افراد کارآمد ہوتے ہیں جو فعّال اور متحرک ہوں اور اپنے نظریات کی برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں۔ مگر ہمارے لقتۂ کار میں کوئی ایسی کوتاہی موجود ہے کہ ہم اسلام کی علمبرداری کے لیے برسوں سے ایک ہی ڈھب کا جو کردار پیدا کر رہے ہیں، وہ فعّال اور متحرک اور ذہنی و فکری برتری کا شعور رکھنے والا نہیں، بلکہ بالعموم گوشہ گیر، سیاست گریز، جامد، معطل، مضمحل، یاس زدہ، پسپائی پسند اور مسلک کش ہے۔ یہ اتنے سارے سخت الفاظ عمداً شاہد ہے کہ کسی جذبۂ نفرت یا تنقیص سے نہیں کہے جا رہے ہیں بلکہ امرِ واقعہ کو چونکہ ان کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا، اس لیے بڑی دردمندی سے عرض کیے جا رہے ہیں۔

آپ خود جائزہ لے کر دیکھیں، تو قلیل سی ایک تعداد کو چھوڑ کر دینی مدارس کے پیدا کردہ انسان کو ہم زندگی کے اجتماعی ہنگاموں سے بالکل منقطع پاتے ہیں۔ وہ موجوں کی کشاکش سے ہٹ کر دور ساحل پر تماشا نظر آتا ہے۔ وہ مخالفِ اسلام رجحانات اور انہیں لے کر چلنے والے بااثر طبقات سے مرعوب اور ان کے مقابلے میں کسی عجز و کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔ وہ باطل اور بدی سے دور رہنا چاہتا ہے، مگر اس سے پنجہ آزمائی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مشاغل کے ایک محدود دائرے میں پناہ گزیں ہے۔ کاش کہ ہماری دینی درسگاہیں اس حقیقت کو محسوس کر کے اپنے نظامِ کار کو بدل ڈالیں۔

## جدید علوم کا مطالعہ

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کرنا اگر مطلوب ہو تو ہمیں ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو دورِ حاضر کے ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے۔ دورِ حاضر کے ذہن کو اپنی قوم کے دائرے کے اندر بھی اور وسیع ترین الاقوامی دائرے میں بھی مخاطب اور متاثر کرنے کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کے علمی اور معلوماتی پس منظر کا احاطہ کیا جائے۔ وہ جس طرح کی کشمکش سے دوچار ہے ہمیں کا پورا پورا اندازہ ہو اور اس کے سامنے آج جو مسائل جس شکل میں آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ استدلال موجود ہے اس سے داعی باخبر ہو۔ یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلباء میں نہیں پیدا کر سکتے جب تک کہ وہ جدید فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات و معیشت کے علوم سے انہیں مالا مال نہ کریں اور انہیں مغربی نظامِ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرائیں۔ اس مقصد کو مروجہ نصاب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔

عجیب بات ہے کہ بار بار ملت کے اصحابِ نظر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ایک بڑی تبدیلی ہونی چاہیے، مگر ہم درسِ نظامی کے چکر سے نہیں نکل سکتے اور نہ اس کے تنگ سے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں۔ درسِ نظامی بڑی ذہنی کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ بڑی شے ہے، مگر حالات اور مزید ریاست نے ایسی نئی مانگیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کو پورا نہ کریں، تو جمود چھایا رہے گا۔ زمانہ آگے آگے دوڑتا جائے گا اور ہم پیچھے

...پیچھے گھسٹتے رہیں گے۔ ہم پیچھے گھسٹنے والوں کی آواز آگے دوڑنے والی منحرف طاقتیں کبھی نہیں سنیں گی۔ ان کو متاثر کرنے کے لیے ان کے ہم ... مسابقت کرنا ضروری ...

آج اگر ایک داعی حق نظریہ ارتقا کو نہیں جانتا، اگر وہ ضبطِ ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے، اگر وہ تجزیۂ نفس کے مختلف مدارس فکر سے بیگانہ ہے، اگر اسے مارکسزم سے آگاہی نہیں ہے، اگر وہ جدید فلسفۂ تاریخ سے تعارف نہیں رکھتا، اگر اسے بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں، اور عبادتوں اور اخلاقی ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے۔ حال یہ ہے کہ موسمیات اور دنیا کے طبعی جغرافیے تک سے بھی ہمارا دینی نظامِ تعلیم طلباء کو بقدرِ ضرورت واقف نہیں کرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہماری کمزوری کی حد یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ افراد اس زبان اور ان اصطلاحات اور اسالیب سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو اس دور کے ذہن کے لیے مؤثر ہیں۔ انگریزی تو انگریزی ہم ادبی معیار کی رچی اردو سے بھی طلباء کو آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔

**تمدنی زندگی میں مقام**

یہ چوتھا نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ کوئی نظامِ تعلیم اسی صورت میں کامیابی سے چل سکتا ہے، جب کہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے انسان ڈھال کر دیتا ہو جو عملاً ایک دورِ تمدن میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہر نظریاتی نظامِ تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر تیار کرنا ہوتے ہیں۔ درس گاہوں سے طلبہ نکلیں، تو زندگی کے کارزار تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے۔ ان میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ تمدن کے کسی نہ کسی شعبے یا ادارے کو چلانے کے اہل ہوں۔ وہ میدان میں آئیں تو نظامِ رائج سے کشمکش کرتے ہوئے بھی معاش کے راستے نکال سکیں۔ زندگی ان کی ضرورت محسوس کرے۔ تمدن میں ان کی مانگ ہو۔ وہ اوّل تو کسی شعبے میں اچھے لیڈر اور کارپرداز ثابت ہوں، ورنہ کم از کم اچھے کارکن ضرور ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارا مروجہ دینی نظامِ تعلیم ایسے افراد تیار کر کے نہیں دے رہا کہ جو صحافت وادب اور تصنیف وتالیف سے لے کر تجارت وصنعت اور ڈاکٹری، انجینئری اور حساب کاری تک گوناگوں مشاغل کو اپنا سکیں۔ اس وقت کی یہ حالت ہے کہ بارہ بارہ سال تک کی دینی تعلیم پایا ہوا نوجوان ٹائپسٹ تک نہیں بن سکتا کہ وہ حلال کی روزی کما کر اپنے حلقۂ ربط میں زبان وقلم سے دین وخلق کی دعوت دیتا رہے۔ کل اگر یہاں نظامِ اسلامی کو چلانے کے لیے کارکنوں کی مانگ پیدا ہو تو ہمارا دینی نظامِ تعلیم اس مانگ کو پورا نہیں کر سکتا۔

ان نکاتِ چہارگانہ کو پیشِ خدمت کر کے میں بہت ہی عاجزانہ انداز سے دینی مدارس کے کارپردازوں کی خدمت میں یہ مشورہ رکھتا ہوں کہ وہ کسی ایسے نقشے پر کام کریں کہ طلباء ان کے یہاں دس بارہ سال میں فارغ ہوں، تو وہ ایک طرف اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں اور دوسری طرف میٹرک یا الف۔ اے کے درجات کے مساوی انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلیں تاکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان پر پورا میدان کھلا رہے۔ جدید علوم کے حساب کو جوں کا توں لے لینے کے بجائے اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں ناقدانہ طریق پر مطالعہ کرایا جائے تاکہ مغربی تصورات کی کمزوریاں نمایاں ہوں اور اسلامی تصورات کی برتری کا سکہ ذہنوں میں بیٹھ جائے۔ ایسے کورس تیار کرائے جا سکتے ہیں جو اسلامی اور مغربی تصورات کا ہر دائرے میں تقابلی مطالعہ ہو اور اسلامی تصورات کا ثبوت ہو اور مغربی تصورات کی تردید!

اس کے ساتھ دینی درس گاہوں کے ماحول کو بھی اس جمود سے نکالا جائے جس میں وہ برسوں سے پڑا ہے۔ طلباء کو سادگی کے ساتھ صاف ستھرے رہن سہن کی تربیت دی جائے تاکہ ان میں عزتِ نفس کا احساس زندہ ہو اور وہ کسی نفسیاتی الجھن میں نہ پڑیں۔ اس سلسلے میں مالیاتی نظام کو بھی نئے سرے سے استوار کیا جائے۔

**

## بقیہ: ہٹلر کا نظریہ تعلیم

دیکھ کر ان دیکھا کر دیتے ہیں وہ دراصل ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ عصمت فروشی کے نتائج آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے مجرم ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کی حفاظت موجودہ نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ ہمیں ثقافت کو پاکیزہ ساسے کا یہ مہم قریب قریب زندگی کے ہر شعبہ میں جاری کرنا ہوگی مثلاً تھیٹر، صرف لطیفہ، لٹریچر، سینما، صحافت اور اشتہارات، ان سب سے گندگی کے داغ دھلنے چاہئیں اور ان سب سے قوم کی خدمت اور قوم کی تہذیب کی خدمت کا کام لیا جانا چاہئے۔ قوم کی زندگی کو جدید عشق بازی کی گلا گھونٹ دینے والی خوشبو اور بے ہنگام ناچ، یا نامردانہ منافقت سے یکسر پاک کرنا ہوگا۔ ان سب اقدامات میں مقصد کار اور طریقہ کار دونوں کا تعین فقط قوم کی روح اور جسم کے مفاد کے پیش نظر کرنا ہوگا۔ اولین فریضہ نسل کی بقا ہے شخصی آزادی کا حق دوسرے درجے پر آتا ہے۔

**

(ذبیح حسین، صحافت)

# ھٹلر کا نظریہ تعلیم

نرگس حشلری نے سے مرتب کردہ اس مضمون میں جب اس قوم کے عظیم سپوت ہٹلر نے ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلیم اور نشوونما کے حسن پہلو پر زور دیا ہے۔ وہ ہماری اختلاف کے باوجود رہنمائی کا ایک بہترین موقع ہے۔ (مدیر)

ہمیں بچوں کی پرورش اور تعلیم کے متعلق راسخ العام غلط نظریات کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اس طرف کسی نے آج تک توجہ ہی نہیں دی ہمارے تعلیمی نصاب میں دماغی تعلیم اور جسمانی تربیت کے مابین دانستہ ایک توازن قائم کرنا ہوگا۔

جس ادارے کو آج کل مکتب کہا جاتا ہے اس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی لیکن مکتب کی موجودہ شکل ایک درسگاہ کے اس تصور کی توہین ہے جو قدیم یونان میں رائج تھا۔ ہمارے نظام تعلیم میں اس حقیقت کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ صرف تندرست جسم کے کوئی تندرست دماغ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ چند مستثنیات کو چھوڑتے ہوئے عوام اور خاص طور پر اس قاعدہ کے تابع ہیں۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں کوئی اس حقیقت پر غور نہ کرتا تھا جسم کی تربیت میں مجرمانہ غفلت برتی جا رہی تھی۔ قوم کی عظمت قرار رکھنے کے لئے دماغ کی یک طرفہ نشوونما کو کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس کا خمیازہ ولیم سے پہلے اور توقع سے زیادہ بھگتنے کی نوبت آئی تھی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ اشتراکی تعلیمات ان علاقوں میں زیادہ فروغ پاتی ہیں جہاں کے باشندے نحیف ہوں اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ پہلی جرمنی سکسی اور ررور کی وادی جیسے ہی علاقے میں ان اصلاع میں یہودیوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹ کی ذہنی بیماری کا جو زہر پڑھے لکھے طبقات بھی کچھ مقابلہ نہ کر سکے اس کی سیدھی سادھی وجہ یہ ہے کہ خود عالم طبقہ بھی جسمانی طور پر ضعیف اور فاقہ کشی کے سبب نہیں، بلکہ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ یہ مقصود ہے کہ وہ رفتار زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کی اہلیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ وہ عہد حاضر میں جسمانی طاقت ہی فیصلہ کن ہے کہ ذہنی تعلیم پر زور دینے والے یہ لوگ نہ تو زندگی میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنے کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ آگے ترقی کرنے کی۔ ان میں بھی جسمانی کمزوری ہمیشہ انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔

محض ذہنی تعلیم کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے اور اس وجہ سے جسمانی تربیت سے سراسر غافل رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھوٹی عمر میں ہی جسمانی جنسی احساس بیدار ہو جاتا ہے جن بچوں کے جسم ورزش اور کھیل سے مضبوط اور تربیت یافتہ بن چکے ہوں ان پر شہوت کا غلبہ ایسے گھر بیٹھے رہنے والے نوجوانوں کی نسبت کم ہوتا ہے جو محض ذہنی مضمون ہی کھا رہے ہوں۔ کوئی صالح نظام تعلیم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ ایک تنومند جوان کسی نوجوان عورت سے جو توقعات رکھ سکتا ہے وہ ان آرزوؤں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جو قبل از وقت بے راہ روی کا تجربہ رکھنے والی ناتواں سے پرورش پاتی ہے۔ غرض تعلیم کے ہر شعبہ میں مدرسیں کے روزانہ نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جانا چاہیئے کہ ایک بچہ کا فارغ وقت اس کے جسمانی قوی کو مفید نشوونما دینے میں صرف ہو سکے اس عمر میں لڑکے گلی کوچوں میں پھریں، شارع عام پر شرارتیں کریں یا سینما میں وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جب وہ روزانہ کام ختم کر چکے تو اسے اپنا مضبوط جسم بنانا چاہیئے تاکہ موقع پر وہ کمزور ثابت نہ ہو۔ اور فی الحقیقت یہ ضرورت پوری بھی کرے۔ نظام تعلیم فقط علم و عقل کی پچکاریاں لگانے والے کارخانہ کا نام نہیں۔ ہمارے مکتبوں کے اصول بھی ترک کر دینا چاہیئے کہ جسم کی تربیت ایک ایسا مسئلہ ہے جسے انفرادی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ کسی فرد کو یہ آزادی حاصل نہیں کہ وہ آئندہ نسلوں کے گناہ کا ارتکاب کرے قوم کو نقصان پہنچائے۔ جسم کی عصمت بچانے کے لئے ذہن کی معصومیت لازمی ہے۔ آج کل ہماری تمام شہری زندگی کو عیاشیوں کے ایسے ٹیکہ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو فقط جنسی تصورات اور جنسی محرکات کو ضرر لگانے کی خاطر قائم کیا گیا ہو۔ سینماؤں، تھیٹروں اور دوسری تفریح گاہوں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس دستر خوان پر سجائی جانے والی غذا صالح نہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو بالخصوص اس سے واجب ہے۔ اشتہار بازی کے مختلف طریقوں سے عوام کی توجہ نہایت بے ہودہ اور بازاری انداز میں اپنی طرف منعطف کروائی جاتی ہے جو شخص مشاہدے کا ارادہ کر چکا وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی انگیخت کے نتائج سخت خطرناک ہوتے ہیں یہ شہوت انگیز اور بد علامت والی فضا ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں ایسے خیالات پیدا کر دیتی ہے کہ جن سے ابھی انہیں واقف نہیں رہنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی تعلیم کے نتائج ہمارے ان نوجوانوں میں کھول مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں جو وقت سے پہلے بالغ ہو جاتے ہیں اور اسی لئے وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں ہمارے چودہ اور پندرہ سال کے بچوں کی روحانی کیفیت کے متعلق کارروائی کے دوران میں ایسے ایسے انکشافات سامنے آ جاتے ہیں جن سے گھن محسوس ہوتی ہے ان حالات میں کچھ تعجب نہیں کہ اس عمر کے بچے بھی امراض خبیثہ کا شکار ہو جائیں ایسے جسمانی طور پر ضعیف اور ذہنی لحاظ سے گمراہ نوجوانوں کی کثیر تعداد دیکھ کر خوفناک سی شرم محسوس ہونی چاہیئے جنہیں بڑے بڑے شہروں کی زندگی کے راز ہائے سربستہ سے آشنا کر دیتی ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو جو عصمت فروشی کو ختم کرنے کے سنجیدگی سے خواہش مند ہیں انہیں سب سے پہلے روحانی علل دور کرنے میں مدد دینا ہوگا جن کے باعث عصمت فروشی فروغ پاتی ہے انہیں مذہب کے اور اجتماعی شعور کے ذریعے سے اٹھنا ہو کر سارے بڑے بڑے شہروں کی تہذیب کی گراوٹ سے پاک کرنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو ان کے موجودہ ماحول کے گندے اثرات سے بچا نہ سکے تو وہ تباہ ہو جائیں گے جو لوگ ان حرکتوں کو

(باقی صفحہ ...)

طالب علم جامعہ پنجاب



# انسانیت کے محافظوں سے سوال

جہاں دانو! میں پوچھتا ہوں
کہ چشمِ انساں میں آنسوؤں کے ہجوم آخر
بتاؤ کب تک ؟ یہ ٹمٹماتے ہجوم آخر
تمہاری پر فریب آنکھوں کو روشنی بخشتے رہیں گے ؟
بتاؤ کب تک یہ اونچے محلوں کی اونچی دنیا
یہ برقی لہروں کے قمقموں سے بھڑکتی دنیا
شکستہ کٹیاؤں سے ابھرتے دھوئیں سے آخر الجھ سکے گی ؟

اے وقت بینو! میں پوچھتا ہوں
کہ چند سکوں کی کھنکھناہٹ پہ جس کی میاد رکھ رہے ہو
وہ مسکراہٹ، لہو میں ڈوبی ہوئی فضاؤں کی ہچکیوں کو
دبانا چاہے گی تو آخر بھلا وہ کب تک دبا سکے گی
اے کامریڈو! اے سرخ ریچھو! او بے خداؤ!
جو اونچے ہوٹل کے نرم صوفوں کی گود میں صبح و شام بیٹھے
جفاکشوں کے لہو کی مانند سرخ کالی کے جام پی کر
غریب دہقان کی بھوک پر تم مکر کے آنسو بہا رہے ہو
سلگتی سوالوں کو پینے بیٹھے
پھٹے ہوئے چیتھڑوں کی قسمت پہ نوحہ خواں ہو گلے پھُلا کر
تمہارے نوحوں تمہارے اشکوں میں اجنبی روح پل رہی ہے
وہ روح جس کے گلابی ہونٹوں میں خوں کی رنگت ملی ہوئی ہے
وہ روح جس کی سیاہ زلفوں سے دم اخوت کا گھٹ رہا ہے

تم ۔۔۔ اس کے ہاتھوں میں مفلسوں کا خلوص چاہتے ہو بیچ ڈالو
جنہیں پسینے دکھا کے مفلس کی تم حمیت خریدتے ہو
میں پوچھتا ۔۔۔ میں چیختا ہوں ۔۔۔ نچوڑ کر اس کی شہ رگ
اے کامریڈو! کرائے کی مرلیو، تم بتاؤ آخر
غریب دہقان کو کب تلک یوں فریب دو گے ؟

"خدا پرستو!"
سیاہ داڑھی کی اوٹ لے کر یتیم کا حق چرا رہے ہو
او جُبّوں والو!
کمائی مُردوں کی کھانے والو، قرآں کی عصمت سے کھیلتے ہو
"بزرگ چورو"!
جو پانچ وقتوں کے عہد و پیماں خدا سے ہر روز باندھتے ہو
انہیں اسی وقت جا کے تنہائیوں میں ہر روز توڑتے ہو
"طویل جُبّو" "سیاہ جُبّو" "سفید جُبّو"
میں پوچھتا ہوں۔ یہ عہد شکنی، خدا سے بھی کیا چھپا سکو گے
بشر کو دھوکا تو دے رہے ہو
خدا کو کیسے فریب دو گے ؟

اے کور بینو!
تم اپنے ماضی پہ اک اچٹتی نظر تو ڈالو
میں پوچھتا ہوں اعلان کر کے
خدا کی لاٹھی یا تیغِ مومن سے بچ سکو گے

# قومی تعلیمی کانفرنس

اسلام آباد (۲، ۳، ۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

کے موقع پر

طلبہ کی تاریخی

# یادداشت

از


عبدالملک مجاہد

ناظمِ اعلیٰ : اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان

چیئرمین ایشین سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن

لیاقت بلوچ

صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین

چیئرمین پنجاب سٹوڈنٹس کونسل

جناب چیئرمین اور سٹرکا کانفرنس

# تعلیم کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

طلبہ کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مسئلہ خود نظام تعلیم ہے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی سے یہ مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ یہاں ایک ایسے تعلیمی نظام کو ترویج دیا جائے جو یہاں کی قومی ضروریات اور عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا حقیقی ترجمان ہو۔ ایک غیر ملکی سامراجی قوت کے نافذ کردہ تعلیمی نظام کا جاری رہنا جو اس نے محض اپنی نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے رائج کیا تھا ہمارے تمام مسائل اور مصائب کی حقیقی اور بنیادی وجہ ہے۔ اس صورتِ حال کو فروعی یا جزوی اصلاح درست نہیں کر سکتی درحقیقت یہ سارا نظام ہی سرتاپا غلط ہے اس کے مقاصد، زندگی کے بارے میں اس کے تصورات اس کے تعلیمی نقطۂ نظر اس کے تعلیمی ادارے، اس کا طریقۂ امتحان و طریقۂ تعلیم، اس کی فیس و قوائد غرض اس کا ایک ایک پہلو۔ نظریاتی لحاظ سے، نظام دیوالیہ ہے، قومی سطح پر ہمارے مقاصد آدرشوں اور امنگوں کی نفی ہے اور ثقافتی نقطۂ نظر سے یہ ہماری روایات کے بالکل برعکس ہے اور فنی طور پر غیر اطمینان بخش اور انتہائی سطحی ہے زندگی کا اس کی عظمت اور وقار کا، اس نظام سے دور کا بھی تعلق نہیں اگر اس سے کوئی چیز سامنے آ سکتی ہے، تو وہ شکستہ امیدیں پژمردہ روحیں، پریشان شخصیتیں اور یاسیت زدہ صلاحیتیں ہیں۔ کانفرنس کو ہمارے فوری اور مستقل مسائل کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہیے تھی یہ اس صورتِ حال کے سدھارنے کے لیے کچھ کر سکے گی۔

حکومت کی غیر موزوں پالیسی صورتِ حال کی شدید ابتری کی ذمہ دار ہوگی آپ (کانفرنس) کو ان تمام باتوں کی طرف بھرپور توجہ دینا ہوگی اور صرف اسی طرح اس مسئلہ کا کوئی مفید حل ڈھونڈا جا سکتا ہے

اس مسئلہ کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اس ملک اَن گنت کانفرنسیں ہو چکی ہیں اس پر کئی کمیٹیوں اور کمیشنوں نے کام کیا ہے حتیٰ کہ تقاریر، بیانات، اعلانات کا شمار ہی کیا ـــــ، سفارشات بھی پیش ہوتی رہیں فیصلے بھی ہوتے اور پالیسیاں بھی بنیں لیکن مسئلہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک حل نہیں ہوا بلکہ اپنی ہلاکت خیزی کے اعتبار سے خاصا بڑھ بھی چکا ہے۔

تعلیم سے براہِ راست متعلق طبقے یعنی طالب علم برادری کی نمائندگی کرتے ہوئے "اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان" مسلسل اس مسئلہ کے حل کے لیے جدید بنیادوں پر قومی اور اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہے ـــــ تاکہ ـــــ اسلامی نظامِ تعلیم کے ذریعہ پاکستان کا مستقبل تابناک ہو اور یہاں سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال سے پاک اسلامی فلاحی معاشرہ تشکیل پا سکے ـــــ ہمیں مسرت ہے کہ اس تصور کی مخالفت رفتہ رفتہ دم توڑ گئی اور گذشتہ کئی سالوں سے نظامِ تعلیم کی نظریاتی تشکیل پر کسی کو اعتراض نہیں رہا۔

ہم نے ـــــ

- نظامِ تعلیم کی خرابیوں اور اس کے حل پر طلبا کو ایک آواز کیا۔
- مذاکروں، سیمیناروں، مضامین اور مجلّوں غرض ہر ممکن ذریعہ ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے ملک بھر کے دانشوروں اور اصحابِ بصیرت کو ہم خیال بنایا
- جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور قراردادوں کے ذریعے ملک بھر کے گوشے گوشے سے یہ مسئلہ اور اس کا حل ہر دور میں اربابِ اختیار کے گوش گزار کیا۔
- پھر اس انقلابی تصورِ تعلیم کی وضاحت کرنے کے لیے ہماری تنظیم نے تفصیلی لٹریچر تیار کیا ہے جو درج ذیل ناموں کے تحت کتابی کی صورت میں۔

STUDENTS PUBLICATION BUREAU سے دستیاب ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | تعلیم کا مسئلہ | ۲۶۰ صفحات | ۱۹۶۵ء |
| ۲۔ | تعلیم کی تشکیل نو | ۸ صفحات | ۱۹۶۴ء |
| ۳۔ | مخلوط تعلیم | ۹۰ صفحات | ۱۹۶۶ء |
| ۴۔ | نظریۂ تعلیم اور اسلام | ۴ صفحات | ۱۹۵۵ء |
| ۵۔ | اسلامی نظام تعلیم اور نفاذ کی عملی تدابیر | ۳۵ صفحات | ۱۹۵۲ء |
| ۶۔ | نظامِ تعلیم میں تبدیلی کیوں اور کیسے؟ | ۴۴ صفحات | ۱۹۶۹ء |
| ۷۔ | خواتین یونیورسٹی (جائزہ) | ۳۵ صفحات | ۱۹۶۶ء |
| ۸۔ | ہمارا نظامِ تعلیم | ۱۹ صفحات | ۱۹۶۷ء |
| ۹۔ | "طلبہ کمیشن کی رپورٹ" | ۱۴ صفحات | ۱۹۶۶ء |

- حکومت سے محض مطالبہ کرنے کے بجائے انتہائی ذمہ دار طور پر ہم نے تعلیم کے مسئلہ پر ہر اس حکومت کو اپنی واضح تجاویز اور تفصیلی سفارشات پیش کیں جس نے تعلیم پر کچھ سوچنے ـــ کچھ کرنے کا اعلان کیا۔
- جناب ایس۔ ایم شریف کی قیادت میں NATIONAL EDUCATION COMMISSION شائع ہوئی، تو ہم نے اپنے تفصیلی تنقیدی کام کی رپورٹ مرکزی وزیرِ تعلیم کو ارسال کی۔
- جناب جسٹس حمود الرحمٰن کی زیرِ نگرانی بننے والے کمیشن کو جنوری ۱۹۶۵ء میں (EDUCATIONAL PROBLEMS OF PAKISTAN) کے زیرِ عنوان مفصل یادداشت روانہ کی جس کو پشاور سے چٹاگانگ تک کے طلباء نے صاد کیا۔
- ۱۹۶۷ء میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے تحت "نصابیات کی تدوین" کے سلسلہ میں تجاویز طلب کرنے پر نومبر ۱۹۶۷ء میں ایک جامع رپورٹ اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان کی جانب سے قدرت اللہ شہاب وفاقی سیکرٹری تعلیم کو ارسال کی گئی کہ کس طرح نظریۂ پاکستان

...کو نشانہ بنایا جائے۔

• نور خان تعلیمی کمیشن کو جون ۱۹۶۹ء میں انتہائی تفصیلی تجاویز دی گئیں۔ اس کی تعلیمی پالیسی کے اعلان پر دوبارہ تنقیدی جائزے کی مفصل رپورٹ ارسال کی گئی۔

• گذشتہ حکومت نے بھی دوری ۱۹۷۲ء میں تعلیمی کانفرنس منعقد کی۔ تسنیم عالم منظور مرحوم ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے بحیثیت کی جانب سے مفصل تجاویز پر مشتمل یادداشت وزیر تعلیم جناب پیرزادہ کو پیش کی ——— ہماری کوششوں کو شروع ہی سے تسلیم کیا گیا لیکن پہلی مرتبہ تجاویز کا پرتو ۱۹۶۹ء میں دکھائی دیا ——— جب کہ ۱۹۶۹ء کی نور خان تعلیمی پالیسی میں تعلیم کی نظریاتی اساس کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا۔ نتیجتاً ہم نے اسے اسلامی نظام تعلیم کی طرف پہلا قدم قرار دیا۔ اس کی حمایت میں طلبہ نے مظاہرے کیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک انتہائی ذہین طالب علم عبدالمالک، ناظم ڈھاکہ جمعیت و رکن مرکزی مجلس شوریٰ، کو اسی تعلیمی پالیسی کی حمایت میں NIPA کے ایک مذاکرے میں تقریر کرنے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں لادینی نظام تعلیم کی مخالفت کرنے پر شہید کر دیا گیا۔

۱۹۷۲ء کی تعلیمی کانفرنس میں بھی اس نظریاتی اساس کو ختم نہیں کیا گیا۔ لیکن ان تمام تر کاوشوں کے باوجود عملاً ہمارے نظام تعلیم میں نہ کوئی تبدیلی لائی گئی اور نہ ہی ان پالیسیوں اور طے شدہ امور کے مطابق کوئی اقدامات کیے گئے۔

اب جب کہ ——— پھر ایک مرتبہ نئے سرے سے قومی تعلیمی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔

• ہم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے طلبا کی تجاویز آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں تاکہ اس طرح جہاں طلبا کی فکر آپ کے سامنے آئے وہیں طلبا کے اس تعمیری کردار کو بھی آپ نوٹ کر سکیں۔

• ہم سمجھتے ہیں کہ نظام تعلیم کی نئے سرے سے تشکیل و تعمیر اب کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں ہے نہ ہی اس کی نظریاتی اساس پر کسی طرح کی الجھن باقی ہے ——— اس کانفرنس کا اصل کام واضح اور دو ٹوک پالیسی فیصلوں کا ہے نہ کہ محض الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھانے اور ٹالنے کا!!

• ہم سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس کو اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ آخر تعلیم کے مسئلہ پر کی جانے والی گذشتہ تمام پالیسیاں اور سفارشات نافذ کیوں نہ ہو سکیں ——— ؟

اس لیے کہ اصل اور بنیادی مسئلہ اب نفاذ کا ہی نظر آتا ہے۔ قومی زندگی اور تعمیر کے اس انتہائی اہم مسئلہ سے اب یہ مذاق مزید نہیں چلنا چاہیے کہ جو حکومت بھی آئے وہ نئے سرے سے بات شروع کر دے اور جب وہ گزر جائے تو نیا آنے والا پچھلے کام کو یکسر ایک طرف ڈالتے ہوئے نئی عمارت کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان فرما دے۔

• ہمارے خیال میں ان پالیسیوں کے نفاذ کی راہ میں مندرجہ ذیل رکاوٹیں حائل رہی ہیں

۱۔ نظام تعلیم کے مقاصد اور ہدف (TARGET) سے نافذ کرنے والے نوکر شاہی کے اداروں کی بیگانگی ——— اور نظریۂ پاکستان کی راہ میں ان کی ذہنی خلیج۔ ان کا مسلکی رجحان!

۲۔ ہر حوالہ کا فلسفہ تدریج کہ بعض فوری اقدامات سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ لہٰذا پانچ سال کا یا آٹھ سال کا پیریڈ مقرر کر دیا جائے۔ اس تدریج کے فلسفے کا سہارا عموماً اس بیمار ذہن نے لیا جو ان پالیسیوں اور اقدامات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکا تاکہ تاخیری حربے استعمال کر کے

...ہوئے لال فیتے کا شکار بنایا جائے

۳۔ کسی بھی پالیسی یا سفارشات پر عمل کرتے ہوئے اس تبدیلی کے نصب العین یا ہدف کو مستقلاً سامنے نہیں رکھا گیا نتیجتاً وہ اوجھل ہوتا چلا گیا۔

۴۔ پالیسی کو نافذ کرنے والی اور اس کے نفاذ کو چیک کرنے والی کوئی پالیسی مرکزی ہیئت موجود نہیں تھی جو نظام تعلیم کی تبدیلی کی دلی طور پر خواہاں ہو۔ رسمی کارروائی کے طور پر یہ اہم ترین کام ہوتا رہا۔

۵۔ یہ تو ہمارے ادارے ہیں جن کے پاس نہ سرکاری فائلیں ہیں نہ ہدایات کے خفیہ خطوط ——— ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے اس مسئلہ کے بار بار اٹھنے ——— سفارشات اور پالیسی بننے کے بعد یکسر فراموش کر دیے جانے کے عمل پر باقاعدہ تحقیقات ہونی چاہئیں تاکہ منت واضح طور پر یہ رکاوٹیں سامنے آ سکیں ——— اور ان ناکامیوں کے پیش نظر آئندہ کے لیے بھرپور مصور بندی کی جا سکے۔

بہر صورت آئندہ کسی بھی پالیسی یا سفارشات کے مؤثر نفاذ کے لیے ہماری تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

## تحریکِ نفاذ

نفاذ روایتی انداز میں نہ ہو بلکہ اسے ایک تحریک کی شکل دی جائے۔ اس سلسلہ میں ملک بھر کے دانشوروں اور اساتذہ کا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔ ہم پاکستان بھر کے طلبہ کا بھرپور تعاون اس مقصد کے لیے پیش کرتے ہیں۔

## ابلاغِ عامہ

ابلاغ عامہ کے پروگرام مسلسل ان سفارشات کو عوام کے سامنے لاتے رہیں تاکہ کوتاہیوں پر احتساب کا عمل ہو سکے۔

## مرکزی کونسل

اس کے نفاذ اور نگرانی کے کام کو نوکر شاہی کے حوالے کرنے کے بجائے ایک "مرکزی تعلیمی کونسل" کے سپرد کیا جائے جو ملک کے نامور اہل علم، اساتذہ، طلبہ اور صحافیوں پر مشتمل ہو۔ اس میں افراد کی تقرری کے وقت ان کے علم، تقویٰ، حب وطن کو ملحوظ رکھا جائے۔

## تبادلہ تقرر

اس کے نفاذ کے لیے محکمہ تعلیم میں فعال افراد کا تبادلہ یا تقرر کیا جائے

## مزید پیش رفت

اس کانفرنس کے رہنما خطوط پر مختلف کمیٹیوں، کمیشن اور یونیورسٹیوں میں مزید کام جاری رہنا چاہیے اس لیے کہ محض ایک کانفرنس اس گمبھیر مسئلہ کا حل نہیں، پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ان کی تجاویز کو ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع سے وسیع تشہیر دی جائے ——— نیز ——— مالی طور پر ——— اور تجاویز پر عملدرآمد کے ذریعے اس کام کی مسلسل حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہیے۔

## ماہانہ مجلہ

ایک ماہانہ مجلہ ان تمام کاوشوں اور اس کانفرنس کے FOLLOW UP پروگرام کو سامنے لاتا رہے۔

## تعلیمی ٹیکس

مالی وسائل کی دقتوں کا سدباب ہر لاکھ ہزار روپیہ سے زائد ماہانہ آمدنی رکھنے والے افراد پر ۵ فی صد تعلیمی ٹیکس لگا کر کیا جا سکتا ہے

## جمعیت کا متوازی کمیشن

ہماری تنظیم سے متعدد ایسے باصلاحیت علماء وابستہ ہیں جو آپ کی کانفرنس کے دیئے ہوئے خطوط پر ساتھ ہوتے کنستر اور کمیٹیوں کے سواری سٹینڈنگ کمیشن اور کمیٹیاں تاکہ مسلسل اسلامی نظریاتی تجاویز فراہم کر سکیں ہیں۔ اگر اس کانفرنس کے ممبران، اعداد و شمار اور دیگر دستاویزات ہمیں متواتر مہیا کی جائیں تو ان شاء اللہ ہم اس ادارے میں بھی قومی تعمیر میں حصہ لیں گے۔

• محترمی — ہم یہ پچاس ہزار سے زائد الفاظ پر مشتمل یادداشت آپ کے حوالے کرتے ہوئے پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتبہ پھر اپنا فرض ادا کیا ہے — اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

---

"طلبہ کے نزدیک ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد ایسا پاکستان بنانا ہونا چاہیئے۔ جو بہترین مسلمان بھی اس معاشرے کو دے اور بہترین صاحب علم و فن بھی"

# نظامِ تعلیم کا نصب العین

اس مقصد کے لئے ہمارے نظامِ تعلیم میں فوری طور پر مندرجہ ذیل تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں

## تعلیم گاہوں کا ماحول

تعلیمی اداروں کے موجودہ ماحول کو تبدیل کیا جائے اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جائیں۔ گو مکمل تبدیلی کے لئے کچھ عرصہ درکار ہو گا لیکن ابتدا میں چند مفید اور مؤثر اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت رقص اور موسیقی کو قومی ثقافت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے اور مغرب زدگی کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں، اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور روزانہ کے مواقع سے بچانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی جاتی۔ ڈراموں اور تقریبات میں مسلم ثقافت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مذہب کو ایک نجی اور انفرادی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ رجحان ختم ہونا ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو اس بات کا واضح اور مبینہ شعور دینا چاہیئے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ اگر اس بات کی اہمیت کو قبول کر لیا جائے تو ایسے کئی اقدامات کی سفارش کی جا سکتی ہے جو آسانی سے قابل عمل ہیں۔ اگر ان اقدامات پر سختی سے عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ماحول ہمارے نظریات کے مطابق نہ ہو۔ اسی طرح مخلوط تعلیم کو بھی ختم کیا جانا چاہیئے ورنہ الگ ... آئے گا۔

(۱۰) ہر ہائی سکول اور کالج میں مسجد کی تعمیر لازمی قرار دی جائے۔

(۱۱) نماز کے اوقات میں کوئی پریڈ نہ ہو۔

### (۱۲) طلبہ کے لئے اہتمام اسمبلی

تمام اسکولوں اور کالجوں میں تدریس کا آغاز "اسمبلی پریئر" (ASSEMBLY PRAYER) سے ہو جس میں تلاوت کلام پاک بمعہ ترجمہ کوئی سی دس احادیث نبویؐ، قومی ترانہ اور پاکستان کا پرچم بلند کرنے سے جو مناسب اشعار سے روزانہ پڑھتے ہیں وہ دل سے ... سوانح پر مشتمل ایک واقعاتی تقریر بھی مفید ثابت ہو گی۔

### (۱۳) قومی لباس

قومی لباس کی اہمیت مسلمہ ہے حضور اکرمؐ کی معروف حدیث ہے "من تشبہ بقوم فھو منھم"۔ لہذا ہماری تجویز ہے کہ فوری طور پر ملک کے ہر تعلیمی ادارے سے جہاں پتلون اور ٹائی کوٹ کو لازمی لباس کی حیثیت حاصل ہے اس حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ یونیفارم کے طور پر کالج کی سطح پر سفید، ہائی سکول میں سرمئی رنگ اور پرائمری کلاس تک طلبہ میں شلوار قمیض کو لازمی قرار دیا جائے۔ خدا کرے کہ وہ وقت جلد آئے

جس سے ملی لباس تفاخر کی بجائے ندامت کا باعث ہو۔

## (۱۴) بااختیار بورڈ

طالب علم محض تعلیمی ادارے سے نہیں سیکھتا بلکہ اس کا ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا ماحول اور موجودہ تفریحی سرگرمیاں نوجوان کو مثبت کردار کی جانب نہیں لے جا رہیں۔ یہی وجہ ہے نوجوانوں میں بے راہ روی اور بے مقصدیت اپنی انتہا کو پہنچ ہوئی ہے۔ چنانچہ نئی نسل کی تربیت ہی کا اگر خیال کیا جائے تو پورے ملک سے عریانی و فحاشی کو خواہ وہ لٹریچر کی ہو یا ابلاغ عام کے ذرائع میں پوری شدت سے ختم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ٹیلیویژن و فلم میں جنس کی جگہ دوسرے تفریحی انداز کو اپنایا جائے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں طالب علموں نے سب سے زیادہ اثر ٹی وی کا قبول کیا ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ ملک کے مسلمہ دانشور حضرات کا ایک بااختیار بورڈ مقرر کیا جائے جو پورے ملک میں ریڈیو، ٹی۔وی جیسے اداروں کو قومی ضروریات کے پیش نظر رہنمائی بھی اور چیک بھی کرے

# نصاب اور درسی کتب

ہمارا نصاب اور درسی کتب نہ صرف مقصدیت کے اعتبار سے غیر واضح ہے بلکہ جدید معلومات سے بھی عاری ہے۔ ان دونوں مقاصد کے لئے مختلف سطحوں پر مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل دو تجاویز خاصی موثر ثابت ہوں گی

## (۱۵) نصاب پر نظر ثانی

یہ بات بطور اصول اختیار کی جائے کہ پرائمری سکول کی حد تک ہر ۴ سال بعد، ہائی سکول کی حد تک ہر ۳ سال بعد، گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کا ہر سال نصاب پر نظر ثانی کر کے جدید ترین معلومات سے آراستہ کیا جائے۔

## (۱۶) نصابی کتب - مقابلہ

ہائی سکول تک نصاب کی تمام نصابی کتب مقابلہ کی بنیاد پر مرتب کرائی جائیں، جب کہ ان کتب کے انتخاب (SELECTION) کا مسئلہ بیوروکریسی کی بجائے مستند صاحب بصیرت حضرات کا بورڈ کرے جس کا فیصلہ حتمی ہو۔

(نصاب کے بارے میں تفصیلات آگے ہیں)

# اساتذہ

نظام تعلیم میں اس وقت تک کوئی عملی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی جب تک کہ اساتذہ کی حالت زار کو نہ بدل دیا جائے۔ بچے اور معصوم ذہنوں پر استاد ایک دائمی اور ان مٹ نقش ثبت کرتا ہے۔ اس کے اعتقاد اور اقدار، برتاؤ اور کام طلبہ کے لئے ایک مثال کا کام دیتا ہے۔ اساتذہ کی حالت کو بدلے بغیر اور انہیں اس سطح تک لائے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ طلبا کو اسلامی تعلیمات اور اصولوں کا پیکر بنا دیا جائے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ اقدامات اختیار کئے جا سکتے ہیں

## (۱۷) استاد اور کردار

نئی تقرریوں کے وقت اساتذہ کے کردار اور عمل کو انتہائی اہمیت دی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ امیدوار نے اسلامی شعائر سے اپنی زندگی کو کس حد تک سنوارا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس طرف اگر پوری توجہ دی جائے تو جلد ہی حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوں گے اس کے لئے ابتدا میں مثالی اساتذہ پیدا کرنے کے لئے پورے ملک کی بنیاد پر کچھ ماڈل ٹیچرز ٹریننگ کالج بنائے جائیں۔ اگر اس سلسلہ میں معقول سہولتیں دی جائیں اور حکومت حقیقتاً کچھ کرنے کا ارادہ کر لے تو اب بھی ہمارے ملک میں ایسے افراد کافی ہیں جو ان چند اداروں کو اطمینان بخش طریقے پر چلا سکتے ہیں۔ اگر اس کام کو پورے جوش و جذبہ اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو ہم ایسے اساتذہ کے حصول میں کامیاب ہو سکیں گے جو ہماری تعلیمی زندگی پر صحت مند مثبت اور ٹھوس اثرات چھوڑ سکیں۔

## (۱۸) ریفریشر کورسز

موجودہ اساتذہ کے لئے اسلامی تعلیمات پر مشتمل ایک ضروری ریفریشر ٹریننگ کورس شروع کیا جائے تاکہ وہ ان تعلیمات سے کما حقہ مستفید ہو سکیں ان کورسوں کا مرکزی نقطہ یہ ہونا چاہئے کہ اساتذہ میں اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا ہو۔ زندگی میں یہ انقلابی تبدیلی کوئی مشکل کام نہیں۔ اسلام جن عقائد سے عبارت ہے انہوں نے زندگی میں ہمیشہ انقلاب پیدا کئے ہیں صرف اسی بنیاد پر یہ ممکن ہے کہ زندگی میں تبدیلی کے اس اہم کام کو سرانجام دیا جا سکے اسی طرح ترقی وغیرہ کے معاملہ میں بھی انہی امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے ترقی کی رپورٹوں میں صرف پیشہ ورانہ مہارت ہی نہ ہو بلکہ اساتذہ کا تمام برتاؤ، اخلاقی اقدار اور شعائر اسلامی بھی اس میں اہم جگہ پاتے ہیں۔

## (۱۹) ڈائری سسٹم

پیپر ٹیچرز اور ٹیچرز کے لئے ڈائری رکھنا لازمی قرار دیا جائے جس میں مختلف مضامین سے متعلق دوسرے اندراجات کے ساتھ علی الخصوص یہ نوٹ کیا جانا رہے کہ اسلامی فکر کو واضح کرنے کے لئے کیا کام کیا گیا ہے؟ کیا مشکلات پیش آئیں؟ کیا نئے سوالات سامنے آئے اور کن الجھنوں کا کیا حل نکالا گیا؟

نیز ڈائری سسٹم جبھی سود مند ہو سکتا ہے کہ ڈائریوں کا جائزہ کرنے کا انتظام ہو۔ ہر پرنسپل اور ہر ہیڈ ماسٹر اس کے لئے کوئی موثر صورت نکالے۔ اساتذہ کی ترقیوں کا دارومدار ان کی ڈائریوں اور ان کے کام کی رپورٹوں پر ہونا چاہئے۔

## (۲۰) کانفرنسیں

پرنسپلوں ہیڈ ماسٹروں اور ایک ایک مضمون کے معلموں کی علاقائی

کانفرنسیں سال میں کم از کم دو بار ہونی چاہئیں، جہاں تعلیمی انقلاب کا موضوع مرکزی حیثیت سے زیر بحث لایا جائے۔

## (۲۱) مجلہ برائے اساتذہ

اساتذہ کے لئے ایک یا ایک سے زائد ایسے سہ ماہی اور ماہانہ رسائل کا اجراء کیا جائے جن میں اسلامی تعلیمی انقلاب کے سلسلہ میں ماہرانہ مقالات کے ذریعے رہنمائی بہم پہنچائی جائے۔

## (۲۲) الحاد اور برطرفی

اگر استاد کا رویہ اسلامی خطوط پر تعلیمی انقلاب کے کام میں معترضانہ ہو تو ترقی روکنے اور تنزل کرنے سے لیکر برطرفی تک کارروائی کی جانی چاہئے۔ خصوصاً اگر استاد کی طرف سے مخالف اسلام نظریات کی حمایت (کرنا درکنار محض زیر بحث لانا) یا اسلامی تصورات و احکامات کی تضحیک کرنا ثابت ہو جائے تو اسے بطور سزا ہر قسم کے معاوضے سے محروم کر کے برطرف کر دینا چاہئے۔ اگر ریاست کے لئے تخریبی عمل ناقابل برداشت ہے تو نظام تعلیم بھی تخریبی عمل کا روادار نہیں ہو سکتا۔

معاشرے میں استاد کی حیثیت اس کے کردار اور صرف کردار پر منحصر ہے، اس کا کوئی دوسرا بدل ممکن نہیں ہے۔ اونچی تنخواہیں اور سہولتیں ضروری ہیں لیکن صرف یہی چیزیں اس عظمت اور عزت کی بنیاد نہیں ہیں جو ہمارے معاشرہ میں استاد کو ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ اگر استاد اپنے اندر ایک صالح اسلامی کردار پیدا کریں تو لازماً طلباء کے دل میں ان کی محبت بڑھے گی۔ اس طرح مسلمان معاشرہ میں اساتذہ اور شاگردوں کے مقدس رشتے جو ایک تاریخی روایت ہیں، ایک نئے دور میں داخل ہوں گے۔

# متفرق تجاویز

ملی جذبوں کو ابھارنے کے لئے چند متفرق تجاویز

## (۲۳) لازمی فوجی تربیت

ہمارا عرصہ دراز سے یہ مطالبہ ہے کہ ہر طالب علم کو کم از کم ایک سال کے لئے لازماً فوجی تربیت دی جائے۔ تاکہ طلبہ جیسی قوت کو جہاں ہنگامی قومی ضروریات کے لئے تیار رکھا جا سکے وہیں ان میں ڈسپلن، حفظان صحت اور قومی تحفظ کے احساس کو ابھارا جائے۔ اس معاملہ میں پچھلی حکومت کے دوران ایک سال تک کے لئے لازمی فوجی تربیت کا آغاز ہوا، مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر ختم کر دی گئی۔!

ایک سالہ لازمی فوجی تربیت کے متبادل کے طور پر این۔ سی۔ سی کا آغاز ہوا جو ایک پرچے کے طور پر محض ۲۰ نمبروں کے حصول کا ذریعہ بن کے رہ گیا ہے۔ نتیجتاً نہ ایک سالہ فوجی تربیت کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور نہ ہی جسمانی تربیت اور ڈسپلن حاصل ہوتا ہے پس ہمارا مطالبہ ہے کہ این۔ سی۔ سی کے اس سلسلہ کو ختم کر کے ایک سالہ لازمی فوجی تربیت کو اختیار کیا جائے۔

## (۲۴) مسلم اسکاؤٹس

پرائمری اور ہائی سکولز کی سطح پر طلبہ کے لئے اسکاؤٹس کی طرح پر ایک فعال ادارے کی ضرورت ہے جسے ایمان اور حب وطن کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ خدمت خلق کے جذبات اگر طلبہ کے ایمان اور اعتقاد پر استوار ہوں تو کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

مثلاً ان کے حلف میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

## (۲۵) قومی تعلق کا ایک ذریعہ سیاحت

(الف) اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ہائی سکول کا ہر طالب علم اپنے ماحول سے باہر کم از کم ایک "ٹور" کر سکے کالج کے ہر طالب علم کو پورے ملک کا دورہ کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ایسے "ٹورز" کے سلسلہ میں ٹرین کا کرایہ فری ہونا چاہئے۔ اس تجویز سے بظاہر خرچہ ہوتا ہے لیکن یہ ایک اہم ضرورت ہے۔ اب تک اس سہولت سے زیادہ استفادہ شہری طلبہ کرتے ہیں اور غریب اور دیہاتی طلبہ اس سہولت اور سفر سے محروم رہتے ہیں۔

(ب) یہ محض مختصر تفریحی دورے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ یہ پاکستان سے لگاؤ، نظریاتی تربیت کا ایک ذریعہ ہوں، ہر پچیس طلبہ پر ایک استاد لازماً نگران ہونا چاہئے اور طلبہ کے مضمون کی مناسبت سے قابل دید مقامات مختلف اہم صنعتی کارخانے اور سائنسی اداروں کے "گائیڈڈ ٹورز" پہلے سے طے کئے جائیں۔

## (۲۶) فوجی قوت کے مظاہرے

قومی اہمیت کے ایام مثلاً "یوم جمہوریہ پاکستان" ۲۳ مارچ اور ۶ ستمبر وغیرہ کو رسماً منانے کی بجائے ان تمام شہروں میں جہاں فوجی چھاؤنیاں موجود ہیں لازماً فوجی قوت کے مظاہرے کئے جائیں۔

مثلاً ہائی اسکولز اور کالجز کے طلبہ کو ان ایام میں رخصت دینے کی بجائے اساتذہ کی زیر نگرانی ان مظاہروں کو دیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے ہماری نئی نسل پر نہایت مثبت قومی اثرات مرتب ہوں گے۔

## (۲۷) ٹی۔ وی کا استعمال

پرائمری کے لئے دستاویزی فلموں اور مختلف تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ، ریڈیو، ٹیلیویژن پر صبح کے اوقات میں کم از کم دو گھنٹے تک نشریات شروع کی جائیں۔ جن میں تعلیمی فلموں اور ڈراموں کے ذریعہ نظریاتی تشخص، قومی تہذیب و تمدن کو رواج دیا اور عظمت اسلام، شجاعت اور قومی غیرت و حمیت کو ابھارا جائے۔

# ذریعۂ تعلیم

انگریزی کے بجائے اردو کو بحیثیت ذریعہ تعلیم اپنایا جانا اصولی

طور پر تو اس ملک کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے لیکن قومی زبان میں ذریعہ تعلیم کی خصوصیات ہوتے ہوئے بھی یہ تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ادارہ اس فریب کا شکار نہیں ہوگا اس رجحان کی وجہ یہ نہیں کہ کوئی زبان ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ اس کی اصل وجہ چند ارباب بست و کشاد کا وہ مشن اور غلط اعتقاد ہے جس سے وہ آج تک اسے کو نکال نہیں پا سکے ہیں

(۲۸) انگریزی کو حیثیت ذریعہ تعلیم ختم کرنے کی ہر کوشش کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ انگریزی کنڈرگارٹن اور نرسری اسکولوں کی بڑھتی ہوئی لعنت کو سختی سے روکا جائے۔

(۲۹) قومی زبان میں درسی کتابوں کی تیاری کے کام کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں۔ قومی زبان میں اہم درسی کتابوں کا ترجمہ کیا جانا چاہئے اور یہی کتابیں ترتیب دی جانی چاہئیں۔ اس سے نہ صرف ہمارے نوجوانوں کی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کر سکیں گے بلکہ غیر ملکی مصنف و طباعت وغیرہ پر خرچ ہونے والا زر مبادلہ بھی بچایا جا سکے گا۔ ہم یہ کام درسی کتب اور نصاب کی ان کمیٹیوں کے ذریعے کر سکتے ہیں جن کے ذمہ اس تمام نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہوگا

(۳۰) سرکاری دفاتر، عدالتوں، عوامی امور اور تجارت وغیرہ میں قومی زبان کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ تیزی سے اختیار کیا جائے۔ اس سے اردو جاننے والے لوگوں کی ضرورت اور قدر بڑھ جائے گی۔ اگر قومی زبان نے ذریعہ تعلیم کے طور پر انحصار کرنے کوئی الواقع قابل عمل بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہے

(۳۱) مختلف سول سروس اور دوسرے امتحانات قومی زبان میں لئے جانے چاہئیں۔ قومی زبان میں جوابات لکھنے کی پوری اجازت دی جائے۔ سر اسٹڈی ورکس اردو ہی میں لئے جائیں

(۳۲) اسکولوں کی سطح پر قومی زبان میں درسی کتابیں بھی مہیا ہیں اس لئے انگریزی میڈیم اسکولوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ فوری طور پر قومی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کریں۔ اس مدت کے بعد کسی بھی انگریزی میڈیم اسکول کو کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے ماسوائے ان کے جو غیر ملکیوں کے لئے ہوں۔

(۳۳) کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی ایسا ہی کیا جانا ضروری ہے درسی کتب کی تیاری کے کام کو اور زیادہ تیز کیا جانا ہے کراچی یونیورسٹی نے ایک دور میں اس سلسلے میں قابل رشک آغاز کیا تھا اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے اور دوسری یونیورسٹیوں کو بھی اسکی تقلید کرنے کے لئے کہا جانا چاہیئے۔

(۳۴) گریجویشن کے نصاب سے انگریزی کی لازمی حیثیت فوراً ختم کر دی جائے

(۳۵) محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیر قیادت ایک با اختیار بورڈ تشکیل دیا جائے جو اردو ذریعہ تعلیم کے لئے منصوبہ اور نفاذ کا کام مستقلاً اپنے ذمے لے۔

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ یہ اب تک ناآسانی حل ہو سکتا تھا اس سلسلے میں فوری اقدامات کی ضرورت ہے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ غیر ملکی ذریعہ تعلیم ہمارے تعلیمی معیار کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ دوسری طرف مغربی تہذیب و ثقافت کی مظہر ہونے کی بنا پر غیر ملکی زبان طلباء کو اسی تہذیب و ثقافت سے بے بہرہ ہے ہیں

تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں میں تخلیق کرنے کی صلاحیتوں کو ابھارا جائے کیونکہ قوم کی قسمت کا دار و مدار اسی پر ہے۔ غیر ملکی زبان کی رو براہ راست اسی پر پڑتی ہے اور طلباء کی تخلیقی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ الفاظ کے الٹ پھیر میں خیالات تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔

ان وجوہات کی بنا پر ہم تعلیمی کمیشن سے کہیں گے کہ وہ اپنی رپورٹ میں قومی زبان کو جلد از جلد ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کرنے پر زور دے اس سلسلے میں مدت کا تعین کرے اور فوری عمل کیلئے ضروری اقدامات تجویز کرے۔

# نظام امتحانات

اصل اہمیت نظام تعلیم ہی کی ہوتی چاہئے لیکن بدقسمتی یہ کہ آج کل اصل اہمیت نظام تعلیم کی بجائے امتحانات کی ہے اور نظام امتحان بھی بہت سی خامیوں کا شکار ہے

موجودہ نظام امتحانات کی اصلاح کے لئے مندرجہ ذیل امور اختیار کئے جائیں۔

## (۳۶) سمسٹر کا پھیلاؤ ختم

جامعات میں سمسٹر سسٹم، تجربات، مسلسل رد و بدل اور وسائل کی کمی کے باوجود تعلیم و تعلّم میں اضافے کا باعث ثابت ہوا ہے۔ لیکن جامعات میں جب تک سمسٹر سسٹم اپنے صحیح شعور کے ساتھ رائج نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا دائرہ کار دوسرے تعلیمی اداروں تک وسیع نہ کیا جائے۔ (یونیورسٹیوں میں سمسٹر کے بارے میں) کراچی یونیورسٹی اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا جائزہ اور تجاویز ساتھ منسلک ہیں۔

ضمیمہ نمبر —

## (۳۷) سالانہ امتحان لازمی

دو سال کی فرصت دیکر دو سالوں کے اختتام پر امتحان کے لئے تمام تر توجہ لا دو سال طلباء کو "رٹنے" کی جانب دھکیلا جا سکتا ہے سمجھنے کی جانب نہیں۔ اس صورت میں کراچی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سکینڈری ایجوکیشن کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جامعہ ہم سے ہی سالانہ امتحان (PER YEAR EXAMINATION) کو اختیار کیا جائے تاکہ طالب علم کا سال بھر کا کام ہی اس کلاس میں اس کی کامیابی یا ناکامی کے لئے فیصلہ کن ثابت ہو لہٰذا نہم دہم انٹر سال اول، دوم۔ بی اے بی ایس سی سال اول اور دوم کے امتحانات ہر سال لئے جائیں۔

## (۳۸) امدادی کتب کا مسئلہ

ٹسٹ پیپر، خلاصے (MADE EASY) پر سختی سے پابندی لگائی جائے۔

## (۳۹) نقل کی عبرتناک سزا

امتحانات میں نقل ایک انتہائی سنگین مرض بن چکا ہے۔ اس مرض کے خلاف ہوا امتحانات کے سلسلے سے پہلے ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے مہم چلائی جائے اور ہر امتحان کے ایک ہفتے کے اندر اندر نقل میں ملوث طلبہ اور اساتذہ پر صرف یہ کہ سخت سزا دی جائے بلکہ ان کی تشہیر بھی کی جائے۔ تاکہ معاشرہ میں یہ برائی کرنے والا سر نہ اٹھا سکے۔ اس سلسلے میں متعلقہ قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔ تحقیقات کا طویل عرصہ مجرم کے لئے ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔

# تعلیم نسواں اور مخلوط تعلیم

نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لئے مخلوط تعلیم، مخلوط سوسائٹی، مخلوط مجالس کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار سے یہ قطعاً لگا نہیں کھاتی۔ خود مغرب میں اس کی تباہی کے گواہ وہاں کا منتشر نظام خاندان، نظام معاشرہ اور نظام اخلاق ہیں۔ مخلوط تعلیم کو قطعاً ختم کیا جانا چاہیئے۔ اگر ہمارے نظریہ حیات اور ہماری اپنی ثقافت کا کچھ لحاظ کیا جاتا تو اسے ایک دن کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہیئے تھا مخلوط تعلیم ہماری آنے والی نسلوں کے کردار کو شدید طور پر متاثر کر چکی ہے اور مستقبل میں اس کے نتائج مزید تشویشناک ہوں گے جتنی جلد ہم اس مصیبت سے چھٹکارا پا لیں اتنا ہی ہمارے مستقبل کے حق میں اچھا ہوگا۔

قومی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی مخلوط تعلیم کوئی قابل عمل چیز نہیں۔ ہمارے ہاں کی ایک پڑھی لکھی لڑکی کے فرائض ایک مغربی لڑکی کے فرائض سے قطعی مختلف ہیں۔ محض اندھی تقلید کے نتیجے کے طور پر اس وقت لڑکیوں کی ایک انتہائی قلیل تعداد مردوں کی طرح عملی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور اس کو اختیار کرتی ہے اس طرح موجودہ نظام کے تحت ان پر قومی آمدنی خرچ کی جاتی ہے وہ محض ضائع ہو جاتی ہے

علمی استعداد کی کمی اور اخلاقی گراوٹ کی ذمہ داری بہت حد تک مخلوط تعلیم پر بھی عائد ہوتی ہے اس لئے ہم تجویز کرتے ہیں۔
اس کے خاتمہ کیلئے مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں

## (۴۰) دو جامعہ خواتین

کراچی اور لاہور میں دو خواتین یونیورسٹیز کی فوری ابتدائی جائے۔ دونوں مقامات پر وہاں کے ہوم اکنامکس کالج کو BASE بنایا جاسکتا ہے۔ (تفصیلی تجاویز اس مقصد کے لئے قائم کی گئی کمیشن کو دی جارہی ہیں) الگ یونیورسٹی ایک بہتر تعلیمی ماحول کی تشکیل میں مدد دے گی بلکہ ان طالبات کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگی جو مخلوط تعلیم کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے اس سے ہم لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد کو تعلیم دے سکیں گے اور ایسی تعلیم جو عام تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کے عین مطابق ہو

## (۴۱) خصوصی سہولیات

خواتین کے لئے تعلیم کی وافر سہولیات فراہم کی جائیں تاآنکہ ملک میں طالبات کے کالجوں کا جال بچھ جائے

## (۴۲) ڈگری تک مخلوط تعلیم کا خاتمہ

ابتدائی کلاسز سے لے کر ڈگری کے بارہ تمام کلاسز میں فی الفور مخلوط تعلیم ختم کر دی جائے۔ اس لئے کہ کراچی کے علاوہ بقیہ ملک میں اب یہ تناسب کہیں موجود ہے جب کہ کراچی میں خواتین کے تعلیمی ادارے خاطر خواہ موجود ہیں

## (۴۳) ایم۔ اے کلاسز کا اجراء

کراچی اور لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں کے گرلز ڈگری کالجز میں بھی معروف مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز کا اجراء کیا جائے۔

## (۴۴) گرلز میڈیکل کالجز

میڈیکل کالجز میں مخلوط تعلیم کے خاتمے کے لئے نئے میڈیکل کالج بنانے کی ضرورت نہیں اگر سندھ اور پنجاب کے کسی ایک میڈیکل کالج کو صرف طالبات کے لئے مخصوص کر کے وہاں کے طلبہ کو دوسرے میڈیکل کالجز میں "مائیگریٹ" کر دیا جائے۔ اس طرح عملاً مزید دو گرلز میڈیکل کالجز عمل میں آجائیں گے جو صوبہ پنجاب و سرحد - سندھ اور بلوچستان کی تمام میڈیکل کی طالبات کے لئے کافی ہوں گے۔

## (۴۵) خواتین، تربیتی مراکز

اسی طرح ٹیچرز ٹریننگ کالجز کو علیحدہ کر دیا جائے جہاں تک خواتین اساتذہ کی کمی کا تعلق ہے اسے مرد اساتذہ کے تعاون سے عبوری طور پر حل کیا جاسکتا ہے۔

# طلباء اور اساتذہ

تعلیم کا سب سے مقدس رشتہ استاد اور طالب علم کا رشتہ ہے بدقسمتی یہ کہ غلامی اور اب غلامانہ نظام تعلیم نے ہمیں اسی اقدار سے اس طرح بیگانہ کیا کہ آج دیگر رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور جب شفقت و محبت، احترام و عزت کے یہ رشتے برقرار نہ رہیں تو کیسی تعلیم اور کہاں کی تربیت۔

## (۴۶) اساتذہ سے مندرجہ ذیل شکایتیں موجود ہیں

(الف) اساتذہ خود اسی غلط نظام کے تحت اپنی تعلیم اور تربیت کی بنا پر ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

(ب) اسکول جیسی اہم ترین اور بنیادی تعلیم کے ذمہ دار اساتذہ تنخواہوں کی کمی کے سبب پریشان اور دیگر معاشی ذرائع کے لئے سرگرداں ہیں۔ نیز اسکول لیول پر دینی اساتذہ اپنی وجوہات کی بنا پر میسر نہیں آتے۔

(ج) اسکول کے اساتذہ معاشرے میں مناسب معاشی مقام نہ ملنے کے سبب احساس کمتری کا شکار ہیں۔

(د) واضح مقصد سامنے نہ ہونے کے سبب عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں
(س) ایسے کردار اور اطوار سے طلبا کے سامنے خود اپنے احترام کو مجروح کرتے ہیں۔

## [illegible] طلبہ سے اساتذہ کو یہ شکایات ہیں

(الف) استاد کے مقام کو محسوس نہیں کرتے
(ب) ڈسپلن کا خیال نہیں کرتے پابندیوں کو برداشت نہیں کرتے
(ج) علم سے دلچسپی نہیں ہے۔ ٹسٹ پیپر اور نقل کا سہارا لیتے ہیں۔
(د) سیاست بازی سے زیادہ دلچسپی ہے وغیرہ

ہمارا خیال ہے کہ طلبا اور اساتذہ کے درمیان تعلق اسی صورت میں درست اور صحیح ہو سکتا ہے کہ جب پورے نظام تعلیم و مقصد تعلیم کی خامیوں کے بدلنے کو تحریک کی صورت دی جائے۔

## (۴۸) بہر صورت چند عبوری تجاویز پیش خدمت ہیں

اساتذہ خود اپنی ذمہ داری اور کردار کا خیال رکھیں باکردار اور مخلص استاد کا ہر سکول، کالج اور یونیورسٹی میں آج بھی بھرپور احترام کیا جاتا ہے۔ شریر سے شریر طالب علم بھی ان کی عزت کرتا ہے

(۴۹) وہ تمام چیزیں جن کا طلبا سے تقاضا کیا جائے ان پر استاد بدرجہ اتم عمل پیرا ہوں۔ مثلاً قومی لباس کلاس میں سگریٹ نوشی سے پرہیز، ڈسپلن کی دیگر چیزیں۔ کراچی یونیورسٹی کی ایک مثال سامنے ہے کہ ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ء میں سیاہ گاؤن طلبا کے لئے لازمی تھا اساتذہ اپنا گاؤن پہن کر آتے اور طلبا سے گاؤن کی پابندی کرواتے اور تمام یونیورسٹی اس علمی وقار اور ڈسپلن سے معمور نظر آئی۔ لیکن ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ء میں مسلسل سرکلر آتے رہے بار بار ہدایت کی جاتی رہیں کہ طلبا گاؤن پہنیں۔ چونکہ اساتذہ خود عمل پیرا نہ تھے لہذا یہ بات ختم ہو کر رہ گئی۔

(۵۰) اساتذہ محنت سے لیکچر تیار کرکے آئیں۔

(۵۱) اساتذہ نہ صرف طلبہ کی سیاست سے بالاتر رہیں بلکہ طلبا کو اساتذہ کی گروہی سیاست میں ملوث نہ کریں۔

(۵۲) اساتذہ کے احترام و مقام کو نصاب اور ذرائع ابلاغ عامہ کے ذرائع کے ذریعے طلبہ پر واضح کیا جائے۔

(۵۳) جو طلبا اساتذہ سے بدسلوکی کے مرتکب ہوں، ان کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور بلا تاخیر تنظیمی تادیبی کارروائی کی جائے ایسی کسی بھی کارروائی کو سوچ سمجھ کر کیا جائے اور پھر کسی قیمت پر بھی اسے واپس نہ لیا جائے

(۵۴) باکردار اور ذہین طلبہ کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے

(۵۵) کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر جو بھی فیصلے طلبہ سے متعلق کئے جائیں انہیں اعتماد میں لیا جائے۔

(۵۶) اساتذہ و طلبا کے درمیان امور پر غیر جانبداری کا رویہ اپنایا جائیں۔

(۵۷) طلبہ کے عذر ایسے فورم کے ذریعے ان پر ہی عرق کئے جائیں۔

(۵۸) جو بھی انتظامی (ڈسپلن) فیصلے کئے جائیں ان پر عمل درآمد [illegible] فیصلے کرتے چلے جانا اور عمل درآمد کا خیال نہ رکھنے سے

لاپرواہی کی کیفیت اساتذہ اور طلبہ دونوں کے درمیان پیدا ہوتی ہے

ہم طلبہ کے نزدیک اساتذہ اور طلبا کے دونوں پر آخری بات یہ ہے کہ استاد بالآخر استاد ہے اگر وہ استاد نہ رہے، وہ ذمہ دار و باکردار شفیق نہیں اور گروپ بندی۔ تو یقینا سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا۔

# نصاب کا مسئلہ

## (۵۹) بنیادی اصلاح کی ضرورت

نصابات کی ترتیب نو کا کام ماضی میں تو بار بار ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ نظام تعلیم ہی کا کوئی مقصد اور نصب العین متعین نہ تھا اس لئے یہ کام بالعموم بے نتیجہ ہی رہا اور محض ادھر ادھر کی تبدیلیوں کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ اب جبکہ تعلیمی نظام کو بامقصد بنایا جا رہا ہے نصابات کی صحیح تدوین کو غیر معمولی اہمیت دی جانی چاہیئے۔ استاد کا نمونہ، درسگاہوں کا ماحول اور دوسری تمام باتوں کے اثرات اپنی جگہ لیکن جو کام ایک طالب علم کو سب سے زیادہ دلجمعی سے اور شعوری طور پر کرنا پڑتا ہے وہ نصاب کا مطالعہ ہی ہے۔ اس کے ذہن و فکر اور سوچنے کے انداز پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اس کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے طالب علم کو زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بھی دینا چاہیئے۔

## ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم ہمارے تصور کی بنیاد ہے اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھانے جو آج کل پرائمری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دیا کریں، ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کئے گئے ہیں اور آئندہ کئے جائیں اُن سب سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں۔

(۶۰) اوّل ـ یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے یہاں ہم خدا کے عبد کی حیثیت سے مامور ہیں یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جوابدہ ہیں یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے اُدھر آیاتِ الٰہی پھیلی ہوئی ہیں۔ جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمراں ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لئے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے لے کر پرائمری اسکول کے آخری مرحلہ تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس ہی اس طرز پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اول روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دے گی اور اُن کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحلِ تعلیم تک جبکہ وہ ڈاکٹر بنیں گے یہی بنیاد اور یہی جڑ کا کام دیتی رہے گی۔

(۶۱) دوم ـ یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا

ہے اُن کی قدر اور اُن کے لئے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے اور دوسری کو برائی قرار دیتا ہے اُن کے لئے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں، جو لوگ بددیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلے ہیں اور آگے جا کر وہی اپنی قوم کے ساتھ یہ کچھ بے ایمانیاں کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کو طبیعیات، کیمیا اور جغرافیے وغیرہ کے سبق پڑھائے گئے تھے، اخلاق سبق نہیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر طالب علم کو جو تعلیم دی جائے اس کے اندر اخلاقی مضامین شامل ہوں۔ اس کے اندر رشوت خوری کے خلاف شدید جذبۂ نفرت اُبھارا جائے۔ اُس کے اندر حرام طریقوں سے مال کمانے اور کھانے والوں پر سخت تنقید کی جائے، اور اُس کے بُرے نتائج بچوں کے ذہن نشین کئے جائیں۔ اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکہ اور فریب سے، خود غرضی اور نفس پرستی سے، چوری اور جعل سازی سے، بدعہدی اور خیانت سے، شراب اور سود اور قمار بازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ ان اخلاقی برائیوں کا اثر پائیں اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں۔ یہاں تک کہ انہی درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ داد دینے اور ساتھ دینے والے۔

اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اُن کو درسیات میں بیان کیا جائے۔ اُن کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اُن کی تعریف کی جائے۔ اُن کے اچھے نتائج تاریخ سے نکال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے اُن کے فائدے سمجھائے جائیں۔ خاص کر یہ نیکیاں حقیقت میں انسانیت کے لئے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دل نشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصل خوبیاں ہیں کیا جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں اُن کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاس عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندیٔ حدود کا، اکل حلال اور ترک حرام کا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلق اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا سبق دیا جائے اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

(۶۲) سوم:- یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دیئے جائیں۔ اس کے لئے اگر ایک الگ دینیات کے کورس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بنایا جا سکتا ہے لیکن بہر حال صرف ایک اسی کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روح تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے اور یہ یقین ایسے طریقے سے ہونا چاہیے کہ بچہ یہ محسوس کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات نہیں جو اُس سے بولنے جا رہے ہیں بلکہ اُسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں۔ ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لئے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

(۶۳) چہارم:- یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دیئے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کرایا جائے جس سے بچے یہ سمجھیں کہ ہمارے لئے یہی احکام ہونے چاہئیں، یہ احکام بالکل برحق ہیں اور ہم کو ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے ان احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

## ثانوی تعلیم

(۶۴) اس کے بعد ہائی اسکول کی تعلیم کو لیجئے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز جسے ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے، حدیث عربی میں ہے، ہمارے ابتدائی صدیوں کے فقہا اور علماء نے جتنا کام کیا ہے اُن کی ساری کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی اسپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ پوری طرح سے اُس میں اسلامی ذہنیت پیوست ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لئے ہم عربی زبان کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی اسکول سے پاس ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عبارت کو جو عربی زبان میں لکھی ہوئی ہو اُس کو صحیح پڑھ سکے اور سمجھ سکے۔

(۶۵) اگلا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہیے جس میں طلباء کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں؟ انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے؟ ان کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا اثرات انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کئے جائیں کہ وہ محض باپ دادا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ اُن کی اپنی رائے بن جائیں۔

(۶۶) اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات [illegible] تعلیم کی نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے

اور تاریخ سے نظیریں پیش کر کے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور نظریئے نہیں ہیں بلکہ عملاً اس سیرت و کردار کے لوگ مسلم سوسائٹی میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء میں ایک ایسی پلٹنے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے، طلبہ خود ان اوصاف کو برا سمجھیں، ان سے بچیں اور ایسی سوسائٹی میں ان صفات کے لوگوں کو ابھرنے نہ دیں اور اسلام جن اوصاف کو محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں، ان کو اپنے اندر نشوونما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔ میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی نسبت زیادہ تفصیلی احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں اس کو شخصی اور ذاتی زندگی، عائلی زندگی اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق ان تمام ضروری احکام سے کموبیش طور سے واقف ہونا چاہیے جو ایک جوان آدمی کے لئے درکار ہیں۔

(۶۷) تاریخ کی تعلیم میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی اسکول کا ہر طالب علم نہ صرف اپنے ملک کی تاریخ پڑھے بلکہ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اس کو تاریخ انبیاء سے واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ جان سکے کہ اسلام ایک ازلی و ابدی تحریک ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں یکایک شروع نہیں ہو گئی تھی۔ اس کو سیرت نبویؐ اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ ان مثالی شخصیتوں سے روشناس ہو جائے جو اس کے لیے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے اس کی تاریخ کا بھی ایک مجمل خاکہ اس کے سامنے آنا چاہئے تاکہ وہ یہ جان لے کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۶۸) اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی اسکول کے مرحلے ہی میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جانا چاہئے۔ مثلاً ہائی اسکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہئے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلباء کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہئے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالب علموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں۔

# سائنسی علوم اور اسلام

ہمیں اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اسلامی دینیات کے دائرے سے طبعی علوم کو باہر نہ رکھا جائے۔ ہمارے بعض پڑھے [illegible] یہ تصور پایا جاتا ہے کہ فزکس یا کیمسٹری، زولوجی باٹنی، فلکیات و [illegible] ٹکنالوجی وغیرہ میں اسلامی اور غیر اسلامی کی کوئی تفریق ممکن [illegible] سیکولر ذہن ہے جو موجودہ نظام تعلیم نے تیار کیا ہے اور [illegible] حالات میں خدا کے عمل دخل کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں [illegible] سارا دائرہ ہے جہاں اگر مطالعہ و تحقیق ذہن سے کیا جائے تو انسان [illegible] توڑتا جاتا ہے۔ سائنسی حقائق تلاش نہ اسلامی اور نہ غیر اسلامی ہوتے ہیں لیکن ان کو پڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سب قوانین اپنے آپ اور بلا خدا کے نافذ ہیں اور دوسرا یہ نقطہ نظر کہ ان سب کے پیچھے کارفرما اصل قوت خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہمیں شعوری طور پر اپنے طلبا کو یہ دوسرا نقطہ نظر دینا ہے بصورت دیگر ہم اس تشکیک اور بے یقینی کا علاج نہیں کر سکتے جو محض سائنس کو سیکولر ذہن سے پڑھانے سے پیدا ہوتی ہے۔

گزشتہ چند صدیوں میں سائنسی علوم و تحقیقات میں امامت کا شرف ایک ایسے گروہ کو حاصل ہے جو کہ اس کائنات کے لئے کسی خالق کے وجود کا منکر ہے اور ان سارے علوم کو اس پیرائے میں ڈھالا ہے۔ ہمیں ان سائنسی علوم کو اپنے خدا پرستانہ سانچے میں ڈھالنا ہے اور ایک ایک مضمون کو اس طرح پڑھانا ہے کہ جدید ترین انکشافات سے بھی واقفیت حاصل ہو۔ خدا کی اس کی حکمت مصلحت کارفرمائی اور ربوبیت پر ایمان بھی راسخ ہو اور نئی نئی تحقیقات کا جذبہ بھی بیدار ہو سائنسی نصاب میں یہ بنیادی تبدیلی ہمیں مغرب کے آگے مستقل مقلد رہنے کے بجائے ایسا حقیقی قائدانہ مقام حاصل کرے گی جس کے بعد ہم اپنے طلبا سے سائنسی میدان میں تخلیقی کاوشوں کی توقع کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں ہمیں بنیادی رہنمائی قرآن پاک کی آیات سے ملتی ہے جس نے انفس و آفاق کی آیات کے مطالعہ کے لئے ابھارا بھی ہے اور اس کے لئے صحیح نقطہ نظر بھی دیا ہے۔ ہمارے سائنسی نصابات میں اس نقطہ نظر کو پوری طرح بہ تمام و کمال جاری و ساری ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف سائنسی علوم کے ایسے ماہرین جو مسلمان ذہن رکھتے ہوں۔ اور ان علوم کی اسلامی تشکیل نو سے دلچسپی رکھتے ہوں اور ان کی کچھ نظر قرآن پر بھی ہو۔ ان کو یہ کام سونپا جائے کہ وہ ان نصابات کے لئے بنیادی خطوط متعین کریں اور واضح مثالوں سے بتائیں کہ کس طرح یہ تبدیلی کی جا سکتی ہے تاکہ پھر نصاب کے تمام مراحل کی کتابوں میں یہ انداز سمویا جا سکے ساتھ ہی معارف اسلامی کے شعبوں کو اس طرف خصوصی طور پر متوجہ کیا جا سکے۔

## (۶۹) تدوین نصاب کے لئے عمومی خطوط کار

نصابات کے سلسلے میں تدوین کیلئے خطوط کار متعین کئے جائیں محض یہ توقع کہ چونکہ مقاصد میں اسلامی اقدار اور قومی شعور کا تذکرہ ہو رہا ہے اس لئے لامحالہ نصاب بھی انہی مقاصد کے مطابق ہوگا۔ ہماری رائے میں کافی نہیں ہے۔ اس تدوین کا کام لامحالہ انہی افراد کے سپرد ہونا چاہیئے جن پر موجودہ سیکولر نظام کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے ذہن کی وجہ سے پالیسی کے ان مقاصد سے بچتے ہوئے بھی صرف نظر کر جائیں اس کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ ایسے تفصیلی DIRECTIVES اس انقلابی پالیسی میں شامل کئے جائیں تاکہ جو کمیٹیاں بنیں وہ اپنے کو اس کا پابند سمجھیں اور اگر کوئی ایسی چیز داخل کی جا رہی ہو جو ان ہدایات کے خلاف ہو تو اسے نکالا جا سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے مختلف مراحل کے نصابات کے لئے الگ الگ بنیادی [illegible] مہیا کئے جائیں لیکن سردست ہم عمومی اشارات دینا چاہتے ہیں [illegible] اور وسیع [illegible]
[illegible] یہ امر افسوسناک ہے کہ چند [illegible] اس کے مسائل کے سلسلے کوئی مثبت اور تعمیری

نصاب کا MODERN IZATION اور اس کو نظریہ اسلامی کے تحت ڈھالنا اوّلین مطمحِ نظر ہونا چاہیئے۔

یہ دونوں کام سوشل سائنسز اور نیچرل سائنسز کے تمام مضامین میں برابر کی اہمیت سے کیے جائیں۔ فی الوقت کچھ ایسی تقسیم کر لی گئی ہے کہ سائنس کے نصابات کو صرف جدید بنایا جاتا ہے اور اس میں محض نقالی پیش نظر ہے نیز انہیں حیات کا آہنگ دینے کی طرف سے کوئی کوشش کی ہی نہیں گئی اور اگر کسی حد تک اسلامی آہنگ دینے کا احساس ہے، خواہ اسے عملاً بہت زیادہ رکھا گیا ہو تو وہ سوشل سائنسز ہیں عدم توازن یہیں کہیں کا رکھے گا اور ہم بدستور اپنے نظام تعلیم سے متضاد رجحانات کے افراد تیار کرتے رہیں گے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ سوشل سائنسز کے نصابات میں اسلامی آہنگ کے ساتھ جدید ترین تحقیقات سمونی جائیں اور نیچرل سائنس کے معلومات کو جدید بنانے کے ساتھ اسلامی آہنگ دینے کا بھی اہتمام کیا جائے۔

## (۱) قرآن پاک بحیثیت راہنما

نصابات کے سلسلہ میں دوسری ضروری بات یہ ہے کہ چونکہ سارے علوم کا سرچشمہ اور ان کے لئے بنیادی رہنمائی کا ماخذ ہماری کتابِ ہدایت یعنی قرآن مجید کو ہونا چاہیئے یہ تمام مضامین زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں۔ اور ان سب کے بارے میں قرآن کی رہنمائی ملتی ہے۔ ہمارا سارا مطالعہ اس رہنمائی کے تحت ہونا چاہیئے اور ہماری کتب سے یہ بات ظاہر ہونی چاہیئے۔ پورے نصاب کو یہ رنگ دینے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ نصاب کے تمام کتابوں میں موضوعات سے متعلق آیات و احادیث کا مختصر انتخاب بھی دیا جائے۔ آیات کا یہ انتخاب تھوڑی سی محنت سے ہو سکتا ہے صرف ارادے اور کوشش کی ضرورت ہے۔

## (۲) غیر اسلامی تصورات کا تنقیدی مطالعہ

غیر اسلامی تصورات کا تنقیدی مطالعہ نصاب کا لازمی جزو ہونا چاہیئے جدید دور کی فکر اور اس کے سارے تصورات کا تنقیدی مطالعہ نصاب کا لازمی جزو ہونا چاہیئے جدید دور کی فکر اور اس کے تصورات پر ایک لادینی اور مادہ پرست تہذیب کی چھاپ ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے وہ قابل اعتراض ٹھہرتے ہیں ۔ بے شک ہمیں اپنے طلبار کو ان تمام تصورات کا مطالعہ کروانا چاہیئے لیکن ان کو بغیر کسی تنقید کے پڑھانے سے ہم طالب علم کو اسلام کی تصورات کی برتری کے بارے میں شک و شبہ کا شکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم ان کو صرف تصورات کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کر سکیں گے۔ [illegible] کے متعلق [illegible] جائے گا اور اسلام کے تصورات کو غلط رنگ دینے کا جو رجحان اس میں پیدا ہو گیا

## غیر قومی اصول کی عکاسی

ہماری نصاب کی کتابوں کو مغرب کی ثقافتی اقدار کو نہیں اور ان کی اہم شخصیات کو نہیں بلکہ پاکستانی ماحول کو پیش نظر رکھ کر اسلامی اقدار کو اور اہم مسلم شخصیات کو سامنے لانا چاہیئے اور انہیں قابل تقلید نمونہ بنا کر پیش کرنا چاہیئے نصاب [illegible] ماحول رہتا ہے۔ مروجہ نصاب بسا اوقات

اسلامی اقدار پر براہ راست حملہ بھی کرتا ہے۔ تاریخ تک بعض جگہ غیر مسلم نقطۂ نظر سے پڑھائی جاتی ہے اور اسے پڑھ کر مسلمان کا زاویۂ ذہن بنتا ہے مثالیں بیشتر غیر ممالک کی ہوتی ہیں خود پاکستان یا دوسرے اسلامی ممالک کی کم۔ الیے کہ سائنس کی کتابوں تک میں ساری مثالیں یورپ اور امریکہ کی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم امریکہ اور انگلینڈ کے پھول پتوں اور مچھلیوں کی تو خبر رکھتا ہے لیکن اپنے آس پاس پائے جانے والے جانوروں اور پودوں سے وہ ناواقف ہے۔ اچھے اخلاق و کردار، ذہانت اور شجاعت اور مہم جوئی کے لئے بھی نمونہ کا کردار مغربی شخصیات کا پیش کردہ ہے اس عام صورت حال سے ایک مرعوب ذہن تشکیل پاتا ہے۔ جس نے اپنی تاریخ، اقدار و شخصیات پر کوئی فخر نہیں ہوتا بلکہ احساس شرمندگی ہوتا ہے۔ لوگ جب غیر ممالک جاتے ہیں تو زیادہ وہ AT HOME محسوس کرتے ہیں تخلیق اور تحقیق کا ذہنوں پر اس کا جو اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ محض اس بات سے کہ اب ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گا اس صورت حال پر فیصلہ کن اثر پڑے گا لیکن یہ بات کافی نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ ہمارے ماہرین محنت سے جی چراتے ہوئے ترجموں پر اکتفا کر لیں اس لئے یہ ہدایت ضروری ہے کہ اس امر کا خاص خیال رکھا جائے اور معینہ مدت میں بی اے کے مراحل کی تمام کتب اردو میں اور اسلامی ماحول کے مطابق تیار کروائی جانی چاہیئے۔

## (۴) مختلف مراحل کا منطقی تسلسل

نصاب کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات مختلف مراحل کے درمیان تسلسل اور ربط کا خاص خیال رکھنا ہے ایک ہی موضوع تقریباً ایک ہی معیار سے بار بار پڑھایا جانا اور اس میں امتحان لینا ایک ایسی تضیع اوقات ہے کہ جس کی اس وقت جبکہ علم کی مقدار ہر گھنٹہ اور ہر سیکنڈ بڑھ رہی ہے ہرگز گوارا نہیں کیا جانا چاہیئے ہمارے نصابات میں بہت سی چیزیں تو ایسی ہیں کہ جو میٹرک میں پڑھا لیں وہی انٹرمیڈیٹ یا حاشر میڈیٹ میں پڑھا لیں وہی گریجویشن میں بھی پڑھیں اس کی مثال بھی موجود ہے کہ ایک ہی موضوع ایم اے 'پریویس' (PREVIOUS) میں ہے اور فائنل میں بھی ہے ایک دفعہ مطالعہ کر کے دو مرتبہ نمبر لئے جا سکتے ہیں ان بہرے جانے سے کاٹ ڈالنے سے ہم مختلف مراحل پر نصابات کے معیار میں اچھا خاصا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت اب شاید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ غیر ممالک میں جو چیزیں گریجویشن کے لیول پر تمام و کمال پڑھائی جاتی ہیں ہم ایم اے، ایم ایس سی کے مراحل پر ان کی مبادیات پڑھاتے ہیں اگر ہمارے طالب علم دوسری اقوام سے کم ذہین نہیں پیدا کیے گئے تو ہمیں اس معاملے میں ان سے سبق سیکھنا چاہیئے اور زیادہ اچھی طرح پڑھانا چاہیئے۔

# چند اہم امور

## (۵) پبلک اسکول

قومی نقطۂ نظر سے یہ بالکل ضروری ہے کہ تمام طلبار کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے اس ضمن میں کسی بھی قسم کے امتیازی سلوک یا طریق کے ساتھ نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ملک میں ایک امتیازی طبقہ پیدا کرنے کے لئے پبلک اسکول کا نظام شروع کیا گیا ہے ہماری درخواست ہے کہ اس قسم کے ادارات کی سختی سے [illegible] کی

جائے ایک ایسے وقت میں جبکہ قوم کی کمی کی وجہ سے توسیع تعلیم کا کام خاطر خواہ نہیں ہو رہا۔ اور اساتذہ نہایت ہی کم اور قلیل سی تنخواہوں کی وجہ سے شدید مشکلات میں مبتلا ہیں ایک خاص طبقہ کی تعداد تعلیم پر عام آدمی کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ خرچ ہو رہا ہے بھاری بھاری تنخواہوں پر غیر ملکی اساتذہ کے تقرر قومی مفاد سے متصادم ہے

پبلک اسکول ایک دوسرے کی حیثیت سے ہوئے ہیں یہ ادارے اس ملک میں تعلیم کو محدود کر کے ایک خاص طبقہ کی سیاسی برتری قائم کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں سے ایک بالکل نئی طرح کی پود پیدا کی جا رہی ہے جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس ملک میں آقاؤں کی طرح رہے یہ سامراجیت کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہوں گے اور اس سے ملک کے استحکام کو نقصان پہنچے گا اور یہ سلسلہ برباد ہو جائے گا پبلک سکول کے ساتھ ایچی سن کالج جیسے اداروں کو شامل سمجھے۔ لہذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس نظام کو کلیتاً ختم کر دیا جائے اور سہولیات و وسائل فراہم ہوں وہ عوام کی تعلیم پر صرف کئے جائیں یہ عوام ہی فی الواقع قوم کی دولت ہیں

## (۷۶) اپنی تاریخ سے واقفیت

نئی پود کو اپنے ملک کی تاریخ اور پس منظر سے پوری آگاہی ہونا چاہیئے جس میں علمائے حق و صداقت کی راہ میں اُن کی جد وجہد اور سامراجیت سے نجات پانے کے لئے اُن کی بے مثال خدمات اور قربانیوں سے واقف ہونا چاہیئے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ :-

(ا) نصاب مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے۔

(ب) ان موضوعات پر مختصر لیکن پرکشش اور دلچسپ مواد شائع کرنے کے لئے مختلف اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے یہ کام خصوصاً یونیورسٹیوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے طلباء ان کتابوں کو ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔ اور اس سلسلے میں ضروری معلومات اور پس منظر سے آگاہی حاصل کریں گے

(ج) تعلیمی اداروں کو ایسے موضوعات پر خصوصی پروگرام پیش کرنے کے لئے کہا جائے خصوصاً یوم آزادی اور دوسرے ایسے ہی اہم مواقع پر یہ پروگرام برائے پروگرام نہ ہوں بلکہ ان کا محرک تعلیم و تربیت ہو۔

(د) ہالوں اور گیلریوں کو اہم شخصیات کے اقوال اور ہماری تاریخ کے اس دور کے اہم واقعات کی تصاویر سے سجایا جائے۔

(س) مشرقی پاکستان اور مقبوضہ کشمیر کو ہمارے نصاب و تعلیمی ماحول میں برابر مقام دیا جائے۔

## (۷۷) عربی تعلیم

قرن اول کی اسلامی روایات و ادب اپنے مذہب سے ربط کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے اور عربی بولنے والے ممالک سے دوستانہ تعلقات کے لئے عربی زبان کو تعلیمی نصاب میں کم از کم اس حد تک شامل کیا جائے جہاں طالب علم براہ راست قرآن و حدیث کے معانی سمجھ سکے اور اصل ماخذ تک اس کی پہنچ ہو سکے کالجوں میں تعلیم پانے والی موجودہ نسل میں عربی سے ضروری واقفیت پیدا کرنے کے لئے مختصر ڈپلوما کورس شروع کئے جائیں۔

## (۷۸) غیر ممالک میں تعلیم

فی الوقت ہمارے بہت سے طلباء اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر ملکی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن اس طریقے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن کے پیش نظر اس تمام طریقے پر نظر ثانی کی جائے

۷۹ - غیر ملکی تربیت پر زبردست اخراجات کے باوجود ہم درحقیقت کلی طور پر آج بھی غیر ملکی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے محتاج ہیں علم کی کسی بھی شاخ میں ہمارے اپنے ملک میں ایک بھی ایسا قابل ذکر ادارہ نہیں جو اعلیٰ ترین تربیت یافتہ افراد تیار کرنے کا مستقل ذریعہ ہو۔

۸۰ - جو طلباء غیر ملکوں میں ایک طویل عرصے کے قیام کے دوران وہاں کی تہذیب سے ذہنی طور پر اتنے متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ واپسی پر یہاں تہذیب مغرب کے چلتے پھرتے سائن بن جاتے ہیں ان کا نقطہ نظر مادہ پرستانہ ہو جاتا ہے اور وہ اس ملک کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہاں کے نسبتاً اونچے معیار زندگی کے زیر اثر ہوں گے

## (۸۱) قومی امور میں طلباء کا کیا رول ہونا چاہیئے ؟

ہمارا سوچا سمجھا نقطہ نظر اور مستقل پالیسی ہے کہ طلباء کو عملی سیاسیات کی الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی مطلقاً نہیں کہ انہیں قومی امور سے کوئی دلچسپی نہ لینی چاہیئے اس احمقانہ پالیسی کو نہ تو طلباء اور نہ ہی ملک برداشت کر سکتا ہے انہیں اخبارات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ مختلف امور پر اظہار خیال کریں، مختلف پالیسیوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح اپنا ایک نقطہ نظر کی تشکیل کریں انہیں اپنے وقت پر حکومت چلانے کے لئے سیاسی تربیت تو دینی چاہیئے لیکن ناپختہ ادارے عملی سیاسیات میں اُن کو نہیں گھسیٹنا چاہیئے۔ قومی زندگی میں کسی شدید ہنگامی حالت کی بات اور ہے لیکن عام طور پر انہیں اپنے آپ کو حالات مستقبل کے لئے تیار کرنے پر لگا رہنا چاہیئے۔

## (۸۲) سیاسی پارٹیاں اور طلباء

تمام سیاسی پارٹیوں کو، خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں یہ اہم اور بنیادی اصول مان کر اس پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے کہ وہ کبھی بھی طلباء کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال نہ کریں ان پارٹیوں کو طلباء کی مشکلات اور تعلیمی مسائل سے اپنے مفادات کی خاطر نہیں بلکہ ان کے حل کے لئے دلچسپی لینی چاہیئے انہیں طلباء کے مسائل کے سلسلے میں تحقیقات اور اعداد و شمار جمع کرنے کا کام کرنا چاہیئے انہیں طلباء کو اپنے نقطہ نظر سمجھانے کی آزادی پر کوئی مخالفت نہ ہو لیکن جس بات کی ضرورت ہے وہ نئی نسل کو چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے غلط طور استعمال نہ کرنے کا شریفانہ معاہدہ ہے بحیثیت شہری کے طلباء کا اپنے کچھ رجحانات رکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن سیاست کے اتار چڑھاؤ میں ہمہ گیر قسم کے عمل دخل کے لئے انہیں موزوں وقت کا انتظار کرنا چاہیئے

نظام تعلیم کے سلسلے میں تمام سیاسی جماعتوں پر خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں یکساں اور بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ کسی نے اس کے مسائل کے سلسلے کوئی ٹھوس اور تعمیری

کوشش ہیں کی۔

## (۸۳) انتظامی امور میں طلبا کا حصہ

سینیٹ، سنڈیکیٹ میں طلباء کی شرکت کے بے حد مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں اس سے طلباء میں اپنے مسائل کے لئے افہام و تفہیم کا احساس پیدا ہوا ہے اکیڈیمک کونسل اور سمسٹر کمیٹیوں میں طلباء کی نمائندگی مزید سعید ثابت ہوگی۔

## (۸۴) غیر نصابی سرگرمیوں میں طلبا کا کیا رول ہونا چاہیئے؟

غیر نصابی سرگرمیوں میں ذوق و شوق سے حصہ لینے کے لئے طلباء کو سہولتیں فراہم کی جانی چاہیئیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے یہ سرگرمیاں درحقیقت نصاب ہی کا حصہ ہیں ان کو اس طرح ترتیب دیا جانا چاہیئے کہ وہ طلباء کی صلاحیتوں میں نکھار کا باعث ہوں طلباء میں کھیل کود ادبی، تقریری اور دوسری سرگرمیوں کو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ بالکل ہم آہنگ اور مربوط کر کے آگے بڑھایا جائے۔

طلباء یونین ایک نہایت ہی اہم ادارہ ہے اور اسے نہایت ادارے سے مفید بنانا چاہیئے۔ آئینی طور پر خود مختار یونینوں کے طلباء کو عملی زندگی کے لئے تیار کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیئے، ان کی سرگرمیاں صحت مند ہونی چاہیئیں اساتذہ کے ساتھ تعاون کے ساتھ کام کرنا چاہیئے یونین دو یہ تصور ذہن سے ترک یونین کے طور پر صرف ہڑتالوں کے لئے استعمال کیا جائے کی کوئی بھی آ سکتا وہ عوامل معلوم کر کے جنہوں نے بدقسمتی سے یونین کو یہ حیثیت دے دی ہے دور کئے جانے چاہئیں۔

## (۸۵) تعلیمی منصوبہ بندی

تعلیم کے میدان میں مناسب منصوبہ بندی نہ ہونے کے سبب طلباء کی ایک بڑی تعداد علم زیور سے آراستہ مگر زنجیر بے روزگاری میں جکڑی گلی گلی، قریہ قریہ میں ملے گی جس کے سبب تعلیم کے "سپر" (SUPER) ہونے کے تصور کو خاصا دھچکا لگ رہا ہے اور لوگوں کا تعلیم سے اعتماد اٹھ رہا ہے اس کا شاخسانہ میدان تعلیم میں منصوبہ بندی کا فقدان ہے کہ کس قدر طلباء یا ماہرین کی کس میدان میں ضرورت درکار ہے؟ اس سوال کا جواب کسی ذمہ دار کے پاس ہے اور نہ ہی اس کی فکر ہے۔ اس لئے ہماری سفارش ہے کہ اس سلسلہ میں مناسب ترین اور فوری منصوبہ بندی کی جائے تاکہ اس حالی کا ازالہ ہو سکے۔

## (۸۶) تحفظ روزگار

بے روزگاری دن بدن شدید ترین مسئلہ کے طور پر معاشرے کو گھن کی مانند کھوکھلا کر رہی ہے ڈگریاں ہاتھ میں لئے پڑھا لکھا طبقہ سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے اور بلا مبالغہ ہر گریجوایٹ پریشانی روزگار سے دوچار ہے اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے کم از کم ابتدائی طور پر یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے طلباء کو فوراً روزگار مہیا کیا جائے کہ ان کو سخت میرٹ (MERIT) اور کڑے سمسٹر کے بعد ڈگری ملتی ہے۔ دوسرے مرحلہ پر انٹرمیڈیٹ اور ڈگری پاس طلباء کو روزگار کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے۔

## (۸۷) عمرانی علوم، سوتیلانہ سلوک

اسے بدقسمتی کہئے یا امر واقعہ کہ سائنسی یا فنی علوم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ماہرین کی ٹیم کا ملک و ملت کی باگ ڈور سنبھالنے میں بہت کم کردار ہوا کرتا ہے اصل میں قوم کی رہنمائی اور قیادت عمرانی علوم کے ماہرین کے ہاتھ آتی ہے جس کی شروعات سے تمام عمرانی علوم (آرٹس مضامین) کی حیثیت "ثانوی" کی ہے۔ وہیں طلباء کو ان مضامین کی جانب کھینچنے کی کشش سے محروم ہیں اس کا بھی سبب حکومت کی جانب سے نا مناسب سرپرستی کا فقدان ہے۔ اس لئے اس میدان میں افراد کار کی تیاری کے لئے جہاں نصاب کے معیار کو بلند کرنا ضروری ہے وہیں پر داخلے کی شرائط کو بھی سخت کرنا ضروری ہے تاکہ کشش بھی پیدا ہو اور وہیں طلباء ملک کے مستقبل کو سنبھالنے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کر سکیں۔

## (۸۸) فنی تعلیم ۶۰٪

ہماری سفارش پر "دوران تعلیمی کمیشن" نے بھی ملک میں ۶۰ فیصد فنی تعلیم کے رواج کی تائید کی اور اس پر عمل درآمد کو لازمی قرار دیا فنی تعلیم سے ذیل میں ہمارے نزدیک میڈیکل، انجینئرنگ، اعلیٰ انجینئرنگ ٹیکنالوجی، زراعت، کامرس، قانون، گھریلو مصنوعات وغیرہ ہیں اب ان کے معیار کو بلند کرنے اور زیادہ توجہ دے کر عام کرنے، بڑے سکور کے ساتھ درسگاہیں قائم کیجئے۔

**ہم نے تجویز** بھی پیش کرتے ہیں کہ فالفور ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے بھی موثر تجاویز پیش کرے جس سے آج طلباء دوچار ہیں، یہ ہمارا یقین کامل ہے کہ اعلیٰ سطح پر مناسب منصوبہ بندی قوم کا صحیح استعمال اور مشکلات کو دور کرنے کا پختہ عزم ان مسائل کو آسانی حل کر سکتا ہے۔ ہمارے قریب کے مطالعہ ان مسائل کے حل نہ ہونے کا سب سے بڑی وجہ ان کو حل کرنے کے لئے کسی ارادہ اور خواہش تک کا نہ ہونا ہے۔

## اب ہم اپنی چند مشکلات بیان کرتے ہیں جن کی نوعیت

تشدید ہے اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو دور کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے

۸۹- درسی کتب کافی سستے داموں فراہم کی جانی چاہئیں دوران کتب بھی جو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نسل کے زیر مطالعہ رہیں کم قیمتوں پر دستیاب ہونا چاہیئیں اس کے لئے طلباء کے لئے مخصوص پیپر بیک (PAPER BACK) ایڈیشن شائع کئے جا سکتے ہیں صحت مند لٹریچر فراہم کئے بغیر ہم سستے جاسوسی گھٹیا جنسی ادب کی لعنت کا مقابلہ نہیں کر سکتے

۹۰- طلباء کی ایک اور اہم ضرورت یعنی سٹیشنری بھی کم داموں فراہم کیا جانا چاہیئے۔ گزشتہ چند سالوں میں ان ضروریات تعلیم کی قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں اس کو روکا جانا چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ حکومت ان قیمتوں کا کچھ حصہ خود ادا کرے۔

۹۱- ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تمام تر وعدوں کے باوجود ابھی تک حل نہ ہو سکا ہے

۹۲- طلباء کی ایک اور بنیادی ضرورت کپڑے بھی ہیں

فراہم کئے جانے چاہئیں۔ اس سے ہم طلبا میں میانہ روی اور سادگی پسندی کے رجحان کو بھی پروان دے سکتے ہیں ان تجاویز کی تکمیل جب ہوجائے گی، طلبا کے لئے سستی دکانوں کا ایک سلسلہ کھولا جاسکتا ہے جہاں صرف طلبا کو ایسی ضروریات کی تمام اشیا کم قیمت پر مہیا ہو سکیں

۹۳- لائبریریاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھولی جائیں اور سارے ملک میں ان کا جال پھیلا دیا جائے ہمارا مقصد طلبا میں مطالعہ کی عادت ڈالنا اور ساتھ ہی ساتھ اچھے ادب کا ذوق پیدا کرنا ہونا چاہیئے یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایسی لائبریریوں کو جو طلبا کو خصوصی سہولتیں دیتی ہیں اچھی کتب فراہم نہ کی جائیں ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے جن سے ان غیر ملکی اور ملکی جاسوسی اور گھٹیا جنسی کتب کی بڑھتی ہوئی رو کو روکا جاسکے جو ہماری نسل کو بے اندازہ نقصان پہنچا رہی ہیں

۹۴- تعلیمی اداروں میں کیپے ٹیریا کھولے جانے چاہئیں جہاں طلبا کھانا کم قیمتوں پر حاصل کرسکیں۔

۹۵- طلبا کی رہائش کا مسئلہ سال بہ سال شدید ہوتا جارہا ہے ملک کے اہم تعلیمی مراکز میں طلبا کے لئے مزید ہوسٹل تعمیر کئے جانے چاہئیں یہاں تک کہ ہر اس طالب علم کے لئے جگہ فراہم ہوجائے جس کو ضرورت ہے

۹۶- طلبا کے لئے علاج کی خصوصی سہولت نہیں ہے اگر تمام تعلیمی اداروں میں مفت دواخانوں کا بندوبست ممکن نہیں ہے تو طلبا سے برائے نام میڈیکل فیس لی جاسکتی ہے اور ان کو مکمل طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ہیلتھ انشورنس سکیم قسم کی چیز شروع کی جاسکتی ہے۔

۹۷- تمام یونیورسٹیوں، بڑے شہروں اور قصبوں میں طلبا کو حصول روزگار میں مدد دینے کے لئے دفاتر روزگار قائم کئے جائیں یہ دفاتر اگر منظم اور مربوط طریقہ پر کام کریں تو فارغ طلبا اور مالکان کے مابین ایک مضبوط رابطہ کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

۹۸- ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر طلبا کو مواقع دیئے جائیں اقربا پروری اور جماعتی مفادات کی وجہ سے نہیں

۹۹- ایم ایڈ اور ایم اے اکنامکس پاس طلبا کو سترھواں گریڈ دیا جائے

۱۰۰- وظائف کی شرح میں ڈیڑھ سو فیصد اضافہ کیا جائے۔

۱۰۱- دینی مدارس کے نصاب کو بہتر اور سائینٹفک عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور نظام کو اسلامی مساوات پر استوار کرنے کے لئے ہم واضح پروگرام اور قابل عمل لائحہ عمل رکھتے ہیں۔

آخر میں ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ آپ کے پیش نظر جو کام ہے وہ ایک تاریخی کام ہے۔ ۳۰ سال تک اندھیروں میں بے مقصد ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد آج تمام قوم کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں کہ آپ ہمیں بدحالی کی اس کیفیت سے نکال کر ایسی روشن اور محفوظ شاہراہ پر ڈال دیں جس کی منزل پاکستان میں اسلامی تعلیم ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ اپنے مشن میں ناکام ہوگئے تو پھر ایک طویل عرصہ تک کوئی اور کوشش نہ کی جاسکے گی اور تاریکی نہ صرف طلبا بلکہ پورے پاکستان کا مقدر بن جائے گی اور اگر آپ کامیاب ہوگئے تو آپ بھی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سوچ سکتے ہیں کہ اس ملک کی تعمیر نو میں آپ کا حصہ ہماری تاریخ کا سب سے اہم اور سب سے درخشاں باب ہے

ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی ذمہ داریوں کی اس شدید اور نازک نوعیت سے آگاہ ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو سیدھی راہ دکھلائے صحیح سمت کا شعور عطا کرے اور اپنی بے پایاں رحمت سے آپ کو عزم و ہمت اور والشمندی مرحمت کرے تاکہ آپ قوم کی صحیح راستہ پر رہنمائی کرسکیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

---

سمسٹر سسٹم کے بارے میں جمعیت کی جانب سے تفصیلی سروے رپورٹ ۲۵ فل اسکیپ انگریزی صفحات ضمیمہ نمبر ۲ کے تحت ہمراہ دی گئی۔

# کلنک کا ٹیکہ

عزیز طلبہ نے ایف اے کے امتحان میں عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے مشکل سوالوں کو جس طرح پانی پانی کیا ہے اس سلسلے میں ہمارے ممتحن دوست ابھی تک ان عزیز طلبہ کی کاوشوں سے [illegible] ہوئے ہیں مثلاً کل ہی ہمارے ایک دوست نے ہمیں بتایا ہے کہ ان عزیز طلبہ نے محاوروں کو جس طرح جملوں میں استعمال کیا ہے اس سے محاوروں کا سیاق و سباق بدل گیا ہے یوں پرانے محاوروں کی بالکل ہی حیثیت بدل گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ کام عوامی سطح پر ہی کرنے کا تھا کیونکہ علمی سطح پر حساب الف الحروف تو یہ مدت سے کام دے ہی رہے تھے

---

اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا سکتا ہے، بلکہ یوں کہہ لیں کہ پوری دیگ کھنگالنے کی بجائے اس میں سے حاصل کئے چند دانے ہی نمونے کے طور پر پیش کر دیئے تو اہل نظر کے لیے کافی ہوں گے مثلاً عزیز طلبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ "مسیں بھیگنا" کو جملے میں استعمال کریں۔ ایک طالب علم نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لکھا:

جب اسے اپنے والد کے انتقال کی خبر موصول ہوئی، تو اس کی مسیں بھیگ گئیں۔ ظاہر ہے "مسیں بھیگنا" کا یہ استعمال بالکل نادر ہے اس سے قبل یہ ترکیب جوانی کی طرف آنے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن طالب علم نے ایک جنبش قلم سے "آنکھیں بھیگنا" کے معنی عطا کر دیے۔ اس سلسلے میں ایک اور طالب علم کی کاوش علمی بھی نہایت قابل قدر ہے اس نے "اللے تللے کرنا" کا محاورے کو جملے میں استعمال کیا ہے [illegible] ادا کر دیا ہے اس نے لکھا:

جب وہ کمرۂ امتحان میں نقل مارتے ہوئے پکڑا گیا، تو اس نے سپرنٹنڈنٹ کے سب "اللے تللے" کیے۔ اول الذکر جملے کے استعمال میں لسانی تشکیلات کے اصول کو مدنظر رکھا گیا تھا جب کہ توڑ مروڑ کر محاورے کو میں استعمال کرنے والے عزیز طالب علم نے "اللے تللے" کو "منت ترلے" کا مفہوم بخش کر اردو اور پنجابی میں فاصلے کم کرنے کی کوشش کی ہے اور ادب میں ایک قابل قدر اختراع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کاوش قومی یکجہتی کے زمرے میں بھی آتی ہے!

---

لیکن ان دو محاوروں کا جملوں میں استعمال ایک طرف اور ایک عزیز طالبہ نے جس طرح ایک محاورے کو جملے میں استعمال کیا ہے، وہ اگر دوسری طرف رکھ دیں، تو بھی پلڑا ادھر ہی کا بھاری رہے گا۔ اس عزیزہ طالبہ نے "کلنک کا ٹیکہ" کو جملے میں استعمال کرتے ہوئے لکھا "ہمارے محلے میں تمام لوگوں نے کلنک سے ٹیکے لگوائے، لیکن میں اس روز گھر پر نہ تھی، اس لیے کلنک کا ٹیکہ نہ لگوا سکی"۔ الحمد للہ ہم آج تک اس محاورے کی طرف سے سطح ہی دیکھتے رہے۔ اس کی دیگر پرتوں پر ہماری نظر ہی نہ جا سکی۔ اب یہ عقدہ ہم پر کھلا ہے، تو ہم ارباب دل سے التماس کرتے ہیں کہ آؤ قومی سطح پر ہم سب کلنک کا ٹیکہ لگوا لیتے ہیں لیکن اگر کوئی بچ گیا ہو تو وہ [illegible] میں کلنک کا ٹیکہ لگوانے کہ "اقبال" کا سوال ہے اور "اقبال" نے کہا ہے ؎

دو قسام لطافت سے ہے تنہا کچھ نہیں

---

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کیا کہ محاوروں کی دیگ میں سے ہم چند جملوں کے دانے یہاں پیش کر رہے ہیں۔ ان عزیز طلبہ و طالبات نے اس ضمن میں جس کاوش علمی کا ثبوت دیا ہے [illegible] سے کام لیا ہے اس کے تحقیق کی بالکل نئی راہیں دریافت ہوئی ہیں تاہم سب سے زیادہ متاثر ہمیں "کلنک کا ٹیکہ" والے محاورے کے استعمال نے کیا ہے اس محاورے کو مذکورہ معنوں میں یوں استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ ہمیں یقین ہے کہ طالبہ نے اس ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں ایک طرف تو اس نے گھسے پٹے محاورے کو حیات تازہ عطا کی ہے اور دوسری طرف اس عزیزہ طالبہ نے ان سطور میں ہمارے پورے نظام یا کم از کم نظام تعلیم پر ضرور طنز کی ہے، اس نے دبے لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ نظام تعلیم معاشرے کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

***

# کہکشاں کے مسافر

مصور عارب

# البدری

"جناب، میرے بڑے بھائی کو گرفتار کرنے کا حکم دیں" ایک نوجوان نے فوجی افسر سے کہا
"کیوں؟" فوجی افسر تذبذب کے عالم میں اس اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"اس کا ہندوستانی افواج اور باغی عناصر سے رابطہ ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا
"تمہیں کیسے علم ہوا؟" فوجی افسر نے پوچھا
"وہ اکثر سرحد پار کر کے ہندوستانی چوکیوں پر جاتا ہے اور انہیں پاک فوج کی نقل و حرکت کی خبریں دیتا ہے۔ کل رات وہ ہندوستان میں تین دن گزارنے کے بعد واپس آیا ہے"۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے حالات پر قابو پانے کے لیے فوج ملک کے باغی عناصر اور ہندوستانی ایجنٹوں کی سرکوبی کر رہی تھی۔
بنگالی نوجوان کے بیان نے فوجی افسر کو حیرت میں ڈال دیا۔
فوجی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے سگے بھائی کے جاسوسی جیسے سنگین جرم سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ نوجوان کے قومی جذبے سے انتہائی متاثر ہوا۔ اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا،
"تمہیں معلوم ہے جاسوسی کا جرم ثابت ہونے کے بعد تمہارے بھائی کو کیا سزا مل سکتی ہے؟" نوجوان نے جواب دیا۔
فوجی افسر نے نوجوان کا مزید امتحان لیتے ہوئے کہا "اگر تمہارے بھائی کو سزائے موت ہو جائے تو تمہیں افسوس نہیں ہوگا؟"
"جناب، بھائی کی موت کا دکھ کسے نہیں ہوتا، لیکن ایک غدار جو میرے تیرہ کروڑ مسلمان بھائیوں سے غداری کر رہا ہو، اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ جو ناسور پورے جسم کے لیے خطرے کا باعث بن جائے، کیا اسے کاٹ دینا بہتر نہیں؟"
"کیا تمہارے بھائی کی موت پر تمہاری والدہ کو دکھ نہ ہوگا؟"
"میرے والد کو فوت ہوئے تین برس بیت چکے ہیں کاش وہ زندہ ہوتے ان کی موجودگی میں میرا بھائی کبھی یہ روش اختیار نہ کرتا میں اپنی ضعیف ماں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی سالمیت پر وہ بیٹے کو ترجیح نہیں دے گی"
"اچھا تو آج ہی فوجی دستہ بھیج کر اسے گرفتار کر لوں گا"
"جی نہیں، ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے فوجی دستے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کر کے کل صبح آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"
افسر نے اٹھ کر اس نوجوان بنگالی کو گلے سے لگا لیا ملک کی دو قوتیں یکجا ہو گئیں۔

یہ نوجوان جو ملک و ملت کی خاطر اپنے سگے بھائی کو خود اپنے ہاتھوں قانون کے حوالے کر رہا تھا مشرقی پاکستان میں ضلع مومن شاہی کے سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور حال ہی میں شیر پور سب ڈویژن کے ایک چھوٹے سے قصبے میں زیر تعلیم تھا وہ ایک ہونہار طالب علم ہونے کے علاوہ ایک قوم شناس پاکستانی اور بلند کردار شہری تھا۔ یہ گفتگو شیر پور میں مقیم ایک فوجی افسر اور اس نوجوان کے درمیان ہوئی تھی
شام کے وقت فوجی افسر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا وہ اب بھی اس نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا خصوصاً اس نوجوان کے آخری جملے نے اس کے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی "ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے فوجی دستے کی ضرورت نہیں، مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کر کے کل آپ کے سامنے پیش کر دوں گا"
وہ سوچ رہا تھا اس کے دوست کون ہیں جن پر اسے اتنا اعتماد ہے۔ ایسے عظیم کردار انسان کے دوست بھی یقیناً بلند کردار ہوں گے تو کیا یہ نوجوان کسی ایسی مالا کا موتی ہے جس کا ہر موتی اپنی چمک میں ثانی نہیں رکھتا اگر یہ سچ ہے، تو اس سے اور اس کے قابل اعتماد ساتھیوں سے سینکڑوں ایسے کام لیے جا سکتے ہیں جو فوجی دستے کے بغیر بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں یہ خیال آتے ہی فوجی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی

چند دن بعد شیر پور میں اس نوجوان اور اس کے ساتھیوں کا ایک منظم گروہ "البدر" تیار تھا اور یہ البدر کی پہلی بٹالین تھی جس میں ۳۱۳ کی نفری رکھی گئی تھی بدر کی جنگ میں بھی تو مجاہدین ۳۱۳ تھے۔ فوجی افسر کو جیپ اور میں سب سے مشکل پیش آئی وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ کس کو البدر میں شامل کیا جائے اور کسے روکا جائے کیونکہ سینکڑوں نوجوان ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کام میں شامل ہونے کے آرزو مند تھے ایک لڑکے کو اس کی کم سنی کی وجہ سے فوجی افسر نے روکنا چاہا، تو کچھ ایسا منظر پیش آیا جیسے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔ افسر نے کہا "بیٹا تم ابھی چھوٹے ہو اس لیے تمہیں البدر میں شامل نہیں کیا جا سکتا"
یہ سن کر لڑکا اپنی ایڑیاں اونچی کر کے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور معصومیت سے بولا "اب تو بڑا ہو گیا ہوں جناب"
فوجی افسر اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اس کی آنکھیں بھر آئیں اس نے کہا "بیٹا، میں نے غلط کہا تھا تم چھوٹے نہیں ہو، تم کبھی چھوٹے نہ تھے تم نے اس عمر میں آج سے چودہ سو سال پہلے بھی یہی جذبہ دکھایا تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ کفار مکہ سے جہاد کرنے جا رہے تھے، تم اس وقت چھوٹے تھے، اب ہو تو نہیں چھوڑا گیا، وہ جھوٹ کہتا ہے چھوٹا ہونا تو کمزوری کی علامت ہے اور مومن کبھی کمزور نہیں ہوتا" یہ کہہ کر اس نے کمسن لڑکے کو البدر میں شامل کر لیا۔
شیر پور کی البدر بٹالین نے اپنی مثالی کارکردگی سے سب کو متاثر کیا یہاں تک کہ اس کی اہمیت اعلیٰ فوجی حکام پر بھی عیاں ہو گئی وہ اسے پورے صوبے میں پھیلانے کے متعلق سوچنے لگے جنرل نیازی بذات خود تشریف لائے اور البدر کی اعلیٰ کارکردگی پر مبارکباد دی

چند دن بعد جمال پور سب ڈویژن میں مزید دو بٹالین منظم کی گئیں۔ جذبۂ جہاد سے سرشار

باقی صفحہ ۲۹۰ پر

اخلاص احمد (شعبہ ریاضی)

# الفاظ کا طلسم کدہ

ایک اعرابی مکہ کے بازاروں میں یہ صدا لگا رہا تھا:

اے لوگو!

۱۔ میرے پاس وہ چیز ہے جو خدا کے پاس بھی نہیں

۲۔ خدا فتنہ کو ناپسند کرتا ہے، میں فتنے سے محبت کرتا ہوں۔

۳۔ میں نصاریٰ کے اقوال کی تائید کرتا ہوں

حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا، لوگوں نے شکایت کی، آپ نے سزا کی حد نافذ کرنے کا حکم فرمایا۔
اعرابی نے عرض کی، امیر المومنین! خدارا میں نے مطلقاً غلط بیانی نہیں کی

۱۔ میرا قول یہ ہے کہ میرے پاس وہ کچھ ہے جو خدا کے پاس بھی نہیں، میری مراد اس سے میرا بیٹا ہے اور خدا کا کوئی بیٹا نہیں۔ قرآن حکیم میں آیا ہے ماکان اللہ ان یتخذ من ولد سبحانہ

۲۔ یہ میرا بیٹا میرے لیے فتنہ ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ خود فرماتے ہیں اولاد فتنہ ہے۔

۳۔ اور میں اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں مجھے فتنہ پسند ہے۔

۴۔ میرا تیسرا دعویٰ ایک صداقت کا اظہار ہے۔ میں نے کہا تھا میں نصاریٰ کے قول کی تصدیق کرتا ہوں اور نصاریٰ کا قول قرآن کریم سے نقل کیا گیا ہے

لیست الیہود علیٰ شئ

یعنی یہود راستی پر نہیں۔ گویا میں نصاریٰ کے اس قول کی تائید کرتا ہوں

حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تجھے الحاد و ارتداد کے الزام سے بری کرتا ہوں، لیکن خبردار اگر آئندہ الفاظ کا یہ مغالطہ آمیز کھیل جاری رکھا تو کڑی سزا ملے گی!

آئیے ایک لمحے کے لیے سوچیں کہ الفاظ کا ناٹک کیا کچھ کرتا ہے۔ آج تک ہم نے اس ناٹک سے کہاں تک لذت حاصل کی۔ لیکن جب آنکھ کھل گئی، تو زیاں تھا یا سود تھا۔

ہمارے ہاں اپنا رد عمل کا جو فقدان ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اب تک الفاظ سے محبت کرنا سیکھی ہے۔ ہم صرف اس امر کے گرویدہ رہے ہیں کہ ان الفاظ کو کون، کس سلیقے سے بول سکتا ہے، جو صدیوں کی گردش کے ساتھ ہمارے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ آزادی سے پہلے الفاظ کا جادو ایک خاص طاقت رکھتا تھا۔ اس وقت ہم جن سنگین مرحلوں سے گزر رہے تھے، الفاظ کا سحر جاری حرکت و عمل کے لیے حیات کا کام کرتا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ الفاظ کی جگہ اعمال ہونے چاہئیں، لیکن جو لوگ قوم کے ترجمان ہوئے، وہ الفاظ کا طلسم خانہ تیار کرتے رہے اور یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ پاکستانی قوم کو سب سے زیادہ فریب حسین حرفوں سے دیا گیا۔ وہ الفاظ اور ان کا جادو ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی بساطِ سیاست پر الفاظ کے مہرے بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاسیات میں الفاظ کی مینا کاری سے جو الفاظ سجائے گئے، ان کی اشاعت گو رائج نہ ہو اور آئینہ ہمارے سامنے ہے۔ ادب میں جو عمل شعر ہوتا رہا، اس کی تمثیلیں، دیواریں اور دروازے ہم رنگ ہوں سے اوجھل نہیں، غرض پورا سانچہ الفاظ کے کارخانے میں ڈھلا ہے۔

ہمیں کشادہ پیشانی سے اس امر کا اقرار کرنا چاہیے کہ ہم میں جذبۂ خلق کا فقدان ناپید ہے۔ اب تک جذبۂ عمل کا جو مظاہرہ ہوتا رہا، بالخصوص اونچے طبقے نے جو روش اختیار کی، اس میں نمود و نمائش کے جذبات زیادہ تھے، یا پھر جو شاید کے حسب نقشہ بدلا تو الفاظ بھی بدلے، لیکن الفاظ کا کھیل بدستور جاری رہا جس کا ذکر ان الفاظ میں ہو رہا ہے۔

مشرقی زبانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی خاصی سب سے زیادہ ہے۔ بالخصوص ہماری زبان رہی ہے، اس لیے اس قسم کے الفاظ اس میں عام ہیں جن سے محض آوازیں پیدا اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خطابات اور القابات کا جو انبار اردو میں پایا جاتا ہے، وہ عجیب و غریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر طاقتور چہرے کو سلام کرتے وقت الفاظ کے خزانے لٹا دیتے ہیں اور جنہیں ہم ارباب بست و کشاد کہتے ہیں، وہ اعرابی کی طرح الفاظ کی شعبدہ بازی میں سکتے ہیں، لیکن جو قومیں زندہ ہوتی ہیں، وہ الفاظ کی بہ نسبت اعمال کو دیکھتی ہیں اور یہی ان کی ہے اور اسی میں ان کی ترقی و کمال کا راز مضمر ہے۔ الفاظ سے کھیلنے والی قومیں حباب کی طرح سطحِ آب پر ابھرتی ہیں اور پھر جلد ہی محو ہو جاتی ہیں۔

راحت م ماجد

# تعلیمی کانفرنس

## فیصلے اور نتائج میں ہم آہنگی کا مسئلہ!

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں کہا گیا کہ شعبہ تعلیم میں ایک ایگزیکٹو کونسل قائم کی جائے جو مستقل بنیاد پر تعلیمی امور پر مسلسل نظر رکھے

۲۔ نئی تعلیمی پالیسی میں بھی ایجوکیشن کونسل کے نام کا تذکرہ ہے لیکن اس کے اغراض و مقاصد بیان کر دیے گئے، تاہم اس پر عمل درآمد اب تک بھی نہ ہو سکا۔ اس تعلیمی پالیسی میں جو اغراض و مقاصد درج کیے گئے ہیں، ان کا بیان ہو جائے

ایجوکیشن کونسل

۱۔ تعلیمی عمل کی مسلسل نگرانی کرے گی اور باقاعدہ جائزہ لیتی رہے گی

۲۔ تعلیم میں نئے تجربات اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کرے گی

۳۔ ہر قسم کی رکاوٹ کے حصول میں مدد ہوگی

۴۔ تعلیمی پالیسی کی تشکیل اور اس میں مناسب ردوبدل کی سفارش کرے گی

۵۔ تعلیمی پالیسی کے رہنما اصولوں کے نفاذ کی نگرانی کرے گی

۶۔ تعلیمی ترقی کا جائزہ لے گی

۷۔ تعلیمی میدان میں تحقیق کے نتائج کی نشر و اشاعت کا انتظام کرے گی

۸۔ جدید تعلیمی طریقوں پر عمل کرنے اور ترقی تعلیم کے ذرائع کی تلاش کا اہتمام کرے گی

ان اغراض و مقاصد پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایک مرکزی ادارہ اور صوبوں میں ایک ایک صوبائی تعلیمی کونسل قائم کرنے اور ان میں کمیٹیاں قائم کر کے تعلیمی عمل

کی نگرانی کا وعدہ بھی کیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے سربراہ وزرائے تعلیم مقرر کیے گئے جن کی سربراہی میں تعلیمی کونسلیں کام کریں گی

یہ بات خود تعلیمی کونسل کے قیام کی تجویز معقول ہے لیکن سینیٹر ناشاد کے ہونے والے وعدے شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہے۔ حقیقت ہے کہ سینیٹر صاحب کوئی ایسی تجویز کبھی منظور کرنے کو ان کے بجائے کہ جو سینیٹ ڈویژن کی پارٹی کے مقبول عام، ظاہر کرتی اور بیان کیے ہوئے اغراض و مقاصد کے رویوں سے بھی سینیٹر پارٹی کا عمومی حافظہ دکھائی دیتا ہے مثلاً تعلیمی پالیسی کے رہنما اصول اور حکومت کے رویے، اسلام سے گزرنے کا نام تھا۔ اسی طرح بیرونی وظائف کے حصول کا مسئلہ ہے۔ سینیٹر پارٹی نے اپنے دور میں کسی کانفرنس یا کانگریس کے لیے جو بیرونی ملک منعقد ہوئی، اسے جو سربراہوں کے سوا کسی کو نہ بھیجا گیا، حتیٰ کہ سعودی عرب میں ہونے والی اسلامی تعلیمی کانفرنس کے لیے بھی چند وفود منظور کر کے روانہ کیے گئے۔ یہاں تک کہ ان پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ یہ کہ اگر کوئی غیر ملکی حکومت، کسی اسلامی فکر کے مالک کو دعوت نامہ دیتی، تو اس کے باہر جانے میں ہزاروں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں۔ بیرونی وظائف کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ گزشتہ چند سال میں دیے گئے وظائف کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ گزشتہ وظائف سینیٹر پارٹی کے حامی عناصر کی اولاد یا سفارشوں کے کام آئے۔ یہ نوجوان شخص جنہیں اعتبار کے ستے میں امداد دی گئی ان میں تعلیم کرتے ہیں

ہم یہ نہیں کہتے کہ تعلیمی کونسل بے معنی ادارہ ہے، لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ بھی دوسرے کئی بے کار کارروائیوں کی طرح، جو دفاتر کی زینت کا ذریعہ ہو۔ تعلیمی کونسل کو بااعتبار بنانے کے لیے پہلے

محکمہ تعلیم کے اصلاح طلب معاملات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ سب سے پہلے مرکزی وزارت تعلیم کو لیجئے۔ بھٹو صاحب صوبوں کی خود مختاری کا ڈھول بجاتے تھے لیکن عملاً ان کے عہد میں ہر راستہ ان کی ذات پر ختم ہوتا تھا اور تمام اختیارات ان پر مرکوز تھے۔ مرکزی وزارت تعلیم کے ماتحت مندرجہ ذیل شعبے ہیں

| | |
|---|---|
| ۱۔ ابتدائی تعلیم | ۴۔ تکنیکی تعلیم |
| ۲۔ ثانوی تعلیم | ۵۔ کالجوں کی تعلیم |
| ۳۔ تعلیم اساتذہ | ۶۔ یونیورسٹیاں |

۷۔ دینی تعلیم (جس میں درس و تدریس امور بھی شامل ہے)

۸۔ تعلیمی امتحان

۹۔ آثار قدیمہ، عجائب گھر، لائبریریاں

۱۰۔ قومی یادگاریں

۱۱۔ کھیل، معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیاں

۱۲۔ ڈرامہ، لوک گیت وغیرہ ۱۳۔ وظائف وغیرہ

۱۴۔ پاکستان نیشنل سنٹر ۱۵۔ سمعی و بصری آلات

۱۶۔ تعلیمی اقتصادیات

۱۷۔ پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان

۱۸۔ نیشنل بورڈ برائے نصاب و نصابی کتب

۲۰۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پاکستان سٹڈیز

۲۱۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن ۲۲۔ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن

۲۳۔ نیشنل بک سنٹر ۲۵۔ بک بینک

۲۴۔ نیشنل سائنس کونسل ۲۶۔ نیشنل بورڈ آف اکنامک پلاننگ

۲۸۔ نیشنل اکنامکس کونسل ۲۷۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اکنامکس

ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اور کئی شعبے وزارت تعلیم سے متعلق ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ غالباً غور طلب باتیں یہ رہ گئی ہیں:

ا کئی ایسے شعبے ہیں جو کسی زمانے میں برطانوی دور میں صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں رکھے گئے ہیں، مثلاً ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، معلم اساتذہ، تعلیم بالغاں، تعلیم نسواں، دینی تعلیم، نصاب سازی وغیرہ۔ مرکزی حکومت صرف ہم آہنگی کا کام کرتی ہے اور ان کے لیے الگ بڑے شعبوں کی ضرورت نہیں۔

۲ مخصوص شعبے ایسے ہیں جو کسی خاص مقصد کی خاطر قائم کیے گئے ہیں، مثلاً سائنسی تحقیق کا ادارہ، اور کئی دوسرے ادارے جیسے قومی سائنس فاؤنڈیشن، نیشنل بک فاؤنڈیشن، نیشنل بک سنٹر، نیشنل بک کونسل وغیرہ۔ ایک مرکزی ادارہ یعنی سائنس کونسل اور دیگر سائنس فاؤنڈیشن کا الگ وجود ہی محض تکرار ہے۔ سائنس کونسل، بک کونسل اور انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن میں یکجا ہو سکتے ہیں۔ ان کا مقصد ایک ہے۔

جہاں تک رہنما اصولوں کا تعلق ہے اس کے لیے ایجوکیشن کونسل مفید ہو سکتی ہے اور مختلف کمیٹیوں کے ذریعے تمام کام نپٹائے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم وغیرہ کو مربوط کرنے کے لیے اور نصاب سازی کے لیے ایجوکیشن کونسل بھرپور خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے خود مختار ادارہ بنایا جائے اور رہنے دیا جائے۔ اگر اس کی حیثیت وزارت تعلیم کے ایک ذیلی شعبے کی ہو گئی تو تمام کام سمٹنے کے بجائے اور بھی پھیل جائے گا۔ ضروری ہے کہ کسی ایکٹ یا چارٹر کے ذریعے اس کی حیثیت متعین کی جائے، تاکہ سرکاری دخل اندازی یا سیاسی دخل ممکن نہ ہو۔ اس کے لیے بڑا ادارہ وزیر تعلیم کی نگرانی میں ہوگا، اور وزیر تعلیم بلحاظ عہدہ اس کا ایک رکن ہو سکتا ہے صدر نہیں۔ اس کے ارکان تعلیم کے مختلف شعبوں سے منتخب کیے جا سکتے ہیں جن کا اپنے میدان میں کم از کم پندرہ سالہ تجربہ ہو۔ بورڈوں یا یونیورسٹیاں گزشتہ برسوں میں اسمبلیوں کے ممبروں میں گھرے رہے ہیں جس کی وجہ سے تعلیمی ماحول کو مکدر کر رہی ہے۔ حکمران جماعت کے رکن ہونے کے باعث یہ لوگ رعب داب اور دھمکیوں سے جائز و ناجائز کام لیتے ہیں، یا ایسے نالائق عزیروں کو ملازمت دلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی لایعنی باتوں کی تائید اور تادیبی یونیورسٹی کے حکام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کہاں کے ایسے ہوں کہ سکیں ان کی بات کی تردید کریں یا ان سے اختلاف رکھ سکیں۔ یہ سیاست دانوں کی طرف سے بے جا رعب اساتذہ میں کمیں۔

ہمارے نزدیک ایجوکیشن کونسل کو بار کونسل اور میڈیکل کونسل کی طرح ہی ہونا چاہیے اور اس کے فرائض میں یہ امور شامل کرنے چاہییں:

۱ تعلیم کے میدان میں تحقیق۔ اب تک اس سے عام غفلت برتی گئی ہے۔ ایجوکیشن کونسل کو پرائمری سے لے کر اعلیٰ اور خصوصی تعلیم و تدریس پر کاوش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تعلیم جامد نہ رہ جائے۔ اس تحقیق کے نتائج کو مقررہ وقت پر سارے ملک میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنا چاہیے، اور نافذ کیے گئے اصولوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اس سے تعلیمی پالیسی خود بخود متعین ہوتی رہے گی اور اس میں رد و بدل بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جاری رہے گا۔ یہ طریقہ فرسودہ اور بے کار رہ گیا ہے کہ چند برسوں بعد ہر نئی آنے والی حکومت ملک میں نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کرتی پھرے۔ کل حشر شریف رپورٹ کی طرح ہوتا ہے۔

۲ تعلیمی انتظامیہ میں رد و بدل کی سفارش۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ایجوکیشن کونسل اساتذہ وغیرہ کے تبادلوں یا دخل اندازی کرے بلکہ مرکزی اور صوبائی شعبہ ہائے تعلیم کا جائزہ لے۔ بعض شعبے غیر ضروری ہیں، ان درجوں اور طبقوں کی کانٹ چھانٹ ہونی چاہیے۔ ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جانا چاہیے، اور اگر کوئی نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو نیا شعبہ قائم کرنے کی سفارش کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ مختلف شعبوں کے سربراہ اس کام کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً ڈائریکٹر آف لائبریریز ایسا شخص تو نہیں جسے لائبریری سائنس کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں، یا ٹیکسٹ بک بورڈ کا سربراہ اشاعت و طباعت کے رموز سے سراسر نابلد ہے، یا نصابی ورکشاپ کا سربراہ نصاب کی اہمیت سے ناواقف ہے؟

۳ کسی شخص کو استاد مقرر کرنے کا اجازت نامہ، اسی طرح اجازت نامہ محض بی ایڈ یا ایم ایڈ لینے سے کسی شخص کو پڑھانے کا لائسنس نہیں مل جانا چاہیے۔ ایجوکیشن کونسل ہر شخص کی استعداد دیکھ کر استاد مقرر کرنے کی اجازت دے، اور اگر کوئی استاد تعلیم کے معزز پیشے کی بدنامی کا باعث ہوتا ہے تو اس کا اجازت نامہ ضروری کارروائی کے بعد منسوخ کر دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اساتذہ کو انعام یا سزا کی تجویز بھی ایجوکیشن کونسل کی طرف سے ہونی چاہیے۔

۴ اساتذہ کے لیے معیار و اصول مقرر کرنا

۵ نصاب سازی کے رہنما اصول نافذ کرنا، اور غلط نصابی کتب یا درسی کتب کا سختی سے جائزہ

۶ مدارس وغیرہ میں داخلے کا معیار اور سرکاری اداروں میں نشستوں کا تعین

۷ رائج الوقت پر تحقیق اور مشورہ۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ عربی فارسی کی تعلیم سے کٹ کر کیا اساتذہ اور کیا طلبہ، زبان کی غلطیاں عام کر رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور بڑے خلوص سے غلط الفاظ لکھے اور بولے جا رہے ہیں۔ ایجوکیشن کونسل کو یہ فرض بھی سونپا جائے کہ وہ اس بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالے۔

۸ کالج کے اساتذہ کے لیے اکادمی کا قیام و نگرانی۔ یہ موضوع الگ اہمیت کا حامل ہے۔

ایجوکیشن کونسل اپنے فرائض کو خاص صورت میں پورے کر سکتی ہے جب یہ خود مختار ادارہ ہو اور تعلیم و تدریس کے معاملات اس کے مکمل اختیار میں ہوں۔ وزارت تعلیم اور صوبائی محکمہ جات تعلیم کو صرف محدود انتظامی معاملات سونپے جائیں۔ اس وقت اکثر معاملات میں DUPLICATION نظر آتی ہے۔ اوّل تو کئی کام وزارت تعلیم اور صوبائی حکومتیں یکساں طور پر سرانجام دیتی ہیں۔ ان کی الگ الگ حدود مقرر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کام آسان بھی ہو اور بچت بھی ہو۔

درسی نصاب سازی کو لیجیے۔ مرکزی حکومت کے پاس بھی یہ شعبہ ہے، صوبائی حکومتیں بھی یہی کام کر رہی ہیں۔ نصاب سازی کے الگ ادارے بھی موجود ہیں اور بورڈ اور یونیورسٹیاں بھی نصاب تیار کرتے ہیں۔ یہ سب کام آسانی سے ایجوکیشن کونسل کو دیا جا سکتا ہے۔ یہاں زیادہ ضروری ہے کہ سول سروس کے محکمہ تعلیم سے سیکرٹریٹ کو منسلک کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سیکرٹری تعلیم اور ڈائریکٹر تعلیم کا ایک ہی عہدہ تھا۔ اس سے صرف یہ کا پہلو نکلتا ہے، بلکہ خلاف ضرورت زیادہ عملہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ڈی پی آئی یا محکمہ تعلیم کا اعلیٰ ترین افسر ہے، وہ سیکرٹریٹ اور سیکرٹری تعلیم سے کم درجے کا ہے۔ سیکرٹریٹ کے ڈپٹی سیکرٹری جو عہدہ بڑے مگر گریڈ کے لحاظ سے چھوٹے افسر ہیں، وہ ڈی پی آئی پر حکم نافذ کرتے ہیں۔ اس سے خواہ مخواہ رنجش کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ڈی پی آئی سیکرٹری ہو اور وہ اساتذہ کے طبقوں سے لے سکتا ہے اور رابطہ بھی رکھ سکتا ہے۔ اس وقت ڈی پی آئی محض چٹھی رساں کا کام کر رہا ہے۔ ڈائریکٹروں سے مسئلہ اٹھا تو سیکرٹری کو رائے کے لیے بھیج دیا اور سیکرٹری نے حکم ڈائریکٹروں کو برائے تعمیل روانہ کر دیا۔ اس عمل کا نتیجہ ملکہ سکیں۔ استعمال ہے۔ اس قسم کی انتظامی بے راہ رویوں کا جائزہ بھی ایجوکیشن کونسل کو لینا چاہیے۔

**

# یادگار خطبہ جلسہ تقسیم اسناد

**محترمہ ... کا یہ یادگار صدارتی خطبہ اسلامیہ کالج پشاور میں کانووکیشن کے موقع پر دیا۔ موضوع کی مناسبت اور افکار کی عظمت کے سبب جامعہ پنجاب کے طالبین و طالبات کے استفادہ کے لیے پیش خدمت ہے**

عزیزانِ من!

آپ نے یہاں اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کر کے تعلیم حاصل کی ہے بڑی امنگوں کے ساتھ آپ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب آپ کو اپنی محنتوں کا پھل ایک ڈگری کی صورت میں ملنے والا ہے۔ ایسے موقع پر شاید آپ بہت سے رنگ رنگ مبارکباد سن چکے ہوں گے۔ آپ کے جذبات کی نزاکت کا مجھے پورا احساس ہے اور اسی لیے آپ کے سامنے اس بات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے ملال ہوتا ہے مگر میں آپ سے خیانت کروں گا اگر محض رسمی طور پر آپ کے جذبات کی رعایت کر کے وہ بات

آپ سے نہ کہوں جو میرے نزدیک حق ہے اور جس سے آپ کو آگاہ کرنا اس وقت اور اسی دن میں ضروری تھا، کیونکہ آپ اس وقت زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف جا رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کی اس مادر علمی کو اور خصوصیت سے اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ علمی کو درسگاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جاتے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل (DEATH CERTIFICATES) موت کے صداقت نامے ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک آپ کا انتظام کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا سر تک کاٹ دیا ہے۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اس قتل گاہ سے بھی جان سلامت لے کر نکل آئیں۔ میں یہاں ان صداقت نامہ موت کے حصول پر آپ کو مبارکباد دینے نہیں آیا ہوں، بلکہ آپ کا ہم درد ہونے کی وجہ سے جو ہمدردی فطری طور پر میں اس کے ساتھ رکھتا ہوں وہ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کے قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھر رہا ہو کہ کہاں کوئی ایسا ہے جس میں ابھی سانس لے رہا ہو۔

شاید میری یہ بات آپ کو مبالغہ کی راہ سے نکلی ہوئی محسوس ہو، اس لیے میں اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں کہ فی الواقع اس نظام تعلیم کے متعلق میرا نقطہ نظر یہی ہے اور اگر میں آپ کو اس کے ساتھ کچھ تفصیل کے ساتھ سمجھا دوں تو کیا عجب کہ آپ خود بھی مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

شاید آپ میں سے ہر شخص اس بات کو جانتا ہوگا کہ اگر کسی پودے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اکھاڑ کر لگایا جائے تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جہاں سے اسے لیا جا رہا ہے وہاں کی آب و ہوا، موسم اور مٹی اور جہاں اسے لگایا جا رہا ہے وہاں کی آب و ہوا اور موسم میں کتنا فرق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنوعی طور پر اس کے لیے وہی حالات پیدا کر دیے جائیں جو اس کی جائے پیدائش میں تھے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بیماری کی سی زندگی ہوگی۔ مگر یہ دوسرے کو تمام عمر بہتر نہیں رکھ سکتی۔ اس غیر معمولی صورت حال کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ بات بالکل صحیح ہوگی کہ کسی پودے کو اس کی اصل جائے پیدائش سے اکھاڑ کر اور ایک مختلف قسم کے ماحول میں لے جا کر لگا دینا دراصل اسے ہلاک کر دینا ہے۔

اچھا اب ذرا اس مسئلے پر ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے۔ ایک پودا اگر اپنی ہی زمین سے اکھاڑا نہیں گیا، اپنے ہی ماحول میں رہا مگر اسے کسی دوسری آب و ہوا اور موسم کے پودوں کے طریقوں سے تربیت دی گئی، اس

طریقوں سے تو اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی ہی زمین اور اپنے ہی ماحول میں اس کی طبیعت اس آب و ہوا اور اس موسم سے بے لگاؤ اور بیگانہ ہو کر رہ گئی اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اس میں اپنی جڑیں پھیلا سکے۔ اس ہوا اور پانی سے غذا حاصل کر سکے اور اس موسم میں پھل پھول سکے۔ اس اجنبی تربیت کی وجہ سے وہ ایسا ہو گیا جیسے کسی دوسری زمین کا پودا ہے اور جس ماحول میں لا کر لگا دیا گیا ہے اب وہ اس کا محتاج ہو گیا ہے کہ اس کے گرد مصنوعی فضا پیدا کی جائے، اور مصنوعی طور پر اس کی زندگی کا سامان کیا جائے۔ لیکن اگر ایسے ہم پودے کو اسی جگہ جہاں وہ پیدا ہوا ہے، اور جس مٹی میں اس کی جڑ ہے، چھوڑ دیں گے تو مرجھا کر رہ جائے گا۔

یہ مثال بھی ایک پودے کی ہے جو کسی ماحول میں لگا ہوا ہے لیکن دستکاری کا عالم ہے اور دوسرا عالم یہی ایک پودے کو اسی جگہ میں جہاں وہ پیدا ہوا ہے ایسے ماحول سے اجنبی بنا دینا اس سے عظیم تر ظلم ہے اور حسب ایک نہیں لاکھوں پودوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا ہو اور اسے کثیر التعداد پودوں کے لیے تباہ کاری کی سی ہمہ گیری کے ساتھ ہم شیپیا ممال ہو تو بے جا نہ ہوگا اگر اسے قتل کے بجائے قتل عام کہا جائے۔

خصوصی صورت حال کو مطالعہ میں لے کر آپ یہ دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان درس گاہوں میں آپ کے ساتھ بھی کچھ ہو رہا ہے۔ آپ اس سرزمین میں مسلم سوسائٹی کے اندر پیدا ہوئے ہیں۔ یہی زمین آپ کی زمین ہے اور یہی یہاں کا ماحول ہے جس کی پیداوار آپ ہیں۔ آپ کی نشوونما یہاں کے اسلامی ماحول میں ہونے کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں کہ اسی میں ملی، جس میں اسلامی آب و ہوا سے زندگی حاصل کریں۔ اس ماحول سے آپ کو جتنی زیادہ مناسبت ہو گی اسی قدر زیادہ آپ کی زندگی آپ کے لیے سود مند ہوگی اور اس قدر زیادہ آپ کی بہار میں آپ اضافہ کر سکیں گے۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ یہاں جو تعلیم اور تربیت آپ کو ملی ہے وہ آپ کے اندر پیدا کرتی ہے جو خیالات، عادات اور رجحانات آپ کے اندر پیدا کرتی ہے وہ خیالات اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں اور جس طرز فکر، رنگ، ذہنیت اور طریق زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں کیا وہ سب کچھ حل کر اس زمین، اس آب و ہوا اور اس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرز زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں ان سب چیزوں کو آگر کون سا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا جینا اور مرنا ہے؟ ان عوام کے ساتھ ہے جو آپ کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ آپ کی شخصیت کے ہیئے اجنبی ہے۔ کاش آپ کے اندر اتنی حس ہی باقی رہنے دی گئی ہوتی کہ آپ اس کی وحشت کو محسوس کرتے۔

آپ ایسا انسان سمجھ سکتے ہیں کہ تمام اسا کر صرف ڈگری سے ممتاز کرنے کا دعا یہی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے لیے کار آمد اور مفید شخص ہو۔ اس طرح تیار کی گئی ہو کہ جس سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے، وہ خود ہی ضائع ہوئی اور اس پر کاریگری بھی حصول مقصد کی بجائے ناکامی ہی کا ... حاصل نہیں ہوتی تو اس کاریگری نے کپڑے کو شاید نہیں لگائی

مقصد نہ ہونا ہے کہ وہ کھانے کے قابل ہو جائے۔ اگر وہ کھانے کے قابل ہی نہ ہوئی تو بیچنے والے صائع کو نہ کر سکا یا بالکل اسی طرح تعلیم کا معاملہ ہے۔ ہمارے سوسائٹی میں جن نوجوانوں نے تعلیم پا اور صلاحیتیں POTENTIALITIES کی عام صلاحیتیں تھیں، ان کو ناسلو کر کے ان کو پوری طرح نشو و نما دے کر ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ سوسائٹی سے انہیں جو ملا ہے وہ اس کے بعد اور کارآمد بنا کر اس کی کارکردگی کو آگے بڑھائیں اور ترقی کا ذریعہ بنیں۔ جو علم افراد کو ان کی صحیح اور اپنی حقیقی زندگی سے آشنا نہ کر سکے اور اس کے سوا آپ کو کچھ نہ دے سکے، وہ ایسی تعلیم ہے جس میں نقصان ہی ہے۔ دراصل اس کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے ہر ادارے کی طرف سے یہ تصور ایک نقطہ نظر کی شکل میں آتا ہے۔ ہر ادارہ اپنا یہ فرض سمجھتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے، اور یہ فیصلہ کرنے کے لیے اس کو دوسروں کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔ یہ ایسی روش ہے جس پر چل کر ہم وہ ساری ایسی چیزیں کھو دیتے ہیں۔

جب آپ کوئی کپڑا سلواتے ہیں اور وہ آپ کے جسم پر راست نہیں آتا تو اسے فوراً کاٹ کر پھینک دیتے ہیں، یا اسے دوبارہ بنواتے ہیں۔ اگر کپڑا کسی دوسرے کے کام آ سکتا ہے تو وہ خود بھی ناکارہ ہے اس کے سوا نہیں، کہ کسی کو بیچ دیا جائے۔ اس کی یہی کیفیت نوجوانوں کی ایک قطار کی بھی ہے جب تک کسی قسم کی راست رہنمائی نہ ملے، ان بے کار نوجوانوں کو جو ہماری جامعات سے نکلتے ہیں، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنی مقرر کردہ تعلیم سے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ سوسائٹی نے ان کو تیار کرایا ہے اس کے بدلے سوسائٹی ان سے یہ توقع بھی رکھتی ہے، اور وہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ذہن اور ان کی زندگی کے لیے مناسب ہو۔ اسی طرح سوسائٹی بھی علمی طور پر ان افراد کو بنانے کے لیے مناسب ہوں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنے کسی کام کا بنا کر زندگی کے لیے تیار کر دیا جائے اور وہ خود بھی اپنی زندگی کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سمجھتے کہ کہیں کسی جگہ ملازمت کر کے بس حساب بیٹھ جائیں۔ یہ وہ قوم ہے جو اپنی بہترین انسانی صلاحیتیں دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے، ہم دوسروں کو انسان دے کر روپیہ، کپڑا اور روٹی حاصل کرتے ہیں۔ آج یہ جو انسانی طاقت (MAN POWER) اور دماغی طاقت (BRAIN POWES) ہم کو خود اپنے کام کے لیے دی گئی وہ دوسروں کے کام آتی ہے۔ ان کے بیٹے کتنے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان بڑے شہروں میں جو قابلیت بھری ہوئی ہیں ان جوڑے جھکے سروں میں جو طرح طرح کی صلاحیتیں رکھتے ہیں جنہیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا، ان میں سے مشکل ایک دو فیصد ہمارے کام آتے ہیں، باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس سارے کی تجارت کو ہم تری کا نشان سمجھ رہے ہیں کیونکہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہمارا اصل سرمایہ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے، اس لیے اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں، بلکہ سراسر ٹوٹا ہے۔

مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں یا پا کر فارغ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے میں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد بھی متعین کیا ہے یا نہیں۔ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، بلکہ بیشتر اصحاب ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہو سکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں اور عملی حیثیت سے طے کرنے کی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا، ہماری دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا (GOAL) اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظام تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے۔ بلکہ زندگی کے لیے کسی نصب العین کی ضرورت ہی محسوس کر سکے۔ نصب العین کا یہ فقدان ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کو بے مقصد زندگی (AIMLESS) بسر کرنا تو حیوانات کا کام ہے۔ اگر آدمی بھی صرف اس لیے کر جیتا ہے کہ اپنی قوتوں کا مصرف کھانے پینے اور نسل بڑھانے کے سوا کچھ نہ رکھے تو آخر اس میں اور حیوانات میں کیا فرق باقی رہا؟

میری اس تقریر کا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو ملامت کروں۔ ملامت و قصور وار کرنے کا ہے، اور آپ قصور وار نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ اسی لیے میں دراصل آپ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو آپ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے جا رہے ہیں، خود ہی اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ آپ اس وقت کس پوزیشن میں ہیں۔ آپ ملت اسلامیہ کے افراد ہیں، یہ ملت کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جو کسی میں پیدا ہوا ہو وہ آپ سے آپ مسلم ہو۔ یہ محض ایک تمدنی گروہ (CULTURAL GROUP) کا نام بھی نہیں ہے جس کے سب محض معاشرتی حیثیت سے وابستہ ہونا مسلم ہونے کے لیے کافی ہو۔ دراصل اسلام ایک مخصوص نظام فکر (IDIOLOGY) کا نام ہے جس کی بنیاد پر ملت اپنے نام سے جڑ کے ساتھ منسوب ہوتی ہے۔ اس ملت کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد اس میں شامل ہوں، وہ اس کے نظام فکر کو سمجھتے ہوں، اس کی روح سے آشنا ہوں اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس روح کی عملی تعبیر و تفسیر پیش کرنے پر آمادہ ہوں۔ حقیقت کے ساتھ ملت کے اہل دماغ طبقے (INTELIGENTIA) کے لیے تو سب سے بڑھ کر اس علم اور اس عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہی طبقہ ملت کا رہنما اور پیشرو ہوتا ہے، اگرچہ ہر قوم اور ہر گروہ کو اس ضرورت ہے کہ اس کا اہل دماغ طبقہ اس کی مخصوص قومی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا ہو، لیکن ملت اسلامیہ کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ یہاں ہماری افراد کی اساس خاک سے نہیں، رنگ ہے نہ زبان نہ کوئی مادی چیز بلکہ صرف اسلام ہے۔ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہماری ملت کے افراد اور خصوصاً دماغ طبقے اسلامی طرز فکر اور اسلامی طرز عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کی علمی اور تربیت میں جو بھی اور جیسی کمزوری ہو گی اس کا عکس ہماری ملت کی زندگی میں خون کا کردار ہو گا اور اگر وہ اس سے بالکل خالی ہوں تو یہ دراصل ہماری موت کا نشان ہو گا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس سے یہاں کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا مگر کیا یہ واقع نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں اسلام کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی رہنمائی کے لیے نہیں، بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے۔ درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ اور دوسرے تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے، مگر آپ کو اسلام کے فلسفہ، اسلام کی اساس حکمت، اسلام کے اصول قانون، اسلام کے طرز سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفہ کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ ہی غیر اسلامی اور تمام بنیادوں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طرز پر سوچنے اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طور پر معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں، مگر وہ بے ربط اور بسا اوقات غلط اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اور زیادہ غیر مسلم ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ ذہنی طور پر غیر مسلم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح سے سمجھتے رہتے ہیں کہ اسلام حق و صداقت ہو گا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی محروم ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

# صدائے رفتہ

جامعہ پنجاب کے سابق طلبہ و طالبات کے اُس کلام
کا انتخاب — کہ —— "محمود" جسے چھاپ رہا۔
محمود

## عدیم راوی (دسمبر ۵۹ء)

پوانہ تیرا سر کا مگر لہر سی نہیں،

وہ کون سی ہے طرح جو اس شہر میں نہیں

میں بھر کے جام آرزو میں خواب دل تمام
وہ چیز ڈھونڈتا ہوں جو اس شہر میں نہیں

*

## شمیم نیازی (نومبر ۵۹ء)

اس طرح شب انتظار گزری ہے
کتنی بھی ساعت یہ بار گزری ہے
گھٹا ہے برف تصور کی وادیوں میں ابھی
مگر یہ لوگ مُصر ہیں بہار گزری ہے

## محمود شام (فروری ۶۲ء)

یہ باغ باغ انجمن، یہ پات پات منظر میں
کہاں ملیں گی پھر کہاں

ہوا سے کل کدھر کدھر
بکھر پڑے گی وقت کی گھناؤنی ہوا اسے ،،

*

## ممتاز حسین (نومبر ۶۰ء)

اک قافلہ دیوانوں کا منزل کو چلا تھا
صحرا کے غزالو! تمہیں کچھ اس کی خبر ہو
اے شب کی خموشی میں بھٹکتے ہوئے تارو
تم کون سی منزل کی طرف گرم سفر ہو

*

## عطاء الحق قاسمی (مئی ۶۶ء)

لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جاتی ہیں ظلمتیں
دن ڈھل رہا ہے مشرقی اقدار کی طرح
انسان بک رہا ہے کوڑیوں کے مول
سارا جہاں ہے مصر کے بازار کی طرح

## امجد اسلام امجد (دمشق ۱۹۶۶)

رکھیے قدم سنبھال کر اُلفت کے دیس میں
رہزن ہر ایک سمت میں رہبر کے بھیس میں

غم ساتھ لے لیا ہے کہ غربت میں کام دے
گڑ جیسے باندھ لے کوئی دہقاں کھیس میں

پتھر سمجھ کے راہ کا، ٹھوکر نہ ماریے
شیشہ ہوں ٹوٹ جاؤں گا ہلکی سی ٹھیس میں

*

## جلیل عالی (۱۹۶۸)

ٹمٹمانے لگے آنسوؤں کے دیئے جگنوؤں کی طرح
دل لُبھانے لگی ان دنوں شامِ غم رت جگوں کی طرح

شوق کے سلسلے، وقت کے فاصلے، درد کے رابطے
نقش ہیں سب کے سب یاد کی لوح پر حادثوں کی طرح

*

## نزہت الماس (۱۹۶۸)

نہ جانے کون سے رنگوں میں ڈھل چکا ہوتا
اس ایک رنگ سے پہلے جو بھا گیا مجھ کو

مرے شعور نے احساسِ آگہی بخشا
اور آگہی کا یہ احساس کھا گیا مجھ کو

## راشد حسین (۱۹۴۷)

اب کے تیز ہوا آئی تو بکھرے گی سب راکھ
رکھ نہ سکوں گا ڈھیر کی صورت پھر میں اپنی ساکھ

---

انکھ سے جیسے مدرا چھلکے منہ سے جھڑتے پھول
جو کوئی میری رادھا دیکھے جگ کو جائے بھول

---

من مندر کے سارے پتھر گائیں دیپک راگ
لمحہ لمحہ پگھلا جاؤں پھیلی جائے آگ

---

رام سا تھا، کرشن سا تھا، بنا تھا میں بھگوان
ایک جنم پہ ایسا آیا بن نہ سکا انسان

--- (دوہے)

*

## سلیم طاہر (۱۹۴۲)

ہم کو معلوم ہے کیا دستِ حنائی دے گا
قرب بوئیں گے تو وہ فصل جدائی دے

آئنہ سیلم کی بدن کانچ کا دل پتھر کا
اپنے شہکار کو کون اتنی صفائی دے

جتنے بیٹھے ہیں منڈیروں پہ شکستہ پر ہیں
اڑنے والوں کو بھلا کون رہائی دے

ہمایوں مجاہد
سابق طالب علم شعبہ معاشیات

# انتظار

یہ نظم کرنل صدیق سالک (جنگی قیدی) کی داستانِ قفس "ہمہ یاراں دوزخ" کے اقتباس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ——— مدیر

دیکھو ذرا قریب سے
وہ دھندلکے میں شام کے
کسی کی تازہ قبر پر
وہ سر جھکائے کون ہے ؟
وہ منہ چھپائے کون ہے ؟
آؤ ——— سناؤں میں تمہیں
وہ حسرتوں کی داستاں
ان آنسوؤں کا وہ چلن
جو آنکھ سے نہ بہہ سکے
ماں متا کی وہ تڑپ
جو بے کلی نہ ہو سکی
سکوت کے فراق میں
وہ رات بھر نہ سو سکی
شاید یہ بات سوچ کر

وہ اشک نہ بہا سکی
کہ ایک اشک بہہ گیا
تو اس کے بیٹے کا عزم
عزم ——— جو جوان ہے
مؤرخوں کے قلم نے
ابھی تو ہے ابھارنا ———
صحافیوں کے قلم نے
ابھی تو ہے اچھالنا
اس ذرا سی چوک پر
وہ رائیگاں ہو جائے گا
شاید وہ سوچتی رہی
وہ ماں تو ہے مگر اسے
نہ اک "صدیق" عزیز ہے

دشمن پرائے دیس میں
کتنے صدیق اور ہیں
وہ قید ہیں مگر انہیں
غم قفس نہ خوف ہے
اکثر ہوا گزر ہی پر
اندھی کالی بدلیاں
دامن میں وحشتیں لیے
پکارتی رہیں اسے
اتنی مہیب پُرخطر
سپاہیوں کے غول میں
وہ پُرسکون ہی رہی
وہ مدتوں سے منتظر
اک آرزو دبائے ہوئے
گاؤں کی کچی سڑک پر
ہر آنے والا دیکھتی
وہ اپنا بیٹا دیکھتی
بڑھی تھی شاید تھک گئی
تھک گئی تو کیا ہوا
اک روز حادثہ ہوا
وہ اپنے چار سو کھڑے
دھندلکے پھیر کے دیکھتی
پتھرا گئی ——— پتھرا گئی
اور اس کی پتھر آنکھ میں
اس وقت بھی تھکا تھکا
کسی کا انتظار تھا ———

# طالب علم ، دو پہلو

صلاح الدین شمسی (شعبہ کیمیا)

اگر علم تن پروری کے لیے حاصل کیا جائے ، تو یہ سانپ کی طرح ہلاکت خیز ثابت ہوگا اور اگر اس کی تحصیل قلب و نظر کی اصلاح کے لیے ہوگی ، تو یہی علم انسان کا دوست اور زندگی کی راہوں میں رہنما اور معاون ثابت ہوگا ۔ یہ شعر مشرق کے عظیم ترین مفکر شاعر مولانا روم کا ہے ۔ اس شعر میں حقائق کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پوشیدہ ہے ۔ ذرا غور کریں کہ وہی علم جو دوست اور زندگی کی راہوں میں ہمارا رہنما ثابت ہوگا ، کیونکہ سانپ سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے ۔ تو یہ مسئلہ بالکل آسان ہو جائے گا کہ اگر انسان علم کا مقصد محض تن پروری سا یہ کس طرح سانپ سے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے ۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تن پروری دولت کے حصول کو نصب العین بنائے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ لہٰذا جب انسان دولت کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے اور ہر چیز کو دولت ، زر ، دولی اور پیٹ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے ، تو اس کی انسانیت فنا ہو جاتی ہے ۔ وہ دولت کا پرستار ہو کر تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرنے پر اتر آتا ہے اور حرام و حلال تمام قیود کو مٹا ڈالتا ہے ۔ نہ اسے سود کھاتے شرم آتی ہے ، نہ شراب خانے اور قحبہ خانے قائم کرتے ہوئے شرماتا ہے ۔ نہ گھوڑ دوڑ کے مقابلوں ، رمی اور شطرنج کے کھیلوں میں اسے کوئی اخلاقی خرابی نظر آتی ہے ۔ یہاں تک کہ یتیموں کا مال کھا جانے اور بیواؤں کا ورثہ غصب کرتے ہوئے بھی وہ حجاب محسوس نہیں کرتا ۔

اس میں شبہ نہیں کہ دولت حاصل کر کے انسان اونچے محلات میں رہ سکتا ہے ، اپنا گھر ہر طرح کے سامانِ آرائش سے آراستہ کر سکتا ہے ، اپنی خدمت کے لیے باوردی ملازمین کی جماعت رکھ سکتا ہے ، اپنا دسترخوان انواع و اقسام کے خوش ذائقہ اور لذیذ کھانوں سے سجا سکتا ہے ، اپنی تن پوشی کے لیے ہزاروں سوٹ سلوا سکتا ہے ، اسی طرح وہ تعلیم سے دولت کما کر بڑی بڑی ملیں اور کارخانے بنا سکتا ہے ، بینکوں کی فلک بوس عمارات اور زبردست تجارتی منڈیاں قائم کر سکتا ہے ۔ صاف اور شفاف عمارات تعمیر کر سکتا ہے ، بڑے بڑے رفاہی پروجیکٹ لگا سکتا ہے ، لیکن ان چیزوں کے باوجود وہ خوشحالی نہیں خرید سکتا ۔ وہ معاشرہ جہاں ایسے افراد موجود ہوں جو علم کو صرف دولت کا ماحصل سمجھتے ہوں ، زرِ تعاون سے سرشار نہیں ہو سکتا ۔ بحیثیت قوم ملک میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا ۔ سب کے لیے یکساں طور پر ترقی کی راہیں کشادہ نہیں ہو سکتیں ۔ سب زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے ۔ مظلوم انصاف حاصل نہیں کر سکتے ، کیونکہ علم کا صحیح اثر معاشرے کی بنیاد مہر و الفت اور عدل کے بجائے حق تلفی ، لذت اور مال و زر کی فراوانی پر قائم ہوتی ہے ۔ نتیجہ کے طور پر معاشرہ میں کہیں تشاییلاک کا کردار ابھرتا ہے ، کہیں بہیمیت پیدا ہوتی ہے ، کہیں تشدد کی سنگدلی رنگ دکھاتی ہے اور کہیں سود خوار مہاجن کا روپ سامنے آتا ہے ۔ اس سے نہ صرف وہ نسل تباہ ہو جاتی ہے ، بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے نہیں بچ سکتیں ۔

حقیقت جو ان ساری باتوں کے بعد سامنے آتی ہے وہ یہی کہ قوم کے عروج و زوال اور امن کے بقا و استحکام کا انحصار تعلیم پر ہے ۔ صحیح تعلیم کے ذریعے ہی ایک قوم اور ایک فرد ترقی کی اعلیٰ بلندیوں سے ہمکنار ہوتی ہے اور تعلیم کے فقدان یا اس کی غلط روش کی وجہ سے ذلت کے گہرے غاروں میں گر جاتی ہے ۔ یہ غلط تعلیم ہی ہے جس کی مدد سے تنزل میں فکری کی صفات اور رشتہ اپنی پیدا کی جا سکتی ہیں اور نئے فکری سانچے میں ڈھلنے کے بجائے ذاتی اور حق لایسمع کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ نتیجہ کے طور پر تعلیم کی مثال اس ابرِ باراں کی سی ہو جاتی ہے جو اگر کسی زرخیز علاقے میں برسے تو سبزہ اگ جاتا ہے ۔ رنگ برنگے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا کو معطر کر دیتے ہیں اور یہی ابرِ باراں جب کسی غلاظت کے ڈھیر پر برستا ہے ، تو بدبو کے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں یا علم اس تلوار کی سی ہے جو ایک ڈاکو کے ہاتھ میں آ کر دنیا کے لیے مصیبت کا سامان بنتی ہے ، لیکن مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھوں میں آ کر رحمت کا نشان بن جاتی ہے ۔

لہٰذا تعلیم کے حصول میں اگر دولت اور شہرت کو ایک ثانوی چیز تصور کر کے ایک اچھا کردار بنایا جائے ، تو ہر معرکہ سر کیا جا سکتا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ قومیں محض کردار کی بلندی سے پروان اور غالب آتی ہیں اور دولت کی کمی اور مادی وسائل کی قلت کے باوجود کردار کے بل بوتے پر کامیاب ہوتی رہی ہیں ۔ اخلاقی اوصاف سے مسلح ہو کر میدان مارا جا سکتا ہے ۔ بڑی بڑی مشکلات ہمت کے سامنے ہوا ہو جاتی ہیں ۔ پیچیدہ سے پیچیدہ قومی مسائل اور معمے کردار کے زور سے حل ہو جاتے ہیں ۔ جو قوم کردار کی دولت سے مالا مال ہو ، وہ دولت اور مادی وسائل کی کمی کے باوجود غالب و سرفراز رہتی ہے ۔ اپنے اخلاقی فضائل سے وہ اپنے اندر ایک ایسے معاشرے کو جنم دیتی ہے جو اخوت ، مساوات اور عدل کی بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے جنت کا سماں پیدا کر دیتا ہے اور مولانا روم کے بقول علم انسان کا دوست اور زندگی کی راہوں میں رہنما اور معاون ثابت ہوتا ہے ۔ لہٰذا علم کا مقصد محض تن پروری انسانیت کا تنزل ہے اور انسان کو قعرِ ذلت میں گرا دیتا ہے ۔ جب کہ صحیح حصول انسانیت کی معراج اور عرفان و ایقان کے بام تا بلند کنگرے سے جا ملتا ہے ۔

# مخلوط نظامِ تعلیم

طاہرہ عصمت (شعبہ تعلیم و تحقیق)

مخلوط تعلیم اُس نظامِ تعلیم کا ایک جزو ہے جو برِّ صغیر میں انگریزوں نے اپنی تہذیب و معاشرت کو مستحکم کرنے کے لیے نافذ کیا تھا۔ مسلمانوں میں مخلوط تعلیم کا باقاعدہ آغاز تقسیم سے پندرہ بیس سال قبل سے ہوا اور مسلمان خاندانوں میں دیگر معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کا رواج بھی بڑھتا چلا گیا۔ آزادی کے بعد بجا طور پر اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق عورتوں کے لیے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کر کے اُن کے لیے معقول و مناسب تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ جس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لے کر اور جس کے احکامات نافذ کرنے کا عہد کر کے یہ زمین حاصل کی گئی تھی۔ اس کے احکام اس باب میں مشتبہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح نظامِ تعلیم کے دائرے میں بھی اُسی رُخ پر حرکت جاری رہی جس رُخ پر انگریز بنیادیں ڈال گئے تھے اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ ذہنوں سے مخلوط تعلیم کے ایک برائی ہونے کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے تعلیم کے ایک ناگزیر جزو کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بڑے شہروں کی حدود سے آگے نکل کر اب اس کا رواج قصبات اور چھوٹے شہروں میں بھی ہونے لگا ہے اور ہمارے معاشرے کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

مخلوط تعلیم کے جو نتائج رونما ہوئے وہ قوم کے ہر بہی خواہ بالخصوص تعلیم کے کارپردازوں کے لیے فکرمندی کا باعث ہیں۔ طلباء اور طالبات دونوں ہی کی دلچسپی اُن کے اصل مقصد یعنی حصولِ تعلیم سے کم ہو گئی ہے۔ معیار گر رہا ہے۔ کامیاب ہونے والوں کا تناسب مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے اور درس گاہوں میں نظم و ضبط ایک مستقل مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری طرف درس گاہوں کے ماحول پر، طلباء و طالبات کے سیرت و کردار پر اور اس کے ذریعے پورے معاشرے پر اس کے مضر اثرات ہو رہے ہیں اور تیسری طرف اس کی وجہ سے عورتوں کے لیے ان کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب نصاب کی ضرورت کے احساس کے باوجود اس کے لیے عملاً کچھ نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے باشعور اور سنجیدہ طبقے کے لیے یہ کبھی قابلِ قبول نہ تھی۔ مسلمانوں کا معاشرتی نظام اور اُن کا مزاج اُسے کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا لیکن عمل کی دنیا میں اس کی پشت پناہ ایک غالب تہذیب اور حکومت کی طاقت تھی۔ جس طرح زندگی کے اور دائروں میں ہم مغلوب ہوتے گئے اور مغرب کی تقلید کرتے گئے، اسی طرح مخلوط تعلیم کو بھی ہم نے نتائج کی پروا کیے بغیر نظامِ تعلیم کا جزو بنا لیا۔

اصولی اور نظریاتی بنیادوں پر بھی ہماری موجودہ دور کی تحقیقات کی روشنی میں بھی مخلوط تعلیم دینے کا ایک غلط اور نامناسب طریقہ ہے اور شدید مُضر اثرات کا باعث ہے لیکن پاکستان کے حالات میں اس کو ملکی و قومی مفاد سے کھُلی کھُلی بدخواہی کے مترادف ہے۔

ہمارا ملک کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، ہماری تہذیبی اقدار کے پس منظر میں مخلوط تعلیمی اداروں میں عورتوں کو اس طرح کی مساوی حیثیت کبھی بھی نہیں مل سکتی، جیسی کہ مخلوط تعلیم کے نظریے کے تحت ملنی چاہیئے، بلکہ وہ ایک الگ گروہ اور حقیقتاً ایک کمتر و حقیر گروہ کی حیثیت سے تعلیم حاصل کریں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو وہ مخلوط تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند نہ ہو سکیں گی اور دوسری طرف علیحدہ تعلیم کے اپنے فوائد سے بھی محروم رہیں گی۔ اس طرح یہ خود عورتوں کے لیے سراسر نقصان کا سودا ہے۔

پھر غلط تعلیم عورتوں کی تعلیم کی ترسیع و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مسلمانوں کا مزاج، کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لی جائے، بحیثیت ایک قوم کے کبھی بھی مخلوط تعلیم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علیحدہ یونیورسٹی نہ ہونے کی بنا پر ایک بہت بڑی تعداد مخلوط تعلیم والے کی نسبت اعلیٰ تعلیم سے محروم رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اگر فی الواقع تعلیمِ نسواں کو ملک کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایک ایک گھر میں اس کا رواج پیشِ نظر ہے، تو اگر یہ ہے تو اعلیٰ ترین مراحل تک ان کے لیے علیحدہ اداروں کا بندوبست کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔ عورتوں کے لیے ان کے فرائض ذمہ داریوں کے مطابق کوئی علیحدہ نصاب نہیں ہے بلکہ ٹھیک وہی نصاب جو مردوں کو ملازمتوں کے لیے تیار کرتا ہے عورتوں کے لیے بھی رائج ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کی بہت بڑی وجہ خود مخلوط تعلیم ہے۔ اگر اس کا رواج ختم کر دیا جائے تو عورتوں کے لیے الگ تعلیمی نصاب مرتب کرنے کی ضرورت عمل نتائج دے گی۔ ان نصابات کی افادیت اپنی جگہ تعلیمِ نسواں میں فروغ کا باعث ہوگی۔

تعلیم کی اصل افادیت یہ ہے کہ طالب علم اپنی بعد کی زندگی میں اس تعلیم کی بنا پر ملک و قوم کی خدمت زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکے۔ قوم کی ترقی کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اس مد پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہیں اور اسے ایک طرح سے سماجی سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے۔ ارباب کار کا یہ فرض ہے کہ اسے قوم کے بہترین مفاد میں لگائیں اور یہ دیکھیں کہ اس کی تضیع نہ ہو۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والی طالبات کی ایک انتہائی قلیل تعداد ان کاموں کو انجام دیتی ہے جس کے لیے یہ تعلیم ان کو تیار کرتی ہے۔ بالعموم خواتین ملازمت کا پیشہ اختیار نہیں کرتیں اور جو کرتی ہیں تو ان کی بھی ایک معتد بہ تعداد شادی اور گھر گرہستی کے بعد ملازمت چھوڑ دیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہماری قومی دولت کا کوئی تعمیری اجتماعی دائرہ کار میں نہیں مل رہا اور یہ دولت مسلسل ضائع جارہی ہے۔ پھر کیا یہ دانشمندی نہیں ہے کہ اس سیدھی سیدھی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے اور خواہ مخواہ طالبات پر طلبہ کے نصاب کے تحت تعلیم پر جو مسلسل دولت ضائع ہو رہی ہے اس کے بچاؤ کی فکر کی جائے۔

یہ بے پناہ ضیاع اس پس منظر میں اور بھی سنگین ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ فی الوقت ہمارے ملک میں جو تعلیمی سہولتیں ہیں وہ مردوں کے لیے بھی کافی نہیں۔ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد قابلیت، صلاحیت حتیٰ کہ ذرائع و وسائل رکھنے کے باوجود بھی محض نشستوں کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے، گویا صورت حال یہ ہوئی کہ ہر طالب علم خاتون ایک مرد طالب علم کی جگہ تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اپنے اوپر وہ ساری رقم خرچ کر رہی ہے، جو درحقیقت مرد طالب علم کا حق ہے اور اس طرح ملک کو اس فائدے سے محروم کر رہی ہے جو اس کے بجائے کسی مرد طالب علم کی تعلیم سے حاصل ہو سکتا تھا۔ قومی تعمیر کے ایک ایسے دور میں جس میں ہمیں تربیت یافتہ افراد کی سخت ضرورت ہے اور ہر شعبہ میں ہمارے پاس ماہرین کا فقدان ہے۔ ان طلبا کو تعلیم سے محروم کرنا قومی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

پھر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں ہمارا معیار تعلیم برابر گر رہا ہے اور اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس کی ایک اہم وجہ مخلوط تعلیم بھی ہے۔ یہ بنیادی طور پر طلبا اور طالبات دونوں کی توجہ اصل تعلیم سے ہٹانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ طالب علموں کا مقصد فریق مخالف کی توجہ کا مرکز بنا ہوتا ہے اور اکثر حالتوں میں تو تعلیمی اداروں کی تمام تر سرگرمیوں کا محور ہی یہ چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو تعلیم جو ذہنی یکسوئی کا تقاضا کرتی ہے شدید قسم کے ذہنی انتشار اور عدم توجہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ طلبا اور طالبات کے ساتھ اساتذہ کا رویہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر مخلوط تعلیمی اداروں میں اساتذہ طلبا اور طالبات کے ساتھ مساویانہ رویہ نہیں رکھتے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ چند جنسی ہیجان رکھنے والے اساتذہ کی وجہ سے پورے طبقے اساتذہ کا وقار مٹی میں مل جاتا ہے جب کہ اس سے ہماری تعلیم بھی براہ راست متاثر ہوتی ہے۔

**

---

## بقیہ: البدری ستارے

"البدر نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے، یہ ایک طویل داستان ہے، صرف اتنا کہوں گا کہ البدر کے ہوتے ہوئے پوری سب ڈویژن میں کسی تخریب کار یا ہندوستانی ایجنٹ کا گھسنا محال تھا۔ ضلع موسن شاہی میں مقیم بریگیڈیر صاحب کو جمال پور کی البدر پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر کہا کرتے: میں ہندوستان کو چیلنج کرتا ہوں کہ جمال پور سب ڈویژن میں تخریب کاری کرے۔ رفتہ رفتہ البدر ہر ضلع میں منظم ہو گئی۔ یہاں تک کہ صوبے بھر میں رضاکار تنظیم وجود میں آگئی جن میں اکثریت البدر گروپ کی تھی۔ ان میں سے اکثر نوجوان طلبا تھے جو عسکری فرائض انجام دے رہے تھے۔ بھاری تعداد کالجوں کے اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ اور مدارس میں پڑھنے والوں کی تھی۔ فوجی حکام، طلبہ کو البدر میں شامل کرنے سے پس و پیش کرتے کہ ان کی تعلیم میں حرج ہوگا لیکن طلبہ کا موقف یہ تھا کہ ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے، اگر پاکستان ہی نہ رہا، تو ہماری تعلیم ...

کے باوجود کسی موقع پر انہوں نے کوتاہی نہیں برتی۔ ایسے ہی دو سگے بھائی شیرپور کی بٹالین میں تھے، ان میں سے ایک، ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا۔ دوسرے بھائی کو چھٹی دی گئی تاکہ اس کے جنازے میں شریک ہو سکے۔ وہ جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً ہی بٹالین میں حاضر ہو گیا۔ اس کے کمانڈر نے پوچھا "چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کیوں آ گئے؟" اس نے جواب دیا: جس فرض کی تکمیل کے لیے میرے بھائی نے اپنی جان قربان کی، وہ میرے گھر میں بیٹھ رہنے سے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب اس کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔ اس عظیم فرض کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

البدر کے سرفروش آٹھ ماہ تک قوم اور ملک کی بقا کے لیے اپنے فوجی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ مسلمان خواہ بنگالی ہو یا سندھی، پنجابی ہو یا پٹھان، حق کے لیے ایک جسم و جان بن کر لڑتا ہے۔ ان میں سے سینکڑوں نے اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ اپنی جان قربان کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ ... موجزن ہے جیسے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں میں تھا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد البدر پر کیا گزری اور کیا ... کی ہر انصاف پسند آنکھ پر نم ہے، بلکہ البدر کو مٹا کر انہیں شکست نہیں دی جا سکتی۔ سچائی پر مرنا کبھی شکست نہیں کہلاتی۔ انہوں نے سچائی پر قربان ہو کر ایسی عظیم الشان فتح حاصل کی کہ قیامت تک ہر ظالم ایک سچے انسان سے خائف رہے گا۔

# پاکستان، عورت، تعلیم

کوکب صدیق (انڈیانا یونیورسٹی، امریکہ)

خواہشات سے حقائق تک کا سفر بہت ہی طویل اور کٹھن ہوتا ہے۔ ذاتی میلانات، خاندانی رسوم اور طبقاتی تاثرات کو حاوی ہوکر انسان اصلاح کی جو کوششیں بھی کرے معاشرے کی سطح پر عموماً ان کا عکس پیدا کرکے ختم ہو جاتی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں اگر ہم کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، تو ہمیں واضح طور پر معلوم کرنا ہوگا کہ ہمارے ملک کے حقائق کیا ہیں۔ اگر ہم یونیورسٹی کے طالب علم ہیں، تو اس کا قوی امکان ہے کہ ہمارا تعلق کسی متوسط طبقہ سے ہوگا۔ ہم کسی افسر، تاجر، زمیندار، اعلیٰ ملازم، کارخانے دار، معلم وغیرہ کی اولاد ہوں گے۔ اس خاندانی پس منظر کی وجہ سے ہماری خواہشات اور منصوبے متوسط طبقے کی ضروریات اور تمناؤں کی عکاسی کریں گے۔ یہ صورت حال کسی فلسفہ یا نظریہ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی فطری صورت حال ہے کہ وہ جس ماحول میں پلتا بڑھتا ہے ویسے ہی اثرات قبول کرتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں پاکستان کا معاشرتی تجزیہ مقصود نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان کی آبادی اسی فیصد سے زائد حصہ کسانوں، مفلسوں، مزدوروں اور ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا متوسط طبقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہم اپنے منصوبے بنائیں جن کا فائدہ زیادہ تر متوسط طبقہ کو ہو تو مجموعی طور پر پاکستانی قوم کو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس تلخ حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ متوسط طبقے کی جو ترقی ہوئی ہے اور ان کی تعلیم میں اضافہ سے پڑھے لکھے لوگوں میں بیروزگاری بڑھتی ہے اور ملک چھوڑ کر باہر جانے کا رجحان تقویت حاصل کرتا ہے۔ اگر اس متوسط طبقہ کی خواتین بھی تعلیم حاصل کریں، تو ایسے خاندانوں کے لیے اونچے طبقہ میں پہنچنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس محدود سے میدان میں چاہے کتنی بھی کوشش کی جائے اس سے ملک کا مستقبل نہیں بدل سکتا۔ عمرانی سائنس کے ماہرین نے پاکستان جیسے دوسرے ممالک کا جو معاشرتی تجزیہ کیا ہے اس کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ان ممالک میں تعلیم امیر کو امیر تر بنانے کا باعث بنتی ہے اور اوپر کے طبقات کی قوت بڑھاتی ہے۔ تعلیم اس قسم کے معاشرے میں غریب اور امیر کو ایک دوسرے سے مزید دور کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعلیم بذات خود کوئی برائی ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک تعلیم اور قوم کے مجموعی مفاد کو یکساں نہ کیا جائے تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ اسے معاشرتی اصلاح کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔

وہی اسلامی تحریک کامیاب بھی ہو سکتی ہے جو کہ اسلام کا پیغام عوام تک پہنچا سکے۔ اگر تحریک کے اثرات متوسط یا اونچے طبقوں میں محدود ہو کر رہ جائیں تو ایسی تحریک قوم کے مستقبل کو نہیں بدل سکتی۔ اس کی وجہ قرآن پاک سے آسانی معلوم ہو جاتی ہے۔

> "اے محمد، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے۔" (الاعراف ۱۵۸)

جب کہ رسول مقبولؐ کو سب انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے، تو ایسی مسلم تحریک کو کامیاب کیونکر سمجھا جا سکتا ہے جو کہ رسولؐ کے انقلابی پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچانے سے گریز کرے اور ایک طبقہ میں اپنی محنت صرف کرتی رہے۔ اسلام ہر ایک کے لیے ہے۔ قرآن اس پر بار بار زور دیتا ہے۔ اوپر کی آیت میں جہاں پیغمبر پر زور دیا گیا ہے اسی طرح نبی کے امی ہونے کا خاص ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی امی کو پڑھا رہا تھا جس کا کام آگے یہ تھا کہ تمام انسانوں کو پڑھائے۔ سورہ سبا میں بھی نبوت کے عام ہونے کا ذکر ہے

> "اور (اے نبی) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں" (سبا ۲۸)

قرآن کا حامل رسولؐ تمام انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام جہانوں کے لیے بھیجا گیا تھا

> "اے نبی، ہم نے تو تم کو تمام کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے" (الانبیاء ۱۰۷)

اب اگر ہمارا پیغام کوٹھی والوں اور کار والوں، ملکیت والوں اور سفید پوشوں تک تو پہنچ رہا ہو لیکن ہم پسے ہوئے طبقوں، خاک اور دھول میں کام کرنے والوں، جن کے پاس دنیا میں سوائے دو بازوؤں کی طاقت کے اور کچھ بھی نہیں، سے ہاتھ ملانے اور انہیں ساتھ بٹھانے سے ہی جھجک محسوس کرتے ہوں، تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ہم اسلام اور اپنے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔

پاکستانی قوم کے پسے ہوئے طبقوں میں سب سے مظلوم طبقہ اس قوم کی عورتوں کا ہے اور یہ طبقہ تعداد میں ملک کی تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہے۔ مسلمان عورت جس قسم کے افراط و تفریط کی شکار ہے اس کی طرف اس صدی کے مجدد نے تقریباً بیس سال قبل اشارہ کیا تھا۔ پردے کی شرعی حدود معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے تو اس قدر آزادی اختیار کر لی کہ اپنی عورتوں کو نیم برہنگی کی حد تک لے گئے اور دوسرے گروہ نے انہیں گھر کی چار دیواری میں اس طرح قید کر دیا کہ صوبہ بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کے وقت بھی ان کی عورتیں ڈولی کے بغیر گھر سے نہ نکل سکیں۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں" (روداد حصہ پنجم صہ ۱۲) ان دو گروہوں کے علاوہ بے شمار مسلمان عورتیں دیہاتوں میں کام کرتی ہیں اور آدمیوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن ان کی حالت تقریباً مردوں کی لونڈیوں کی سی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ عورتیں اسلام میں اپنے مقام اور حیثیت سے ناواقف ہیں۔ ۲۰ سال قبل اسی مجدد

نے تحریک اسلامی سے وابستہ خواتین کو ہدایت دیتے ہوئے حصولِ علمِ دین پر زور دیا تھا

"اوّلین ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دین سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کریں۔ نہ صرف قرآن سمجھ کر پڑھیں، بلکہ کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ بھی کریں۔ نہ صرف دین کی بنیادی باتوں اور ایمان کے تقاضوں کو جانیں، بلکہ یہ بھی معلوم کریں کہ آپ کی ذاتی زندگی، گھر کی زندگی، خاندان کی زندگی اور عام معاشرتی زندگی کے بارے میں دین کے احکام کیا ہیں۔ احکامِ دین سے عورتوں کی عام ناواقفیت ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی بدولت مسلمان گھروں میں غیر شرعی طریقے رائج ہوئے ہیں، بلکہ جاہلیت کی رسموں تک نے راہ پالی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے خود اسی خامی کو رفع کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے" (ہدایات صفحہ ۵۳)

یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے حصولِ علم ہر مسلمان عورت پر فرض ہے، حدیث میں آتا ہے کہ طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" (بیہقی) اگر اس وقت ملک کی عورتوں کی اکثریت طلبِ علم کے بنیادی ذرائع سے محروم ہے، تو ایسی کیفیت میں ہی زمانہ اسلامی انقلاب کا عملاً لانا بہت کٹھن کام ہے۔

پاکستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے کے لیے معاشرتی تجزیہ بہت اہم ہے تاکہ واضح طور پر معلوم ہو سکے کہ پاکستانی عورت کس حد تک مظلوم ہے۔ اگر ہم مغرب زدہ طبقہ کے ردِعمل کا شکار ہو کر موجودہ رسم و رواج کو اور عورت کی موجودہ صورتِ حال کو اسلامی سمجھنے لگیں، تو یہ اسلام کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مغربیت زدہ طبقہ جو محض پروگرام عورت کی ترقی کے نام پر پیش کرتا چلا آ رہا ہے ایسا نہ ہو کہ ہم محض اس کی تردید میں لگے رہیں اور خود کوئی مثبت پروگرام نہ پیش کر سکیں۔ مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے رنگ میں رنگی جائے، لیکن یہ نہیں بھولنا پڑے گا کہ یہ رنگ دقیانوسی روایات سے بالکل مختلف ہے اور مغربیت زدہ آزادی سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان عورت نہ تو کسی کی لونڈی بن کر رہے اور نہ صنعتی کی گڑیا۔ اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں ایک انسان کی تمام خوبیوں کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔ مولانا مودودی نے تشکیلِ پاکستان کے موقع پر برملا کہا تھا کہ "اس وقت تو ملک میں ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ عورتوں کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ بوقتِ ضرورت اپنی حفاظت خود کر سکیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خود منتقل ہو سکیں اور مصیبت کے وقت مردوں کے لیے بار اور رکاوٹ بننے کی بجائے ان کی قوت میں اضافہ کرنے کا موجب ہوں" (روداد حصہ پنجم)۔ اور یہی بات یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد اب تک بھی بعینہٖ حالات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کی تعلیم میں انفرادیت ہو تاکہ وہ اس ترقی پذیر ملک میں اپنا مثبت رول ڈال سکیں۔

**

---

## بقیہ

## موت کے صداقت نامے

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ جو تربیت آپ کو میسر آتی ہے جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں اور عملی زندگی کے جن مراحل سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیریکٹر اور اسلامی طرزِ عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو عملاً غیر اسلامی تربیت دی گئی ہو وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں۔ ان پر وحی نازل تو نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علمِ دین ڈال دیا جائے وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں، بلکہ ان درس گاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت قائم کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ میرا وجدان ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان درس گاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سوسائٹی میں جنم لیا ہے جس کے ہر پہلو پر ظلم باقی ہے جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے، اس کے لیے آپ بے کار بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں بنایا گیا، بلکہ دراصل آپ کو باضابطہ اور منظم طریقے پر ایسا بنا دیا گیا ہو کہ بلا ارادہ آپ کی ہر حرکت اس ملت کے بیڑے کا سامان بنے حتیٰ کہ آپ کی خیر خواہی کے لیے

بھی کچھ کرنا چاہیں تو اس کے حق میں مضر ثابت ہو۔ اس لیے کہ آپ نہ صرف اسلام کے اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے ہیں اور آپ کی پوری دماغی تربیت اس نقشہ پر کی گئی ہے جو صاف اسلام کے نقشہ کے بالکل برعکس ہے۔

اسی بنا پر میں کہوں گا کہ اگر آپ کو پوری طرح احساس ہے کہ فی الواقع کس قدر خطرناک حالت کی طرف آپ کو بار بار زندگی کی طرف جانے کے لیے چھوڑا جا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ تلافی مافات کی کوشش ضرور کریں گے۔ پوری تلافی تو اب بہت مشکل ہے تاہم میں آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا جن سے آپ کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) جہاں تک ممکن ہو سکے عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذِ اصلی یعنی قرآن اسی زبان میں ہے اور جب تک آپ اس کی اصلی زبان میں نہ پڑھیں گے اسلام کا نظام کبھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح نہ آ سکے گا۔ عربی زبان کی تعلیم کا پرانا طریقہ اب غیر ضروری ہے جدید طرزِ تعلیم سے آپ چھ مہینے میں اتنی عربی سیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کی عبارت سمجھنے لگیں۔

(۲) قرآن مجید، سیرتِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جہاں آپ نے اپنی زندگی کے ۱۲، ۱۵ سال دوسری چیزوں کے سیکھنے میں صرف کیے ہیں، اس سے آدھا بلکہ چوتھائی وقت ہی اس چیز کو سیکھنے میں صرف کر دیجیے جس پر آپ کی ملت کی اساس قائم ہے اور جس کے جانے بغیر آپ اس ملت کے کسی کام نہیں آ سکتے۔

(۳) جو کچھ بھی نظریات آپ نے ناکافی اور منتشر معلومات کی بنا پر اسلام کے متعلق قائم کر رکھے ہیں ان سب سے ذہن کو خالی کر کے اس کا باقاعدہ مطالعہ (SYSTEMATIC STUDY) کیجیے۔ پھر جس رائے پر بھی آپ پہنچیں گے وہ قابلِ وقعت ہوگی۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے لیے یہ کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر رائے قائم کریں۔ اب میں اس دعا کے ساتھ اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے اور آپ کو اس خطرہ سے بچائے جس میں آپ پھنسا دیے گئے ہیں۔

شعیب احمد (شعبہ تاریخ)

# امتحانات میں دھاندلیاں

موجودہ دور میں آئے دن امتحانات میں دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے واقعات سننے میں آ رہے ہیں مگر ابھی تک اس سلسلے میں کوئی موثر اقدام نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر نہیں اٹھایا گیا۔ ان بدعنوانیوں سے دیانت دار، فرض شناس اور اعلیٰ شہرت کے حامل اساتذہ نے معاملات میں کام کرنے کا مکمل طور پر بائیکاٹ کر دیا ہے اور ان کی جگہ نااہل، پیشہ ور اور راشی لوگوں نے کام شروع کر دیا ہے جس سے امتحانات کا تقدس بری طرح مجروح ہو چکا ہے۔ ملک کے دیگر امتحانات میں بھی ایسے واقعات منظر عام پر آ چکے ہیں جن کا اگر فی الفور مناسب سدباب نہ کیا گیا تو اس کی اہمیت و افادیت مکمل طور پر ختم ہو کر رہ جائے گی۔

تمام عرصہ جب کہ امتحان سے قبل کسی پرچے کا آؤٹ ہونا امتحانی عملہ کے ساتھ ملی بھگت، بد سلوکی اور بعض گروہی یا امتحانی مرکز سے باہر پرچہ حل کر کے جواب کی کاپی اندر بھجوانا اور کمرۂ امتحان میں تمام امیدواروں کا کھلم کھلا نقل کرنا ایسے واقعات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری جن پر بھی عائد ہو اس کے خلاف آج تک کارروائی کو عمل میں کیوں نہیں لایا گیا۔ اب یہ طوفان بدتمیزی مکمل عروج پر ہے اور اسے مسلسل ختم کرنے کی کوشش تو کی گئی مگر بے سود۔ اب جس تیزی سے حالات بگڑتے جا رہے ہیں اسی تیزی سے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ معاشرہ اصلاح کی راہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ... عمل پیرا ہو جائے اور کچھ اہل علم، محب وطن اور اعلیٰ سوچ کے حامل اہل افراد یہ محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ اگر حالات کو درست نہ کیا گیا تو اس ملک کا تعلیمی ڈھانچہ بری طرح مجروح ہو کر رہ جائے گا۔ اس قسم کے تمام بد اعمالیوں کی ذمہ داری متعلقہ ثانوی بورڈوں اور یونیورسٹی کی انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ انتظامیہ کی نااہلی کے نتیجہ میں اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر ان کی وجوہات پر غور کیا جائے تو وہ درج ذیل ملتی ہیں۔

(۱) یونیورسٹیوں اور ثانوی تعلیمی بورڈوں کے تمام انتظامی عہدوں پر قابل، تجربہ کار اور اعلیٰ کردار کے حامل افراد کی تقرریوں کو عمل میں لایا جاتا ہے اور یہ تعیناتی صرف ایک مخصوص عرصے کے لئے کی جاتی ہے۔ جب یہ عرصہ پورا ہو جائے تو متعلقہ افسر کو فی الفور اس اسامی پر سے تبدیل کیا جاتا ہے۔ عرصہ پورا ہونے کے بعد کسی قسم کی ملازمت میں توسیع ہرگز نہ کی جاتی۔

(۲) ملازمین کی گروہ بندی میں برسر اقتدار پارٹی کا ایک گروہ کا ساتھ دینا اور اس کی جائز ناجائز امداد کرنا۔

(۳) غلط کاریوں میں مصروف ملازمین کی باز پرس نہ کرنا اور ان کا محاسبہ نہ کرنا۔

(۴) اساتذہ میں گروہ بندی بازی کی بدولت پیشہ تدریس کا وقار مجروح ہونا اور طلبا کا اساتذہ کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا جس سے طلباء کے دلوں میں اساتذہ کا وقار اور قدر و منزلت باقی نہ رہے۔

(۵) والدین کا اپنے بچوں پر صحیح کنٹرول نہ ہونا اور بجائے انہیں سیدھے راستے پر چلانے کے انہیں ناجائز ذرائع سے امتحان میں پاس کرانا۔

(۶) طلبا میں بڑھتے ہوئے سیاسی رجحانات، گروہ بندی اور دھڑے بندیوں کے سبب تعلیمی امور پر کم توجہ دینا اور امتحان کے موقعوں پر ناجائز راستوں کا تلاش کرنا۔

(۷) معاشرہ میں بدعنوانی کے رجحان کا مزید سے بڑھنا

(۸) سفارشوں کے ذریعے ممتحنوں کی بھرتی اور سنٹر سپرنٹنڈنٹوں اور دیگر عملے کا تقرر عمل میں لانا۔

یہ وہ بدترین عوامل ہیں جن کی بدولت بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے سطح امتحانات میں دھاندلیاں، بد دیانتی اور بدعنوانیوں کو فروغ ملا۔ کسی سطح پر بھی ان کا مناسب سدباب نہ کیا گیا جس سے شعبہ امتحانات کی اصلاح نہ کی جا سکی اور امتحانات کا تقدس بری طرح مجروح ہوا چنانچہ اس شعبہ میں تعینات افسران اور ان کے عملے نے من مانیاں کیں۔ اپنی مرضی اور پسند کے لوگوں کو سنٹر سپرنٹنڈنٹ تعینات کیا، خواہ وہ سراسر نااہل اور ناقابل ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے ایک امتحان شروع ہونے سے تقریباً تین چار روز قبل شعبہ امتحانات کے ایک ذمہ دار افسر سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ صاحب صبح سے لے کر شام ۶ بجے تک تو اپنے دفتر سے غائب اور پھر ۶ بجے شام دفتر کا کام شروع کیا اور رات کے گیارہ بجے تک تقرریوں کے سلسلہ میں ہمہ تن مشغول رہے۔ لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور ہر ایک کو رات ۸ بجے کا وقت دیا ہوا ہے۔ جو کوئی آیا اس سے خاموشی سے کان میں کوئی بات کہی۔ بعد ازاں ان سے ایک چٹ لے کر اس کی برانچ کے ایک ذمہ دار فرد سے ملا اپنا آرڈر لیا اور غائب ہو گیا۔ مگر اس کے مقابلے میں وہ دیانتدار، تجربہ کار اور فرض شناس افراد جو کہ امتحانات میں کام کرنا ہی اپنی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔ انہیں کیا ضرورت ہے کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک ذلیل و خوار ہوتے رہیں، حالانکہ یہی صاحب عرصہ دو سال سے اس اہم کلیدی آسامی پر جلوہ افروز ہیں۔ اس سے پہلے سال انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو بطریق احسن سرانجام دیا۔ خدا جانے اس سال انہیں کن مشکلات و حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک اور واقعہ پیش خدمت ہے۔ راقم کو ایک امتحان میں بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کام کرنے کا موقع ملا۔ جس دن امتحان شروع ہو رہا تھا اس سے ایک دن قبل میری تقرری عمل میں لائی گئی۔ بہر حال میں اسی دن سنٹر پہنچ گیا۔ میرے سپرنٹنڈنٹ سنٹر جو کہ ایک ریٹائرڈ بزرگ تھے، شکل و صورت سے بڑے بھاری اور پرہیزگار معلوم ہوتے تھے۔ ان کی رہائش تو سنٹر کے اندر تھی مگر ان کے خورد و نوش کا تمام انتظام ایک امیدوار کے ہاں تھا۔ اس امیدوار کو انہوں نے مکمل طور پر آزادی دے رکھی تھی۔ جب میں نے ایسا کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تو انہوں نے راتوں رات شعبہ امتحانات کے سربراہ سے فون پر رابطہ قائم کر لیا اور میرے بارے میں یہ شکایت کی کہ یہ میرے ساتھ قطعاً تعاون نہیں کر رہا ہے لہذا اسے فارغ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے میرے سپرنٹنڈنٹ کو فون پر ہی منظوری دے دی۔ چنانچہ اگلے دن مجھے انہوں نے ڈیوٹی کا حوالہ دے کر سنٹر سے فارغ کر دیا۔ جب میں نے شعبہ امتحانات کے سربراہ سے فون پر رابطہ قائم

گیا تو وہ مجھے کیسے لگے کہ جو کہ اس سے آپ سے پہلے فون کر لیا تھا لہذا اس نے عدم تعاون کی صورت میں اسے سطور دی دے دی۔ علاوہ ان سدہ نے ایک غیر جانبدار ادارہ کی مدد لی اور تمام معاملات سے آگاہ کیا تو پھر انہوں نے مدد کرلی۔ اسے آپ اندازہ لگائیں کہ یہ دیانت داری سے کام کرنے کا صلہ ہے کہ ایک بیک، فرض شناس اور محنتی استاد کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح کچل دیا جائے

اگر کسی امیدوار کا رابطہ متعلقہ امتحانات میں کام کرنے والے کسی کلرک سے ہے تو وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے اس میں ہیرا پھیری کر سکتا ہے اور اگر امیدوار کا رابطہ امتحانی سنٹر کے پانی پلانے والے سے ہے یا نگران عملہ اور سپرنٹنڈنٹ وغیرہ سے تو وہ ان کے سامنے کتابیں رکھ کر نقل کر سکتا ہے یا باہر سے سوالات کے جوابات منگوا سکتا ہے یا اس کی کاپی باہر سے مکمل طور پر تیار ہو کر آجاتی ہے۔ یہ صورت حال حال ہی میں عروج پر ہے۔ براہ کرم اس کا سدباب کیا جائے

ایک ثانوی تعلیمی بورڈ کے ذمہ دار افسر کا واقعہ بطور مثال ہے۔ یہ صاحب بورڈ کی کار میں چند امیدواروں کے ہمراہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس سفارش کے لئے پہنچتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ چونکہ کل پرچہ ہیں اس لئے وہ سپرنٹنڈنٹ سنٹر اپنی جائے رہائش پہ چلے گئے ہیں سب یہ صاحب وہاں پہنچے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سسرال میں گئے ہیں جب وہ وہاں کا رخ کرتے ہیں تو وہ وہاں پر بھی موجود نہیں ہیں بالآخر یہ کہہ کر وہاں سے واپس آجاتے ہیں کہ انہیں کہا جائے کہ وہ مجھے میرے دفتر میں ملیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے جس کی سزا پر ان کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بیان ناقابل بیان ہے

جہاں تک ان بدعنوانیوں کے ختم کرنے کا تعلق ہے اسے کسی اعلیٰ سطح پر اصلاح مسعود کر دیا گیا اس کا مناسب سد باب کیا جائے۔ تمام موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے ضروری قدم اس طرح عمل کیا جائے کہ امتحانی مراکز کی تعداد کم سے کم رکھی جائے بڑے بڑے شہروں میں صرف چند سنٹر بنائے جائیں جو کہ ہر لحاظ سے موزوں اور سہل تر ہوں ان میں صرف دیانت دار، محترم کو۔ اور نیک افراد کے ہی تقرر کو عمل میں لایا جائے اور نگران عملے کے تقرر میں صرف ہائی مدارس کے اساتذہ کو ہی ترجیح دی جائے۔ مڈل اور پرائمری مدارس کے اساتذہ کے بس کا روگ نہیں کہ وہ ایف اے اور بی اے کے طلباء پر کنٹرول کر سکیں

ان تقرریوں کو امتحان سے دس دن قبل کر دیا جائے۔ بعد از ان کسی تقرری کو عمل میں نہ لایا جائے اور سپرنٹنڈنٹ کسی امیدوار کے استعمال کے لئے کر تبدیل کیا جائے۔ امتحان کے لئے ایک ایسی کمیٹی بنادی جائے جو کہ پورے ضلعے کے بدر امتحانات کی پوری طرح ذمہ دار ہو اس کمیٹی کا صرف ایک ممبر ایک ضلع کے لئے کافی ہوگا اس کے پاس مکمل اختیارات ہوں عملہ کا بندوبست بھی اگر ضرورت پڑے تو پیر کر کے دے۔ بورڈوں اور یونیورسٹی کے تمام تر افسران دوران امتحان چھاپے ماریں تاکہ نقل کا رجحان مکمل طور پر ختم ہو بدعنوانی کے ضمن میں جب بھی امتحانی عملہ کا کوئی فرد ملوث پایا جائے اس کے خلاف سخت سے سخت کارروائی عمل میں لائی جائے۔ امتحانی مراکز کے سپرنٹنڈنٹ نہایت ہی سینئر اساتذہ کو مقرر کرنا چاہیئے تاکہ وہ ایمانداری اور دیانتداری سے کام کر سکے۔ اس کے معاوضہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا جائے ہر امتحان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے تقرر کے لیے ورکنگ اساتذہ (ایس وی، او ٹی، پی ٹی آئی اور ڈرائنگ ماسٹر) جن کا تدریسی تجربہ بیس سال ہے جو کہ نہایت ہی دیانتداری، فرض شناسی اور خلوص نیت سے اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں ہیں، کو موقع دیا جائے تو یقیناً امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھا سکیں گے۔ امتحانات کے دوران خفیہ رپورٹوں کا بندوبست کیا جائے۔

چھاپہ مار پارٹیاں زیادہ فعال کر دی جائیں۔ بدعنوانی کے مرتکب امیدواروں اور دیگر افراد کے خلاف قانون سازی کے ذریعے کارروائی کی جائے اور انہیں کڑی سے کڑی سزا دی جائے تاکہ ایسی سوچ سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ والدین کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے معاملہ میں کوئی ڈھیل نہ دیں۔ اور انہیں امتحان میں پاس ہونے کے لئے بدعنوانیوں کی ترغیب نہ دیں۔ پولیس کی بجائے ضلع کی انتظامیہ سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً امتحانی مراکز پہ جا کر چھاپے ماریں جس سے طلباء کے دلوں میں خوف پیدا ہوگا۔ ڈاک اور ریل کے ذریعے پرچے اور دیگر سامان کی ترسیل میں شک پڑے تو ان افراد کے خلاف بھی انکوائری کو عمل میں لایا جائے۔ البتہ پرچہ جات کی ترسیل میں سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ جس ادارہ میں سنٹر ہو اس کے سربراہ کی موجودگی بھی لازمی قرار دیا جائے۔ تیاریاں کرتے وقت ایک کمیٹی بنادی جائے جس میں کنٹرولر امتحانات کے علاوہ ہر طبقے کے اساتذہ کا ایک ایک فرد بھی لیا جائے جو کہ نہایت ہی محترم، کارہ، فرض شناس اور ایماندار ہو۔ اور یہ کمیٹی صرف اساتذہ کا چناؤ کرے اور صرف کنٹرولر امتحانات ان اساتذہ کو سختی سے یہ اس نے کام کرنا ہے الاٹ کرے تب جا کر امتحانات کا تقدس برقرار رہ سکے گا۔ اور صحیح امتحانات میں مکمل طور پر رازداری قائم رہ سکے گی

***

## بقیہ سیسٹر کی دوپہر

مرج کے سلسلے میں میرا خیال سب مختلف ہے، شکیل ڈیئر!

میرج تو ایک گھریلو لڑکی سے ہونی چاہیے۔ اطاعت گزار، فرمانبردار جب میں دفتر سے تھک کر آؤں تو میرے جوتے اتارے، میرے انتظار میں کھانا نہ کھائے۔ یونیورسٹی کی لڑکیاں ان کے ۔۔۔ میں اپنی لیڈی رینگ کی دیکھ بھال پسند نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں میں پرانے خیالات کا آدمی ہوں۔ انہیں تو اپنے فیشن سے فرصت نہیں ہوگی"

اچھا اب بکواس بند کرو، ہم بھی اپنی زندگیاں تم جیسے یونیورسٹی کے فالتو لڑکوں کے حوالے نہیں کر سکتیں" عاصمہ نے اسے زور سے جھڑکا

بے کار باتیں بند کرو اب انہیں سیمینار کا ایک گیت سنائیں گے" ان کی گفتگو کے دوران ہی ۔۔۔ ان کے بیچ آ بیٹھا تھا۔ اپنی رسمی آواز کے سبب اسے سیمینار کا خطاب ملا تھا۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں

اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں

وہ گا رہا تھا اور وہ سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے

یہ سردیوں کے دن تھے اور کیمپس پوسٹ کی دلہن یہ سمسٹر کی آخری دوپہر تھی۔ تھک کر وہ اپنی اپنی کتابوں پر نوٹس پر اور کاپیوں پر جھکی ہوئی لڑکیاں اور لڑکے انہیں دیکھتے اور

کر دوبارہ جھک جاتے

ٹونی! تمہیں احساس ہے تم نے اس موقع پر کتنے گھٹیا جملے کہے تھے"

عاصمہ نے سیمینار کے ٹھیک سامنے اسے روک لیا

کیوں کیا تم ناراض ہو گئیں عاصمہ؟

"ارے" اس نے دونوں آنکھیں پوری طرح سے کھول کر ٹونی کو دیکھا۔

"اتنا بدل کیسے گیا؟ یہ اتنا سا بانو اور وہ معذرت کا سا انداز اس کے ایک جملے میں کیسے ۔۔۔ بس وہ میں یوں ہی بدحال سا ہو گیا تھا۔ دیکھو یہ ہمارا فائنل ایئر ہے، پھر ہم بچھڑ جائیں گے پھر ملیں نہ ملیں!

یونیورسٹی تب بالکل سونی سونی سی لگ رہی تھی

سب ٹیسٹ دینے میں مصروف تھے اور کہیں کوئی گپ شپ شور و ہنگامہ نہ تھا۔

وہ دونوں دیر تک سیمینار کے سامنے کھڑے باتیں کرتے رہے۔

سردیوں کے دن تھے اور دھوپ لان پر لیٹی ہنس رہی تھی۔

***

(مسعود صداقت)

# سمسٹر کی ایک دوپہر

اس نے آتے ہی کتابیں زور سے ریسٹ پر پٹخ دیں
میری سمجھ میں تو خاک نہیں آ رہا ٹیسٹ سارا رولز کا۔
"بیٹھ جاؤ پیارے بیٹھ جاؤ ابھی سارا دماغ درست کیا جاتا ہے۔"
ضیاء نے اسے تسلی دی۔ "ہاں ٹونی اب تم ذرا جلدی سے فیض کی وہ غزل سنا دو۔"
"کون سی؟"
"بھئی وہ کہ ابھی جلی سی موسم گل ہے، تمہارے نام پہ آنے کا نام"
ٹونی نے سر پر ہاتھ مارا، ابھی گلا پھاڑنے ہی والا تھا کہ اسے ایک دم شاک سا لگا، پھر وہ مڑ کر بھاگتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔
"عاصمہ" ضیاء نے مخاطب کیا "تم تو اس کی حماقتوں کی راز داں ہو نا"
"ساؤ مجھے کہاں تک رہی ہو؟"
"وہ جب سر سے غنڈہ ٹیکس وصول کرنے گیا ہے۔"
"کیا؟" ان سب کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا
ٹونی جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہو کر دوبارہ ادھر آ رہا تھا اس کے ہاتھوں میں نوٹ دبے تھے
"ذلیل آدمی، تو نے یہ بزنس کب سے شروع کیا" شکیل دھاڑا
"امیر احمد کا ہاں"
"اب اس ساد کی یہ عزت رہ گئی ہے، تو اس سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتا ہے"
"اچھا اب عاصمہ کم بحث ہے تم لوگوں کو مس گائیڈ کیا ہے، ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں۔"
ٹونی عاصمہ کے پیچھے بھاگا۔ سب اپنی کتابوں اور نوٹس پر جھکی ہوئی لڑکیوں نے اس گروپ کو سر اٹھا کر پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر سے پڑھائی میں مصروف ہو گئیں۔
سردیوں کے دن تھے سمسٹر کے کمپری ہینسو ٹیسٹ۔ مدات ن کراں سب کے سروں پہ مارل ہو رہے تھے لان پہ دھوپ بکھری تھی اور لڑکے لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ٹہل ٹہل کر سوال یاد کر رہی تھی
"ٹونی ان دنوں تم مجھے بالکل ہی نوٹ نہیں دیتے" عاصمہ رجسٹر کی تاریخ تھامے ہوئے کہہ رہی تھی،
"دیکھو ٹونی! اب ہم فائنل میں ہیں نا بس یہ آخری ہی سال ہے نا"
"سب ہم بچھڑ جائیں گے، پھر تم مجھے نہیں ملو گے پورا گروپ بکھر جائے گا اور . . . اور پھر سامنے ہماری انگیجمنٹ ہونے والی ہے"
"کیا یہ بالکل ٹھیک بات ہے ٹونی؟"
ٹونی غور سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اس وقت کتنی سادہ اور معصوم لگ رہی تھی۔
"تم جیسی لڑکیاں کتنی احمق اور رومانٹک ہوتی ہیں، بس ذرا سی چھٹی آئی اور دھڑام سے گر پڑیں اور تم لڑکے کتنے ذلیل اور کمینے ہوتے ہو میرا بس چلے تو چوراہے پہ تم لوگوں کو منہ کالا کر کے جوتے لگاؤں کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں"
"بس! ابھی تو تم بہت اداس ہو جانے والی گفتگو کر رہی تھیں"
ٹونی کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ آئی۔ عاصمہ کا جی چاہا کہ اس ٹونی کے بچے کا گلا گھونٹ دے۔ "تم لوگ کیا کالسپیریس کر رہے ہو، چلو ادھر آؤ" ضیاء نے چیخ کر دونوں کو بلایا۔ سب ہی دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب آ گئے۔
"بھئی عاصمہ کہہ رہی تھی کہ چونکہ ہم لوگوں کا فائنل ایئر ہے اس لیے وہ مجھے یعنی صرف ٹونی کو ایک عدد زوردار سے لنچ کی دعوت دینے والی ہے" میں نے کہا
"یہ جھوٹ بک رہا ہے میں نے" عاصمہ نے بات کاٹی۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔"
"عاصمہ اور ٹونی" شکیل جو دیر سے ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہا تھا آہستہ سے بولا، اور سب اس لیے پر چونک پڑے، کیونکہ شکیل کی آواز معاملہ کے قول کے مطابق بات کو سڑکوں پر جاگ جاگ کر پہرہ دینے والے چوکیداروں جیسی تھی۔
"میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا تم دونوں کی میرج نہیں ہو سکتی۔"
اس عجیب سوال پر وہ سب پریشان سے ہو گئے تھے۔ عاصمہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ البتہ ٹونی مسکرا رہا تھا ایک شریر سی مسکراہٹ۔
"ٹونی تم مرد ہو، میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں۔"
"شکیل بیٹے، کیا اب تک تم نے سمسٹر ٹیسٹ دیئے اور میرج کرنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا
میرج کا تعلق پوری لائف سے ہوتا ہے احمق! پوری لائف سے!"
"تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ آدھی لائف سے ہوتا ہے، میرا سوال ہے کہ تم عاصمہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے"
"کیوں میں پاگل ہوں کیا، جو اس سے شادی کر لوں؟"
"تم دونوں میری انسلٹ کر رہے ہو" عاصمہ کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی۔
"پلیز عاصمہ پلیز ایک سٹ ہولڈ کرو، ہاں تو عاصمہ میں کیا رائی ہے"
"اور تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں پیارے ٹونی؟" شکیل کے لہجے میں کاٹ تھی۔

(باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

# طالبات، اعلیٰ تعلیم ۔ وقت کا زیاں؟

عابدہ جلیل ۔ شعبہ ہاشمی

"ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ پیدا کرنے کا دوسرا نام تعلیم ہے" ارسطو کے اس قول سے ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ کسی قوم کی نوجوان نسل کی تعلیم ایک ملک کی ترقی اور خوشحالی میں کس قدر اہم کردار ادا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی قوم کی ترقی و خوشحالی کا اندازہ لگانا ہو تو اس قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کی نوعیت اور معیار کو دیکھنا چاہیئے تعلیم کی اس اہمیت کے پیش نظر ہر ملک یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے نوجوان بہتر سے بہتر طریقے سے تعلیم حاصل کریں اس مقصد کے لیے وہ ملک ایک تعلیمی ڈھانچہ مرتب کرتا ہے جو اس ملک کے تہذیب و تمدن، تاریخی روایات اور تاریخی حقائق سے ہم آہنگ ہوتا ہے موجودہ دور میں چند بڑی طاقتوں کے دنیا پر اقتدار سے دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک اپنے طالب علموں کو یہ سہولت فراہم کرنے سے قاصر ہیں ان ترقی یافتہ ممالک نے اپنا تعلیمی ڈھانچہ ان بڑی طاقتوں کے تعلیمی نظام کے مطابق بنایا ہے جس کی بدولت ان ممالک میں تعلیم اگر طلبہ و طالبات کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتی تو سودمند بھی نظر نہیں آتی بدقسمتی سے ہمارا ملک بھی ان ممالک میں سے ایک ہے موجودہ دور میں اس نظام تعلیم نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ خواتین ہیں

موجودہ دور میں دنیا تین بڑے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے جن کی روایات و اقدار، تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت سب سے جدا جدا ہے یہ تین گروپ عیسائی اور کافر یا ہندو، مسلمان ہیں، اور تیسرے لادینی عناصر ہیں سب سے پہلے ہم عیسائی دنیا میں طالبات کی اعلیٰ تعلیم پر بحث کریں گی عیسائی دنیا کے کم و بیش ہر حصہ میں موجود ہیں لیکن ان کی اکثریت دنیا کے مغربی حصہ پر ہے مغربی دنیا میں طالبات کو طلبہ کے برابر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ہی حاصل نہیں بلکہ ان کی تعلیم بھی ایک جیسی ہے مغربی ممالک میں طالبات تعلیم کا حصول شوقیہ ہی نہیں کرتی بلکہ انہیں ملکی معیشت میں ہاتھ بٹانے کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ملازمت اختیار کر لیتی ہیں یہ صحیح ہے کہ اس طبقہ سے بڑی بڑی قابل عورتیں ابھریں مادام کیوری، مس کیلر، فلورنس نائٹنگل اور کئی دوسری قابل ذکر ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ عموماً ملازمت پیشہ خواتین کی اولادیں ہوسٹل میں پروان چڑھتی ہیں نہ انہیں ماں کی محبت ملتی ہے اور نہ باپ کا پیار پیار و محبت سے محروم یہی نسلیں جب بڑی ہوتی ہیں تو اس مشینی زندگی کے خلاف ردعمل کی بدولت وحشیانہ زندگی اختیار کر لینا چاہتی ہیں انسانی، اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جانا چاہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج مغرب ایک بدترین اخلاقی بحران سے دوچار ہے جو اس کے زوال کی نشاندہی کر رہا ہے اسی موقع کے لیے شاید اقبال نے کہا تھا ؎

کیا یہی ہے مغربی معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

اور اس کا واحد سبب محض مادی عمل میں موجودہ تعلیمی نظام کی فارغ التحصیل طالبات نظر آتی ہیں۔

دنیا کا دوسرا گروہ یہ مسلمان ہیں جو ایشیا کے ایک بڑے حصے پر چھائے ہوئے ہیں ان کی روایات و اقدار کی بنیاد اسلام پر مبنی ہے اسلام تعلیم کے حصول پر جس قدر زور دیتا ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں جس طرح اسلام اور دوسرے معاملات میں مرد اور خواتین کو مساوی حقوق دیتا ہے، اسی طرح تعلیم کا حصول بھی دونوں کے لیے یکساں طور پر مواقع فراہم کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اسلام نے مرد اور عورت کے فرائض کو مکمل طور پر جدا رکھا ہے اگر ایک طرف عورت کو بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی ذمہ داریاں سونپی ہیں تو مرد کو بیٹے، بھائی، باپ اور شوہر ہونے کی ذمہ داریاں اس سختی کے ساتھ سونپی گئی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے فرائض کے اس جداگانہ انداز سے جداگانہ تعلیم و تربیت کا تصور ابھرتا ہے یہی اسلامی روایات کی بنیادی کڑی ہے، لیکن اگر اسلامی ممالک کی تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ کسی بھی ملک میں طالبات کے لیے جداگانہ نظام تعلیم نہیں ہے جس کی بدولت اکثر ممالک میں طالبات مشعل علم سے قطعی طور پر محروم ہیں جیسے سعودی عرب، عراق، افغانستان اور دوسری طرف چند ممالک ہیں جیسے ایران، ترکی، وغیرہ وغیرہ جہاں اسلامی روایات و شعائر پیچھے ڈال دیا گیا ہے یہ ممالک آہستہ آہستہ اخلاقی بحران کا شکار ہوتے جا رہے ہیں دنیا کا تیسرا گروپ لادینی طاقتیں ہیں جو نہ صرف خدا کی منکر ہیں بلکہ انسانی یا مذہبی اور اخلاقی رواج کی یکسر مخالف ہیں ان ممالک میں طالبات سے وہ کام بھی نہیں لیے جاتے اگرچہ یہ ممالک مادی طور پر خوشحال ہیں لیکن ان میں حکومت اور نظام تعلیم کے خلاف ایک عام رجحان پایا جاتا ہے کہ اکثر طلبہ و طالبات روس سے بھاگ بھاگ کر امریکہ میں پناہ لینے میں مجبور ہو جاتے ہیں۔

طالبات کی تعلیم سے متعلق موجودہ دور کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم خود اپنے ملک میں بھی طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لیں ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی بمشکل ۲۵٪ طالبات ملازمت سے منسلک ہوتی ہیں اور بقایا ۷۵٪ طالبات عائلی زندگی بسر کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں درحقیقت ہمارے ملک میں صرف چند فیصد طالبات ایسی ہوتی ہیں جو شوقیہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں ورنہ زیادہ تر طالبات اچھا رشتہ نہ ملنے کے سبب اپنی تعلیم کو ایک مدت تک جاری رکھتی ہیں یا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آتی ہیں

# نظامِ امتحانات ۔ لمحۂ فکر

بشیر احمد (شعبۂ عمرانیات)

امتحانات ہمارے نظامِ تعلیم کا سب سے اہم اور بنیادی پہلو ہیں۔ غالباً جب امتحانات کا آغاز ہوا ہوگا، تو یہ نظامِ تعلیم کے ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہوں گے، لیکن اب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ امتحانات اصل میں اور باقی نظامِ تعلیم اس کی فروع۔ تعلیم کا پورا نظام، سال کے مختلف حصوں میں پڑھائی، مختلف ادوار، طالب علم اور اساتذہ کی دلچسپی کے اتار چڑھاؤ، کتابوں کی خرید و فروخت، اہم اور غیر اہم کا تعین، غرض سب کی بنیادی اور فیصلہ کن قدر امتحانات ہو گئی ہے۔

اس میں بہت دخل ہمارے ملکی نظام کو حاصل ہے جو ڈگری کے بغیر روزگار فراہم نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں بطورِ معاش کے لیے ڈگری کی شرط انگریزوں کے ساتھ آئی۔ اپنی تعلیم کو رواج دینے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ انہی کے نظام کے ڈگری یافتہ نوجوان معاش کی دوڑ دھوپ میں منتخب کیے جائیں گے۔ اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا اور ہوا کہ ڈگریوں کی ہوا چل گئی۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک میں خود جرمنی میں باعزت ملازمت کے لیے ڈگری اس طرح لازمی نہیں ہے جیسے ہمارے ملک میں ہے۔ ہمارے ہاں تو اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، اگر ڈگری یافتہ نہ ہو تو اسے اہل تسلیم نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ڈگری ہو خواہ کیسا ہی نالائق کیوں نہ ہو، اسے اہل تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے یہ صورتِ حال نہ تھی اور تجربہ و مہارت اصل تھے نہ کہ کچھ خاص کورسوں کی کسی نہ کسی طرح تکمیل۔ ڈگریوں کے لیے اس عام ریس اور اس کے حصول کے لیے ہر طرح کے ناجائز ذرائع کا بے باکانہ استعمال اسی لیے ہے۔ اگر کسی طرح ڈگری کو محض تعلیم اور قابلیت کی نشانی رہنے دیا جائے اور روزگار بغیر اس کے بھی فراہم ہو جائے، تو شاید بہت خوش گوار تبدیلی رونما ہو۔ غالباً اسی کے پیشِ نظر ۱۹۵۴ء میں اس وقت کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا تھا:

"ویسے گریجویٹس کی تعداد میں اضافہ جو اب یونیورسٹی کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہا۔ یہ صورتِ حال اقدار کے جھوٹے احساس کی بدولت ہے۔ ایک حد تک حکومت بھی چھوٹی موٹی آسامیوں کی بھرتی کے لیے بھی بیچلر کی ڈگری کی شرط عائد کر کے اس کی ذمہ دار ہے درانحالیکہ سوائے بہت ہی اونچے عہدوں کے لیے یونیورسٹی ڈگری کی کوئی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔"

عملاً جو حالت برقرار ہے وہ بہرحال یہی ہے کہ ہر نئے سال میں گریجویٹس کی تعداد کا زیادہ ہونا ہے۔ تعلیم کی اشاعت اس بات سے ناپی جاتی ہے کہ کتنے لوگوں کو ڈگری دی گئی۔ ہمارا پورا نظامِ تعلیم ان ڈگریوں ہی کی تلاش میں ان ہی کے گرد گھوم رہا ہے۔ سال بسال ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہر یونیورسٹی ایک فیکٹری کی طرح ہر سال کچھ گریجویٹس ڈھال کر زندگی کے میدان میں داخل کر دیتی ہے۔

ڈگریوں کی اس غیر معمولی غیر فطری اہمیت نے پورے نظامِ تدریس کو مفلوج کر دیا ہے۔ تدریس کا مفہوم طالب علم میں قابلیت پیدا کرنا، مضمون کو سمجھانا اور اظہارِ خیال کی صلاحیت پیدا کرنا نہیں رہا ہے، بلکہ امتحانات پاس کرا دینے کے قابل بنا دینا ہے۔ جس استاد کی فی صدی اچھی ہو، وہ کامیاب رہا ہے اور جو اچھی فی صدی نہ دے سکے وہ ناکام ہے۔ فطری طور پر استاد اپنی ساری صلاحیت امتحان کے نقطۂ نظر سے صرف کرتا ہے اور طالب علموں کو سمجھانے کا خواہ مخواہ کا فعل سمجھ کر اس سے باز رہتا ہے۔ طالب علم بھی ابتدائی کلاسوں میں کچھ نصاب کے مطابق تیاری کرتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ انہیں اسی حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ بھی پرچوں کی مدد سے محض مطالعہ پر اتر آتے ہیں۔ یہ کوئی نظری بات نہیں ہے۔ آج ہماری ہر درس گاہ میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین جماعتوں تک یہی عالم ہے۔

اس کے نتیجے میں پورا نظامِ تدریس جڑ سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ درس گاہوں سے تعلیم و تعلم کی غرض بسا ہی ختم ہو گئی ہے، تدریس جیسا مقدس فریضہ اوّل تا آخر خالص کاروباری انداز سے انجام پا رہا ہے۔

## نظامِ امتحانات کی اہم خرابیاں

اگر غور کیا جائے، تو مخصوص نظامِ امتحانات: (۱) سال کے بیشتر حصے میں سستی و لاپروائی، استاد اور طالب علم دونوں کی طرف سے (۲) کلاس روم میں لیکچر کے بجائے نوٹس دینے اور لکھنے کے رواج کا (۳) مذاکرات اور گائیڈ بک قسم کی کتابوں کے رواج کا اصل ذمہ دار ہے۔

دوسری جانب یہ (۱) طالب علموں کی توجہ اصل نصاب سے ہٹا کر چند مخصوص سوالوں پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اکثر کے پاس نصاب نہیں ہوتا بلکہ گیس تی

چار سال کے پرچے ہر ایک کے پاس مل جاتے ہیں گے (۲) طالب علموں میں تخلیقی فکر اور تنقیدی ذوق کی آبیاری نہیں کرتا مقصد امتحان پاس کرنا ہوتا ہے وہ اس کے بغیر ہی زیادہ اچھی طرح پاس ہو جاتا ہے (۳) سطحی مطالعے کی ہمت افزائی کرتا ہے جو امتحان کے بعد بآسانی ذہن سے فراموش ہو جاتا ہے اور طالب علم کی عمومی قابلیت میں بہت کم اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ثانوی تعلیمی کمیشن (۵۳–۵۲) نے ان امتحانات کے بارے میں یہ رائے دی:

"امتحانات کے بارے اساتذہ کی آزادیٔ عمل کو ختم کر دیا ہے۔ نصاب کو رٹگا بند بنا دیا ہے۔ بے جان اور میکانکی طریق ہائے تعلیم کی ہمت افزائی کی ہے تجربے کے شوق کی حوصلہ شکنی کی ہے اور تعلیم میں غلط اور غیر اہم چیزوں کو غیر ضروری اہمیت دے دی ہے۔"

امتحانات کا اصل مقصد مہارتِ علم اور طلبہ کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے موجودہ طریقے میں ایک مقررہ تین گھنٹوں میں کوئی سے دس سوالوں کے ذریعے طالب علم کی سال بھر کی محنت کی جانچ کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ بذاتِ خود طالب علم کی قابلیت کے اظہار کا صحیح طریقہ نہیں ہے اور اس میں کم جاننے رکھنے والے کے زیادہ اظہار اور زیادہ قابلیت رکھنے والے کے کم اظہار کی پوری گنجائش ہے۔ اس پر مستزاد ان کاپیوں کا جانچا جانا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ممتحن بہت محنتی اور ایماندار ہے یہ ممکن ہے تب بھی کسی کاپیوں کو ایک معیار سے جانچنا ناممکن ہے اور بہت سارے ممتحن ہونے کی صورت میں تو اس کا عملاً ہوتا ہے کہ ہر کاپی الگ معیار سے جانچی جائے گی۔ امتحان کے نتیجے کا سارا انحصار ایک دوسرے کے مقابل پر ہی ہوتا ہے اس طرح صحیح اصل قابلیت کا ایک بالکل دوسرا عکس ہوتا ہے جو طلبہ امتحان دینے کے رموز کو پا لیتے ہیں، وہ کم قابلیت سے بھی زیادہ نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امتحان کسی مضمون میں طالب علموں کی تقابلی قابلیت کا نہیں، بلکہ یہ مخصوص سوالوں کا ایک بندھے ٹکے دن میں منہ لکھنے کا ہوتا ہے۔

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ امتحان کا پورا انحصار رٹ لینے پر اور یادداشت پر ہو گیا ہے معاملہ دراصل اس بات میں ہوتا ہے کہ کون زیادہ یاد رکھتا ہے۔ عموماً طالب علم اس دائرے کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتا، اکثر تو نوٹس سے کام چلا لیتے ہیں۔ حافظہ اور یادداشت اصل معیار ہو جانے میں وہ ذہین سمجھدار نوجوان جو رٹنے سے بھاگتے ہیں اکثر مضمونوں میں اچھے نمبر نہیں لے سکتے۔ اس کے نظام تعلیم اور ملکی زندگی پر دو اہم اثرات ہو رہے ہیں۔

۱۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہنوں کو سوچنے اور تنقید کرنے کی تربیت دینا ہوتا ہے دنیا کے کسی بھی فلسفہ تعلیم کی یہ بنیادی غرض و غایت لکھی ملے گی ساری مساعی اسی لیے ہوتی ہیں علم و فکر کے میدان میں اور تحقیقی کاموں میں قیادت اسی قوت پر منحصر ہے، بلکہ انسان کو انسان بنانے والی چیز یہی ہے ہمارے نظامِ امتحانات نے تعلیم کے اس اصل مقصد ہی کو فوت کر دیا ہے۔

۲۔ ڈگری مہارتِ علم کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں رہی ہے مہارتِ علم ایک الگ مسئلہ ہے جس کا ڈگری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، طالب علم اپنے ذاتی شوق سے حاصل کرے تو کرے، ڈگری اس کے ساتھ مشروط نہیں ہے ڈگری ہولڈرز کا ایک الگ طبقہ سا پیدا ہو گیا ہے جسے قابلیت ہو یا نہ ہو ڈگری کی بنیاد پر میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ دوسری طرف کوئی کتنی ہی قابلیت کا مظاہرہ کیوں نہ کرے، اس کا مادی فائدہ وہ ڈگریوں میں اضافہ کیے بغیر حاصل نہیں کر سکتا

راز ہائے نہفتہ

یہ خرابیاں تو اس نظامِ امتحانات میں بالعموم موجود ہیں۔ اگر اس کو ایمانداری سے چلایا جائے، تو بھی ان خامیوں سے مفر نہیں لیکن ہمارے ملک میں حالت کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہے۔ زندگی کے اور میدانوں کی طرح اخلاقی قدروں کا لحاظ یہاں سے بھی اٹھ گیا ہے کسی کے دیکھنے اور جانے کا اور کسی دن اپنے کیے کا جواب دینے کا احساس بھی زندگی سے خارج ہو چکا ہے۔ اصل نصب العین معاشی خوشحالی اور مادی منفعت ہے اور اس کے حصول کے لیے جس کو جیسا موقع ملے، کسی کو کسی جبر سے ذریعہ نہیں زندگیوں سے محنت کرنے اور ذمہ داری سے کام کرنے کا رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ استاد اور شاگرد، شاگرد کے والدین اور امتحانوں کے منتظمین الا ما شاء اللہ سب ہی بلا تکلف اپنی کسی منفعت کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو توڑ دیتے ہیں، بلکہ اصول لوٹنے رہے ہی نہیں ہیں اب کچھ اور اصول وضع کر لیے گئے ہیں جن کے مطابق اب برائی کو برائی سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے ؏

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

امتحانات بھی کاملاً اپنے ہر مرحلے پر اس کیفیت کا شکار ہیں، بدعنوانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ سرکاری سطح پر ہمارے منصوبہ کاروں کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ

"گذشتہ دس سال میں ناجائز ذرائع کا استعمال مسلسل تیزی سے بڑھ رہا ہے۔" (صفحہ ۱۷۹)

یہ بدعنوانیاں اور ناجائز ذرائع کس طرح ہر مرحلے پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہے جسے کسی بھی حیثیت سے اس نظام سے واسطہ پیش آ رہا ہے

بہت پہلے ماضی میں یہ بدعنوانیاں بہت محدود ہوتی تھیں اور ان پر بیکڑ دھکڑ بھی ہوتی تھی، لیکن اب یہ عام ہوتی جا رہی ہیں اور ان پر بیکڑ دھکڑ ختم ہوتی جا رہی ہے کسی ایک تعلیمی بورڈ یا یونیورسٹی میں نہیں ہر جگہ ایک ہی داستان ہے۔

پرچہ کا تقدس ختم ہو گیا ہے جو مرتب کرنے والے یا نظرثانی (MODERATE) کرنے والے یا اس سے آگے کسی مرحلے پر پرچے آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے ذمہ دار لوگ یہ کام بلاتکلف سرانجام دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یہ کام زیادہ سلیقے سے ہو رہا ہے اور بورڈ کی باہیں اخباروں میں آ جاتی ہیں گذشتہ سال لاہور بورڈ کے جو واقعات کھل کر سامنے آ گئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ماضی میں بھی کیا کچھ ہوتا رہا ہوگا۔ اب یہ وبا اتنی عام ہو گئی ہے کہ بعض مخصوص طلبا شروع سال ہی سے جانتے ہیں کہ ان کا پرچہ آؤٹ ہو جائے گا کئی سالوں سے یہ عمل جاری ہے اور ہر سال اس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس نے محنتی طلبا کے محنت کرنے کے رجحان کو شدید دھچکا پہنچایا ہے اس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور آئندہ وہ محنت کو حماقت سمجھ کر اپنا وقت پرچہ معلوم کرنے میں صرف کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

کمرۂ امتحان میں بدعنوانیوں کا رواج بھی برابر بڑھ رہا ہے لاہور بورڈ کے صدر نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ ۲۵ فی صد طلبا ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ خود نگراں حضرات نے نقل میں مدد فراہم کی ہے نگران حضرات امتحانات کو دیانت داری سے منعقد کرانا اپنا فرض نہیں سمجھتے بلکہ بدعنوانیوں سے صرف نظر کرنے یا معمولی ڈانٹ ڈپٹ کرکے چھوڑ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نگراں حضرات کے پاس سفارشیں بھی آتی ہیں کہ اپنے کمرے میں فلاں نمبر کا خیال رکھیے گا اس کا اثر یہ ہے کہ جو ایک دفعہ نقل کرتا ہے وہ پھر مستقل اسی کو ذریعہ بنا لیتا ہے ایک کمرے میں جب ایک طالب علم چھوڑ دیا جاتا ہے، تو دوسروں کی بھی ہمت بڑھتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ سال بسال بڑھتا جا رہا ہے اور طلبا نقل کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور استاد چھوڑ دینے کو رحمدلی اور ہمدردی سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو آنکھوں دیکھے واقعات سننے میں آئے ہیں ان پر شاید یقین نہ آئے کمرہ بند کرکے بلیک بورڈ پر سوال حل کر دینا اور کتابیں تک استعمال کرنے کی اجازت دینے کے واقعات کراچی میں ہو چکے ہیں۔

تیسرا مرحلہ کاپیوں کے جانچنے کا ہوتا ہے۔ آج کل یہ بات کھلا راز ہوتی ہے کہ کس کی کاپیاں کس کے پاس گئی ہیں امتحان ختم ہونے کے بعد اب یہ کام شروع ہوتا ہے کہ متعلقہ ممتحن تک کوئی رسائی ڈھونڈی جائے، حالانکہ ممتحن کے پاس رول نمبروں کی فہرست بھی پہنچ جاتی ہے والدین کو اس مقصد کے لیے اپنے بچے کے ساتھ گھومنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ ترین افسران تک کو اپنے اولاد کے لیے یہ کام کرنے میں تکلف نہیں ہوتا اب حال حال ہی ایسے استاد رہ گئے ہیں جو اس معاملے میں دیانت داری کے اصول پر سختی سے قائم ہیں، ورنہ خود ان کے ہم پیشوں میں یہ وبا اتنی عام ہے کہ الٹا وہ ہی نشانہ گفتگو بنتے ہیں اب یہ شک ہونے لگا ہے کہ بااثر حضرات ہر ہر مضمون کے ممتحن تک پہنچ کر اپنے صاحبزادے کو پاس ہی نہیں کراتے ہیں، بلکہ فرسٹ ڈویژن حتیٰ کہ اور لس تک دلوا لیتے ہیں۔

پھر جو کاپیاں بغیر کسی مفاد کے جانچی جاتی ہیں، وہ اتنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جانچی جاتی ہیں کہ امتحان کا مقصد بالکل ہی دم توڑ دیتا ہے۔

ماہرین ۱۵۰ سو صفحے کی کاپی دیکھنے میں دو ڈھائی منٹ سے زیادہ نہیں لیتے۔ ایک اور رواج اور یہ بھی بہت عام ہے، کاپیاں خود دیکھنے کے بجائے اپنے کسی مخصوص شاگرد سے دکھوا دینے کا ہے۔ اس طرح اس کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ طالب علم نے جیسا کچھ لکھا ہے اس کے مناسب سے ہی اس کو نمبر ملیں اور آخری مرحلہ امتحانی اداروں میں نتائج کی ترتیب کا ہے گراں رجحان نمبر پر نمبر رکھوانے اور ڈویژن بہتر کروانے کے واقعات کبھی کبھی سامنے بھی آ جاتے ہیں لاپرواہی اور بدانتظامی کی بنا پر بھی طلبا کے ساتھ بڑی ہولناک زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔

ان عملی خرابیوں نے، ان کی وجوہات خواہ کچھ ہی ہوں، امتحانات کا اصل مقصد بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ کیتھرڈوم کے حرج سے پورے ملک میں یہ نظام چلایا جا رہا ہے، لیکن اس کی حقیقت ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ امتحانی اداروں کی ساکھ ختم ہو چکی ہے اور عوام کو ان پر یہ اعتماد نہیں رہا ہے کہ وہ دیانتداری سے امتحان لینے کا فرض سرانجام دے رہے ہیں یہ طریق امتحان جو طلبا کی مہارت و قابلیت جانچنے کے لیے خود ہی ایک ناقص طریقہ ہے۔ ان بدعنوانیوں کی بنا پر بالکل ہی ناکارہ ہو گیا ہے۔ تمام ملک پر اس کے تشویشناک اثرات پڑ رہے ہیں کہ جو کچھ تھوڑا بہت پڑھائی اور محنت کا رجحان باقی رہ گیا ہے وہ بھی ختم ہو رہا ہے اور دل گرفتہ ہو ہو کر ہر سال بدعنوانیوں کا ذریعہ اختیار کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ صورت حال ہمارے ماہرین تعلیم کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے حکومت کی مختلف کمیٹیاں اس مسئلے پر اظہار رائے تو کر رہی ہیں، لیکن کسی نے بھی سو روئٹر کا حق ادا نہیں کیا ہے قومی تعلیمی کمیشن نے ۲۵ فی صدی داخلی نمبروں کا جو نظام شروع کرایا ہے، وہ بھی بدعنوانیوں کا آماجگاہ بن چکا ہے ضرورت ہے کہ سارے ملک سے تعلیمی اداروں کے اساتذہ و طلبا اور امتحان سے متعلق دیگر تجربہ کاروں سے معلومات حاصل کی جائیں اور مکمل اعداد و شمار جمع کیے جائیں پرچوں کے نصاب سے باہر ہونے سے لے کر کاپیاں بدل جانے تک کی شکایات پر تحقیقات کی جائے اور پھر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ مشتبہ امیدواروں کے بارے میں

معلومات حاصل کر کے خصوصی سفارشات کی جائیں اور اس طرح اس مسئلے کی صحیح نوعیت حقائق کی بنیاد پر متعین کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے ملکوں کے امریکہ و برطانیہ ہی کے نہیں بلکہ ایسے چھوٹے ملکوں کے نظامِ امتحانات کا جن کا نظام امریکہ و برطانیہ کی نقالی پر مبنی نہیں ہے، مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ انہوں نے طلبا کی قابلیت کو پرکھنے کا کیا طریق کار اختیار کیا ہے؟ شاید اس مطالعے کی روشنی میں کوئی بہتر نظام تجویز کیا جا سکے۔ فوری طور پر جس امر کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر ممکن سختی استعمال کر کے خواہ اس کی آنچ بڑوں پر آئے، بدعنوانیوں کا سدباب کیا جائے تاکہ طلبا اور عوام کا امتحانی اداروں پر اعتماد بحال ہو سکے۔

یہ تمام تحقیقات صورت حال کی اصلاح میں غیر معمولی مدد دے سکتی ہیں، لیکن سب سے بنیادی حقیقت یہ ہے کہ نظام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ افراد کے سیرت و کردار کی اصلاح کی طرف اولین توجہ دی جائے۔ اپنے آخری تجزیے میں مسئلہ اخلاقی مسئلہ بھی ہے اور جب تک استاد، طالب علم اور امتحانی عملہ ہر ایک میں اخلاق کی پابندی اور آخرت کا خوف پیدا نہ ہو، ان بدعنوانیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جو آج تعلیمی نظام کے رستے ہوئے ناسوروں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ کیا اربابِ تعلیم اب بھی ان ناسوروں سے ہمارے جسم کو پاک کرنے کی فکر نہیں کریں گے؟

**

---

## بقیہ طالبات کی اعلیٰ تعلیم

جہاں تک ملازمت پیشہ خواتین کا مسئلہ ہے وہ ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ خانگی زندگی بسر کرنے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین تہذیب، سلیقہ اور شعور میں کسی طرح بھی ان خواتین کا مقابلہ نہیں کر پاتیں جنہوں نے اگرچہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم تو حاصل نہیں کی ہوتی ہے لیکن اپنے بزرگوں سے تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم ملازمت میں تو معاون ثابت ہو سکتی ہے لیکن گھریلو زندگی گزارنے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ مثلاً زوالوجی، باٹنی، فلسفہ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ طالبات لیکچرار تو بن سکتی ہیں لیکن وہ ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کا کردار بہتر طریقہ پر ادا نہیں کر پاتیں جو کہ ان کا اوّلین فرض ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی ایک طویل مدت تک حاصل کی ہوئی یہ تعلیم ضائع ہو جاتی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں طالبات کی اعلیٰ تعلیم اگر ایک طرف وقت کا زیاں ہے تو دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ظلم بھی ہے۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ مرد اور عورت کے حقوق ہر حال میں مساوی ہیں۔ دونوں کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ لیکن طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا ڈھانچہ اس طور پر کرنا پڑے گا جو فطری اصولوں کے عین مطابق ہو۔ جو خواتین کو اس قابل تو کر سکے کہ وہ ایک بہترین بہن، ماں، بیٹی اور بیوی بن کر اپنے گھروں کو جنت بنا سکیں۔ جو اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تربیت کر سکیں اور انہیں اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق پروان چڑھائیں۔ جو معاشرہ کی اخلاقی برائیوں کو دور کر سکیں۔ لیکن جن سے ان کے ناتواں کندھوں پر ملکی معیشت کا براہ راست بوجھ لاد کر ان پر ظلم نہ کیا جائے۔

**

---

## بقیہ: مریم جمیلہ سے انٹرویو

بہت سی پاکستانی ماؤں کو میں نے دیکھا ہے کہ انتہائی پابندی سے نماز ادا کرتی اور تمام مذہبی فرائض پورے کرتی ہیں لیکن اپنے بچوں سے ایسا کرانے میں بری طرح ناکام رہتی ہیں۔ یہ ایک بدترین خرابی ہے جس میں مخلص مسلمان گرفتار ہیں کہ قرآن کو سرسری اور رسمی طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معانی و مطالب پر چنداں توجہ نہیں دی جاتی اور قرآن ایسی عملی کتاب جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے احکام اور ہدایات موجود ہیں، اس کی بے فہم تعلیم سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان کو قرآن معانی اور تشریحات کے ساتھ سمجھایا جائے اور اس کے ترجمے کو عملی جامہ پہنایا جائے تو دنیا ایک ایسے حقیقی انقلاب کی تجربہ گاہ بن جائے کہ گذشتہ سارے انقلاب اس کے سامنے ماند پڑ جائیں۔

**

# نومسلمہ

# اسلام کی طالبہ

مریم جمیلہ سے

مکالمہ

**سوال** - آپ کا بچپن کس طرح کے ماحول میں گذرا۔ آپ نے کس قسم کی تعلیم حاصل کی اور اس سے آپ پر کیا اثر ہوا؟

**مریم** : میں نے اپنا بچپن، ایام بلوغت اور نوجوانی کا سارا زمانہ لارچ مونٹ کے قصبے میں گذارا جو نیویارک کے شہر کے نواح میں ایک مقام ہے، یہ ایک خالص امریکی ماحول تھا۔ جس یہودی گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی اس نے بھی مکمل طور پر امریکی طور طریقے اپنا لیے تھے ہمارا خاندان دوسرے امریکن گھرانوں سے اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ ہم لوگ رشتوں کے پختہ بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے طلاق اور علیحدگی کا میرے گھرانے میں تصور تک نہ تھا اور میرے والدین آپس میں اور اپنے بچوں کے ساتھ بے پناہ محبت کرتے تھے میرا خاندان اپنے ماحول میں قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے اندر لڑائی جھگڑا نام کو بھی نہ ہوتا نہ کبھی گالیاں اور لغو باتیں ہمارے گھر میں سننے میں آئیں میرے اکثر رشتہ دار کامیاب ازدواجی زندگی گذارتے تھے، اور میرے خون کے رشتہ داروں میں کبھی کوئی کسی جرم میں ملوث نہیں ہوا، نہ ہی ہماری نوجوان نسل کسی بداخلاقی کی مرتکب ہوئی یہ سب لوگ نہایت نکھرے اور سلجھے ہوئے مذاق کے مالک ہیں، اور اپنے بچوں میں اعلیٰ علمی مذاق کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

تعلیم میں نے پبلک اسکولوں میں پائی۔ جہاں مکمل طور پر لادینیت کی تعلیم دی جاتی تھی اٹھارہ برس کی عمر میں جب میں ہائی اسکول (بارہ جماعت تک) کی تعلیم مکمل کر چکی تھی، تو میں نے نیویارک یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ مگر اسی دوران میں سخت بیمار ہو گئی، لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کالج کی کوئی ڈگری حاصل نہ کر پائی۔ میں نے جن اسکولوں میں تعلیم حاصل کی وہ اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے بہترین تصور کیے جاتے تھے۔ ان کا طریقۂ تعلیم مؤثر اور نظم و ضبط نہایت معقول تھا۔ لیکن یہاں پر کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہ دی جاتی تھی۔ بالفاظ دیگر میں نے ان اسکولوں میں زبان، ادب، تاریخ، سائنس، ریاضی اور آرٹ ہر چیز سیکھی، مگر کچھ نہ سیکھا تو خدا کے متعلق، لیکن والدین کی حوصلہ افزائی بے حد حساس، قوت تخلیہ اور جبلت تجسس اور بلند ترین روحانی چیزوں کے بارے میں پیاس، یہ وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے میں نے اسکولوں کے زمانے میں بھی نصاب ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ نصاب کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ دی خدا کے فضل و کرم سے اسلام کے متعلق جو تعلیم میں نے حاصل کی یہ قطعاً میری اپنی جد و جہد اور دلچسپی کا نتیجہ تھا۔

**سوال** :- آپ کے بعد کی زندگی میں آپ کا ماحول آپ پر کس طرح اثر انداز ہوا، اور اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

**مریم** :- اس میں کوئی شک نہیں کہ میں جس ماحول میں رہتی تھی کہنے کو تو اس میں پوری طرح شامل تھی لیکن دراصل میں کبھی اس کا حصہ نہ بن سکی دوسری تہذیبوں کی دوسری قوموں کے لیے اور ممالک کے طور طریقوں اور نظام ہائے حیات کے متعلق ایک طویل مطالعے سے میرے اندر اپنے ماحول کے خلاف ایک تنقیدی جذبہ سر اٹھانے لگا مجھے فریب، بدکاری، غرور اور دولت کی جھوٹی نمائش سے ہمیشہ نفرت رہی اور سنجیدگی اور قناعت ہی میرا وطیرہ رہا ہے، اسی لیے میں نے کبھی شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا، نہ دوسری نشہ آور چیزوں میں دلچسپی لی۔ اسی طرح اپنی جوانی کے سلسلے میں بھی مخالف جنس سے ہر نوع کے تعلقات سے گریزاں رہی میری تنہائی میں بھی میرے لیے ذاتی دلچسپی کا سامان موجود تھا، اور میں اپنی تنہائی پر قانع اور مطمئن تھی، جدید نسل تفریح اور انبساط کے جن مصنوعی ذرائع مثلاً فلم ریڈیو، ٹیلی ویژن تھیٹر اور ناچ گانوں پر انحصار کرتی ہے میں ان سے بے نیاز تھی۔

**سوال** :- کیا آپ اپنی زندگی کا ناقابل فراموش تجربہ بتائیں گی؟

**مریم** :- میری زندگی کا بے حد تلخ اور تکلیف دہ تجربہ ۱۹۵۳ء کی سرگرمیوں میں مجھ پر ایک شدید بیماری کا اچانک حملہ تھا اس وقت میری عمر انیس

سال تھی، اور تقریباً یہی زمانہ تھا جب پہلے میرا قرآن سے تعارف ہوا جس نے روحانی دُنیا کی صداقتوں کے بارے میں میری آنکھیں کھول دیں۔ میری بیماری ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دی تھی مگر اس بیماری اور قرآن دونوں نے مل کر مجھے ایک ناقابل فراموش سبق سکھایا، اور وہ یہ تھا کہ کسی چیز کو یہاں بقا نہیں، اور کامیابی اور ترقی کا جو طلسماتی جال ہم نے اپنے گرد بن رکھا ہے ایک خوشنما دھوکا ہے جو بالآخر موت کے دروازے پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ غمزدہ انسانوں کی اکلوتی اُمید خدا تعالیٰ کی عبادت ہے جس میں سکون و انبساط کا حقیقی راز پنہاں ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ باری تعالیٰ ہمیں اپنے رحم و کرم سے نوازتا ہے۔ ہماری خطاؤں سے درگذر کرتا ہے اور ہمیں جنت بریں کی بشارت دیتا ہے اس جنت کی بشارت جہاں ہم اپنے عزیزوں دوستوں اور ہر عمر کے نیک اور برگزیدہ لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ یہ کس قدر حیرت انگیز اور ولولہ انگیز مصاحبت ہوگی جس کے بارے میں قرآن شریف ہمیں بتاتا ہے :

"یقیناً اللہ تعالیٰ کا قرب ہمارے دلوں کو شادمانی عطا کرے گا"

**سوال** :۔ اسلام قبول کرنے کے بعد پردے کی پابندی سے جو مسائل پیدا ہوئے وہ آپ نے کس طرح حل کئے ؟

**مریم** :۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں امریکہ میں اسلام قبول کیا اور اس کے فوراً بعد ہی نہایت پاکیزہ اور سادہ لباس پہننا شروع کر دیا مگر میرا لباس ماحول کے اس قدر مخالف بھی نہ تھا کہ لوگوں کیلئے عجوبہ ہوتا۔ اسی طرح میں نے ہر قسم کے زیورات کا استعمال ترک کر دیا ۔ لپ اسٹک اور دوسرے غازے وغیرہ جو مجھے پہلے اپنے والدین کی دلجوئی کے لیے استعمال کرنے پڑتے تھے، اگرچہ میں نے کبھی انہیں جنس مخالف کے التفات کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، اب میں نے بالکل ہی چھوڑ دیئے، پھر بھی برقعہ پہننا اس ماحول میں ناممکنات میں سے تھا اور مجھے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مزاج کے خلاف اس کے بغیر ہی کام چلانا پڑا۔ ساتھ ہی ساتھ جب کبھی مجھے کسی مردانہ یا مخلوط مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوتا تو میں اسلام کے موضوع پر بحث کرنا اور تبلیغ کے فرائض انجام دینے کی پوری کوشش کرتی۔ آٹھ برس پہلے پاکستان آنے کے فوراً بعد میں نے برقعہ کا استعمال شروع کر دیا۔ اب جب بھی مجھے گھر سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو برقعہ اوڑھتی ہوں۔ ہمارے یہاں نوکر نہیں ہے اس لیے سودا سلف اور دوسری ضروریات زندگی کے لیے مجھے اپنے مقامی بازار تک بھی جانا پڑتا ہے اسی طرح میں پڑوس میں اپنی سہیلیوں سے ملنے بھی چلی جاتی ہوں۔ گھر سے باہر بغیر برقعے کے میں خود کو عریاں خیال کرتی ہوں۔

میں پردے میں پختہ یقین رکھتی ہوں، کیونکہ اسلام کی دوسرے مذاہب پر برتری اسی وجہ سے ہے کہ قرآن و سنت صرف بے حیائی اور بدکاری پر پابندی لگانے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بے حیائی اور بدکاری کے اسباب کو بھی ختم کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی حفاظت کے لیے یہ امر بے حد ضروری ہے کہ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط پر پابندی عائد کر دی جائے، ہند و پاک کے راسخ العقیدہ خاندانوں میں پردہ صدیوں سے احکام شریعت میں ایک شدید ترین اہمیت کا حامل خیال کیا جاتا رہا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت صرف اس شرط پر دی ہے کہ وہ مناسب لباس پہن کر جائیں اور شریفانہ طریقے سے چلیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورتیں مسجد بھی جا سکتی ہیں، اگرچہ ان کے لیے گھر میں نماز پڑھ لینا بھی درست ہے۔ اس طرح جب عورتیں گھر کے دھندوں سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی بھی اجازت ہے اسی طرح وہ شادی کی تقاریب میں بھی شریک ہو سکتی ہے

**سوال** :۔ آج کل آپ کی بسر کیسے ہو رہی ہے، کیا آپ زندگی کے اس ڈھب سے مطمئن ہیں ؟

**مریم** :۔ میں نے اپنے اوقات کو پڑھنے لکھنے، اپنے تین بچوں اور گھر کی دیکھ بھال میں برابر بانٹ رکھا ہے میں وقت کی قیمت جانتی ہوں اور اسے گنوا بیٹھنے سے ریڈیو یا ٹیلی وژن پر ضائع نہیں کرتی۔ پاکستان میں آتے ہوئے مجھے آٹھ سال بیت گئے۔ اس پوری مدت میں کبھی سینما ہاؤس نہیں گئی، اور نہ کبھی اس خرافات سے جسے تفریح کا نام دیا جاتا ہے لطف اٹھانے کے لیے میرے دل میں ہلکی سی خواہش ہی پیدا ہوئی۔ تین پیارے پیارے شریر اور تندرست بچے کسی بھی ماں کو ہر روز چوبیس گھنٹے کی تفریح مہیا کر سکتے ہیں پھر بھی جب

مزید دل بہلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اپنے نو سالہ پالتو طوطے سے دل بہلا لیا کرتی ہوں جو آٹھ سال سے میرے پاس موجود ہے خدائے رحیم و کریم کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میرے سارے فکر اور دلدّر دور کر دیئے، اور میں اپنے شوہر بچوں اور اپنی مطالعاتی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ جس بیوی کا شوہر خوش اور مطمئن ہو اس کے لیے اس دُنیا میں اس سے زیادہ کوئی چیز باعث اطمینان نہیں ہو سکتی اور حقیقی اور ابدی مسرت تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب مرتے مرتے خدا تعالیٰ انسان کے اعمال کو اپنی قبولیت اور رضامندی سے سرفراز کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ ہے جس کی میں تمنائی ہوں۔

**سوال** ۔ آپ اپنے بچوں کو کون سی تعلیم دلا رہی ہیں اور اس تعلیم کے آپ کے بچوں پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟

**مریم** ۔ اپنے بچوں کی تعلیم اور ان کے مستقبل کی فکر ہمیشہ مجھے متفکر اور مضطرب رکھتی ہے میرے دو بچے اسکول جاتے ہیں مگر میں اردو اور انگلش دونوں قسم کے اسکولوں سے مطمئن نہیں ہوں جہاں انتہائی گھٹیا اور لادینیت پر مبنی انگریزی علوم کی تدریس ہوتی ہے اور یہ تعلیم ہر مثبت رجحان کی دشمن ہے، اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھاؤں جس طرح خود میں نے پڑھا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بمشکل چند اسکول ایسے ملیں گے جہاں طلبہ کو کما حقہ، اسلام کی تعلیم عصری تقاضوں کے مطابق دی جاتی ہو۔ میرے شوہر تو دن رات جماعت اسلامی کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور بچوں کی تربیت کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں بچتا، لہٰذا تمام ذمہ داری تنہا مجھ پر پڑتی ہے خدا مجھے اس عہدہ برآ ہونے کے لیے قوت و صلاحیت عطا فرمائے اس ناسازگار فضا اور ناموافق حالات میں بچوں کے مستقبل کے بارے میں مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے اور خدا سے ہر وقت دعا مانگتی رہتی ہوں کہ وہ انہیں راست عقیدے کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم رکھے

**سوال** آپ اپنی مسلمان بہنوں کے نام کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟

**مریم** اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام ذہین قابل مستعد اور مخلص مسلمان بہنیں چاہے وہ کسی گروہ یا قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں ایک موثر اور فعال تحریک منظم کریں جس میں اپنے بچوں کو بھی شامل کرلیں اگرچہ ماؤں کی اپنے بچوں کو اسلامی تربیت دینے کے لیے انفرادی کوششیں بھی قابل قدر ہیں، خصوصاً ان حالات میں جب گھروں سے باہر خوفناک برائیوں کا راج ہے مگر جو مسلم خواتین فی الواقع اسلامی قانون کا احترام اور اجراء چاہتی ہیں میں سمجھتی ہوں کہ وہ باہم متحد ہو کر کوشش کریں اور اپنے بچوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں ہم اپنے بچوں سے کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر اسلام سے محبت کریں گے جبکہ ان کو اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم اور وہ تعلیم جو گلیوں اور بازاروں میں حاصل کرتے ہیں انہیں اسلام سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے اگر ہم یہ عذرِ لنگ پیش کریں کہ ہم گھر کے دھندوں، اپنے خاندان اور ذاتی مسائل میں اتنے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اس مسئلے پر توجہ نہیں دے سکتے تو ہمیں اپنے بچوں سے یہ زندگی، سینما بینی، رقص و سرود اور کھیل کود کے کاموں کے سوا کسی چیز میں دلچسپی لینے کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کام اس لیے نہیں کریں گے کہ ان کی فطرت خراب ہے، بلکہ اس لیے ان کا ماحول انہیں یہی کچھ سکھاتا ہے، اور اس کا کوئی بہتر متبادل ہمارے پاس نہیں اس مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خواتین جو مخلصانہ طور پر اسلامی تہذیب کے احیاء کی متمنی ہیں، انہیں چاہیئے کہ وہ خود متحد اور منظم ہوں اور اپنی متحدانہ کوشش سے ایسے اسلامی پرائمری اسکول قائم کریں جن میں ہم اپنے بچوں کو قرآن کے احکام، حضور کے ارشادات اور اسلاف کی زندگیوں سے آشنا کر سکیں، اور عربی زبان کی ابتدائی تعلیم دلا سکیں نماز اور وضو کا طریقہ سکھایا جائے، انتہائی محبت اور دلنشیں انداز سے اس کے معانی اور مطالب بھی سکھائے جائیں کلاسیں گھروں پر بھی لگ سکتی ہیں۔ اسلامی کتابیں اس ملک میں سستی ہیں، اس لیے یہ کام کچھ زیادہ روپے پیسے کا مطالبہ نہیں کرتا، البتہ اچھی نظم اوقات، قوت کار، تدابیر اور حکمت ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۴۴۷ پر)

پروفیسر فروغ احمد (شعبۂ اردو)

# علی گڑھ

# "ٹریڈیشن"

* * *

جس کالج کو سب سے پہلے میں نے دیکھا نصیب ہوا وہ تھا کلکتے کا سٹی کالج (دیر ہو جانے کے سبب اسلامیہ کالج کلکتہ میں داخلہ نہ مل سکا تھا) سٹی کالج میں ہندو اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اور اس وجہ سے ہندو ثقافت کے غلبے نے طبیعت کو بہت جلد ہی اچاٹ کر دیا۔ ۱۹۴۲ء میں جاپانی بمباری کا خطرہ درپیش ہونے کے سبب کلکتے کی تمام درس گاہیں غیر معینہ عرصے کے لیے بند ہو گئیں تو سلسلۂ تعلیم سال بھر سے زیادہ عرصے تک منقطع رہا۔ ۱۹۴۴ء میں ایک دوست کے مشورے پر علی گڑھ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور والد صاحب مرحوم نے اس کی منظوری دے دی۔

علی گڑھ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جب ٹرین رکی، تو وہاں علی گڑھ کٹ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس متعدد جوان یار دوستوں پر شروع ہی سے تکتے ہوئے باوقار انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں ہر ایک تھا PROCTOR — میں سمجھا یہ نوجوان شاید بولتے ہوئے دل کے استعمال کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔ مع ساز و سامان دست بدست گیٹ سے ہوتا ہوا ایک تانگے تک پہنچا۔ "یونیورسٹی چلو" میں نے تانگے والے سے کہا۔ اس نے مڑ کر پوچھا "نئی مارک؟" مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ نئی مارک اور کیا مارک کیا ہے۔ اس لیے میں نے کہا "ہاں، اس چلے چلو یونیورسٹی۔" علی گڑھ کا تانگے والا سمجھ گیا کہ میں نووارد ہوں۔ بہرحال اس نے بقول خود "نئی مارک" ہی پہنچا کر دم لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سر سید ہال کا مشرقی دروازہ ہے یعنی "ایس ایس ایسٹ"۔ باب اسحاق سے داخل ہو کر اندر پہنچا تو پرووسٹ آفس کے ہیڈ کلرک نے فوری طور پر ایک کمرے میں جگہ دلوائی۔ داخلے کا مرحلہ بعد میں طے ہوا اور اب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی سب سے پہلے باتھ روم کی فکر ہوئی۔ وہاں ہر کمرے میں الگ اٹیچڈ باتھ روم تھا لیکن وہ لغوی معنوں میں صرف باتھ روم ہی ہوتا ہے یعنی غسل خانہ۔ پانی لینے کے لیے نلکے کی ٹونٹی کھولی تو پانی ندارد۔ گھڑا بھی بھرا ہوا خالی ہی پڑا تھا۔ لوٹا اٹھایا اور روم بیرر سے پانی کے لیے دریافت کیا تو انہوں نے ایک رستہ دکھاتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ اوپر وارڈن صاحب کا کمرہ تھا (وہ ہسٹری کے پروفیسر تھے)۔ اندر پہنچ کر انہیں سلام کیا اور پانی کے لیے کہا، تو وہ مسکرا دیے اور اپنے باتھ روم میں ایک گھڑے سے پانی لینے کی اجازت دے دی۔

مجھے اوپر باتھ روم یا شاور پر آمدے میں کھڑے ہنس رہے تھے۔ اب میں سمجھ گیا کہ وارڈن صاحب کیوں مسکراتے تھے۔ گویا یہ پہلی "ایکٹیوٹی" (ACTIVITY) تھی جو علی گڑھ میں میرے ساتھ کی گئی۔ پانی کسی اور کمرے سے بھی دلوایا جا سکتا تھا۔ "ایکٹیوٹی" علی گڑھ کی خاص چیز ہے اور وہاں کی ایک مخصوص اصطلاح ہے یعنی وہ حرکت جو نوواردوں اور جونیئروں کے ساتھ کی جاتی ہے اور علی گڑھ ٹریڈیشن کے مطابق بالکل روا ہے۔ بہرحال جب میں نے بیت الخلا کے بارے میں دریافت کیا تو ایک صاحب نے وکٹوریہ گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ٹرنسالاں ماحول میں چند گرجا نما خوبصورت عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "جی؟ وہاں؟ وہ تو ..." میری بوکھلاہٹ کو وہ بھانپ گئے اور بولے "جی ہاں، وہ سارے کے سارے بیت الخلا ہیں، گرجا گھر ان میں سے ایک بھی نہیں"، اور میں بڑی کربیری سے ادھر لپکا۔ مجھے متعدد قصبے مختلف شہروں میں ملے ہوئے لیکن میں گویا ساید خواص چور رہا تھا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ "بانگ درا" میں جو اقبال کی ایک نظم "طلبائے علی گڑھ کالج کے نام" ہے اس میں ایک جگہ جب کلیسا کا فقرہ آتا ہے تو اقبال کی ایک مراد غالباً علی گڑھ کے ان کلیسا نما بیت الخلاؤں سے تو نہیں تھی۔

شہر سے باہر ریلوے لائن کے جانب شمال، تقریباً تین مربع میل میں پھیلی ہوئی یونیورسٹی ایک چھوٹی سی مہذب اور ماڈرن دیسی مسلم ریاست کا منظر پیش کرتی ہے۔ وہاں بار بار "علی گڑھ ٹریڈیشن" کا فقرہ کانوں سے ٹکرایا — خوب درستی کا معیار بھی تھا۔ ہر وہ شے معقول جو اس کے مطابق ہو اور ہر وہ شے نامعقول جو اس کے منافی ہو۔ ویسے "علی گڑھ ٹریڈیشن" میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے تھے تاہم قوم کی اکثریت ان رخنوں کے "شر" سے بڑی حد تک محفوظ تھی۔ کیا اساتذہ اور کیا طلبا، تقریباً ایک ہی یونیفارم میں — یعنی علی گڑھ کٹ شیروانی (گرمیوں میں سفید یا بادامی اور جاڑوں میں سیاہ) اور سر پر ترکی ٹوپی جس کی جگہ اب جناح کیپ لے رہی تھی۔ اس یونیفارم کے سبب طلبا و طلبہ یا اساتذہ

اور طلبہ کے درمیان بھی عموماً کوئی ظاہری امتیاز نہ تھا۔ وہاں اساتذہ کو سر نام صاحب سے خطاب کرتے تھے اس سے بے تکلفانہ ارتباط میں ضروری حدود کو جس طرح ملحوظ رکھا جاتا ہے اس کی مثال مجھے اور کہیں نہیں مل سکی اور جونیئر طلبہ کے درمیان بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا سا تعلق بھی علیگڑھ ٹریڈیشن کا طرۂ امتیاز رہا۔

یونیورسٹی کو علیگڑھ کے محاورے میں مادرِ علوم کہتے ہیں جو "Alma Mater" کا ترجمہ ہے۔ مادرِ علوم کی آغوش شفقت میں جس نے چند دن گزارے ہوں اس کی سیرت اسی حساب سے متعین ہوتی تھی۔ چاہے وہ امتحانات میں جتنا ناکام ہوا ہو، علیگڑھ ٹریڈیشن کے مطابق کوئی طالب علم "فیل" نہیں ہوتا تھا، البتہ اس سال وہ "ڈراپ" ہو جاتا تھا۔ اگر وہ جونیئر ناخواندہ ہوتا تو اُس کے ساتھ "انکشی ڈیٹی" پر سینئر کا حدود حق تھا جسے طلب کرنے کا کوئی بھی مجاز نہ تھا لیکن اس کے بھی کچھ حدود مقرر تھے۔ ان حدود کا خیال ہر طالب علم سینئر کو رکھنا پڑتا تھا۔ سینئر اور جونیئر کی رسمی اخلاقیات کی سمجھ کی طرح اور بہت سے مسلمات ادارے میں ساری حیات بھی احساسی "انکشی ڈیٹی" کے طور پر ہر سال ساری ساری اقامت گاہ میں اچانک "اسٹریچی ہال" کا ہنگامہ برپا ہوتا، اگر کسی جونیئر کو کمرے سے اس کی ٹھنڈک مل جاتی اور اُس رات وہ کہیں کھسک جانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا نام نوٹ کر لیا جاتا اور پھر بعد میں اُس کی خبر لی جاتی کیونکہ علیگڑھ ٹریڈیشن سے فرار ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ ایک رات کوئی بارہ ایک بجے سوتے سوتے جو جاگا تو سارا سوٹ قیامت کا بپا تھا۔ یہ اقامت گاہ کے مختلف کمروں پر ماری ماری ملتا رہا تھا۔ ادھر جونیئروں کا فردِ جرم کا دفتر کر رہا تھا۔ جلد ہی ختم ہونا تھا کہ ناموں کی فہرست سے میرا نام نکالا گیا تو میں جواس باختہ سلام عرض کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ ایک طرف سے آواز آئی "ذرا ناچ کر دکھاؤ"۔ مجال بشری کہ کسی میں بھی ہمت ہو کہ انکار کرے، میں نے ناچنا شروع کیا۔ ان جونیئروں کو ایک ذرا سا حکم ہی دینا تھا کہ قہقہوں کا ایک طوفان برپا ہوا۔ اب ان کا دوسرا نشانہ میں تھا کہ پھر دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ کہ الحمد اللہ جلد ہی خلاصی ہو گئی۔ جگر درا کبھی آنکھ اوپر دکھاتا، تو وہ کس جانی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، دوسرے دن ملاتے وقت لیکن محض "اسٹریچی ہال" کی ملاقات کے درمیان یہ گزر جانے کے بعد علیگڑھ میں کوئی جونیئر کسی سینئر سے ہمسری کرنے کا حق دار نہیں رہ جاتا۔ مدرسہ جو رہ گئے اس ٹھاٹ کا بدلہ ملا، ہڑا اسی لوڈا مینگ (؟) دل کی روٹیاں کھا کر ایک بار ہی خیر نہیں ہوئی، سینئر کی سے ہی نکلے… سب میں نے دل ہی دل میں کہا ہے

سہی شرط جو ٹھہری وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا با حسرت و یاس

لیکن علیگڑھ اُس روایت کی مکمل حمایت ہے جسے چھوڑ بھی دیں تو کبھی نہیں چھوڑتا۔ بھی حق ہی ہوئی اور ہوئی رہی اور ناتا چھٹ ۴۸ – ۱۹۴۹ء میں جب کہ میں سکنڈ ایلڈ ہوسٹل میں تھا، باضابطہ سینئر اسٹریچی ہال والی ٹولی میں بھی شریک ہوا اور "جبّہ مارنی" کے دور میں بھی لیکن علیگڑھ میں یہ میرا آخری سال تھا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے "علیگڑھ اولڈ بوائز" کی اُس وسیع برادری میں شامل ہو گیا، جو پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے اور ہر جگہ اسی بعض خصوصیات کے سبب ایک نام نمایاں ہے۔ اس طرح علیگڑھ کا ناطہ زندگی بھر کا طے ہوتا ہے اور یہ بات برصغیر کے اور کسی اقامتی دارالعلوم کے ساتھ نہیں ہے۔

تعلیمی معیار کے اعتبار سے برصغیر کے بعض دوسرے اقامتی دارالعلوم تو علیگڑھ والوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہوں گے لیکن وہ چیز جسے "علیگڑھ لائف" کہا جاتا ہے تمام تر خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ اپنی جگہ منفرد ہے۔ اس کی خوبیوں میں چند جو سامنے ہیں ایک عظیم برادری کا احساس ملی شعور، ہمہ جہتی سوجھ بوجھ، رواداری، خود اعتمادی، زندہ دلی، دلبستگی اور حوصلہ مندی۔ ان خوبیوں کے مقابلے میں کچھ برائیاں بھی ہیں، جو علیگڑھ والوں سے منسوب کی جاتی ہیں مثلاً طبقہ احساسِ برتری کھلنڈراپن، طاہرداری، منافقت اور سازش جہاں تک میرے ذاتی تجربے کی درست کے "بکری" یا "لامذہب" ہونے کے الزام کا تعلق ہے وہ محض ایک وقتی رد عمل تھا۔ اب شاید ہی کوئی علیگڑھین ملے گا، جسے "بکری" "لامذہب" کہا جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سب لوگ بالخصوص اساتذہ کے معاملے میں سائنس کے اساتذہ زیادہ تر اسلامی ذہن و فکر کے حامل تھے۔ شعبۂ دینیات کے اساتذہ بھی معدودے چند کو چھوڑ کر عام طور پر آزاد خیال اور روشن خیال ہونے کے باوجود اعتقاداً اور عملاً مسلمان تھے۔ میری علیگڑھ کی زندگی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ابتدا تو میں وہاں سائنس کا طالب علم تھا مگر انٹرمیڈیٹ کے بعد میں سائنس اور ہیومینٹیز کا تجربہ آزمایا یعنی جغرافیہ کے ساتھ ادبیات۔ تعلیم کا سلسلہ تقسیم برصغیر اور ہجرت کے بعد منقطع ہو گیا۔ اور میں جغرافیہ میں ایم اے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور خیال تھا کہ جغرافیہ کے ایک خاص مضمون میں الحاد کے جو کیڑے ہیں انہیں چن چن کر نکالوں اور اس مضمون کو اسلامی فلسفہ، تاریخ و تمدن سے ہم آہنگ کرنے کی کوئی راہ تلاش کروں لیکن اپنے یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی، بعض اُن خرابیوں کی جو بیشتر علیگڑھ والوں سے منسوب ہیں۔ منسوب کی جاتی ہیں۔ وہاں کے آداب اور حدود کا نظام ہی کچھ ایسا تھا کہ اس سے ذہن "خوبیاں" پیدا ہوتی ہیں جنہیں ہم آپ خرابیاں کہتے ہیں۔ جاگیرداری اور عسکری سامراج کے منصوبوں کا بندے سے تیار کرنے کے لیے جس رکھ رکھاؤ اور جس قسم کے اکھاڑ پچھاڑ کی ضرورت تھی اسے پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ زیادہ تر کھپت ایسے ہی افراد کی سازش ہوتی جو جی حضوری، ٹیپ ٹاپ، تعلّی اور جاسوسی کے میدان میں آگے نکلے۔ سٹرنگ تو یعنی گھس ماری علیگڑھ کی خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں ہیں ہیں مسکہ پالش کرنا، مارد عنایت ملنا۔ اس فن میں وہاں جو جتنا ماہر ہوتا اتنا ہی آگے بڑھتا۔

پراکٹر جس کا ذکر مضمون کے شروع ہی میں آیا ہے علیگڑھ لائف کے رکھ رکھاؤ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر پراکٹوریل سسٹم وہاں نہ ہوتا، تو علیگڑھ لائف بالکل ہی افراتفری کا شکار ہو جاتی۔ یہ گویا ایک قسم کا خود ساختہ پولیس سسٹم ہے، اس کی عملداری یونیورسٹی کے خطے میں مربع میل تک ہی محدود نہیں تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور ریلوے اسٹیشن سے آگے گنڈ گلے تک بلکہ مارس ہڑتک اس کے دائرہ کار میں شامل تھا۔ ہیڈ پراکٹر کوئی سینئر استاد ہوتا اور چار بہادر رضاکار میں ستون سمجھے جاتے تھے۔ یعنی ہمارے زمانے میں ستون سمجھے جاتے صدر کرنل حیدر ہوتے۔ اُن کے ماتحت اُوپر سے نیچے تک سب سے پراکٹر سب سینئر طلبہ تھے۔ پراکٹر کے اختیارات کافی وسیع تھے۔ کسی جونیئر کی شیروانی کے بٹن کھلے ہوں، تو اسے روک کر گردن تک لگوانا، سرِ عام کوئی جونیئر سگریٹ پی رہا ہو، تو اسے روکنا، شمشاد مارکیٹ، سینما، رہائش گاہ اور سرِوپ علیگڑھ کے لیے داخلوں انگ انگ پاس جاری کرنا۔ اگر بلا پاس کسی کو یونیورسٹی کے حدود سے باہر جاتے پکڑا جاتا، تو اس کا نام نوٹ کیا جاتا۔ علیگڑھ لائف میں خاص پراکٹوریل سسٹم کے بے شمار فوائد ہیں جن سے انکار ممکن نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے داخلی نظم و ضبط کے معاملے میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلبہ کو خود کفیل بنایا اور نازک سے نازک موقع پر بھی سرکاری پولیس کی مداخلت کی نوبت نہ آنے دی۔ جنگِ عظیم کے دوران بڑے بڑے مظاہروں کا ذکر میں نے سنا ہے جب اعلان بالفور، برطانوی پالیسی کے تحت فلسطین میں وطنِ یہود کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی، تو طلبائے علیگڑھ نے زبردست مظاہرہ کیا تھا جلوس کی شکل میں نعرے لگاتا ہوا طلبہ کا ایک سیلاب شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرا۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد بعض افسروں پر بغاوت کے مقدمے چلے اور پھر کانگریس لیڈر شاہنواز، کورری اور مسلم لیگ لیڈر شاہد علی کو ملزم قرار دیا گیا، تو کیا مذاق ایکشن

جزل ڈائلک کے خلاف طلبائے علیگڑھ نے عظیم الشان جلوس نکالا۔ آگے آگے ڈائلک کا مصنوعی جنازہ تھا اور اہل جلوس "ڈائلک ہائے ہائے" کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ضلع کچہری کے سامنے اس جنازے کو آگ لگائی گئی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ جاتے ہوئے علیگڑھ اسٹیشن سے گزر رہے تھے تو یونیورسٹی کے تمام طلبہ نے اسٹیشن پر ان کے خلاف مظاہرہ کیا۔ ایسا ہی مظاہرہ وہ جنگ کے آخری دنوں میں شیر بنگال مولوی فضل الحق کے خلاف کر چکے تھے، جو مسلم لیگ سے ناتا توڑ کر وائسرائے کی ڈیفنس کونسل کے رکن بن گئے تھے۔ یہ تمام مظاہرے حدود میں رہتے۔ دور دور تک پولیس کی نفری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صرف اپنے پراکٹر صاحب اور محترم اساتذہ تھے جن کے ہوتے ہوئے کسی ہولی سد کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وائس چانسلر کے خلاف (ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم) کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ ہوا۔ مظاہرین وائس چانسلر کی معزولی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر بھی صرف پراکٹر اور اساتذہ نے مظاہرین کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دیا۔ سچ یہ ہے کہ علیگڑھ میں پراکٹوریل سسٹم جہاں روزمرہ ڈسپلن کا ضامن رہا ہے وہاں غیر معمولی حالات میں بھی اجتماعی نظم و ضبط کا ضامن رہا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز صرف علیگڑھ ٹریڈیشن ہے اور اس ٹریڈیشن کا احترام۔ تاہم اس سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا کہ پراکٹوریل سسٹم کا ڈھانچہ طلبہ کی رائے عامہ سے استوار نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف وہاں کی ہیئت حاکمہ کی خوش نودی ہی اس کی واحد اساس ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں اثر و رسوخ اور برتری کا حصول کن راہوں سے ہوا کرتا ہے۔

لہٰذا عام طلبہ کے کردار میں اگر کچھ خراسان راہ پاتی ہیں، تو وہ خراسان در جہا سنگین شکل میں دوسرے اسلامی دارالعلوموں میں راہ پا سکتی تھیں، کیونکہ ان دارالعلوموں میں علیگڑھ ٹریڈیشن جیسی جو اجتماعی سلوک اور توازن

کی حامل ہو کارروایات موجود نہیں ہیں۔ ہاں اگر تحریک علیگڑھ ہی

جیسی کسی تعلیمی اور سماجی تحریک کے طویل تعمیری عمل کے نتیجے میں کوئی ادارہ وجود میں آتا، تو پراکٹوریل سسٹم وہاں کارآمد ہو سکتا ہے۔ بلکہ بہتر حالات میں اسے ان خرابیوں سے بھی پاک رکھا جا سکتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نصاب تعلیم میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، جسے ہم اس کا طرۂ امتیاز قرار دے سکیں۔ سوائے اس کے کہ (THEOLOGY) دینیات

کا لازمی کورس ہے، جو بی اے یا بی ایس سی تک لازمی ہے۔ مسلمان طلبہ کے لیے سنی تھیالوجی یا شیعہ تھیالوجی اور غیر مسلم طلبہ کے لیے مسلم ہسٹری کا لازمی متبادل نصاب۔ تعلیم وہاں غیر مخلوط ہی، ان معنوں میں کہ طالبات کا کالج الگ ہے۔ اگر وہ طلبہ کے کلاس روم میں آئیں، تو برقعوں میں ہوتیں اور گیلری کی پچھلی نشستوں پر طلبہ کے پیچھے بیٹھتیں۔ آتے جاتے راہ چلتے اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے خوش طبعی کے اکا دکا واقعات ہو جاتے، لیکن شائستگی کے حدود پامال نہ ہوتے۔

علی الصباح ناشتے سے پہلے، لازمی طور پر ڈرل میں جانا تو جامعہ کی میرے لیے ایک غیر متوقع تجربہ بھی علیگڑھ کی جاڑے والی سخت ترین سردیوں میں بھی تو سویرے بستر میں لحاف کو پرے پٹک کر گرد آلود میدان میں اور "لفٹ رائٹ" کرنا" لہو گرم رکھنے کا تھا اک بہانہ"

جمہوری اور پارلیمانی ادارے کی تربیت یونین کے انتخابات اور یونین ہال کے اجلاسوں میں ہوتی تھی۔ تقریروں کے دوران ہوٹنگ اور تالیوں کا وہاں ایک مخصوص طرز ہے، جو کہیں اور نہیں۔ وہاں تالیوں میں دہی کر تا ثر تھا، جو فوجی پریڈ میں "لفٹ رائٹ" کرتے ہوئے قدم سے قدم ملانے میں کر تاثر تھا۔ وہاں کی سارا زندگی کے ہر شعبے میں یک جہتی و ہم آہنگی کا پورا حق ادا کیا جاتا ہے۔

ہر قسم کے کھیلوں اور تفریحات کی آزادی کے علاوہ وقتاً فوقتاً فیئر لگتے اور فن الندیہ کے مقابلے اسی کثرت سے ہوتے کہ علیگڑھ کے کھلاڑی گھڑ سواری، تیراکی، نیزہ بازی وغیرہ سے لے کر بین الکلیاتی اور بین الاقوامی سطح تک اپنی برتری کا خوب خوب مظاہرہ کرتے۔ ہر مضمون کا جہاں تک تعلق ہے، وہاں کتابوں کے کیڑے کی بھی کمی نہیں۔ کلاس روم لیکچر سے زیادہ مہمان اسکالرز اور خود اپنے اساتذہ کے توسیعی لیکچر بڑے شوق سے سنے جاتے۔ مہمان اسکالرز: ابوالحسن ندوی، مفتی محمد شفیع، حافظ کفایت حسین، عراق، شام، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ٹوڈے، شاعر اور نامور گوپال اچاریہ کے لیکچر ہم نے یکساں ذوق شوق سے سنے۔ یونیورسٹی کے مصلا میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم، ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، پروفیسر ام بی مرزا، ڈاکٹر آرام چوہدری اور پروفیسر الف جے ملاڈل کے لیکچر، جو نقوش ذہنوں پر چھوڑتے ہیں، مٹ نہیں سکتے۔ "الف جے ملاڈل یعنی" اکا ہم نے اردو میں ترجمہ کیا تھا، تو جاسوسی بھی ہے اور کافی مشہور بھی یعنی "فیض جنگ ہمدانی" پرو وائس چانسلر پروفیسر بی اے حلیم (A B A HAI IM) جو "ابا حلیم" مانے جاتے تھے، آیا "محض" کی بنا پر نہیں، بلکہ اس معاملے میں کہ وہ سیکولر کے معاملے میں وہ ابا ہی کی طرح سخت تھے۔ طلبہ نے اپنے جن اساتذہ کا جو نام رکھ دیا، اُسی نام سے وہ مشہور ہوا۔ مثلاً ایک نام ہے "قاری محمود"۔ قاری ان کے نام کا کوئی خاندانی جز و نہیں تھا۔ نہ وہ قرآن شریف کے قاری تھے۔ وہ ہمیں شیکسپیئر کا ڈراما پڑھاتے تھے اور ڈرامے کو ادا کرنے کا طرز ان کا ایسا نمایاں تھا کہ لڑکوں نے ان کا نام ہی رکھ دیا "قاری محمود"۔ اساتذہ کا تذکرہ ایسا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اساتذہ پرستی کا الزام بھی میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے اس قصے کو یہیں ترک کرتا ہوں۔

ایک خصوصیت جو علیگڑھ میں مجھے بے حد نمایاں محسوس ہوتی، وہ ہے رواداری۔ سنی تھیالوجی اور شیعہ تھیالوجی کی تفریق کے باوجود وہاں شیعہ سنی تعصب کہیں نام کو بھی محسوس نہ ہوتا۔ یونیورسٹی کی ایک ہی جامع مسجد میں دونوں فرقے نماز پڑھتے، جماعتیں بے شک الگ الگ ہوتیں۔ پہلے سنیوں کی، اس کے بعد شیعوں کی۔ جسے وہاں کی زبان میں سکینڈ شو کہا جاتا تھا اور اس پر ہم دونوں محظوظ ہوتے تھے۔ یہ تو فرقہ وارانہ رواداری کی بات ہوئی۔ سیاسی اختلافات بھی وہاں معاندانہ شکل اختیار نہ کرتے۔ گھتیاں کھلتی ہوتیں، دو ایک سال تو کبھی نوبت ہی نہ آتی۔ اعانات کرانا گرمی میں بھی تصادم کی کوئی واردات میں نے اپنی چار سالہ زندگی میں وہاں نہیں دیکھی۔ میرا تعلق حلقہ ہمدرداں جماعت اسلامی سے تھا لیکن میں مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں بھی عملی دلچسپی لیتا تھا۔ میں ۱۹۴۶ء کی بات کر رہا ہوں۔

اساتذہ میں ہر عقیدے کے اساتذہ تھے۔ اسی لیکچر میں بلا لحاظ حالات بڑی جرأت کی سے سنائے اور بد مزگی پیدا نہ ہونے دیتے۔ تقسیم برصغیر کے ہنگاموں کے سبب میرا تعلیمی سلسلہ ایک سال منقطع رہا۔ بی اے کی تکمیل کے لیے جب میں دوبارہ ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ پہنچا تو عام فضا میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی۔ ایک طرف رواداری کا یہ عالم، دوسری طرف تہذیبی خود اعتماری کا ایسا گہرا اثر کہ یونیورسٹی کے نام سے "مسلم" کا لفظ خارج کرانے کی کوئی سرکاری مہم آج تک کامیاب نہ ہو سکی۔ رواداری اور عصبیت کا یہ خوش گوار امتزاج علیگڑھ ٹریڈیشن کا خاص وصف ہے۔ جس کے سلسلے کر دو جس توازن کی بدولت علیگڑھ ٹریڈیشن

کی بعض کمزوریاں سنگین شکل اختیار نہیں کر سکیں۔ پاکستان آنے کے بعد اطلاع ملی کہ جب پروفیسر آل احمد سرور نے وہاں مخلوط مجالس اور ناچ رنگ کی طرح ڈالنے کی کوشش کی، تو رشید صاحب مرحوم نے یہ فقرہ چست کیا "لوگ دارالعلوم کو دارالسرور بنانے چلے ہیں"۔ اور پھر سرور صاحب کی ایک نہ چلی محض ایک فقرے نے وہ کام کر دکھایا جو شاید کسی جابر حکمران کے حکم امتناعی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ رشید صاحب علیگڑھ کے بعض ناطقہ تھے اور اب آگے کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

***

# جامعہ خواتین نصابی گروپس

> جامعہ خواتین کا بڑا مسئلہ نصابی مضامین کی ترتیب اور اس کے بعد تدوین کا ہے۔ نئی نصابی کتب کی تیاری کے لیے دو چار سال کا زمانہ چاہیے۔ پہلے مفصل نصابی خاکہ بنے، پھر اس کے مطابق کتابیں لکھی جائیں۔ اس لیے اور ضروری ہے کہ کام کا لازمی حصہ ابھی سے تیار ہونا چاہیے۔ (ترجمان القرآن)

ہمارا خیال ہے کہ ذیل میں درج مضامین کو بھی جامعہ خواتین میں آسانی شروع کیا جا سکتا ہے، اس لئے کام کا آغاز کر دیا جائے۔

## مضامین

مضامین کے حسب ذیل گروپ تجویز کیے گئے ہیں

### ۱۔ فلسفہ گروپ

الٰہیات، نفسیات، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تعلیم (تعلیمی نفسیات)، فلسفہ تمدن و سیاست، اجتماعی نفسیات، فلسفہ جرم و سزا، وغیرہ۔

### ۲۔ سائنس گروپ

فزکس، کیمسٹری، فرمالوجی، بیالوجی، بائیو کیمسٹری، شماریات، ریاضی، جغرافیہ طبعی و اقتصادی وغیرہ

### ۳۔ انسانیات

تاریخ، تاریخ اسلام، تاریخ عالم اسلام (موجودہ ـــــ مغربی امپیریلزم کے ظہور سے اب تک) ـــــ تاریخ تحریکات اسلامی، برصغیر کی تاریخ، تاریخ پاکستان، سوشیالوجی، اقتصادیات، پولیٹیکل سائنس، قانون

### ۴۔ لسانیات

اردو، پنجابی، پشتو، سندھی، فرنچ، انگریزی، فارسی، عربی، روسی، چینی وغیرہ، ہندی، سنسکرت، بنگلہ، تامل، سنہالی وغیرہ، عربی، فارسی، ترکی، سواحلی وغیرہ

### ۵۔ اسلامیات

تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام اور تاریخ امت محمدیہ (دور نبوت اور خلافت ادوار مابعد)، اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ، جدید مادی تحریکات کا مطالعہ، ماضی اور حال کی اسلامی تحریکات کا مطالعہ

اسلامی نقطہ نظر سے تہذیب جدید کا ناقدانہ مطالعہ۔

### ۶۔ انتہائی لازمی اور بنیادی مضمون بعنوان اسلامی حکمت حیات

یہ مضمون تعلیم کے ابتدائی درجے سے شروع ہو کر آخر تک جائے گا اور تمام علوم و فنون کے ساتھ یہ انتہائی لازمی ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد طلبہ و طالبات کے ذہن و کردار کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

اس مضمون میں اسلام کے بنیادی طرز فکر، عقائد، عبادات، اخلاقیات اور حدود و حلال و حرام کے علاوہ اسلامی سیاست، اسلامی معاشرت اور اسلامی معیشت کے پورے پورے خاکے بیان ہوں گے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام وغیرہ علوم کے نشوونما کی معلومات دی جائیں گی۔ ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علوم و افکار کی تاریخ اور قرون وسطیٰ کا نشوونما اور پیش حاکمیت میں پیدا ہونے والے تغیرات جدید و طالبات کے سامنے لائے جائیں گے۔ ماضی اور حال میں برپا ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکات کو پیش کیا جائے گا۔ موجودہ دنیا میں غالب قوتوں اور جدید تہذیب اور اس کی پیدا کردہ سیاسی و معاشی تحریکات کے مقابلے میں اسلام کی دعوت کو ابھارنے اور تحریکی انداز پر کام کرنے کے لیے رہنمائی دی جائے گی۔ ملت اسلامیہ کی اہم تاریخی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا بیان ہوگا اور دور حاضر میں عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں کا تعارف کرایا جائے گا۔ اہم اداروں اور کتابوں پر نظر ڈالی جائے گی۔

اس مضمون کا دوسرا جزو پاکستان اسٹڈیز یا مطالعہ پاکستان ہوگا جو پہلے سے رائج ہے۔

اس مضمون کا تیسرا جزو خواتین کے لیے خاص طور پر مرتب کرنا ہوگا۔ اس جزو میں خواتین کے مقام و منصب اور حقوق و فرائض پیش کیے جائیں گے۔ دائرہ زوجیت اور فریضہ امومت کے متعلق اسلامی حکمت اور اس کے ساتھ احکام مذکور ہوں گے۔ تاریخ اسلام میں قرون اولیٰ سے اب تک خواتین کے ایمانی و اخلاقی اور علمی و فکری اور تعلیمی و تصنیفی کارنامے پیش کیے جائیں گے، سرمغرب

کی تحریک، آزادیٔ نسواں اور ترقی نسواں اور مساوات مرد و زن کے نظریے کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ پردے کے موضوع پر عقلی تجزیات اور کسی دینی احکام کی حکمت و مصلحت کو اُجاگر کیا جائے گا۔ کسی ایک کتاب کو پڑھے بغیر نظام تعلیم پر اوّل تا آخر پھیلائے ہوئے سلیبس کے مطابق مدرسہ کرایا جائیگا

باقی تمام مضامین کی جو درسیات تیار ہونے کے وقت تک ان کا کام چلایا جا سکتا ہے کہ مضمون کے ساتھ ایک مختصر سا اضافی کورس ایسا شامل کر دیا جائے جو حسب ذیل امور پر مشتمل ہو

۱ اس مضمون کے متعلق قرآن اور حدیث کی رہنمائی

۲۔ اس خاص دائرہ علم میں مسلمانوں کا کیا پچھلا کام اور موجودہ دور میں ہونے والی تحقیق

۳ اس مضمون میں لادینی فلسفہ پرستانہ تہذیب کے شامل شدہ نظریات و تصورات پر تنقیدی بحث

یہ مواد تمام اردو، انگریزی اور عربی میں اب تک کے شائع شدہ مواد لٹریچر (کتب اور مقالات و مضامین) سے فوری طور پر متعلقات یا اقتباسات کی صورت میں مرتب کرایا جا سکتا ہے

ایسے اضافی کورس میں سے بھی امتحانی سوالات دیئے جائیں جو کم از کم ۲۵ فیصد نمبروں کے ہوں۔ اضافی کورس (یعنی اسلامی حصہ اور مغربی تہذیب کے متعلق تنقیدی حصہ) سے متعلق پرچے یا سوالات میں پاس ہونے کے بغیر کسی کو کامیاب قرار دیا جائے

یہ کام مروجہ کتب کے ساتھ ساتھ اور ان کے مباحث پر حاشیہ نوٹس لکھوا کر بھی لیا جا سکتا ہے

دوسرا ضروری کام فوری کرنے کے لیے یہ ہے کہ ہر مضمون سے متعلق ٹیچرز گائیڈ بکس تیار کی جائیں جن میں واضح کر دیا جائے کہ کسی مضمون کو پڑھاتے ہوئے کیا مطلوب ہے اور کیسا ... میں تیار کرنا ہے۔ نیز اہم اور ضروری مواد بھی گائیڈ بکس میں شامل کیا جائے

## مضامین کے لحاظ سے گروپس

اسلامی حکمت حیات (یکساں اسٹینڈرڈ) (مسلم خاتون کا منصب) اوّل درجے کا لازمی مضمون ہوگا اور ہر گروپ کے لیے ضروری

گروپس حسب ذیل ہوں گے

۱ فلسفہ گروپ کوئی سے دو مضامین فلسفہ + لسانیات یا اسلامیات یا انسانیات میں سے ایک مضمون

۲ انسانیات گروپ کوئی سے دو مضامین انسانیات میں سے + لسانیات یا اسلامیات یا فلسفہ میں سے ایک مضمون

۳ اسلامیات گروپ۔ کوئی سے دو مضامین اسلامیات میں سے + لسانیات یا فلسفہ سے ایک مضمون۔

۴ سائنس گروپ، کوئی سے دو مضامین، سائنس میں سے + اسلامیات یا لسانیات یا انسانیات یا فلسفہ میں سے ایک مضمون

۵ لسانیات گروپ کوئی سی دو زبانیں + اسلامیات یا انسانیات یا فلسفہ میں ایک مضمون۔

یونیورسٹی اور پوسٹ گریجویٹ طالبات کے لیے پانچ گروپ مقرر کئے گئے ہیں ہر ایک کو اسلامی حکمت حیات سمیت جملہ چار مضامین لینے ہوں گے

پہلے تمام مدارج تعلیم کے لیے اسی کے مطابق نصاب مرتب کرنا ہوگا

## خواتین کے لیے اقتصادی راستہ

تعلیم پاکر ڈگریوں کی راہ پر دوڑ لگانے کا جو سلسلہ انگریزی دور سے مردوں میں چلا اب خواتین میں بھی عام ہو رہا ہے، حالانکہ جہاں جسم یا وہ مردوں کے لیے کافی روزگار ... ہر وہاں کام بھی اس میدان میں آ پہنچا ملک کے مجموعی مفاد کے لیے مناسب نہیں ہے کیوں نہ ایسے اور پیشہ وارانہ ترتیب سے خواتین کو آراستہ کر دیا جائے کہ وہ یونیورسٹی سے نکلتے ہی پورے اطمینان کے ساتھ پردہ داری کو قائم رکھتے ہوئے نہایت منفعت بخش کام سرانجام کر سکیں

اس سلسلے کے مختلف درجوں کے کام بھی میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے تک پھیلا دیے جا سکتے ہیں عام کاموں میں سے گھریلو ٹائپ، ترجمہ و تصنیف کے کام کیے جا سکتے، ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار چلا سکتا ہے۔ ہیئر ڈریسنگ اور کڑھائی ... حاصل کر کے گھر بیٹھ کر ... سکتی ہیں۔ بہت ہیں مگر تفصیل میں جانا ممکن نہیں، البتہ اتنا کہوں گا کہ کسی دکان پر سیلز گرل یا ہوٹل یا دفتر میں اسسٹنٹ سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ گھروں میں دوا سازی کا کام اور ... اور سیاہی، خصوصاً پریس کے لیے ... کام ... اور باعزت طریقے سے کیے جا سکتے ہیں

تفصیل وار ... خواتین کھلونوں میں دلچسپی لیں اور جانوروں اور ... کے لیے جدید ... کھلونوں کی ڈرائیونگ اور ... کا استعمال بھی جا سکتا ہے۔

خواتین یونیورسٹی میں اجتماعی خطابوں کے ذریعے، درس قرآن و حدیث کے ذریعے اسلامی تعارف اور تہواروں کا صحیح طریق سے اہتمام کرنے کے ذریعے، خاص خاص موضوعات پر اسلامی شخصیتوں (خصوصیت سے خواتین) کو لیکچر کرنے کے لیے مدعو کرنے کے ذریعے، اسلامی ... کردار کی تعمیر کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے

---

## بقیہ — ہاسٹل میں پڑھنا

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے اپنے تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی اور انہیں مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا، کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لے ہاسٹل میں آ رہے ہیں جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہرباں کی سی سوچ لی جس کے ارد گرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے، تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے ہم اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے!

ہم پر تو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے

احمد شاہ

# ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی۔اے بھی پاس کر لیا لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہوسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک دفعہ ہی ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھ رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی اس لیے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور دیانت دار مصنف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام وغیرہ بے شمار اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی، تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے، تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو گو ضرور دخل دیا گیا، لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک اجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے، تو بہت خوب تھا، لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہوسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبہ باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے، تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور، مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید، مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت

[illegible] کرنے کے بہت سے طریقوں کو دریافت کرنے سے مجھ پر یہ ثابت کیا [illegible] کہ واقعی میرے ماموں میں مجھے [illegible] ایک شہر [illegible] تھا، تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ ایسی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی ترقی کے پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر چھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ کسی نہ کسی کو ساتھ لیا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ باتیں تیرا یاس [illegible] کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈرامہ دیکھنا چاہیے تو دور تماشا ہی سے کوئی تحریک ہے۔ جسے تیرنا آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا سلوایا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں، اس کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سا ہمارا زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ ان تو دوستوں سے ملاقات ہی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ جس دل میں لئے تھے ہمیں وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک کشادگی ہونی چاہیے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکا جا سکتا ہے، گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے، کون سا ملازم سوالی ہے، کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ ایسی زندگی کو شدت سے جاننے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا، والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہوسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے مرارا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و ستم کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بے چارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بے چارا ہاسٹل کو واپس آ رہا تھا، چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا، صرف دو منٹ۔ بس صاحب، اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا، پولیس سے تحقیقات کروائی اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے یا الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بے چارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بے چارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انہیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے، تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ ایجاد کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آ گئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ لمبر بتاؤں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ والدین اغراض کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر خط ان کے نام منی آرڈر رسید آرڈر چلا آتا ہے۔

ناداں آں چناں روزی رساند — کہ داناں اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، تو ایک دن والد نے پوچھا:

"تمہارا شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا، "دیکھئے، مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے، ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بے کار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— خیر دماغ تو بے کار نہیں ہونا چاہیے۔ [illegible] ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی تو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد [illegible]

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت اور سیرت کہنا چاہیے۔ سیرت ایک رنگ سا لفظ ہے سیرت کے لفظ سے یہی لگتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو بیانگ کلام جانا لیا، لیکن یہ بھی ناکام رہا۔ والد کہنے لگے: "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن سے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا: "چال چلن ہی کہہ لیجیے۔"

کہنے لگے: "علمی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا: "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

کہنے لگے: "یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے ستیا ناس ہو جاتا ہے؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی، کہا: "جی ہاں۔"

"بعض ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم عام طالب علموں سے زیادہ باشعور ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ بولنے میں بیباک زیادہ ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں۔"

پوچھنے لگے: "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ رشید صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا اسے کوشش میں نے اس وقت تو ہر سے سنایا تھا۔

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں رہنے سے، تو ہر اس کے بعد بھی گزر جانے کے دن کا تار[illegible]

ہر سال میری درخواست نامنظور ہوتا رہا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ میں نے ساری کام نہیں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا، تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے اقتصادی پہلو پر زور دیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان مردوں اور کالج کے ملاقاتوں سے انسان پاس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا اور اچھی ہوتی ہے صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے، مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں کہہ دیا کہ بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں، تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں گزرتا گیا میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ایک بے معنی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کر ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں، حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی اے کا امتحان دیا، تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا، تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا، لیکن کلام میں وہ پہلی سی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلی سی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکارا ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں فیل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا، تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لیے ہم اس میں کچھ ... ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا، لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر ٹکٹ کے ہم اپنے ہمراہی مسافروں کے ساتھ ریل گاڑی کے کسی میں سفر کر رہے ہوں نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی اے میں داخل ہو گئے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی اے میں ریاضی نہیں تھی، اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام کرنا پڑے گا، لیکن بہت سے لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ ہم ... لوجب ہم نے اس کی وجہ پوچھی، تو کسی نے بھی کوئی معقول جواب نہ دیا، لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا، تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے گویا ہم بجائے تین کے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا ذاتی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی، اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضمون پڑھنے ہوتے، تو جو وقت میں نے ایک چوتھے مضمون کو دے رکھا تھا، وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا، بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کر دیتا، تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہوا جو لازم تھا، یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا، لیکن بی اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا، وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا، بلکہ اس کے بجائے ۔۔۔۔۔ مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو، لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب ہوا اور سچ پوچھیے، تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی، لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا، لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک ... ہو، مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و

شاید باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں

اب تک تو ہر دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے پتہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قاعدہ کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے، تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن بہت غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں یک وقت پاس ہونا محال اور مشکل ہے۔ پہلے دو دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے چنانچہ پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہے:

۱۔ انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

۲۔ انگریزی۔ تاریخ

۳۔ انگریزی۔ فارسی۔

۴۔ تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے ہیں، وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا

۵۔ تاریخ میں فیل۔

۶۔ انگریزی میں فیل

ساتویں دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا، تو ثابت ہوا کہ غم کی بات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں، لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہو گا، لیکن اس میں یہ مصلحت ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا مل جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا، تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں، بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی بہت ہی طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں، تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو، لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تر بیان کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا، کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، لیکن ادھر ادھر کے لوگ "ابھی نہیں صاحب" "آپ کیا کہہ رہے ہیں" "ابھی نہیں کوئی بات ہے" ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری ہے، اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا، تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں، اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے، تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آمد و رفت کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبہ کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں، اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا، لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک نہ مٹا۔ کہنے لگے: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو، وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا"

میں نے جواب دیا کہ ایک ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو علوم میں منہمک نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں، پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصبح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے، وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں، ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں [illegible] کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ [illegible]

والد نے اجازت دے دی۔

قلمی مذاکرہ

محمد ادریس
مرتبہ:
مسعود کھوکھر

# سابق صدروں کے افکار

ہم نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ جامعہ پنجاب کے طلبہ و طالبات کی صدارت کے منصب پر فائز رہنے والے خوش نصیبوں کو آج کے طالبات و طالبات کی محفل میں شامل کر لیں۔ درج ذیل سوالات اور آگے آگے جوابات۔ (محور)

(۱) آپ کے عرصۂ صدارت میں آپ کے لیے یادوں کے انمٹ نقوش — زاویے اور خیال جو آپ کو تنہائیوں میں سامانِ آسودگی مہیا کرتے ہوں یا آپ کو پریشان کرتے ہوں؟

(۲) آپ کو اس مفروضے سے کس قدر اتفاق ہے کہ یونین انتخابات نے تعلیمی ماحول کا ستیاناس کر دیا ہے؟

(۳) اگر آپ طالبات کے لیے الگ یونیورسٹی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو کیوں؟

## حافظ محمد ادریس : ۷۰-۱۹۶۹ء

(۱)

عرصۂ صدارت سارا پس دیوارِ زنداں گزرا۔ بار بار رہائی کی پیش کش ہوتی رہی مگر یہ اللہ کا احسان اور اس کی رحمت بے پایاں تھی کہ ساہیوال جیل کی مشکلات برداشت کرنے کا حوصلہ ملا مگر معافی نامے پر دستخط کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہ آیا۔ اس دور کے انمٹ نقوش، زاویے اور خیال ان گنت ہیں۔ ان میں سامانِ آسودگی کی طاقت پریشانی کے معاملے میں کہیں زیادہ ہے۔ جیل کی چالیس چکیوں کے احاطے میں باقاعدہ درسِ قرآن کا سلسلہ جس میں تقریباً ہر بیرک اور احاطے سے قیدی اور حوالاتی شرکت کرتے تھے، آج تک میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

ملک بھر سے عزیز دوستوں کے مختلف شہروں سے خطوط اور لطف و کرم کے قریب، ہر مہینے میں دو تین مرتبہ ملک بھر سے دور دراز مقامات سے ساتھیوں کا جیل میں ملاقات کے لیے آ جانا، ساہیوال کے احباب کا تقریباً ہر روز تشریف لانا، یہ امور بھلا کیسے فراموش کیے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک پریشانی کا تعلق ہے تو وہ اس وجہ سے تھی کہ میری گرفتاری کی وجہ سے جمعیت کا کام بہت متاثر ہوا تھا اور آئندہ یونیورسٹی یونین کے مستقبل کا کوئی واضح پروگرام نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری اہم وجہ والدین اس سال بھر کی سزا سے بہت پریشان ہوں گے۔

دونوں پریشانیاں دور ہو گئیں کیونکہ وائس چانسلر کے حوالے سے ایک خبر نظر سے گزری کہ آئندہ سال یونین کے انتخابات باقاعدہ ہوں گے اور یہ کہ کوئی نامزد یونین نہیں بنائی جائے گی کیونکہ طلبہ نے ایسی یونین کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ جہاں تک اہلِ خانہ کا معاملہ تھا وہ پریشانی یوں دور ہو گئی کہ جب معافی نامے پر دستخط کرنے کے لیے بار بار حکومت کے سرکاری ہرکارے آنے شروع ہوئے اور یہ بات جیل سے باہر بھی پھیل گئی کہ کئی طلبہ نے معافی ناموں پر دستخط کر کے رہائی حاصل کی تھی تو میرے والد محترم نے اپنی اور جملہ اعزہ و اہلِ خانہ کی طرف سے خط لکھا کہ ہرگز معافی نہ مانگو۔ یہ جرأت مندانہ خط میرے لیے بہت بڑی ڈھارس کا باعث تھا۔ اس دور میں اس خط کے اقتباسات بہت سے اخبارات میں بھی چھپے تھے۔

(۲)

یونین کے انتخابات سے تعلیمی ماحول کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے مگر اسے سیاسی جلسے جیسے خطرناک لفظ سے تعبیر کرنا شاید زیادتی ہے۔ سیاسی سرگرمیاں اگر مناسب حدود کے اندر رہ کر جاری رکھی جائیں، تو وہ تعلیم اور تعلیمی معیار پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتیں۔ میرا یونیورسٹی کا دور سیاسی ہنگاموں کا دور رہا ہے۔ میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس دوران جمعیت طلبہ کی نظامت میرے ذمے رہی۔ مسلسل ہنگامے اور مظاہرے ہوتے رہے۔ میں دو مرتبہ گرفتار بھی ہوا اور تیسری دفعہ ایم اے کے امتحان کے دوران میں مجھے مارشل لا کے ضابطوں کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے دو پرچے ادھر حوالات میں دیئے تھے۔ ایک پرچہ ہی نہ دے سکا اور باقی کیمپ جیل لاہور میں۔ نتیجہ نکلا تو میں ۵۱۸/۸ نمبر لے کر پنجاب یونیورسٹی بھر میں اول گولڈ میڈلسٹ قرار دیا گیا۔

اس مثال کو میں نے محض اس لیے پیش کیا ہے کہ میرے نزدیک طلبہ کو سیاسی سرگرمیوں اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے تعلیمی معیار ہرگز نہیں گرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں میرا یہی زاویۂ نظر ہے کہ طلبہ رہنماؤں کو تعلیمی ریکارڈ میں بھی عام طلبہ کی قیادت کرنی چاہیئے۔

(۳)

طالبات کے لیے الگ یونیورسٹی نہایت ضروری ہے۔ کیوں؟

اس کیوں کا جواب دو طرح سے ممکن ہے ایک اسلامی نقطۂ نظر سے اور دوسرا سیکولر انداز میں

اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ اور رسولؐ نے مخالف جنسوں کو اختلاط کی آزادی نہیں دی جن کی حکمتوں پر لمبی بحث ہو سکتی ہے مگر یہاں تفصیل کا موقع نہیں، ایک مسلمان کے لیے گنجائش نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے سامنے کیوں کہہ سکے۔ ذرا مندرجہ ذیل آیات ایک بار پڑھ جائیں

النساء آیت ۶۵ الحشر النور ۳۰-۳۱، الاحزاب ۳۲-۳۳

سیکولر انداز سے آپ سوچیں تو طالبات کی یہ بہت بڑی حق تلفی ہے کہ وہ ہر قسم کی فیسیں پوری ادا کریں اور ان کے تمام معاملات طلبہ کے ہاتھوں میں ہوں چند سیٹیں یونین میں طالبات کے لیے مخصوص کر دینا ان کے آزادانہ حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔ ان کی الگ یونیورسٹی ہو تو ہر شعبے میں وہ خود ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوں گی اور اپنے ٹیلنٹ کا بہتر استعمال کر سکیں گی۔ افسوس ہے کہ اس موضوع پر تشنگی محسوس ہو گی۔ وقت کی کمی کے پیش نظر زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

# فرید پراچہ : ۱۹۷۳-۷۴ء

(۱)

رنگ و نور کی اس محفل میں کس نے اپنا عرصۂ صدارت یوں گزارا کہ

اُڑ رہی تھیں گلستانوں میں سے جانی تھی مجھ کو
میں گُنت جانوں میں اوراق یہ سر دُھنتا رہا

اس لیے نہ اپنے ہمراہ سامان آسودگی لے آئے ہیں ۔۔۔ نہ دخترِ پریشانی کوئی یاد ہمراہ ہے ۔۔۔ زندگی کے تلخ حقائق ۔۔۔ اور مقصدِ زندگی کا شعور ہی "امت" نقوش اور زاویوں کی صورت رکھتا ہے ۔۔۔ یہ سامان سب بھی بھاری بھی ہے ۔۔۔ شاید یہ سامان کم ذوقی کی علامت ہو ۔۔۔ تاہم ایسا حادثہ یوں ہے کہ

تیری محفل سے ستارے کون جگمگایا
میں وہ پاگل کہ فقط آنکھ میں آنسو لایا

(۲)

یونین نے انتخابات سے تو تعلیمی ماحول کو مزید بہتر اور معیاری بنایا ہے یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے طلبہ کی اجتماعی بہبود کے لیے بے شمار مطالبات اٹھے۔ مثلاً میرٹ پر داخلے، میرٹ سکالرشپ کی تعداد میں اضافہ، ریسرچ کے لیے سہولتیں، قابل اساتذہ کا تقرر وغیرہ۔ سٹوڈنٹس یونین کی کوششوں سے بک بینک کے ذریعے لاکھوں روپے کی نصابی کتابیں حاصل کی گئیں۔ ظاہر ہے یہ سب اقدامات تعلیمی ماحول کی بہتری کے لیے ہیں، تاہم یونین انتخابات میں سرکاری مداخلت نے تعلیمی ماحول کا ستیاناس ضرور کیا ہے لیکن اب

نشاط ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے
ٹھکانے سکوں سے اب گردش زمانہ ہے

(۳)

طالبات کے لیے علیحدہ یونیورسٹی کا مطالبہ کون کرتا ہے۔ ہم خواتین کی آزادی کے دشمن تھوڑا ہیں کہ جو ایسا ناجائز مطالبہ اٹھائیں ہم تو طلبہ کی علیحدہ یونیورسٹی چاہتے ہیں تاکہ ان

(قلمی مذاکرہ)

- پروفیسر بنت اسلام (لاہور)
- اُمّ زبیر (کراچی)

# خواتین نے کہا .....

> ہم نے خواتین کو ۔۔ مرم محور کا یہ سوالنامہ بھیجا۔
> جواب نامہ بھی ہمراہ ملاحظہ فرمایئے ۔۔ !!

(۱) کیا موجودہ نظامِ تعلیم میں طالبات پوری طرح اپنا حق حاصل کر رہی ہیں ؟

(۲) کیا جامعہ خواتین قائم ہونے کی صورت میں طالبات بہتر انداز میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکیں گی ؟

(۳) جامعہ خواتین میں کون سے پہلو مدِ نظر رکھنا ضروری ہیں ؟

## پروفیسر بنت الاسلام (لاہور)

(۱) لفظ "حق" وضاحت طلب ہے کس بات کو حق کہا گیا ہے ؟ اگر حق سے مراد صرف امتحانات پاس کرنا اور سندیں حاصل کرنا ہے تو پھر ٹھیک ہے کہ لڑکیاں اپنا حق حاصل کر رہی ہیں ۔ لیکن اگر حق سے مراد یہ ہے کہ طالبات کو وہ تعلیم دی جائے جو زندگی میں ان کے کام آئے اور وہ بہتر زندگی گزار سکیں اور اپنے متعلقین، وطن اور دین کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں تو پھر نہیں اُن کا حق نہیں مل رہا کیونکہ موجودہ نظامِ تعلیم عورت اور مرد دونوں کو ایک ہی طریقے کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے ڈھانچے میں مردوں کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے بہ نسبت عورت کی ضروریات کے ۔

(۲) بے شک اگر خواتین کی علیحدہ یونیورسٹی ہو اور اس میں طالبات کی مخصوص ضروریات کا دھیان رکھا گیا ہو تو لڑکیاں بہتر انداز میں تعلیم حاصل کر سکیں گی کئی لڑکیاں صرف اس لیے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں کہ والدین انہیں مخلوط یونیورسٹی میں بھیجنے کے روادار نہیں ہوتے اور ان طالبات کی بھی کمی نہیں جو خود بھی مخلوط کلاسوں میں جاتے ہوئے گھبراتی ہیں اور ان میں وہ طالبات بھی شامل ہیں جو ویسے پردہ نہیں کرتیں ۔ بعض مضامین کے ایم ۔ اے طالبات کے کالجوں میں بھی ہیں طالبات یونیورسٹی میں پڑھنے کے بجائے ان کالجوں میں آنا بہتر سمجھتی ہیں ۔

(۳) نصاب مرتب کرتے وقت طالبات کی مخصوص ضروریات کا دھیان رکھا جائے وہ مضامین خاص طور پر پڑھائے جائیں جن کی طالبات کو مابعد کی زندگی میں ضرورت پیش آئے گی مثلاً ہوم اکنامکس اور ہوم نرسنگ وغیرہ ۔ بہت اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف ان طالبات کو چنا جائے جو غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں ویسے تو جامعہ میں اعلیٰ تعلیم ہی دی جاتی ہے ، مگر اعلیٰ سے اوپر "بہت اعلیٰ" بھی ہوتی ہے وہ ہر لڑکی کے لیے عام نہ ہو ۔ عورتوں کی یونیورسٹی میں میڈیکل کالج پر خصوصی زور دیا جائے کہ خاتون ٹیچر اور خاتون ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے طالبات کو صحیح اسلامی تعلیم دینے کا لازماً بندوبست ہو ۔

## اُمّ زبیر (کراچی)

(۱) میرا جواب ہے ۔۔۔ "نہیں"
مگر کیوں ؟ اس کیوں کے دلائل کے لیے تو کئی صفحات درکار ہوں گے ۔ لیکن مختصراً عرض کرتی ہوں ۔
مملکت خداداد پاکستان میں ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہونا چاہیئے تھا کہ نظامِ تعلیم کو نظریۂ پاکستان کے مطابق اسلامی نظامِ تعلیم میں بدل دیا جاتا ۔ مگر وائے حسرتا امور دِلّی دُور است ۔ مروجہ نظامِ تعلیم کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ انگریز کا بنایا ہوا ہے جس میں خدا پرستی کا کوئی تصور ہی نہیں اور وہ کائنات کی ہر شئے کو مادّی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور حل کرتا ہے ۔ جس میں ایک "فرد" اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کر سکے ۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز کو اپنی حکومت چلانے کے لیے غلامانہ ذہنیت کی ضرورت تھی اس کو ایسے افراد چاہئیں تھے جو اس کے ایک اشارے پر ہزاروں کام اس کی منشا کے مطابق انجام دے سکیں لہٰذا اس نے ہی حضوریوں، خوشامد پسندوں اور خوشامد پرستوں کے گروہ تیار کرنے کے لیے نظام تعلیم بنایا تھا اور یہ پڑھے لکھے لوگ حکومت کے دفتر میں "کلرک" بن کر زندگی کی معراج حاصل کر لیتے تھے انگریزی حکومت خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں سے آزادی کی جوت لے چھین لینا چاہتی تھی، کیونکہ اس کو اور تہذیب و تمدن کو سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں سے ہی تھا علامہ اقبالؒ نے اس کی اس حکمت عملی کی کیا خوب تشخیص کی ہے "ارمغان حجاز" کی ایک نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کہہ رہا ہے۔

"خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات"

پاکستان بننے کے بعد اس خرابی کا احساس اور اظہار بار بار ہر دور حکومت پاکستان نے کیا، لیکن عملاً اس کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ ٹرائی ماری، تو یہ کہ سکولوں، کالجوں میں دینیات و قرآن مجید ناظرہ پڑھنا ضروری قرار دیا "جامعات" میں ایک پرچہ بھی دینیات کا رکھ دیا گیا، لیکن اس سے وہ مقصد تو ہرگز پورا نہیں ہو سکتا تھا، جو ایک آزاد مسلمان قوم کے لائق ہو۔ مدہ یہ کہ خواتین کے لیے تعلیم کے میدان مردوں سے الگ ہوں، نہ کہ تعلیمی نصاب بھی بالکل الگ ہونا چاہیئے میری نگاہ میں مروجہ تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر لینے کے باوجود بھی تعلیم نامکمل ہے خصوصاً عورت کے لیے حقیقی اور اعلیٰ تعلیم یہی ہے کہ پاکستان کی طالبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے ایک مومنہ اور مسلم لڑکی ہے۔ اُسے لازماً "یہ علم" ہونا چاہیئے کہ وہ ایک آزاد مملکت کی شہری ہونے کے ساتھ ہی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ، خدا اور رسولؐ پر ایمان و یقین رکھنے والی ہے۔ اُسے یہ یقین ہونا چاہیئے کہ ایک روز خدا کے رُوبرو اپنی شعوری زندگی کے ہر عمل کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔ بڑھتی عمر کی سرائشیبی میں اس کی جو حیثیت (بیٹی، بہن، بیوی، ماں) متعین ہوتی چلی جائے گی خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان سب حیثیتوں کے مطابق اس کے ذمہ کچھ حقوق و فرائض بھی عائد ہوتے چلے جاتے ہیں جو اُسے لازماً ادا کرنے ہیں حق کو اگر ادا نہ کیا گیا تو زندگی نامکمل رہ جائے گی، بلکہ بے شمار مشکلات اور الجھنوں میں اُلجھ جائے گی میری ان باتوں سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ آج کی پیشہ وارانہ تعلیم کے خلاف ہوں

آخر میں ایک بات اعادہ کہنا چاہتی ہوں کہ نظریۂ پاکستان کے مطابق نظام تعلیم کو بنا کر پھر مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ کر کے اعلیٰ ڈگری دیدہ دلیری اور پتہ ماری اور ماہرین کا کام ہے اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ موجودہ ماہرین تعلیم کے ساتھ دین و شریعت کے ماہرین کی ایک ٹیم ساتھ کر دی جائے، جو باہم مل کر اسلامی نظام تعلیم کا ایسا ڈھانچہ تیار کریں جو آئندہ نسلوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنائے۔ اُن کے سینوں میں جوش ایمانی، احساس فرض اور انتھک جدوجہد کا جذبہ بیدار ہو جائے وہ دنیا کے لادینی افکار و خیالات پر اسلام کے عقائد و نظریات کو غالب کر دیں اور پاکستان کو صرف عالم اسلام کا ہی نہیں، بلکہ دنیائے انسانیت کا رہنما بنا دیں۔

**

اور یہ کام اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ایوانِ حکومت میں قرآن دست کو اُس کا مقام مل جائے۔

---

بقیہ : سابق صدروں کے افکار

بے چاروں کی عزت و عصمت محفوظ ہو راہ چلتے ان پر آوازے نہ کسے جائیں اور راہ سے چھیڑ چھاڑ کر کے پریس کو اُڑے لگائے جا سکیں، اور ان بے چاروں کا دھیان بھی پڑھائی کی طرف لگ سکے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

مسعود احمد کھوکھر - ۶ - ۷ - ۱۹۷۵ء

---

(۱)

پہلے یہ پرستش میں گر رہا ہوں وقت ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ اُس وقت کی سیاست قیادت اور چاہت اور آج۔
[illegible] سیں دل تھا جو رستا تھا مرا اسم کے لیے
اب یہاں ترک تعلق کے سب نے ماتھے

(۲)

نہی انتخابات سے تعلیمی ماحول متاثر نہیں ہوتا بلکہ ملکی انتخابات سے زیادہ .....

(۳)

# تعلیمی تجاویز

**الطاف حسن قریشی**

اسلامی تہذیب اور نظریہ پاکستان کے الفاظ بار بار نصاب میں آئے، مگر ان کی جس قدر گردان ہوئی، نظریۂ پاکستان کی قوت میں کمی آتی چلی گئی۔ قومی تعلیمی کمیشن نے نظریہ پاکستان کو عظیم الشان خراج تحسین پیش کیا تھا:

ہمارے نظام تعلیم کو ان مقاصد کے تحفظ میں جو تشکیل پاکستان کا محرک تھے، بنیادی کردار ادا کرنا ہوگا اور اس تصور کے ذریعے اتحاد کی بنیادوں کو استحکام بخشنا ہوگا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن کی آرزو اس لیے ابھری تھی کہ وہ اپنی مخصوص اقدار کے مطابق اپنے آپ پر حکومت کریں۔ دوسرے الفاظ میں یہاں ملک اسلامی زندگی کے تحفظ کے لیے وجود میں آیا۔ (صفحہ ۱۱)

یہ ۱۹۵۹ء کا اعلان تھا اور دس برس بعد ہم سب نے دیکھ لیا کہ اس نظام تعلیم نے جو افراد تیار کیے، وہ نظریاتی قدروں سے تشویشناک حد تک بے بہرہ تھے بلکہ ان میں وہ نظریات راہ پا گئے جو نظریۂ پاکستان کی نفی کرتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء کی نئی تعلیمی پالیسی میں بھی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کا اعادہ ہوا۔ یہ سوال ابھرتا ہے ہمارے انتظامات کیا ہوں گے اور ہم کس طرح ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

طالب علموں میں نظریہ پاکستان سے محبت کیوں پیدا نہ کر سکے، اس کے بڑے بڑے ... ل ہیں:

۱۔ اساتذہ جو بچوں کو اس عمر میں پڑھاتے ہیں جس میں دیرپا نقوش ثبت ہوتے ہیں، ... نظریہ پاکستان کا شعور نہیں رکھتے۔ ہم نے تربیت کے کسی مرحلے پر بھی اساتذہ پر اللہ کا رنگ چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ جے وی، ایس وی، سی ٹی، بی ایڈ، ایم ایڈ کے تربیتی کورس اٹھا کر دیکھ لیجیے، نظریے در تشکیل کردار کی بات نظر ہی نہ آئے گی۔ اساتذہ میں کثرت ان افراد کی ہے جو قرآن ناظرہ پڑھ سکتے ہیں نہ آیات کا مطلب سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہے جو طلبہ کے ذہنوں سے اسلام کے اثرات کھرچنے کے لیے خاص طور پر محنت کو اختیار کرتا ہے اور ہم نے ایسے عنصر کو چھانٹنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

۲۔ ہمارے نصاب ہائے تعلیم میں تشکیل پاکستان ایک تحریک اور ایک عہد نے اور ایک تہذیبی انقلاب کی حیثیت سے پیش ہی نہیں ہوا۔ دسویں جماعت تک جو معاشرتی علوم پڑھائے جاتے ہیں، اُن میں پاکستان کا بھی ذکر آتا ہے، مگر یہ ذکر انتہائی بے جان اور بے روح ہے اور جن ہوسٹلوں پر یہ ذکر آتا ہے، وہ اس قدر خشک اور بے رنگ ہیں کہ طلبہ اپنے ذہنوں پر کوئی نقش مرتب کر ہی نہیں سکتے۔ ایف اے اور بی اے کے اکثر مضامین اس ذکر سے خالی ہیں۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں پاکستانیات کا پرچہ کسی بھی شعبے میں لازمی نہیں۔ شعبۂ تاریخ میں اپنے اپنے علاقوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر حیدرآباد یونیورسٹی میں تاریخ سندھ، پشاور یونیورسٹی میں سرحد کی تاریخ، ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگال کی تاریخ اور پنجاب یونیورسٹی میں پنجاب کی تاریخ۔ الغرض برصغیر کے پس منظر میں پاکستان کی تاریخ کہیں بھی لازمی پرچے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی حال شعبۂ علم السیاست کا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پاکستانیات کا پرچہ کسی زمانے میں لازمی ہوتا تھا، اب اہل نظر اس کے بھی درپے ہیں۔

۳۔ تحریک پاکستان پر عام فہم زبان میں اور خوبصورت طباعت کے ساتھ لٹریچر نہیں ملتا۔ حکومت نے کبھی اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور عام ناشرین وہ کتابیں چھاپنا پسند کرتے ہیں جن کی کھپت زیادہ ہے۔ پورے ملک میں ایک بھی ایسا ادارہ قائم نہیں ہوا جس نے تحریک پاکستان پر مستقل کام کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان پر اچھے معیار کی چند کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی میں اور بیشتر غیر ملکی مصنفوں کی ہیں۔ اردو زبان میں ایک بھی قابل قدر کوشش نہیں ہوئی۔ بچوں کا دامن بھی تقریباً خالی ہے اور ایسی کتابیں تو وجود ہی میں نہیں آئیں جو بچوں کے ذہن میں کہانیوں، افسانوں یا دلچسپ تاریخی واقعات کے ذریعے پاکستان کے نقش و نگار منقش کر سکیں۔

۴۔ حکومت کو اپنی تعلیمی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ماہرین تعلیم کے سلسلے میں بھی

ہمارا ملک بڑا بدقسمت رہا ہے ہوا یہ کہ چند نوکر شاہی افسروں، چند تعلیمی ماہرین اور چند صحافت کی ملی بھگت سے ایک خاص طبقے کو ماہرینِ تعلیم کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا۔ یہ ماہرینِ تعلیم وہ تھے جو علمی آزادی کا نعرہ لگا کر آئے تھے اور ان کے افکار کو پریس میں نمایاں جگہ دی گئی پھر انہیں مختلف تقاریب میں، مذاکروں میں ان کے افکار کو علی سُرخیوں کے ساتھ پھیلایا گیا، پھر ان عظیم شخصیتوں پر مقالے لکھے گئے، ریڈیو سے ان کی تقریریں نشر ہوئیں اور ٹیلی وژن پر بھی وہ بی لقراط آتے اس طرح یہ پاکستان کے مسلّمہ ماہرینِ تعلیم بن بیٹھے اور نوکر شاہی سے ملی بھگت کے نتیجے میں ان کے نام سرکاری فائلوں تک پہنچ گئے اب جب بھی کوئی مسئلہ حکومت کے پیش نظر ہوتی ہے تو وہ سادہ تمام ہی ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کرتی ہے اور انہی کو سرداریاں سونپتی ہے یہ ماہرینِ تعلیم نظریاتی کی مدد سے اسکیم کو اپنے مزاج اور اپنے فلسفے کے مطابق عملی جامہ پہناتے ہیں اور اصل منصوبے کی شکل بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں

۵: اس ملک میں برسرِ اقتدار اور دوسرے مؤثر حلقے اسلامی اقدار کا مذاق اڑاتے رہے ہیں پاکستان سے حقیقی محبت اُن کے دل میں پیدا ہوگی جو دل سے خدا اور رسولؐ کے لیے محبت و شیفتگی کے جذبات رکھتا ہے یہ جذبہ جس قدر سرد پڑتا جائے گا بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچستانی اور سرحدی اُبھرتا جائے گا ہم نے اسلامی طاقتوں کو شکست دینے کے جوش میں اس بات کا ہوش نہ کیا کہ ملک کی بنیادیں بھی ہل سکتی ہیں۔ ہر علاقے میں زبان، تہذیب، نسل اور عصبیتوں کے بُت تراش لیے گئے ہیں اور ان کی پوجا ہو رہی ہے اور ان کے پجاری اس قدر شیر ہو گئے ہیں کہ قومی اور ملی وحدت کے پرستار دبک کر بیٹھے پر مجبور ہیں

۶: طلبہ میں ایک مربوط تصور اور ایک مربوط فلسفہ اس لیے بھی نہیں اُبھر سکا کہ مختلف مضامین کے درمیان تضاد اور تصادم پایا جاتا ہے طالب علم نے اسلامیات کے ذریعے اسلام کا ہلکا سا تصور قائم کیا، لیکن اسے مختلف مضامین پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ اسلام نے انسانی تہذیب اور علوم و فنون کی ترویج اور تعمیر میں کچھ بھی حصہ نہیں لیا گویا اسلام کو زندگی سے کسی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ایسے مذہب کا تصور راسخ ہوگیا جس کا زندگی سے تعلق نہیں اس کے علاوہ اُس نے اسلامی علوم میں خدا اور کائنات کے تصورات کچھ اور پڑھے اور فلسفے اور سائنس میں کچھ اور۔ یہ کام امورِ اسلام کے ہمہ گیر نظریے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

۷: قیامِ پاکستان کے بعد نظامِ تعلیم ایسا مرتب ہوا کہ اس میں عربی اور فارسی زبانوں کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہ رہی عربی اور فارسی زبانوں سے ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسا ماحول منتقل ہوتا آرہا تھا جس میں اسلامی شعائر اور اسلامی روایات زندہ و تابندہ تھیں ان زبانوں کو پڑھ کر طالب علم غیر شعوری طور پر اسلامی زندگی کے مظاہر سے متاثر ہوتا چلا جاتا تھا اب وہ ماحول اور وہ عناصر تقریباً ختم ہوگئے اور اس طرح جو خلا پیدا ہوا اُس میں وہ افکار اور وہ شخصیتیں جذب ہوتی گئیں جن کا تیر چار طالب علم کے چاروں طرف ہوتا رہا ہم نے اپنے قومی ہیرو اور تاریخ کی عظیم شخصیتوں پر ایسی تنقیدی نگاہ ڈالی کہ انہیں جلا کر راکھ کر دیا اور اسی راکھ کے ڈھیر پر غیر ملکی شخصیتوں اور غیر ملکی افکار تعمیر ہوتے رہے ایک نوجوان ذہن کو کوئی نہ کوئی آئیڈیل چاہیے تھا اسے اپنا نہ ملا تو باہر سے لے آیا اور اس کی پوجا کرنے لگا۔

اس پس منظر کی روشنی میں اسلامیات کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دینے سے کام نہ چلے گا اس عظیم مقاصد کے لیے عظیم منصوبے کی ضرورت ہے اس سلسلے کے چند بنیادی اصول یہ ہو سکتے ہیں

۱: اساتذہ بننے کے لیے جے وی اور ایس وی کے جو تربیتی نظام ہیں اُن میں قرآنِ حکیم کی تدریس کا مخصوص انتظام ہو اور اس وقت تک کسی کو جے وی یا ایس وی کا سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے جب تک قرآن کا پوری صحت کے ساتھ پڑھانا آجائے قرآن کو ناظرہ پڑھانے کے سائنٹفک بنیادوں پر تجربے کیے جا چکے ہیں اور ایسے قواعد مرتب کر لیے گئے ہیں جن سے قرآن پڑھنے کا مرحلہ چند مہینوں میں بڑی کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے ماضی میں بچوں کے لیے قرآن کی ناظرہ تعلیم لازمی قرار دی گئی، مگر اسکولوں کو قاری میسر نہ آئے چنانچہ یہ اسکیم مؤثر طور پر نافذ نہ ہو سکی۔ اگر ہر جے وی اور ایس وی اُستاد قرآن کو صحت

کے ساتھ پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو، تو قرآن کی ناظرہ تعلیم واقعی مؤثر ثابت ہوگی

۲: اُردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب میں اسلامی نظامِ زندگی کو خوبصورت کہانیوں کے ذریعے پیش کیا جائے سچائی، وعدہ ایفائی اور دیانت و امانت کے واقعات عام فہم زبان میں اس طرح پیش کیے جائیں کہ ننھے ذہن پر مستقل نقوش مرتب ہوں تیسری جماعت تک دینیات کی علیحدہ کتاب پڑھانے کی ضرورت نہیں اُستاد اسے طور پر بچوں کو اخلاقی کہانیاں سنائے اور قرآن کی آیات یاد کرائے

۳: پانچویں جماعت سے لے کر ایم اے تک پاکستانیات کا پرچہ لازمی ہو اس میں تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل، ہندو ذہنیت کے مظاہر، تشکیلِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کی عظیم انسانی قربانیوں کے مناظر، پاکستان کا تاریخی، سیاسی اور تہذیبی جواز، مملکتِ پاکستان کی عظمت و شوکت، یہ تمام باتیں طالب علموں کے ذہن میں سلیقے سے راسخ ہو جانی چاہییں تقسیمِ پاکستان سے پہلے دسویں جماعت کے انگریزی سلیبس میں ایک کتاب NDIA OUR (ہمارا ہندوستان) شامل تھی اسے پڑھ کر دل کی محبت کا جذبہ پوری شدت سے اُبھرتا تھا اور ہندوستانی ہونے پر فخر اور اعتماد کا شعور جاگتا تھا ہمیں اس کتاب کے خطوط پر اچھی کتابیں پاکستان پر تیار کرنی ہوں گی مجھے ابھی تک اُس کتاب کی زبان اور انداز بیان یاد آتا ہے

۳: یونیورسٹی کی سطح پر پاکستانیات کا ایک شعبہ قائم کیا جائے اگر نظریۂ پاکستان کا تحفظ پاکستان کا تحفظ ہے، تو ہمیں اعلیٰ سطح پر نظریۂ پاکستان کا تحفظ پاکستان کا تحفظ ہے، تو ہمیں اعلیٰ سطح پر نظریۂ پاکستان پر علمی اور تحقیقی کام کرنا ہوگا تاکہ اعلیٰ ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں اور وہ اپنا تاریخی رول ادا کرنے کے لیے تیار ہوتے چلے جائیں۔ اس تحقیقی کام سے اُن میں وسعتِ نظر اُبھرے گی اور وہ قومی مسائل کو قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے خوگر ہو جائیں گے۔

۴: تعلیمی اداروں میں ایسے اساتذہ کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے جو اسلام کے خلاف منفی اور معاندانہ زاویۂ نظر رکھتے ہوں نظریاتی ریاست میں تعلیم و تربیت کا کام انہی افراد کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے جو اُس نظریے پر یقین اور اس کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہوں جس نظریے پر ریاست قائم ہے ہر اُستاد کے معاہدۂ ملازمت میں نظریۂ پاکستان پر یقین کو لازمی شرط قرار دیا جائے۔

۵: خود ساختہ ماہرینِ تعلیم کے بجائے اُن ماہرینِ تعلیم کا تعاون حاصل کیا جائے جو واقعی پاکستان اور نظریہ پاکستان کے لیے درد رکھتے ہیں اور گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں تعلیمی وزارت اور اہم تعلیمی دفاتر میں ان اصحاب کے ترتیب یافتہ اور لوازمات ہائے سجائے اُونچا شمار ہوتے افراد موجود ہیں جو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق تعلیمی نظام کو چلاتے رہے ہیں، وہ تمام اور ان موجود ہیں جو نظریۂ پاکستان کو بے اثر بنانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں مغربی پاکستان میں ایسا بااثر عنصر موجود ہے جو نئی تعلیمی پالیسی کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہا ہے اور وہ عنصر بظاہر اپنے آپ کو نئی حکومت کا دوست ظاہر کرتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ پانچویں جماعت تک مادری (علاقائی) زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تیسری جماعت سے اُردو لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ بچوں کے لیے کتابیں اس طرح تیار کی جائیں کہ دونوں زبانوں کو سیکھتے وقت بچوں کے ذہن پر بوجھ نہ پڑے۔

علاقائی زبانوں کے فروغ میں یہ پالیسی بھی مفید ہو سکتی ہے کہ پی سی ایس افسروں کے لیے اُردو زبان کے علاوہ دو علاقائی زبانوں کی تحصیل بھی ضروری قرار پائے سی ایس پی افسروں کو دو زبانوں کے علاوہ ایک علاقائی زبان جانی ہو اس طرح انتظامی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی اور علاقائی زبانیں اپنا موزوں مقام بھی حاصل کر لیں گی۔

## ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم کی اساسی اہمیت کے پیشِ نظر اس سلسلے میں چند حقائق پیشِ خدمت ہیں:

اعداد و شمار کے مطابق ہر ضلع میں ایک ہزار پرائمری (پانچ جماعت) سکول ہیں۔ ایک تعلیمی سروے کے مطابق ان اسکولوں میں سے صرف ۲۷ فی صد ایسے ہیں جن کی عمارتیں دو کمروں پر مشتمل ہیں اور ان کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ ۴۴ فی صد سکول خستہ عمارتوں میں رہتے اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑی تعداد درختوں کے سائے میں بستی ہے۔ جب چلچلاتی دھوپ میں بچے اس حالت میں ہوتے ہیں اس کا اندازہ وہ نہیں لگا سکتے جو شہری زندگی کی آسائشوں سے بہرہ ور ہیں۔ بارش ہو جائے تو چھٹی، گرمی میں شدت پیدا ہو جائے تو بچوں اور اُستاد کے لیے ننگ دھڑنگ درختوں کے نیچے بیٹھے رہنا محال۔ چنانچہ گرمیوں کے دنوں میں یہ سکول دو تین گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں کرسکتے۔

اب ذرا نصاب کی طرف آئیے۔ معلوم نہیں بچوں کا نصاب کن تقاضوں سے تیار کیا گیا۔ دوسری جماعت کے بچے کو آٹھ کتابیں، ایک ڈرائنگ کی کاپی جو کتاب کی طرح بھاری ہوتی ہے، اٹھانی پڑتی ہیں۔ کاپیوں کا بوجھ علیحدہ۔ دوسری جماعت کے لیے جو حساب کی کتاب تیار ہوئی ہے اسے دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ اتنی لمبی چوڑی اور اس قدر مشکل کہ انسان حیران ہو جائے۔ یہ سب کچھ کس مقصد کے لیے کیا گیا تھا؟ یہ بوجھ ہر جماعت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی معقول آدمی اس بات کا تصور کرسکتا ہے کہ چھ سات برس کا بچہ آٹھ مضامین کی تعلیم حاصل کرے؟ بہت سادہ کام جو اُستاد زبانی بچوں کو کرا سکتا ہے، اسے کتابوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ بعض کتابیں امریکہ اور انگلستان کے ماحول اور طریقوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔ اب بچے حساب کی کتاب میں جو تصویریں دی گئی ہیں انہی کو سمجھتے ہیں اور اُستاد کے الفاظ کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ ایک اور ستم یہ کہ اکثر کتابیں ایسے افراد نے لکھیں جنہیں بچوں کو پڑھانے کا سرے سے کوئی تجربہ ہی نہ تھا۔ ان کتابوں کو خوبصورت ہونا چاہیے وہ بکل بے رنگ ہیں۔

اب ذرا اساتذہ پر ایک نظر ڈالیے۔ آپ کو ایک ضلع میں ۱۵ فی صد کے قریب ایسے پرائمری سکول ملیں گے جن میں صرف ایک اُستاد کام کرتا ہے، یعنی پانچ جماعتوں کو جن میں سے ہر جماعت میں آٹھ آٹھ مضامین ہیں، ایک اُستاد اور بعض اوقات وہ بھی اَن ٹرینڈ بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ رول ماڈل کا اصول ہے کہ چالیس بچوں پر ایک اُستاد دیا جاتا ہے۔ ایسے اسکول ۵۰ فی صد سے بھی کم ہیں جن میں ایک جماعت کے لیے ایک اُستاد ہو۔ ابتدائی تعلیم کو جس طرح گورکھ دھندا بنا دیا گیا، اس میں تو ایک جماعت کے لیے کم از کم دو اُستاد ہونے چاہییں۔

اب پرائمری اسکولوں میں بمشکل ۲ فی صد ایسے اسکول ہوں گے جو پرائمری تعلیم کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ آپ اس ڈھانچے پر کوئی مستحکم عمارت کیونکر تعمیر کرسکتے ہیں؟

پرائمری تعلیم کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ابتدائی تعلیم کو تعلیمی بجٹ کا ۵۰ فی صد حصہ ملنا چاہیے۔ یونیورسٹی کیمپس پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے اور اس میں لاکھوں روپے کا غبن ہونے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ابتدائی تعلیم کو صحت مند خطوط پر استوار کیا جائے۔ پرائمری اسکولوں کے لیے ایسی عمارتیں تعمیر کی جائیں کہ وہ آنے والے پچاس برسوں کی ضرورتیں پوری کرسکیں۔ ایک عزیز بچے کو اپنی زندگی میں کوئی انقلاب محسوس کرنا چاہیے۔ اگر ہم ابتدائی تعلیم میں کشش، حفظانِ صحت کی سہولتیں اور معیاری تعلیم کے نمونے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو فی الواقع ہماری ذہنی اور معاشرتی زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو جائے گا۔

۲۔ یہ اصول وضع کیا جائے کہ پرائمری اسکول میں کم از کم تین اساتذہ ہوں گے۔

۳۔ پرائمری جماعتوں کا نصاب تبدیل کیا جائے۔ پہلی تین جماعتوں میں زیادہ اہمیت اُردو، دینیات اور حساب کو دی جائے۔ اُردو کی کتاب میں اسلامی تاریخ کے واقعات، سیرت، کہانیاں اور حفظانِ صحت کے اصول اور معلوماتِ عامہ دی جاسکتی ہیں۔ بچے کی لسانی بنیادیں مضبوط ہوں گی، تو باقی مضامین وہ از خود پڑھ لے گا۔ تقسیم سے پہلے دوسری جماعت تک صرف اُردو کی کتاب اور حساب پڑھائے جاتے تھے۔ اُستاد آموختہ سے پہلے کتاب پڑھاتا تھا اور تقریباً دو سال کی محنت سے بچے میں زبان اور حساب کی صلاحیت مضبوط ہو جاتی اور وہ اس کی مدد سے دوسری کتابیں پڑھ لیتا تھا۔ تیسری جماعت میں ضلع کا جغرافیہ شامل کر دیا جاتا۔ آج کے نصاب نے بچے میں معلوماتِ عامہ حاصل کرنے کا شوق تو پیدا کر دیا، مگر زبان اور ریاضی کے معاملے میں وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ نصاب کا حجم کم ہونے سے اُستاد کے لیے تدریس کا کام آسان اور مفید ہو جائے گا۔

۴۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کا وقار اور تنخواہیں خاص اہتمام سے بلند کی جائیں، یعنی ایسا مرتبہ عطا ہو کہ تعلیم یافتہ حضرات پرائمری اُستاد بننے میں فخر محسوس کریں۔ ہمارے خیال میں بی اے بی ایڈ اساتذہ کو پرائمری اسکولوں میں مقرر کیا جائے۔ نفسیاتی اصولوں کا سب سے مفید استعمال تو پرائمری اسکولوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ پرائمری اُستاد کو بچوں کی نفسیات اور مضامین کے تدریسی اصولوں کا جس قدر شعور ہوگا، اُسی قدر وہ بچے کے اندر علم کی وسعتیں اُتار سکے گا۔ اگر اساتذہ ابتدائی پانچ برسوں میں بچوں کے اندر علم کی چنگاری روشن کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو سمجھ لیجیے معاشرے کی فکری اور معاشرتی بنیادیں مستحکم ہو جائیں گی۔

۵۔ ہر بڑے ابتدائی اسکول (ELEMENTARY SCHOOL) میں جو آٹھ جماعتوں پر مشتمل ہوگا، ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر مقرر کیا جائے، جو بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھے اور جسمانی نشوونما میں ان کی رہنمائی کرے۔

## فنّی اور پیشہ ورانہ تعلیم

تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دو لاکھ تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگار ہیں اور یہ تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مسئلے کو ایک نئے انداز سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ہمارے خیال میں طلبہ کے اندر ایسی صلاحیت اور اعتماد پیدا کر دینا چاہیے کہ وہ اپنے لیے از خود معاش کے راستے بنا سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہم تجویز کرتے ہیں کہ:

۱۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۳۰ فی صد طلبہ اور طالبات کے لیے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۲۔ ہائی اسکول زیادہ تر جامع (COMPREHENSIVE) اسکول ہوں۔

۳۔ ٹیکنیکل کالج کا کورس چار برس کا ہو یعنی دو سال بعد ٹیکنیکل ڈپلومہ اور چار سال کے بعد بی ایس سی انجینئرنگ کی ڈگری مل جائے۔

۴۔ ہر صوبے میں ٹیکنیکل تعلیم کا ڈائرکٹوریٹ قائم کیا جائے جس کا سربراہ ڈائرکٹر جنرل ٹیکنیکل ہو۔ یہ ڈائرکٹوریٹ ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ اور نشوونما کے لیے مسلسل کام کرتا رہے۔ یہ فنی تعلیم، زراعت، صنعت و حرفت اور کامرس کے شعبوں میں استعداد پیدا کریں۔ ٹیلرنگ اور کشیدہ کاری کی بھی ڈگری ملے۔

۵۔ فنی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے صوبائی اور مرکزی وظائف کا ۵۰ فی صد حصہ ان طلبہ کے لیے مخصوص ہو جو ٹیکنیکل تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔

۶۔ ٹیکنیکل کالج میں تربیت کے دوران میں ہر طالب علم دو سال کے لیے منظور شدہ انڈسٹری میں اپرنٹس کے طور پر کام کرے۔ اس عرصے میں اُسے اپرنٹس شپ الاؤنس دیا جائے۔

۷۔ ملک کی اقتصادی منصوبہ بندی اس طرح کی جائے کہ وہ تربیت یافتہ فنی افراد مختلف شعبوں میں زیادہ سے زیادہ فراہم کرسکے۔ یعنی پہلے منصوبہ بندی صرف ضروریات کے نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی، اب اس کا زاویہ بدل دیا جائے اور فنی افراد کی فراہمی اس کا مطمحِ نظر قرار پائے۔

اگر یہ منصوبہ عمل جاری ہو سکے، تو ملک کے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے، مگر ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے کہ ہائی اسکول اور انٹر کالج کو ہماری رائے میں اکٹھا ہونا چاہیے۔ ہمارے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ماہرین نفسیات کے مطابق ۱۲ اور ۱۷ سال کی عمر کے بچوں کو یکساں ماحول میں یکجا تعلیم دینی چاہیے

۲۔ ہائی اسکولوں اور ماسٹر کالجوں کو یکجا کرنے سے فنی تعلیم میں سہولتیں پیدا ہوں گی نئی اسکیم کے مطابق زیادہ تر طالب علموں کو انٹر پر تعلیم ختم کر دینی چاہیے۔ اس طرح ان کے ماحول میں ایک تسلسل موجود رہے گا اور اسکول اور کالج کی زندگی میں جو ایک وسیع فاصلہ ہوتا ہے اور جس کے خطرناک معاشرتی اور اخلاقی نتائج نکلتے ہیں اس سے طلبہ محفوظ رہیں گے

۳۔ بھارت میں اسی مسائل پر حال ہی میں تحقیق ہوئی ہے ۱۹۶۷ء میں "کوٹھاری رپورٹ" منظر عام پر آئی اس میں اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہائی اسکول اور انٹر کالج کی علیحدگی سے دونوں ادارے غیر اقتصادی (UN ECONOM CAL) ہوتے ہیں۔

ہم نے اختصار کے ساتھ چند اہم تجویز پیش کرتے ہیں۔

۱۔ خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے خواتین کے لیے نصاب بھی علیحدہ ہو تاکہ انہیں اپنی شخصیت کو نسوانی تقاضوں کے ساتھ نشوونما دینے کا موقع ملے

۲۔ ہمارے تعلیمی زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بہترین اور تجربہ کار ہزاروں اساتذہ کو پرنسپل، صدر ہائے شعبہ بنا کر ضائع کر دیا ہے کالج میں نئے طلبہ داخل ہوتے ہیں، تو ان کے حصے میں وہ اساتذہ آتے ہیں جو عمر میں مشکل سے چار یا پانچ برس بڑے ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے طلبہ میں کچھ ذہن پیدا نہیں کر سکتے ہماری رائے میں وائس پرنسپل، پرنسپل اور صدر شعبہ کو تدریسی کام زیادہ کرنا چاہیے یونیورسٹی میں بھی اسی دستور العمل پر کام کیا جائے۔

۳۔ یونیورسٹی میں تازہ تازہ ایم اے پاس کرنے والوں کو استاد مقرر نہیں کرنا چاہیے اس کے لیے لازم ہو کہ وہ کسی کالج میں کم از کم سات برس پڑھا چکا ہو۔

۴۔ صوبائی محکمۂ تعلیم کو تنظیم نو کی ضرورت ہے صوبائی سطح پر تین ڈائریکٹوریٹ ہوں؛

(الف) ڈائریکٹر جنرل (اسکول)

(ب) ڈائریکٹر جنرل (کالج)

(ج) ڈائریکٹر جنرل (ٹیکنیکل)

یہ تینوں ڈائریکٹر جنرل براہِ راست وزیر تعلیم کے ماتحت ہوں اور صوبائی سیکرٹری تعلیم کی حیثیت کار نیلس رپورٹ کے مطابق ڈائریکٹر جنرل سے کم تر ہونی چاہیے۔

## چند اہم تجاویز

صوبے کی تعلیمی سرگرمیوں میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے وزیر تعلیم کی صدارت میں تعلیمی کونسل قائم کی جائے۔ جو تمام صوبے کے تعلیمی مسائل پر تحقیق اور غور و خوض کرتی رہے

ماضی میں ہم نے ٹیکسٹ بورڈ کے ذریعے نصابی کتابوں کی اشاعت کا نہایت ہی ناکام اور مضحکہ خیز تجربہ کیا یہ بورڈ برسوں سے قوم کو بے وقوف بنا رہا ہے حکومت اسے سوڈیش پیپر مفت مہیا کرتی ہے۔ اس نے تو حتیٰ سے تیار کی جاتی ہیں کہ ایک بچے کو سال میں چار پانچ بار ایک کتاب کو خریدنا پڑتا ہے۔

ایسے ادارے کو ختم ہونا چاہیے اس کی جگہ وزارتِ تعلیم میں ایک مخصوص شعبہ قائم ہو جو مختلف جماعتوں کے لیے نصاب کے خاکے تیار کرے اور اس خاکے کے مطابق نمونے کی کتابیں تیار کی جائیں اور پھر عام ناشروں کو اسی معیار کی کتابیں چھاپنے کی اجازت ہو۔ یہ شعبہ جائزہ لیتا رہے گا کہ کوئی کتاب معیار سے گھٹیا تو نہیں چھپی۔ اساتذہ کو آزادی ہوگی کہ وہ ان کتابوں میں سے کوئی معیاری کتاب اپنے اسکول کے لیے منتخب کریں۔

تعلیمی تبدیلی بڑی احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ قوم چاروں طرف سے مسائل میں گھری ہے اور ہمارے رہبروں کی طرف بار بار دیکھ رہی ہے۔

# موجودہ نظام تعلیم عام طالب علم کو اچھا مسلمان، سچا پاکستانی بنانے میں کیوں ناکام ہے؟

❁*❁*❁*❁*❁*❁

کیونکہ یہ اسلامی نہیں۔ (ماجد علی — زوالوجی)

اس میں آدھا قصور بیمار معاشرے کا ہے۔ (پروین عالم۔ سوشل ورک)

اس لیے کہ یہ اسلامیت اور وطنیت سے خالی ہے (شاہد سلیم — سوشیالوجی)

چونکہ یہ نظریاتی نہیں — فرنگیت سے بھرپور ہے (رفیق شاہد۔ سوشیالوجی)

اس لیے کہ یہ نظام ہی غیر فطری ہے (ظہیر گیلانی۔ کیمیکل ٹیکنالوجی)

نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور احساسِ ذمہ داری کی کمی (صالحہ سلیمان صحافت)

شروع ہی سے اسلامیات کو انگریزی سے کمتر حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ (خالد حسن — فلسفہ)

چونکہ اساتذہ کی تربیت ہی غلط بنیادوں پر ہے (حسن کاکا خیل۔ ریاضی)

اس لیے کہ یہ نظام تعلیم ہے ہی فرنگی۔ (وقار احمد — طبیعات)

یہ نظام تعلیم بنیادی طور پر کلرک فیکٹری ہے (ملک اختر جاوید — اردو صحافت)

ہمیں تحریک پاکستان کی قربانیوں کا صحیح شعور نہ ملنے کے سبب۔ (نجم النساء — فارمیسی)

چھوٹے میناروں کے بجائے مکمل مسجد سازی کی ضرورت ہے (اکرم رازی — فارمیسی)

آپ کا خیال غلط ہے (روحینہ واسطی — سیاسیات)

خدائی خدمت گاروں کا اسکول ہو — یا ٹھیکہ (اشفاق مہر — فارمیسی)

یہ نظام تعلیم ان اعلیٰ مقاصد کے لیے بنایا ہی کب گیا تھا (مصطفیٰ میرانی سوشل ورک)

کتب کی اکثریت "کاڑھ" ہے (الیاس احمد — زوالوجی)

اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں مت سوچو۔ (کلیم ماتران۔ طلکیات)

دینی علم اور تحریک پاکستان ہر لمحہ لازم ہونا چاہیئے (نصرت پروین — فلسفہ)

دھریک نژن بیز نیئس لگیا کر دے۔ (ذوالفقار چودھری — صحافت)

چونکہ یہ دینی اور قومی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا (مریم خاتون، زوالوجی)

نظام تعلیم بھی تو معاشرتی نظام کا ایک حصہ ہے۔ (حسن نواز تارڑ۔ صحافت)

نوجوانوں کو بدمست گھوڑے کی طرح کھلا بھی چھوڑنا۔ حماقت ہو گا۔ (یاسمین حمید — فلسفہ)

معروف شیرازی (شعبہ عربی)

# دینی تعلیم ناقص نصابیات

پاکستان میں طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد ان مدارس میں زیر تعلیم ہے جنہیں "اسلامی مدارس" "دینی مدارس" یا "عربی مدارس" کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مدارس کثرت سے ہیں اور ان میں لاکھوں طلباء زیر تعلیم ہیں۔ یہاں صدیوں کا پرانا نصاب اور کئی سو سال پہلے کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور یہ بہاں پر ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوششوں میں مصروف بھی ہیں۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مدارس اپنے طلبہ میں دین کا محدود اور تنگ نظرانہ تصور پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ لیکن ایسی صورت حال میں جب کہ دین کا صحیح تصور پیدا کرنے والے مدارس ناپید ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظام اس لحاظ سے ان ہی کا کام سرانجام دے رہا ہے، ان مدارس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پرانے طرز کے نصابی پڑھنے والے طلباء اس معاشرہ میں معاش کے لحاظ سے سخت عسر الحیاتی کی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں وہ پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ نصاب کی تکمیل کے بعد انہیں کوئی بڑی ملازمت نہیں ملے گی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس میں تعلیم سے ان کی اصل غرض حصول علم ہی ہے۔ چند مدارس کی تیار کردہ طالب علموں کی طرح حصول دنیا اور آرام و آسائش نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ حضرات کسی مسجد میں خطیب یا ان ہی مدارس میں مدرس ہو سکتے ہیں اس طرح انتہائی کم آمدنی پر بسر اوقات کرتے ہیں اور یہ چیز بالواسطہ طور پر معاشرہ ان کی حیثیت و مقام کو، اور جب کہ معاشرہ میں اصل قدر علم و فضل نہیں، بلکہ معیار زندگی کی بلندی ہو، متاثر کرتی ہے۔

ان عربی مدارس کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر جدید نظام تعلیم جاری ہے جو ریاست و حکومت اور معاشرہ کی دیگر اہم ضروریات کے لئے افراد تیار کرنے کا کام کر رہا ہے۔ دونوں ہی نظام ہائے تعلیم کے علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود دیکھا گیا ہے کہ افادیت دونوں کی ہے اور ایک لمبے عرصہ تک یہ بہرحال اپنا اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گے۔ ان دونوں نظاموں کا ڈھانچہ، مقاصد اور طریق کار اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا امتزاج کم عرصہ میں عملاً ممکن نہیں نظر آتا۔ ماضی میں اس قسم کی جو کوششیں کی گئی ہیں وہ ناکام رہی ہیں کوئی ایسی جامع اسکیم آج تک نہیں پیش ہو سکی ہے جس کے مطابق سہولت سے دونوں نظام ہائے تعلیم کو ایک ہی جامع نظام میں بدلنا عملاً ممکن ہو، درحقیقت یہ کام اسی وقت ممکن ہوگا جب کوئی حکومت تمام ذرائع و وسائل کے ساتھ اس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور ایک طویل عرصہ تک چلتا رہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اس کام کو سرانجام دینا اس قدر عظیم کام ہے کہ کسی فرد یا کسی ایک چھوٹے موٹے ادارے کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ نیا نظام تعلیم لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک وقت ان دونوں نظاموں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک نیا نظام رائج کیا جائے جو اپنے ڈھانچے، نصاب، مقاصد اور نتائج کے اعتبار سے ان دونوں سے مختلف ہو اور ہماری قومی اور ملی ضروریات کو بدرجہ کمال پورا کرنے والا ہو۔

مناسب یہی ہے کہ ایک اور جدید نظام تعلیم کو مطمح نظر بنا کر، ہر دو نظاموں میں ایسی مناسب تبدیلیاں کی جائیں کہ مستقبل میں جب کوئی اسلامی ریاست تشکیل نظام تعلیم کا کام انجام دے تو امتزاج میں کم سے کم مشکلات پیدا ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے اس مضمون میں صرف قدیم نظام تعلیم (درس نظامی) میں بنیادی اصلاح کے لئے گذارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

**درس نظامی** —— رائج الوقت درس نظامی میں فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق قدیم، فلسفہ قدیم، ریاضی، ہیئت، علم کلام قدیم، صرف عربی، نحو عربی، بلاغت اور میراث وغیرہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ نصاب کئی سو سال پہلے جس طرح ترتیب دیا گیا تھا اسی طرح ابھی تک پڑھایا جا رہا ہے۔ زمانے کی تبدیلی نے اور حالات کے تقاضوں نے اس پر کچھ بھی اثر نہیں ڈالا ہے۔ بہرحال ان بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر خود اسلامی مدارس کے بعض اہل حل و عقد کو شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں ایک ہمہ گیر تبدیلی ہونی چاہیئے۔ باوجود اس کے یہ حضرات نصاب تعلیم اور اس کے تحت پوری کتابوں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں، بعض مشکلات کی وجہ سے کم ادارے ایسے ہیں جنہوں نے اصلاح حال کی طرف عملاً کوئی قدم اٹھایا ہو۔ اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کتابوں کی فراہمی ہے۔ نئے نصاب کے ساتھ ساتھ اس بات کی اشد ضرورت ہوگی کہ اس کے مطابق کتابیں تیار کی جائیں یا تیار شدہ کتابوں کو وافر مقدار میں فراہم کیا جائے اور یہ کام اس قدر مشکل اور دشوار ہے کہ موجودہ اسلامی مدارس میں سے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے افراد بہت کم ہیں جو موجودہ پڑھائے جانے والے علوم کو از سر نو مرتب کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس وقت کے مدرسین میں سے 99 فیصدی کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف لکھی ہوئی کتابوں کا مطلب سمجھا سکتے ہیں۔ از خود نئی ترتیب دے کر نئے تقاضوں کے مطابق کتابیں تیار کرنا ان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کام کے لئے تیار بھی ہو جائے تو اگلی مشکل یہ درپیش ہے کہ ان کتابوں کو طبع کون کرے اور فراہمی کا بندوبست کس طرح ہو۔ اور اس کے بعد پھر اتنی ہی مشکل مرحلہ یہ آتا ہے کہ اساتذہ کو نئی کتابیں پڑھانے کے لئے کیسے تیار کیا جائے۔ یہ ہیں وہ مشکلات جن کی وجہ سے موجودہ نصاب پر نظر ثانی کا کام اس کی ضرورت کا احساس ہونے کے باوجود مشکل اور عملاً ناممکن ہو گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود بعض اداروں نے آہستہ آہستہ یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ندوۃ العلماء کے دار العلوم کا نصاب پہلے سے اصلاح شدہ تھا۔ اب دار العلوم دیوبند نے بھی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اس قدم دراصل کا نام مدرسہ عربیہ تھا لیکن اس قدر طویل عرصہ کے بعد اب وہاں ایک عربی رسالہ "دعوۃ الحق" کے نام سے جاری ہوا ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی تحریری اصلاحات کا سلسلہ جاری ہے اور یہ احساس شدت سے بڑھ رہا ہے۔ پاکستان کے اداروں میں مدرسہ عربیہ، نیو ٹاؤن کراچی کے سر ہے۔ اس ادارے نے اصلاح کی طرف قدم اٹھایا ہے اور اس کے کارپردازوں میں جس قدر اصلاح کا احساس شدید ہے اسی قدر اصلاح کی جانب ان کی رفتار تیز ہے۔ عربی زبان و ادب، صرف و نحو کے بارے میں یہاں کا نصاب مطلوبہ حد کے قریب جا

پہنچا ہے۔ تاریخ کی طرف توجہ دی جا رہی ہے اور امتحان کا طریقہ صریحاً معیاری ہو گیا ہے۔ یہاں طلبہ کو تحریر کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا گیا ہے اور درجہ تخصص بھی کام کر رہا ہے اور طلباء کو مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے پورے مغربی پاکستان میں کوئی دوسرا ادارہ ایسا نہیں ہے جس کے اندر اس قدر جامع مدون نصاب ہو اور اصلاح احوال کی طرف بھی قدم اٹھایا جا رہا ہو۔

موجودہ درس نظامی میں وہ کیا کیا نقائص ہیں جن کو دور کرنا ممکن ہے بھی اور اس کی اشد ضرورت بھی ہے۔ میرے خیال میں درج ذیل امور کی طرف اصلاح کا قدم اٹھانا بس ضروری ہے:

## قرآن اور علوم القرآن

موجودہ نصاب میں قرآن کریم کے سلسلہ میں بے حد کوتاہی برتی جاتی ہے۔ اس وقت تک صرف ایک پہلو کی اصلاح ہوئی ہے یعنی تجوید پر کافی زور دیا جا رہا ہے اور طلباء علم قرأت میں بھی دلچسپی لیتے ہیں لیکن تفسیر اور دوسرے علوم القرآن کی تعلیم و تدریس سے تغافل برتا جا رہا ہے کچھ عرصہ پہلے تو یہ حالت تھی کہ خود راقم نے مدارس میں قرآن کریم کی ایک سرسری تفسیر جلالین پڑھائی جاتی تھی جسے قرآن کریم کا ترجمہ کہا جا سکتا ہے، اور بیضاوی شریف سورہ بقرہ تک رائج تھی لاہور میں مولانا احمد علی مرحوم، راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ خان نے اور سرحد میں پنج پیر کے مولانا محمد طاہر صاحب نے دورہ تفسیر کے نام سے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ مولانا احمد علی مرحوم صرف جہاد اور دوسرے دو مضامین صرف توحید پر زور دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ نہایت قلیل عرصہ میں ختم کرا دیا جاتا تھا۔ اگرچہ طالب علم پورے قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کر لیتا ہے لیکن جس طرح قرآن مجید کا حق ہے اس طرح گہرا مطالعہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قرآن کریم کے تمام علوم پر مشتمل ایک کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں علامہ سیوطی کی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" مفید ہو سکتی ہے علاوہ ازیں اگر اسے طویل سمجھا جائے تو اس کو بنیاد بنا کر ایک کتاب بسہولت تیار کی جا سکتی ہے۔

## علوم عقلیہ

ہمارے موجودہ نصاب میں منطق اور فلسفہ کی کتابوں پر بہت زور دیا جاتا ہے اور ان فنون کے ضمن میں بعض ایسی بحثیں آ جاتی ہیں جو محض تاویلی اور وہمی ہیں مثلاً وہ بحثیں جن کا تعلق حل متن کے بجائے محض متن اور شرح کے اسرار و رموز سے ہوتا ہے کہ ماتن نے یہ لفظ کیوں لایا ہے اور شارح نے تشریح میں "اس فقرے" کا اضافہ کیوں کیا ہے۔ اصل فن کے بجائے طلبا متن اور شرح کے الفاظ پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ پھر منطق اور فلسفہ کے میدان میں زمانہ حاضر کے علماء کی قابل قدر تحقیقات اور نظریات کا شمول ضروری ہے خصوصاً منطق کا استقرائی پہلو اور جدید اقسام فلسفہ۔

ہمارے ہاں فلسفہ کا جو حصہ رائج ہے وہ نہایت قدیم ہے۔ فلسفہ کے میدان میں آج کل جو ترقی ہوئی ہے کوئی صاحب ہوش اس کا انکار نہیں کر سکتا کئی حقائق رد ہو چکے ہیں اب کسی صورت میں بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ان ہی پرانے یونانی افکار سے چمٹے رہیں جنکو وہ "وحی" سمجھتے تھے

ریاضی کی کوئی کتاب درس میں شامل نہیں ہے حالانکہ یہ ایک انسانی ضرورت ہے۔ خود راقم الحروف جب ۱۹۵۴ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے فارغ ہو کر نکلا تو جمع تفریق اور ضرب و تقسیم کا علم ا سے رکھتا اور حساب اتی اسکول میں اسے پانچویں جماعت کی ریاضی پڑھانا پڑی تو اسے ایک آٹھویں فیل لڑکے کی مدد لینی پڑی ایک عالم دین جب ایک تیسری جماعت کے بچے کو دیکھا کہ وہ سلیٹ پر تقسیم کا لمبا اور طویل عمل کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور ایک شیخ الحدیث صاحب عرصہ تک سکہ بدلنے کے بعد ایسے کے سولہ سکے ایک روپے کے بدلے دیتے رہے یہ مثالیں ہیں جو خود راقم الحروف کے تجربے میں ہیں اور ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حساب و ریاضی کی تعلیم سے کس قدر مجرمانہ غفلت ہو رہی ہے۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ علم الجبر والمقابلہ مسلمانوں کی ایجاد ہے لیکن ہے وہ "اسلامی نظام تعلیم" سے خارج۔

## تاریخ و جغرافیہ

دور جدید میں تاریخ کی جو اہمیت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاریخ صرف سیاسی تاریخ کا نام نہیں بلکہ اب ہر علم و فن اور ہر مسئلہ اور ایجاد کی تاریخ مرتب ہونی شروع ہو گئی ہے، بلکہ تاریخ سے بھی آگے فلسفہ تاریخ مرتب ہو چکا ہے، اور جس کا ابوالآبا بھی ایک مسلم مورخ ابن خلدون ہے، لیکن واحسرت کہ درس نظامی میں اسلامی تاریخ بھی لازمی طور پر نہیں پڑھائی جاتی طلباء کو علم نہیں ہوتا کہ سی ایسے پہلے گذرے ہیں یا بنو عباس؟ یہ کسی عام طالب علم کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء میری تعلیمی زندگی میں اکثریت ایسے طلباء کی تھی اور یہ آخری درجوں کے منتہی طلباء سمجھے جاتے تھے۔

اس سلسلے کی ایک دوسری کوتاہی جغرافیہ کے سلسلے میں برتی جاتی ہے طالب علم کی جغرافیائی معلومات اس حد تک محدود ہوتی ہیں جس حد تک اس کا سفر ہوتا ہے اور بس، الا یہ کہ کوئی میٹرک یا مڈل یا پرائمری تک تعلیم حاصل کر کے درس نظامی کی طرف آیا ہو۔ بعض طلباء اخبار تو پڑھتے ہیں لیکن انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ یہ ملک جس کے متعلق وہ خبر پڑھ رہے ہیں کہاں ہے مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۲ء میں جب مجھے ندوۃ المصنفین کا شائع کردہ جغرافیہ عالم ملا تو وہ میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ میں دو چار دن تک رات دن اسے پڑھتا رہا۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جغرافیہ پڑھایا جائے۔ اس سلسلے میں نقشے اور کتابیں بسہولت فراہم ہو سکتی ہیں اور کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

## فقہ اور اصول فقہ

فقہ اور اصول فقہ کی تمام کتابوں کا مدار آئمہ اربعہ کے اجتہادات پر ہے لیکن اس دور میں ایسے مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں جو بالکل نئے ہیں، لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پرانی کتابوں میں سے کسی ایک کو ہٹا کر اس کی جگہ کوئی ایسی کتاب تحریر کی جائے جس کے اندر جدید بحثوں کو سمویا جائے، مثلاً سود، میراث

حدود شرعیہ کا نصاب اور عائلی مسائل کی بحثوں پر مشتمل ایک جدید کتاب کا اضافہ کیا جاتا ہے ہمارے ہاں "شرح وقایہ" اور "ہدایہ" درس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

اگر ایسی ہی کسی اور کتاب کا اضافہ کر دیا جائے جس میں ان بحثوں کو سمو دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس طرح قدیم بحثوں پر اثر پڑے بغیر ہی جدید مسائل شامل ہو جائیں گے نیز اصول فقہ میں سنت، اور اجماع و قیاس کی بحثوں کو باقاعدہ نئے سرے سے مرتب کیا جائے اور یا پھر ایک ایسی کتاب کا اضافہ کیا جائے جو جدید ابھری ہوئی بحثوں پر مشتمل ہو جس میں متجددین اور مستشرقین کی اٹھائی ہوئی تمام بحثوں کا جائزہ لیا جائے ہمارے ہاں رائج کتب میں "اصول شاشی" "نور الانوار" "حسامی" اور "توضیح تلویح" ہیں جو علی الترتیب متواتر چار سال تک پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں سے آخری دو کتابوں میں سے کسی ایک کو خارج کر کے اس کی جگہ اس نئی کتاب کو درس میں پڑھایا جا سکتا ہے اس طرح قدیم نصاب بھی تشنہ نہیں ہوگا اور یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی

اس میدان کی ضرورت تو اس سے کہیں زیادہ ہے مثلاً اصول فقہ کو اصول قانون ——— ( JURIS PRUDENCE ) کے مطابق مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے پھر فقہ کی ترتیب جدید قوانین و ضوابط ( ACTS ) کی طرز پر اشد ضروری ہے لیکن موجودہ مدارس کی بس کا یہ کام نہیں ہے ممکن ہے مستقبل میں اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے کوئی راہ نکالے اس وقت متعدد حکومت کی سرپرستی میں یہ کام ہو رہے ہیں لیکن ایسے مقاصد کے لئے دوسری طرف سراسر غفلت ہی غفلت ہے۔

## علم کلام

تمام اہل فکر اس بات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ علوم کلام کو نئے سرے سے مرتب ہونا چاہیئے معتزلہ اور خوارج جبریہ اور قدریہ کے ساتھ ساتھ اہل قرآن، متجددین، منکرین ختم نبوت اور اہل بدعت کے، کمیونزم، سوشلزم اور مغرب کے پھیلائے ہوئے مادی فلسفوں کی تحقیق اور تنقیدی مطالعہ کی اشد ضرورت ہے۔ جس میں تحقیق ہو کہ یہ جدید فتنے اٹھے کروڑوں مسلمان اور ہزاروں مربع میل اسلامی دنیا کو ہضم کر گئے۔ اور ہم صرف قدیم بحثوں میں الجھے ہوتے ہیں۔ اگر عربی میں ممکن نہ ہو تو اردو زبان میں ایسی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں یا ایسی کتابوں کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں رائج نصاب مرکزوں کے درمیان کام کیا جا رہا ہے بعض مدارس میں جدید افکار کے خلاف نوٹس لکھائے جاتے ہیں لیکن وہ بہت محدود اور سرسری ہوتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پہلو میں کام کر کے ایک خصوصی کتاب تیار کی جائے اور اسے نصاب میں داخل کیا جاتے

**علوم عربیہ** علوم عربیہ میں صرف و نحو کے قواعد پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن ان کے استعمال اور اجراء کو نظر انداز کیا جاتا ہے خصوصاً نحو کا فن تو گویا رٹ کر کھا جانے کا طلسم کردہ گیا ہے زبان کی تعلیم میں کافی ہوتا ہے کہ یہ غلط ایسے عمل کیا ہے، لیکن اس سے آگے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ محض علمی اور ذہنی عیاشی ہے مثلاً نحو کی مشہور کتاب "شرح جامی" میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ تثنیہ اور جمع میں اصلی حالت میں اعراب الف نون اور واو اور نون سے ہوتا ہے اور نصبی اور جری حالت میں یا اور نون سے یعنی مسلمان مسلمون اور مسلمین اور مسلمین اسے وہ تفصیلی بحث کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے .. ——— اور اس کی بے فائدہ فلسفی بیان کی جاتی ہے لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے فضلاء جیسی صرف و نحو کے قواعد ازبر ہوتے ہیں دو فقرے صحیح نہیں بول سکتے اور فصیح عربی لکھنا تو ان کے لئے ناممکن ہے حالانکہ وہ فصاحت و بلاغت کے قواعد کے پورے حافظ ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں صرف و نحو کی پڑھائی جانے والی کتابوں کا نئے سرے سے جائزہ لینا ضروری ہے ان کی جگہ "النحو الواضح" اور "البلاغۃ الواضحہ" کی طرز کی کتابوں کو درس میں داخل کیا جانا چاہیئے مگر "کافیہ" اور "شرح جامی" کی جگہ "المغنی" "ابن عقیل" "شرح "المعمہ" مفید ہیں۔ مگر علم بلاغت کے ضمن میں بلاغت قرآن اور اعجاز قرآن کے مضامین کو تفصیل سے لیا جانا ضروری ہے

ادب عربی کی بعض کتابیں نہایت فحش ہیں سا مقامات ان کو خارج ہونا چاہیئے پھر ادب میں تنقید کے فن پر توجہ نہیں دی جاتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم ہر مدرسے میں تخصص کا ایک شعبہ ہو مثلاً ایک مدرسے میں قرآن کا تخصص ہو تو ایک جگہ حدیث و ادب کا ——

**جدید زبانیں** ان اصلاحات کے علاوہ طلباء کی معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اسلامی اور عالمی زبانوں کی ضروری مہارت حاصل کرنا بھی ضروری ہے عالمی زبانوں میں جرمنی فرانسیسی اور انگریزی میں سے کوئی ایک ہو، اور اسلامی ممالک کی زبانوں میں سے فارسی ترکی اور انڈونیشین میں سے کوئی ایک ضروری رائج ہونا چاہیئے خصوصاً یورپی زبانوں کا سیکھنا منتہی اور فاضل طلباء کے لئے اشد ضروری ہے ان زبانوں میں جدید علوم کے ساتھ ساتھ وہ تمام مواد موجود ہے جو اسلام کے خلاف پوری دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے مثلاً متجددین کے فتنے اٹھے ہیں ان کا منبع اور ماخذ مستشرقین کے خیالات و افکار ہیں اور جو انگریزی، جرمن اور فرانسیسی میں موجود ہیں

**اصلاح کا طریقہ کار** اوپر جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان کے نفاذ کے لئے اور ان مدارس کے نظام میں مزید اصلاح کے لئے اور ان پر مسلسل غور و فکر کے لئے ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں کے انداز پر یا کم از کم سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کی طرح محض امتحانات لینے کی خاطر، اس کا کوئی مرکز قائم ہو یہ علماء سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک ایسے ادارے کی تشکیل دیں ابتدائی طور پر یہ صرف امتحان لینے کا ادارہ ہو سکتا ہے جو نصابات کا تعین کرے اور جس کی دی ہوئی سند کو اہمیت اور مقام حاصل ہو، پھر کوشش ہو کہ آہستہ آہستہ سارے معیاری مدارس اس سے الحاق کریں بلکہ صورت یہ ہو جاتے کہ الحاق کا نہ ہونا غیر معیاری ہونے کا ثبوت ہو۔ اس قسم کے ادارے کا سارے صوبے (اور آگے چل کر سارے ملک) کے ارباب علم و فضل سے جو رابطہ ہوگا وہ نصابات کی از سر نو تدوین میں استعمال کیا جاتے۔ مختلف میدانوں کے لئے مناسب افراد پر مستقل کمیٹیاں بنائی جائیں۔ مدارس کے نظام کار، آمد و خرچ کے نظام اور دیگر معاملات کے بارے میں بھی اصلاحی تجاویز پیش کی جائیں یونیورسٹی کے سینٹ اور سنڈیکیٹ کے انداز پر مجلسیں ترتیب پا جائیں اس مرحلہ تک آنے کے بعد یہ بڑا آسان ہوگا کہ نئی کتابوں کی تدوین ہو اور ان کی اشاعت کا بندوبست ہو سکے اگر کسی کتاب کے بارے نصاب ہو کر سارے مدارس میں اس کا رواج ہوگا تو مدارس کے طلبہ کے لئے تعداد کی بنا پر کوئی کثیر تعداد کی بنا پر کوئی بھی ناشر اس کے لئے باسانی تیار ہو جائے گا۔

یہ ایک نہایت ضروری اور ابتدائی اور بنیادی قدم ہے جو ان مدارس کے ارباب کار کو اٹھا لینا چاہیئے۔ اور اگر ہمارے علمائے کرام اس نظام کی اصلاح و ترقی کچھ بھی پرخلوص دل میں رکھتے ہیں تو انہیں اس راہ کی مشکلات پر قابو پا کر عملی اقدامات کا آغاز کرنا چاہیئے مدارس کا نظام ایک طویل مدت سے جمود کا شکار ہے، اور یہ بالکل بے جا نہیں ہے مدارس کے ارباب حل و عقد کو چاہیئے کہ وہ اس کی فکر کریں تاکہ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ، معاشرے کے بہتر فرد اور دین کے بہتر خادم بن سکیں۔

* *

# آزادیٔ کشمیر کا واحد حل آپ کی نظر میں؟

*❁*❁*❁*❁*

جہاد بالنفس، جہاد بالقلم، جہاد بالسیف (لیاقت بیرچ صحافت)
ہم نے جیسی فقیر سائیں (احمد) رمل دے مگے (راقم الحروف پنجابی)
پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اور جذبۂ جہاد کی بیداری (فرح نوین فارمیسی)
آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ گوریلا جنگ (بشارت احمد، ملاوجی)
جذبۂ جہاد کے ذریعے (فرمان علی۔ زوالوجی)
دفاعی قوت میں معقول اضافہ اور گوریلا جنگ (سلیم چغتائی زوالوجی)
استصواب رائے (لستا مبیگ فارمیسی)
الجزائر اور ویت نام کی طرح تخت یا تختہ منتخب کیا جائے (رفیق شاہد سوشیالوجی)
"ڈنڈے سے ڈنڈا" (الیاس شیخ زوالوجی)
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس (حسن نواز صحافت)
پھر کوئی محمود آئے پھر سے قاسم کوئی (عابدہ سحر۔ صحافت)
تیس سال سے حل ہی تو تلاش ہو رہا ہے (شوکت رانا فارمیسی)
رائے شماری (عتیق النساء۔ باٹنی)
طاقت سے چھینے علاقے طاقت سے واپس (خالد حسن۔ فلسفہ)
واحد حل طاقت کا عقل مندی سے استعمال (سلمیٰ سعید زوالوجی)
جنگ مگر میرے خیال میں اب یہ مسئلہ کم اور سٹنٹ زیادہ ہے (سعید۔ اردو)
آزادانہ استصواب رائے (سمیرہ وحید۔ تاریخ)
عائدہ حکومت۔ مسلح جدوجہد (خالد فاروق نباتیات)
ایک ہی لفظ۔ جنگ (ضیاء السلام سیاسیات)
دو قومی نظریے سے نئی نسل کو واقف کرایا جائے (طاہر شہناز۔ ارضیات)
جہاد ہی ہے زندگی (ارشد چغتائی کیمیکل ٹیک)
جہاد فی سبیل اللہ (حافظ سلمان بٹ سیل کالج)
الجہاد والجہاد والجہاد والجہاد (مقصود احمد سیل کالج)

● ●

# کلاس روم میں جنس مخالف کی موجودگی

ذہنی، تعلیمی، اخلاقی رجحان کو ڈسٹرب کرنے کا سبب بنتی ہے؟

کرتی ہے مگر امر تسری ڈی سے کم (ماجد علی۔ زوالوجی)
اس سے میں زیادہ حقیقت پسند ہو گئی (پروین عالم۔ سوشل ورک)
میں ان بیماریوں سے ابھی تک بچا ہوا ہوں (رفیق شاہد۔ سوشیالوجی)
کچھ گڑبڑ ہوتی رہتی ہے (خالد فاروق باٹنی)
ذہن پہ بوجھ نہ ہو، دل کی بے تالی نہ ہو (عابدہ سحر۔ صحافت)
اخلاقی تصورات کسی حد تک منتشر ہوا کرتے ہیں (حسن نواز صحافت)
قدرے توازن کی فضا قائم رہتی ہے (صالحہ سلیمان۔ صحافت)
ذہنی اور تعلیمی رجحان کو یقیناً منتشر کرتی ہے (مہ پارا رشید۔ اردو)
اعتباری نظام میں پڑھیں تو صفر ملی میٹر (فرخ۔ فارمیسی)
جنسِ مخالف کی موجودگی میں صنفِ نازک "ٹیلنٹ" خوبی سے استعمال کرنے کی صلاحیت
بہرحال نہیں رکھتی جو کہ قدرتی امر ہے (میمونہ شہزادی تعلیم و تحقیق)
مخلوط تعلیم میں علم کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف (ضیاء السلام ملک سیاسیات)
سو فی صد درست ہے فرمایا ہوا آپ کا (الیاس شیخ۔ زوالوجی)
سارا وقت شخصیت جاذبِ نظر بنانے میں گزر جاتا ہے (محمد اسلم۔ پنجابی)
کبھی کبھار ذہنی، اخلاقی، تعلیمی تصور کو منتشر کرتی رہتی ہے (مریم خاتون زوالوجی)
عموماً لوگ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی فکر میں رہتے ہیں (مہر عبدالغفار عربی)
یقیناً درست کہا آپ نے (سعید ظفر اردو)
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی (بشریٰ ناہید اردو)
اگر صحت مند بنیادوں پر ہو تو آدمی انسان بن جاتا ہے (خالد حسن قریشی علم)
مخلوط تعلیم نہیں ہونی چاہیئے۔ (مس کاکا خیل۔ ریاضی)
"نو کمنٹ" (یاسمین حمید۔ فلسفہ)
اگر خیالات منتشر ہونے لگیں تو مطالعہ جاری رہتا ہے (قمر الاسلام۔ ارضیات)
خاموشی سے حرامیں پر سیر ستی منوا لیے (ماجد عرفان سیل)

● ●

ممتاز مفتی

# تعلیمی زندگی

# یادیں ہی یادیں

آفتاب فیروز کی جانب سے مجھے کہا گیا ہے کہ میں اپنی تعلیمی زندگی کی یادیں بیان کروں۔ میں علی پور کے ایلی میں اپنی تعلیمی اور غیر تعلیمی زندگی کی یادیں اتنی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ اب دہرانے کی کیا ضرورت ہے
ہم دیکھ کر کہا تھا یہ تو راویوں کا گرتہ صاحب ہے

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ ان میں سے ہوں جن پر زندگی گزرتی ہے۔ زندگی بھر میں نے راہ نکالی نہیں راستے آتے گئے اور انہیں اپناتا رہا۔ چاہیے یہ راستہ پیدا کئے ہوں یا قسمت نے بنائے ہوں عملی طور پر راستہ اپنے کا خوگر ہو اسے کیا کہئے:

اصلی طور پر مجھ میں دو خصوصیات موجود تھیں ڈر اور جھلک۔ صرف تھیں ہی نہیں اتنی شدت سے تھیں کہ باقی صفات پیچھے کھڑے رہتے تھے اس کی وجہ شاید گھر ہو۔
گھر کے متعلق میرے بچپن کے تاثرات کچھ ایسے ہیں جیسے ——— گھر تو تھا لیکن وہ گھر نہیں تھا جیسے ہم گھر میں ہیں۔ آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ آؤٹ ہاؤس گھر کے اندر واقع تھا لیکن گھر آؤٹ ہاؤس سے کوسوں دور رہتا تھا کوئی پوچھنے والا تھا کوئی سننے والا۔ تھا کوئی اہمیت۔ تھی کوئی حیثیت۔ تھی آجاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ کوئی آگیا ہے۔ چلا جاتا تو پتہ نہ چلتا کہ چلا گیا ہے۔ ماں اپنے ہی گھر میں نوکرانی تھی۔ شاید اسی سے آؤٹ ہاؤس میں رہنے والا بچہ گونگا تنہا اور بے چارہ ہی رہا۔

باہر گلی میں لڑکے تو تھے لیکن جھک اور علیحدگی کی وجہ سے انہیں ساتھی۔ نہ سکا یوں گلی اور محلہ گھر کی طرح ویران ہی رہے۔

سکول میں میں ایک نالائق لڑکا تھا۔ چونکہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا اس لیے ہر سال پاس ہو جایا کرتا تھا

۱۹۲۹ میں پندرہ سال کی عمر میں میں نے دسویں جماعت پاس کرلی۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ وجہ شاید یہ ہو کہ دسویں جماعت میں والد صاحب ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے کوئی سوال پوچھتے۔ ل جواب نہ دے سکتا لہٰذا مجھے بنچ پر کھڑا کر دیا جاتا۔ دسویں جماعت میں انگریزی کے پیریڈ میں میں نے تقریباً پورا بنچ پر کھڑے ہو کر گزارا۔ سب ہم جماعت جانتے تھے کہ باپ بیٹے کی آپس میں ٹھنی ہے ساتذہ اسی باعث مجھ سے ہمدردی کا سلوک کرتے تھے۔ آخری تین ماہ میں میں نے یکا ارادہ کر لیا کہ میں خود کو اس ذلت سے بچا کر رہوں گا لہٰذا میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ماسٹر جانتے تو میں ان کی نگاہیں زیر بار رہتا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پڑھائی سے دلچسپی تھی یا امتحان پاس کرنے کا خیال تھا۔ صرف اس لیے کہ ابا کے پیریڈ میں مجھے بنچ پر کھڑا ہونا مشکل ہو جائے اور ہم جماعت تمسخر بھری نظروں سے نہ دیکھیں۔ شاید اسی وجہ سے میں میٹرکولیشن میں پاس ہو گیا

پھر مجھے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل کروا دیا گیا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کا رنگ کچھ اور ہی تھا

زیادہ تر زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے سیدھے گاؤں سے تحصیل علم کے لیے اسلامیہ کالج میں آتے تھے۔ اونچے لمبے قد بھرے بھرے جسم جاٹ دار آواز۔ تکلف سے بھرپور انداز۔ گھومنے والی انہیں صرف وہ گاؤں سے آتے تو ساتھ ہی چادروں کے تہمد کھلے کھلے کرتے طرّے دار پگڑیاں پہنے ہوتے۔ ہاتھ میں حقہ ساتھ دھرا ہوتا۔ پیچھے پیچھے پائیدان پر گاؤں کا کوئی کمی بیٹھا ہوتا۔ جو حقے کو تازہ رکھتا۔ یہ کامی وہ گاؤں سے ساتھ لاتے تھے تاکہ بورڈنگ میں ان کے ساتھ رہ کر خدمت بجا لائے

یوں سمجھ لیجئے کہ ان گبھروؤں کی بستی میں ایک ماتا کا دھنسا ہوا بت جسا قدم قدم پر دھکے پڑتے۔ جگہ جگہ سے دھونس کی آواز سنائی دیتی۔ ہر کوئی طعنہ دیتا۔ مذاق اڑاتا۔ "پیٹ سے ہی میٹرکولیشن پاس کر کے آیا ہے۔" "ارے میاں لڈیاں بھی آگئیں۔" "ابھی تو دودھ کے دانت ہیں"

میں تو پہلے ہی تنہا گونگا اور بے چارہ تھا اس ماحول میں بالکل ہی اداس کھو بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا سارا دن لاہور کے بازاروں کی خاک چھانتا۔ موم پھلی کھاتا ریوڑیاں چباتا۔ شام کو کسی سستے سینما حال میں ایلمو یا پیڈرو بہادر کے کارناموں کی فلم دیکھتا۔ ان دنوں فلم جادو اور سیریل ہوتے تھے۔ دو دو چار چار ایپی سوڈ دکھائے جاتے۔ آخر میں ہیرو کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتا۔ سو اور

زندگی کا سوال درپیش ہوتا پھر حل حروف میں لکھا ہوا آتا پھر کیا ہوا ـــــــــــــ اگلی بار آکر دیکھیے۔ جب اندھیرا چھا جاتا تو چوروں کی طرح بورڈنگ میں داخل ہو کر اپنے کمرے میں پڑ رہتا۔

مجھے آوارہ گردی کا شوق نہ تھا یہ تو فارسٹ کے ماحول سے فرار کا واحد راستہ تھا رہا سینما دیکھنا احساس کمتری کا مارا ہوا ہر شخص بہادروں کے کارنامے دیکھنے کا شوق رکھتا ہے خود کو بہادر سے (IDENTIFY) کر کے چند گھنٹوں کی عیاشی کر لیتا ہے اس کے لیے احساس کمتری سے وقتی مخلصی پا لینا سب سے بڑی عیاشی ہوتی ہے۔

اسلامیہ کالج کے بعد مجھے سندوسبھا کالج امرتسر میں داخل کروا دیا۔ سندوسبھا کالج میں مسلمان طلبا کو داخل کرنے کی اجازت نہ تھی خصوصی داخلہ کے لیے بورڈ کی منظوری لینا پڑتی تھی مجھے اجازت اس لیے ملی کہ پرنسپل میرے والد کے دوست تھے سارے کالج میں صرف چار مسلمان طالب علم تھے جو ہوسٹل میں مقیم تھے۔

ہوسٹل کالج سے آدھ میل دور شہر کے باہر ایک افتادہ ویرانے میں واقع تھا۔ ہوسٹل میں چالیس لڑکے رہتے تھے جن میں صرف چار مسلمان تھے چھتیس برہمنوں میں چار شودر جو ڈائننگ ہال میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ڈائننگ ہال پر بیٹھ کر کھانا کھانا ممنوع تھا ہمیں کے برتنوں کو ہاتھ لگاتے تو بھرشٹ ہو جاتے لہذا ہمیں اپنے برتنوں کا خود انتظام کرنا پڑتا۔ نوکر ہمارے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے خود ہی انہیں دھونا پڑتا بورڈنگ میں گوشت لانا پکانا یا کھانا منع تھا

ہوسٹل ایک پرانی بوسیدہ کوٹھی میں تھا اسے آموں والی کوٹھی کہا جاتا تھا چونکہ وہاں آموں کے پیڑ تھے اور سانپ بکثرت تھے ہم چاروں کا شغل سانپ مارنا اور چرا کر آم کھانا تھا۔

روز ہم سولہ سترہ میل پیدل چلتے تھے چونکہ کالج پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ ان دنوں بسیں اور ٹیکسیاں نہ تھیں۔ شہر کی طرف دو ہی ذریعے تھے تانگہ اور ریل گاڑی۔

پڑھنے لکھنے کا وقت کہاں ملتا تھا ہمیں چار گھنٹے تو پیدل چلنے میں صرف ہو جاتے ہوسٹل میں پہنچتے تو تھک کر چور ہوتے پھر کھانے میں دال اور پھلیاں دال اور بھیا کھانے کے بعد مطالعہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

تفریح کی صرف ایک صورت تھی پرنسپل اپنی لینڈو میں بیٹھ کر ہوسٹل کا وزٹ کرنے آتیں ان کا انتظار کھینچتے جب وہ واپس جاتے تو ہم ان کی لینڈو کی بیک سیٹ پر بیٹھ جاتے باری باری دو بیٹھتے دو لینڈو کے پیچھے بھاگتے یوں شہر پہنچتے اور کسی تھیٹر یا سینما میں جا گھستے آخری دنوں میں جب امتحان قریب آ گئے تو پرنسپل صاحب سیر و تفریح کے لیے روز ہوسٹل آنے لگے اور ہم تفریح کے لیے مجبور ہو گئے بھلا کمرہ میں بیٹھ کر کیسے کرتے۔

ہندوسبھا کالج میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہاں احساس کمتری کی شدت میں تھوڑی سی تخفیف ہو گئی یہ تخفیف وقتی تھی دائمی نہیں

یہ عقدہ آج تک نہیں کھلا کہ میں ایف اے میں پاس کیسے ہو گیا۔

احساس کمتری کی شدت کے علاوہ میری ایک اور مشکل بھی تھی مجھے عشق کرنے کا ہوس تھا ہر چلتی پھرتی لڑکی کو دیکھ کر مجھے اس سے عشق ہو جایا کرتا تھا شکر ہے ان دنوں چلتی پھرتی لڑکیاں سر عام نظر نہیں آتی تھیں یا شاید اسی وجہ سے ہو جایا کرتا تھا

۱۹۲۱ء میں لاہور میں انارکلی بازار میں کسی کوئی برقعے میں ملبوس لڑکی ہی نظر نہیں آتی تھی ان دنوں انارکلی لاہور کا جدید ترین علاقہ تھا جہاں رونق ہوتی تھی مال روڈ اور میکلوڈ روڈ ویران تھے مال اور میکلوڈ کے درمیانی آبادیاں وجود نہیں رکھتی تھیں ادھر مزنگ کا اور اچھرے کا گاؤں تھا ادھر قلعہ گوجر سنگھ کا سرکلر روڈ پر تانگے چلتے تھے ہیرا منڈی آباد تھی تماشہ دیکھنے کے لیے ہیرا منڈی جانا پڑتا تھا۔ ریڈیو ابھی نہیں چلا تھا اردو فلم کا وجود نہ تھا لڑکی دیکھنے کے لیے ڈبی بازار جانا لازم تھا والڈ سٹی کے محلوں میں لڑکیاں تو تھیں لیکن انہیں کھڑکیوں میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ محلے کے رستے لوٹتے ہر راہ گیر کو کڑی نگاہوں سے دیکھتے تھے کون ہے ادھر کیوں آیا ہے نگاہوں میں تیر تو نہیں چلتے گر بادل گرنے کا کام تھا۔

پتہ نہیں یہ عشق کی بیماری مجھے کیوں لگی تھی شاید اس لیے کہ میں بچپن سے جنس زدہ تھا گھر کے ماحول کو دیکھ کر مجھے جنس سے نفرت ہو گئی تھی یہ نفرت اتنی شدید تھی اتنی شدید تھی کہ جنس میرے لیے ـــــ (OBSSESSION) ہو کر رہ گئی۔ اس جنس زدگی کے کوائف بھی عجیب سے تھے

پتہ نہیں ہوا کیا جسم کو جنس سے نفرت رہی، ذہن کشش سے بھر گیا

یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں عشق کے ذریعے انتقام لے رہا تھا اپنے والد کو سمجھا رہا تھا کہ اے اللہ کے بندے عورت خوش وقتی کے لیے نہیں ہی عشق کرنے کے لیے بنی ہے اس سے عشق کر داس کے لیے آہیں بھر داس کے ہجر میں جل سب کچھ تیاگ کر اس کی چوکھٹ پر جا بیٹھو اسے فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش کر خود پر حرام لو۔

میری تعلیم ادھوری رہنے کی ایک وجہ عشق بھی تھا اس زمانے میں عشق کرنے کے لیے لڑکی ملتی نہ تھی خوش قسمتی سے مل جاتی یعنی ایک جھلک پر گزارا کرنا پڑتا یہ جھلک بھی نیم جھلک ہوتی چونکہ درمیان میں یا تو برقعے کا پردہ حائل ہوتا اور یا کھڑکی کی چق۔

اس زمانے میں لڑکیاں بندشوں کی وجہ سے مظلوم تھیں آج آزادی کی وجہ سے مظلوم ہیں اس مخلوق کی قسمت میں ہی مظلومیت لکھ دی گئی ہے۔

امرتسر میں میں ایک سفید دھبہ اور سنہری لٹ پر عاشق ہو گیا نیم جھلک میں یہی کچھ نظر آیا تھا چہرے کا ایک سفید دھبہ اور سنہرے بالوں کی ایک لٹ مجھے علم نہ تھا کہ وہ کیسی ہے کون ہے کہاں رہتی ہے عشق کے لیے یہی بہت کچھ ہوتا ہے۔ لہذا دو سال اسی پر گزارا کیا آگے اللہ مالک تھا

بی اے میں میں پھر سے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا اسلامیہ کالج کی وہی سر تال تھی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی اس لیے پھر سے شدت احساس کمتری بیدار ہوا۔

اول تو جماعت میں جانا مشکل تھا۔ اگر دل کڑا کر کے پہنچ جاتا تو بیک بنچ کے پیچھے چھپا رہتا اور وہاں بیٹھ کر کسی سفید دھبے اور سنہری لٹ کے خیالوں میں کھو جاتا۔

انہی دنوں میری زندگی کا ایک عظیم حادثہ عمل میں آیا کیمبرج آنرز سکول کا ایک طالب علم ہوسٹل میں میرے ساتھ والے کمرے میں آ گیا اس کا نام نیاز محمود تھا وہ میرے گاؤں بٹالے کا رہنے والا تھا۔ ایک اونچے اور معروف خاندان سے تھا جسے ہم اچھی طرح سے جانتے تھے

نیاز محمود کی زندگی میں صرف ایک کام تھا کتابیں پڑھنا وہ دن رات صبح شام ہر وقت پڑھنے میں مصروف رہتا تھا اس کا کمرہ کتابوں جدید ترین رسائل اور ورلڈ فیمس تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ اس کے مطالعے کا محور درسی نہ تھا وہ انگریزی ادب کی ہر کتاب پڑھنے کا دلدادہ تھا چاہے وہ کورس سے متعلق ہو یا غیر متعلق اس کے مالی حالات اچھے تھے اس کے ہاتھ جو رقم اسے ہاتھ لگتی اس کی کتابیں اور رسائل خرید لیتا۔ کتاب اس کے لیے سب سے بڑی عیاشی تھی۔

عباس محمود سے مل کر پہلی مرتبہ مجھے سمجھ میں آیا کہ پڑھنا لکھنا کسے کہتے ہیں اور کتاب کا مفہوم کیا ہے۔

عباس محمود کو صرف مطالعے کا شوق ہوتا تو شاید بات نہ تھی۔ اس کی طبیعت میں ٹوکا ٹوکی بھی بہت تھی۔ اگر میں اس کی کوئی کتاب اٹھا لیتا تو وہ جھٹ بول اٹھتا۔ معاف کیجئے یہ آپ کے کام کی چیز نہیں۔ یہ کتاب ہے کتاب۔ آپ کو علم ہے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ وہیں میں نکال رہا ہے۔ یہ آپ کے مطلب کی چیز نہیں اسے وہیں رکھ دیجئے۔

عباس کی غیر موجودگی میں۔ میں اکثر اس کی کتابوں اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ اگر پکڑا جاتا تو عباس کی دہاڑ نکلتی۔ اچھا تو آپ تصویریں دیکھ رہے ہیں لیکن جناب یہ تو ورلڈ میس پینٹنگ ہے۔ آپ کے مطلب کی نہیں۔ آپ کسی سینما ہال کے باہر لگے ہوئے پوسٹر دیکھیے۔

کبھی کبھار اس کا موڈ اچھا ہوتا تو مسکراہٹ بدل جاتا۔ ہاں ہاں یہ کتاب دستوفسکی کا شاہکار ہے۔ یہ دستوفسکی کے بارے میں ساری معلومات بیان کرتا اس کی زندگی، اس کی تحریر کی خوبیاں، خامیاں۔ لیکن ایسا موڈ کبھی کبھار ہی طاری ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ گرد و پیش سے بے زار رہتا تھا۔

بہرحال عباس کی ٹوک اور کاٹ نے میرے دل میں مطالعے کا شوق پیدا کیا اور آج اگر میں کچھ جانتا ہوں تو وہ بیشتر عباس کی وجہ سے ہے۔

کچھ دیر ہم ہوسٹل میں رہے پھر ہم پانچ لڑکوں نے ہوسٹل چھوڑ کر ایک لاج کرائے پر لے لیا اور اکٹھے مل کر وہاں رہنے لگے۔

مطالعے کا یہ شوق غلط وقت پیدا ہوا۔ چونکہ امتحان قریب آگیا تھا۔ اس وقت مجھے درسی کتابوں کی طرف توجہ دینی چاہیے تھی۔ لیکن مطالعے کا شوق تو کتابی دنیا میں آوارگی پر اکساتا ہے۔

بہرحال انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے میں درسی کتابیں پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔

لاج میں میرا ایک دوست مرزا رہتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکا تھا۔ اونچا لمبا قد، سڈول جسم، اجلا اجلا رنگ اور سنہرے بال۔

وہ سب سے اوپر کی منزل میں مقیم تھا تاکہ جھانکنے سے دلچسپی تھی۔ لاج سے چالیس پچاس قدم دور دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ ایسی تاک جھانک چل کر لڑکیاں اس پر مرمٹیں۔ وہ دونوں تھیں بہت تیز مذاق اور ہنسی ہوئی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مرزا خط لکھے۔ تاک جھانک تو خیر ٹھیک تھی لیکن خط لکھنا مرزا کے بس کا روگ نہ تھا۔ لہذا خط مجھے لکھنے پڑتے جن کی نقل کر کے مرزا لڑکیوں کو بھیج دیتا۔ لڑکیاں شستہ لکھتیں اور شوخ جواب دیتیں۔

خط و کتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ رات کے دو بجے لڑکیاں سلاخ دار کھڑکی میں آ کھڑی ہوتیں جو ایک مختصر سے قبرستان میں کھلتی تھی۔ مرزا قبرستان میں جا پہنچتا۔

میری ڈیوٹی یہ لگی کہ رات کے دو بجے تک جاگوں۔ جاگتے رہنے کے لیے لازم ہو گیا کہ میں درسی کتابیں پڑھوں۔ دو بجے تک میں پڑھتا رہتا۔ جب کھڑکی میں روشنی لہراتی تو میں اٹھ کر مرزا کو جگا دیتا۔ مرزا جلدی جلدی تیار ہو کر قبرستان میں جا پہنچتا اور میں سو جاتا۔

دو مہینے تو یہ معمول چلتا رہا پھر گڑبڑ ہو گئی۔

مرزا کو بات کرنی نہیں آتی تھی۔ وہ تو محض ملاقات کا قائل تھا۔ لڑکیوں کو بات سمجھ میں آگئی کہ خط لکھنے والا کوئی اور ہے۔ میری غلطی ہو گئی۔ اس پر منظر ہی بدل گیا۔ طویلے کی بلا بندر کے سر آپڑی۔

بہرحال وہ مہینے تو بیت گئے ——— اور میں بی اے میں پاس ہو گیا۔

بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے نوکری تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن بے کار۔

ان دنوں مالی انحطاط کا دور تھا۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا۔ ملازمت ملنی محال تھی۔ کیسے جیسے یہ پہلی جنگ عظیم کے اثرات تھے۔ ساپ بارہ سال پہلے گزر اتھا لیکن یہ سب امر ہی تھیں۔ ویسے بھی اس لیے میں نے سٹینو گرافی پاس کر لی۔ ان دنوں گریجویٹ سٹینو گرافر فال خال ہوں گے۔ اس کے باوجود نوکری نہ ملی۔

انٹرویو کے لیے خط تو بہت آئے لیکن ان دنوں دفتر ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ وہ بڑی احتیاط سے خط انٹرویو سے ایک دن پہلے پوسٹ کرتے تاکہ مسلمان کو نوکری نہ مل جائے۔

تنگ آ کر ۱۹۲۲ء میں میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہو گیا۔ مجھے استاد بننے سے سخت نفرت تھی۔ سب سے زیادہ ہوسٹلی کی وجہ سے تھا لیکن مجبوری تھی۔ تو میں سکول ماسٹر بن گیا۔ بارہ سال سکول ماسٹر رہا۔ حتیٰ کہ تنگ نظری میں نے سکول کے اساتذہ میں دیکھی کہیں اور نہ دیکھی۔ اساتذہ مجھے ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے کیونکہ میرے خیالات سکہ بند نہ تھے اور میرا برتاؤ رسمی نہ تھا۔ آخر ۱۹۳۵ء میں میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔

سہر طور کالج چھوڑنے کے بعد مطالعے کی بیماری بڑی طرح لگی رہی۔ نفسیات سے میں جس میں جا نکلا پھر لٹریری ادب اور آخر میں پارا سائیکالوجی

کچھ سال سے یہ کہا گیا ہے کہ میں آج کے نوجوانوں کو پیغام دوں۔ پیغام سے مطلب نصیحت ہے جو میں معذور ہوں۔ بے شک دوسروں کو نصیحت کرنا بڑی عیاشی ہے۔ نصیحت ایک ایسا میوہ ہے جسے کھانے میں نہیں دوسروں کو کھلانے میں لذت ہے۔ میں نے زندگی بھر کڑوا کھایا ہے۔ نصیحت کس منہ سے کروں۔

میں آج کے نوجوانوں کا مزاج ہوں۔ میری دانست میں آج کے نوجوان ہم سے بہتر ہیں۔ ہم سے زیادہ ذہین ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ حسن ہیں۔ ہم سے زیادہ مخلص ہیں۔ ہماری طرح ہپوکریٹ نہیں۔

مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ وہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں یا انجانے میں دوسروں کے ہاتھ کا ہتھیار بن جاتے ہیں۔ آپ اسے سیاست کہہ لیں۔ کچھ کہہ لیں۔

* *

# نوجوان اور سن رسیدہ اساتذہ کے رویوں میں فرق

میٹھے اور کھاری پانی والا فرق۔ (بشارت احمد ۔ زوالوجی)

نوجوان اساتذہ — طالبات کے لیے رحمت ۔ (نثار سکارمی ۔ زوالوجی)

مگر طلبہ کے لیے حذر رقابت۔

جوانوں کی نسبت سن رسیدہ کا رویہ بہتر ہے۔ (فرمان علی ۔ زوالوجی)

جیسا کسی کتاب کے نئے اور پرانے ایڈیشن میں فرق (محمد اشرف زوالوجی)

دونوں جو فرد ہ — نالاں — پریشان حال ہیں (مس لبنیٰ طاہک فارمیسی)

اس قدر جتنا بیسویں اور اکیسویں صدی میں فرق ہے (رفیق شاہد ۔ سوشیالوجی)

نوجوان اساتذہ ولسبتاً لڑکیوں کو جھجک سے پڑھاتے ہیں (مہ پارہ رشید اردو)

فی الحال فیل ہونے کا ارادہ نہیں (یاسمین حمید فلسفہ)

جو فرق ایک سیر اور ایک کلو میں ہے۔ (شوکت علی رانا فارمیسی)

سن رسیدہ اساتذہ کا رویہ مشفقانہ، جوان سال (سلمیٰ رشید زوالوجی)

اساتذہ کا دوستانہ۔

ہر بات بتائی نہیں جاتی۔ (بشریٰ ناہید اردو)

پیرزادہ اور دل جان جتنا (اسنعان مہر فارمیسی)

نوجوان اساتذہ رقیب محسوس ہوتے ہیں مجھے (سعید طلعت محمود)

جوان اساتذہ پڑھانے سے زیادہ ڈرانے کے ماہر۔ (خالد فاروق ۔ باٹنی)

وہی جو "ہم" اور ہمارے والدین میں ہوتا ہے۔ (شگفتہ ملک ۔ فارمیسی)

دونوں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ (عتیق النساء ۔ نباتیات)

نرگس کا چمن اور بے شاہین کا جہاں اور (سید نعیم سیل کالج)

نوجوان علم کی دھوپ میں جاتے ہیں اور رنگ برنگی (ضیاء السلام ملک سیاسیات)

زمین و آسمان کا فرق (روحینہ واسطی سیاسیات)

نوجوان فراخ دل، سن رسیدہ نمبروں کے معاملے میں کنجوس (وقار احمد ۔ طبیعات)

شادی شدہ ہوں تو کوئی فرق نہیں (الیاس احمد ۔ زوالوجی)

جس قدر پرانے اور نئے سکوں میں فرق (محمد علی سید ۔ فارمیسی)

بزرگ نسل سے تعلق رکھنے والے وضعدار ہوتے ہیں (افتخار احمد فارمیسی)

نوجوان اساتذہ اختلاف رائے سے نفرت کرتے ہیں (سمعیہ وحید فارمیسی)

---

ماہرین عمرانیات کی رائے۔

# جواں خون پابندیوں کا مخالف، آپ کا خیال ؟

میرے جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے (مس فرح نوئیں ۔ فارمیسی)

صحیح کہا (پروین عالم سوشل ورک)

جائز پابندیوں کا کرنا فرمایت ہے؟ (شاہد سلیم سوشیالوجی)

اصولی پابندیاں قبول (رفیق شاہد ۔ سوشیالوجی)

پابندی کے بغیر انسان نامکمل قول عارف (حسن لارتارڑ ۔ صحافت)

ہے اہی پابندیوں میں سر آزادی اسیر (عابدہ سحر ۔ صحافت)

خون بے چارا تو کچھ نہیں کرتا (شوکت رانا فارمیسی)

شتر بے مہار کی سی آزادی لعنت ہے (العست بیگم تعلیم و تحقیق)

ذات، اخلاق معاشرے کے لیے پابندیاں رحمت ہیں (میمونہ شہزادی تعلیم و تحقیق)

کسی حد تک انسان آزادی پسند ہے (وقار احمد ۔ فزکس)

جتنی پابندیاں ہوں گی اتنی بغاوت ہوگی (نصرت پروین فلسفہ)

غلط تربیت سے راہ فرار ہی دکھائی ہے (خاور منصور لاء کالج)

ہر حد سے اور بڑے کام پر پابندی ضروری ہے (شگفتہ ملک فارمیسی)

عزیزم ناجائز پابندیاں جوتے کی نوک پر اچھال (احسان اللہ وقاص ...)

معقول پابندی — نشان زندگی ہے (ماجد عرفان ۔ سہیل کالج)

جائز پابندی قابل برداشت (مریم خاتون ۔ زوالوجی)

اگر میرے بس میں ہوتا تو کئی قتل کر چکا ہوتا (سعید ظفر ۔ اردو)

آپ بڑھاپے میں یہ بات پوچھ رہے ہیں (بشریٰ ناہید ...)

ہمارے ساتھ کوئی ایسا چکر نہیں (روحینہ واسطی سیاسیات)

شتر بے مہار قابل ستائش تو نہیں (منصور شاہ ۔ ریاضی)

ارادہ صاف ہو تو کوئی پرابلم نہیں (سمعیہ وحید ۔ فارمیسی)

اگر آزادی سے مراد پر ریب والی ہے تو پھر توبہ (اصغر علی ۔ ریاضی)

عمرانیات میں یہ ابھی تک متنازعہ مسئلہ ہے (زین العابدین عباسی سوشیالوجی)

محمد حسن
مستقل ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی

# صاحبِ تفہیم القرآن کے تعلیمی نظریات

معاملہ فلسفۂ حیات کا ہو یا فلسفۂ تعلیم کا حقیقت کی جستجو اہم حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ حقیقت کیا ہے اس وقت تک زندگی کا صحیح لائحہ عمل مرتب نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام کائنات از خود چل رہا ہے یا کسی بندھے ٹکے اصول کے مطابق چل رہا ہے؟ اگر کوئی اصول ہے تو اس کی نگہداشت کون کر رہا ہے؟ انسانی عقل اس عقدے کو حل کرنے کے لیے زمانۂ قدیم سے سعی کر رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نظام عالم خود بخود وجود میں آیا ہے اور کسی روز خود ہی ختم ہو جائے گا۔ ایک گروہ کی رائے میں یہ عالم کائنات مصنوع تو ہے، لیکن صانع کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے برخلاف ایک عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس نے حکمت کے ساتھ اس کی تخلیق کی ہے۔ اسی حکمت و تدبر کے ساتھ اس کا نظام چلا رہا ہے، اور جب چاہے گا اس نظام کو ختم کر دے گا۔

سید مودودی تصورِ حقیقت کے متعلق موخر الذکر مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے محققانہ انداز میں اس تصور کی وضاحت کی ہے کہ یہ نظام کائنات خود بخود نہیں چل رہا ہے اور اس کو چلانے والی مدبر قوت خدا کی ذات ہے۔ اس کے سامنے باقی تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔ وہ پورے اختیارات کا مالک ہے۔ اسی کے حکم کے تحت یہ دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ وہی اس پورے نظام کو پیدا کرنے والا ہے۔ کوئی دوسرا خلق و تدبیر میں اس کا شریک نہیں۔ رہی اس کی ربوبیت میں کوئی حصہ دار ہے۔ اس پورے نظام کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس نے انسان کو اپنی قدرت و حکمت سے وجود بخشا لہٰذا انسان کا معبود بھی وہی ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ اسی کو اپنا آقا و مالک سمجھے۔ انسان کا تعلق اپنے مولا سے عبدیت کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کی معرفت اور رضا حاصل کرنے میں دل و جان مشغول رہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنے ارادہ و اختیارات سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ ایسا علم حاصل کرے جس سے عبدیت کے تمام تقاضے پورے ہو سکیں۔[1]

سید مودودی کا یہی تصورِ حقیقت دراصل ان کے تمام تصورات و نظریات کا سرچشمہ ہے۔

## تصورِ کائنات

یہ نظام کائنات بھی ایک عجب کارخانہ ہے۔ جس کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے انسانی عقل بھی ابھی تک سرگرداں ہے۔ انسانی علم نے ہر دور میں اس کے بارے میں مختلف نظریات قائم کیے ہیں۔ بعض نے اس کو ایک اتفاقی حادثہ مانا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا نظم و ترتیب بھی کسی حادثے کی پیداوار ہے۔ اس کائنات میں انسان کا وجود بھی کسی حادثے کا پیدا کردہ ہے۔ انسان اور اس کائنات کے درمیان تعلق صرف خواہشات طبعی کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

بعض نے کائنات کو ایک وجود کا مظہر قرار دیا ہے۔ دریا، درخت، پہاڑ، چاند اور خود انسان بھی اسی ایک واحد وجود کے جلوہ ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت اور وجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ارادے کے مالک ہیں۔ ایسے میں کسی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں۔ ان کا عمل خدا کا عمل، ان کی حرکت خدا کی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے۔ اس طرح انسان اور کائنات میں کوئی تعلق ممکن ہی نہیں۔

بعض کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک الٰہ ہے جس میں کچھ طاقت یا نفع کا پہلو موجود ہے۔ چنانچہ دریا اگر سیراب کرتا ہے تو معبود ہے۔ آگ اگر جلا سکتی ہے لائق پرستش ہے۔ سانپ اگر کاٹ لیتا ہے، تو لائق تعظیم و عبادت ہے۔ غرض کائنات کی ہر شے مخدوم اور انسان اس کا خادم ہے۔

ایک اور مکتب فکر کے علمبرداروں مثلاً ہیگل اور مارکس نے بھی کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے فلسفے کو اس بنیاد پر چلایا کہ دنیا ہمیشہ سے قائم ہے۔ دنیا کا نظام کبھی ختم نہیں ہو گا بلکہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس کے ختم ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں سید مودودی کی رائے ہے کہ یہ نظام کائنات کسی حادثے کی پیداوار نہیں، بلکہ اس کو بنانے والے نے ارادتاً بنایا ہے۔ ذرّے سے لے کر آفتاب عالم تک ساری کائنات ایک بندھے ٹکے اصول اور قانون کے تحت چل رہی ہے۔ یہ قانون سب پر حاوی ہے۔ جو چیز بھی اس قانون سے روگردانی کرے گی چاہے پتھر ہی کیوں نہ ہو، اس کو تباہ و برباد ہونا ہے۔[2]

بعض مفکرین نے کائنات کو الگ الگ اجزاء میں تقسیم کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ایک جزو کا دوسرے جزو سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر ایک اپنے الگ اصول اور ضابطے کے تحت چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں سید مودودی فرماتے ہیں:

کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرّہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے گویا پوری کائنات ایک جسد واحد ہے اور اس کے اجزاء میں باہم

---

1۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۲۷، ۳۰، ۱۰۴۔
2۔ سید مودودی، تفہیمات، جلد اول، ص ۴۴۔

ٹھیک اسی طرح جیسا کہ ایک جسم کے اعضا میں ہوتا ہے پھر جس طرح کائنات کے اجزا میں ربط اور تسلسل ہے اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط اور تسلسل ہے جو اس دنیا میں پیش آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلہ واقعات کی ایک کڑی ہے اور اس کی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوند عالم نے اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلانے رکھا ہے۔[1]

سید مودودی کی رائے میں یہ کائنات ایک عارضی سلسلہ ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے۔ سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ایک خاص حد ہے جہاں پہنچ کر وہ فنا ہو جائے گی۔ اس کائنات کی خالق وہ ہستی ہی ہے۔ باقی سب طاقتیں محدود ہیں۔ انسان کا تعلق اس کائنات کے ساتھ صرف جسمی خواہشات کی تکمیل نہیں ہے بلکہ یہ کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔[2]

**تصورِ انسان**

تخلیق انسان کا معاملہ ان سوالات میں سے ایک ہے جو سب سے زیادہ جانے کے بعد بھی انسان کی تخلیق کے بارے میں ہر دور میں الگ الگ نظریے قائم کیے گئے۔ کسی نے انسان کو باقی نظام کائنات کی طرح ایک حادثہ قرار دیا ہے گویا انسان خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد گویا کسی بلند و بالا ہستی کا نام نہیں۔ ڈارون نے انسان کو خدا کی روح عالم قرار دیا اور کہا کہ خدا انسان کو خود اپنی تکمیل کا آلہ کار بنا رہا ہے۔ تاریخ کے میدان میں انسان محض ایک بے شعور، بے اختیار، بے ارادہ ایجنٹ اور وہ خدائی ہے جو انسانوں کے واسطے سے مختلف افکار پیش کرتا ہے۔ ان کو لڑاتا ہے اور پھر ان کے درمیان مصالحت کر کے حال کی نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔

مارکس کے نزدیک انسان ایک حیوانِ شکم ہے جو حاجات کو پورا کرتا ہے۔ گویا وہ صرف انسان کے مادی جوہر کو دیکھتا ہے۔ اس کی روح تک اس کی رسائی نہیں۔ اس کی رائے میں انسان کو عقل و استدلال، فکر و شعور، مشاہدہ و وجدان، تحقیق اور تخلیق کی جو قوتیں دی گئی ہیں، وہ سب دراصل اس حیوانِ شکم کی خواہشات، اغراض اور ضروریات کو پورا کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطابق اخلاق اور اصول کو وضع کر کے زندگی کے راستے کا تعین کرے۔

تصورِ انسان کے سلسلہ میں سید مودودی ایک جامع نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کسی مادے سے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا:

حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں، ان سب کا ٹھیک ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا، دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (LAW OF CHANCE) کو اس پر منطبق کیا جائے، تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں۔ اب تک تجربی طریقِ سائنس کے معمل (LABORATORIES) میں بے جان مادے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاح میں D N A کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہر حیات تو ضرور ہے، مگر خود جاندار نہیں۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہے، جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔[1]

سید مودودی کے نزدیک انسان کو پیدا کرنے والی ہستی صرف خدا ہے جس نے اس کو ایک منصوبے اور ارادے کے طور پر پیدا کیا۔ یہ صرف حیوانی وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی وجود بھی رکھتا ہے جو اور کے حیوانی خول کے اندر رہتا ہے۔ اس کا مقصد صرف جسمی ضروریات کی تکمیل نہیں۔ اسے عقل، تمیز، اکتساب علم اور فیصلے کی قوتیں دے کر ایک حد تک خود اختیاری عطا کی گئی ہے۔ "اللہ تعالیٰ دوسرے حیوانات کی طرح اسے لگے بندھے راستے پر نہیں چلاتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوشش کی قوت دے کر دنیا میں چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنی کوشش ہی سے زندگی کا راستہ اختیار کرے۔" اسی خود اختیاری کی حامل اور اسی کوشش کی قوت رکھنے والی اور اپنی کوشش کے لیے خود ہی سمت اور راستہ منتخب کرنے والی روح کا نام انسان ہے۔[2] چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب مقرر کیا ہے اس لیے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس منصب کے متعلق اپنی ذمہ داری پوری کرے جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کو فرض شناسی اور وفاداری کے ساتھ سرانجام دے۔ انسان کو ایسا علم دیا گیا ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں ملا۔ گویا انسان کی ہستی ایک طرح سے کائنات میں بلند و بالا ہستی ہے۔ پس انسان کا مقصد اس دنیا میں صرف اور صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ رضائے الٰہی حاصل کرے۔ اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا اور آخرت میں کامیاب اور کامران ہونے کی کوشش کرے۔[3]

## علم کیا ہے؟

فلسفۂ تعلیم میں علم کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ہر ایک ماہر تعلیم نے علم کی تعریف اپنے حالات کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مغربی ماہرین تعلیم کے نزدیک چونکہ انسان کا تعلق خدا سے نہیں، بلکہ اس کائنات ہی کے ساتھ ہے۔ لہٰذا ان کی بیان کردہ تعریفوں میں روحانی پہلو غائب ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علم ایک عطیہ الٰہی ہے۔ لہٰذا علم اس چیز کا نام ہو گا جس سے تعلق باللہ پیدا ہو۔ سید مودودی کے نزدیک اس وقت کے علماء دین اور علوم دینیہ کے ماہرین ایک تاریک دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نئی نئی ایجادات کر لینا اور معاشیات، مالیات، قانون اور فلسفہ میں مہارت حاصل کر لینا ہی علم ہے۔ علم کے اعتبار سے وہ جاہل ہیں اور انسان کو علم کی ہوا تک نہیں لگی۔ علم سے مراد درسی کتب

---

۱۔ تفہیمات، جلد اوّل ص ۱۴۳۔

۲۔ حوالہ مذکورہ بالا۔ ۱۔ سید مودودی تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۵۹۳۔

۱۔ فاران، کراچی اگست ۱۹۷۳ء ص ۵۴۔

۲۔ تفہیم القرآن جلد سوم ص ۵۹۳۔ ۳۔ ایضاً ص ۵۱۱۔

نہیں ہیں، وہی محض سائنس، تاریخ وغیرہ کا درس دینا علم ہے بلکہ علم سے مراد معرفتِ الٰہی کا علم ہے اور اس کی صفات کے جاننے کا نام علم ہے۔ ایک آدمی پڑھا لکھا ہو، اگر وہ خدا کے خوف سے خالی ہے، وہ ایک سند یافتہ عالم ہی کیوں نہ ہو علم کی اس تعریف کی روشنی میں وہ جاہل مطلق ہے۔ اس کے برعکس ایک ان پڑھ صاحبِ علم ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے اور وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔ گویا سید صاحب کے نزدیک علم سے مراد دو باتیں درست قرار پاتی ہیں

۱۔ معرفتِ الٰہی کا علم

۲۔ صفاتِ الٰہی کا علم

ان دونوں کے جاننے ہی سے ایک آدمی صاحبِ علم کہلا سکتا ہے۔

## ذرائع علم

فلسفۂ تعلیم میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع کون سے ہیں۔ اس کی تحقیق کرنے کی سب سے ماہرینِ تعلیم نے کوشش کی ہے۔ بعض نے تجربے اور مشاہدے ہی کو ذریعۂ علم قرار دیا ہے اور حواسِ خمسہ ہی کو علم کا منبع قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف صوفیائے عقل اور تجربے سے بالکل ہٹ کر اس میں افراط و تفریط کی راہیں نکالی ہیں۔ ان کے نزدیک بس وجدان اور کشف ہی علم کے ذرائع ہیں۔

سید مودودی کے نزدیک سب سے اہم ذریعۂ علم وحی ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے واسطے سے بندوں کو علم دیا۔ پیغمبروں نے اس علم کو عام کیا۔ پیغمبر کی بات کو ماننے کے لیے انسان کے اندر ایمان بالغیب کی استعداد کا ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ہی وہ پیغمبر کے صحیح علم کو مانے گا اور اس کو حاصل کر کے زندگی میں ٹھیک طور پر چل سکے گا۔۱

سید صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کو سننے اور دیکھنے کی قوتیں عطا کی گئی ہیں جن کے ذریعے وہ علم حاصل کر کے نتائج حاصل کرتا ہے۔ انسان کو دوسرے حواس بھی دیے گئے ہیں جن سے وہ علم حاصل کرتا ہے۔ انسان کے حواس اور حیوانات کے حواس میں ایک واضح فرق ہے۔ انسان کے حواس کے پیچھے ایک دماغ ہے جو سوچتا ہے اور معلومات کو ترتیب دے کر ان سے نتائج نکال سکتا ہے۔۲

انسان کو پیدائشی طور پر تعلیم کا طریقہ نہیں دیا گیا جس طرح کہ مچھلی کو تیرنا اور پرندے کو اڑنا سکھایا گیا ہے۔ جو انسانی جسم میں آنکھ کو دیکھنا، کان کو سننا اور معدے کو ہضم کرنا سکھا دیا گیا۔ حالانکہ ان کاموں کے لیے ان کی تربیت نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس انسان کو استاد، کتاب، مدرسے، تتبع و تفتیش، تحریر و تقریر، بحث و استدلال سے کام لے کر علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ انسان اپنے لیے پیدائشی علم و شعور کو کافی نہیں سمجھتا۔ انسان اسی رہنمائی کے لیے کسی اور ہستی کا محتاج ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ اس نے اس کی تعلیم کے لیے رسولؐ اور کتاب کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔۳

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا اور اس خلافت کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے انسان کو علم دیا۔ علم کو حاصل کرنے کے لیے اسے کچھ قوتیں عطا کی ہیں جن کی مدد سے انسان علم حاصل کر کے اس دنیا میں خلافت کے کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں

علم سے مراد کیا ہے؟ اور اس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فواد کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلامِ الٰہی میں یہ اصول لفظاً سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں، بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے، بصر سے مراد مشاہدہ کر کے واقعہ سمجھنا ہے اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کرنا ہے۔ یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بناتے ہیں جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے اور بلحاظ اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقاتِ ارضی پر علمی تسلط و غلبہ انسان کو حاصل ہے۔۲

## تعمیرِ کردار

تعلیم میں تعمیرِ اخلاق کو سب سے اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم کا مقصد اصلاحِ نفس ہے۔ اگر انسانی اخلاق اچھے نہ ہوں تو معاشرے میں صحیح توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ انسان چونکہ خدا کا نائب ہے اس لیے اس منصب پر فائز رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی سیرت و کردار میں وہی اوصاف پیدا کرے جو اس کے آقا و مولا کے ہیں۔ اس کے اخلاق میں شفقت، مہربانی، عدل و انصاف وغیرہ شامل ہوں

سید مودودی اخلاق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ذہنی تربیت سے زیادہ اخلاقی تربیت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔۱ انسان میں عدل کا وصف پایا جانا لازمی ہے۔ یہ دو حقیقتوں کا مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے حقوق کے درمیان توازن اور تناسب قائم کرنے والا ہو، دوسرا یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بغیر کسی رکاوٹ کے دیا جائے۔

---

۱۔ تفہیم القرآن، جلد چہارم ص ۲۳۲

۱۔ دینیات، ص ۳۷۔

۲۔ تفہیم القرآن، جلد ششم ص ۱۸۷۔

۳۔ تفہیم القرآن، جلد چہارم ص ۲۵۰، ۲۵۱۔

۱۔ القرآن، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۳

۲۔ تعلیمات، ص ۶۹۔ ۱۔ تعلیمات، ص ۱۰۵۔

انسان میں احسان کا مادہ ہونا چاہیے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے زائد دینا، خود کم لینا یہ عدل سے زیادہ چیز ہے جس کی اہمیت معاشرتی زندگی میں عدل سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

انسان میں صلہ رحمی کا ہونا بھی ضروری ہے صلہ رحمی کا تعلق رشتہ داروں سے ہے جو ان کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کر دیتی ہے۔ ہمارے نوجوان ان اخلاقی اوصاف سے پاک ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کفار، منافق اور منافقین کی صفات قرار دیا ہے اور اس کے برعکس قرآن و حدیث میں اللہ کے بندوں، متقین، صالحین، مخلصین، قانتین اور محسنین کے جو اوصاف بتائے گئے ہیں انسان کو ان کا حامل ہونا چاہیے۔

سید صاحب کے نزدیک کسی ملک کا نظام تعلیم ہی انسانی اخلاقیات میں وہ تحریک پیدا کرتا ہے جو ایک آزاد قوم اپنے آزاد نظام زندگی کو چلانے کے لیے چاہتی ہے۔ ہمارا نظام تعلیم صداقت اور اخلاقی تعلیم سے بالکل خالی ہے موجودہ نظام تعلیم ہمیں انگریزوں سے ورثے میں ملا ہے یہاں لوگوں میں جو اخلاقی بگاڑ ہے اس کے مدنظر یہ بات ہی واضح ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں انسانی اخلاقیات کا پیدا ہونا محال ہے جو ایک قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے ہمارے نظام تعلیم میں ایسے اوصاف شامل ہیں جن میں ایک آزاد قوم کی طرح رہنا مشکل ہے۔

ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جدید نظام سے متعلق ہو یا قدیم نظام تعلیم سے اخلاق و شائستگی عمدہ عادات اور ضبط و نظم کی مساوی تربیت سے عاری ہے۔ مغربی العلم مدارس سے جو نسل ہے اس میں نوجوان نسل پرورش پا رہی ہے، وہ مغربی علوم سے پوری طرح واقف ہے، مگر ان کی خوبیوں کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی و جفاکشی، نہ ضبط اوقات، نہ صبر، عزم و استقلال ہے، نہ باقاعدگی اور باضابطگی نہ ضبط نفس ہے اور نہ ہی اپنی ذات سے کسی بالاتر ذات سے وفاداری۔ ان کی حالت ایک خود رو درخت کی طرح ہے۔

سید مودودی تعمیر کردار کے سلسلے میں سفارش کرتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات کے لیے تاریخ سے مثالیں پیش کر کے طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے کہ اسلام محض ایک نظریہ کا نام نہیں بلکہ اس کے ہر ایک عقیدے کا کردار کا دائرہ بھی لازمی ہے طلبہ میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے وہ بھی ان کی مذمت کریں اور جن اوصاف کو اسلام محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں اور اپنے اندر ان کی نشوونما کریں۔

سید مودودی تعمیر کردار کے لیے نماز کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک نماز انسانی سیرت میں تبدیلی کرتی ہے اس لیے بچوں کو اس کا پابند بنانے کی کوشش کرنی چاہیے ہمیں اور نماز ہے جس پر عملاً اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے اگر اس کو ختم کر دیا جائے، تو اسلامی زندگی کے قائم ہونے کا تصور ختم ہو جاتا ہے طلبہ اگر فرض کو فرض جانیں اور اس کے ادا کرنے سے روگردانی کریں تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ اپنی روزمرہ ڈیوٹی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے انسانی سیرت میں کمی پیدا نہیں ہوگی کہ وہ ایک ریاست کا فرض شناس شہری ثابت ہو ایک فرض چھوڑنے سے اس میں یہ جرأت پیدا ہوگی کہ وہ ریاست کے دوسرے فرائض میں بھی کوتاہی کرتے۔

اس امر کی کوشش جاری رکھنی چاہیے کہ طلبہ کے اندر مضبوط سیرت پیدا ہو۔ انہیں شروع ہی سے بتانا جائے کہ ان کا عمل ان کے علم کے مطابق ہونا چاہیے۔ ان میں یہ کردار پیدا کیا جائے۔ کہ جس چیز کو حق اور ٹھیک سمجھیں اسے اختیار کریں اور جسے برا جانیں اسے ترک کر دیں۔

محض اخلاقی تصورات بچوں کے سامنے پیش نہیں کرنے چاہئیں بلکہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرتوں کے نمونوں کو سامنے رکھ کر اخلاقی تصورات دیے جائیں، تاکہ طلبہ کو معلوم ہو جائے کہ ایک مسلمان کے کردار کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ان کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔

# مقاصدِ تعلیم

سید مودودی نظام تعلیم میں اس مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے کیا تعلیم کا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے؟ کیا فرد کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیے کہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات کا معروضی مطالعہ کرے اور بالکل آزاد ہو کر نتائج اخذ کرے؟ سید مودودی کی رائے میں انسان کے لیے ایسا کرنا دشوار ہے کیونکہ معروضی مطالعہ تو صرف کیمرے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے انسان دو آنکھیں بھی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ایک سوچنے والا دماغ بھی جو خود اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے اس کے لیے معروضی مطالعہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

---

۲۔ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۴۷۲۔
۱۔ تعلیمات ص ۱۳۳۔
۲۔ ایضاً ص ۱۳۲۔
۳۔ ایضاً ص ۱۰۴۔
۴۔ ایضاً ص ۱۳۲۔
۱۔ تعلیمات ص ۱۵۱
۲۔ ایضاً ص ۱۳۵، ۱۵۵۔
۱۔ تعلیمات ص ۳۷۔
۲۔ ایضاً ص ۱۸۸۔

**پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما** سید مودودی کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد معرفتِ الٰہی کا حاصل کرنا ہے جو ایک ہمہ گیر مقصد ہے۔ مزید برآں ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ انسان کی جملہ صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما کی جائے کہ وہ سوسائٹی کے لیے مفید اور کارآمد اور انسانی زندگی میں پاکیزگی، اصلاح و ترقی کا ذریعہ بن سکیں ۳

**کلچر کی منتقلی** تعلیم کسی تہذیب اور کلچر کی آئینہ دار ہوتی ہے تعلیم کا مقصد، صرف کلچر کو زندہ رکھنا بلکہ اس کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرنا بھی ہے ہمارے نظامِ تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ زندگی جس نظریہ اور نصب العین کے تحت چل رہی ہے، انہی بنیادوں پر اسے ترقی دے۔ زندہ قومیں انہی اغراض و مقاصد کے تحت اپنا الگ مستقل نظامِ تعلیم قائم کیا کرتی ہیں ۱

**تعمیرِ اخلاق** تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اپنی قومی تہذیب اور دین پر سچے دل سے ایمان لا کر اس کے اصولوں کو ٹھیک ٹھیک جان سکیں۔ اسی کے مطابق مضبوط اور سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق رکھتے ہوں اور ایسی اہلیت کے مالک ہوں کہ اجتماعی زندگی کو اسی تہذیب اور اصولوں کے مطابق چلا سکیں۔

**لیڈر شپ کی تربیت** تعلیم کا مقصد ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو دورِ جدید میں اسلام کے اصولوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں ۲

گویا تعلیم کا اہم مقصد بہترین شہری پیدا کرنا ہے تاکہ وہ دنیا کی امامت کرنے کے قابل بن سکیں جس قوم کا مقصد دنیا میں لیڈر شپ حاصل کرنا ہے، وہ اپنی تعلیم کو اس طرح استوار کرتی ہے جس سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ایسے افراد کی تربیت ہے جو دنیا کی رہنمائی کر سکیں مقصدِ تعلیم میں اس کو مدِ نظر رکھنا لازمی ہے۔

اوپر وہ عام مقاصدِ تعلیم بیان کیے گئے ہیں جنہیں سید مودودی نظامِ تعلیم کی اساس قرار دیتے ہیں علاوہ ازیں سید صاحب نے الگ الگ شعبوں کے لیے تعلیم کے مقاصد بھی بیان کیے ہیں ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے جو اعلیٰ دماغی تربیت حاصل کر کے ایک صالح نظام اور اخلاقی تعمیر کے لیے علمی دنیا میں ایسی قابلیت کا سکہ بٹھا سکیں ان کے اخلاقی اوصاف قرآن اور حدیث کے مطابق ہونے چاہئیں ان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کر سکیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رزق کے لیے تگ و دو کرنے والے ہوں ۱

سید مودودی نے ابتدائی جماعتوں میں تعلیم کے حسبِ ذیل مقاصد بیان کیے ہیں ۲

۱۔ شائستگی، پاکیزگی، صفائی، تمیز، جس وضع اور ذوقِ سلیم

۲۔ اخلاقِ حسنہ، انفرادی، عائلی اور اجتماعی۔

۳۔ انضباط (DISCIPLINE) باقاعدہ، مہذب طریقے سے سوسائٹی میں رہنے اور کام کرنے کے ڈھنگ۔ محاسبہ نفس کی عادت، احساسِ فرض، احساسِ ذمہ داری

۴۔ وسعتِ قلب، وسعتِ نظر، وسعتِ تصور، بلند حوصلگی، خودداری۔

۵۔ عزم و ارادہ کی پختگی، متانت و سنجیدگی (SERIOUSNESS) خلوصِ نیت اور یہ ضروری صفت کہ جس معاملہ سے بھی دلچسپی لیں، اس میں ان کی دلچسپی سطحی نہ ہو۔

۶۔ جرأت و دلیری، جفاکشی، چستی، ہر نوع کا کام کر لینے کی صلاحیت، زندگی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ واقفیت (نہ صرف معلومات کی حد تک بلکہ عملاً بھی)۔

۷۔ اسلامی نصب العین کا عشق اور گہرا اسلامی جذبہ جو خون، روح اور قلب میں اترا ہوا ہو جس کا اظہار بچوں کی تمام حرکات و سکنات سے ہو۔

۸۔ جماعتی زندگی کے لیے وہ مناسب اوصاف جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

۹۔ اسلامی اوزان اور پیمانوں (ISLAMIC STANDARD OF WEIGHT & MEASURE) سے ہر چیز کو ناپنے اور تولنے کی عادت۔

۱۰۔ ضروری انتظامی صلاحیت۔

۱۱۔ تجسس و تحقیق اور تفکر و مشاہدہ کی عادت۔ کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دنیا میں رہنا، باقاعدگی کے ساتھ سوچنا، استدلال کرنا اور پرکھنا۔

# نصابِ تعلیم

تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب کا موزوں انتخاب ضروری ہے۔ بے نصاب نظام مقاصدِ تعلیم کو پورا نہیں کر سکتا سید مودودی نے جس دور میں پرورش پائی وہ غلامی کا دور تھا۔ اس وقت ہندوستان میں دو قسم کے نظام ہائے تعلیم رائج تھے ایک تو وہ نظام جو سمندر پار سے آنے والی قوم نے اپنے خاص مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر رائج

---

۳۔ ایضاً ص ۵۷۔

۱،۲۔ تعلیمات ص ۱۴۲۔

۳۔ ایضاً ص ۱۴۸۔

۱۔ تعلیمات ص ۱۰۸۔

۲۔ ایضاً ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

کیا تھا۔ دوسرا وہ نظام تعلیم جو قدیم طرز پر چل رہا تھا اور مسلمان اس کو برا نہیں جانتے تھے۔

یہ دونوں نظام ہائے تعلیم ایک زندہ قوم کے مقاصد کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس پر سید مودودی نے تنقیدی نظر ڈالی اور جائزہ لیا کہ اس میں کیا رد و بدل کیا جائے۔ سید مودودی مانتے ہیں کہ جدید نظام تعلیم کو ہم نے مغرب سے اس حالت میں لیا ہے کہ اس کو خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف ہم نے دینیات کا ایک کورس اس میں شامل کر لیا ہے۔ سید صاحب اس پیوند کاری کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔[1] سید صاحب کے نزدیک ہر نظام تعلیم کسی کلچر کا خادم ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی درس گاہ میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی جس میں کوئی خاص رنگ اور خاص صورت نہ ہو۔ ہر چیز کا انتخاب کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ ہم نے دینیات کا الگ کورس رکھ کر طلبہ کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر کے کلچر کو ملحد رکھنے کے لیے نظام تعلیم میں تبدیلی ناگزیر ہے۔[2] سید صاحب کی رائے ہے کہ دینیات کو جسم تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنانے کا کوئی فائدہ نہیں فرماتے ہیں: اس کو پورے نظام تعلیم میں اس طرح اتار دیجئے کہ وہ اس کے دوران خون، اس کی رگوں کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا عضو بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ فلسفی مسلمان، سائنس دان مسلمان، ماہرین معاشیات مسلمان، مقنن مسلمان، مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تمدن حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیب اسلامی کی خدمت لیں گے اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانین حیات کو روح عصری کے لحاظ سے از سر نو مرتب کریں گے یہاں تک کہ اسلام از سر نو علم و عمل کے میدان میں اس امامت و رہنمائی کے مقام پر آ جائے گا جس کے لیے وہ درحقیقت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔[3]

سید مودودی جدید دور کے علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ جدید تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں کے لیے الگ الگ نصاب تجویز کرتے ہیں

**ابتدائی تعلیم کا نصاب**

سید مودودی ابتدائی تعلیم کی مدت آٹھ سال مقرر کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں پرائمری سکولوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور جن پر بھر میں تجربات کیے گئے ہیں، ان کو شامل نصاب رکھا جائے۔[4] اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو لکھنے پڑھنے کی اتنی استعداد بہم پہنچائی جائے کہ وہ ادب کو سمجھ کر پڑھ سکیں اور اپنے خیالات کو تحریر و تقریر میں ادا کر سکیں۔ ابتدائی طور پر انہیں عربی قرآن کو سمجھنے کے لیے پڑھائی جائے۔ انگریزی اس حد تک پڑھائی جائے کہ انگریزی کتابیں سمجھ سکیں اور ان کا ترجمہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سید صاحب ابتدائی سطح پر فارسی زبان کی کتابیں گلستان اور بوستان کو بھی شامل نصاب کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ذہنی تربیت اور آئندہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریاضی کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔ جغرافیہ خصوصی، عالمی، عرب اور پاک و ہند کے متعلق ہو اور تاریخ اسلام، انبیاء اور صحابہ کی سیرت اور پاک و ہند کی تاریخ ضروری حد تک نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔ اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق واضح معلومات کا ابتدائی تعلیم کے نصاب میں ہونا لازمی ہے۔[5]

نصاب میں فقہ کے جدید تصور اور نصابی اصولوں کے بالکل مطابق سید مودودی سفارش کرتے ہیں کہ فقہ کے ساتھ ساتھ جن مسائل کا جاننا بچوں کے لیے ضروری ہے وہ ضرور نصاب میں شامل کرنے چاہئیں مثلاً:

ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو طہارت وغیرہ کے متعلق چند ضروری باتیں معلوم ہونا چاہیے۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزہ کے طریقے، حرام اور حلال کی ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔[6]

اس کے ساتھ ساتھ سید صاحب عملی کام کی ضرورت کو بھی محسوس کرتے ہیں اور اس بات کا لحاظ کرتے ہیں کہ عملی میدان میں بھی طلبہ کی تربیت کرنی چاہیے، چنانچہ ان کی رائے میں ابتدائی سطح پر کشتی، تیراکی، گھوڑے کی سواری، اسلحہ کا استعمال، ہاتھ سے کام کرنے کی مشق، ابتدائی طبی امداد، بازار سے سودا سلف خریدنے کی مشق، خط و کتابت کی مشق، دفتری کام سے واقفیت اور لڑکیوں کے لیے کھانا پکانے، کپڑے سینے اور سینے پرونے کی تربیت وغیرہ نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔[7]

## ثانوی تعلیم کا نصاب

**زبانوں کی تعلیم:** اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں طلبہ کو اتنی استعداد ہونی چاہیے کہ انہیں مزید مطالعہ کے لیے آسانی رہے کوئی شخص اسلام کی روح کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے۔[8] عربی کے علاوہ کوئی ایک یورپین زبان اس حد تک کہ اس میں آسانی سے ریسرچ کرنے کے قابل ہو، شامل نصاب ہونی چاہیے۔[9]

**قرآن و حدیث:** اسلامی زندگی کو استوار کرنے کے لیے قرآن کی تعلیمات کو اس قدر ثانوی نصاب میں شامل ہونا چاہیے کہ وہ ابتدائی تحقیقی مطالعہ کی تیاری کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصول حدیث اور حدیث کی ایسی مختصر کتاب جس سے تحقیقی مطالعہ کے لیے راہ ہموار ہو کر نصاب میں داخل کرنا چاہیے۔

سید مودودی ثانوی سطح کے لیے نصاب کے پانچ ایسے شعبے قائم کرتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے مددگار ثابت ہوں۔

---

۱ تعلیمات ص ۲۹۔ ۲ ایضاً ص ۳۰۔ ۳ تعلیمات ص ۳۲۶۔ ۴ تعلیمات ص ۱۴۷۔ ۵ ایضاً ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۸
۶ تعلیمات ص ۱۴۹۔ ۷ ایضاً، ص ۱۱۳۔ ۸ ایضاً ص ۱۵۰۔ ۹ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۱۔ شعبہ فلسفہ میں وہ سائنسی مضامین کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس میں منطق، فلسفۂ قدیم وجدید اور علم کلام پر ایک ایک کتاب جو ان علوم کی اصطلاحات، طرز بیان اور ان مسائل سے واقف کرنے کے لیے کافی ہو، نیز ریاضیات، طبیعیات اور علم کیمیا پر بھی ایک ایک کتاب شامل نصاب ہونی چاہیے۔[1] ریاضیات کا مضمون مغربی ممالک میں تو ثانوی جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے، مگر ہمارے ہاں کالج میں اس مضمون کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے بھی اسے ثانوی سطح پر شامل نصاب کرنے کی سفارش کی ہے۔ جس سے ان کے تصورِ نصاب کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا شعبہ تاریخ کا ہے۔ اس میں سید صاحب تاریخ، عمرانیات اور تاریخ سیاسیات کو بھی شامل کرتے ہیں۔ وہ سفارش کرتے ہیں کہ شعبۂ تاریخ کے نصاب میں اہتمام کیا جائے کہ طلبہ تاریخی تحقیق اور مدنیت و متعلقات تمدن کی گتھیوں کا مطالعہ کر سکیں۔[2]

۳۔ شعبہ معاشیات کا نصاب ایسا ہونا چاہیے جس سے طالب علم انسانی سوسائٹی کی ترکیب اور اس کے بنیادی مسائل کو حقیقت کو پوری طرح سمجھ لے اور پھر معاشیات، مالیات، بینکنگ اور کاروبار معیشت کے اصول سے واقف ہونے کے علاوہ موجودہ زمانے کے معاشی نظاموں اور سکولوں سے بھی فی الجملہ روشناس ہو جائے۔[3]

۴۔ شعبۂ قانون کے لیے اصول قانون، اصول فقہ، تاریخ فقہ، تاریخ قانون اور تاریخ فقہ اسلامی پر ایک ایک ابتدائی کتاب اور فقہ مذاہب کے مسائل کا ایک مختصر مجموعہ شامل نصاب ہونا چاہیے۔[4] ہمارے ہاں اعلیٰ جماعتوں کے بعد مغربی ممالک کا قانون پڑھایا جاتا ہے، حالانکہ انسان کے لیے اس کی ضرورت گریجوایشن کو پہنچتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ سید صاحب کے نزدیک مغربی قانون کے بجائے اسلامی قانون کو شامل نصاب کیا جانا چاہیے اور اس کی تدریس ثانوی جماعت ہی سے شروع ہو جانی چاہیے۔

۵۔ پانچواں شعبہ علوم اسلامی کا ہے۔ اس وقت ثانوی جماعتوں میں اسلامیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے، مگر اس سے ہمارے مقاصد پورے نہیں ہوتے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود ہمارے طلبہ میں اسلام سے لگاؤ کا مادہ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ سید صاحب اس شعبے میں عربی زبان کی تدریس کے لیے ایک الگ کورس کو نصاب میں شامل کرتے ہیں۔ یہ کورس عام تدریس سے الگ ہو۔ اس کے علاوہ ہر شعبے میں فقہ پر ایک ایک کتاب، تقابل ادیان میں تاریخ ادیان بھی شامل ہو کر شامل نصاب ہونا چاہیے۔[5] سید صاحب ثانوی تعلیم کے لیے دو سال کی مدت تجویز کرتے ہیں۔

## اعلیٰ تعلیم کا نصاب

اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی سید مودودی وہی پانچ شعبے تجویز کرتے ہیں جن کی بنیاد ثانوی تعلیم میں رکھی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم میں تو لوازمۂ نصاب (CONTENT) کا انتخاب محدود طور پر کیا گیا ہے، مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس میں وسعت کر دی گئی ہے۔[6]

**۱۔ فلسفہ:** تاریخ فلسفہ، مسلمان فلاسفہ کے مختلف مکاتب فکر، غیر مسلم فلاسفہ کے مختلف مکاتب فکر، علم کلام، فلاسفہ متصوفین، منطق، نفسیات، فلسفہ اخلاق، نظری (THEORETICAL) سائنس، حکمت قرآن اور اس کی مدد کے لیے حدیث۔

**۲۔ تاریخ:** تاریخ اسلام، تاریخ مسلمین، تاریخ عالم قدیم وجدید، تاریخ انقلاب، فلسفۂ تاریخ، عمرانیات (SOCIOLOGY)، مختلف عمرانی فلسفے، مدنیات (CIVICS)، سیاسیات، دساتیر عالم (CONSTITUTIONS OF THE WORLD)، اسلامی فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ مدن اور نظام اجتماعی اس کا مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں۔

**۳۔ معاشیات:** علم المعیشت، مختلف معاشی نظریے اور معاشی و تمدنی مسالک، دنیا کے مختلف معاشی نظام، مالیات (FINANCE)، بینکنگ (BANKING)، قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے۔

**۴۔ قانون:** تاریخ قانون، اصول قانون، قدیم و جدید قوموں کے قوانین، اصول قصاص و نظام عدالت، قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ کا مطالعہ قانونی نقطۂ نظر سے۔

**۵۔ علوم اسلامی:** ادب و لغت عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، علوم اسلامی کی تاریخ، تاریخ افکار مسلمین، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، تاریخ ادیان عالم، فلسفہ تاریخ، دور جدید کی مذہبی و اخلاقی تحریکیں، مغربی الحاد کی تاریخ۔ اس قسم کے نصاب سے طلبہ میں علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے ایسی ضروری قابلیتیں اور اوصاف پیدا ہو جائیں گے جو جدید انسانی معاشرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس تعلیم و تربیت سے وہ اس حد تک آراستہ ہو جائیں گے اور جوہر انسانیت اور جوہر اسلامیت کے اعتبار سے مکمل ہو جائیں گے کہ ایک متمدن اور مہذب زندگی کے لیے جس قسم کی فعال کارکن ضروری ہیں وہ پیدا ہو جائیں گے۔[7]

## معیاری نظامِ تعلیم

ہمارے ہاں اس وقت دو نظامِ تعلیم پائے جاتے ہیں۔ ایک قدیم نظامِ تعلیم اور دوسرا جدید نظامِ تعلیم۔ قدیم نظامِ تعلیم جسے درسِ نظامیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، ہمارے مذہبی مدرسوں میں ابھی تک رائج ہے۔ اس میں جدید تعلیم کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا مقصد ان ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ ناکافی ہے کیونکہ اس کے نصاب میں کسی قسم کی لچک پیدا نہیں کی گئی ہے۔ جو نصاب قدیم زمانے میں رائج تھا اس کو جوں کا توں ابھی تک برقرار رکھا گیا ہے۔ دوسرا نظامِ تعلیم جسے جدید کہا جاتا ہے ہمارے ہاں حکومت کی سرپرستی میں رائج ہے۔ یہ نظامِ تعلیم ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے یہاں پر رائج کیا تھا، جو ابھی تک سارے سرکاری مدارس میں رائج ہے۔ قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ نظامِ تعلیم بھی مفید نہیں ہے۔

سید مودودی ان دونوں نظام ہائے تعلیم پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ قدیم نظامِ تعلیم کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تعلیم مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں

---

[1] تعلیمات، ص ۱۱۰۔ [2] ، [3] ، [4]۔ تعلیمات، ص ۱۱۱۔ [5] تعلیمات، ص ۱۱۰۔ [6] ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔
[7] تعلیمات، ص ۱۱۵۔

کے عہدِ حکومت میں سول سروس کی تعلیم تھی اس کی افادیت اسی دن سے ختم ہو گئی تھی جس دن سے یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی ؎ انگریزوں نے یہاں ایسا نظام رائج کیا جس کے ذریعے باہر سے آنے والے حکمرانوں کے لیے بہترین آلہ کار پیدا کر سکیں جو اپنے آقا کی زبان کو سمجھ کر حکمران اور عوام کے درمیان رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کے لیے معاون ثابت ہوں اور یہاں پر انگریزوں کی منشا کو پورا کر سکیں ؎

مسلمانوں کو اس زوال سے بچانے کے لیے چند لوگوں نے قدم بڑھایا تاکہ یہ قدم ڈوبنے سے بچ سکے۔ سید مودودی ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ ایک زوال پذیر قوم کو بچانے کے لیے کون سی فوری تدابیر ہو سکتی ہیں ایک گروہ نے پرانے جہاز کے تختوں کو جوڑ کر لوگوں کو اس میں بھرنا شروع کر دیا۔ دوسرے گروہ نے نیا دخانی جہاز کرایہ پر لیا اور قوم کو ہلاکت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر منزل تک لے جانے کے لیے یہ دونوں ناکافی تھے۔ نہ تو پرانے بادبانی جہاز (یعنی قدیم نظامِ تعلیم) میں اتنی قوت ہے کہ وہ تیز رفتار جہاز سے سبقت لے جائے اور نہ ہی نیا دخانی جہاز (جدید نظامِ تعلیم) اس لائق ہے کہ مسلمان اس کی مدد سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں، کیونکہ یہ جہاز دوسروں کا بنایا ہوا ہے اور جنہوں نے اس کو اپنے مقصد کے لیے اور ضرورتوں کے تحت بنایا ہے اور اس کے رہنما اور چلانے والے بھی انہی میں سے ہیں۔ سید مودودی کی رائے ہے کہ ہمیں ان سے یہ امید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں ہماری منزل کی طرف لے جائیں گے، بلکہ خطرہ ہے کہ وہ مخالف سمت کی طرف لے جائیں گے جو ہماری منزل سے دور ہو گی ؎

سید مودودی کے نزدیک ان دونوں گروہوں میں اجتہادی صلاحیت نہیں جو مناسب موقع پر تدبیر کرے اور لوگوں کی مناسب رہنمائی کرے۔ کہتے ہیں :

"انتہائی خراب کرکے پرانے جہاز والوں میں سے اگر کوئی اجتہاد کرتا ہے، تو بس اتنا کہ اپنے اس پرانے جہاز میں چند کلیں لگا لیتا ہے، نئے طرز کا ایک پھریرا لگا لیتا ہے اور ایک چھوٹی سی دخانی مشین خرید لیتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتی رہے کہ پرانا جہاز نیا ہو گیا ہے۔ اس مقابلے میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمتِ مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر وہ جہاز پرانے بادبانوں میں سے کرسیوی صدی کے اپ ٹو ڈیٹ جہاز پر لگائے ہوئے ہیں، تاکہ خود اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکہ دے سکیں کہ یہ جہاز بھی "اسلامی" جہاز ہے اور لندن کے راستے سے مکہ کو چلا جا رہا ہے ؎"

قدیم نظامِ تعلیم کے نصاب کے بارے میں سید مودودی فرماتے ہیں کہ اس میں فلسفہ، منطق، ادب اور صرف و نحو تو شامل ہے مگر دین کی سیاسی تعلیم کے لیے قرآن و حدیث پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ قرآن کی تعلیم کے لیے صرف چند ایک سورتیں پڑھائی جاتی ہیں قرآن کے تحقیقی مطالعہ کی طرف توجہ نہیں دی جاتی حدیث کی تعلیم کا حال بھی یہی ہے کہ اس میں محدثین کی طرف توجہ کم اور فقہی اور اعتقادی مسائل کے متعلق اختلافی بحثیں زیادہ ہوتی ہیں ان مدارس میں قرآن و حدیث کی تعلیم اس نہج پر نہیں دی جاتی کہ اسلام کے معاشی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی نظام کے متعلق پوری واقفیت حاصل ہو نہ ہی دستورِ مملکت یا نظامِ عدالت یا بین الاقوامی قانون کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم سے فارغ ہونے والوں میں اجتہادی صلاحیتیں مفقود ہیں وہ پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں یہ نظامِ تعلیم نہ صرف ہماری مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بالکل ناکافی ہے، بلکہ دنیوی ضرورتیں بھی اس نظامِ تعلیم سے پوری نہیں ہو سکتیں ؎

جدید نصابِ تعلیم خدا پرستی اور اسلامی اخلاق سے بالکل خالی ہے اس تعلیم کی بدولت ہماری نسل دینی اخلاق اور دینی طرزِ فکر سے دن بدن دور ہوتی چلی جا رہی ہے ہمارے ہاں ایسے علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کو مرتب کرنے والے ایسے لوگ ہیں جو دنیوی زندگی میں خدا کی رہنمائی محسوس نہیں کرتے سائنس، فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات جیسے مضامین انگریزوں نے اپنے نظامِ تعلیم کے طرز پر یہاں رائج کیے ہیں۔ جن لوگوں نے اس طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، دراصل وہی لوگ اس وقت تک اس نظامِ تعلیم کی گردن پر سوار ہیں ان کا نقشہ سید مودودی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ان میں نہ فرض شناسی ہے نہ مستعدی، نہ جفاکشی، نہ ضبطِ اوقات، نہ جہد و ثبات، نہ عزم و استقلال، نہ باقاعدگی، نہ ضبطِ نفس، نہ اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز سے وفاداری۔ وہ بالکل خود رو درختوں کی طرح ہیں جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی قومی کیریکٹر بھی ہے ان میں معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی کو ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خور، جوئے باز، سفارشیں کرنے والے اور سننے والے، بلیک مارکیٹنگ کرنے اور کرانے والے، ناجائز درآمد و برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور ضابطوں اور صلاحیت کا خون کرنے والے، فرض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ مارنے والے اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کر دینے والے ایک دو نہیں، ہزاروں کی تعداد میں، ہر شعبہ زندگی میں ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آتے ہیں۔ انگریز کے ہٹ جانے کے بعد ملک کو چلانے کی ذمہ داری کا بار اسی تعلیم کے تیار کیے ہوئے لوگوں نے سنبھالا ہے اور چند سال کے اندر ہی سیرت کا کن کے ہاتھوں ملک کا جو حال ہوا ہے وہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے اور جو نسل اب اس نظامِ تعلیم کی درس گاہوں میں زیرِ تربیت ہے اس کے اخلاق و کردار کا حال آپ چاہیں تو درس گاہوں میں، ہوسٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور قومی تقریبات کے مواقع پر بازاروں میں دیکھ سکتے ہیں ؎"

جدید نظامِ تعلیم بنیادی انسانی اخلاقیات سے بھی خالی ہے، لہٰذا اس تعلیم سے ایک آزاد ملک کے لیے قابلِ اعتماد کارکن پیدا کرنے کی کوئی اگر توقع رکھتا ہے، تو وہ عقل مند نہیں کہلایا جا سکتا ؎

## نظامِ تعلیم کیسا ہو

مودودی لکھتے ہیں کہ قدیم اور جدید دونوں نظاموں کی انفرادیت کو ختم کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک دین اور دنیا الگ الگ کوئی شے نہیں۔ دنیا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے

۱۸۲ ... ؎ تعلیمات، ص ۱۴، ۱۵۔ ؎ تعلیمات، ص ۱۶۔ ؎ تعلیمات، ص ۱۸۰، ۱۸۱۔ ؎ تعلیمات، ص ۱۸۵۔

وہی اس پر اپنا حکم چلا رہا ہے۔ انسان اس سلطنت میں ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ اس دنیا میں رہ کر زندگی کو دینی تقاضوں کے مطابق گزارے، گویا دنیوی زندگی اللہ کی رضا اور ہدایت کے مطابق ہو۔ اس چیز کا نام دین ہے۔ دین کا تعلیمی تقاضا یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اگر دینی اور دنیوی علوم کو الگ الگ حیثیت سے پڑھایا جائے گا، تو طلبہ میں یہ تصور پرورش پائے گا کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا۔ دونوں کے درمیان توافق پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا۔[1]

مروجہ نظامِ تعلیم کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ مصنوعی تقسیم ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر سے قطعاً جائز نہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو باقی مضامین سے الگ نہ پڑھایا جائے، بلکہ تمام مضامین کو اسلامیات کے رنگ میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ اس خدائی سلطنت میں خدا کی حکمت و قدرت کے آثار کو اچھی طرح جان سکے اور اس حقیقت کو سمجھ لے کہ کائنات کی ہر چیز کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے جو انسان کے لیے ہی مسخر کی گئی ہے۔[2]

# اختصاصی تعلیم

سید مودودی کی رائے ہے کہ نظامِ تعلیم میں اختصاصی تعلیم کا طریقہ رائج کرنا چاہیے۔ ہر طالب علم کو مجموعۂ علوم پڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کا علم اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ تمام علوم کی معقول استعداد کسی انسان میں پیدا ہونا قریب قریب محال ہے۔ اس لیے ایک مخصوص علم میں قابلیت پیدا کرنے کا طریقہ اپنانا چاہیے۔[3]

# تعلیمِ نسواں

انسانی تہذیب و تمدن میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت اختلاف رہا ہے۔ مغربی اقوام نے عورت کو عزت اور حقوق اس وقت تک نہیں دیے جب تک وہ عورت رہی۔ جب عورتوں نے اپنے کندھوں پر مردوں کے فرائض کا بار اٹھانے کی ذمہ داری قبول کر لی اس وقت عورت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔[4] اسلام نے عورت کو بلند مقام دیا۔ انسانی تمدن کو ٹھیک چلانے کے لیے جو تعلیم اسلام نے عورت کو دی ہے وہ آج تک کسی مذہب سے غیر اسلامی معاشروں میں نہیں ملتی۔ سید مودودی کے نزدیک گاڑی کو چلانے کے لیے جس طرح دو پہیوں کی ضرورت ہے اسی طرح انسانی گاڑی کو چلانے کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو تنگ کر دیا جائے تو گاڑی نہیں چل سکے گی جس طرح گاڑی کے دو پہیوں کا درست ہونا ضروری ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے لیے مرد اور عورتوں کا درست ہونا لازمی ہے۔ اسلام جتنے حقوق مرد کو دیتا ہے، اتنے ہی حقوق عورت کو تفویض کرتا ہے۔[5] اپنی مشہور تصنیف "پردہ" میں سید مودودی فرماتے ہیں:

"عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے، بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے، اسی طرح عورتیں بھی حاصل کرتی تھیں۔ آپ ان کے لیے اوقات معین فرما دیتے تھے۔"[6]

عورتوں کو کن علوم کی تعلیم دی جائے؟ سید مودودی کے نزدیک جو تعلیم مردوں کے لیے مقرر کی گئی ہے، عورتوں کے لیے بھی اس کا انتظام کیا جائے، مگر اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ عورتیں اپنی فطری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں، نہ کہ وہ اس تعلیم کی بدولت مردوں کے ساتھ کارخانوں، دفتروں اور رنگین بازاروں میں کام کریں۔ عورت کا صحیح مقام گھر اور اس کا اصل کام انسان سازی ہے۔ اس لیے عورت پر مصنوعی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔[7]

جہاں تک نفسِ تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اسے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا مسلمان عورت کے لیے لازم ہے اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنی چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کی ہیں۔[8]

# تربیتِ اساتذہ

نظامِ تعلیم میں تربیتِ اساتذہ کا مسئلہ ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ نصاب میں کتنی ہی خامیاں موجود ہوں، اگر اس کو پڑھانے والے اساتذہ میں خوبیاں موجود ہوں گی جو ایک استاد میں ہونی چاہئیں، تو نظامِ تعلیم غلط سمت کی بجائے صحیح سمت چل سکتا ہے۔ سید مودودی اساتذہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نظامِ تعلیم میں نصاب اور کتابیں اتنی اہمیت کی مالک نہیں، اصل چیز اساتذہ اور ان کا کردار ہے، جو قوموں کا رخ بدل دیتے ہیں۔ اگر نظامِ تعلیم بگڑے ہوئے اخلاق اور عقیدے کے لوگوں کے ہاتھ میں جاہلوں کے ہاتھوں میں جو نسل پروان چڑھے گی، ان سے کسی اصلاح اور فلاح کی امید نہیں کرنی چاہیے۔[9]

---

[1] ایضاً، ص ۸۴۔ [2] تعلیمات، ص ۸۶۔ [3] ایضاً، ص ۸۸۔ [4] ایضاً، ص ۲۱۲۔ [5] روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم ص ۱۰۸۔
[6] پردہ ص ۲۴۰۔ [7] تعلیمات، ۲۱۳۔ [8] پردہ ص ۲۴۷۔ [9] تعلیمات، ص ۱۹۳۔

نظام تعلیم میں عام بھرتی کے بجائے انتخاب، اساتذہ کا خاص معیار ہونا چاہیے۔ صرف کسی کو اس کی علمی قابلیت کی بنا پر منتخب نہیں کر لینا چاہیے بلکہ اس کے عقائد و نظریات کا جائزہ بھی لینا ہوگا اور یہ بھی جانچنا ہوگا کہ اس کی عملی زندگی کا اس کے علم سے کتنا تعلق ہے۔ اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عقائد و افکار کے لحاظ سے پورے کے پورے مسلمان ہوں، مغربی تہذیب و ثقافت سے شکست خوردہ نہ ہوں۔

جن اساتذہ کو منتخب کیا جائے ان کے متعلق یہ اطمینان بھی کر لیا جائے کہ ان کے گھر والے بھی حدود شرعیہ کی پابندی سے آزاد نہ ہوں۔ اس لیے کہ جامعہ کے حدود میں اگر طلبہ کے ساتھ ایسے اساتذہ رہیں جن کے گھر کی خواتین تبرج جاہلیت میں مبتلا ہوں اور جن کے گھر سے نغموں کی آوازیں بلند ہوتی رہیں تو طلبہ کو ان سے کوئی اچھا سبق نہ مل سکے گا۔ [1]

گویا سید مودودی کے نزدیک ضروری ہے کہ اساتذہ خود بھی اچھے اوصاف اور کردار کے مالک ہوں اور ان کے گھر میں بھی ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہو تاکہ طلبہ پر کسی طرف سے بھی غلط اثر نہ پڑے۔

ایسے اساتذہ کا اس دور میں ملنا ناممکن نظر آتا ہے، تو پھر اس کا حل کیا کیا جائے گا۔ سید صاحب کے نزدیک ایک معمار کے لیے مکان بنانے کے لیے اینٹیں نہ ہوں، تو پہلے بھٹہ تیار کرنا پڑے گا تاکہ اینٹیں تیار کی جائیں۔ اس طرح ایک خاص طرز کا نظام چلانے کے لیے اساتذہ تیار کرنے پڑیں گے۔ ان کے لیے خاص تربیت گاہیں مہیا کرنی پڑیں گی۔ ان کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست کرنا ہوگا جس میں ان کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ان میں اجتہادی صلاحیتیں بھی پیدا ہوں۔ [2]

انتخاب اساتذہ کے سلسلہ میں یہ بات مدنظر رہے کہ اساتذہ علوم جدیدہ کے بھی ماہر ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں اور ان میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ مغربی علوم اور نظریات کا صحیح صحیح تجزیہ کر سکیں۔ اسلام کے حقائق طلبہ کے سامنے پیش کرتے وقت مغربی علوم سے مرعوب زدہ نہ ہوں، بلکہ ان کے دل میں اسلام کی سچی محبت ہو وہ ہر بات کو بیان کرنے وقت اسلامی نقطۂ نظر واضح کرتے چلے جائیں۔ [3]

# نظام امتحانات

نظام امتحانات کے بارے میں سید مودودی کی رائے یہ ہے کہ جاسے داخلی امتحانات کا نظام ہو یا بیرونی، بہرحال امتحانات منتظمین کی دیانت داری سے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں تنظیم اساتذہ پاکستان کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے سید مودودی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ موجودہ ناقص نظام تعلیم کے پیش نظر اگر داخلی امتحانات کا نظام نافذ کیا جائے تو بہتر ہے لیکن اس میں بھی اساتذہ کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ اساتذہ جب تک صحیح کردار کے مالک نہیں ہوں گے اور ایسی رائے میں (OBJECTIVE) نہیں ہوں گے، اس وقت تک داخلی نظام امتحانات کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکتا۔

# ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

ہمارے ہاں ابھی تک انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی کے بجائے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ سید مودودی کے نزدیک کسی غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ایک آزاد قوم کی شان کے خلاف ہے جب کہ ہماری اپنی زبان اس قابل ہے کہ اس کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں چاہیے کہ ابتدائی تعلیم سے آخری درجوں تک تعلیم اردو زبان میں ہو۔ انگریزی کی حیثیت ثانوی ہو، جو صرف سائنس اور دوسرے جدید علوم کی تعلیم ہو جائیں اس زبان میں حاصل کریں، مگر اس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا سخت غلطی ہے۔ [4]

# رسم الخط کا مسئلہ

پاکستان میں ایک زمانے میں رسم الخط کے بارے میں بڑی شدت سے بحث چلی تھی۔ اس وقت پاکستان کی دو قومی زبانیں تھیں۔ مغربی پاکستان میں اردو اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ۔ مغربی پاکستان میں بھی چار زبانیں بولی جاتی تھیں۔ سرحد میں پشتو، سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی، اور بلوچستان میں بلوچی۔ لیکن رسم الخط کا مسئلہ صرف دو زبانوں میں تھا اردو اور بنگالی۔ مسئلہ یہ تھا ان دونوں قومی زبانوں کے لیے کیسا رسم الخط ہو جو دونوں کو آپس میں قریب کر دے۔

بعض مغرب زدہ لوگ اس بات پر زور دینے لگے کہ دونوں زبانوں کا رسم الخط رومن ہونا چاہیے۔ اس سے دونوں زبانوں میں قریبی تعلق پیدا ہو جائے گا۔ سید مودودی رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بنگال میں عرصہ تک عربی رسم الخط رائج رہا اور انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش سے عربی رسم الخط کی جگہ ناگری رسم الخط رائج کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو اپنے [illegible] بیگانہ کرنا تھا، بلکہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے زیر اثر لانا بھی تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں ان تمام مدارس کی امداد بند کر دی جو عربی رسم الخط میں تعلیم و تربیت [illegible] دیتے تھے اور اس طرح مسلمانوں پر یہ رسم الخط زبردستی ٹھونسا گیا تھا۔ [5]

[illegible] سے مسلمانوں پر [illegible] کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو رسم الخط میں ہمارا تمام لٹریچر موجود ہے جس سے موجودہ نسل بھی آشنا ہے۔ اگر اس کو بدل دیا [illegible]

---

[1] [illegible] ۔ [2] ایضاً، ص ۲۷ ۔ [3] تعلیمات، ص ۲۱۹ ۔ [4] تعلیمات، ص ۲۱۳، ۲۱۵

[illegible]

گیا تو ساری نئی نسل اردو لٹریچر سے بالکل ناواقف ہوگی تمام مذہبی، ادبی میراث جو اردو، عربی اور فارسی زبان میں موجود ہے اس سے بیگانہ ہو کر اپنی تہذیب کو کھو بیٹھے گی۔ اس طرح ہم صدیوں کے سرمایۂ علم و تہذیب سے محروم ہو جائیں گے۔ سید صاحب اس سلسلے میں ترکی قوم کی مثال بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسم الخط کو تبدیل کر کے کشمکش کا شکار ہو گئے کیونکہ نئے رسم خط لکھنے اور رائج ہونے میں کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے اہل قلم کوئی علمی کام نہ کر سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ رومن رسم الخط کے اختیار کرنے سے سب سے بڑا نقصان جو ہوگا وہ یہ کہ مسلمان دنیا سے بالکل کٹ جائیں گے جہاں عربی رسم الخط رائج ہے جو اردو کے لیے بھی آسانی سے اپنایا جا سکتا ہے، ہماری حیثیت مسلمان اور پڑوسی ملکوں میں ایک اجنبی کی سی ہو جائے گی۔ [1]

سید مودودی کے نزدیک ہمارے لیے مناسب رسم الخط خطِ نسخ ہے کیونکہ مسلمان عربی رسم الخط سے پہلے ہی مانوس ہیں۔ اگر اردو زبان کا رسم الخط نسخ میں تبدیل کر دیا جائے، تو اردو پڑھنے والوں کے لیے بھی آسانی رہے گی اور مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ خط آسان ہوگا کیونکہ وہ قرآن پڑھنے کی خاطر اس رسم الخط کو اب بھی سیکھتے ہیں، اس لیے ان کے لیے بھی زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ خطِ نسخ اب کافی ترقی کر چکا ہے طباعت کی سہولت بھی اس میں موجود ہے۔ اس طرح بنگالی زبان اور اردو زبان کا رسم الخط ایک ہو جائے گا جو بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارے لیے فائدہ مند ہوگا۔ [2]

# نظریۂ ادب

ادب کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی۔ اس بحث نے بہت سے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ادب زندگی کی ضرورتوں کے مطابق ہو یا صرف ادب کے لیے ہو۔ مارکسی نظریات نے ادب برائے زندگی کا تصور دیا۔ سید مودودی ادب کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"خاص کر کے یہ کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھوئے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل نظریہ و مسلک پر استوار کرنا ہوگا۔" [3]

ادب کا کام دماغ کی تربیت ہے۔ ادب ایک خاص نظریۂ زندگی کی ترجمانی کرنے والا ہونا چاہیے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو قوموں کو بقا بخشتی ہے۔ ادب برائے معاش تو زندگی ختم ہونے کے ساتھ ہی اپنے تصورات کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے وہ پیٹ کی خاطر ادب پیدا کرے گا۔ یہ چیز انسان کو کسی ایک مسلک کے تابع نہیں رکھ سکتی جہاں بھی انسان کو معاش میں کشائش نظر آئی، اپنے ادب کو اس طرف جھکا دیا۔

# خلاصہ، نتائج، سفارشات

## خلاصہ

سید مودودی اس وقت عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں ان کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی جامع ہے۔ وہ مفسر قرآن، عالم دین، سیاست دان، متکلم اسلام ہونے کے علاوہ مفکر تعلیم بھی ہیں۔ سید مودودی نے موجودہ حالات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ نظام تعلیم کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور اس نظام تعلیم کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے قومی مقاصد کی تکمیل کر سکے، چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سید مودودی کے تعلیمی نظریات کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں اپنے نظام تعلیم میں اصلاح کے لیے سفارشات پیش کی جائیں۔

# نتائج

اس تحقیق کے دوران میں سید مودودی کی کتب کے علاوہ چند دوسری کتب کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ کا ماحصل درج ذیل ہے:-

۱۔ حقیقت اصلیہ ذات الٰہی ہے۔ وہی نظام کائنات اپنے تدبر و حکمت کے ساتھ چلا رہی ہے۔

۲۔ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ارادے سے پیدا کیا اور اس کی تخلیق میں ایک مقصد موجود ہے۔

۳۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور دنیا میں اپنا نائب مقرر کیا۔

۴۔ علم کا مفہوم معرفت الٰہی اور صفاتِ الٰہی کا جاننا ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص صاحب علم کہلانے کا مستحق نہیں۔

۵۔ علم ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ وحی الٰہی اصل ذریعۂ علم ہے۔

۶۔ وحی الٰہی کے علاوہ انسان کو حواس و عقل کی قوتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے وہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ نیز دوسروں کے علم سے بھی استفادہ کر سکتا ہے، لیکن یہ تمام ذرائع وحی کے تابع ہیں۔

۷۔ تعلیم میں اخلاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علم، احسان اور صلہ رحمی پسندیدہ اقدار ہیں۔ طرز کردار میں اسلامی شعائر کی پابندی سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ تعلیم کا مقصد جہاں معرفت الٰہی ہے وہاں انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما، ثقافت کی منتقلی، مضبوط سیرت و اخلاق کی تعمیر اور صحیح لیڈرشپ پیدا کرنا

---

[1] تنقیحات، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ [2] ایضاً ص ۲۱۸۔ [3] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۷۳۔

گئی ہے۔

۹۔ نصابِ تعلیم کے مرتب کرنے میں اسلامی روح کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نادر نصاب کے انتخاب میں مدرج اسلام کو معیار بنایا جانا چاہیے۔

۱۰۔ نظامِ تعلیم میں قدیم و جدید کی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا جواز اسلام میں قطعاً نہیں ہے۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ دینی اور دنیوی تفریق پیدا نہ ہو۔

۱۱۔ پاکستان میں تعلیم اردو زبان میں ہونی چاہیے

۱۲۔ رسم الخط کے اعتبار سے خطِ نسخ کو اپنانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ قرآنی خط سے مشابہ ہے جس سے مسلمان مانوس ہیں لہٰذا انہیں خطِ نسخ اپنانے میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔

۱۳۔ ادب کا مقصد معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا نہیں بلکہ ذہنی تربیت ہے۔ ادب نظریۂ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

۱۴۔ نظامِ تعلیم میں تربیت اساتذہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اساتذہ کی تعیناتی کے وقت ان کی علمیت اور اخلاق و کردار دونوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۵۔ تعلیم کا حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ عورتیں بھی وہ علوم حاصل کر سکتی ہیں جو مرد حاصل کرتے ہیں مگر اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ عورت کا اصل مقام گھر اور تربیت اطفال ہے۔

۱۶۔ امتحان میں داخلی نظام کا اپنانا مناسب ہے۔ مگر اس میں اساتذہ کی دیانت داری بنیادی حیثیت رکھتی ہے

# سفارشات

سید مودودی کے تعلیمی نظریات کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں

۱۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ قدیم اور جدید نظامِ تعلیم کی تفریق ختم ہو جائے۔ اس باہمی ربط کی بنیاد بہرحال اسلام کے بنیادی اصول بننے چاہئیں۔

۲۔ مقاصدِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی تدوین و ترتیب اس طرح کی جائے کہ تمام افراد چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، استاد ہوں یا وکیل، تاجر ہوں یا کسی اور پیشے سے متعلق ہوں، اپنے پیشے میں مہارت کے علاوہ اوّل و آخر صحیح مسلمان ثابت ہوں۔

۳۔ اساتذہ کو نہ صرف علمی قابلیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، بلکہ اپنے کردار و سیرت سے بھی طلبہ پر اثر انداز ہونا چاہیے

۴۔ اساتذہ کے انتخاب میں ان کی علمی اور پیشہ ورانہ لیاقت کے علاوہ عقائد و نظریات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۵۔ بچوں کو ابتدا ہی سے ایمان کی پختگی اور عمل صالح کی تعلیم دینی چاہیے توحید و رسالت کا تصور بچے کے ذہن میں شروع عمر ہی سے راسخ کیا جانا چاہیے طلبہ سے نماز کی پابندی کروانی چاہیے اس سے سیرت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ خاص طور پر مدارس میں نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے اس سے مساوات اور جمہوریت کا تصور بھی واضح ہوگا

۶۔ طلبہ پر نظریۂ پاکستان جو درحقیقت اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے، واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

۷۔ طلبہ میں اخلاقِ حسنہ، شائستگی، پاکیزگی، ذوقِ سلیم، وسعتِ نظر، خودداری، جرأت و دلیری، جفاکشی اور خود کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

۸۔ طلبہ کو علم کے ساتھ ساتھ ضروری معاشرتی مسائل سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔

۹۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے جس سے اسلامی کلچر اور تہذیب کا احیا ہو سکے

۱۰۔ مختلف مضامین کو از سر نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلامی نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

**:

## ظہور پاکستان پر

- جواہر لعل نہرو
- کرشن چندر
- راما نند ساگر
- سعادت حسن منٹو
- قدرت اللہ شہاب
- رئیسی جان نیکسن

# لہو رنگی تصویریں

[illegible] (مدیر)

## ڈاکو اور لٹیرے

پنڈت جواہر لال نہرو

آج جب میں مہاتما گاندھی کے سامنے گیا تو میں ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا شرم سے میری گردن جھکی ہوئی تھی ـــــ وہ عظیم انسان ـــــ ہمارا گرو آج کیا سوچتا ہوگا۔ کیا پھر وہ ہمیں اسی لیے اہنسا کا سبق دیتا رہا کہ ہم یہ کارنامے کریں جو آج کل کر رہے ہیں

جب میں ان کارناموں کا خیال بھی کرتا ہوں تو خوف و دہشت کے مارے جیسے انسانوں پر سے گناہوں اور آج کل خون ہی تو رہ گیا ہے۔ ہمارے بچے کے لیے ان ہزاروں لاکھوں اموات کی مرتدہ ذلت اور شرمندگی جواب کی نسلوں تک ہمارے ساتھ چپکی رہے گی۔

جتنے کئی سالوں سے جو خواب ہم دیکھتے آرہے تھے کیا اس کی تعبیر یہی تھی؟ ایک نسل نے جو کام اپنی ساری زندگی میں کیا تھا کیا وہ یوں تباہ ہو جائے گا؟ یہ بڑی نازک گھڑی ہے۔ سوچنے کا مقام ہے ہم آخر ہندوستان کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ ہم کیسا ہندوستان اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جانا چاہتے ہیں؟

دوسری طرف جو کچھ ہوا وہ سن کر ہمیں بھی جوش آتا ہے مجھے بھی غصہ آتا ہے لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ جوش کرنے لگا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا کیا ہم لٹیروں کا ملک بنانا چاہتے ہیں؟ جو قتل ایسے کے خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں میں لوٹ کا سامان لیے ہوئے فسادیوں کے ہجوم جب مجھے دیکھ کر "جواہر لال کی جے اور مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے لگاتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کیا میں لٹیروں اور ڈاکوؤں کا سردار ہوں؟

میرے بھائیو یاد رکھو کہ ملک پاگل پن سے نہیں چلتے۔ پاگل آدمی ملکوں کو ساتے ہیں ہم اس وقت محض لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں سے نہیں کھیل رہے بلکہ ایک قوم اور ایک ملک کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ اپنے مستقبل سے کھیل رہے ہیں۔ سمجھو اور سنبھلو!!

(پنڈت نہرو کے تحریری بیان سے جو ۹ ستمبر، ۱۹۴۷ء کو ریڈیو سے نشر ہوا)

## مَیں تیری بہن آں

کرشن چندر

تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور میں کہ ایک ٹی آر ورجنت کے نیچے ایک لمبا سا کیو (قطار) لگا تھا مَیں نے قریب جا کر ایک آدمی سے پوچھا جو ایک چھوٹی سی قمیص اور ایک میلی سی پتلون پہنے تھا۔

"یہاں کیا راشن ملتا ہے؟"

وُہ نوجوان مسکرایا بولا "یہاں سیکس (SEX) کا راشن ملتا ہے"

"کیا مطلب؟"

وُہ بولا "ایک مسلمان لڑکی ہتھے چڑھی ہے، ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں"

"مَیں نے سامنے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا، مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیو کب تک رہے گا؟ میں نے اسی نوجوان سے پوچھا۔

"جب تک لڑکی مر نہیں جاتی" نوجوان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک تو مَیں کیو میں کھڑا رہا لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے، پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔

کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا، جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو۔ واقعی اُس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔

"وے بھراوا، مَیں تیری بہن آں۔ وے ویرا، مَیں تیری بہن آں"

مَیں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ وُہ چھوٹی قمیص والا نوجوان اپنی میلی پتلون سنبھالتا ہوا زور سے قہقہہ مار کر بولا:

"بزدل"۔

(ناولٹ غدار سے)

## انسان کے شکاری

راماند ساگر

کئی مسلم گاڑیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب میں جو کچھ کیا گیا وُہ بھی کم ہولناک نہ تھا اُن میں سے ایک گاڑی کے تیرہ ہزار انسانوں میں سے صرف پندرہ بچے تھے اور وُہ بھی لاشوں کے نیچے دب جانے کے باعث

ان پندرہ نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب فرش پر تڑپتے ہوئے اپنے بھائیوں، بیویوں اور بچوں کے خون کو چاٹا انتہا یہ کہ کئی روز ریلوے میں رہنے کے بعد آخر انہوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا تاکہ حلق تو تر ہو سکیں۔

جالندھر میں ایک ڈاکٹر کی لڑکی نے اپنی چھوٹی بہن اور بھائی کے ساتھ مل کر گھنٹوں تک سینکڑوں سکھوں کے ایک بھرے ہوئے ہجوم کا مقابلہ کیا مسلسل گھنٹوں وُہ تینوں ایک ریوالور اور دو رائفلوں سے لڑتے رہے، لیکن آخر کار انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ڈاکٹر کو باہر لایا گیا تو ایک جوان گُھبرو آگے بڑھا اس نے کہا:

"اسے چھوڑ دو، یہ میرا شکار ہے" اور پھر ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک وزنی کھانڈے کا ایک بھرپور ہاتھ ایسا مارا کہ کھانڈا ڈاکٹر کی کھوپڑی کو چیر کر چھاتی کے ایک طرف سے ہوتا ہوا ایک کولہے کے قریب سے نکل گیا اور پھر قریبی دیوار میں جا کر ایسا لگا کہ کُند ہو گیا۔

ڈاکٹر کے دونوں ٹکڑے زمین پر اس کے قدموں میں پڑے تھے اور وُہ اپنے کُند کھانڈے کو دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا

"اگر تم اتنے ہی نرم تھے، تو پہلے کہتے، مَیں اپنا کھانڈا ہی خراب نہ کرتا"

اُس کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو باہر لا کر اُن کے متعلق کئی طرح کی اسکیمیں مرتب کی گئیں لیکن دونوں لڑکیاں بڑے بہادرانہ انداز میں خاموشی سے کھڑی رہیں آخر میں انہیں کہا گیا کہ وہ جے کا نعرہ لگائیں، لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا

"ہم لڑائی ہارے ہیں آپ کا جو جی چاہے ہمارے ساتھ کر سکتے ہیں، لیکن جو نہیں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے"

ان لڑکیوں کے ساتھ ایک دس سال کا اُن کا چھوٹا سا بھائی بھی تھا جو حیران ہو کر دیکھ رہا تھا کہ سر ہی نہیں جو کبھی پردے کے بغیر غیر مردوں کے سامنے نہیں گئی تھیں آج کس ڈھٹائی سے تڑ تڑ باتیں کر رہی ہیں آخر انہیں ننگی عورتوں کے ایک فاتحانہ جلوس کے آگے چلنے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا

انھوں نے زمین پر گھسٹنا منظور کر لیا لیکن اپنی رضا سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ آخر میں کسی نے کُرتیوں میں ہاتھ ڈال کر ان کے پیرہن بالکل چیر دیئے اور وہ دونوں بالکل ننگی کر دی گئیں۔ جوں ہی حسبِ ان کی سرکشی ٹوٹ سکی، تو ایک نوجوان نے طیش میں آ کر اپنی تلوار کی نوک بڑی لڑکی کی شرمگاہ میں اس طرح ٹھونس دی کہ وہ (جسم کو) چیرتی ہوئی لڑکی کے پیٹ تک آ گئی۔

اسی وقت چھوٹی بہن کو ایک اور نے سڑک پر لٹا لیا تھا اور کھلے عام کئی سواروں نے وہیں دادِ عشرت دی۔
یہ دیکھ کر چھوٹا بھائی چلایا اور اس نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو کسی نے لوہے کی ایک کند سلاخ اس کے پیٹ میں اس زور سے کھبو دی کہ وہ اس پر معلق ہو گیا۔
(رپورتاژ 'اور انسان مر گیا' سے)

## مالِ غنیمت

سعادت حسن منٹو

لوٹ کھسوٹ کا بازار اسی طرح گرم رہا اور اس گرمی میں چاروں طرف بھڑکنے والی آگ بدستور اضافہ کرتی رہی۔ بہت دیر کے بعد تڑ تڑ کی آواز آئی، گولیاں چلنے لگیں۔ پولیس کو بازار خالی نظر آیا، لیکن دور دھوئیں میں ملفوف موڑ کے پاس ایک آدمی کا سایہ دکھائی دیا۔ پولیس کے سپاہی سیٹیاں بجاتے اس کی طرف لپکے۔ سایہ تیزی سے دھوئیں کے اندر گھس گیا۔ پولیس کے سپاہی بھی اس کے تعاقب میں گئے۔

دھوئیں کا علاقہ ختم ہوا، تو پولیس کے سپاہیوں نے دیکھا ایک کشمیری مزدور پیٹھ پر وزنی بوری اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ سیٹیوں کے گلے خشک ہو گئے، مگر وہ کشمیری مزدور رکا نہیں۔ اس کی پیٹھ پر وزن تھا، معمولی وزن نہیں، ایک بھری ہوئی بوری، لیکن وہ یوں دوڑ رہا تھا جیسے پیٹھ پر کچھ ہے ہی نہیں۔
سپاہی ہانپنے لگے، ایک نے تنگ آ کر پستول نکالا اور داغ دیا۔ گولی کشمیری مزدور کی پنڈلی میں لگی۔ بوری اس کی پیٹھ پر سے گر پڑی۔ گھبرا کر اس نے اپنے پیچھے آہستہ آہستہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا۔ پنڈلی سے بہتے ہوئے خون کی طرف بھی اس نے غور سے دیکھا، لیکن ایک ہی جھٹکے سے بوری اٹھائی اور پیٹھ پر ڈال کر پھر بھاگنے لگا۔
سپاہیوں نے سوچا، "جانے دو جہنم میں جائے۔"
ایک دم لنگڑاتا لنگڑاتا کشمیری مزدور لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ بوری اس کے اوپر آ گری۔
سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور بوری سمیت لے گئے۔
راستے میں کشمیری مزدور نے بارہا کہا:
"حضرت آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے۔۔۔ میں تو غریب آدمی ہوتی۔۔۔ چاول کی ایک بوری لیتی۔۔۔ گھر میں کھاتی۔۔۔ آپ ناحق مجھے گولی مارتی۔" لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔
تھانے میں بھی کشمیری مزدور نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا: "حضرت، دوسرا لوگ بڑا بڑا مال اٹھاتی۔۔۔ میں تو فقط ایک چاول کی بوری لیتی۔۔۔ حضرت میں بہت غریب ہوتی۔ ہر روز بھات کھاتی۔"
جب وہ تھک ہار گیا، تو اس نے اپنی میلی ٹوپی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چاولوں کی بوری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر تھانیدار کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا:
"اچھا حضرت، تم بوری اپنے پاس رکھتی۔ میں اپنی مزدوری مانگتی، چار آنے۔"
طریقے مزدوری نے سے

## مہاجر خانے میں

قدرت اللہ شہاب

ایک صاحب نئے مخیر تھے۔ بدن پر چست سوٹ، سر پر ترچھی ٹوپی، آنکھوں پر سونے کے فریم والی عینک، ہاتھوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پائپ، انگلیوں پر لعل اور یاقوت جیسا، نگینوں... وہ گھنٹوں مہاجر خانے میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان بڑے غور سے سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے، کسی کو مٹھائی کی گولیاں، کسی کو کھلونے۔ دلشاد پر بھی ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس بچی کے لیے سرخ اون کا ایک سویٹر لائے۔ دوسرے روز انہوں نے رحیم خان کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں بعد وہ دلشاد کے لیے ایک خالہ امید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خان کا پتہ مل گیا ہے۔ لے جا رہے ہیں کہ وہ آج کل چلنے پھرنے سے معذور ہے، لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک بار زیست اٹھائے ہوئے ہے۔ دلشاد کی نظر میں دنیا گلزار ہو گئی۔ مہاجر خانے کی زمین پر پھول ہی پھول اُگ آئے۔ اس کے دل میں بسنے والا سہرا کانوں کی طرح منکسار ہو گیا۔
وہ اپنے سینے میں ارمانوں کا لے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفیٰ خان سیالی کی موٹر میں آ بیٹھی، کار فرّاٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گزر رہی تھیں۔ "یہ ناصر باغ ہے۔ یہ گلستان فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ مقبرہ کائنات ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریستوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے۔ وہ مسجد ہے۔ یہ مصطفیٰ خان سیالی کا متعلقہ بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔ آج کرنے کی بھر کے سنگسار۔۔۔"
دلشاد کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک انوکھے سرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر کبھی رحیم خان کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلے کی ہوا میں اس کی دلاویز سانس بسی ہوئی ہو۔ دلشاد کی نظر عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ آنکھ اور مدینے کی خاک بن گیا۔ بنگلے کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس سائے پڑ گئے۔
ایک نوکر نے اُسے ایک پلیٹ میں پلاؤ، ایک میں پالک اور گوشت، ایک میں مٹر اور قیمہ، ایک میں کیوڑے میں تلی ہوئی فرنی لا کر رکھ دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی، کتنا کھا گئی اور کب کھا گئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی روح اپنے رحیم خان کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو بھی گِدھ گھور رہے تھے۔

مصطفیٰ خاں بھائی، ڈھلسنگ گاؤں پہنچے اس کے سامنے مجرم کے گروہ کی طرح منڈلا رہا تھا میرے پاس کی ولی کی لول جھنکار رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا میرے لال اگر مرے بیٹے سے لگ جاؤ تم بڑی مظلوم ہو، ہم بڑی غریب ہو، لیکن میں ایک امیر انسان ہوں، میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ سا کے رکھوں گا، ہمارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو، لیکن تم اس فرشتی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ، آؤ میری جان آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ اب تم اپنے آزاد وطن میں آگئی ہو اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں یہ ہمارا وطن ہے پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد۔

دلشاد کے گلے میں مولا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی جب مصطفیٰ خاں بھائی کی رال ٹپک ٹپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی، تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگِ اسود کو بوسہ دے رہا ہے۔

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خاں بھائی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے، تو دلشاد پھر مہاجر خانے میں واپس آگئی جہاں محمود ایک شیشے کا لٹو چلا رہا تھا اس نے تتلا تتلا کر باتیں بنا کر دلشاد کو سمجھایا کہ رشیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی، دادا میاں نے سیپٹی کا یہ لٹو بھیجا ہے، یہ لڑکی کا کیسا ہے، یہ رنگدار مٹھائی ہے آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی نئے نئے لوٹ لائے گی، کلّے دار ٹوپی لائے گی۔

لاہور، لاہور یہ تھا، مدینہ تھا۔ لاہور والے لاہور والے تھے انصار تھے۔ ہم، ہم تو شاید انصار مدینہ سے بھی کچھ درجہ افضل تر تھے جہاں دلشاد کے پیٹ سے ہر دن ایک نیا رحیم خاں پیدا ہوتا تھا، رشیدہ کے پیٹ سے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا، بیٹیوں کے پیٹ سے نئے باپ تھے۔ بہنوں کے پیٹ سے نئے بھائی جنم کا رشتہ ہم سے ملتا تھا خون کا رشتہ خون سے۔

## بیس لاکھ مسلمانوں کی لاشیں

مرتضیٰ خاں میکش

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع امرتسر، گورداسپور (ماسوائے تحصیل شکرگڑھ) فیروزپور، جالندھر، ہوشیارپور، کانگڑہ، انبالہ، رہتک، حصار، گوڑگاؤں، ہیرپور، پٹیالہ، جیند، نابھہ، کلسیہ، الور، بھرت پور اور کوہستان شملہ کی تمام ریاستوں سے مسلمان یک بینی و دوگوش نکال باہر پھینک دیے گئے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہنے والا اور اس حقیقت کبریٰ کا اعلان و اقرار کرنے والا ایک متنفس بھی اس وسیع ملک میں جس کا رقبہ ستر ہزار مربع میل ہے، باقی نہ رہا۔ بلکہ یہ ہے کہ سارے کے سارے صوبے سے مسلمانوں کے اخراج کا کام بہت پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جا چکا تھا اس قتل عام اور اخراج کے باعث مسجدیں ویران ہو گئیں بزرگوں کے مزار تباہ کر دیے گئے ہزاروں مسلمان عورتیں جبراً و قہراً لونڈیاں بنا کر رکھ لی گئیں ہزار بچے چھین لیے گئے اور ہزاروں خاندان ہندو یا سکھ بنا لیے گئے۔

ان اقطاع کی چھبیس لاکھ مسلم آبادی میں سے لاکھوں کلمہ گو قتل کر دیے گئے اکثر گولیوں کا شکار ہوئے بہت سے تیز دھار رکھنے والے آلات سے مارے گئے ایک بڑی تعداد نذر آتش کر دی گئی۔ یہ ساری زمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی بلکہ گویا توحید کی لاشوں سے پٹ گئی، چیلوں، کوؤں، گدھوں، کتوں اور گیدڑوں نے ان کا گوشت نوچ نوچ کر اس حد تک کھایا کہ سیر ہو کر منہ موڑ گئے۔

لاکھوں مسلمان جنہوں نے کیمپوں کے رسوا کن مصائب اور سفر کی ناقابل برداشت صعوبتوں کا شکار ہو کر مر گئے اور جہاں جہاں سے گزرے اپنے قبرستانوں سے زمین کو آباد کرتے گئے ہزاروں مسلمان بارشوں کے باعث آنے والے سیلابوں اور دریاؤں کی طغیانیوں میں غرق ہو کر بہہ گئے دریائے بیاس کے دونوں طرف کئی کئی میل تک زمین ان کی گلی سڑی لاشوں سے پٹ گئی گرانڈ ٹرنک روڈ پر سے ناک بند کیے بغیر گزرنا مشکل ہو گیا

پاکستان میں پہنچنے کے بعد پناہ گزینوں میں اموات کی رفتار تیز تر ہو گئی، کیونکہ سفر کے مصائب جھیلنے کے باعث امراض کے مقابلے میں ان کی قوت مدافعت بہت کم ہو گئی تھی اور پاکستان میں ان کا پرسان حال کوئی نہ تھا ۲۵ اور ۲۶ دسمبر کی درمیانی شب کو جب کہ پاکستان کے ارباب اقتدار، قائد اعظم کے یوم ولادت پر رقص و سرود اور مے نوشی کی محفلیں گرم کر کے جشن منا رہے تھے، لاہور، مغلپورہ اور دیگر مقامات کے کیمپوں میں کئی ہزار مسلمان ایک ہی شب میں سردی سے ٹھٹھر کر مر گئے۔

دہلی کے ہزاروں مسلمان ان سب کیفیات کا تختۂ مشق بن کر تلف ہوئے اور ہندوستان کے دیگر اقطاع سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے کے لیے وارد ہوئے یہ مسلمان کروڑوں روپے کی جائدادیں، املاک، اموال، اراضی، باغات، مویشی، سامان، گھر، عمارتیں اور کاروبار چھوڑ کر آئے اور پاکستان میں ہیچ کر تباہ حالی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے جان و مال کے اس اتلاف پر یہ مصیبت جھیلنی پڑی کہ بھائی سے بھائی بچھڑ گیا۔ اعزا و اقربا ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور جا پڑے گاؤں کے لوگ جو پشتوں سے رنج و راحت کے شریک چلے آ رہے تھے تتر بتر ہو گئے

ان تمام اتلافات اور نقصانات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ امر محال ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ

قتل ہونے والوں کی تعداد

کیمپوں میں اور سفر کے مصائب سے مرنے والوں کی تعداد — پانچ لاکھ

پاکستان میں پہنچنے کے بعد دو ماہ کے اندر اندر مرنے والوں کی تعداد — پانچ لاکھ

ان عورتوں، بچوں اور مردوں کی تعداد جو ہندو بنا لیے گئے — ایک لاکھ

قصہ مختصر سولہ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک مسلمان چھ ماہ کے قلیل عرصے میں ہلاک ہو گئے باقی ماندہ کی خانہ بربادی اس پر مستزاد ہے کُل ایک کروڑ سے زائد مسلمان سارے ہندوستان سے اس قیامت صغریٰ کی لپیٹ میں آ گئے (واقعاتی تصنیف اخراج اسلام از ہند سے)

***

# خواتین یونیورسٹی

## اہمیت و ضرورت !

سلمیٰ کلثوم
(شعبہ کیمیا)

ملک میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ روز بروز پریشان کن صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ان پر ہی ان کا معاشرہ معاشرتی اقدار یا ان کے اثرات، نئی نسل کی تربیت میں ان کا رول اہم ہونے کے لحاظ سے یہ مسئلہ ایک ایسا پہلو تھا جو فوری اور سب سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا لیکن اس بارے میں کسی فکر اور تدبیر کے بجائے مروجہ نظام سے ہٹ کر اپنے مسائل اور آرا موصوف مقاصد کا لحاظ رکھ کر کسی قدم اٹھانے کا کہیں پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں کوئی نشان نہیں ملتا جو کچھ ہوا ہے وہ بس یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کی تعلیم کی نوعیت، اداروں کا ماحول، نصاب کسی بھی لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے

تعلیم نسواں کے بارے آواز بلند کرنا آج کل کچھ فیشن سا ہو گیا ہے لیکن اس کے لئے غور و فکر کر کے مناسب عملی اقدامات کرنے کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ ملک میں کئی حکومتیں بدلیں لیکن لارڈ میکالے کی غلامی کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ مغرب کے اثرات سب پر اس طرح حاوی رہے کہ ان کی آمد سے علیحدہ راہ پر کوئی قدم بھی نہ اٹھایا گیا اور نہ اس کے لئے سوچا گیا بلکہ اس کے برعکس انہی راہوں پر دوبارہ سفر جاری ہے۔ تعلیم کے شعبے کی مخصوص بندی کی گئی اس سے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ ہوئے ہیں اور آج ہر ایک ان کو دیکھ رہا ہے اور محسوس کر رہا ہے

پاکستان میں اسلام کے تحفظ اور معاشرتی استحکام کے نقطہ نظر سے اس سے زیادہ اہم اور کوئی مسئلہ نہیں کہ عورتوں کو اسلامی زندگی دور کی جائے اور ان میں تعلیم پھیلائی جائے اور یہ تعلیم ان کے لئے مناسب ہو، دین و ایمان کے تقاضے پورا کرنے والی ہو اور جو کام ان کو کرنا ہے اس کے لئے ان کو بہترین استعداد پیدا کرنے والی ہو۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم عورتوں کی بہت ہی محدود تعداد کو تعلیم دے رہے ہیں اور وہ بھی اسی غلط نوعیت کی ناقص طریقہ مگر مغربی رسالوں سے اور یہ نظام ہم سے سامنے ہے وہ ایسا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے دروازے عورتوں پر تقریباً بند کر دیئے ہیں عورتوں کی تعلیم کا ہمہ گیر اور وسیع مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے ایک خوشگوار ابتدا خواتین یونیورسٹی ہو سکتی ہے

خواتین یونیورسٹی بہت ہی مفید اور آسانی سے قابل عمل تجویز ہے۔ نظریاتی طور پر تو اس کی ضرورت اور اہمیت اتنی واضح ہے کہ پاکستان میں آزادی کے بعد اس تجویز پر عمل کرنے میں دیر نہ ہونا چاہئے تھی اور اب تو عملاً بھی اس کے نتیجے کے نتائج لئے کھل کر سامنے آ چکے ہیں کہ اب حکومت کے لئے کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔ ماہرین تعلیم نے اس سے پہلے آواز بلند کی ہے، طلبہ کی تنظیموں نے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ کہنا ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کے دل کی آواز ہے جسے اپنی عورتوں کی عزت اور وقار عزیز ہے اور جسے ان کی مناسب تعلیم و تربیت مطلوب ہے اور اس کے علاوہ ملک میں تعلیم نسواں کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے بلکہ یہ کہنا صحیح بات ہے کہ اگر ہم اس معاشرتی بگاڑ کو روکنا چاہتے ہیں جو عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے نام سے ہمارے ہاں پیدا ہو رہا ہے تو اس کی کوئی تدبیر اس کے علاوہ نہیں ہے

یہ ہماری تعلیم میں ایک نیا قدم ضرور ہوگا لیکن حقیقت میں ہماری تہذیب اور ہمارے مذہب سے مطابقت رکھنے والے رجحان کا آغاز ہوگا۔ اگر اس تجویز پر عمل کیا جائے، دینی لحاظ سے دینی و سماجی تعلیم کے فروغ کے خصوصی مراکز بنا دیئے جائیں تو چند سالوں ہی میں ملک میں تعلیم نسواں کی اشاعت کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ کا باعث ہوگا اور ساتھ ہی اس تعلیم کی نوعیت میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں لا سکے گا اور اس ملک کی خواتین مسلم معاشرہ کی تعمیر اور اسلامی ثقافت کے فروغ میں اپنا اصل حصہ ادا کر سکیں گی

خواتین یونیورسٹی قائم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی جاتی۔ غالباً اسے قدامت پسندی کا نشان سمجھ کر ارباب حکومت اس کے ذکر سے شرماتے ہیں اور محض ترقی پسندی اور مغربی اقوام کی رائے میں اس کے ہونے کے اثرات کو، اس دین کو، مذہب کو، ملک و قوم کو، معاشرہ کو اور خود عورتوں کو برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ہمارے ارباب حکومت کے لئے اسلام کا نظام معاشرت اور پردہ کا نظام کوئی دلیل نہیں ہے اور ان کے اسلام کے لئے خدا اور رسول کا حکم کافی نہیں ہے، تو ہم اس بات میں چند دلائل پیش کرنے کی اجازت چاہیں گے

تعلیم عورتوں اور مردوں کا مساوی حق ہے اور کوئی حکومت اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ مخلوط یونیورسٹیاں ان پاکستانی عورتوں کی ایک کثیر تعداد کے لئے جنہیں اسلامی اخلاق اور وقار عزیز ہے اعلیٰ تعلیم کے حق سے انکار کے مماثل ہے۔ ان عورتوں کی یہ مسلسل حق تلفی ختم ہونا چاہئے اور خواتین یونیورسٹی کے ذریعے انہیں ان کا یہ حق ملنا چاہئے۔ آخر اس ملک کے عوام اس بات کے لئے مجبور کیوں ہوں کہ تعلیم دلانے کی خاطر اپنے مذہب اور اپنی معاشرت کو قربان کر کے دلائیں۔ اگر حکومت یہ نہیں کر سکتی ہے کہ وہ لڑکیوں کے لئے اسلام کے نظام کے مطابق تعلیم کی سہولتیں فراہم کرے، تو کم از کم دونوں صوبوں میں ایک علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے تاکہ حکومت کم از کم یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکے کہ ہم نے بہتر علیحدہ تعلیم کی بھی فراہم کر دی ہے۔ آج کے دور میں آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو تعلیم سے عملاً محروم رکھنے کو کوئی حکومت اپنے کو مہذب حکومت کس طرح کہہ سکتی ہے؟

یہ بات مسلم ہے کہ عورتوں کا معاشرہ میں اپنا ایک مخصوص رول ہے اور انہیں تعلیم اس کے مطابق ملنی چاہئے۔ ہم کامرس، انجینئرنگ اور زراعت کی تربیت کے لئے ادارے قائم کرنے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں تو خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کو کیوں نہیں اپنایا جاتا۔ نہ اپنانا مناسب ہے اور یہ پالیسی اصلاح طلب ہے۔

ماہرین میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ طلبا و طالبات کی مزاجی کیفیت الگ الگ ہے۔ ایک مناسب نظام تعلیم کو اس کا لحاظ رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہیئے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ ابتدائی درجوں سے اعلیٰ درجوں تک ایک نصاب صرف طلبہ کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے اور طالبات نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ خالص تعلیم کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ ان کا نصاب علیٰحدہ ہو اور اس کے لئے خواتین یونیورسٹی ناگزیر ہے۔ دیانتداری سے غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اثرات ہمارے پورے نظام تعلیم اور معاشرے پر بڑے خوشگوار ہوں گے اور اس کا ایک سرسری جائزہ اس اقدام کی افادیت کا اندازہ کرنے میں معاون ہوگا

عورتوں کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب مضامین کے اجرا میں یہ سنگ میل ثابت ہوگا۔ موجودہ نظام میں عورتوں کے خاص مضامین عدم توجہی کا شکار ہیں۔ یونیورسٹی بن جانے کے بعد عورتوں کے مضامین کی حیثیت معمولی اہمیت کی نہ ہوگی۔ ان پر مطالعے کئے جا سکیں گے، کتب لکھی جا سکیں گی، نئے مناسب مضامین تشکیل پائیں گے، امتحانات کا معیار ہوگا۔ یہ علیٰحدہ اور تعلیم عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کے رجحان میں اضافہ کا اور ان کو معاشرہ کے لئے ایسے مفید بنانے کا باعث ہوگا۔ عورتوں کو یہ فیصلے کا موقع ملے گا کہ وہ اپنے مزاج و ضروریات سے مناسبت رکھنے والے مضامین میں اعلیٰ درجوں تک ترقی کر سکیں۔ کیونکہ موجودہ صورت حال میں بالعموم خواتین ان خواتین کے مضمونوں میں اختصاصی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتیں۔

جب یونیورسٹی میں عورتوں کے لئے علیٰحدہ اور مفید نصاب تشکیل پائے گا تو لامحالہ اس کے اثرات کالجوں اور سکولوں کی تعلیم پر بھی پڑیں گے، وہ یہاں بھی خواتین مضامین کے جانے میں عام ہو جائیں گے۔ اس کا رجحان بڑھے گا بالخصوص جبکہ ان ہی مضامین میں آگے ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔ اس طرح آہستہ آہستہ عورتوں میں ایک ذہنی انقلاب کی بنیاد پڑے گی اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد عورتوں کا الگ پورا متوازی نظام ہو جائے تو درحقیقت ان کے معاملہ کا یہی حل ہے

عورتوں کو اجتماعی امور کی تربیت دینے کے لئے یہ مناسب جگہ ہوگی اور یہاں ان کو بہترین مواقع ملیں گے۔ مختلف سوسائٹیاں اور ادارے، مختلف شعبوں کی نگرانی وغیرہ ہر چیز آج کے معاملے میں ان کے لئے کھلی رہے گی جو بہتر معاونت اور امکانات کا باعث ہوگی

مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے لئے یہ مؤثر ترین قدم ہوگا۔ آج مخلوط تعلیم کے رواج کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو مخلوط اداروں میں دلائیں۔ یونیورسٹی کے بن جانے پر محض یہ گمان کر لینا کہ تعلیم بھی ہو سکے گی اور پھر اسی تعلیم کی معاشرہ میں مانگ بھی ہو، چند سالوں میں نئے اثرات لائے گی

اس کے علاوہ بھی بہت سے اچھے اثرات بالواسطہ ہماری موجودہ تعلیم پر پڑیں گے۔ طالب علم زیادہ دلچسپی سے پڑھیں گے، اساتذہ زیادہ دلچسپی سے پڑھائیں گے۔ تعارف عصمت مند ہوں گی، فضا اخلاقی اقدار کو خراب کرنے والی نہ ہوگی۔ معیار تعلیم اور طلبہ کا کردار اور اداروں کے نظم و نسق کی صورت حال سب میں بہتری آئے گی۔ آخر میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ موجودہ سہولتوں کو دو الگ مقاصد کے لئے صرف کرنے کے بجائے زیادہ وسیع پیمانے پر اس کی تعلیم کے لئے استعمال کیا جا سکے گا اور یہ قومی معیشت کے نقطۂ نظر سے اشد ضروری ہے

خواتین یونیورسٹی ہمارے لئے بھی ضروری اور اہم اور ہمارے نظریات اور معاشرہ کے لحاظ سے بھی مناسب اور مفید ہے۔ اس کا جائزہ لیا جائے کہ ہم اس سلسلے میں قدم آگے بڑھانے اور دوسروں کے لئے جو بے راہ روی اور مخلوط تعلیم کے ہولناک اثرات سے تنگ آئے ہوئے ہیں کوئی قابل تقلید نمونہ پیش کرتے۔ لیکن ہمارے ہاں تو اس تصور کو ابھی سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ مسز ... اس کا ذکر کرنے والی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان نے اس معاملے میں پہل کی ہے اور وہاں دو خواتین یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف ہمارے لئے شرمندگی کی بات ہے وہیں اس کے قابل عمل ہونے کا ثبوت ہے۔ ان میں سے ایک ایس این ڈی ٹی ویمن یونیورسٹی ٹھاکرسی ہے۔

اس یونیورسٹی کو چار لاکھ روپے کی مالی مدد سے چلایا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس سے چار کالجوں کا الحاق ہوا۔ اس کے پاس ... میں دو ... اور تعلیم۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں

(۱) بھارتی خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیم کا نظام

(۲) یونیورسٹی کے درجے تک آنے سے پہلے مختلف تعلیمی اداروں کے نصاب اور رہنمائی کے کاموں کو ایسی صورت دی جائے کہ وہ خواتین کی مزاجی کیفیت کے معیار پر پورے اتر سکیں۔

(۳) خواتین اساتذہ کو پرائمری اور ثانوی تعلیم دینے کی تربیت کا انتظام کیا جائے

خواتین کی یہ یونیورسٹی بھارتی خواتین کے لئے بہت مفید رہی ہے۔ اس کے نصاب میں وہ مضامین شامل ہیں جن سے نسوانی ذہن کے نشو و ارتقا میں مدد مل رہی ہے۔ بھارتی ریاستوں میں اعلیٰ تعلیم کا خصوصی انتظام ہے۔ یونیورسٹی کے سامنے نئے نئے گوشے اور امکانات تعمیر کرنے کا عزم مصمم ہے

بھارت کی یہ مثال یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ خواتین کی یونیورسٹی قائم کی جا سکتی ہے اور ہمارے ملک میں بھی جلد از جلد قائم ہونی چاہیئے

(۴) خواتین یونیورسٹی ملک کی اہم تعلیمی ضرورت ہے۔ یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ حکومت کو اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہے۔ کم از کم فوری طور پر لاہور اور کراچی میں یہ یونیورسٹیاں ایک دو سال ہی میں قائم کی جا سکتی ہیں اور پھر بعد میں دیگر اہم شہروں میں۔ اگر حکومت اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے تو اسے چاہیئے کہ اس کی سکیم بنانے کے لئے مناسب اور اہل افراد پر مشتمل کوئی کمیٹی بنائے تاکہ اس کا کوئی خاکہ سامنے آئے۔ اور اگر حکومت اپنے فرائض سے پہلو تہی کی پالیسی کو برقرار رکھتی ہے تو پھر کسی پرائیویٹ ادارے کو ہی ذرائع و وسائل جمع کرکے اور ملک کے قابل اور اہم افراد کا تعاون حاصل کرکے اس کی داغ بیل ڈال دینی چاہیے۔ یہ مسئلہ ہمارے دین، تہذیب و تمدن اور ملک و قوم کی سلامتی سے اس طرح براہ راست متعلق ہے کہ اس میں تاخیر مسلسل نقصانات کا باعث ہے

# پاکستانی شہری اور نظامِ تعلیم

پروفیسر عبدالحمید صدیقی
ماہر معاشیات، ماہر تعلیم

صاحب صدر اور معزز حضرات!

عام طور پر کوئی ایسا ملک جو نیا نیا سا کے جیسے ابھرا ہوا ہو اس کے سامنے بلاشبہ یہ عہد مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے فکر و عمل کے کیسے راستے اور عمل کے کیسے سانچے متعین کرے۔ اور اسی طرح ایک نئی قوم کے لیے بھی یہ سوال کافی پریشان کن ہوتا ہے کہ وہ اپنے افراد کو کس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل کرے۔ کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم کے لیے یہ دونوں سوالات شدید اضطراب کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ دونوں سوالات زیادہ کسی پیچیدگی کے حامل نہیں۔ ہم انہیں پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے بہت پہلے طے کر چکے ہیں بلکہ پاکستان انہی پریشانیوں اور اضطرابات کو دور کرنے کے لیے تو معرض وجود میں آیا تھا۔

مسلمانوں کے اندر صدیوں سے یہ احساس موجود چلا آ رہا ہے کہ اُن کی حیات اجتماعی اس جا کے اور عقیدے کے مطابق نہیں جو ہمیں اسلام نے دیا ہے اور جس کے عمل مظاہرات ہمیں سنت رسول اور آثار صحابہ میں ملتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کی کسی انقلاب انگیز تحریک کا جائزہ لیں آپ کو اس کے پیچھے یہی احساس کارفرما نظر آئے گا۔ مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندان ارجمند کے افکار و نظریات، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلویؒ کی تحریک جہاد، دیوبند اور ندوہ کی تعلیمی سرگرمیاں، تحریک خلافت، مولانا شبلی، حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و تصورات، غرض ان سب فکری اور عملی کوششوں میں یہی احساس جاری و ساری نظر آتا ہے بلکہ خود تحریک پاکستان بھی اسی احساس کی مظہر ہے۔

برعظیم ہند کے نہیں شہری دنیا کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ اپنی الگ اور مستقل تہذیب کا شعور رکھتے تھے اور ان اجتماعی عقائد و معاشرتی افکار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جن سے ہندوستانی وطنی تحریک کا مزاج تیار ہوا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مسلمانوں کے لیے اس میں کیا قباحت تھی کہ وہ بھی عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں کی طرح ایک محدود معنی میں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قومیت کا جزو بننے پر راضی ہو جاتے۔ آخر اس میں کیا جبر یا عیب تھی کہ مسلمان اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم و عبادات اور بعض معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے امور ملک کے انصرام و نظم اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں سے پورا پورا اشتراک عمل کر لیتے اور اس ملک کو شوارا نہ ہوتا۔ کانگریس کا استدلال یہی تو تھا کہ جب ہم اپنی مذہبی آزادی برقرار رکھ کر بھی ہندوستانی قومیت میں شامل ہو سکتے ہیں تو پھر مذہبی اساس پر ایک علیحدہ قومیت کا ادعا کیوں کیا جا رہا ہے۔ اس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کر سکتے کیونکہ مذہب ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبدا اور اسی کی اساس ہے۔ ہماری تہذیب میں مذہب صرف ایک عنصر کی حیثیت سے داخل نہیں بلکہ وہی اس تہذیب کا مدار اعلیٰ اور جوہر حیات ہے۔ اس لیے ہم مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، ملکی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طرزِ فکر کے مطابق کام کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو ہمارے مذہبی احساسات و تخیلات سے متاثر نہ ہو۔ یہ جواب بالکل معقول تھا اور اسلام کے مزاج اور تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

حضرات! آپ خود ہی غور فرمائیں کہ جو ملک اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا ہو اور جس کے قیام کا منشائے مقصود ہی اسلامی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو، اس ملک کے باشندوں کے بارے میں اب یہ سوچنا کہ انہیں کس تہذیب و تمدن کا خادم بنایا جائے، کس رخ کی آبیاری کی جائے، یہ متعین کیا جائے کہ کس نصب العین کو اُن کی سرگرمیوں کا ہدف ٹھہرایا جائے اور کس مقصد کے لیے انہیں سرگرم عمل اور متحرک کیا جائے محض ایک لاحاصل ہے۔ ان سارے امور کا فیصلہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اور اسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہم نے جان و مال اور عزت و آبرو کے ناقابل بیان نقصانات برداشت کر کے ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کیا تھا۔

حضرات! پاکستان مسلمانوں کے دینی احساسات کی صحیح عکاسی تصور ہے۔ یہ اُن کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کے عزائم اور ارادوں کا محور اور اُن کی امنگوں اور ولولوں کا مظہر ہے۔ اسے صرف احیائے اسلام کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اسی غرض کے لیے یہاں کے باشندے اس کے تحفظ و بقا کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ پاکستان ایک خطۂ ارضی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ایک انقلاب انگیز تحریک فکر و عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ دین صرف ایک محکمہ اوقاف یا ایک شیخ الاسلام یا ایک وزارت امور دینیہ کے نام تک محدود ہو بلکہ پوری اجتماعی زندگی، سیاست، معیشت، معاشرت، عدالت، قانون، تعلیم، غرض حیات اجتماعی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہو۔

پاکستان کے اس پس منظر اور اس کے ساتھ وابستہ ان جذبات و احساسات کو اگر سامنے رکھا جائے تو پاکستان کے مطلوب شہری کے اوصاف کا تعین کچھ مشکل نہیں رہتا۔ پاکستان کا مطلوب شہری وہی ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا امین اور علمبردار ہو۔ اس ملک کو جس کر دیا ہے جس سے بوقت ضرورت فائدہ اٹھانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، دنیا پر عمل کی دنیا میں اس کی ہدایات اور پابندیوں سے ہر طرح گریز کیا جاتا ہے۔ دورنگی اور تضاد کی اس فضا میں آخر کس طرح نوجوان نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس ماحول میں ہماری جو نوجوان نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں وہ بھی دین کو بس ایک کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ جب کسی مجلس کو گرمانے یا کوئی مؤثر بیان دے کر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی ضرورت پیش آئی تو فوراً اس کو استعمال کر لیا لیکن جہاں انہوں نے کسی معمولی سے معمولی ایثار کا مطالبہ کیا وہاں اس سے اس طرح آنکھیں چرا کر نکل گئے جیسے کہ اُن کا اللہ کے اس دین سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس ماحول میں جو سوسائٹی تشکیل پا رہی ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بڑی کمزور اور بودی ہے۔ آپ خود حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ موجودہ معاشرے میں کتنے

لوگ ایسے ہیں جو اپنا کوئی ضمیر رکھتے ہیں اور پھر اس ضمیر کے مطابق عمل کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ مکر و فریب، ریاکاری، بے اصولی، خوشامد ہماری قومی زندگی کی خصوصیات بن چکی ہیں۔ چند مقدس مستثنیات کو چھوڑ کر ہر فرد جائز و ناجائز طریق سے دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جب انسان چشم تصور میں حالات پر نگاہ ڈالتا ہے تو یوں نظر آتا ہے کہ ضمیر فروشوں کے ٹولے اپنی متاع ایمان کا سودا کرنے کے لیے گاہکوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کوئی بے جان سکوں کے عوض اسے بیچنے کے لیے تیار رہتا ہے، کوئی کسی ادنیٰ عہدے کے لالچ میں اسے فروخت کرنے پر تلا ہوا ہے اور کوئی حکمرانوں کی چشم التفات پر اسے نثار کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ہر شخص نے اپنی جگہ اس مال کی ایک قیمت مقرر کر رکھی ہے اور جب وہ قیمت مل جاتی ہے تو وہ اسے بیچ ڈالتا ہے۔ ایسا معاشرہ نوجوان کو کسی نصب العین کا علمبردار کس طرح بنا سکتا ہے

مقصد کے حاصل کیا گیا تھا اس کے شہریوں کی توجہ لازماً اسی مقصد کے حصول پر مرکوز ہونا چاہیے۔ اسلام کے ساتھ گہری محبت و وابستگی، اس کی سربلندی کا مخلصانہ جذبہ اور اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کی گہری لگن ایک پاکستانی کے امتیازی اوصاف ہونے چاہییں۔ اگر وہ ان مقاصد کو نظر انداز کر کے اور بعض دوسرے مقاصد کے حصول اور بعض دوسرے اوصاف کو اپنانے کے لیے تگ و دو کر رہا ہے تو یہ پاکستان کے اساسی تصور کے خلاف صریح بغاوت ہے

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا موجودہ نظام تعلیم پاکستان کے مطلوب شہری پیدا کر سکتا ہے؟

ظاہر بات ہے کہ موجودہ نظام تعلیم، جو دراصل انگریز کے لیے چند معتمد مطلب کارکن پیدا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا تھا اور جس کے پیش نظر چند ہندوستانیوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنا تھا جو خون کے اعتبار سے تو بلاشبہ ہندوستانی ہوں مگر مذاق، نظر اور جذبات و احساسات کے لحاظ سے خالص فرنگی ہوں، پاکستان کے ان تقاضوں کو کسی اعتبار سے بھی پورا نہیں کر سکتا۔ مروجہ نظام تعلیم میں تعلیم کا مقصد اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ؏

بی اے کیا نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

موجودہ نظام تعلیم نے ہماری نوجوان نسلوں کو اس سے کسی بلند تر مقصد سے آشنا نہیں کیا۔ اس مجلس میں کئی نامور اساتذہ اور ماہرین تعلیم موجود ہیں۔ ان سے دریافت کیجیے تو وہ آپ کو خود بتا دیں گے کہ آج کل کا طالب علم اپنے سامنے کوئی اونچا اور بلند مقصد نہیں رکھتا۔ اس کی تگ و دو کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کسی طرح امتحانات پاس کر لیے جائیں اور پھر ان ڈگریوں کی مدد سے کوئی ایسی ملازمت تلاش کر لی جائے جو اسے اقتدار اور خوشحالی سے بہرہ مند کر دے

اب اگر ہم واقعی اس ملک کی نوجوان نسلوں کو اسلام کا شیدائی بنانے کا عزم رکھتے ہیں تو ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ کام محض نصاب کی ترتیب میں چند معمولی تغیر و تبدل سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس ملک کے حاکم و محکوم اسلام کے معاملے میں یکسو ہوں اور وہ اس منافقانہ طرز عمل کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جائیں جو انہوں نے دین کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت رہی ہے کہ اس نے اپنے دین کی خدمت کے لیے معاشرے کے کمزور طبقوں، چرواہوں، مچھیروں اور غلاموں تک سے کام لیا ہے لیکن منافقوں اور آرام طلب لوگوں سے اس کو ہمیشہ بچایا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آج نہ صرف اس ملک میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دین حق کے ساتھ جو شرمناک مذاق کیا جا رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے نوجوان نسلیں اسلام سے

کس طرح متاثر ہو سکتی ہیں۔ اساس علیٰ دین ملوکہم ایک ایسی ہمہ گیر سچائی ہے جس کی صحت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ جن لوگوں پر اسلامی نظام کے قیام کی براہ راست ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جب وہ خود ہی دین کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں تو نوجوان اسے آخر کس طرح سنجیدگی سے اپنا سکتے ہیں۔ وہ بچارے ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دین کو بازیچۂ اطفال بنتے دیکھتے ہیں۔ ان کے کانوں میں برسر اقتدار طبقوں کی اسلام سے گہری وابستگی اس کے ساتھ گہری عقیدت کی داستانیں پڑتی ہیں۔ وہ ان حضرات کی زبان فیض ترجمان سے آئے دن یہ سنتے رہتے ہیں کہ اسلام ہی ہماری اور پوری نوع انسانی کی مشکلات کا واحد حل ہے اور اسی میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز مضمر ہے۔ یہ باتیں سن سن کر نوجوان نسلوں کے اندر اسلام کے متعلق کچھ اچھے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے انہی لوگوں کا رویہ دنیائے عمل میں دیکھتے ہیں، تو انہیں یہ سبق ملتا ہے کہ اسلام صرف باتیں بنانے کے لیے ہے عمل کے لیے نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کوئی رنگین نعرہ ہے جسے ہماری قوم کے بڑے لوگ اپنے عوام کا دل بہلانے کے لیے اڑایا کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ یہ دین اس قوم کی قوت و طاقت کا سرچشمہ نہیں بلکہ اس کی

حضرات! کسی نصب العین سے ایک انسان کو کس قدر وابستگی اور محبت ہے اس کا اندازہ لگانے کی سہل ترین اور ایک ہی کسوٹی ہے کہ انسان جس مقصد کو اپنانے کا دعویدار ہے اس کے لیے کس حد تک ایثار کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی بنیادی عبادات کو ہی لیجیے جن اسلام اتنی اہمیت دیتا ہے۔ آپ کو ایک بہت قلیل تعداد صحیح معنوں میں ان کی پابند نظر آئے گی۔ اسلام کی اخلاقی اقدار کے متعلق بھی ہمارے ہاں ایک عام لاپروائی بلکہ بغاوت کا رجحان نظر آتا ہے۔ خصوصاً صنعت و تجارت میں معمولی معمولی فوائد کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ جھوٹ اور فریب سے کام نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر میں ہماری چند خوش نصیب افراد ایسے ہوں جو رشوت لینے کے باوجود محض اللہ کے خوف سے اس حرام خوری سے بچنے کی کوشش کرتے ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے اندر جو عام اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہے وہ نوجوانوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ خود دیندار طبقوں کے اندر بھی امور دنیا کے معاملے میں وہ اخلاقی احساس باقی نہیں رہا جو ان کی اسلام سے سچی وابستگی ظاہر کر سکے۔ یہ حضرات زبان سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے لیکن عمل میدان میں اسلام ان کے نزدیک ایک خالص روحانی فلسفہ ہے جس کا انسان کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے دیندار طبقوں کا یہ رویہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اسلام زندگی کی عادت اولیٰ نہیں بلکہ حیات انسانی کے متعدد شعبوں میں صرف ایک شعبہ ہے جس کا زندگی کے دوسرے گوشوں سے کوئی گہرا تعلق نہیں۔

جس معاشرے میں بنیادی مقصد حیات کے ساتھ عوام کی وابستگی کے یہ انداز ہوں اس معاشرے کی نوجوان نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنانا حکایت قصہ و سلف سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ایک بچے کو ماحول سے الگ کر کے کس طرح تربیت دی جا سکتی ہے وہ قدم قدم پر اسلام کے بارے میں دورنگی اور منافقت کے رُوح فرسا مناظر دیکھتا ہے اور بالآخر یہ نقش خود بخود اس کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے کہ کسی زمانے میں کوئی اچھوتا نظریہ فکر و عمل ہو تو ہو لیکن دور جدید میں یہ ہر لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ اب اس کی اگر کوئی افادیت ہے تو صرف اسی قدر کہ بوقت ضرورت اس کا نام لیکر عوام کو بہکایا جائے یا اس سے کبھی کبھی اپنے روحانی احساس کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا جائے

جب ان احساسات کے ساتھ کسی درسگاہ کا رخ کرتا ہے تو وہاں کا ماحول انہیں مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ تعلیم گاہ کی پوری فضا میں اسلام سے گریز کے واضح رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اساتذہ کے لباس، بول چال، چال ڈھال، اخلاق و اعمال ان کا مجموعہ ...

- وائس چانسلر کی ذمہ داریوں کے دوران میں آپ کو یہاں تعلیمی ماحول پیدا کرنے، سیاسی مداخلت ختم کرنے کے لیے کون سے تلخ و شیریں مرحلوں سے گزرنا پڑا؟
- آپ کی کوئی ایسی آرزو ہے کہ جسے آپ نافذ کرنا چاہتے تھے، مگر وہ ادھوری ہی رہ گئی؟

# پروفیسر شیخ امتیاز علی

**انٹرویو**

سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی
حال پرنسپل یونیورسٹی لاء کالج

وائس چانسلر کی ذمہ داری جب سنبھالی اس وقت یونیورسٹی شدید بحران کا شکار تھی۔ حالات حد سے خراب تر ہو رہے تھے، طلبہ اور انتظامیہ کے لئے تکالیف بے شمار تھیں۔ ان حالات کو بہتر بنانے کے بارے میں سوچتے ہی ذہن ماؤف ہو جاتا، میں نے آتے ہی تہیہ کیا کہ سب سے بڑا اور پہلا کام یہ ہو گا کہ حالات کو مزید خراب ہونے سے روکا جائے۔ اگر جامعہ کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی تو پھر برائی، ایبوں کا خاتمہ قدرے آسان ہو جائے گا!

پہلے چھ ماہ میں نے محسوس کیا کہ یونیورسٹی کے ہر وائس چانسلر کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، مرحلہ بہ مرحلہ، ہر ہر ادارہ میں یہ دباؤ کی انتہا کر دیا جاتا ہے بنیادی طور پر سمجھا جاتا ہے تاکہ معاملہ بنے یا بیرونی کے سامنے سرنڈر ہو جائے۔ علاوہ ازیں حکومتی سیاسی مداخلت اور اقربا پروری راستے میں ایک خطرناک کھائی کی صورت سامنے آتی جس کی ایک جانب طلبہ پارٹی اور دوسری جانب اندھی کھائی ہے۔ سیاسی لیڈروں کی بات نہ ماننے کے نتیجے میں اصول یہ بن چکا تھا کہ ——— اور مجھے اس کھائی میں جا گرا، اور اگر خیریت چاہتے ہو تو پھر "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی ———"

میں نے وائس چانسلری کا چارج سنبھالتے ہی یہ طے کیا کہ حالات کے بحران کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ اس صورت حال میں دریا کا نام موت ہے اور تماشائی بنے رہنے کا مطلب اس مقدس درس گاہ کی تباہی ——— اس لئے ضروری ہے کہ جارحانہ رویہ اختیار کیا جائے ——— ان تمام خرابیوں کے خلاف رہا، چاروں طرف آگ کی سی کیفیت میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ EVENTS وائس چانسلر کو کنٹرول کیا کرتے ہیں۔ اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے دراصل اسی بات کے لئے تیاری کی کہ "EVENTS SHOULD NOT CONTROL ME, BUT I SHOULD CONTROLE EVENTS" (حالات مجھے نہیں بلکہ میں حالات کو کنٹرول کروں گا)

اسی سوچ کے دنوں میں ابھی طلباء ریلیاں ہی تھا کہ میرے گھر پر ایک سرد صبح طلبہ نے حملہ کر دیا اور یہ حملہ بھی دراصل میری ابتدائی پالیسیوں کے خلاف ایک شدید ردعمل کی صورت میں رونما ہوا، جس پر میں نے محسوس کیا اور سوچا کہ یہ حملہ کسی فرد یا گروہ کا ذاتی فعل نہیں، بلکہ ان حالات کا ایک فطری منطقی نتیجہ ہے، جن میں جامعہ چل رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً پیشہ ور طلبہ ہیں، جو گزشتہ دس دس سالوں سے جامعہ میں پڑے ہیں، ان سے نمٹنے کے لئے ضابطوں کا اعلان کیا، اور ان ہی میں سے انہیں یونیورسٹی سے نکالا۔ تمام طویل المیعاد مصروفیت ختم کرتے ہوئے داخلہ پالیسی نافذ کی ——— وہی داخلہ پالیسی جو ابھی تک رو بہ عمل ہے ——— اس داخلہ پالیسی کا بڑا مقصد غیر طالب علمانہ رجحان رکھنے والوں کا خاتمہ اور جامعہ میں تعلیمی ماحول کی آبیاری تھا ——— اس پالیسی کو طلبہ کی یونین نے بھی قبول کیا اور طلبہ کی بڑی تعداد دلی طور پر خوش ہوئی ——— کچھ اساتذہ نے اسے ناکام بنانے کے لئے منصوبے بنائے مگر ان کے منصوبے [illegible] ناکام ہو گئے ———!

یونیورسٹی میں یہ ذمہ داری سنبھالتے ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہاں کچھ عجیب و غریب لازوال حقیقتیں ہیں، ہوا یہ ہے کہ یہاں شاید کسی حد تک رکھی تھیں، لیکن عام طالب علم کے لئے نہ رہی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ یونیورسٹی ہاسٹلز علاوہ غیر طلبہ کے جاتے، جہاں پر قانون کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی اور یہی تھی جامعہ کی ——— ، حکومتی مداخلت و سیاست بازی کے سبب کرپشن عام ہوئے تھے، کمروں پر زبردستی قبضہ کرنا، اور سارا سال واجبات تک ادا نہ کرنا معمول تھا۔ اس مخصوص لاقانونیت کی صفائی کے بغیر جامعہ کا ایک بھی مثبت قدم اٹھانا ممکن نہ تھا

لیکن ایک مرتبہ ہیں ہمات مرتبہ تمام تعلیم بند یاں توڑ دیں، اور خود تمام تر کاروائیوں کی نگرانی کی، نتیجہ طلباء میں آزاد خیالی، اسٹوڈنٹ یونین، اور سیمینٹ اور سینیٹ قائم کرنے کا تصور مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ـــــ اور "قانون جامعہ میں سینٹ کے طور پر سر کے مقابلہ پر قانون سب سے بالاتر ہے" کا علم لہرا دیا گیا ـــــ ا

یونیورسٹی میں پھر اس سے یہ کہ اٹھارھویں گریڈ تک تقرریوں کے بارے میں یہ بات "مساوی اصول" کی طرح رونما ہوئی کہ تمام تر تقرریاں سیاسی دباؤ، حکومتی مداخلت کے نتیجے میں ہوں اور اس قسم کا خلاف اصول و اخلاق روش کو بڑی حد تک کنٹرول کیا ا ور یہ بات تمام اسٹاف پر واضح ہو گئی کہ اب یونیورسٹی کی قسمت کے فیصلے یونیورسٹی انتظامیہ ہی کرے گی

اگلا اقدام یہ کیا کہ یونیورسٹی میں پہلی بار سمسٹر سسٹم نافذ کیا جس سے طلباء میں فراغت کا تصور ختم ہوا، اور ہر ہر لمحہ ان کے لئے قیمتی بن گیا مطالعہ مستقلاً شروع ہوا، سیاسی ہنگاموں میں بھی ہوا آغاز میں اساتذہ کی ایک تعداد نے مخالفت کی، مگر میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ داخلہ کی سیٹیں کم کر دیں تاکہ اساتذہ زیادہ بہتر طریقے کو کام کر دیں، تاکہ اس سسٹم کو متعارف اور رائج کرا یں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین سے پوری طرح معاونت کی۔

سمسٹر کی کامیابی اور طلبہ کی سہولت کے لئے، وڈ کاپنگ مشین کی خریداری، تیکھوں کی تنصیب، وظائف میں اضافہ، ہڑتالوں اور ہنگاموں پر کنٹرول کیا ـــــ نظرے سمسٹر میں نمبروں کے استعمال کا جائزہ لینے کے لئے کمیٹی بنائی، اس سلسلے میں کوئی اپیل نہ آئی جس کا مطلب ہے کہ طلبہ اور اساتذہ نے اپنے کو ماحول میں ستر فیصد پر سیٹ کیا تھا ـــــ

ایک اور کام جو ہمیشہ ناگوار یادوں کے طور پر کھلا تا ہے وہ ہے جعلی ڈگریوں کے دھندے پر قابو پانا اس سلسلے میں ۱۹۹۳ کو میں آیا اور ۱۹۹۵ء کو رام سیما کے قریب اور ۱۹۹۶ء کو ۱۲ کے قریب چھاپے مارے، اور قومی مجرموں کو رنگے ہاتھوں جعلی مہروں، ڈگریوں سمیت پکڑ لیا

۱۹۹۸ میں بی، اے کے امتحانات کے آغاز ہی میں اس دور دھاندلیاں شروع ہوئیں، اور نقل کا کچھ یوں مظاہرہ ہوا کہ بظاہر صورت حال بے قابو نظر آتی تھی، مگر خدا کے فضل سے منصوبہ بندی کی گئی، کہ دوران پرچہ جات ہی امتحانات ملتوی کر دیئے تمام سنٹر توڑ دیئے اور نئے سرے سے امتحانی مراکز قائم کئے، امتحانی مراکز پہلی مرتبہ محض لاہور کی حد تک تیرہ پولیس کے تھانوں کے زیر نگرانی کے ان رجحانات کو ختم کیا جائے، جو ایک طویل قومی تضاد کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے ـــــ آپ اندازہ لگائیں کہ امتحانی عملہ اس قدر بے بس ہو چکا تھا کہ سردار ۱۰ سال صاحب جیسا یہ مارے گئے، فرائض منصبی میں دلیری کا سامنا کرنا پڑا تب تو احمر سے علمی حکمت کے ساتھ گرفت مضبوط بنائی، اور سیاسی و سرونی مداخلت کے سلسلے میں بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بند باندھنے میں حامی وقتی مشکلات پیش آئیں، مگر خدا کا شکر کہ وہ سیلاب اگر پوری طرح ختم نہ ہوا تو کم از کم اس کی شدت بڑا میٹھا ـــــ ۱۱

(۴)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے !

ایک بنیادی اصول یاد رکھئے کہ کسی اہم عہدے پر متمکن ہونے کی خواہش دل میں رکھئے، اور نہ اس کا اظہار کیجئے کیونکہ یہ بہت بڑا امتحان ہوتا ہے، اور جب فطری عمل کے نتیجے میں وہ آپ پر آن ہی پڑے تو پھر "ادھر ادھر" کی مجبوریوں سے بے نیاز ہو کر اس ادارے کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ خلوص کے ساتھ کام کیجئے بگاڑ کی راہوں کو مسدود کیجئے۔

مجھے یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے چھتیس سال گزر گئے تھے کہ مجھ کو وائس چانسلر بنایا جانا ہے، میں نے عمداً اس سے انکار کیا، مگر کہا گیا نہیں اب تم ہی وائس چانسلر ہو گے۔

پھر اللہ کے بھروسے پر اپنی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے، اس جامعہ کو جس سے مجھے پیار ہے، زیادہ بہتر بنانے کے لئے جو کچھ بس میں تھا، کرنے کی کوشش کی انسان کو اپنی کوشش کرنی چاہیئے ـــــ اس میں برکت اور مقبولیت سراسر اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے ـ میں نے تمام تر عرصہ ایک اصول اپنائے رکھا کہ طلبہ کے ساتھ والد کا رویہ رکھا جائے ـــ جو اس کے مفاد میں ہے، یا نقصان میں، اس کی حد تک پروا کئے بغیر ملامت کا سنت اسے بتلا دو ـ

مسلسل پراپیگنڈہ کے خوف سے اچھے کام نہ کرنا سب سے بڑی بزدلی ہے، یہی وجہ ہے، اس دوران میں جہاں عمل کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے محظوظ ہوا، وہیں مخالفتوں کی لو بھی تلخیاں کم کرتی رہی ـ یہی بات کہ اس سب ناگوار یادوں کے ساتھ اصولوں اور انتظامی فیصلوں کے نفاذ میں حائل رکاوٹوں کے پہاڑ سر کرتا، اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا ہے مجھے اطمینان ہے، اگر میں نے یونیورسٹی کا ماحول اور وقار بلند نہیں کیا تو کم از کم گرتے ہوئے معیار کے آگے کو ٹھہرا ضرور دیا !

---

### بقیہ نصابی جائزے

ان سے سامی و صاحبوں کی بنیاد قرآن و حدیث کے صحیح استدلال پر قائم ہونی چاہیئے اور اقوام عالم کی تاریخ بھی خارج قرآن سے بحث کی ہے اسی کو تاریخ سازی کا معیار بنایا جانا چاہیئے

## ۴ ـ ریاضیات

ریاضیات احساب جیومیٹری، الجبرا، کا جس عملی زندگی کی روزمرہ کی ضروریات کے پیش نظر مڈل کے نصاب میں لیا ہے حتیٰ جو کہ ابتدائی تعلیم میں سے بنیادی ریاضی کو ملحوظ کرایا جا سکے، طالب علم پر بار و بار پڑے، لیکن ایک حد تک اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ریاضی کی تعلیم بچے کے ذہنی ارتقاء کو حسب کرے اور اسے راست فکری (STRAIGHT THINKING) کا سر سکھائے سرمایہ کاری کے حسابات کاروباری حسابات اور دفتری حسابات ابتدائی حد تک طالب علم کے علم میں آجانے چاہئیں، ریاضی کے نصاب میں حسب ذیل تبدیلیاں فوری طور پر کی جانی چاہئیں '

ا ـ سود اور کلو و ماد کے ان پہلوؤں سے متعلق رکھنے والے حصے خارج از نصاب کر دے جائیں جن کو اسلام نے ہر مسلم کے لیے حرام ٹھہرایا ہے، لیکن جب تک ہمارے معاشرے میں سود بالکل ختم نہیں ہوتا اور اس سلسلے کے حسابات کی تعلیم دینا ضروری ہے تو سوالات کو اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ سود کی حرمت واضح ہو اور طلبہ میں اس کے لیے ایک نفرت اُبھر آئے

ب سوالات کی عبارت میں اس کا خاص طور پر اہتمام ہو کہ طالب علم کو دینی حقائق و احساسات کے قریب لایا جائے خصوصاً کاروباری مسائل سے تعلق رکھنے والے سوالات میں اسلام نے کاروبار کے جو اصول و احکام دیے ہیں ان کا تعارف ہو جانا چاہیئے

ج ـ زکوٰۃ، عشر اور تقسیم وراثت کی پوری ریاضی دینی اصلاحات کے ساتھ مرتب کر کے مڈل کے اندر اندر سکھا دینا لازم ہے

د ـ ہر سہ حسابات کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ کر اس سے تعلق رکھنے والے احکام شرعیہ بیان کر دیا جائے تاکہ طالب علم عملی زندگی میں ان احکام کے اتباع کے قابل ہو جائے

ایم اے ملک صاحب کا شمار دنیا کے مشہور و معروف ماہرین دست شناس میں ہوتا ہے، وہ نہ صرف اس فن میں ہاتھ کے بارے میں عالمگیر شہرت رکھتے ہیں، اس علم کی جدید سائنسی توجیہات کے سلسلے میں ایک منفرد مقام ملے ہیں اور صف اوّل کے رہبروں (PIONEERS) میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے لاکھوں ہاتھوں کا مطالعہ کیا ہے، جن میں ایک عام آدمی سے لے کر شہرہ آفاق لیڈر، سائنسدان، وکیل اور دانشور شامل ہیں۔ ان کی کتابیں "ہاتھ کی زبان" اور "ہاتھ کی لکیریں" دنیا بھر میں اپنی جامعیت کے اعتبار سے ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ملک صاحب ایک ماہر دست شناس ہی نہیں بلکہ نفسیات اور عمرانیات کے انتہائی تجربہ کار اور قابل استاد ہیں۔ اس ملک میں انہوں نے انفرادی معالجہ (CASE WORK) کی نئی سائنسی بنیادوں کی راہ ہموار کی ہے، اور سینکڑوں لوگوں کے لیے "خضر راہ" کا ذریعہ بنے ہیں۔ ان کی کتاب "زندگی کے جذباتی مسائل" حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں میں ابھرنے والے جذباتی طوفانوں اور ان کے اثرات کا بھرپور مشاہدہ اور تجزیہ ہے۔ ملک صاحب ان باتوں کے ساتھ ساتھ صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ بیان میں ان کا اپنا اسلوب اور چاشنی ہے لفظوں سے خوب کھیلتے ہیں کہ زبان کی بالی ہے۔ وہ اس میں ہوں یا محفل میں زندگی کی تلخ اور کڑی دھوپ سے بھری شاہراہوں پر خوبصورت لفظوں کے سائے دراز کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے وہ سکوت ساحل ہیں۔ بڑے بڑے طوفانوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور ان پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ پژمردہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو دلاسہ دیتے ہیں، امید بندھاتے ہیں، مایوسی کے صحراؤں میں بھٹکتے ہوئے لوگوں کو نخلستانوں کا پتہ دیتے ہیں۔ نوجوان جو زندگی کے بارے میں امیدوں اور تمناؤں سے پُر ہوتے ہیں ملک صاحب سے ہزاروں قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ نئی نسل کے رجحانات کا اندازہ لگانے کے لیے ملک صاحب کی خدمات حاصل کی جائیں کہ وہ رمز آشنا ہیں، موجودہ نسل کے رنگ ڈھنگ سے واقف ہیں بہت سے ایسے گرہ ہائے زندگی جانتے ہیں، جس سے ہم اور آپ سب دوچار ہیں۔ آئیے برادرم اور یا مقبول، برادرم جاوید اقبال رانا اور مدیر اعلیٰ "محور" بحیثیت نمائندگان نئی نسل ـــ جناب ایم اے ملک کے روبرو ہیں۔

ادارہ ـــــــ

عالمی شہرت یافتہ ماہر دست شناس
پروفیسر ایم۔ اے ملک سے

# نئی نسل نے کیا پُوچھا؟

**محور:** آپ کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ دست شناسی کے ساتھ ۴۵ برس کی عملی وابستگی کے دوران آپ نے کم و بیش ایک لاکھ سے زائد انسانی ہاتھوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ آپ کے علم اور تجربے سے استفادہ کرنے والوں کی اکثریت کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے؟

**ملک صاحب:** کوئی باقاعدہ ریکارڈ تو اس ضمن میں میرے پاس نہیں ہے، تاہم میرا محتاط اندازہ ہے کہ مجھ سے مشورہ کرنے والوں کی زیادہ تعداد نوجوان نسل پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ متوسط عمر کے لوگ بھی کثرت سے آتے ہیں، لیکن دست شناسی سے میرے طویل عملی رابطے اور تحقیق کے دوران میں مشاہدہ ہے کہ نئی نسل ہی کریں سے اس علم کی طرف زیادہ رجوع کرتی ہے۔

**محور:** آپ کا یہ بیان ہمارے ذہن میں لاتعداد سوالات کو جنم دیتا ہے ایک سوال جو الجھن بن کر ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد کا دست شناسی کی طرف یہ رجوع کہیں ان کے توہم پرست اور تقدیر پرست ہونے کا اظہار تو نہیں، دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو یہ بڑی تشویشناک بات ہے جس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے نوجوان جدوجہد اور کشمکش حیات سے

وراثت کا رجحان رکھتے ہیں؟

**ملک صاحب:** اگر آپ دست شناسی کو توہم پرستی کے مترادف تصور کرتے ہیں تو آپ کا یہ تاثر درست ہے۔ لیکن دست شناسی کے بارے میں میرا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ میں اس علم کی عملی اور علمی بنیادوں کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔ میں نے اسے ادبی علوم کی صف میں شمار کرنے کے بجائے باقاعدہ ایک سائنس سمجھا اور میرا طریق کار اس علم کے حصول میں تحقیقی رہا ہے، اعتقادی نہیں۔ میں نے کم و بیش ایک لاکھ انسانی ہاتھوں پر تجربات کیے ہیں۔ میں دست شناسی کو پیشے کی حیثیت سے نہیں، ریسرچ سکالر کی حیثیت سے ... میں اسے سائنٹفک نتائج کو برسوں سے ملکی اخبار و رسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ سے مسلسل پیش کر رہا ہوں۔ دست شناسی پر اپنی معروف عام کتاب "ہاتھ کی زبان" میں بھی میں نے اس علم کی سائنسی حیثیت کی طرف اہل علم حضرات کو توجہ دلائی ہے۔ پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں سے کہتا ہوں کہ مجھ سے ملنے والے زیادہ تر لوگ توہم پرست نہیں ہوتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عام دست شناسوں کے پاس کس ذہن یا مقصد سے لوگ کن اغراض و مقاصد کو لے کر جاتے ہیں۔ البتہ جہاں تک میرے اپنے تجربے کا تعلق ہے اس میں چار اقسام (CATEGORIES) کے لوگ پائے گئے ہیں

(۱) جو محض اپنے ذوق تجسس کی تسکین چاہتے ہیں کہ آیا اس علم کی کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں

(۲) جو چند مسلسل ناکامیاں دیکھ کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کوئی خلل بھی ہے۔ تقدیر پرستی نہیں، نفسیاتی سہارے کی تلاش ہے۔

(۳) جو اپنے سامنے چند مقاصد اور عزائم رکھتے ہیں اور انہیں اپنی ذات پر بے پناہ اعتماد ہے، لیکن وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ عظیم مقاصد جو وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہیں ان کے حصول کے امکانات کیا ہیں، صلاحیتوں کی سمت کیا ہے اور عزائم کے ساتھ ان کی مطابقت کی صورت کیا ہے۔ انہیں دست شناسی میں اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھنے اور اپنی منزل متعین کرنے میں کچھ اشارے ملنے کی توقع ہوتی ہے اور دست شناس کی طرف سے کچھ یقین دہانی (RE-ASSURANCE) کی بھی

(۴) جو مسائل کے بھنور میں کچھ اس طرح پھنس چکے ہوتے ہیں کہ متبادل راہ نجات کی عدم موجودگی میں دست شناس سے مشاورت و رہنمائی چاہتے ہیں

ان چاروں اقسام پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو اس حقیقت کا ادراک حاصل ہوگا کہ دست شناسی سے نوجوانوں کی وابستگی کے محرکات تقدیر پرستانہ نہیں، بلکہ نفسیاتی الجھنیں انہیں سمجھنے کے لیے ... نسل کا ذہنی تحریک ہوگا جو عدم اطمینان پیش کیا جاتا ہے۔ ویسے اثنا میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ دست شناسی کے سائنسی پہلو سے دلچسپی کا اظہار کچھ ایسی معتبر شخصیتوں کی طرف سے بھی رہا ہے جنہیں بہرحال آپ توہم پرست قرار نہیں دے سکتے۔ آپ ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر محمد اسلام الدین ... جیسے دانشور، ادیب، صحافی، ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسدان شامل ہیں جن کی عقلی اور علمی حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ بعض غیر ملکی دست شناس مائیکل ... چرچل، آسکر وائلڈ، آئن سٹائن، نہرو، گاندھی جیسے عظیم انسانوں کے ہاتھوں کے نقوش حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ہاتھوں کے نقوش خود میرے پاس موجود ہیں۔ ... قابل قدر ... ہیں

**محمود:** بلاشبہ آپ کے یہ تاثرات فکر انگیز ہیں لیکن میرا سوال ... نئی نسل کی طرف ہے۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جب ایک دست شناس آپ سے ... نسل کے ذہن میں ... کیوں ... کیا اس کی بنیادی وجہ معاشی عدم اطمینان تو نہیں؟

**ملک صاحب:** بادی النظر میں تو بات درست معلوم ہوتی ہے کہ نوجوانوں کی پریشانیوں کا تعلق ان کے معاشی حالات سے ہے اور بالخصوص ان میں سے بیشتر اپنے معاش اور کیریئر (CAREER) کے بارے میں متفکر بھی ہوتے ہیں لیکن جس طرح معاش ہی انسانی زندگی کا مسئلہ نہیں اسی طرح نوجوانوں کے مسائل کو معاش تک محدود کر دینا ان کے مسائل کا سطحی تجزیہ ہے۔ معاش کے سوا بھی ان کی زندگی میں کچھ اور دکھ بھی ہیں جن کا اظہار ان کے سوالات کے انتخاب سے ہوتا ہے جیسے غالب نے کہا ہے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تعلیم، کیریئر، بیرون ملک سفر کے امکانات کے بارے میں تو وہ سوالات کرتے ہی ہیں، لیکن ان نوجوانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے لیے اپنی جنسی، جذباتی، رومانوی اور معاشرتی زندگی کے مسائل ہی اصل حیات ہیں

ابھی تو ایک بزرگ اپنے نوجوان فرزند کو ہمراہ لائے اور وہ اس کے کیریئر کے بارے میں جاننے کے لیے مضطرب تھے۔ جہاں تک ممکن ہوا میں نے اس بارے میں ان کی راہنمائی کی۔ اس کے بعد باپ بیٹا مطمئن ہو کر رخصت ہوئے۔ لیکن برخوردار اگلے روز پھر مجھ سے ملاقات کے خواہشمند ہوئے اور کہا کہ ... پھر کہا کہ آپ نے جو کچھ بتایا وہ تو والد صاحب کے سوالوں کا جواب تھا لیکن ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکیں گے کہ میرے والد میری شادی وہاں کریں گے جہاں میں چاہتا ہوں

رازداری کے اصول کی پاسداری ایک دیانت دار دست شناس کی بنیادی ضرورت ہے اور اس پر میں ہمیشہ سختی سے کاربند رہا ہوں۔ تاہم اکثر انکشافات اور اعترافات حیرت انگیز ہوتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی، ذہنی اور نفسیاتی الجھنیں، اعصابی امراض، تنہائی کا احساس، لاشعوری خوف، غیر اخلاقی افکار، کمتری کے احساسات، خودکشی کے رجحانات، زندگی سے فرار کے میلانات، گھر کا ماحول اور نوجوانوں کی داخلی زندگی کے عوامل ... میں ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ... میں نہیں آتا

**محمود:** یہ بات ساری گھر سے متعلق ہے۔ ان مسائل میں اصلاح، رہنمائی اور مشاورت کے لیے دست شناسی ہی کا انتخاب کیوں؟ کسی اور طرف رجوع کیوں نہیں؟

**ملک صاحب:** اس سوال کے جواب کا آغاز میں ایک سوال ہی سے کرنا چاہتا ہوں کہ رہنمائی و مشاورت کے کون سے متبادل ادارے ہمارے ہاں موجود ہیں؟ ... موجود ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کا پیشہ ور دست شناسوں، ... تحریروں اور عملی ... کی طرف رجوع کا امر مجبوری بھی ہے۔ لیکن ایک وجہ میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ دست شناس کو اپنے مخصوص علم کی بدولت معاشرے میں ایک منفرد مقام حاصل ہے ... نوجوانوں کو کسی نفسیاتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دست شناسی کی پراسرار گہرائی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ دست شناس کے مشورے ان کے لیے انتہائی ترغیب انگیز (SUGGESTIVE) ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی سرعت اور آمادگی سے دست شناس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں اور اس کے مشوروں کو فوری قبولیت (ACCEPTANCE) دینے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ ... یہ ہے کہ رہنمائی و مشاورت کے مراکز اداروں کی عدم موجودگی نے نوجوانوں کا رجحان دست شناسوں کی جانب کر دیا ہے۔ اب اگر دست شناس چاہے تو انہیں ایکسپلائٹ کر سکتا ہے اور چاہے تو انہیں تعمیری راستے پر ڈال سکتا ہے۔ بہرحال میری طرف نوجوانوں کا رجحان ...

ست شناسی کی سائنسی تعبیر اور علم حیات و عمرانیات کے معلم ہونے کی حیثیت سے کی ہے۔

**محور** | عمرانی علوم اور نفسیات کے ایک استاد کی حیثیت سے آپ نوجوانوں کے ان متعلقہ ہوئے مسائل کا کیا تجزیہ کرتے ہیں؟

**ملک صاحب** | میرا تجربہ یہ ہے کہ معاشرے میں دن بدن استاد، والدین اور نئی نسل کے درمیان شدید بُعد پیدا ہوتا جا رہا ہے، فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں، تعلقات کی اہمیت اور یگانگی کی دیواریں حائل ہوتی جا رہی ہیں فریقین کے درمیان ذہنی اور روحانی رابطہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اُدھر معاشرے میں تمام ذرائع ابلاغ سے ایک ہیجان خیز اور ہنگامہ پرور فضا پیدا کی جا رہی ہے، اور مشکل یہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کہ رہنمائی اور مشاورت مہیا کرنے والے اداروں کا زبردست فقدان پورے ملک میں کوئی ادارہ موجود نہیں جہاں نوجوان دلی کیفیات کا اظہار اور راستے ڈھونڈتے ناسوروں کا مداوا تلاش کر سکیں گھٹن کی اس ماحول میں ان کی رسائی ایسی ہی قسم کے ہم عمر نوجوانوں تک ہوتی ہے جو ترقی کو مزید ہیجانی الجھنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بنتے ہیں ہمارے سکولوں اور کالجوں میں رہنمائی و مشاورت کے کلینکوں (CLINICS) کا جال بچھ جانا چاہیئے، بصورت دیگر یہ سائنسی نظر سے حال دست شناسوں کی طرف نوجوانوں کا رجوع فطری ہے۔

**محور** | مشاورت و رہنمائی کے اس پروگرام میں علم دست شناسی بھی کوئی رول ادا کر سکتی ہے؟

**ملک صاحب** | یہ علم مسائل کی تشخیص کا کام دے سکتا ہے، اُن کا حل تجویز نہیں کرتا اس کی حیثیت سٹیتھسکوپ کی طرح ایک آلۂ تشخیص کی سی ہے، جس سے کسی مرض کی نشاندہی تو ممکن ہے، لیکن علاج نہیں ۔۔۔ البتہ دست شناس جو عمرانی و نفسیاتی علوم سے بہرہ ور ہو اور سائنسی مزاج رکھتا ہو، انسانی مسائل پر بھی اس کی نظر ہو وہ رہنمائی و مشاورت کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک نوجوان لڑکی کا واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے جسے اس کی والدہ اس کی کسی مخصوص ذہنی کیفیت کی بنا پر میرے پاس لائیں اس کے ہاتھ کی لکیروں کی مخصوص ساخت اور ظاہری حرکات و سکنات اس کی کسی گہری ذہنی پریشانی کی آئینہ دار تھیں جس کا اظہار اس کے لئے ماں کی موجودگی میں انتہائی مشکل تھا میں نے الجھن کو حل کرتے ہوئے اس کی والدہ سے درخواست کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جائیں، مختصراً اور واضح سی بات یہ تھی کہ لڑکی اپنی مخصوص کی بنا پر کسی پوشیدہ مسئلے سے دوچار ہو چکی تھی جس کے نتائج کے تصور سے وہ سخت خوفزدہ تھی اور اظہار بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر میں نے لڑکی کی والدہ کو اعتماد میں لیا، اور اسے حقیقی صورت حال سے آگاہ کیا، جس سے وہ مسئلہ جو کہ ایک شدید جذباتی المیہ کا سبب بن سکتا تھا، بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور شادی وہاں ہوئی جہاں لڑکی چاہتی تھی

بالعموم دست شناس کسی فرد کی زندگی کی درج ذیل خدمات سرانجام دے سکتا ہے:

(۱) اس کے فطری رجحانات اور پیدائشی صلاحیتوں کی جانچ پرکھ۔

(۲) ذہنی اور جسمانی امراض و مسائل کی تشخیص۔

(۳) ماضی و حال کے واقعات کی تعبیر اور آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر۔

**محور** | مذکورہ بالا خاتون کے واقعہ کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا آپ نے نئی نسل کی لڑکیوں کے مسائل کو لڑکوں کے مسائل سے مختلف پایا ہے؟

**ملک صاحب** | بعض مسائل دونوں اصناف کے مشترک ہیں، اور بعض مختلف، کیونکہ دونوں کو پاکستانی معاشرے کا جزو ہونے کی حیثیت سے یکساں قسم کے معاشرتی و معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ بہرحال صنفی اختلاف مسائل کے اختلاف کی عکاسی بھی کرتا ہے، مثلاً لڑکیوں کے لئے ان کی ازدواجی حیثیت ان کے کیریئر سے زیادہ معاشرے میں ان کا مقام متعین کرتی ہے، شادی اور کیریئر کے درمیان کشمکش دونوں میں کسی ایک کا انتخاب، گھر سے باہر دفتروں میں ملازمت، معیاری رہن سہن کا حصول، شائستہ پسندی، حقائق سے فرار، آزادی کے نئے رجحانات کا غیر مناسب استعمال قدروں کا تصادم ــــــــ یہ چند ایک ان کے مخصوص مسائل ہیں، آج سے بیس برس قبل کی لڑکیاں شرم و حجاب کا مجسمہ تھیں لیکن آج اپنی ازدواجی زندگی اور دیگر تعلقات کے بارے میں بے باکی سے گفتگو کرتی ہیں، اس سے بدلتے ہوئے معاشرتی ڈھانچہ کا احساس ہوتا ہے

**محور** | "ہاتھ کی زبان" میں ایک مضمون "دیکھن کی اوٹ میں" آپ نے تحریر کیا ہے "مارک ہے ہاتھوں کا ذکر آتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں" کیا آپ اب بھی اسی COMPLEX میں مبتلا ہیں؟

**ملک صاحب** | یہ COMPLEX کی بات نہیں معاشرتی مجبوری کا اظہار ہے، اور دست شناس کے لئے "گریم مشکل" کا معاملہ ہے

**محور** | آپ نے اس علم کی سائنسی حیثیت کا ذکر بار بار کیا ہے، اس کے لئے آپ کے پاس عقلی استدلال کیا ہے؟

**ملک صاحب** | عقلی استدلال یہ ہے کہ علم دست شناسی پر سائنسی طریق کار کا اطلاق ممکن ہے، اس کے مطابق کسی مظہر فطرت (PHENOMENON) پر تحقیق کا آغاز ہمیشہ چند ابتدائی غیر مربوط اور نامکمل مشاہدات (OBSERVATIONS) سے ہوتا ہے ان کی بنا پر ہمارے ذہن میں کوئی مفروضہ (HYPOTHESIS) جنم لیتا ہے، اس مفروضے کی تصدیق یا تردید کے لئے کسی مرکز تحقیق (UNIVERSE) کا انتخاب کیا جاتا ہے، جہاں سے مسلسل و مربوط حقائق و شواہد (FACTUAL DATA) اکٹھے کئے جاتے ہیں، بعد ازاں ان کا تجزیہ و تعبیر (ANALYSIS AND INTERPRETATION) کی جاتی ہے، اگر حقائق و شواہد کی اکثریت سے مفروضہ کی تردید ہوتی ہے تو علم باطل ٹھہرتا ہے، اور اگر ان کی واضح اکثریت مفروضے کی تصدیق کرتی ہے تو وہ علم سچا ہے، اور مفروضہ سائنسی نظریے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جسے بار بار تجربات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو اصول و قوانین معرض وجود میں آتے ہیں

اسی سائنسی طریق کار کو ذہنی مریضوں کے ہاتھوں پر آزمایا گیا، ہمارا مفروضہ یہ تھا کہ ہاتھ کی وہ لکیر جسے عرف عام میں دماغی لکیر کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس پر چند مخصوص علامات ذہنی مریضوں کی خاص قسم (SCHIZOPHRENICS) کی مظہر ہے، ہم نے اس مفروضے کی تردید و تصدیق کے لئے گورنمنٹ مینٹل ہسپتال لاہور کو بطور مرکز تحقیق (UNIVERSE) منتخب کیا ملک صاحب نے سو ایسے ذہنی مریضوں کے ہاتھوں کے نقوش دست کے نمونے اکٹھے کئے، حقائق و شواہد کی اکثریت سے ہمارے مفروضہ کی تصدیق کی

اب اسی طریق کار کا اطلاق عاملوں کے ہاتھوں پر کیا جا رہا ہے۔ تا حال جو حقائق ہمیں دستیاب ہو سکے ان سے ہمارے اس مفروضے کی تصدیق ہوتی ہے کہ عاملوں کے ہاتھوں پر کچھ غیر معمولی علامات پائی جاتی ہیں جو عام لوگوں کے ہاتھوں پر نہیں ہوتیں۔

**محاور** | ایک بات جو میرے ذہن میں مسلسل کھٹکتی رہی، اور جو عام اور نوجوانوں کے ذہن میں بھی اس کی یقیناً محسوس ہوتی ہوگی کہ سائنسی مرتبے کے ساتھ ساتھ اس علم کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟

**ملک صاحب** | اس سوال سے مجھے اس لئے پریشان نہیں کیا کہ میں اس علم کے سائنسی مرتبے کا قائل ہوں، اور اگر آپ مذہب کی بات کرتے ہیں، تو میرا پختہ یقین ہے کہ کم از کم اسلام ان مذاہب میں سے نہیں جو سائنس سے کسی طرح بھی متصادم ہوا ہے۔ ایک بار ایک عالم دین سے جو اس علم کی مذہبی حیثیت پر معترض تھے میں نے دریافت کیا کہ تخلیق انسانی ہاتھ پر یہ علامات اور لکیریں مری سائی ہوئی ہیں یا آپ کی، انہوں نے فرمایا کہ یہ سب اللہ کی بنائی ہوئی نشانیاں ہیں۔ میں نے دوبارہ استفسار کیا کہ پھر بتائیے اللہ تعالیٰ نے آج تک کوئی چیز بے معنی بھی پیدا کی ہے، اگر یہ بامعنی ہیں، تو ان کے معانی کو کھوجنا مشیت ایزدی کے خلاف کیونکر ہوا؟

مجھ سے پوچھئے تو علم دست شناسی سے میرا اعتقاد کہ دست تقویت حاصل ہوئی ہے۔ میں دست شناسی سے خدا شناسی تک پہنچا ہوں۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انتہائے آفرینش تک جتنے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں یا ہوں گے، ان کے ہاتھوں کے انگوٹھوں پر نشان کبھی ایک دوسرے سے مشابہ نہیں پائے گئے ہیں اور نہ کبھی ایسا ہو سکے گا۔ انگوٹھا ہر انسان کا شناختی نشان ہے (IDENTIFICATION MARK) اور اس کی انفرادیت کا مظہر۔ یوں معلوم ہوتا ہے، ہر انسان جو اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اسے ایک شناختی نشان الاٹ کیا جاتا ہے، اور یہ نشان کسی مخصوص منصوبہ بندی کے تحت باقاعدہ ریکارڈ میں محفوظ ہے کہ جب وہ کہیں جرم کا مرتکب ہو جائے تو بھی یہ پولیس ریکارڈ سے اس کی شناخت ممکن رہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کارساز مطلق نے کچھ ماحولیاتی کمپیوٹر بھی کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ مکر میں بھی شامل ہو کمپیوٹر، نظام کا حصہ بن سکے اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ انسانی ذہن میں کچھ آلات ایسے بھی نصب ہیں، جو راز کی ماحد آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر بھی اس کے سامنے پیش کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لکیریں بسا اوقات انسانی مستقبل کی نقشہ بھی ٹھہرتی ہیں۔

**محاور** | اس علم کو جدید عصری تقاضوں میں ڈھالنے کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

**ملک صاحب** | اس علم کی تمام تر اصطلاحات علم نجوم اور قدیم ہندی اور یونانی دیومالاؤں کے حصوں سے مستعار لی گئی ہیں مثلاً زحل، عطارد، زہرہ، مشتری، حلقۂ سلیمانی وغیرہ۔ یہ اصطلاحات اوہامی علوم سے اس کی نسبت قائم کرتی ہیں، اور اسے پراسرار علوم کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

ان اصطلاحات کو جدید سائنسی علوم، میڈیکل سائنس، اعصاب، بیالوجی اور نفسیات کی روشنی میں از سر نو وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اس علم کی علامات کے مفہوم، و تعبیر کو جدید علمی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بھی ضرورت ہے، کچھ علامات کے مفہوم کو محض صرف از سر نو متعین کرنے بلکہ انہیں بالکل بدلنے کی ضرورت ہے، مثلاً شادی کی ایک روایتی لکیر بتا کر پیش اسے میرے نزدیک شادی کی لکیر سے منسوب کرنا درست نہیں۔ یہ انسان کے جنسی رجحانات کی مظہر ہے۔ بہت سی علامات جن کی تقدیر پرستانہ تشریح و تعبیر کی جاتی رہی ہے بہت کم دست شناس شاید یہ جانتے ہوں گے کہ یہ در اصل کسی انسان کی سیرت و کردار اور شخصی رجحانات کی عکاسی ہیں اور انسانی مقدر سے ان کا رشتہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کا ہے۔

---

## بقیہ دینیات کا پیریڈ

اس وقت جو طریق تعلیم رائج ہے، وہ جدید اور اسلامی علوم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یکجا ہونے کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متبائن اور متصادم عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے، اور اس سے کوئی مفید ثمر برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ خرابی کا سبب بن گئی ہے کیونکہ اول تو خود آمیزش ہی درست نہیں، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ یہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت طاقتور ہے اور اسلامی عنصر اس کے مقابلے میں نہایت کمزور ہے۔ مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر زمانہ رفتار کی قوت اور ایک عالمگیر حکمران تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ ترکیب کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں ہے اور ہوا جا سکے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی صاف

اور سادہ لوح دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے کلیتہً مغربی سانچے میں ڈھل جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں، اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور بامعنی ہے تو وہی ہے جو مغربی علوم کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اس تربیت سے پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں کھلا دی جا رہی ہے۔ لباس و معاشرت، آداب و اطوار، رفتار و گفتار، غرض کون سی چیز ہے جس پر مغربی تہذیب، تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فیصدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو نتائج ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحب نظر خود سمجھ سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں غیر اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے، اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کو کھو کر دیسے ہی کمزور ہو چکا ہے، پھر ہماری یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم جن کتابوں کے ذریعے سے دی جاتی ہے، وہ موجودہ زمانے سے صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں، ان کی زبان اور ترتیب و تدوین ایسی نہیں جو اس کے ہاتھوں کو اپیل کر سکے، ان میں سے اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن عملی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر اب دنیا میں نہیں ہیں، ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید برآں اس تعلیم کی پشت پر کوئی زندہ تہذیب، کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی علوم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آ جائے اور اسلامی عنصر محض ایک سامان تبرک بن کر رہ جائے یا زیادہ سے زیادہ اس سے کہ زمانہ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے

عکس

# دینیات کا پیریڈ

## نامنظور

### ۱- مولانا محمد علی جوہر

جو ایک مضمون پر میں یہاں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، وہ مذہبی تعلیم کا ہے۔ بے شک علی گڑھ کے جامع متصل حلقہ کالج کے بانی یاد رہے تھے اور انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں کافی سے زیادہ عامل تھے۔ یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ کالج میں مسلمان طالب علموں کے لیے نصاب میں مذہبی تعلیم کا وقت مقرر تھا اور علم دینیم کی طرف سے ایک دینیات کمیٹی بھی بنی ہوئی تھی جو سالانہ امتحان کے موقع پر دینیات کا امتحان لیتی تھی اور کوئی طالب علم دینیات کا امتحان پاس کیے بغیر ان کی جماعت میں نہیں جا سکتا تھا۔ مذہبی تعلیم کے لیے ایک بے ڈھنگے اور بے جان قسم کی کمیٹی بنا دی گئی تھی جس نے سوائے اس کے کہ ایک ... کے لیے چند نہایت ہی ابتدائی مذہبی کتابیں جنہیں جوں توں دینیات کا نام دیا گیا تھا مقرر کر دی تھیں اور کبھی کوئی کام نہ کیا۔ ان کتابوں میں زیادہ تر عبادات اور ان سے متعلق احکام کا ذکر تھا اور دیگر کتابوں کے علاوہ کے لیے ان میں نکاح، طلاق وغیرہ کے بھی مسائل بیان کیے گئے تھے۔ لیکن جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ طالب علموں کے لیے ایک سربستہ کتاب ہی رہی اور احادیث نبوی کے سلسلے میں ہم ان کے مجموعوں کے ناموں سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح ہمارے کالج میں طالب علموں کے لیے رسول ﷺ کی سیرت و زندگی کے بارے میں ایک ابتدائی سی کتاب جس کے صفحات چند ہیں ... مقرر کی گئی تھی، اور یہی دینیات جس سے مراد اعتقادات اور مذہب کے متعلق عقلی دلائل ہو سکتے ہیں، اس کا درسی کتابوں میں کہیں نام و نشان نہ تھا۔

اور اس پر طرہ یہ کہ مسلم نوجوانوں کو اس دینیات کی تعلیم دینے کے لیے جس کا ہفتہ میں صرف ایک گھنٹہ ہوتا ہے، دینیات کے کامل علم سے کم استاد مقرر تھے، حالانکہ اس کا تصور یہ تھا کہ دینیات کے گھنٹے سے بھی کھیل زیادہ پُرلطف دلچسپ کا گھنٹہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ بھی کہ اس گھنٹے سے غائب ہو جانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا اور اگر ایسا نہ بھی ہوا اور وقت طلباء لوگوں کے متعلق مزاحیہ شعر لکھنے اور ان کے مضحکہ خیز اور گستاخانہ خاکے بنانے میں صرف کرتے جن سے انہیں نفرت ہوتی اور ایسے لوگوں میں سے قابل احترام مولوی صاحب مستثنیٰ نہ کیے جاتے ... شعر مسودہ کی نقل کو ادھر بھی بڑھا دیا جاتا تھا

(خود نوشت سے اقتباس)

### ۲- سید مودودی

دینیات کا پیریڈ ایک اصلاح کی صورت بھی، درحال یہ کہا گیا تھا کہ اس طریقے سے ہم ان مسلمان نوجوانوں کو جو ہمارے اداروں میں آکر پڑھیں گے، ان برے اثرات سے کسی حد تک بچا سکیں گے جو انگریزی تعلیم سے پیدا ہونے کی توقع تھی لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ صورت بالکل بے اثر ہے۔ آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ اس طرح کے علاج سے جو منفعت ہے کم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ... انسان پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی جو بالکل ناکام ہوئی اور حالات کے مطابق اس کو ناکام ہی ہونا چاہیے تھا۔

ایک طرف آپ ایک طالب علم کو تمام دنیوی علوم اس طریقے سے پڑھاتے ہیں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سارا کارخانہ خدا سے بے نیاز ہے اور خدا کے بغیر چل رہا ہے اور حرکت کا سامان ساتھ چل رہا ہے، جو علم بھی وہ حاصل کرتا ہے اس کے اندر کہیں اس کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کا رشتہ دنیا میں یا اس کی عام زندگی میں کہیں خدا کا کہیں مقام ہے، کہیں رسول کا مقام ہے، کہیں وحی کی کوئی حاجت ہے۔ سارے کے سارے نظام زندگی کو وہ کسی دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ دینیات کی کلاس میں لے جا کر اس کو بتاتے ہیں کہ خدا بھی ہے، رسول بھی ہے اور وحی بھی آئی ہے اور کتاب بھی آئی ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ وہ سارے مجموعی تصور سے الگ اور بالکل بے جوڑ کر کے اطلاع جو آپ اس کو دیتے ہیں، اس کو وہ اس گوشے میں آخر کہاں فٹ کرے گا؟ کس طرح آپ ہر طالب علم سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کائنات اور زندگی کے بے خدا تصور کے ساتھ دینیات کی یہ بے جوڑ معلومات جو الگ سے اس کے ذہن میں بٹھا دی جاتی ہیں، اپنے ذہن کو کھول کر دونوں پہلو بہ پہلو دوسرے اجزائے علم کے ساتھ ترتیب دیتا رہے گا، ادھر وہ اپنے ذہن میں ایک دوسرا مربوط تصور مرتب کرتا رہے گا۔

پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے جو اپنی درسگاہیں قائم کیں ان میں بھی ہم نے وہی ماحول پیدا کیا جو سرکاری درسگاہوں میں تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ ہمارے طلبہ انگریزی ٹوپیاں اور انگریزی لباس پہنیں۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ انگریزی کلچر کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ہم نے کھیلوں میں، نشست و برخاست میں اور رہنے سہنے میں، مسائل و معاشرت میں ہر ہر چیز میں یہی کوشش کی کہ ہماری یہ قومی درسگاہیں کسی طرح بھی سرکاری درسگاہوں سے مختلف نہ ہوں۔ بالکل اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ سرکاری درسگاہوں سے نکلے ہیں ان میں اور ان درسگاہوں سے نکلے ہوئے لوگوں میں کسی طرح بھی کم فرق نہیں۔ جب یہ مقصد ہمارے سامنے تھا اور اسی کی خاطر ہم نے پورا فرنگیت کا ماحول طاری کرنے کی کوشش کی تو اس ماحول کے اندر اسلام کی وہ ذرا سی قلم جو ہم نے لگائی وہ آخر اپنا کیا رنگ لا سکتی تھی؟ دوسرے کسی مضمون کی تعلیم سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ دوسرے دلائل اس کے لیے ... اور ... کے نہ کام آئے، وہ سارے کے سارے دلائل ہم نے ماحول اور ماحول سیاسی کے لیے قائم کرکے دیے۔ اس پر مزید ہم نے یہ کیا کہ اپنے قومی کالجوں میں بھی سرکاری کالجوں کی طرح رنگ کا پورا ماحول اور ... کا پورا نظام ایسا رکھا جو اسلام کے اس ... کے بجائے رنگ ... کے لیے ... سازگار تھا۔ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس ... کو غذا دینے والی ہو، بلکہ ہر چیز میں اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ سب کچھ کرکے ہم اس نتیجے کی توقع رکھتے تھے کہ دینیات کی اس ... سے کوئی دینی جذبہ پیدا ہوگا، کوئی دینی رجحان نشوونما پائے گا، اسلام کی کوئی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگی اور ان کے اندر اسلامی کیریکٹر پیدا ہوگا۔ حالانکہ فطرت کے مطابق اس کا ... یہی نتیجہ تھا اور یہی نکلا کہ جن لوگوں کو اس طریقے سے دینیات کی تعلیم دی گئی، ان کی نگاہوں سے دین گر گیا اور ان کی دینی حالت ان کالجوں اور گورنمنٹ کالجوں کے طلبہ سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں بالعموم دینیات کا گھنٹہ تفریح اور مذاق کا گھنٹہ، تفریح اور مذاق کا گھنٹہ ہے، اور اس سے دلوں میں دین کا مذاق کرنے کے سبب سے ایمان کو ختم کر دینے کی خدمت انجام دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم خود اپنی اولاد کے سامنے اپنے دین کو اسلام دوسرے مضامین سے حقیر سا کر کے پیش کریں گے، تو اس کی کم سے کم سزا خود دین کی طرف سے یہی ملنی چاہیے، وہ یہی ہے کہ ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے خدا اور رسول پر ہنسیں اور ان سے ... کو جس کو ہم خدا اور رسول اور آخرت کہتے ہیں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

چند مشورے

رائو محمد اختر

# آزاد کشمیر میں تعلیمی تبدیلیاں

آزاد کشمیر میں تعلیم کے شعبے کو ایک مدت سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ نظام تعلیم بشمول اساتذہ کے قیام اور طلبہ کی مشکلات کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس سلسلے میں مل بیٹھ کر غور و فکر ہو اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اس پس منظر میں آزاد کشمیر تعلیمی کانفرنس کے انعقاد پر جمعیت طلبہ اس توقع کا اظہار کرتی ہے کہ تعلیمی کانفرنس آزاد کشمیر میں تعلیم کے مسائل کا جائزہ لینے اور انہیں حل کرنے کے سلسلے میں ایک مثبت کوشش ثابت ہوگی۔

## تعلیم

گذشتہ کئی برس سے اس بات کو تقریباً سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیم کی بے مقصدیت اور تعلیمی سہولتوں کی عدم دستیابی کا اصل سبب وہ نظام تعلیم ہے جس سے ہمیں برصغیر کے انگریز آقاؤں نے ورثے کے طور پر مسلسل اپنے بیان جاری رکھا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ آزاد کشمیر میں ایک ایسے نظام تعلیم کی ترویج کی ضرورت ہے جو قومی ضروریات اور عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا حقیقی ترجمان ہو۔ ایک غیر ملکی سامراجی طاقت کے تشکیل کردہ تعلیمی نظام کا جاری رہنا جو اس نے محض اپنے نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے نافذ کیا، ہمارے تمام مسائل اور مصائب کی حقیقی وجہ ہے۔ اس صورت حال کو وقتی یا جزوی اصلاح درست نہیں کر سکتی بلکہ ایک ایسی کلی تبدیلی ضروری ہے جو طلبہ کو کشمیر کی آزادی اور اسلام کی نظریاتی اساس پر مبنی فلاحی معاشرہ کے قیام کے مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کر سکے۔ تعلیمی کانفرنس کے شرکاء پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نظریاتی لحاظ سے دیوالیہ اور تعلیمی نقطۂ نظر سے بوسیدہ روایات سے ہٹتے ہوئے طریقۂ امتحان و طریقۂ تعلیم میں وہ انقلاب لانے کے لیے سوچیں جو اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کا ذریعہ ثابت ہو۔ ہماری رائے میں آزاد کشمیر میں تعلیم کا بنیادی مقصد نوجوانوں کو کشمیر کی جدوجہد آزادی کا سپاہی بنانا اور اسلام کے اصولوں کی اساس پر معاشرتی و ریاستی ڈھانچہ چلانے کی تربیت دینا ہونا چاہیے۔ ان مقاصد کے لیے محض اعلانات و سفارشات کا طریقہ اختیار کیا گیا، تو یقیناً یہ ایک بے مقصد بات ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک طرف تو ماہرین تعلیم، دانشور، اساتذہ اور طلبہ اس تعلیمی ڈھانچہ کی تشکیل کے فکری و علمی کام میں حصہ لیں جو ہمارے قومی نصب العین کے مطابق ہو اور دوسری طرف اس تشکیل شدہ ڈھانچے کے عملی نفاذ کے لیے فوری طور پر قدم اٹھایا جائے۔ نئی پالیسی کے نفاذ کو تحریک کی شکل دی جائے اور اس غرض سے اہل علم، اساتذہ، طلبہ، اور صحافیوں پر مشتمل "تعلیمی کونسل" بنائی جائے جو اسے نوکر شاہی کے سرخ فیتے کی نذر ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعے مسلسل ان سفارشات کو عوام کے سامنے لاتے رہیں تاکہ کوتاہیوں پر احتساب کا عمل ہو سکے۔

## تعلیمی نصب العین

"ہمارے نظام تعلیم کا مقصد ایسے نوجوانوں کی تیاری ہونا چاہیے جو وطن عزیز کی جدوجہد آزادی کے مجاہد، بہترین مسلمان اور بہترین صاحب علم ہوں۔"

اس مقصد کے لیے ہمارے نظام تعلیم میں فوری طور پر مندرجہ ذیل تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں

تعلیمی اداروں کے موجودہ ماحول کو تبدیل کیا جائے اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جائیں گو مکمل تبدیلی کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا لیکن ابتدا میں چند مفید اور مؤثر اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت رقص اور موسیقی کو فنون ثقافت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے اور مغرب زدگی

## تعلیمی ماحول

کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور روز بروز ہمارے معاشرے میں یہ ضرورت تک محسوس نہیں کی جاتی۔ تعمیر پذیر اور سماجی ڈھانچے میں مسلم ثقافت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مذہب کو ایک نجی اور انفرادی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ رجحان ختم ہونا ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو اس بات کا واضح اور بیّن ثبوت دینا چاہیے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ اگر اس بات کی اہمیت کو قبول کر لیا جائے، تو ایسے کئی اقدامات کی سفارش کی جا سکتی ہے جو آسانی سے قابل عمل ہیں۔ اگر ان اقدامات پر سختی سے عمل کیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا ماحول ہمارے نظریات کے مطابق نہ ہو

- ہر ہائی اسکول اور کالج میں مسجد کی تعمیر لازمی قرار دی جائے۔
- نماز کے اوقات میں کوئی پیریڈ نہ ہو۔

## اہتمام دعائیہ اجتماع

تمام اسکولز اور کالجز میں تدریس کا آغاز دعائیہ اجتماع ——————— سے ہو جس میں تلاوت کلام پاک مع ترجمہ کوئی سی دس احادیث نبوی، قومی ترانے اور آزاد کشمیر و پاکستان کا پرچم بلند کرنے سے ہو۔ ساتھ ہی آزادی کشمیر کا جذبہ بیدار کرنے والی نظموں اور نعروں کا بھی اہتمام کیا جائے۔

## نصاب اور درسی کتب

ہمارا نصاب اور درسی کتب نہ صرف مقصدیت کے اعتبار سے غیر واضح ہے، بلکہ جدید معلومات سے بھی عاری ہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے مختلف سطحوں پر مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل دو تجاویز خاصی مؤثر ثابت ہوں گی۔

## مسئلہ کشمیر کی نصاب میں شمولیت

مسئلہ کشمیر کی تاریخ اور جدوجہد آزادی کے حقائق و واقعات کو ہر سطح پر نصاب میں شامل کیا جائے۔ معاشرتی علوم اور رسالوں کے پرچوں کے نصاب میں اس موضوع پر مضامین شامل کیے جا سکتے ہیں۔ پرائمری اسکول کی سطح پر قومی نغمے پڑھائی جانی چاہئیں۔ جغرافیہ کے مضامین میں ریاست جموں و کشمیر کا جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین میں ریاست کی تاریخ اور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔

## کانفرنسیں

رسالوں، ہیڈ ماسٹروں اور ایک ایک مضمون کے معلموں کی کانفرنسیں سال میں کم از کم دو بار ہونی چاہئیں، جہاں تعلیمی انقلاب کا موضوع مرکزی حیثیت سے زیر بحث لایا جائے۔

## اساتذہ کا نظریاتی رجحان

اگر استاد کا رویہ اسلامی خطوط پر تعلیمی انقلاب کے کام میں مضرات مؤثر ترقی روکے اور تنزل کرنے سے کہ ہر طرح تک کاروائی کی جانی چاہیے خصوصاً اگر استاد کی طرف سے مخالف اسلام نظریات کی حمایت کرنا یہ کہ محض زیر بحث لانا) یا اسلامی تصورات و احکامات کی تضحیک کرنا ثابت ہو جائے۔ تو اسے فوری طور پر ہر قسم کے معاد سے محروم کر کے برطرف کر دیا جانا چاہیے جس طرح ریاست کے لیے تحریک کا مرد وائی ناقابل برداشت ہے، اسی طرح نظام تعلیم بھی تخریبی عمل کا روادار نہیں ہو سکتا

معاشرے میں استاد کی حیثیت اس کے کردار اور صرف کردار پر منحصر ہے۔ اس کا کوئی دوسرا بدل ممکن نہیں۔ اونچی تنخواہیں اور سہولتیں سر آنکھوں پر، لیکن صرف یہی چیزیں اس عظیم محبت اور عزت کی بنیاد نہیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہمیشہ استاد کو حاصل رہی ہیں۔ اگر استاد اپنے اندر ایک صالح اسلامی کردار پیدا کریں، تو لازماً طلبہ کے دل میں ان کی محبت بڑھے گی، اس طرح مسلمان معاشرے میں استاد اور شاگرد کے یہ مقدس رشتے جو ایک تاریخی روایت ہیں ایک نئے دور میں داخل ہوں گے۔

## متفرق تجاویز

تعلیمی مدارس کو ابھارنے کے لیے چند متفرق تجاویز۔

## لازمی فوجی تربیت

ہمارا موجودہ دور اس بات کا مطالبہ ہے کہ ہر طالب علم کو کم از کم ایک سال کے لیے لازمی فوجی تربیت دی جائے تاکہ طلبہ جیسی قوت کو ہنگامی قومی ضروریات کے لیے تیار رکھا جا سکے، وہیں ان میں ڈسپلن، جسمانی صحت اور قومی تحفظ کے احساس کو ابھارا جائے۔ اس لیے دیگر ممالک کی طرح ثانوی تعلیم کی تکمیل پر ایک سالہ فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے۔ اس سلسلے میں نیشنل کیڈٹ کور (N C C) اسکیم ناکافی ہے، ایک تو اس میں وہی طلبہ زیادہ تر دلچسپی لیتے ہیں جو فنی تعلیمی اداروں میں داخلوں کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ ٹریننگ بھی معمولی دماغی نوعیت کی ہے جنگی چالوں اور ہتھیاروں کے جدید ترین دور میں محض ایل ایم جی اور تھری ناٹ تھری کی ٹریننگ تحریک آزادی کے لیے ناکافی ہے۔

## فوجی قوت کے مظاہرے

قومی اہمیت کے ایام مثلاً یوم شہدائے کشمیر ۱۳ جولائی، ۶ ستمبر اور یوم آزادیٔ کشمیر ۲۴ اکتوبر وغیرہ کو رسمی ہنگاموں کی بجائے لازمی فوجی قوت کے مظاہرے کیے جائیں۔

مڈل ہائی اسکول اور کالج کے طلبہ کو ان ایام میں رخصت دینے کی بجائے اساتذہ کی زیر نگرانی ان مظاہروں کو دیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس سے ہماری نئی نسل پر نہایت مثبت اثرات مرتب ہوں گے

## ریڈیو اور ٹی وی

جس، عصری آلات تعلیم اور تربیت کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ آزاد کشمیر میں ریڈیو کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ راولپنڈی، اسلام آباد ٹیلی ویژن سے آزاد کشمیر کے لیے خصوصی پروگرام نشر ہونے چاہئیں جو کشمیر کی آزادی کو اہمیت دیں۔ صبح کے وقت ریڈیو، ٹی وی کی تعلیمی نشریات شروع کی جا سکتی ہیں جن میں تعلیمی فلموں اور ڈراموں کے ذریعہ نظریاتی تشخص اور قومی تہذیب و تمدن کو رواج دیا جائے اور عظمت اسلام، شجاعت اور قومی غیرت و حمیت کو ابھارا جائے

## تعلیمی اداروں کا مسئلہ

آزاد کشمیر میں میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور یونیورسٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا دائرہ خاصا محدود ہے۔ تعلیمی سہولتوں میں اضافے کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جانے چاہئیں:

۱۔ آزاد کشمیر میں یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جامعہ کے قیام تک تمام بڑے شہروں اور ضلعی صدر مقامات پر ڈگری کالجوں میں ایم اے، ایم ایس سی کی کلاسیں شروع کی جائیں۔

۲۔ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور فنی تعلیمی ادارے (پولی ٹیکنیک) قائم کیا جائے۔

۳۔ لاء اور کامرس کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے اور کامرس و لاء کی ڈگری تعلیم کے لیے ادارے قائم ہوں۔

۴۔ موجودہ تعلیمی اداروں میں تعلیمی ضروریات کی غرض سے مطلوبہ گرانٹس کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے۔

## تعلیم نسواں

نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے مخلوط تعلیم، مخلوط سوسائٹی، مخلوط مجالس کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار سے یہ قطعاً لگا نہیں کھاتی۔ مخلوط تعلیم کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ لازم ہے کہ تعلیم نسواں کا بھرپور اہتمام کیا جائے۔ آزاد کشمیر میں طالبات کے لیے تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے۔ گرلز اسکولوں، گرلز کالجوں اور خواتین تربیتی مراکز کے قیام پر فوری توجہ دی جانی چاہیے۔

## تعلیمی فنڈ

آزاد کشمیر میں تعلیم کے معیار اور سہولتوں کی فراہمی کے لیے خطیر رقوم صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں "تعلیمی فنڈ" قائم کیا جا سکتا ہے جس میں عوام و خواص سے تعاون کے لیے کہا جائے۔ بالخصوص بیرون ملک کشمیریوں سے اپیل کی جائے کہ وہ اپنی آمدن کا ایک حصہ (مثلاً ۵ فی صد) ریاست میں تعلیم کے مقاصد کے لیے مختص کر دیں۔ اگر بیرون ملک کشمیریوں کی جانب سے ملک روانہ کی جانے والی رقوم کی لازمی کٹوتی کر لی جائے، تو تعلیمی فنڈ کو اور وسیع کیا جا سکتا ہے۔

## وظائف اور روزگار کی سہولتیں

کشمیری طلبہ کو اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر مناسب وظائف و انعامات دینے کا انتظام، طلبہ کے تعلیمی ذوق میں اضافہ کا سبب ثابت ہوگا ساتھ ہی اگر تعلیم کے بعد روزگار کی ضمانت فراہم کی جائے تو حصول علم میں نہ صرف دلچسپی بڑھے گی، بلکہ حکومت اپنی ایک اہم ذمہ داری کی ادائیگی بھی کرے گی۔ پسماندہ علاقہ ہونے کے ناطے آزاد کشمیر میں تعلیم اور ملازمت کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت پاکستان کو بھی مدد کرنی چاہیے۔ بیرون ملک وظائف کے سلسلے میں اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ استحقاق کی بجائے یہ وظائف اثر و رسوخ اور سیاسی دباؤ کے تحت دیے جا رہے ہیں۔ اب

یہ سلسلہ ختم کر کے استحقاق پر سختی سے عملدرآمد ہونا چاہیے۔

## مطالعۂ کشمیر

کشمیری تاریخ، سیاسی جغرافیہ (GEO POLITICS)، جدوجہد آزادی اور معیشت و معاشرت کو کشمیر اسٹڈیز کے عنوان سے بطور ایک مضمون پوسٹ گریجوایٹ سطح پر پڑھانے کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ آزاد کشمیر میں ایم اے کلاس کے اجراء کے بعد تو یہاں یہ مضمون شروع ہو گا ہی پاکستان کی جامعات میں بھی کشمیر اسٹڈیز میں ریسرچ شروع ہونی چاہیے۔

## انتظامی امور میں طلبہ کا حصہ

انتظامی امور میں طلبہ کو تعلیم سے متعلق پالیسی بنانے اور چلانے والی مجالس میں نمائندگی دی جائے۔ تو اس سے احساسِ شرکت و ذمہ داری پیدا ہو گا جو تعلیم کے اداروں کے انتظام کو بہتر چلانے کا ذریعہ بنے گا۔

## چند اہم امور

- قرآن فہمی کے لیے عربی زبان سے واقفیت کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا ثانوی سطح پر عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جانی چاہیے۔
- نئی پود کو اپنی تاریخ اور پس منظر سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے اسلامی تاریخ اور کشمیری مسلمانوں کے پس منظر کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی جانی چاہیے
- اسکول اور کالج کے ہال اور کمروں کو اہم شخصیات کے اقوال اور ہماری تاریخ کے اہم واقعات کی تصاویر سے سجایا جائے، تو یہ تاریخی تربیت کا ذریعہ ہو گا۔
- گلگت و بلتستان کا آزاد کشمیر تعلیمی بورڈ سے الحاق کیا جائے۔
- اساتذہ طلبہ کو فراہمی و تحصیل علم پر مکمل توجہ کے لیے فارغ کرنے کی غرض سے ان مسائل سے نجات دلائی جائے جو اس راہ میں رکاوٹ بنے ہیں اس سلسلے میں سب سے اہم ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے جس کے حل ہونے سے اساتذہ و طلبہ اپنی صلاحیتیں اور توجہ علم پر مرتکز کر سکیں گے۔
- درسی کتب کافی سستے داموں فراہم کی جانی چاہئیں دوسری ایسی کتب بھی جو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کے زیر مطالعہ رہیں کم قیمتوں پر دستیاب ہونی چاہئیں اس کے لیے طلبہ کی خاطر مخصوص پیپر بیک ایڈیشن شائع کیے جا سکتے ہیں صحت مند لٹریچر فراہم کیے بغیر ہم سستے جاسوسی اور گھٹیا عشقیہ ادب کی لعنت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

- طلبہ کی ایک اور بنیادی ضرورت کپڑے بھی رعایتی نرخوں پر فراہم کیے جانے چاہییں اس سے ہم طلبہ میں میانہ روی اور سادگی پسندی کے رجحان کو بھی پروان دے سکتے ہیں۔
- تعلیم مفت ہونی چاہیے ستم ظریفی یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے طلبہ پر فیسیں عائد کر دی گئی ہیں، جب کہ پہلے فیسیں نہیں لی جاتی تھیں۔
- لائبریریاں زیادہ سے زیادہ کھولی جائیں تاکہ طلبہ میں مطالعہ کرنے کی عادت پڑے اور اچھے ادب کا ذوق پیدا ہو یہ اس وقت ممکن نہیں ہو گا جب تک کہ ایسی لائبریریوں کو جو طلبہ کو خصوصی سہولتیں دیتی ہیں، اچھی کتب فراہم نہ کی جائیں۔ ایسے اقدامات کی سفارش بھی کی جانی چاہیے جس سے ان غیر ملکی اور ملکی جاسوسی اور گھٹیا عشقی کتب کی بڑھتی ہوئی رو کو روکا جا سکے جو ہماری نسل کو بے اندازہ نقصان پہنچا رہی ہیں
- طلبہ اور اساتذہ کا رہائشی مسئلہ سال بہ سال شدید ہوتا جا رہا ہے ملک کے اہم تعلیمی مراکز میں طلبہ کے لیے مزید ہوسٹل تعمیر کیے جائیں، یہاں تک کہ ہر اس طالب علم کے لیے جگہ فراہم کی جائے جس کو ضرورت ہے۔
- جن تعلیمی اداروں کی عمارات نہیں ہیں، وہ فوری طور پر فراہم کی جانی چاہئیں۔
- طلبہ کے لیے علاج کی خصوصی سہولت نہیں ہے ان کے لیے مفت دواؤں کا بندوبست کیا جائے اگر یہ ممکن نہ ہو تو برائے نام میڈیکل فیس لے کر بھی یہ مسئلہ حل کیا جائے
- بڑے شہروں اور قصبوں میں طلبہ کو حصول روزگار میں مدد دینے کے لیے دفاتر روزگار قائم کیے جائیں یہ دفاتر منظم اور مربوط طریقے پر کام کریں۔
- ریڈیو مظفرآباد، تراڑکھل اور اسلام آباد بھی دینی پروگرامز اور صلاحیت کی بنیاد پر کشمیری طلبہ کو مواقع دیئے جائیں، اقربا پروری اور جماعتی مفاد کی وجہ سے نہیں۔

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ آزاد کشمیر میں تعلیم کو بہتر بنانے اور نظام تعلیم کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے حکام و اہل علم جو اقدامات بھی کریں گے، طلبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ہم اس میں مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں ہمیں اندازہ ہے کہ وسائل کی کمی ایسے کسی بھی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دشواریاں پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، لیکن اگر عزم و ارادہ محکم ہو تو اس دشواری پر تعلیمی فنڈ جیسے منصوبوں کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے کشمیر میں یونیورسٹی اور امتحانی بورڈ کے سلسلے میں موجودہ تجربہ واضح کر چکا ہے کہ ایک یونیورسٹی ہی بہم جامعہ سے لے کر ایم اے تک کے امتحانات اور یوں نوکر شاہانہ ادارے قائم کرنے پر وسائل صرف نہ ہوں، بلکہ تعلیم ہی کو اہمیت دی جا سکے اور اس یونیورسٹی کا دائرہ کار گلگت و بلتستان تک بڑھا دیا جائے۔

* علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے، اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے، جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے، تو محض شیطنت ہے۔ ... مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے ــــ بولہب را حیدر کرار کن ــــ اور اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے، یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے، تو نوع انسانی کے لیے سراسر رحمت ہے۔"
(اقبال)

# تجاویز و خاکے

تعلیم کے پورے سسٹم میں کسی پہلو سے بھی کوئی تبدیلی پیدا کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا قومی اور ریاستی نصب العین (OBJECTIVE) کیا ہے؟ جس کے لیے تعلیمی نظام چلایا جا رہا ہے، اور اس کے لیے کیسا ماحول اور کیسے کارکن مطلوب ہیں؟ نصب العین کی سرحد متعین ہو جائے گی تو تعلیمیات کے لیے صحیح سمت سفر متعین ممکن ہو جائے گا۔ واضح ہے کہ پاکستان کا دستوری نصب العین قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی تشکیل قرار دیا جا چکا ہے، لہٰذا تعلیم کی ذمہ داریاں یہی ہیں کہ اسے بہترین قسم کے مسلمان پیدا کر کے دینے ہیں جو فکری جہت سے بھی اور عملی جہت سے بھی نظم میں سے اسلامی نظام کے [illegible] کردار اور دوسرے کارکن اور بہتر [illegible] کریں۔ اس نصب العین کا تقاضا ہے کہ اسلام فکر و عمل کے پہلے تقاضے رکھا ہے وہ سارے کے سارے پاکستان کے طلبہ کے سامنے آنے چاہیں۔ اس سے جو مرحلہ بھی مصادم ہو، سوائے پاکستان کے نظام تعلیم سے خارج ہو جانا چاہیے۔

اس نصب العین کا ایک واضح تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کے اصول، عقائد، قواعد و ضوابط، واجبات و محرمات اور حلال و حرام کی سمت اور اخلاقیات، روحانیت اور سیرت کا کامل نقشہ سامنے لے کر طلبہ ... کو سامنے رکھیں اور ایسے دین اور نظام اسلامی کے حق میں ان کے ساتھ [illegible] اعتماد اور استدلال ہو کہ کسی غیر اسلامی نظام کو مرعوب کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ [illegible] اسلامی عادات ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے اصول و عقائد ... کے ساتھ اسلامی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ ادا کر سکیں۔

نظام تعلیم نے مسلمان کو اس بات سے بھی آگاہ رکھنا ہے کہ اسلام میں، سب انفرادی معاملہ ہے اجتماعی اور اسلام پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ اس کا ایک حصہ ... اگر اسلام کو محض ... کے مطابق پوری زندگی کا دین و نظام کہا جائے تو نظام تعلیم ... کرنا پڑے گا کہ جس میں دین و دنیا کی تفریق ... دوسرے علوم کا ... اسلام سے ... شکار ہے ... عام نصاب سے الگ ہیں ... اسی طرح مدارس ... ہے کیونکہ کسی اصول نظام زندگی کی تعلیم کا طریقہ یہ نہیں۔

ہمارے لیے ... رہے کہ ہم تمام نصابوں میں تعلیم ... ہو کر پورے نظام تعلیم کو ... ہمارے یہاں ... پڑھایا جائے تو اسلامی ... ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام ... طبعیات کی تعلیم دی جائے ... لسانیات ... وضاحت ہونی چاہیئے ... اسلام ... سائنسی ... اسلامی اصولوں کی کارفرمائی کے اسباب ... بیان کی جائے ... اسلامی سیاست ... معاشیات ... اسلامی اصول و نظم پر تنقید کرنے اور خاص عقلی طرز ... کو محسوس کرنے کی توفیق عطا ہو۔

دین و سائنس [illegible] کا ... تعلیم میں ... کا ... پوری طرح احتیاط کریں ... علم کو تعلیم دینا ہوتا ہے ... دین کے ... سامنے آنے چاہئیں ... اور تمام علم اسلامیات ... ہمارے ... کو دینیات کا پیریڈ ہونا چاہیئے۔

اس ابتدائی ... میں ہم مختلف مضامین کے وہ اصولیات (PRINCIPLES) عرض کرتے ہیں جن پر ان کو مرتب کرنے سے ہر مضمون دینی رنگ میں دینیات کا مضمون بن سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ دینیات کے لیے الگ کوئی کتاب ... پیریڈ اور ٹیچر مقرر کیا جائے۔

## ۱۔ شہریت

ہماری تعلیم میں اس مضمون کی اہمیت سب سے زیادہ مرکزی ہوگی اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اسلامی اصولوں پر سوسائٹی کے اور افراد کے مختلف روابط اور ان کی گوناگوں حیثیتوں کے مطابق ان کی ذمہ داریاں متعین کرے۔ ایک مسلم معاشرہ کا فرد بن کر ایک فرد مسلم کو زندگی گزارنے کے لیے اسلام کے اعتقادی، اخلاقی، اور قانونی تقاضے پوری طرح معلوم ہونے چاہیں اور اس کو قرآن کے پیش کردہ شہری کے معیاری نمونہ ہوگا۔ تفصیلی علم ہونا چاہیئے جس کے مطابق اسے اپنی سیرت تعمیر کرنی چاہیئے۔ خصوصیت سے سب بڑا انسانی روابط کی ذمہ داریاں اسلامی اصولوں پر واضح ہو جانی چاہئیں۔

- ۱ خاندانی نظام کے داخلی تعلقات کا درجہ بدرجہ مردوں اور ذوی القربیٰ کے حقوق
- ب محلہ، شہر، ملک اور انسانیت کے معاملے میں ایک فرد مسلم کا مقام اور حقوق جار کی تفصیل
- ج ایک مسلم اور دوسرے مسلم کے عمومی تعلقات کی اسلامی بنیادیں
- د اسلامی حکومت کے ماتحت کی حیثیت میں عائد ہونے والے فرائض۔
- ہ۔ اسلامی حکومت کے صاحب اعلیٰ کی ذمہ داریوں کی نزاکت
- و۔ اسلامی حکومت سے لازمی تعاون کی مختلف نوعیتیں
- ز کارخانہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع اور آقا اور غلام کے باہمی حقوق و فرائض

ط۔ مرد و عورت کے تعلقات کی فطری حدود
ی۔ مرد و عورت کا مقام
ک۔ اسلامی سوسائٹی اور جمہوری و اشتراکی سوسائٹی میں وجہ اختلاف۔

علاوہ بریں اس سیرت (CIVICS) کے مضمون میں اسلامی نظام حکومت و سیاست کے مختلف پہلوؤں کو طلبہ پر واضح کر دینا چاہئیے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے۔ اس میں پولیس اور عدالت کا مقام کس طرح کی اداریاں کیا ہیں، اس کا نظام تعلیم و اشاعت کن طریقوں پر چلتا ہے، اس کے مالیات کن اصولوں پر کام کرتے ہیں وغیرہ۔

ہر طالب علم کو سیرت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہونا چاہئیے کہ اس کے روزمرہ کے معاملات کا تعلق حکومت کے کن کن شعبوں سے کس کس امر میں ہے اور ان کی کن طریقوں سے قائم ہے اور ان کو معمولی اور غیر معمولی ضروریات کے لیے کدھر رجوع کرنا چاہیے

اس سارے کورس میں خوب اچھی طرح نمایاں کیا جائے کہ اسلامی عقائد اور اسلامی عبادات اور اسلامی قواعد اخلاق مسلم سوسائٹی کے روابط کس طرح استوار کرتی ہے اور مختلف مباحث قرآن، حدیث اور دور خلافت راشدہ کی نظیروں کو رہنمائی کے لیے علمی ترتیب سے سامنے لایا جائے

ان اشارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری دینیاتی تعلیم کے لیے سب سے زیادہ اہم مضمون یہی ہوگا

## ۲۔ مطالعہ نظام فطرت

اس ایک جامع عنوان کے تحت علم کیمیا، طبعی جغرافیہ، حفظان صحت، علم حیوانات کے مبادیات اور علم نباتات میں سے کچھ عام معلومات کی چیزیں زبان دانی کے نصاب میں آجائیں گی، لیکن علم کیمیا، طبعی کیمیا اور حفظان صحت مستقل اختیاری مضامین کی حیثیت سے پہلے ۳ یا ۴ سال آئندہ بھی رہیں گے۔ ان تمام مضامین کے نصاب اور طرز تعلیم میں جن اصولوں کو مدنظر رکھنا ہے وہ یہ ہیں

ا۔ یہ دکھانا ہے کہ کائنات ایک صاحب شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی مخلوق ہے۔ ڈیزائننگ، پلاننگ، میکنگ اور کنٹرولنگ کے جو حیرت انگیز آثار اس میں کام کر رہے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کا کرشمہ ہیں۔

ب۔ یہ دکھانا ہے کہ پوری کائنات بحیثیت مجموعی بھی اور جزء جزء بھی اپنے خالق کے سامنے "مسلم" (مطیع فرمان) کی حیثیت رکھتی ہے، حتیٰ کہ جسم انسانی بھی بلحاظ جسم اس کا مسلم ہے، لہذا انسان کے لیے اس کائنات میں اپنے خالق کے سامنے مسلم بننے سے کوئی راہ بہتر نہیں رہتی ہے

ج۔ یہ واضح کرنا ہے کہ کائنات کے ہر شعبے میں سنت اللہ (خدا کا قانون) کار فرما ہے اور ہر چیز اس کی حکومت میں جکڑی ہوئی ہے، پس یہاں انسان کے لیے بھی خدا کا قانون معلوم کر کے اس کی پیروی کرنا واحد ذریعہ ارتقاء ہے۔

د۔ اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہے کہ نظام فطرت میں حکمت اور مقصدیت کارفرما ہے۔

ہ۔ قرآن کے سارے استدلال کو ان مضامین کے مباحث میں سمو دینا جو اس نے اسلام کے عقلی اثبات کے لیے نظام فطرت کے مظاہر کی بنا پر کیا ہے۔ سیرت کے بعد اس مضمون کی اہمیت بھی اول درجے کی ہوگی

## تاریخ

تاریخ کا مضمون ہمیں موجودہ صورت سے زیادہ وسیع کرنا ہے، اس کے شعبے حسب ذیل ہوں گے

ا۔ تاریخ اسلام از آدم تا نبی صلعم (مجمل)

ب۔ تاریخ اسلام (۱) دور نبوت (۲) دور خلافت راشدہ (۳) دور شاہی (۴) مسلمان ہندوستان میں۔

ج۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ – (۱) ہندوستان مسلمانوں سے پہلے (۲) مسلمانوں کی آمد براہ بحیرہ عرب (۳) مسلمانوں کی آمد براہ درۂ خیبر (۴) مسلمان انگریزی استبداد کے پنجے میں۔ (۵) آزادی کی جدوجہد (۶) ظہور پاکستان

د۔ تاریخ عالم (مجمل) (۱) قرون مظلمہ (۲) قرون وسطیٰ (۳) قرون جدیدہ (۴) پاپائیت کا رد عمل الحاد کی شکل میں (۵) جمہوریت کا ظہور اور ارتقاء (۶) سرمایہ داری اور امپیریلزم (۷) اشتراکیت کا ظہور (۸) دنیا کا ہمہ گیر اختلال (۹) جمعیت اقوام متحدہ کی ناکامی (۱۰) دنیا میں اسلامی نظام کی ضرورت

تاریخ کی تعلیم کے بارے حسب ذیل امور ملحوظ رہیں گے

ا۔ یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام و جاہلیت کی دو قوتوں کی کشمکش کی جولان گاہ ہے

ب۔ یہ واضح کرنا کہ اقوام کے عروج و زوال کا ہر ملک اور ہر زمانہ میں اخلاقی ارتقاء و انحطاط میں مضمر ہے۔

ج۔ یہ واضح کرنا کہ طبعی پہلو (وسائل تمدن) کے لحاظ سے ارتقاء مسلسل ہے، لیکن اخلاقی پہلو سے کبھی ارتقاء ہوا ہے، کبھی انحطاط۔

د۔ یہ واضح کرنا کہ خدا کا قانون رحمت و عذاب کس طرح کام کرتا ہے؟

ہ۔ یہ واضح کرنا کہ جنگیں اور انقلاب اخلاقی وجوہ سے رونما ہوتے ہیں

و۔ یہ واضح کرنا کہ انسان کی اچھی اقدار ہمیشہ سے اچھی ہیں اور بری اقدار ہمیشہ سے بری آ رہی ہیں

ز۔ یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمان میں کیا فرق ہے؟

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

حسین نقی

# پہلے انقلاب، پھر انقلابِ تعلیم

مضمون نگار ١٩٦٢ء میں اشتراکیت پسند طلبہ کے نمائندہ کے طور پر کراچی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے، اس زمانے میں موصوف این ایس ایف کے مرکزی رہنماؤں میں سے ایک تھے اور آج کل "پاکستان پریس انٹرنیشنل" لاہور کے بیورو چیف ہیں۔ "الفتح" کے لیے لاہور سے نمائندگی کرتے ہیں۔ (ادارہ)

قارئین محترم کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی بھی ملک کے نظام تعلیم کو اس کے معاشی، معاشرتی ڈھانچے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی ملک کا سیاسی معاشرتی ڈھانچہ تو ناکارہ ہو چکا ہو اس کی قومی ضروریات سے ہم آہنگ نہ ہو اور نظام تعلیم ٹھیک ٹھاک چلا رہے۔ پاکستان کے موجودہ نظام تعلیم کی فرسودگی ہمارے سیاسی معاشرتی ڈھانچے کی فرسودگی کی ہی عکاسی کرتی ہے۔

پاکستان میں ابتدا ہی سے صورت حال رہی کہ قوم پر نوآبادیاتی معاشی معاشرتی ڈھانچہ مسلط رکھا گیا، اور نظام تعلیم کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ کرنے کے دعوے دہرائے جاتے رہے۔ ان قومی امنگوں سے مراد پاکستان پر قابض سامراجی گماشتے بڑے جاگیرداروں، بڑے سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے چند سو افراد کی لوٹ مار جاری رکھنے کی امنگیں تھیں۔ اگر آپ تمام پاکستان کے ابتدائی سالوں کے اخبارات ہی کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اس وقت بڑے دعوے کیے گئے، نظام تعلیم کے سلسلے میں کیے گئے، ہماری موجودہ تعلیمی زندگی میں کسی میں سے کسی پر بھی عمل نہیں ہوا۔ صرف عام اور لازمی تعلیم ہی کی بات کر لیجیے جس میں ملک میں خواندگی کا تناسب بیس فیصد سال پہلے ترقی کا سوال ہے کہ ملک میں خواندگی کی شرح وہی ہے جو قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں تھی۔

پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں سے شروع ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہم سے ملک کا نوآبادیاتی معاشی، معاشرتی ڈھانچہ بدل کر دینے کا سامنا نہیں ہوتا۔

تعلیم کے سلسلے میں تمام بڑے بڑے مختلف کمیشنوں کے سلسلے میں مجھے کام کرنے کا موقع میسر آیا ہے اور میں نے ان کمیشنوں کے سامنے اپنی معروضات رکھی تھیں۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے سربراہ جسٹس (ریٹائرڈ) حمود الرحمٰن صاحب نے ١٩٦٦ء میں مجھے تین گھنٹے تک اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ بالآخر یہ کہا، اور بالکل درست کہا کہ میری تجاویز پر عمل کرنے سے پہلے اس ملک کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی جو ان کے کمیشن کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ کمیشن کی تجاویز اور ان کا حشر ہمارے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک خود مختار آزاد قوم اور ملک کی طرح بسنے کی کوئی کاوش کرتے پچھلے تیس سال میں کی ہوتی تو ہم نے نظام تعلیم کو بھی سنجیدگی سے تبدیل کرنے کی کوئی سعی کرتے۔ لیکن ہمارے حکمرانوں کا تمام زور محض پالیسیوں تک محدود رہا، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

ایک نوآبادی کے طور پر قیام پاکستان کے بعد ہمارے ملک میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا اظہار آپ کو ملک کے نظام تعلیم میں صرف نظر آئے گا جیسے جیسے ہم برطانیہ کے حلقے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دائرے میں داخل ہوتے گئے ہمارا نظام تعلیم امریکی سامراج کی مقصد براری کے لیے راہ ہموار کرتا گیا۔ ہماری نصابی کتب، طریق امتحانات، اساتذہ کی تربیت، نئے مضامین کی تشکیل، آپ جس جانب نگاہ اٹھائیں گے امریکی نظام تعلیم کی ایک بگڑی ہوئی اور مضحکہ خیز شکل آپ کو ہمارے نظام تعلیم میں نظر آئے گی۔

کسی بھی یونیورسٹی اور اعلیٰ تعلیمی ادارے میں آپ چلے جائیے وہاں آپ کو پاکستان اور اس کی ضروریات کے علاوہ سب کچھ نظر آئے گا حتیٰ کہ وہ تمام قبیح حرکات بھی جو سامراجی امریکہ کے تباہ ہوتے ہوئے اخلاق اور معاشرتی نظام کے تحت چلنے والے امریکی اداروں میں پائی جاتی ہیں۔

قومی زبان کا مطلب ہمارے یہاں اب تک اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لیا گیا کہ حکمرانوں کے اب وہ اس علاقے میں جہاں پاکستان قائم ہوا یا ہندوستان جس کی تقسیم سے یہ ملک معرض وجود میں آیا، میں پیدا ہوئے تھے، اور قوم سامراج کی ساری محکوم بھی حکمران محکوم قوم کی حد تک حکمران تھے لیکن عملاً سیدھا عوام کے غلام ہی وہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے بھی حکمرانوں اور محکوموں کے تعلیمی اداروں میں تقسیم ہو کر حاکم محکوم کی کھیپیں تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ صورت حال تا حال جاری ہے، اور ابھی اس کے تدارک کی کوئی امید نہیں، کیونکہ حکمران طبقات تمام قوتوں کو پس پشت ڈال کر محض اپنی لوٹ مار کی ہی سبیل کرنے میں مصروف ہیں۔

لہٰذا حکمران طبقوں کو تبدیل کیے بغیر نظام تعلیم کو تبدیل کرنے کی خواہش ایک کار زیاں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اس سلسلے میں سوچ و بچار وہیں سے کرنی ہے کہ جب سامراج کے گماشتوں کا راج ختم ہو گا اور پاکستانی قوم کی عظیم اکثریت اپنے مسائل اور اپنی تعلیمی ضروریات کا احاطہ کرے گی، تو اس کو کیا کرنا ہو گا۔

اس سلسلے میں سب سے اولین کام پاکستانی قوم کی بھاری اکثریت کی بنیادی ضروریات کا اندازہ لگانا، ان کو پورا کرنے کے لیے ہمہ جہتی اقدامات کرنے ہوں گے، اور اس کے واسطے ایک نیا تعلیمی ڈھانچہ استوار کرنا پڑے گا۔

اس تعلیمی ڈھانچے کی بنیاد پاکستانی قوم کی مختلف النوع ضروریات پورا کرنا ہوگی، اسی طرح جیسے آج کے پاکستان تعلیمی نظام کی بنیاد سامراج کے نوآبادیاتی اور گماشتہ نظام کی ضروریات کا پورا کرنا ہے۔

پاکستان کی بھاری اکثریت غریب کسانوں، بے زمین مزارعوں، ہاریوں، محنت کشوں، مزدوروں، دکانداروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بستے اور مختلف زبانیں اور بولیاں بولتے ہیں۔ ساتھ ہی ہمارا ملک دنیا کے انتہائی غریب ممالک میں شمار ہوتا ہے، اور اس کے وسائل پر سے حکمران طبقوں اور سامراجی گماشتوں کا تسلط ہٹا دینے کے باوجود بھی کسی وسائل محدود رہیں گے۔ اس لیے بہرحیثیت کاوش کے ابتدائی مرحلے میں تعلیم سمیت تمام شعبوں پر محدود وسائل ہی لگائے جا سکیں گے۔

ان محدود وسائل ہی سے ابتدائی سالوں میں ہی بنیادی تعلیم سے ہر فرد بشر کو لیس کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ ابتدائی تعلیم عوام کی اپنی بولیوں اور زبانوں میں دی جانی لازمی ہوگی، اور ملک گیر پیمانے پر اس رضاکارانہ کے لیے نصاب تیار کرنا ہوگا۔ میری رائے میں اس بنیادی تعلیم کے لیے ملک بھر میں موجود مساجد کا استعمال ضروری ہوگا اور مدرسا اور بڑے پیمانے اس اقدام میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

اس نصاب کو جو بنیادی اور لازمی طور پر تو عمر اور عمر رسیدہ مردوں کے لیے ہر سطح پر شروع کیا جائے گا، کو پڑھانے کی خاطر ان مساجد کے مولوی صاحبان جن کی موجودہ معاشرتی حیثیت گھٹیا پیشوں سے زیادہ نہیں کی رسد کا سدوست کر دیا گیا اور ان کی کلیدی اہمیت کا احساس کیا، اور دوسروں سے ان کے رشتوں میں جو احساس کمتری پیدا ہوگا معاشرے میں ان کا فرض تعلیم دینا اور معاشرہ پر ان کے ماعزت اور باوقار مقام کا احساس لازمی ہوگا، اور فرض کی ادائیگی کی بنا پر ان کا مشاہرہ مقرر ہوگا تاکہ وہ روزی اور دیگر ضروریات کے لیے محنت مزدوری کرنے سے نجات حاصل کر سکیں۔ ابتدائی بنیادی تعلیم کے حروف و الفاظ کی شناخت، ان کو پڑھنا اور لکھ سکنے کی صلاحیت، بنیادی حساب یعنی جمع تفریق اور ابتدائی عام سائنسی اور معاشرتی معلومات پر مشتمل ہوگی جس میں نصاب کی کتابیں، تختی، پنسل وغیرہ لازماً مفت مہیا کی جائیں گی، اور تعلیم کے حصول کی خاطر بنیادی بنیادی تعلیم کے بعد کے سے بنیادی مراکز میں بھی مد نظر رکھی، اور وسائل کے مطابق فراہم کی جائیں گی۔

تو آبادیاتی گماشتہ نظام کے خاتمے کے پہلے پانچ سال میں قوم کی ناخواندگی کو ختم کیا جا سکے گا۔ ممکن ہے کہ اس سے بھی کم عرصے میں تمام نوجوان تعلیم یافتہ افراد کی تربیت یافتہ رضاکار فوج کے ذریعے پورا کیا جا سکے۔

ابتدائی لازمی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی ملک بھر کی آبادی مختلف علاقوں میں اس کے پھیلاؤ اور ضروریات کے مطابق بالخصوص دیہی علاقوں میں بنیادی تکنیکی اور سائنسی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ جہاں ہمارے مولوی صاحبان کے ساتھ ساتھ معاشرے میں گئی حال کے جانے والے سرمایہ لوگ، رکھوالی، مرغی وغیرہ، سائنسی بنیادوں پر اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کریں اور پھر اس ہنر کو دوسروں تک پہنچائیں اور معاشرہ کے نئے مادہ ہونہار سائنسدانوں کے لیے استعمال کریں گے، اور ہمارے ہزاروں بے روزگار اور روزگار کی خاطر ملک ملک چھاننے والے سرمایہ دوں کو پاکستان میں ہی روزگار فراہم کر کے تکنیکی انقلاب برپا کرنے کے بنیادی اور اہم ادارے ہوں گے۔

یہ تعلیمی ہی خود کفالتی ادارے ہوں گے۔ البتہ ابتداً ان کے لیے ایک معقول رقم بنیادی عمارات اور ورکشاپ کے آلات وغیرہ کی فراہمی کا بندوبست وسائل کی بنا پر کیا جائے گا۔

ان بنیادی اداروں کا قیام وسائل سے ہمیں ہے کہ جانے کا وقت زیادہ وقت طلب نہ ہوگا۔ اسی ملک میں موجود مختلف سطح کے تعلیمی اداروں میں وسیع پیمانے پر اصلاحات کا مرحلہ کٹھن ہوگا کیونکہ ان اداروں میں بنیادی مالکانہ تصور ملے۔ رجعت پسند کے نام نہاد دانشور افراد کی جماعت ہے جو سامراجی سلسلے کی اسکیم کے عین مطابق ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں پر مسلط ہیں۔ ان میں سے کسی کی اصلاح تو ممکن ہو سکتی ہے، لیکن ایک خاصہ بڑا گروہ قطعی ناقابل اصلاح ہوگا جس کو ہراول سمجھ کر لائے جانے وطن اور قومی خدمت اور انکساری کا جذبہ پیدا کرنے اور علم دے کر اپنا فریضہ سمجھنے کا احساس پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ زیادہ وقت صرف ہوگا اس طبقے کی گرفت سے نئی نسل کو رہائی انتہائی مضبوط ہے۔ ہمارے ملک میں دن اور فکری انتشار پیدا کرنے میں بھی اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس گروہ کی نام نہاد آزاد فکری دراصل بے راہروی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے قومی مقصد کے حصول کے ضمن میں اس گروہ کی جانب سے مزاحمت لازمی ہے، اور اس مزاحمت کا تدارک کرنا بھی انتہا ضروری ہے۔

ایک اصلی قومی نظام تعلیم کے لیے ضروری ہوگا کہ ایک محور کی حیثیت کا حامل ہے جس پر عملدرآمد سے پہلے تمام محب وطن عناصر بالخصوص سامراجی، نوآبادیاتی نظام تعلیم میں کام کرنے والے باشعور اور محب وطن عناصر کے درمیان سادہ حال اس کے صدر حال درست کرنے میں بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

پچھلے بیس سال کا تجربہ بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ ملک کا معاشی، معاشرتی وحدت قومی ضروریات پورا کرنے کے سلسلے میں ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس کا نظام تعلیم بھی اسی طرح ناکارہ ہے اور یکسر تبدیلی کا متقاضی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اس وقت تک نہیں لائی جا سکتی، جب تک کہ ملک کا سیاسی، معاشرتی ڈھانچہ تبدیل نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں موجودہ صورت حال کافی حوصلہ افزا ہے کیونکہ ملک کے برسر اقتدار طبقات جو سامراجی نوآبادیاتی گماشتہ نظام چلاتے رہے خود ہی اپنے آپ میں یہ صلاحیت نہیں پاتے کہ وہ زیادہ عرصہ اس نظام کو برقرار رکھ سکیں نہ اسے اسی حد تک کامیابی سے چلا سکیں جیسا کہ سب ظلم و ستم وہ چلاتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں وہ اس حد تک پیچھے ہٹ گئے کہ ملک کے دو حصوں کی کامیابی ان سے برقرار نہ رکھی جا سکی۔ لہٰذا انہوں نے قومی عزت و آبرو لٹا کر خون بہا کر ہندوستان کے سامنے سر مت اٹھا کر ساری دنیا میں پاکستان کی عزت و وقار ڈبو دیا۔ ملک کی قسمت میں ایک مارہ کا لوجھ آیا۔ پاکستان رجحان یہ تھا کہ مغربی حصے کی کم آبادی اور زیادہ وسائل اور اس حصے کی بین الاقوامی اہمیت کے سبب وہ اس کو اپنے آقاؤں کے تعاون سے چلانے کے اہل ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اصل اس حصے کو بھی اسی طرح چلانے میں ان کے درمیان ہم آہنگی اور معاملہ فہمی پیدا کر کے چلانے کی ہمت نہیں رہی۔ یہ بات اس میں واضح ہے کہ یہاں میں، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی۔ اس کھیل میں اگر قوم کے سب حصے اور محنت کش طبقوں کا بھی خون بہا ہے، لوگوں کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی، لیکن ان کا یہ کھیل لگاتار جاری رکھا جا سکتا ہے، اور ان کی موجودہ کمزوریاں، ان کی آپس کی کشمکش اور ایک دوسرے کو شکست دینا اور کرانے کی خواہش سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تاہم یہ خطرہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے وطن پر منڈلا رہا ہے ——— علاقائی لٹیرے طبقات کے درمیان کشمکش کی وجہ ہمارے ملک کی شکست و ریخت کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر یہ قوم اس چیلنج کو بچا گئی، تو موجودہ معاشی، معاشرتی نوآبادیاتی نظام کے گماشتوں کو اقتدار سے ہٹانا زیادہ آسان ہوگا، اور اس کے بعد سے موجودہ فرسودہ نظام تعلیم کو تبدیل کرنا بھی۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا، ہمارا فرسودہ تعلیمی نظام ہماری نئی اور نوجوان نسل کو دیمک کی طرح کھاتا رہے گا۔ ان کو اصل اور اپنی تعلیم سے محروم رکھے گا جس سے وہ پاکستانی معاشرے کو ایسا کے واقعی آزاد معاشروں کے بالمقابل کھڑا کر سکنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس نظام تعلیم کے نتیجے میں ایسے ہی افراد فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے جو اس غریب قوم کے لاکھوں روپے اپنی تعلیم پر صرف کرانے کے باوجود اس ملک کی کوئی خدمت کرنے پر بیرون ملک مالی مفادات پر بہتر تنخواہوں پر ملازمت کرنے کو ترجیح دیں گے۔

ووٹ مانگنے والے ہمارا معاشرتی نظام لٹیرے یا لسانیوں کے آلۂ کار ہی پیدا کر سکتا ہے، اسے صرف عقل و فہم سے ملک و قوم کی جانب اپنے فرائض کا احساس کرنا، اس نظام تعلیم کی دین نہیں ہو سکتا۔

# سوشلسٹ طلبہ اور تعلیم میں تبدیلی

> ہم نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کی روشنی میں اشتراکیت پسند طلبہ گروہوں کا نقطۂ نظر ان کے لٹریچر کی روشنی میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس لیے ان کی دو تنظیموں
>
> ۱) متحدہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن
>
> ۲) سوشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن
>
> تعلیمی مسئلوں سے متعلق تصورات پیشِ خدمت ہیں (محمود)
>
> **این۔ایس۔ایف**
>
> (یہ مضمون اس تنظیم کے مجلہ "درستی" شمارہ دسمبر ۷۷ء سے لیا گیا)

**نظامِ تعلیم اور ؟** یہ سوال آج کے ہر مہذب معاشرے میں ایک طے شدہ امر کی حیثیت رکھتا ہے کہ تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان میں طلبہ اور عوام نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اس بنیادی اصول کو تقریباً تسلیم کروالیا تھا کہ تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہے، اور کوئی بھی حکومت جو عوام کی آمدنی کا بیشتر حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ٹیکسوں کی صورت میں عوام سے واپس وصول کرتی ہے، اس بات کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے کہ وہ ملک میں علم حاصل کرنے والے ہر خواہش مند شہری کے لئے، اور بچوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع کا بندوبست کرے۔ عوام ٹیکس اس لئے ادا نہیں کرتے کہ اس میں سے کچھ بھی ان کی فلاح و بہبود پر خرچ نہ کیا جائے، ہمارے ملک میں تمام بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے، علاج معالجہ، رہائش، صحت و صفائی، ٹرانسپورٹ، تعلیم، روزگار کے مواقع، بڑھاپے کی صورت میں یا کام کرنے کے اہل نہ ہونے کی صورت میں سماجی تحفظ اور اس کی طرح کی دوسری بنیادی سہولتیں اور تحفظات ہر ایک مہذب معاشرہ میں ریاست اور حکومت کی بنیادی اور لازمی ذمہ داری ہوا کرتی ہے۔ پہلے ہی سے برائے نام حد تک بھی نہیں جب کہ ٹیکسوں کی شرح بھاری ... زیادہ ہے۔ تعلیم کو ریاستی اور قومی ذمہ داری قرار دینے کے سلسلے میں طلبہ اور عوام نے ایک مسلسل جدوجہد کی ہے

**نصاب اور ذریعۂ تعلیم** نصاب اور ذریعۂ تعلیم ایسے مسائل ہیں جن پر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت نے اپنے اپنے مقاصد اور مخصوص مفادات کے لحاظ سے طبع آزمائی کی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آج کا طالب علم اور استاد دونوں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کی کوششوں، کاوشوں، محنت اور لگن کا مقصد کیا ہے؟ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں، اور انجام کیا ہوگا۔ یہ بات بنیادی طور پر موجودہ تعلیمی ابتری کی ذمہ دار ہے، لیکن آج بہت کم حقیقت پسند حضرات ایسے ہیں، جو اس بات کو تسلیم کریں۔ ہر صاحبِ اختیار شخص اپنی اپنی طبع اور رجحان کے مطابق تعلیم کو اپنے قیمتی مشوروں اور سفارشات سے نوازنا ضروری خیال کرتا ہے، خواہ وہ تعلیمی مسائل کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو۔ چنانچہ اگر نقطۂ نظر سے بچوں کے لئے ... کا بندوبست کرنے والے علماء دہمت کے مالک یہ اصحاب ایک آزاد اور ترقی پذیر قوم کی امنگوں اور خواہشات کو زنجیر کیا کریں گے، اپنے آپ کو "دانشور" کہنے والے حضرات نے ... اور ذریعۂ تعلیم کے مسائل پر غور کرتے وقت عقل و دانش اور تعلیم کے مسائل پر جدید ترین تحقیقات اور نقطہ ہائے نظر کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا، نصاب کو سائنسی اور عقل و دانش کی ... بنیادوں پر مرتب کرنے کی بجائے، جس کے ذریعے ہمارے طلبہ جدید ترین علوم اور فنون سے لیس ہو کر ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کریں، اور جدید معاشرے کے باشعور شہری بن سکیں سوال صرف یہ ہے کہ جس ضابطۂ اخلاق کی کچھ لوگ وکالت کرتے ہیں کیا وہ ہمارے معاشرے میں تسلیم شدہ ہے، اور عملاً رائج ہے؟ اگر ایسا ہے تو طلبہ کے دس پندرہ برس کی عمر اور استعداد کے لحاظ سے زیادہ بوجھ ڈالنا دراصل اُن کے ذہنوں کو مفلوج کرنے کی کوشش ہوگی، اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے، یعنی یہ کہ یہاں کا مرتب کردہ ضابطۂ معاشرے میں رائج نہیں ہے تو کیا تعلیمی ادارے معاشرے سے الگ ایسے جزیرے ہیں، جہاں ہمارے سماجی رجحانات کو نظر انداز کرکے اس ضابطے کو رائج کیا جاسکتا ہے؟ اس دور ... میں سماجی اور معاشرتی رجحانات میں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے جہاں بچہ ایک دن میں چھ سات گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے ... میں طالب علم ... زیادہ گزارتا ہے، اور زندگی ... نقطۂ نظر اور رجحانات حاصل کرتا ہے۔ تعلیمی اداروں کو خاص طور پر اپنی طبع تشنج کا نشانہ بنانے کا مقصد صرف اور صرف اپنے نظریات و خیالات سے مختلف نظریات اور افکار رکھنے والے طلبہ و باشعور شہریوں کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانا ہے

**عربی تعلیم** انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم ختم کرکے عربی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کا عزم کیا جا رہا ہے۔ مڈل کے درجے پر عربی کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی ہے تاکہ ایک قومی اور مادری زبان کے لئے بنیاد فراہم ہوسکے۔ انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم ختم کرکے مقامی اور علاقائی زبانوں اور اردو کو مختلف مرحلوں میں ذریعۂ تعلیم بنانا ایک مثبت کوشش ہوگی

بشرطیکہ اس سلسلے میں واقعی اخلاص سے اخلاص سے کام کیا جائے لیکن عربی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت سے نافذ کرنا اور اسی زبان کو یا اس کے ذریعے ایک قومی و مادری زبان بنانے کی کوشش کا خیال کرنا کسی ذی ہوش شخص کا خیال نہیں ہو سکتا اگر انگریزی دو سو برس تک ہمیں غلامی میں رکھ کر ہماری زبان تبدیل نہ کرسکے تو کیا عربی چونکہ ناکتابیوں کے لئے ایک غیر ملکی زبان ہے اس طرح ہماری اپنی زبان بن سکتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس اقدام کی افادیت کیا ہوگی ؟ کیا عربی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے رائج کرکے محض طلبہ پر زائد بوجھ ڈال کر ان کی ذہنی صلاحیتوں کو سلب کرنے کے مترادف نہیں ہوگا ؟ اور سب سے اہم سوال یہ کہ ہم کتنی زبانیں سکھیں گے مادری زبان، اردو، انگریزی اور پھر عربی آتی زبانیں ــــ ؟

**تعلیمی آزادی اور لازمی سروس** ہماری تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ تعلیمی آزادی کا مسئلہ ہے، ہماری تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کو ہر کارِ ن اور کسی مخصوص سیاسی گروہ کی مداخلت کے بغیر اپنا درس و تدریس آزادی کے ماحول میں جاری رکھ سکیں اور کسی کو کسی سیاسی دباؤ کی بناء پر حتساب کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں یہ روایت مضبوط کی کوشش کی گئی کہ طلبہ اور اساتذہ سیاست میں حصہ نہ لیں وہ روایت آزادی کے بعد آنے والے حکمرانوں نے مزید مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ کو لساہر تعلیم اور دانشور یہ کہہ سکیں تعلیمی اداروں میں زیر بحث آنے والے علوم و فنون اور حتیٰ کہ خالص نظری سائنس کے مضامین کو سماج کی سرگرمیوں سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ علیحدہ نہیں ہو سکتے، تو تعلیمی اداروں کو بھی سماج سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا مکمل تعلیمی آزادی اسی لئے ضروری ہے کہ کسی قسم کی مخصوص سیاسی نظریات اور افکار رکھنے والا کوئی گروہ تعلیم کو اپنی اجارہ داری بنا کر قوم کو غلط راہ پر نہ لگا سکے، اور تعلیم کے مقاصد کو پس پشت ڈال کر اپنے گروہی سیاسی مفادات کی تکمیل نہ کر سکے، جیسا کہ موجودہ تعلیمی کانفرنس کی سفارشات کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں اکادمیوں کے علم کے لئے یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے "لازمی سروس" کا نظریہ جو ہمارے یہاں رائج ہے، یہ خالص نوآبادیاتی نظریہ ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز اپنی ریاستی مشنری پر مکمل کنٹرول رکھ سکیں، اور اس کو عوام میں ابھرنے والے آزادی کے رجحانات سے پاک رکھ کر عوام کے خلاف استعمال کر سکیں۔ آزاد قوم کی حیثیت سے یہ ضروری نہیں کہ ہم اس نظریہ کو مدنظر رکھ کر مزید مضبوط بنانے کی کوشش کی جائے، جہاں رائج ہے، وہاں سے بھی ختم کرنے کے امکانات پر غور کریں؟

**خواتین کی یونیورسٹیاں** رجعت پسند قیادت ایک مطالبہ یہ کر رہی ہے کہ خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، آج کی تیزی سے ترقی کرتی ہوئی دنیا میں معاشرہ کا مشترکہ عمل ہونے کے ساتھ ساتھ خواتین کو قومی زندگی کے بنیادی دھارے سے علیحدہ کرنے اور خواتین کو استحصالی نظام کے تعصبات کا شکار بنانے کے مترادف ہے۔

---

جامعہ پنجاب میں انجمن طلبہ اسلام کا موقف ان کے چیئرمین کی مدد سے ہم نے ”منشور“ دسمبر ۱۹۷۷ء اور ”تعارف“ سے مرتب کیا (ادارہ)

# این۔ایس۔او

ہماری تعلیم این ایس او کے بنیادی اصول ہیں کہ طلبہ کے مسائل ان بنیادوں پر حل ہوں گے

۱۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ طالب علم علیحدہ کوئی طبقہ نہیں بلکہ وہ موجودہ طلبہ اور انسانی جنس استحصال زدہ طبقاتی معاشرے کا ایک حصہ ہیں، اور ان کے اکثر مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جس وقت تک موجودہ استحصالی نظام کی متعین کلاس کروں کرکے ایک غیر طبقاتی معاشرے کی بنیاد نہیں رکھی جاتی

۲۔ ہم انسانی مساوات کے اصول کی بنیاد پر مرد اور عورت کی مکمل برابری پر یقین رکھتے ہیں، اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ برابری صرف اور صرف ایک سوشلسٹ معاشرے میں ہی ممکن ہے

۳۔ این ایس او ملک کے مختلف علاقوں کی مقامی زبانوں، ان کی تہذیب اور ثقافت کو تحفظ دینے اور ان کو فروغ دینے پر یقین رکھتی ہے

۴ این ایس او اس بات پر بھی یقین رکھتی ہے کہ ذریعہ تعلیم قومی زبان کو بنایا جائے، ماہر کالج صاحب اور طلبہ پیدا کرنے کے لئے مکمل صلاحیتوں کے مالک ڈاکٹر انجینئر اور سائنسدان پیدا کر سکیں

۵۔ این ایس او طبقاتی تعلیم کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ ایچی سن کالج اور کراچی گرامر سکول جیسے تمام سامراجی اڈوں کو فوری طور پر بند کیا جائے تاکہ یہ ادارے مزید عوام دشمن اور سامراجی گھس کو جنم نہ دے سکیں

۶ ہم ملک میں تعلیمی، جمہوری، معاشی اور سماجی آزادیوں کے لیے کام کر رہے ہیں

۷۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی مقامی زبانوں ان کی تہذیب اور ثقافت کے تحفظ اور ان کے فروغ کے لیے کام کرنا ہمارے مدنظر ہے۔

۸۔ ہم موجودہ فرسودہ اور طبقاتی نظام کو ختم کرتے اور قومی تقاضوں کے مطابق جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کی جمہوریت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں

۹ ہم طلبہ میں انقلابی فکر، آرٹ، ادب، ثقافت اور عوام دوست رجحانات کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی سرپرستی کے لیے مناسب اقدامات کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں

۱۰۔ ہم انسانی مساوات کے اصول کی بنیاد پر عورت اور مرد کے لیے مساوی حقوق و سماجی مقام کے لیے اور طلبہ کے مختلف مسائل کے حل کے لئے طلبہ کی اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں

## عورتوں کی علیحدہ یونیورسٹی

آج کل ایک مخصوص گروہ کی طرف سے مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ عورتوں کی علیحدہ یونیورسٹی ہونی چاہیے ایسے اہم مسئلے کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے مزید براں کہ اس مسئلے پر بحث کی جائے، اس بات کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ یہ مطالبہ ایسے گروہ کی طرف سے کیا جا رہا ہے جو عورت کی آزادی کے خلاف ہیں جو مرد اور عورت کی برابری کو تسلیم نہیں کرتے، جو عورت کو کسی قسم کے حقوق نہیں دینا چاہتے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ عورت مرد سے ہر لحاظ سے کمتر ہے عورت کا کام صرف مرد کی غلامی ہے عورت مرد کی مرضی کے تابع ہے عورت کا کام چار دیواری کے اندر رہ کر مرد کے احکامات کی تکمیل ہے عورت کو جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک کھلونا سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک عورت کو محض لونڈی بنا کر رکھنا جائز ہے، اور پھر ان سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی بھی عادت ہے یہ گروہ مختلف قسم کے حربوں سے یہ کوشش

کہا جاتا ہے کہ عورت مسلسل مرد کی غلام رہی ہے، لیکن تاریخ کا پہیہ اُلٹا گھمانا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔ رجعت پسند گروہ پہلے یہ پروپیگنڈا کرتا ہے کہ

- عورت کو تعلیم نہیں دلانی چاہیے اس سے عورتیں خراب ہو جاتی ہیں
- عورت اور مرد اکٹھے رہیں گے، تو اس سے مزید برائیاں جنم لیں گی
- عورت کو ملازمت نہیں کرنی چاہیے اس طرح وہ گھر کا کام کاج نہیں کر سکتی اس سے ہر ایک سرمایہ داری کی غرض ہوتی ہے مرد کی زیادتیوں کو دوام بخشنا

آئیے دیکھیں کہ یہ الزامات کہاں تک درست ہیں۔ عورت کو علم سے بے بہرہ رکھنا انسانی معاشرے کا اہم حصّہ ہے، جو عورت کو مرد کے تابع رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ عورت معاشرے کی تعمیر و ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمام دنیا بالخصوص پاکستان جیسے ملک میں دیہی ریاست میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بچوں کی پرورش، گھر بار کا صحیح ماحول، حفظانِ صحت کے علاوہ معاشی طور پر بھی عورت کی تعلیم اور کاروبار زندگی میں شمولیت کی سخت ضرورت ہے۔ پاکستان کی تقریباً نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے، لہٰذا ان کے بغیر زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک کی ترقی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں، ان میں ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ یہ مقصد کافی حد تک اکٹھی تعلیم سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کو بالکل الگ اور نگاہ سے تصور کرتے ہیں۔ مخلوط تعلیم کی صورت میں یہ ساری صورت حال بدل جائے گی اور ان کے درمیان ایک دوسرے کو سمجھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس طرح معاشی طور پر ملک کی معیشت پر ایک نیا دور شروع ہوگا۔ ملک میں قائم درسگاہوں کی ضروریات مکمل طور پر پوری نہیں ہو رہیں، یہ جانتے ہوئے بھی تعلیمی اداروں میں تعداد اور درسگاہوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا۔ یہ قابلِ غور بات ہے کہ اگر مخلوط تعلیم نافذ کر دی جائے تو کیا عورتوں کی علیحدہ درسگاہوں سے برائیاں ختم ہو جائیں گی؟ کیا تعلیم سے فارغ ہو کر عورتیں واپس چار دیواری میں بند ہو کر رہ جائیں گی، یا کمائی پر خرچ ہونے والا قیمتی سرمایہ ضائع ہو جائے، شادی ہو جانے کے بعد، کیا عورتیں علم حاصل کرنے کے بعد عملی زندگی میں آئیں گی اور کیا وہاں مردوں سے آمنا سامنا ہوگا؟ کیا مردوں کے دفتروں کے ساتھ عورتوں کے دفتر علیحدہ ہوں گے، یا یہ ملکی کام انجام دیں گی؟

جب حصولِ تعلیم کے بعد مرد اور عورت اکٹھے کام کریں گے، تو پھر (POST GRADUATE) کلاسوں میں اکٹھے پڑھ کیوں نہیں سکتے؟ یہ درست ہے کہ جس طرح حیوان ہے کوئی بھی معاشرے کا کاروبار عورت کی مکمل شرکت کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک عورت کے صنفِ نازک اور مرد سے کم ہونے کا سوال ہے، آج عورت نے ملکی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کر کے یہ بات غلط ثابت کر دی ہے، بلکہ بعض حالات میں مرد سے بھی برتری حاصل کی ہے۔ آج عورت نے مرد کے شانہ بشانہ ملکی خدمت میں حصّہ لے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی طور پر بھی مرد سے کم نہیں اور اسے صنفِ نازک کہنے والے غلط سوچ کے مالک ہیں۔ چین، ویت نام، کمبوڈیا، کوریا اور دیگر ممالک کے علاوہ فلسطین کی عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لے کر ثابت کیا ہے کہ وہ مردوں سے کم نہیں۔ ان ممالک میں عورت کو سامراج اور اس کے گماشتوں کے خلاف لڑتے دیکھا جا سکتا ہے، اور سامراجی ممالک کے ظلم سے آزاد ہو کر سامراجیوں کی صفوں میں کھلبلی مچا رہی ہے۔

## طلبہ اور سیاست

ملک میں مخصوص نظریہ کے لکھنے والوں کی طرف سے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصّہ نہیں لینا چاہیے۔ اُن کے نزدیک طالب علم اور سیاست دو متضاد چیزیں ہیں۔ طلبہ کا کام صرف اپنے نصاب کی کتابیں پڑھنا، امتحان دے کر اچھے نمبر لینا اور ملازمت کرنا ہے۔ ان کو حق نہیں ہے کہ وہ ملکی معاملات میں دخل اندازی کریں، اور کسی مسئلے پر رائے زنی کریں۔ یہ صرف چند مخصوص سیاستدانوں کا حق ہے۔ ان گروہوں کے نزدیک صرف چند لوگ لٹریچر پڑھ سکتے ہیں، اور اسے سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں، گویا اُن کے نزدیک طلبہ اس قابل نہیں کہ وہ لٹریچر کا مطالعہ کر کے اپنے مسائل کا جائزہ لے کر درست رائے قائم کر سکیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی طلبہ اور سیاست دو متضاد چیزیں ہیں؟ کیا واقعی طلبہ اس قابل نہیں کہ وہ کسی مسئلے پر اظہار کر سکیں؟ جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں طلبہ کا تاریخی کردار سنہری حروف میں لکھا نظر آتا ہے۔ طلبہ صرف طلبہ نہیں ہیں بلکہ وہ اس معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ طالب علموں کا کردار پاکستان جیسے مخصوص حالات رکھنے والے ملک میں اور بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارا ملک بنیادی طور پر جاگیردارانہ، نیم سرمایہ دارانہ اور نیم نوآبادیاتی ملک ہے۔ سارے ملک کی کثیر آبادی کا بیشتر حصّہ دیہی علاقوں میں بسنے والے غریب عوام پر مشتمل ہے۔ ان کا واسطہ زیادہ تر جاگیرداروں، بڑے بڑے چوہدریوں، وڈیروں اور پیروں وغیرہ سے پڑتا ہے۔ شہروں میں مزدوروں اور غریب شہریوں کا واسطہ سرمایہ داروں، بڑے بڑے تاجروں، پیشہ ور لوگوں اور افسر شاہی سے پڑتا ہے۔ پاکستان کے مزدور، کسان اور دوسرے غریب عوام اس میں براہِ راست حصّہ نہیں لے سکتے۔ انہیں اپنے معاشی وسائل سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ملکی سیاست میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ سیاست میں عمل دخل مکمل طور پر ان لوگوں کا ہے جو کل آبادی کے ۵ / ۱ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی لوگ ملکی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے غریب اور محنت کش عوام کا شعور پہلے سے کہیں بلند ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود پاکستان کے محنت کش عوام اس قابل نہیں ہوئے کہ وہ پیشہ ور سیاستدانوں کی مکاریوں کو مکمل طور پر سمجھ سکیں۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے وہ لٹریچر کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ معاشی مسائل میں اس قدر گھرے ہوئے ہیں کہ مزدور وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لیے تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ طلبہ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے لٹریچر کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ طالب علم ملکی معاملات کے بارے میں حساس ہوتے ہیں اور بہت جلد کسی مسئلے پر اپنی رائے قائم کر کے عملی طور پر مسئلے کے حل کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

طلبہ جب اتحاد کر لیتے ہیں کسی بھی مسئلے پر اکٹھا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ ایک شہر یا کسی مخصوص کالج کے مسئلے کے حل کے لیے وہاں کے طلبہ کی جدوجہد میں دوسرے شہر اور کالجوں کے طلبہ بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ادھوری ہوتے ہیں، مشکلات سے وہ نہیں گھبراتے۔

آج ہم جو نصاب پڑھتے ہیں اس سے ملکی تعمیر میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اسلام نظامِ تعلیم ہمارے دل کے دشمنوں کا دیا ہوا ہے جو کبھی بھی ہمارے وطن کی بھلائی نہیں سوچ سکتے۔ یا یہ کہ ہم غلام بنانے کے نظریات کا علمبردار ہے۔ اگر طلبہ سیاسی شعور رکھتے ہوں، ملکی مسائل کے بارے میں سوچتے سمجھتے رہیں تو مکار سیاستدان اس ملک کو مزید نہ لوٹ سکیں گے، ان کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ملک میں سیاسی عدم استحکام بڑھے گا۔ ان حالات میں طلبہ کو سیاست میں بھرپور حصّہ لینا چاہیے، تاکہ وہ غریب اور مظلوم عوام کے چھینے ہوئے حقوق کے خلاف اُن کی اُٹھتی ہوئی آواز کی حمایت کر سکیں، چند مخصوص سیاسی لیڈروں کو لگام دے سکیں۔ ••

مجیب الرحمٰن شامی
ایڈیٹر "بادبان"

# عبدالمالک کی طرح جیو!

ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہال میں ایک نوجوان کی آواز گونجی تھی: "ہم یہاں ہر قیمت پر اسلامی نظام نافذ کریں گے"——— سیکولر نظامِ تعلیم کا پرچار کرنے والوں کے دل اس ایک آواز نے دہلا دیئے۔ وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے——— سٹیج خالی ہو گیا، ہال ویران ہو گیا، لیکن عبدالمالک کا نعرۂ حق وہاں گونجتا رہا، اس کی گونج آج تک مدھم نہیں پڑ سکی——— باطل کا شعار ہے کہ وہ کھلے میدان میں شکست کھانے کے بعد شب خون مارتا ہے، پیٹھ سے وار کرتا ہے یہی بات ۱۲ اگست کو دہرائی گئی——— عبدالمالک کی للکار کی تاب نہ لانے والے اس پر ٹوٹ پڑے———

اس وقت جب کہ عبدالمالک اپنے گھر جانے کے لیے ریس کورس میدان کو عبور کر رہا تھا——— حملہ آور کئی تھے اور عبدالمالک اکیلا——— لیکن وہ اکیلا بھی کہاں تھا، حق کی نصرتیں اور رحمتیں اس کے ساتھ تھیں وہ بھاگنے کے بجائے ڈٹ گیا——— خدا کا نام لینے والے ڈٹ ہی جایا کرتے ہیں——— سعد کے سامنے عبدالمالک کا خون بہہ نکلا، وہ نڈھال ہو کر گر پڑا لیکن اس کی زبان سے یہی الفاظ ادا ہوتے رہے۔ "ہم یہاں ہر قیمت پر اسلام لائیں گے"——— عبدالمالک جانبر نہ ہو سکا۔ اس نے ہسپتال میں جان دے دی، لیکن اس کا گرم خون ۱۲ کروڑ عوام کے خون کو گرما گیا——— پورب سے لے کر پچھم تک ہر شخص کی زبان پر اس کے الفاظ تھے: "ہم ہر قیمت پر اسلام لائیں گے"——— عبدالمالک نے یہ قیمت چکا دی ہے———

اس کا لہو بالکل اسی خون کی طرح مقدس ہے، جو ستمبر ۶۵ء میں واہگے کی سرحد پر بہا تھا——— اس کے خون سے وہی خوشبو اٹھ رہی ہے، جو عزیز بھٹی اور شامی شہید کے خون سے اٹھی تھی——— عزیز بھٹی اور بریگیڈیئر شامی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کا حق ادا کر گئے——— اور عبدالمالک نے نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا حق ادا کیا——— عزیز بھٹی اور شامی کے خون کی آبرو پر اطلاقِ تاشقند نے وار کیا——— یہ اعلان مصلحتوں کی پیداوار تھا——— عبدالمالک کے لہو پر بھی مصلحتیں حملہ آور ہیں——— یہ لہو آج تک ریس کورس میدان میں بکھرا ہوا ہے——— یہ لہو ابھی تک اپنے قاتلوں کی تلاش میں ہے، انصاف دینے والے ہاتھ سو گئے ہیں——— لیکن عبدالمالک جاگ رہا ہے۔ عبدالمالک عشق کی علامت ہے، جذب و سرمستی کا نشان ہے اور عشق مصلحت کی پیداوار نہیں ہوتا——— عشق تو مصلحتوں کو نظر انداز کرنے اور خاطر میں نہ لانے کا نام ہے———

عبدالمالک شہیدِ عشق تھا——— ہمیں اس کے خون کا انتقام لینا ہے، جس طرح عزیز بھٹی اور شامی کے خون کا بدلہ ہمارے ذمے ہے، اسی طرح عبدالمالک کے خون کا حساب لینا بھی ہمارا فرض ہے——— ہم ان سب کا انتقام لیں گے———

قاتل ایک ہے——— واہگے پر اس نے کھل کر حملہ کیا تھا، ڈھاکے میں چھپ کر——— وہ کسی رنگ میں آئے، ہم اسے پہچانتے ہیں——— ہم اس سے انتقام لیں گے یا عبدالمالک کی طرح جان دے دیں گے اور سب سے بڑا "انتقام" یہی ہے کہ ہم یہاں اسلام قائم کر دیں——— یہاں خدا کی حاکمیت کا پرچم لہرائے، قرآن کی آواز گونجے——— یہ آواز گونجی تو باطل قوتیں دب جائیں گی، مٹ جائیں گی، ان کی تمنائیں خاک میں مل جائیں گی——— ہمیں اسی آواز کو بلند کرنا ہے——— ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ اس "انتقام" کے لیے ہر قیمت ادا کریں گے——— عبدالمالک یہ قیمت ادا کر چکا ہے——— اس کی روح ہماری طرف دیکھ رہی ہے——— ہم اسی کو گواہ بنا کر اعلان کرتے ہیں کہ زندہ رہیں گے تو اس کی طرح، ورنہ جینے سے انکار کر دیں گے۔

**انٹرویو**

ستارہ ایاز

# ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا

وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور

**محور:** محترم شیخ الجامعہ! جب پنجاب یونیورسٹی میں آپ کی تقرری بحیثیت وائس چانسلر کی گئی، اس وقت آپ نے کیا محسوس کیا؟ اور پھر محسوسات کی اساس جب آپ نے یونیورسٹی میں قدم رکھا اس لمحے آپ نے یونیورسٹی کی غیر یقینی صورت حال کو کیسے سنبھالا دیا۔۔۔؟

**وائس چانسلر:** مجھے ایک روز بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی گئی کہ میرا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت وائس چانسلر کیا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا کہ فوری احکامات کا انتظار کروں روز بعد چانسلر صاحب کی طرف سے تقرری کے احکامات موصول ہوئے جس کے مطابق اسی روز لاہور کا چارج سنبھالنے کی ہدایت کی گئی تھی چنانچہ چند گھنٹوں میں مختصر تیاری کر کے لاہور ا۔ ہوا۔ میرے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع اور اچانک تھی اور ملتان رد عمل یہ تھا کہ میرے سپرد ایک نہایت ہی مشکل کام کیا گیا تھا اس کے علاوہ اہالیان ملتان نے اپنے روایتی انداز میں ہمارے ساتھ جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا تھا، اس کی وجہ سے سرزمین ملتان سے سب سے گہرا لگاؤ ہو گیا تھا اس لیے وہاں سے یکایک روانگی کوئی خوش آئند تجربہ نہ تھی

جب میں پنجاب یونیورسٹی میں پہنچا تو یہاں کی سیاسی صورت حال انتہائی مخدوش تھی طلبہ سیاست کا میدان سب گرم اور شدید کشیدگی کا شکار تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے یونیورسٹی میدان جنگ کی سی شکل اختیار کر سکتی ہے طلبہ کے ۔۔۔۔۔۔ دونوں گروہ شدید عداوت کے عالم میں تھے ایک گروپ کو براہ راست حکومت سے رابطہ حاصل تھا، بیرونی غیر طالب علم عناصر کی مداخلت نے اس دشمنی کی حالت دگرگوں کر رکھی تھی روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے پوری انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ تنگ آ چکے تھے۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین سالانہ الیکشن بھی ہونے والا تھا جو اس سلگتی ہوئی آگ کو مزید ہوا دے کر بھڑکا رہا تھا۔

شروع روز ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ساتھ کٹھن ذمہ داری کا بوجھ ڈالا گیا ہے جس میں بظاہر نہ جانے رفتہ نہ جانے ماندن کی سی کیفیت ہے۔ اس مشکل امتحان کے پہلے ہی سال میں سیاست اور انتخابات یونین کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ طے کیا کہ ہر معاملے میں غیر جانبداری، رواداری اور نیک نیتی سے مسائل حل کیے جائیں تو یہ مشکل مرحلہ آسان ہو سکتا ہے، کیونکہ طالب علم معیار اور غیر جانبدارانہ رویے ہی سے اعتماد کی فضا قائم ہو سکتی ہے

اس معاذ پر طلبہ کے دونوں فریقوں کے درمیان جدا کا نام نے کر گفت و شنید کا آغاز کیا لیکن شروع میں مفاہمت کی کوئی امید دکھائی نہ دی۔ کیونکہ بیرونی عناصر طلبہ کو اس جانب بڑھنے نہ دیتے تھے اس پر حکومت سے درخواست کی گئی کہ غیر طالب علم عناصر کو یونیورسٹی کے احاطوں سے باہر رکھا جائے اور یہ کہ یونیورسٹی میں امن و امان کی صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہر معاملہ غیر جانبداری سے طے کیا جائے میری اس درخواست کا خاطر خواہ اثر ہوا غیر طالب علم عناصر کو جو یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دے رہے تھے، گرفتار کر لیا گیا اس کے بعد جب بارہ مشترکہ مذاکرات ہوئے، تو طلبہ کے درمیان ہم آہنگی کی فضا پیدا ہونے لگی

**محور:** پھر کیا ہوا۔۔؟

**وائس چانسلر:** اس ابتدائی ایکشن کے بعد طلبہ کے دونوں گروپوں اور اساتذہ نے مل کر ایک ضابطہ اخلاق ر انایا مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اس ضابطہ اخلاق کو اکثر معاملات میں طلبہ نے تسلیم کر لیا اور اس کے مطابق کسی بھی فیصلے کو ماننے سے پس و پیش سے کام نہ لیا جس سے اس لڑائی کا خاتمہ ہونا شروع ہوا

**محور:** آپ کی آمد کے تھوڑے دنوں بعد یونین الیکشن مکمل ہو گئے اس کے بعد حالات کو بتدریج کیسے کنٹرول کیا۔؟

**وائس چانسلر:** سٹوڈنٹس یونین کے غیر جانبدارانہ الیکشن میں طلبہ کی جو یونین کامیاب ہوئی، اس کے افراد کے ذہنوں میں میرے بارے میں لامحالہ طور پر شکوک و شبہات تھے، کیونکہ حالات ہی بظاہر ایسے تھے کہ جن میں میری تقرری ہوئی۔ لیکن میں نے جو عہد کیا تھا اس کے مطابق مکمل غیر جانبداری کے ساتھ الیکشن پروگرام مکمل کیا نتیجتاً طلبہ کی یونین نام طلبہ کے درمیان وائس چانسلر کے بارے میں یہ احساس و اعتماد پیدا ہوا کہ جس بات کا وی۔سی کی جانب سے اقرار و اعلان کیا جائے گا اسے بغیر کسی پس و پیش کے مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی اعتماد طلبہ کے دوسرے گروہ میں بھی پیدا ہوا اور اب تک خدا کے فضل و کرم سے یہ اعتماد جامعہ کی فضا کو پرسکون رکھنے کا سبب ہے۔۔۔ اور ہمیں کسی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا نہیں ہے۔

یونیورسٹی کے طلبہ کے مسائل کے سلسلے میں سٹوڈنٹس یونین سے رابطہ قائم کیا یا پھر جمہوری ضابطوں سے ہٹتے ہوئے یونین کی موجودگی میں طلبہ تنظیموں سے براہ راست بیرے ساتھ گفتگو کر کے محدود سے سا درحتی الامکان ہر جائز بات کو مانا اور مسئلے کو فوری طور پر حل کیا۔

اسی طرح یونیورسٹی ملازمین کے لاتعداد مسائل تھے جن کے سلسلے میں ان کی یونین سے کہا گیا کہ وہ اپنے تمام مسائل کی ایک جامع فہرست تیار کریں اور اپنی ایگزیکٹو کے ہمراہ ملاقات کریں۔ اس ملاقات میں ہم نے متعلقہ افسران کو بلایا ہوا تھا جو مطالبہ جائز تھا اور جس کا حل ہمارے اختیارات میں تھا وہ فوری طور پر حل کر دیا جن میں وہ حق بجانب نہ تھے، وہ باہمی گفت و شنید کے بعد واپس لیے گئے

پھر اساتذہ کی جانب سے یہ شکایت تھی کہ یونیورسٹی کے سالانہ بجٹ کے مطابق جن آسامیوں کو پُر کرنے کا وعدہ کیا جاتا رہا ہے وہ پیچیدہ طریق کار کے سبب پُر نہیں ہوتیں، نتیجتاً ان کی ترقیاں رکی ہوئی تھیں ظاہر ہے مدرس کا پیشہ ایک فطری امر تھا اور اگر استاد ہی بد دلی کا شکار ہو تو اس سے طالب علم کو کیا سکھا اور کیا پڑھا سکتا ہے؟ ہم نے اس مسئلے کو بہت تیز رفتاری سے حل کرنا شروع کیا، چار چار سال سے رکی ہوئی نشستیں ہوں یا ایک سال پرانا کیس، تمام کو ایک تیز عمل کے ذریعے مکمل کیا جس سے اساتذہ میں اطمینان کی فضا پیدا ہوئی۔ پھر اساتذہ کا دوسرا اہم مسئلہ رہائش کا تھا جسے حل کرنے کے لیے مسلسل رابطہ کے باعث لمبے اسی فوری طور پر، چھوٹے چھوٹے مسئلے سلجھائے اور یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے ہماری درخواست اور ملاقاتوں کے نتیجے میں چالیس مکانات کی فوری تعمیر کا حکم دیا، جو کہ تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت ہی بڑا اقدام تھا

**محور**

یہ تو تمام باتیں درمیں ایک طرف لیکن سر! یونیورسٹی شدید مالی بحران کا شکار ہے جب تک اس کا حل سامنے نہ آئے اطمینان کی مجموعی کیفیت پیدا ہونی ممکن ہی نہیں۔۔؟

**وائس چانسلر**

درست ہے کہ خسارہ یا مالی بحران کسی بھی ادارے کے نظام کو ہلا کے رکھ دیتا ہے جب میں یہاں آیا تو اس کے پانچ چھ ماہ بعد اچانک میرے علم میں بات لائی گئی کہ جامعہ شدید مالی بحران سے دوچار ہے اور کئی سالوں سے بجٹ کا خسارہ جمع ہوتے ہوتے ایک کروڑ سے تجاوز کر رہا ہے۔۔۔ ایسی صورت میں جامعہ کو ایک دن بھی چلانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا قرض کی حاجت تھی۔۔ یہ صورت حال جب اسلام آباد میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب کے علم میں لائی گئی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا گیا، تو انہوں نے کانووکیشن کے موقع پر وہ سارا خسارہ پورا کرنے کا اعلان کیا، جسے میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ کی فلاح و بہبود کا ایک اعلان تھا۔ اس دوران میں موجودہ ملکی انتظامیہ نے پونے دو کروڑ روپیہ کی رقم جامعہ کو مرحمت فرمائی جس میں خسارہ، مکانات کی تعمیر، مرمت وغیرہ کی مدات شامل ہیں

**محور**

پروفیسر صاحب! گذشتہ سال میں یونیورسٹی کی تاریخ کے اہم موڑ کون کون سے تھے۔۔؟

**وائس چانسلر**

سٹوڈنٹس یونین کے انتخاب منسوخ اور اس کی افتتاحی تقریب کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ پچھلے گیارہ سالوں سے یونیورسٹی کانووکیشن منعقد نہیں ہوا اس کے انعقاد کے مطالبے پر شدید زور دیا گیا، اور یہی خیال ہمارا بھی تھا کہ ساری دنیا میں اعلیٰ درسگاہوں کی یہ روایت ہے جسے روبہ عمل نہ لانا اس درسگاہ اور طلبہ کے ساتھ ایک زیادتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر بسبب سیاسی بے چینی اور ملکی صورت حال کی دگرگوں صورت حال تھی، لیکن اب تہیہ کر لیا گیا کہ یہ باوقار تقریب ضرور منعقد کی جائے گی خدا کا فضل ہے کہ یہ پروگرام ہوا اس کے ساتھ ساتھ اس عرصہ میں ہم نے اس بات کا اہتمام کیا کہ ہر مرحلے کی شکار تمام اسناد کامیاب امیدواروں کو بھیج دی جائیں، اس پروگرام کے تحت ارسال کردہ اسناد کی تعداد چالیس ہزار تھی۔۔۔!

ہمارے پیشرو جناب پروفیسر شیخ امتیاز علی صاحب نے امتحانات میں دھاندلیوں کے خلاف جو مؤثر ڈھانچہ ترتیب دیا تھا اسے مزید مضبوط بنایا گیا یہ اعلیٰ احتیاطی کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمے نگران عملہ کی جانچ پڑتال کے بعد تقرری اور اچانک چھاپہ مار کر بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے بہت سے ہنگامی اختیارات تفویض کیے۔

اگلا قدم حیات یونیورسٹی میں صد سالہ جشن اقبال کے سب سے بڑے پروگرام ۔۔۔ اقبال عالمی کانگرس ۔۔۔ کا انعقاد تھا یہ ذمہ داری مرکزی اقبال کمیٹی نے صد سالہ تقریبات کے بارے میں لگائی جس کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ، سٹوڈنٹس یونین، آفیسرز اور ملازمین نے اس قدر جانفشانی سے کام کیا کہ یونیورسٹی کا سر پوری دنیا میں فخر سے بلند ہوگا، علاوہ ازیں اس قدر مؤثر پروگرام ہوا کہ بیرون ممالک سے آنے والے مندوبین نے اس پروگرام کو عالمی سطح کے اثرات سے لبریز، سب لوگوں کی رائے تھی کہ اس قدر اعلیٰ اور منظم ترتیب کے اعتبار سے معیاری پروگرام ترقی یافتہ ممالک میں بھی آسانی ممکن نہیں ۔۔۔ بہرحال ہمیں مسرت ہے کہ خدا نے اس اعزاز کی لاج رکھی ۔۔۔ اس عالمی کانگرس کے نتیجے میں تمام اسلامی انقلاب علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے بارے ایک سازگار ماحول پیدا ہوا ان کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلوؤں پر تحقیقی مقالات پیش کیے گئے، پاکستان اور بیرون ممالک سے اقبال کے شیدائی اسکالرز کو مدعو کیا گیا ۔۔۔ انشاء اللہ جلد ہی ان کی تخلیقات کو اعلیٰ جلدوں کی صورت میں پیش کیا جائے گا ۔۔۔ مزید یہ کہ ۔۔۔ ہم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری فلسفہ اور پیغام کے بارے یونیورسٹی میں اقبالیات چیئر قائم کر رہے ہیں ۔۔۔!

طلبہ میں صحت مند اور غیر نصابی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے متعدد اچھے پروگراموں میں ان کی سرپرستی کی، علاوہ ازیں پاکستان ریاضی کانفرنس سائنٹفک و ٹیکنیکل کانفرنسیں بھی منعقد کی گئیں

**محور**

پروفیسر صاحب! آپ یونیورسٹی کے تعلیمی میدان میں سب سے زیادہ کس پہلو کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں؟

**وائس چانسلر**

میرے نزدیک ہمارے علوم میں ترقی کا راز سب سے زیادہ اہمیت و ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنسی تحقیقات کو تمام ترجیحات میں اولین حیثیت دی جائے اس سلسلے میں ہم نے سب سے پہلے ادارہ کیمیکل ٹیکنالوجی اینڈ انجینئرنگ یونیورسٹی کیمپس کالج کی عمارت میں منتقل ہونے سے لے کر سب سی ٹیکنالوجی سے متعارف کرانے کا عمل ایک اہم پروگرام ہے جس میں سب سامان اور ایکوپمنٹ بیرون ممالک سے منگوایا گیا ہے ان تمام امور کے تسلسل سے انشاء اللہ عنقریب یہ ادارہ پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ بن جائے گا

علاوہ ازیں دوسرے سائنسی شعبوں کے اساتذہ کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے اہم تحقیقی گرانٹ ملے ہیں، جن سے تحقیق و تفتیش کا عمل اور تیز ہوگا۔ اگر ملک کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو ساتھ منظم و فعال بنایا جاتا، ان میں نیا ڈسپلن اور بین الاقوامی سائنسی حرکت پیدا کی جائے، اس قدر سست تحقیقی میدان کو دیکھتے ہوئے محض رقوم کی کمی کے پیش نظر ان سہولتوں میسر نہیں لیکن اب صورتحال میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

## محاور

ڈاکٹر صاحب! کچھ حلقوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ سمسٹر سسٹم ناکام ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی پر اس الزام کا عملی کی حیثیت کے بارے میں آپ کے خیالات؟

## وائس چانسلر

دیکھئے! محض چند مقامات پر کچھ بے اعتدالیوں کی بنا پر پورے سمسٹر سسٹم کو ناکام قرار دینا کوئی دانشمندی نہیں۔ اگر اچھے سے اچھے نظام میں رکھیں کسی فرد کی غلطی کے سبب کوئی غلط عمل سر انجام پائے تو سارے نظام کو مسترد نہیں کر دیا جاتا۔ ابھی یہ نظام شروع ہی ہوا ہے اسے زیر ترتیب ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک سمسٹر سسٹم کی آزمائش حرکی ہے کہ اس سے قبل سسٹم میں پڑھانا استاد کا کام تھا مگر طالب علم کی صلاحیت کو جانچنے میں دو دو سال کے اسباق و امتحانات اور ذہانت و لیاقت کا پتہ نہیں چلتا تھا اور وقت زیادہ ضائع ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاس کورس سسٹم کے نصاب میں سرمایہ اور محدود وسائل کے ساتھ سمسٹر سسٹم میں ردوبدل سے طالب علم کو آگاہ کرنا آسان ہے اور کم وقت میں زیادہ علوم کا استفادہ کر سکتا ہے۔ یہاں نصاب کی تکمیل کا حق استاد کو ملتا ہے اور طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ امتحان اور سمسٹر کے ساتھ اپنی تیاری کر کے رہیں۔

آج جس قدر تیزی سے تخصصات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اس میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ کیا پڑھایا جائے اور کیسے پڑھایا جائے۔ سمسٹر کی اگلی خوبی یہ ہے کہ طالب علم پر بغیر کوئی زیادہ بوجھ ڈالے وہ کچھ دو سال میں پڑھایا جا سکتا ہے جو کہ دوسرے نظام تعلیم میں ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ طالب علم میں محنت، لگن اور ذوق پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ہر اسائنمنٹ کے لئے استاد کی رہنمائی سے اور زیادہ کام اسی طرح لے سکتے ہیں کہ کسی اہم حصہ علوم کا جائزہ لے کر طالب علم سے کہا جاتا ہے کہ وہ گھر یا لائبریری میں مطالعہ کر کے اس پر رپورٹ مرتب کرے اور یوں محض استاد کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ طالب علم بذات خود آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، یوں ہر طالب علم میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اساتذہ کی جانب سے اس امر کا خدشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے لیکن کہیں کہیں اساتذہ کی جانب سے کے الزامات والے امور میں حق کی انتظامیہ خود بھی سختی سے پڑتال کر رہی ہے اور امید ہے اس کا سدباب کیا جائے گا۔ لیکن صورتحال کوئی خاص نہیں، اطمینان کے ساتھ برائیوں کا وجود خارج از امکان نہیں۔

مجھے ذاتی طور پر جس بات کا شدید احساس ہے وہ یہ ہے کہ یہاں فرسٹ ڈویژن کی ریس کا ہے۔ اگر کوئی طالب علم کوئی امتحان پاس کر جاتا ہے تو معیار تعلیم اور ترقی و تعلیمی معیاروں پر بے دریغ دیا یونیورسٹی اور خود طلبہ و اساتذہ کے ساتھ ناانصافی ہے۔ بالفرض ایک طالب علم نے ڈگری حاصل کر لی لیکن عملی میدان میں وہ علم کے حاصل کرنے کے بارے میں قابلیت کی صلاحیت سے محروم ہے تو ظاہر ہے کہ اس یونیورسٹی کی ڈگری ایک سوال بن جائے گی، تو اور کیا ہوگا۔

یہاں اس خامی کا شکار ہو جائے کہ میں بیرون ملک کے بعض جامعات کی بات کروں، وہاں طلباء کو بھی سختی نہیں اور ڈگری بھی آسانی سے نہیں۔

## محاور

یونیورسٹی میں طلباء میں سیاست کے رجحانات کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

## وائس چانسلر

ترقی پذیر ممالک کے طلبہ کو آج کل کے ماحول میں سیاست سے الگ رکھنا ممکن ہے اور ان کا یہ تعلق کوئی بری بات بھی نہیں، بشرطیکہ اس سیاست کی نوعیت کے بارے میں علم ہو۔ بشرطیکہ وہ سیاست محض طلبہ مسائل کو حل کرانے اور صحت مند سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لئے ہو۔ اس سے بڑھ کر سیاست طلبہ کی سرگرمیوں کا دائرہ تو ہی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلباء کے ذہن کو محصور کر دے، بدقسمتی سے ابھی تک طلبہ سیاسیات کا سلسلہ خطرناک راستے ہی میں گم ہے۔ خدا کرے وہ اس سے نکل کر صحیح علمی و دینی مسائل کا حصول کر سکے!

جہاں تک ہماری یونیورسٹی کا تعلق ہے، اس میں سٹوڈنٹس یونین، طلبہ برادری کا سب سے زیادہ مقتدر ادارہ ہے جسے طلبہ منتخب کرتے ہیں تاکہ وہ ان کے مسائل ان کے احساسات اور خیالات کو وائس چانسلر تک پہنچا سکے۔ مگر ممکن نہیں کہ وہ یونیورسٹی کے مرکز سے بیٹھ کر ہر طالب علم کے پاس جا کر ان کے مسائل سے آگاہی حاصل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری طریقہ اختیار کرتے ہوئے ہر طالب علم کو ووٹ کا حق دیا گیا ہے، تاکہ وہ اپنی نمائندے منتخب کر سکے اور پھر وہ اپنی ان عادات پر پارٹی مفادات سے ہٹ کر اعتماد بھی کرے۔ یہی کسوٹی ہمیں بھی رکھنی چاہیے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ محض ایک پارٹی کا نمائندہ بن جائے، بلکہ پورے طلبہ کا اعتماد حاصل کرے۔

جہاں سٹوڈنٹس یونین کی بات تسلیم، اس کی جانب سے جائز مطالبات پیش کئے جائیں ان کو حل کرانا، خصوصی تعلقات والی بات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ یونیورسٹی کی جانب سے انتظامیہ میں احترام کرنا دراصل طلبہ ہی کے حق میں جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے کچھ لوگ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں وہ اسے جمہوری حقوق عوامی مسترد کرنے کے درپے ٹھہرتے ہیں۔ یہ میں سسٹم کے خلاف خود ہی دلیل دیتے ہیں۔

حضور! ایک بات ہماری اور طلبہ یونین کے درمیان طے شدہ ہے کہ وہ ناجائز کام نہیں کہیں گے اور نہ ہم کسی لمحے ناجائز مطالبہ مانیں گے۔ ان حقائق کی بنا پر لکھنے دیکھتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ طلبہ کی

یونین نے ہمیں کسی ناجائز کام کے لئے مجبور نہیں کیا۔

**محمود**

وائس چانسلر صاحب! آپ یونیورسٹیوں کی خودمختاری کے بارے کیا طریق کار پیش نظر رکھتے ہیں؟

**وائس چانسلر**

پہلی بات تو یہ کہ مجھے سرے سے اس بات سے ہی اختلاف ہے کہ یونیورسٹیاں خودمختار نہیں۔ اس وقت جس قدر خودمختاری یونیورسٹیوں کو حاصل ہے، اس پر اگر پورا اطمینان نہیں تو کم از کم بے اطمینانی کا بھی کوئی جواز موجود نہیں۔

یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ، بورڈ آف سٹڈیز، بورڈ آف فیکلٹیز اور دیگر شعبہ جات میں جو تمام اپنے پروگرام، اپنی ٹیچنگ کورس سمیت اور دیگر ضرورتوں کے بارے مکمل طور پر کاربند ہیں

اب یونیورسٹی کے ذرائع آمدن ایسے نہیں کہ وہ خود آزادانہ اسی کام ترجیحات کے مطابق ہی خرچ کر سکے، اسے لامحالہ طور پر حکومت سے اس سلسلے میں مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اور پھر جو ادارہ رقوم دے گا۔

اسے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ ان خرچوں پر کسی حد تک گرفت بھی کرے۔ ہماری یونیورسٹیاں رقوم تو حاصل کرتی ہیں لیکن حکومتوں کی مداخلت نہ چاہتے ہوئے بھی [illegible] آہستہ آہستہ خودمختاری کا عمل فطری طریقے سے نئے رخ لے گا کہ اس سلسلہ میں ہم کسی جلد بازی کے خواہشمند نہیں ——"

**محمود**

پنجاب یونیورسٹی کی نئی کیمپس میں منتقلی آخر کب مکمل ہوگی؟

**وائس چانسلر**

ہماری جانب سے ایک تفصیلی پروگرام اس سلسلے میں حکومت کو بھجوایا گیا ہے۔ اگر وہ منظور ہوگیا، تو انشاءاللہ سات سالوں میں یونیورسٹی نئی کیمپس میں منتقل ہو جائے گی۔ بڑے منصوبوں میں مرکزی لائبریری، کمیٹی، فیکلٹی آف فارمیسی، ایڈمنسٹریشن بلاک، ہیلی کالج شامل ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اورینٹل کالج اور لاء کیمپس سٹی میں رہے، کیونکہ اولڈ کیمپس کا پنجاب یونیورسٹی سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر اسے یکسر چھوڑنا اچھی بات نہیں، بہرحال یہ مسائل زیر غور ہیں!!

**محمود**

پنجاب یونیورسٹی سے گزشتہ آٹھ سالوں میں کتنے اسکالرز نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس وقت کتنے افراد نے رجسٹریشن کرا رکھی ہے

**وائس چانسلر**

یونیورسٹی آف دی پنجاب سے گزشتہ سات سالوں میں ۵۱ اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، جن میں ۲۴ افراد نے نیچرل سائنسز میں تحقیقی مقالات پر ایوارڈ حاصل کیا۔ اس وقت ۱۳۰ افراد نے ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرا رکھی ہے ——"

---

# تعلیم کا زہر

ایک بنگالی بوڑھا میرے دفتر میں سخت کلامی پر مائل تھا۔ وہ اپنے آپ کو پکا پاکستانی بتاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ مسلم لیگ کی تحریک کے روح رواں ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ پاکستان بنانے کے لیے وہ اپنی جد و جہد اور قربانیوں کا ذکر کرتا تھا، مگر یہ تسلیم بھی کرتا تھا کہ اس کا جوان لڑکا مکتی باہنی میں ہے اور گوریلوں میں شامل ہو کر پاک فوج کے خلاف جھڑپوں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ وہ سرنڈر ہو کر [illegible] کر رہا تھا۔

میرے بیٹے کا بدلہ لینے کے لئے پاک فوج مجھے تنگ کر رہی ہے۔ میں لاکھ کہتا ہوں کہ میں پکا پاکستانی ہوں۔ آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کے ساتھ شامل ہو کر اپنے بیٹے کے خلاف لڑنے کو بھی تیار ہوں، کیونکہ میرا شمار صرف پاکستان کا حامی ہے۔ مگر ساتھ ہی [illegible] مغربی پاکستانیوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی میری سنوائی نہیں ہوتی، میری کسی بات کا یقین نہیں کیا جاتا۔ بتائیے! میرا کیا قصور ہے؟"

میں نے ازراہ ہمدردی کہہ دیا کہ آپ کو تو خواہ مخواہ اپنے بیٹے کے قصور کی سزا مل رہی ہے۔ وہ بوڑھا فوراً شدت جذبات سے ناراض ہو کر بولا۔

"مجھے آپ کے قصور کی سزا مل رہی ہے۔ بحیثیت سیکرٹری وزارت تعلیم آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں مجھے اس کرسی کے تساہل کی سزا مل رہی ہے۔ میرا بچہ پیدائشی پاکستانی تھا مگر آپ کے اس نظام تعلیم نے اسے غیر پاکستانی بنا دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں تو اس ملک کے قیام کی تحریک میں پیش پیش رہوں اور دھن لٹا دوں اور یہی ملک پہلے تو میرا بیٹا نگل لے اور پھر مجھے اس کے جرم کی سزا دے۔"

خواتین و حضرات! ایسے سوالات صرف بہاری اور بنگالی ہی نہیں پوچھتے بلکہ [illegible] اور پھر بھی [illegible] سوال ہے——" (ماخوذ [illegible] مسعود حق کی ذاتی ڈائری کا ایک ورق)

نصاب پر نظرثانی کے لیے ــــ گمراہیوں سے نجات کے لیے ــــ گزشتہ وقت کی سیاہیاں دھونے کے لیے

# تعلیم کا مستقل کمیشن قائم کیجئے

کی تعلیمی پالیسی میں فرمایا گیا "قومی مقاصد اور ... ۱۹۷۲ء صرف قوں کے سانچے کے اندر تعلیمی اداروں کو ... رسی آزادی یا اندر سیاسی خودمختاری کی ضمانت دی جائے گی۔ منشور ... وتی مالعادہ اور رنگین وعدوں کے ساحری تھے۔ اُن کے نزدیک ... ضروری نہیں تھا کہ جو لکھا یا کہا جائے اُس پر عمل بھی لازم ہے علاوہ ... فرماتے اس سے برعکس مراد لیتے۔ اور اُن کا سارا طلسم ہوشربا ... سے دھوبی کا ... پوری کی پوری تعلیمی پالیسی اس کی عکاس ... لرزم کو کاغذی گھوڑے سے کر سلایا گیا۔ ان کے نامسعود دور میں ... تعلیمی نظام جس پستی تک پہنچا، اس سے نکلنے کے لیے طویل مدت ... درکار ہوگی۔ عبوری حکومت نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں اُلجھے کے ... ے السا کسی مقرر کرے جو پیلر پہلی کے نشانات مد کا مکمل جائزہ ... مرض کی تشخیص کے بغیر علاج کا ارادہ بے معنی ہے مسائل جانے ... مدد کے لیے مسودہ بندی دانائی نہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی ... پالیسیوں وغیرہ سے کا اعلانات محض ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہوتے ... عبوری حکومت کو یہ کام مستقل حکومت پر چھوڑ دینا چاہیے، ... فی الحال کمیشن قائم کرنے کے علاوہ ایجوکیشن کونسل کے قیام کو تکمیل ... توجہ دی جانی چاہیے کہ تعلیمی پالیسی کی ساخت وتعارکا اصل یہی ادارہ ... ہے۔ گزشتہ تیس برس میں اس بدنصیب ملک کی پالیسیوں ... کا حشر کیا ہوا ہے؟

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سب سے پہلے ہدف متعین کیجئے۔ آپ کو مکہ اور مدینہ کی طرف جانا ہے یا ماسکو اور پیکنگ ... سمت؟ پہلے منزل کا تعین فرمایئے پھر جہت سفر اپنایئے۔ اگر ... آپ خلوص دل سے اسلام کا ضابطۂ حیات اپنانا چاہتے ہیں تو اس ... کے لیے الحاد، لادینی اور اشتراکی عناصر کے ذریعے کس طرح ممکن ہے ... جو کے ساتھ وجود رہتے آپ کی صفوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ جس طرح کسی سچے مسلمان کے لیے اشتراکیت کا پرچار ناممکن ہے۔ اسی طرح غیر مسلم عناصر سے اسلام پر کاربند ہونے کی توقع عبث ہے۔ ہمارے نزدیک کوئی تعلیمی پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے مخالف اس نظام کے اندر موجود ہوں۔ اس وقت سکولوں اور کالجوں میں اسلام بیزار افراد گھسے ہوئے ہیں۔ یہ سادہ لوحی ہوگی کہ ان سے اسلامی نظام کے نفاذ کی امید رکھی جائے۔ تعلیم سارے نظام کی اساس ہے۔ اگر تعلیمی اداروں میں غلط افراد غلط تعلیم دے کر غلط شہری پیدا کرتے رہیں گے تو صحیح نظام اور مسلمان معاشرے کی توقع احمقوں کے سوا کچھ نہیں۔ اگر روس میں کوئی مذہب پسند یا امریکہ میں کوئی کمیونسٹ کسی سرکاری عہدے پر تعینات نہیں ہو سکتا، تو کسی مسلمان ملک میں اسلام دشمن افراد کی پرورش ایسے ہے جیسے ملی وجود و وحدت کا گلا گھونٹا جائے۔ اس لیے ہماری دانست میں اب سرکاری ملازمین سے بالعموم اور اساتذہ سے بالخصوص یہ تحریری حلف لیجئے کہ وہ مسلمان ہیں، خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور پاکستان کے جاں نثار ہیں۔

اس وقت کئی تعلیمی اداروں کے اساتذہ جن سے ہم واقف ہیں، در پردہ اور برملا اسلام بیزاری کی تبلیغ میں مصروف ہیں ــــ کہیں کہا جاتا ہے "اسلام ترقی دشمن مذہب ہے" کہیں نرسود ... علماء کی رہنمائی کو ناممکن کہا جا رہا ہے۔ دگرنا جس چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا اُسے یہ جدید ممتحن "حلال" قرار دے رہے ہیں۔ اکثر پردے کا مذاق اُڑایا جاتا ہے اور کہیں شراب اور جوئے کی سرپرستی کا نام ہے۔ کیا ان عناصر سے اسلام پر مخلصانہ عمل یا اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کی توقع کی جا سکتی ہے؟ سیاسی اختلاف اور بات ہے لیکن دین کی مخالفت اور اس پر طعن زنی ناقابل برداشت ہونی چاہیے۔ کسی بھی تعلیمی پالیسی کے نفاذ سے پہلے اس محاذ پر توجہ اہمیت رکھتی ہے۔ اچھے سے اچھے مقاصد کو بھی بے دین اور غیر مخلص افراد خطرناک بنا سکتے ہیں۔ پہلے چھان پھٹک کیجئے، ہر صحبت کی اصلاح کیجئے۔

جب تعلیمی پالیسی قومی مقاصد کا ذکر کرتی ہے تو یہ باتیں لقیناً ذہن میں آتی ہیں۔ اور ان سب سے اہم یہ ہے کہ قومی مقاصد کیا ہیں؟ ستم تو یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی نے قومی مقاصد کی کوئی تشریح نہیں کی۔ حالانکہ اس کی وضاحت شرط اوّل تھی کہ جب تک قومی مقاصد کا علم نہ ہو تعلیمی ہدف معلوم ہو، نہ تعلیمی نظام یا پروگراموں ... سے اشتراکی عناصر تو چاہتے تھے کہ ادھر چاہتے ہیں کہ اسے گول مول رکھا جائے، ان کا اصل ہدف منافقت اور فریب ہے۔ جب اس مملکت کی بنیاد ہی لا الٰہ الا اللہ پر ہے، تو ہمارے قومی مقاصد اسلام سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہمارے قومی مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار، اطاعت رسولؐ، تقویٰ، آداب مصطفویؐ، اخوت اسلامی، اخوت عام وغیرہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم ان کا مظہر ہونا چاہیے۔ ہمارے نصاب کو ان کا احاطہ کرنا چاہیے اور ہمارے اساتذہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے چاہئیں۔ ہمارے قومی مقاصد نظریۂ پاکستان سے الگ نہیں ــــ اور تعلیمی پالیسی میں نظریۂ پاکستان بھی مبہم رہنے دیا گیا۔

تعلیمی اداروں کو درسی آزادی اور مناسب خودمختاری کی ضمانت بھی بہرحال انہی قومی مقاصد کے دائرے کے اندر رہنی چاہیے۔ جس کی وضاحت ہم اوپر کر آئے ہیں۔ "درسی آزادی" کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تعلیمی اداروں میں سیکولر کے حامی یہ درس بانٹیں، خدا اور رسولؐ کو بحث کا موضوع بنایا جائے۔ اسلام پر نشتر کے جائیں۔ کیا اشتراکی عناصر اسی قسم کی درسی آزادی کی روش میں ضمانت دیے گئے ہیں؟ کیا وہاں کارل مارکس یا لینن پر تنقید کی اجازت ہے؟ کیا اشتراکیت کے خلاف دعا سیاق ہو سکتے ہیں؟ کیا سرمایہ داری کی تائید میں لب واہوتے ہیں؟ کیا یہ ...

پر عمل کرنے کی آزادی ہے؟

اگر روس، نظریاتی مملکت کے طور پر، ان آزادیوں کا متحمل نہیں ہے تو پاکستان بھی ایک نظریاتی مملکت ہے، جہاں سب کچھ کر گزرنے کی آزادی کا تصور محال ہے۔ اگر ہم روس کو اشتراکیت پر کاربند ہونے سے منع نہیں کرتے، تو اشتراکی حضرات کو بھی ہماری نظریاتی سرحدوں کا پابند ہونا چاہیے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا فلسفہ حیات اور نظام زندگی ان کے لیے ناقابل قبول ہے تو وہ بصد شوق اشتراکی ممالک میں بسر اوقات کریں، نہ انھیں ہمارے "مسائل" سے الجھنے کی ضرورت ہوگی نہ ہم پریشان ہوں گے، اگر وہ وہاں کی فضا میں سانس لیں، لیکن اگر کسی کو پاکستان — ایک اسلامی مملکت — میں رہنا ہے تو اسے اسلام کے ضوابط قبول کرنا ہوں گے۔ وقت آ گیا ہے کہ رواداری اور مروت کا ملمع اتار دیا جائے اور صاف صاف حدود متعین کر دی جائیں۔

تدریسی آزادی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ علمی اداروں میں اسلام کی مخالفت پڑھانے کی تعلیم دی جائے اور نہ یہ مطلب ہے کہ جس کا جو جی چاہے پڑھاتا رہے۔ ایجوکیشن کونسل کے قیام کے بعد پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک کے نصاب نظریاتی ضرورت کے مطابق مرتب کرنے والے نصاب تشکیل دینے والے نام نہاد اسلام سے بیزار لوگ تھے۔ ان کی دلی کوشش تھی کہ پاکستان میں وہ افراد پیدا کیے جائیں جو اسلام سے گریز کریں۔ اس طرح کے نصاب سے اخلاق حسنہ بالخصوص وہ جن کا مدار اسلام پر ہے خارج کر دیے گئے، اور پانچ برس کے مختصر، بلکہ طویل عرصے میں مشاہدے میں آیا کہ پوری قوم ان سے عاری ہو گئی۔ حکام ہی دروغ گوئی اور فریب کو شعار بنائیں، تو سچ کی تعلیم کہاں سے آتی ہے؟

تدریسی آزادی کا وعدہ محض فریب تھا اور کسی تعلیمی ادارے کو یہ جرأت نہ رہی کہ وہ کھل کر اسلام کی بات کرے۔ آج یونیورسٹیوں کے جو وائس چانسلر اور سائنسی اداروں کے چیئرمین وغیرہ اسلام کا ذکر کر رہے ہیں، چند ماہ پہلے پیپلز پارٹی کی جمہوریت میں اشتراکی فلسفے کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ مجھ سے ایک تعلیمی بورڈ کے ایک چیئرمین نے کہا: "اردو ڈائجسٹ، زندگی، اسلامی جمہوریہ وغیرہ پڑھنا بڑی بات ہے، ہم لوگ تو بعض اسلامی موضوعات پر کوئی رسالہ یا کتاب منگا لیں، تو سی آئی ڈی ہمارے پیچھے لگ جاتی ہے۔" یہ بھی وہ تدریسی آزادی جس کی "عوامی تعلیمی پالیسی" ضامن بنی تھی۔

⁂

اس کے علاوہ فرمایا گیا کہ تعلیمی اداروں کو مناسب خود مختاری بھی عطا ہوگی۔ اول تو اس ترکیب میں "مناسب" کا لفظ تشریح طلب ہے، یعنی یہ مناسب کس لحاظ سے، اور کس معیار کے مطابق؟ کیا مناسب خود مختاری یہ ہے کہ مثلاً اسلامی جمعیت طلبہ کو کالج کی یونین کا انتخاب کر لینے پر سزا دی جائے، یا اسلام کا نام لینے والے اور اسلام پر عمل کرنے والے اساتذہ کو احتساب کی چکی میں پیس دیا جائے، یا حکام وقت کی خوشامد کو پسند نہ کرنے والے افراد کو ترقی نہ دی جائے، یا امتحانوں میں بے قاعدگیوں سے روکنے والوں پر پرچے درج کر کے ان کے دروازے بند کر دیے جائیں؟ یہ سب کچھ سابقہ حکومت کے سیاہ دور میں ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ کے انتخابات (منعقدہ ۱۹۷۳ء) میں پانچ منتخب ارکان میں سے چار اسلامی ذہن رکھنے والے افراد بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے، تو پیپلز پارٹی کی حکومت سخت بوکھلا گئی۔ انھیں "انعام" یہ دیا گیا کہ ایک سال تک یونیورسٹی سینیٹ کا ایک بھی اجلاس نہ بلایا گیا۔ وائس چانسلر کو بھی حکام وقت سے سرتابی کی مجال نہ ہوتی اور وہ اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر رہے کہ حکم ملے تو اجلاس بلائیں۔ کیا یہ بات "مناسب خود مختاری" کی حدود میں آتی ہے؟

یونیورسٹی ایکٹ کا مطالعہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اس میں بار بار یہ کوشش کی گئی کہ کہیں مخالف عناصر کو غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں کے صدر، مدت ملازمت کے لحاظ سے سب سے سینئر پروفیسر ہوتے تھے۔ پیپلز پارٹی کو یہ شبہ ہوا کہ اکثر شعبوں کے صدر اسلامی ذہن رکھتے ہیں، اور اگر وہ ریٹائرمنٹ تک صدر رہے تو اشتراکیت کا پودا مرجھا جائے گا، چنانچہ اپنے پٹھوؤں کی مدد سے قانون بنا دیا گیا کہ صدر شعبہ ہر دو سال بعد بدل دیا جایا کرے گا اور یہ عہدہ اوپر کے چار پروفیسروں میں باری باری منتقل ہوتا رہے گا۔ یونیورسٹی کے واقف حال حضرات کا کہنا ہے کہ اس چکر بازی نے پورے تدریسی نظام کو چکرا کر رکھ دیا ہے، اور عارضی صدر ہونے کے باعث کوئی صدر شعبہ نہ مستقل پالیسی تشکیل دے سکتا ہے، نہ ڈسپلن قائم رکھ سکتا ہے، اور نہ اپنے رفقائے کار پر کنٹرول رکھ سکتا ہے۔ اگر آج صدر شعبہ ہوتے ہوئے وہ کسی سے باز پرس کرتا ہے تو اس کے ہٹتے ہی اس کا ماتحت اس سے بدلہ لے سکتا ہے۔ گویا اس "مناسب خود مختاری" کی صلاحیت نے نظام تدریس تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔

کوئی مانتا تھا کہ اگر گورنر اور اس کے درباری، وائس چانسلر کے مشورے کے بغیر یونیورسٹی میں دخل اندازی کی جسارت نہ کرتے اور وائس چانسلر انتظامی اور تدریسی امور میں خود مختار ہوتا۔ جب وائس چانسلر حکومت کے کاسہ لیس بن گئے تو یونیورسٹیاں سیاست کے اکھاڑے بن گئیں۔ یونیورسٹیوں کو اپنے اعمال میں آزاد اور سیاست کی دخل اندازی سے مامون کر دیجیے، انھیں صرف اصولوں کے سامنے جواب دہ بنائیے، تو صحیح خود مختاری کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی وزیر کے بھتیجے نے بدقسمتی سے تھرڈ ڈویژن میں بی اے پاس کیا۔ وزیر صاحب اس کا وائس چانسلر سے بروقت ذکر نہ کر سکے، پھر آنے کے بعد انھوں نے وائس چانسلر سے شکایت کی، اور کہا: "تھرڈ ڈویژن بی اے کیا کرے گا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔" وائس چانسلر صاحب نرمی سے بولے "حضور! آپ ارشاد فرمائیں تو داخلہ کر دیجیے۔" وزیر صاحب کچھ نہ سمجھ پائے، تو وائس چانسلر نے عرض کیا: "غلام پر چھوڑ دیجیے، آپ فکر مند نہ ہوں، ہمارے ہاں ڈپٹی کنٹرولر یا ڈپٹی رجسٹرار ہو جائے گا۔"

⁂ ⁂ ⁂

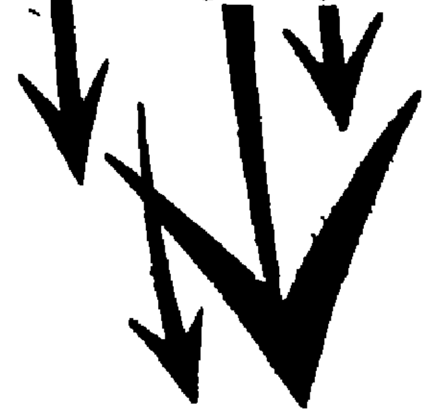
کالجوں کا حال اس سے زیادہ ناگفتہ بہ ہو گیا۔ "قومیانے" کا مطلب ہی یہ تھا کہ آزاد خیال، یا حکومت سے اختلاف کے تمام رستے بند کر دیے جائیں۔ حکومت کے "رفقا" (خواہ وہ ۱۶ ویں گریڈ میں تھے) پرنسپل بنا دیے گئے اور ۱۹ ویں گریڈ کے پرانے افسران کے ماتحت لگائے گئے۔ طلبہ کی یونینوں کے انتخابات میں دل کھول کر اشتراکی ذہن کے عناصر کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان انتخابات میں سرکاری رقم بے دریغ خرچ کی گئی اور اسلحہ تک فراہم کیا گیا۔ نہ وہ خود مختاری ہی جس کا ڈھول تاشے سے اعلان فرمایا گیا تھا۔ "خود مختاری" ضرور دے دی کہ کالج اور سکول قومیائے جانے سے پہلے والے نام کے ساتھ "گورنمنٹ" کا لفظ چاہیں، تو لکھیں، چاہیں نہ لکھیں۔ ویسے جملۂ معترضہ کے طور پر، ہماری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول یا گورنمنٹ مشن کالج لکھنے کی کیا تک ہے، اور کب تک یہ ڈھکوسلے جاری رہیں گے؟

⁂

مالی، تعلیمی اور بورڈوں کی خود مختاری کا تو جنازہ ہی نکال دیا گیا ہے۔ ایکٹ کی رو سے چیئرمین سے چپڑاسی تک، ڈائریکٹر تعلیم کے "ذاتی ملازم" کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ڈائریکٹر تعلیم جسے چاہے ملازمت دے، اور جسے چاہے جواب دے دے۔ وہ چیئرمین کسی سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف امتحانوں کے سوال مقرر کرنا، نتائج کی خبر اور رپورٹیں لکھنا رہ گیا ہے۔ خود چیئرمین کو مساوی عہدہ کی کوئی ضمانت حاصل نہیں۔ ڈائریکٹر تعلیم چاہے، تو تقرری کے ساتھ ساتھ پروانۂ برخاستگی بھی عطا کر سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ چیئرمین تعلیمی پیشہ سے تعلق رکھتا ہو۔ ڈائریکٹر تعلیم کا کوئی بھی منظور نظر اس عہدے پر فائز ہو سکتا ہے، اور جب تک ووٹ کی لوٹ کو لوگ زبان سے پسند کرتا ہے، فائز رہ سکتا ہے۔ بورڈ کے پاس کوئی خالی اسامی ہو یا نہ ہو، یا کسی عہدے دار کی ضرورت ہو یا نہ ہو، ڈائریکٹر تعلیم "حکم حاکم" سے عہدہ تخلیق کر سکتا، اور تقرری کا حکم نامہ جاری کر سکتا ہے۔ یہ صرف داستانوں تک محدود نہیں رہا کہ "شہر پناہ کا دروازہ کھلتے ہی اندر آنے والے پہلے شخص کو تاج سلطنت پہنا دیا جائے گا"، ہم نے اپنی زندگی میں اس کی تعبیر دیکھ لی ہے۔

ہم پھر بصد ادب عرض کریں گے کہ شعبۂ تعلیم میں تحقیق احوال کے لیے مستقل کمیشن قائم فرمائیے، اور اس کمیشن کو مستقل بنا کر تعلیمی و تدریسی معاملات کی مستقل نگرانی اس کے سپرد کیجیے۔ جب تک خود مختاری کی قرار واقعی ضمانت کے ساتھ ساتھ، مناسب نگرانی اور رہنمائی کا بندوبست نہیں کیا جاتا، تعلیمی اداروں میں تعلیم کے سوا سب کچھ مل جائے گا۔

شہید مشرقی پاکستان کے محب وطن — البدری طلبہ، غازیوں اور مجاہدوں کی لازوال قربانیوں کی لازوال تاریخ کے چند اوراق



سلیم منصور خالد
شعبہ پنجابی زبان و ادب

# سعادت کی زندگی — شہادت کی موت ؟

پاکستان کا مشرقی بازو ہم سے جدا ہو گیا، بے اعتدالیوں کے باعث مسلسل بارہا مسئلے پر مسئلہ — پھر بھی بات بھی مسئلہ — " ہر بڑی بات بھی ناسور کی مانند کھکھاتی رہی — ان مسئلوں — مجیب، نسل ہے مسئلہ — بالآخر طلوع تو ایسا ہوا کہ سیاست دانوں نے جھولی بھری — پاکستان — پاکستان رہا، مگر مسلمان دو ٹکڑے ہو گیا — نظریہ پاکستان آج بھی اٹل حقیقت، لیکن مشرقی پاکستان اور نظریہ مغرب دو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم — حصوں میں منقسم "

## پس منظر

دسمبر ۷۰ کو پاکستان میں پہلے عام انتخابات ہوئے، ہر دو بازوؤں میں علاقائی پارٹیاں کامیاب ہو گئیں — ایک طرف عوامی لیگ والا شیخ مجیب اور دوسری جانب پیپلز پارٹی والا بھٹو — دونوں — دونوں سخت دھرم — جب کہ سیاست نام ہے اعتدال کا — رواداری کا — اور ذاتی و گروہی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح کا — لیکن ان دونوں شخصیتوں میں یہ جذبہ رواداری کہاں؟ یہ دولت نایاب — یہ — — قسمت قوم کی مداوا تی سوچ لے کر اور ان کی بکھرائی کے لیے گیدڑ انتخاب کر لیے — ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا سامان اپنے ہاتھوں کر لیا — "

ادھر مغربی پاکستان میں لہو کی ندیوں کے بہانے کی بات اگر تصور کر سکتا تھا تو ادھر محب اسے حواروں کے ساتھ ندیوں پر دریاں، گنگا کی گنگا، لہو لہو کر رہا تھا — مگر کس سے — ہاں اپنے بھائیوں — بہاری مسلمانوں، پاکستان سے محبت کرنے والوں کے لہو سے " درج حالات سچ گئے تھے کہ بستیوں، قصبوں، شہروں کے ہاتھوں میں مکر پر وار — اسلحے سے پُر مراکز — ٹرینوں اور بستیوں سے بھری بستیاں لہو کی پیاسی — لہو سے تر — "

۱۹۷۱ء جنوری، فروری میں گھٹائیں اٹھیں، مارچ کے پہلے ہفتے میں کھل کر برسنا شروع ہوئی اور — شور گھٹائیں — گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم اٹھیں — سرخ بدلیاں کڑکتا پاکستان کا پرچم تار تار ہو گیا — ہاں وہ چھاتیوں میں اپنی پیاس بجھا رہے تھے — ہندوؤں کی صورت میں " اور ایک لاکھ بستیاں — — عورتیں عصمت و آبرو — مال و جان سمیت آرائش کی اس دھکتی میں جلتی ہوئی روئی کے مانند ادھر سے ادھر ٹکڑے ٹکڑے — مگر قوم کو — اسلام زندہ باد — پاکستان زندہ باد —

نعرے لگاتے ہوئے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتے — پڑتے رہے

— سیاست دانوں کی حماقتیں

— حکمرانوں کی کم عقلیوں کے نتیجے میں وہی ایکشن ناگزیر ہوا — مگر وہاں پاک فوج آنکھوں کے بغیر حرکت ثابت ہوئی کیونکہ تمام بنگالی فوجیوں نے بغاوت کر دی — " ایسٹ پاکستان رائفلز " نے بھی اسلحہ لے کر بیسیوں رائفلز کو نا کامل بنا لیا — " حکومت پاکستان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ قوم پرستوں نے متوازی حکومت قائم کر لی — ریڈیو، ٹی وی نے سارا شگر کا اعلان ابتداء کر دیا — نشریات کا پروگرام کیا مچ گیا — عدلیہ نے دم توڑ دیا — فوجی ایکشن سے ملک عارضی طور پر تباہی سے بچ گیا — سرحدیں جاگ جاگ — پیسے دوا اور اناج — سرحدی پہرہ کے — پاک فوج خالی ہاتھ تھی — " مواصلاتی نظام درہم برہم تھا — رابطے کٹ گئے — شرپسند بھارت پہنچ رہے — مسلح ہوتے رہے گوریلا کارروائیاں کرتے رہے — پاک فوج بنگالیوں کے بغیر — بنگال میں کوئی مثبت کارروائی کرنے سے قاصر رہی — "

بھارت اور اس کا آلہ کار — اپنے گماشتوں یعنی مکتی باہنی کو تربیت دے دے کر — اسلحہ سے مسلح کر کے — بھارتی فوج کی کمانڈوز کے ہمراہ پاکستان کی سرحدوں میں لاتے رہے — پہلے سے زیادہ رفتار اور قوت میں رسائی بڑھاتے رہے — ہوش سنبھالت میں اپنے ہی بنگالی بھائیوں کے لیے پال کے ٹکیوں میں سرطان رہے — پاک فوج اور پاک حمایت رکھنے والے محب وطن لوگوں میں مارے جاتے رہے — پیشے میں رضاکار فورس اور " امن کمیٹیوں " کو تشکیل دیا گیا، لیکن رضاکار فورس میں بھی کئی باہنی کے جاسوس نکلے — معاملہ اُلٹ گیا — پاک وطن — پاک وطن ہی میں بے گانہ بن گیا — اعتماد کی سطح کو کھتا ہوا دیکھتا رہا — "

## تاسیس

مارچ، اپریل اور مئی کے مہینوں میں محب وطن پاکستانی آ مائش کی بہیں، ملکہ آہیں و آنسو اور لہو کی کشتی میں سلگتے رہے — سسکتے رہے — ایسے عالم میں " قال الله و قال رسول الله " کہنے والے بچے اور نوجوان آگے بڑھے — پاک فوج کے ہمراہ مظالم کے لیے نہیں بلکہ سالمیت پاکستان کی جنگ میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے قدم اُٹھایا — " رضاکار "

میں جہاں دیگر گروہوں کے لوگ موجود تھے وہیں ـــ اعلیٰ کردار ـــ بہترین صلاحیتوں ـــ تقویٰ اور جرأت جذبے میں "اسلامی جمعیت طلبہ" کے کارکن اپنے امتیازی مزاج ـــ سے نمایاں سے پہچانے جاتے تھے ـــ ۔ دوسروں نے مسلسل کشمکش رہنے کے باعث جمعیت طلبہ کے کارکن ہی پریشان تھے اور پاک فوج کو بھی ہندوؤں کے خلاف اس مسلسل جنگ میں با اعتماد عنصر کی ضرورت تھی۔ اس عالم میں جمعیت نے بھی فیصلہ کر لیا کہ جمعیت ایسی کسی تنظیم میں حصہ نہیں لے گی جس میں حصہ لینے سے جمعیت کی حب الوطنی اور خلوص و دیانت میں دراڑ پڑ جائے۔

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کا تاریخی دن طلوع ہوا۔ آزادی کے لحاظ سے بنگلہ دیش کے سب سے بڑے ضلع "میمن سنگھ" (میمن سنگھ) کے چھوٹے سے شہر ـــ شیرپور (SHERR PUR) میں البدر کی تشکیل کرنل عبدالعزیز اور میجر ریاض کے زیر نگرانی میں ہوئی ـــ جنہوں نے ، فوج سے تربیت حاصل کرنے والے اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان اور کارکنان کے ہم خلوص پر مسلسل تیج کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"آپ جیسے سیرت کردار اور بااصول جذبہ رکھنے والے فرزندان اسلام ہی کو حق پہنچتا ہے کہ انہیں "البدر" کے نام سے پکارا اور پہچانا جائے ـــ آپ کے گروپ کو آج سے "البدر" کہا جائے گا۔"

اس کے پہلے کمانڈر حسن کامران (متعلم ایف ایس سی) امیدوار رکنیت اسلامی جمعیت طلبہ ضلع میمن سنگھ مقرر ہوئے ـــ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جمعیت کے کارکنان البدر کی صورت میں منظم ہوتے چلے گئے اور دسمبر ۱۹۷۱ء تک پورے مشرقی پاکستان میں جمعیت کے تمام کارکنان ـــ البدر کیڈٹ بن گئے ـــ۔

## تنظیمی ڈھانچہ

البدر میں شامل کارکنوں کے کردار، عمل، جذبے میں ملائک معرکہ بدر کے جانثاروں کی جھلک پائی جاتی تھی جمعیت کے تحت اس کا تنظیمی ڈھانچہ حسب ذیل تھا۔

- ۱۔ یونٹ ـــ ۳۱۳ کیڈٹس ( CADETS )
- ۱۔ یونٹ = ۳ کمپنیاں ـــ اور ہر کمپنی میں ۱۰۴ مجاہد ۔
- ۱ کمپنی = ۳ پلاٹون ـــ اور ہر پلاٹون میں ۳۴ غازی ۔
- ۱ پلاٹون = ۳ سیکشن ٹروپس ـــ اور ہر ٹروپ ۱۱ جانبازوں پر مشتمل تھا ـــ۔

"البدر" کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ۲۰ اضلاع ہیں اور ہر ضلع میں سے لے کر چار تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ ہر ہر تحصیل و سب ڈویژن میں البدر کا کم از کم ایک ایک یونٹ قائم تھا اس طرح یہ تنظیم پورے مشرقی پاکستان کی شاہراہوں پر پھیلی ہوئی تھی ـــ"

## تقسیم کار

وسیع تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے البدر کے ہر یونٹ کے تین شعبہ جات تھے ـــ۔

FIGHTING DEPARTMENT (I)

DEPARTMENT OF CIVIL AFFAIRS (II)

DEPARTMENT OF INTELLIGENCE (III)

**پہلا شعبہ** ـــ اسی کے تحت البدر کیڈٹس پر مشتمل جماعتوں کی ذمہ داری مسلح دستوں کی صورت میں دشمن سے عملی نبرد آزمائی، گوریلا جنگ، قومی املاک کی حفاظت اور جارحیت کا مقابلہ تھی ـــ۔

**دوسرا شعبہ** ـــ عوام سے رابطے کے لیے بنایا گیا جس کی ذمہ داری رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا کیونکر عوام مسلسل افواہوں، بی بی سی، آل انڈیا ریڈیو کی خبروں سے سخت پریشان کا شکار ہوئے جاتے تھے اس غلط پروپیگنڈے کا جواب دینا، حقائق سے آگاہ کرنا، حوصلہ اور عام کا اعتماد بحال کرنا، انکو امن طلبہ واپس مدد کو تحفظ دینا اس شعبے کے ذمہ تھا ـــ۔

**تیسرا شعبہ** ـــ اندرون ملک شرپسندوں کی ملک دشمن کارروائیوں سے متعلق صحیح اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا جس کے ذریعے فوج اور البدر فائٹنگ فورس دشمن کے نقل و حرکت اور سرگرمیوں کا اندازہ لگاتے ـــ

دوسرے اور تیسرے شعبے میں البدر کے تین تین کیڈٹ رضاکارانہ طور پر ہمہ وقتی کام کرتے ـــ۔

علاوہ ازیں ـــ البدر کی ایک میڈیکل کور بھی جو میڈیکل کالج کے کارکنوں پر مشتمل تھی اس میں سائنس جمعیت ڈاکٹرز بھی شامل تھے۔ (سکول ـــ البدر کراچی اکتوبر ۷۲ء)

## قیادت کا معیار

البدر فورس کی تنظیم کا سب سے اہم حصہ اس کی قیادت تھی کیونکہ دیگر ہر طرح کی تنظیموں میں مشکل ترین مرحلہ قیادت کے چناؤ کا ہوتا ہے۔ مگر اپنے مستقل رعب کے کام اور ذہنی طور پر مقصد کے لیے بالکل واضح ہونے کے سبب ـــ کبھی قیادت کا مسئلہ پیدا ہوا اور نہ ہی اختلاف کی نوبت ہنگامہ خیزی ـــ چونکہ جمعیت کے تحت قیادت کے چناؤ کا وہ ٹھوس اصول پہلے سے ہے کہ قیادت کا معیار ہمیشہ اپنے میں سے تقویٰ، فہم، دیانت، راہ حق میں استقامت پر استوار ہے اور یہ معیار دنیا کی دیگر تمام تنظیموں، آرگنائزیشنوں سے سراسر مختلف ـــ۔

چنانچہ اسی اصول کے تحت پاکستان البدر فورس کا کمانڈر انچیف سابق پاکستان اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ تمام مقامات پر بھی اس اعتبار سے جمعیت کے ناظمین ہی البدر کے کمانڈر اور

جمعیت نے بھی انتخاب قیادت میں اولین قیادت جمعیت کی تیار کی ہوئی تھی جس کا علم ہو کر یہ بات مان لی گئی کہ اس تنظیم کی قیادت فکری اور عسکری دونوں محاذوں کی قیادت سنبھالنے کی اہل ہے

## حلف نامہ البدر

البدر کا ہر مجاہد تربیت کی تکمیل کے بعد تمام ساتھیوں کے روبرو حسب ذیل حلف نامہ پڑھتا جس کے الفاظ یوں تھے ـــــ ،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله

میں ......... خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ

○ پاکستان کی سالمیت پر آنچ نہ آنے دوں گا ،

○ پر امن شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کروں گا ۔

○ اسلام اور پاکستان کے لیے ہر سطح پر جنگ کروں گا ،

○ اور اپنی جان و مال کو اس مقصد کے لیے وقف کر دوں گا

اللہ میرا حامی و مددگار ہو۔ آمین

## البدر پروگرام

البدر کا پانچ نکاتی پروگرام حسب ذیل تھا

۱۔ پاکستانی عوام میں اعتماد بحال کرنا۔ اس کے لیے البدر کیڈٹ عوام سے وسیع رابطہ رکھیں گے، دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں بھی پہنچیں گے، ضرور جلسوں اور اجتماعات کا انعقاد بھی کریں گے

۲ بنگالی اور غیر بنگالی کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنا اور مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان گہرے اخوت و محبت کے جذبات پروان چڑھانے کے لیے عملی و فکری اقدامات کرنا

۳ پاکستان دشمن عناصر اور ہندوستانی مداخلت کاروں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا

۴۔ مداخلت کاروں اور شرپسندوں کے خلاف پاک فوج اور سول انتظامیہ کے ساتھ عملی تعاون کرنا۔ اس مقصد کی خاطر تمام محب وطن طلبہ کو عسکری تربیت دینا

۵ ملک دشمن عناصر خواہ وہ کہیں بھی ہوں ان کے بارے مکمل چھان بین کرنے کے بعد ان کی حکام کو مطلع کرنا ، پیر سرد وسیر میں محب وطن پاکستانی فراہم کرنا ـــــ [illegible]

## تربیت

البدر کیڈٹ دو طرح کی تربیت حاصل کرتے۔ ایک عسکری ، دوسری فکری

● عسکری تربیت میں چار سے بارہ روز کی ٹریننگ شامل تھی جس میں چھوٹا ہلکا آتشیں اسلحہ استعمال کرنے کھولنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے ساتھ ساتھ وائرلیس نظام سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا

میدان عمل میں حسب ذیل ہتھیار البدر کو دیے جاتے :

- تھری ناٹ تھری • لائٹ مارٹر • اینٹی انفنٹری مائنز
- ہینڈ گرنیڈ • چھوٹی ساخت کی بندوقیں • ڈائنامائٹ
- کارتوس • ریوالور • اور مکتی باہنی سے چھینا ہوا روسی ، ہندوستانی اسلحہ

● فکری تربیت میں جمعیت کا تنظیمی پروگرام کسی حد تک متاثر ہوا ، لیکن رسمی پروگرام پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں رکھے گئے جن میں

- شب بیداریاں • مجالس ذکر • دورہ درس قرآن • درس حدیث
- ایک روزہ تربیتی کیمپ • فلسفہ جہاد • احتساب • دعا وغیرہ

اس تربیت کے پروگرام اس قدر وار ان کے ساتھ ہوتے کہ البدر کی اگر رات جہاد السیف میں گزرتی ، تو ان کے دن کا بیشتر حصہ فکری غذا حاصل کرنے میں صرف ہوتا ـــــ اور

یہ بھی ہو تا کروں کہ میدانِ جنگ میں جھکنے کے باوجود گذشتہ رات بھر خدا کے حضور گریہ و زاری میں گزارنے جس کی تصدیق سب سے پہلے آفیسر کرتے ہیں یہی وہ کردار تھا جس نے پاک فوج کے سب سے آفیسر اور جوانوں کو اسلام کے عملی مجاہدوں کی جانب موڑ دیا، اور وہ لوگ آج تک البدر کا نام سنتے ہی اپنا سر اظہارِ عقیدت میں جھکا لیتے ہیں۔

## مشاہرہ

مشاہرہ، تنخواہ، الاؤنس اور رعایت کی کئی ناموں سے معاوضے کو جانا پہچانا جاتا ہے ——— پاک آرمی کی طرف سے اپنے کمبی لواحق کے تحت البدر کمانڈوز کے لئے بھی انفرادی معاوضے کا اعلان کیا گیا ——— فرد اور ٹریننگ بھی دی گئی ——— لیکن اسلامی چھاتر سنگھو کی ایگزیکٹو کونسل کے فیصلے کے مطابق کسی ایک کمانڈو یا مجاہد نے بھی مالیہ، الاؤنس یا مشاہرہ نہ لیا۔ اس میں جہاد کی لے لوث جذبہ کا عنصر شامل تھا تحسین کا موقف تھا کہ یہ مشاہرہ اور تنخواہیں ہمارے بجائے دوسرے رفاہی پروگراموں پر خرچ کی جائیں ——— "البدر" کی باقاعدہ وردی بھی تھی، لیکن اشرفت سے استعمال نہیں کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ حکمت کا تقاضا تھا۔

## معرکے ہی معرکے

ہم یہاں البدر کے چند معرکوں کی کارروائی مدیرِ قارئین کرتے ہیں وہ چند واقعات جو ہمیں بھارت کی قید سے لوٹ کر آنے والے فوجی جوانوں کی زبانی یا سقوط کے بعد پاکستان پہنچنے والے البدر کی زبانی میسر آئے!

## ڈسٹرکٹ مومن شاہی

سب سے پہلے ——— کامران، کمانڈر البدر نے بتلایا کہ ۔

سرحد کے نزدیک ٹریننگ حاصل کر رہے تھے کہ ہم کو ان کے پہلے ہفتے میں شام کے وقت ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا کہ مکتی باہنی کے لوگ گاؤں کے مویشی چوری کر کے لے جا رہے ہیں صوبیدار صاحب نے کہا کہ فوری طور پر "البدر" کے پندرہ نوجوانوں کو ساتھ لے کر آپریشن پر جاؤ۔ یہ "البدر" کا سب سے پہلا آپریشن گروپ تھا جس کا کمانڈر مجھے مقرر کیا گیا ہم بہت خوش تھے اس مسرت انگیز لمحات کا اظہار اس وقت مشکل ہے۔ ہمیں خوشی تھی کہ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے اور وطن دشمنوں کو پکڑنے جا رہے ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مویشی چھوڑ کر بھاگ نکلے درختوں کے زیادہ گھنا ہونے کی وجہ سے ہم فائرنگ نہ کر سکے ——— سرحد کے قریب مکتی باہنی نے پاک فوج کے کیپٹن جاوید کو جنگلی طریقہ AMINC کے ذریعے شہید کر دیا ان کی شہادت پر میجر صاحب نے مجھے کہا کہ انڈیا جا کر اس کے خون کا انتقام لوں، مقامی دیہاتیوں کی جاسوسی میں لوہا حاصل کیا الہٰ میں نے کئی "البدر" کے مجاہد جو رضاکار تھے۔ انمول شمسل ——— اور تیسرے ساتھی کا نام یاد نہیں انہیں آرڈر کیا کہ انڈیا جا کر AMINC کے ذریعے اپنے مجاہد کے خون کا بدلہ لے کر آؤ انہوں نے حکمتِ عملی سے ایک بھارتی فوجی ٹرک تباہ کر دیا اس میں دو ہندو فوجی افسران اور پانچ مکتی باہنی بھی سوار تھے ہمارے ساتھیوں نے یہ کام رات کے اندھیرے میں دشمن کے مورچوں میں سے گزرتے ہوئے جان ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کیا اس گروپ میں صرف انور علی اور صرف ستنگھو در کر تھے۔

تیس پور سے سولہ میل دور ایک مقام "حیدر نگر" کے متعلق خبر آئی کہ وہاں ہندوستان کے ایجنٹوں نے بہت گڑبڑ کر رکھی ہے۔ بس کر ہم لوگ تیار ہو گئے ۳۰ آدمی کے اور ۳۰ "البدر" کے مجاہد، جن کی کمان میجر ریاض ملک خود کر رہے تھے انہوں نے رات کے اندھیرے میں نکلے وہاں پہنچے تو ایک گھر سے روشنی اور کچھ آدمیوں کی باتوں کی آواز آ رہی تھی ——— ہم تین ساتھی ان کے پاس گئے۔ اور کہا کہ ہم مکتی باہنی ہیں، جمال پور پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس طرح ہم اس لئے کر رہے تھے تاکہ ہمیں ان کے بارے میں پتہ چل جائے اگر وہ تائید کر دیتا تو صاف دشمن ثابت ہو جاتا اور اسے پھر "دوسری طرح" درست کر دیتے انہوں نے بتایا کہ دو ساتھی سامنے ہیں اس لئے وہ ابھی رکے رہیں ہم نے فوری طور پر حملہ کرنے کو کہا باہر آوازیں، دوسرے ساتھی بھی آ گئے۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا ان سے بہت سا اسلحہ اور ہندوستانی کرنسی ملی ——— پیدل ہی حیدر نگر کی طرف کوچ کیا رات در گئے وہاں پہنچے میجر صاحب نے اس مشکوک گھر کے گھیراؤ کے لئے مجھے کہا کہ "البدر" کی ڈیوٹی لگاؤں جب ان کی ڈیوٹی لگا رہا تھا تو فائرنگ کی آواز آئی میں نے ساتھیوں کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور خود دھر لیٹے گیا مکتی باہنی بالکل ہمارے سامنے تھی میں نے دیکھا کہ فوج اور مکتی باہنی میں ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ سات مکتی باہنی کے مارے گئے اور باقی فرار ہو گئے رات کے اندھیرے میں اندازہ لگانا مشکل تھا اس لئے دو گھنٹے ساتھیوں نے آرام کیا صبح ان لوگوں کے زخمی لوٹ ملے مگر سات مردہ آدمی، دو شین گن ۲۵ ہینڈ گرنیڈ، بہت سا بارود اور بھارتی کی پاکستان کے خلاف تحریک کے سب سے سائیکلوسٹائل کاغذ ملے!

ہماری سب سے بڑی کامیابی شیر پور سے سترہ میل دور "بالیا باڑی" کے مقام پر اسلحہ کے بہت بڑے ذخیرے کا ہاتھ لگنا تھا ——— مومن شاہی سے ۵۲ میل دور پھول پور کے مقام پر "تل کلا" نامی پانچ میل چوڑی جھیل تھی جس میں جزیرے تھے اگست کا آخری ہفتہ تھا اس مقام کے متعلق ہمیں یہ اطلاعات ملی تھیں کہ یہاں مکتی فوج کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر ہے جب ہم جھیل کے نزدیک پہنچے، تو اس سکیم کے تحت فوج پیچھے سے بڑھے گی اور ہم سامنے بھاگنے والے ایجنٹوں کا صفایا کریں گے مگر اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی ہمارا ان سے سامنا ہوا ہم نے کہا ہم "مکتی" ہیں مقصد یہ تھا کہ اس عرصہ میں قدم جمالیں ہم صرف ۵ فوجی اور ۲۴ "البدر" کے نوجوان تھے اور مکتی باہنی کے ۳۰۰ سے زائد مسلح افراد تھے انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا سارا دن فائرنگ ہوتی رہی۔ چیک پوسٹ ۹ میل دور تھی رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا یکایک ہمیں خیال آیا کہ اسلحہ ختم ہو گیا تو پھر کیا کریں گے۔ اب نہایت محتاط انداز سے فائرنگ شروع کی اور دشمن کے قدم بعض مقامات سے اکھڑنے شروع ہو گئے جب وہ فرار ہوئے وہاں سے ۲۱ مشین گنیں، ۹ سٹین گنیں ۲۵ گرینیڈ مال غنیمت میں ملے، اور مصلحت اسی میں جانی کہ پانچ پانچ افراد کا گروپ بن کر چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہوا جائے ایمونیشن ساتھ لیا اور گھیراؤ سے نکلے "مکتی" نے چھپ کر گوریلا جنگ کو ترجیح دی وہ راستوں کے اردگرد چھپ گئے۔ اسی دوران شام کے اندھیرے میں ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے شروع کئے۔ اس ہتھیار کی آواز بہت ہی خوفناک ہوتی ہے۔ وہ سمجھے شاید اسلحے کی بڑی کھیپ سے ہم پر یہ لوگ حملہ آور ہوئے ہیں اس سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے راہِ فرار اختیار کی اور رات ۹ بجے ہم چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔

رن کچھ اور ۶۵ء کی جنگ میں شرکت کرنے والے فوجی بھی ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ "ایسا سخت معرکہ ان دونوں جنگوں میں نہیں دیکھا تھا اسی لئے

جانی نقصان نہ ہوا

نومبر کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ کمال پور سرحدی پوسٹ پر البدر کے تیس اور پاک فوج کے ساٹھ جوان قیام پذیر تھے۔ رات کے وقت ایسٹ پاکستان رائفلز، مکتی باہنی اور ہندوؤں نے ہماری چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کمک میں البدر کے صرف سات افراد بھیجے جو ماہر تھے۔ ہم نے آہستہ آہستہ فائرنگ ختم کر دی۔ دشمن سمجھا شاید ہم ختم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے پیش قدمی شروع کی۔ ہمارے چھپے ہوئے ساتھیوں نے یک دم فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بوکھلا گئے۔ ان کے ۹۳ آدمی مارے گئے اور بہت سا اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس قسم کے واقعات تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے تھے۔ ہمارے دو ساتھی شہید ہوئے۔

البدر کے بانی میجر ریاض نے بتلایا: "یہ مئی ۱۹۷۱ء کی بات ہے ۲۸ مارچ کا واقعہ ہے کہ جب میرے ضلع میں البدر کی پہلی کمپنی نے بارہ روز کی ابتدائی سرسری سی تربیت مکمل کر لی تو اسی دوران میں ہندوستان کی سرحد پار کر کے بھارتی سپاہ کے ایک دستے نے ہمارے فوجیوں پر گوریلا حملہ کر دیا۔ اس حملے کے دوران ہمارے ایک کیپٹن جاوید شہید ہو گئے۔ میں پریشانی کے عالم میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے اور اس کا بدلہ کیسے لیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں البدر کے پہلے کمانڈر ——— اسے ایچ ایم کامران طالب علم سال دوم میرے پاس آئے اور کہا: "سر! شہید کیپٹن جاوید صاحب کا بدلہ ہم لیں گے۔" میں نے پوچھا: "بھئی! ہندوستانی بارڈر پار کر کے وہاں جانا اور پھر ہندو فوج پر شب خون مارنا آپ سے کیسے ممکن ہوگا؟" بھولے بھالے سانولے سلونے کامران نے معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ان شاء اللہ بدلہ لے کر دکھائیں گے۔" میں نے کہا "اچھا آپ ہی کی کمان میں آج رات ایک گروپ بھیجوں گا، اپنے ساتھ پانچ "البدر" ساتھیوں کو لے جانا"

نماز مغرب سے کچھ پہلے کامران آیا اور کہا "میجر صاحب! ہم چلتے ہیں، آپ ہمیں ٹارگٹ (TARGET) بتلائیں اور کچھ اسلحہ بھی دے دیں" ——— میں نے ٹارگٹ تو بتلا دیا اور اسلحہ دینے کے بارے میں کچھ گومگو کی کیفیت کا شکار ہو گیا، کیونکہ اس سے قبل رضاکار فورس میں کچھ لوگ جاسوسی بھی کرتے رہے اور پھر اسلحہ لے کر فرار بھی ہوتے رہے، اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی ایسا "کیس" ہو، لیکن "اسلامی چھاترو سنگھو" کے ان معصوم نوجوانوں کے جوش و جذبہ کو دیکھ کر جی بھی چاہتا کہ اسلحہ دیا جائے۔ پھر یہ بھی پریشانی تھی کہ "البدر" کی تاسیس چونکہ میرے علاقہ میں ہوئی ہے، اس لئے کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھ جائے یا کسی اعتبار سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ میں کشمکش میں رہا ——— اور اسی ذہنی کشمکش میں میں نے کہا "نماز مغرب کے بعد بات کروں گا"

نماز کے بعد پھر مسکراتے سانولے سلونے چہرے میرے سامنے تھے۔ میں نے انہیں ایک پستول اور ہلکا ڈائنامائٹ دیا اور یہ اسلحہ ان میں سے کسی ایک کے بھی تحفظ کے لئے کافی نہ تھا ——— کامران نے کہا "اور کچھ نہیں تو ہر ایک ساتھی کے ذاتی تحفظ کے لئے ہی ایک ایک ہلکا ہتھیار دے دیجئے"، لیکن میں اس سے آگے نہ بڑھا۔ وہ "اعتماد" ہو کر جا سکتا تھا پھر نامعلوم میرے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ میں فوراً اندر گیا اور "سورۃ یٰسین" کا ایک نسخہ لے آیا جو ایک پرانے عید کارڈ میں لگا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے کامران کے ہاتھ میں دیا تو اس کے ساتھیوں نے مزید کوئی تقاضا نہ کیا۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے راہ لی۔ چونکہ بارڈر دور تھا، اس لئے وہ سورج نکلنے کے بعد جب میرے پاس واپس آئے تو کہا "میجر صاحب! کمال ہو گئی"

تفصیلات سے معلوم ہوا کہ ان البدری شاہینوں نے ہندو فوج کے ایک میجر اور چار سپاہیوں کو انہی کے اسلحے کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا، جبکہ ایک ٹینک تباہ کر دیا ——— یہ تھا ——— "البدر" کا پہلا ایکشن جو سرزمین ہند پر ہوا۔

## چٹاگانگ

چٹاگانگ موہتی کھالی (کاکس بازار کے قریب ایک جزیرہ)

جمعیت کے رفیق اور پلاٹون کمانڈر محمد ... طالب علم عربی مدرسہ المدنیہ نے سنایا: "رمضان المبارک کے اواخر کی بات ہے کہ میں کاکس بازار کے ناظم بھائی عبدالاول سے ملنے کو ریسٹ کھالی گیا۔ لوٹتے وقت شاہ جلال چوہدری (رکن چاٹگام جمعیت) اور جعفر سے سرراہ ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے یونہی سرسری طور پر کہا کہ "البدر" میں شامل ہو جائیں اور بات آئی گئی ہو گئی ——— عید کے ایک ہفتہ بعد میں نے موہتی کھالی میں ان دونوں اور کاکس بازار کے ناظم کو پریشانی میں متفکر بیٹھے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ البدر کے نئے طلبہ کو لینے کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں چونکہ جزیرہ میں اجنبی ہیں، اس لئے تھانیدار اور رضاکار کمانڈر انہیں مکتی باہنی سمجھ کر گرفتار کرنا چاہتے ہیں ——— میں چونکہ انہیں جانتا تھا، اس لئے بمشکل ان سے پیچھا چھڑوایا۔ ان کی خاطر تواضع کی۔ حنیف بھائی نے مجھ سے کہا کہ آپ جمعیت کے جتنے بھی اچھے طالب علم ہو سکیں، سب کو لے کر فوراً چاٹگام آ جائیں ——— اور چلے گئے۔

میرے پاس وقت نہ تھا، مدرسہ کی چھٹیاں تھیں، ورنہ میں کم از کم سو ساتھیوں کو لے جا سکتا تھا۔ بہرحال ۱۲ بہترین کارکنان کو ادھر ادھر سے اکٹھا کیا اور انہیں لے کر چاٹگام پہنچا۔ اسی دوران کاکس بازار کے ناظم عبدالاول بھی ہمارے ساتھ آ ملے۔ ہم بارہ ساتھیوں میں سب سے چھوٹا طالب علم پانچویں جماعت کا سراج الاسلام تھا ——— دہم ساتھیوں میں سے لڑائی کے دوران اور سقوط ڈھاکہ سے پہلے کوئی شہید نہ ہوا۔ لیکن بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ ہمارا احمد فرار ایک ہیڈ ماسٹر کا لڑکا، متعلم نہم، بشیر احمد متعلم نہم اور سراج الاسلام متعلم پنجم کو مکتی باہنی نے شہید کر ڈالا۔

تربیت کے لئے مجھے چاٹگام چھاؤنی بھیج دیا گیا، جہاں ایوب نوالداد نے مائن گرینیڈ، ۳۰۳ وغیرہ سب کی ٹریننگ مجھے ایک ہی دن میں دے دی۔ دس فائر بطور امتحان کرنے ہوتے ہیں میں نے تین فائر کئے، تینوں سیدھے اندرا کے پیٹ میں لگے۔ (چھاؤنی میں نشانہ بازی کے لئے اندرا کی ایک تصویر بنی ہوتی تھی۔) ایوب نے مسٹر ہشتم شوکی اور اتفاقی جہاد سے کر کیپٹن کے پاس بھیج دیا جس نے مجھے البدر میں باقاعدہ شامل ہونے کی اجازت دے دی اور اس طرح میں دس دن کی تربیت کے بجائے ایک ہی دن میں تمام تربیتی مراحل سے گزر گیا۔

ہمیں البدر کے ایک شہری کیمپ میں رکھا گیا ہم ——— تجربہ کے لئے مکتی باہنی کا پتہ چلا چلا کر فوج کو بتاتے یہی کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔

چند روز بعد ہم اپنے ہیڈ ماسٹر سے ملنے عیدگاہ گئے ہمیں اور لیتے بیٹھے کو وردی میں کیل کانٹوں سے لیس دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ہماری وردی پہلے سفید کرتا پاجامہ تھی پھر حکمت کے پیش نظر ہم پی ٹی ڈریس پہننے لگے تھے۔ وہاں دیہات کے افراد نے بتایا کہ یہاں سے اٹھارہ میل دور جیگڈنا کے قریب جنگل

ہیں کہیں پہاڑوں پر کسی باغی کا اڈا ہے جہاں سے اگر وہ یہاں حملے کرتے ہیں، اور کل ہی ایک موٹر ڈرائیور کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس گھنے جنگل میں ابھی تیر اندازی ہی ہو رہی تھی کہ ——— ہمارے جوانوں نے جوش مارا اور ہم تین ساتھیوں نے وہ رات کے بارہ افراد اور رضاکار، پیٹے ساتھ لئے اور رات کے ایک بجے کے قریب کسی باغی کو ان کے اڈے کے قریب جالیا۔ دو اشخاص رہے کہ فوج کے عام سپاہیوں کو البدر کی کمان میں وقتی طور پر دے دیا جاتا تھا۔ معاملہ میں سو معاملات کار وہاں موجود تھے۔ ہم نے پوزیشن سنبھالی اور عام حملہ شروع کر دیا۔ رات بھر لڑائی ہوئی۔ صبح ہم نے ایڈوانس کر کے اڈے کو گھیر لیا۔ البتہ ایک غدار فرار ہونے کے لئے بالکل تیار تھا وہ اس سے بھاگتے ہوئے اور ہم مارے رہے ——— دو دن گھنٹے بعد وہاں پر ہمارا مکمل قبضہ ہوگیا۔ پہاڑ کی سطح پر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا اور باقاعدہ ڈائننگ روم بھی موجود تھا۔ اس مقابلے میں ہمیں ۳ رائفلیں، چودہ سو چالیس گولیاں، شیل، گولہ بارود اور کچھ ادویات وغیرہ ملیں۔ ایک مخبر کی اطلاع پر چار بھائی مارے گئے۔ ہمارا کوئی نقصان نہ ہوا، البتہ ایک رضاکار اپنی غلطی کی وجہ سے ہمارے ہی ہاتھوں مارا گیا۔ تب جا کے ہم نے عیدی نکالا اور طبری کی نماز کے بعد اٹھارہ میل پیدل چل کر شام ۹ بجے کے قریب نعرہ تکبیر، البدر زندہ باد ——— البدر کے جوان سے پاکستان قائم رہے گا، بنگال نہیں پاکستان ——— کے نعرے لگاتے ہوئے کاکس بازار میں داخل ہوئے اور سکون سے کھانا کھایا۔ کاکس بازار میں لوگوں نے ہمیں ٹھہرانا چاہا۔ ہم بھی رکنا چاہتے تھے، مگر حکم نہیں تھا اس لئے چاٹگام چلے گئے۔

اب ہمارے دن شہر میں آپریشن پر گزرنے لگے اور ہم تخریب کاروں کو ڈھونڈنے لگتے، صرف ماہ میں بھی ہم ان سرکشوں کی تلاش میں نکل جاتے۔ جنگ کے دوران دس دسمبر ۱۹۷۱ء کو رات ۱۱ بجے چاٹگام شہر میں یہ خبر گرم ہوگئی کہ بھارت شہر میں اندر گھس آیا ہے۔ فوراً صوبیدار منور خان کے ساتھ ہم دس البدر دس مجاہد اور دس فوجی مل کر سیکٹر پہنچے۔ بھارتیوں کا حملہ جاری تھا وہ مسلسل ہم پر آگ برسا رہے تھے مگر ہم نے فائرنگ روکے رکھا حتیٰ کہ چار گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے تو بھارتی سمجھے کہ پاکستانی فرار ہو گئے۔ سو انہوں نے مورچوں سے نکل کر ایڈوانس شروع کر دیا۔ اس عالم میں ہم نے عام حملہ کر دیا اور مورچوں سے باہر نکل آئے۔ تکبیر کی صدائیں گونجتی رہیں اور ہم کاروں سے دور ہوتے رہے۔ وہ کچھ پیچھے ہٹنے لگے تو ہم تعاقب میں دوڑنے لگے۔ وہ گھبرا کر اور پیچھے دوڑتے تو ہم دم بخود ہوتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس طرح جنگی حکمت عملی کے بغیر سیدھے سادھے انداز میں ہم ڈیڑھ تین گھنٹے کے اندر اندر دشمن کو چھ میل پیچھے دھکیل دیا اور اپنے پرانے مورچوں پر پھر ڈٹ گئے ——— جہاں آخر تک ہم لڑتے رہے۔ ہم مزید آگے بڑھ سکتے تھے، اور بڑھنا چاہتے تھے۔ ہمارا ساتھی صوبیدار صاحب بھاگ کر ہمیں ایڈوانس سے روک دیا گیا ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہیں دیا گیا۔ کہا یہ گیا کہ آرڈر نہیں ہے۔

چاٹگام کے حسان (متعلم ایف ایس سی) نے بتلایا کہ "یہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے ہم ایک جگہ پوزیشن سنبھالے دشمن پر گوریلا شامل کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اسی میں بھارتی فضائیہ کے لڑاکا طیارے فضا میں نمودار ہوا اور چند گز کے فاصلے پر دو دو ہزار پونڈ وزنی بم پھینکے جو پھٹنے، مگر ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ——— سائیکلون (CYCLON) آیا ہو یا آندھی کا ایک ریلا ——— حالانکہ اتنے قریب فاصلے پر اگر ہینڈ گرنیڈ پھٹے تو جسم انسانی کے پرخچے اڑ جائیں، لیکن ان بموں کے پھٹنے کے باوجود ہمیں کوئی زخمی ہوا، اور نہ ہی ہمارا نقصان ہوا، حالانکہ قریب ہی زمین میں بڑے بڑے گڑھے بن گئے۔ اس معاملہ کو دیکھ کر ہمارا سر خدا کے حضور جھک گیا اور آج جب بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو دل ودماغ لرز اٹھتے ہیں ———!

## البدر نے دو جہاز مار گرائے

ایک فوجی جوان نے بتایا کہ جنگ کے دوران چاٹگام میں پاک فوج ایک بھی بھارتی حملہ آور جہاز کو نہ گرا سکی، جبکہ البدر کے دو مجاہدین حسان مثال نے اینٹی ایئر کرافٹ کے ذریعہ دو ہوائی جہاز گرائے جس کے بعد شہر میں البدر نے جلوس نکالا اور حسان مثال زندہ باد ——— کے نعرے لگائے۔ یہ دونوں کارگن اینٹی ایئر کرافٹ کے گر تھے جنہوں نے کئی دوسروں کو بھی البدر کے مجاہدین کو تحریک دے ان کی شاندار کارکردگی کی ساری مثالیں دے رکھی تھیں۔

## فوج

البدر کے کیڈٹوں نے فوجیوں کی اصلاح کے لئے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں، چنانچہ ابو سرور رکن جمعیت نے چاٹگام کے ایک کیپٹن (نام مصلحتاً چھوڑا جا رہا ہے) کو اپنا ہدف بنایا۔ کیپٹن صاحب پہلے شراب پیتا تھا جس کے نتیجہ میں انہوں نے شراب چھوڑ دی اور نماز باجماعت میں باقاعدہ ہو گئے۔ اور البدر سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک روز ایک سپاہی نے ایک البدر کو تھپڑ مارا تو ابو سرور نے شکایت کی۔ اس پر کیپٹن نے البدر کیڈٹ کو بلا کر اس سپاہی کو تھپڑ مارنے کے لئے کہا۔ کیڈٹ نے کہا میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اس پر کیپٹن نے کہا تم تو معاف کر سکتے ہو مگر میں اسے معاف نہیں کروں گا، کیونکہ اس نے البدر کو تھپڑ مار کر مسلک مردِ کے قرآن کے پیغام جہاد کی عملی تصویر کو تھپڑ مارا اس لئے اسے گولی مارنی چاہئے، مگر چونکہ البدر نے معاف کر دیا ہے اس لئے میں صرف سات کوڑے اور دس سال قید مع تین ماہ قید تنہائی کی سزا کی سفارش کرتا ہوں۔ بالآخر ابو سرور کے شدید اصرار کے بعد سپاہی کی سزا معاف کرائی گئی!

## شاہ جلال کی شہادت

شاہ جلال چودھری چاٹگام جمعیت کے رکن، اور البدر پلاٹون کے کمانڈر تھے۔ ان کی شہادت سے متعلق ——— یوسف البدر کیڈٹ نے بتلایا:

"جنگ ۱۹۷۱ء کے باقاعدہ آغاز کے بعد چاٹگام میں تیل کے ذخیرے پر بھارتی فضائیہ کے طیاروں نے راکٹ اور بم گرائے جس کے نتیجہ میں ذخیرے کی جنوبی سمت میں آگ لگ گئی۔ جنگ میں پٹرول کی سخت ضرورت اور اہمیت تھی جبکہ اس سے قبل ہی شدید قلت تھی۔ شمالی سمت میں رکھے ہوئے بہت سے ڈرم کوشش کر کے بچائے جا سکتے تھے، مگر اس قدر خوفناک آگ سے متصل اہم ترین کام پاک آرمی کے جوان نہیں کر رہے تھے اور آگ رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ اس صورت حال میں شاہ جلال ۲۶ البدر کیڈٹوں کی قیادت میں آگے بڑھے اور آگے سے بچے ہوئے ڈرموں کو لڑھکاتے ہوئے دور دور لے جانے لگے، اس مشن میں میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اتنے میں ہوائی حملہ ہوگیا۔ کچھ ساتھی راستہ کے ایک طرف دکانوں کے پیچھے چھپ گئے اور دیگر چودہ ساتھی جن میں شاہ جلال چودھری بھی شامل تھے، راستہ کی دوسری طرف حفظ ماتقدم کے طور پر عمارت میں داخل ہو گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ جس عمارت میں وہ داخل ہوئے بدقسمتی سے"، اس پر بھی بمباری شروع ہو گئی۔ حملہ کے بعد جب عمارت کا ملبہ ہٹایا گیا تو ہمارے دس

دوست جو ائیر ڈگری کالج کے سٹوڈنٹ تھے شہید ہو چکے تھے۔ الّٰہ شاہ جلال اور دیگر چار کیڈٹ بچ گئے مگر شدید زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں کو ہسپتال لے جانے کے لئے ایک کو میں نے اٹھایا اور ایک دوسرے ساتھی نے شاہ جلال کو پیٹھ پر لاد لیا اور ہم شہر کی جانب بھاگے، اسی دوران میں پھر ہوائی حملہ ہو گیا جہاز سے بچنے کی پرواہ میں تھے میں قریبی دکان کے پیچھے رینگ کر لیٹ گیا البتہ زخمی ساتھی محمد حسین اس پناہ گاہ سے دور رہ گیا کیونکہ اس نے حملے کے دوران چلاتے ہوئے مجھے کہا "مجھے چھوڑ دو اپنی جان بچاؤ" ۔۔۔۔۔ !! اس لئے بات مان کر میں رینگ گیا لیکن شاہ جلال نے ماسر زخمی حالت میں چلا رہا تھا ۔۔۔۔۔ "محمد حسین کو بچاؤ، محمد حسین کو بچاؤ" اور اس کرم سے گردن اٹھا کر دیکھا اور زخمی شاہ جلال گر پڑا تھا محمد حسین کو بچانے کے لئے آگے لپک رہا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی بات کرتا، جہاز کی بے پرواہ دیکھ کر چلایا ہی جا رہا تھا کہ جنگی طیارے کی گولیوں کی بوچھاڑ نے، بھی بھائی کو بچانے کی کوشش میں زخمی جلال کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لہو میں نہلا دیا ۔۔۔۔۔ شہید کر دیا۔

## راج شاہی

راج شاہی سے جمعیت کے رکن ضلع جمعیت کے ناظم انجینئرنگ یونیورسٹی کے طالب علم، مشرقی پاکستان ٹیکنو انجینئرنگ کے ممبر ۔۔۔۔۔ برادرم انعم اسلام بتلاتے ہیں۔

اپریل کے آخر میں رضاکار تنظیم نے کام شروع کیا تقریباً دو ماہ بعد جون میں البدر کا قیام عمل میں آیا۔ راج شاہی میں چار سب ڈویژن تھے اور ہر ایک میں الگ الگ پوسٹ قائم تھے۔ ہر پوسٹ ۳۱۳ افراد پر مشتمل ہوتا تھا جو طلبہ رضاکار تھے وہ اس میں آگے باقی ساتھیوں نے بھی پندرہ دن کی تربیت حاصل کر لی۔ شروع میں میں البدر کے سعد تعلقات عامہ میں تھا۔ بعد ازاں اجتماع ارکان کے فیصلے کے مطابق اکتوبر میں البدر کے ٹاؤننگ کمانڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگا تقریباً سات آٹھ آپریشنز پر میں خود بھی گیا۔ ہمیشہ مکتی باہنی ہماری آمد کی اطلاع پر بھاگ جاتی۔ اگر مقابلہ ہوتا بھی تو جلد ہی فرار کی راہ اختیار کر لیتے۔ میں چونکہ کمانڈر تھا اس لئے بھاری اسلحہ استعمال کرنے کا موقع نہ ملا بس ایک ریوالور اور ایک میگافون میرے پاس تھا جو کہ لڑائی کے دوران ہدایات دینے کے کام آتا تھا۔ ۱۰ میں جیپیں ہمیں مستقل طور پر ملی ہوئی تھیں۔ آرمی آفیسرز ہمیں ساتھیوں والبدر کے کردار سے بے حد متاثر تھے، اور بار بار اس کا اظہار ہمارے سامنے کرتے تھے۔ ادہ بیکری کیمپ ہمارے شہر میں تھے جن میں ہم کے قریب البدر کے مجاہد رہتے تھے کل تعداد میں پوسٹ کے مجاہدین کی اجرائیں ۵ تک پہنچ گئی تھی ایک سو دس روپے ہر ماہ آرمی البدر کے ہر مجاہد کو دیا جاتا تھی۔ مگر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی اس کو نہ لیتا تھا۔

البدر کے آپریشن کے دوران اللہ کی رحمت ہم نے محسوس کی۔ ہم ناظم ریکارڈ کے نگرایان کے پل توڑنے پر کام کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ دو بسیں اور ایک ٹرک بھر کر البدر کے مجاہدین آپریشن پر گئے۔ ایک دیہات پر پہنچ کر مکتی باہنی سے لڑائی ہوئی، کچھ دیر مقابلے کے بعد وہ بھاگ نکلے مگر ہمارے واپسی کے راستے میں بارودی سرنگیں بچھا گئے، ہمیں خبر نہ تھی کہ ہمارا پہلا ٹرک اس پر پہنچا ہی تھا کہ دھماکے سے سرنگ پھٹ گئی۔ ٹرک کے پرخچے اڑ گئے۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ہمارے کئی ساتھی ہلاک ہو سکتے تھے، مگر اللہ کی رحمت سے کہ ٹرک تو ختم ہو کر رہ گیا لیکن ہمارے صرف سات آٹھ ساتھی زخمی ہوئے۔ البتہ ڈرائیور جو ہم میں سے نہیں تھا، شدید زخمی ہوا۔ یہ تھی ہم پر اللہ کی رحمت خاص۔

راج شاہی میں مکتی باہنی کے سات آٹھ اڈوں پر ہم نے قبضہ کیا۔ ایک اڈے سے سائیکلو اسٹائل مشین بھی ملی تھی۔ وہ شر انگیز پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرتے تھے، جبکہ ہر حملے سے سے اسلحہ اور بہت سیاہ لٹریچر ہمارے قبضہ میں آیا۔ ایک اڈے سے تو ایک ٹرک بھر کر لیا ہم نے حاصل کیں۔

فیلڈ میں ہی ہمارے مستقل تحریکی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ہمارے شعبہ معاملات کا شعبہ روزانہ دیہاتوں میں جا کر رائے عامہ کو صحیح راہ پر لانے اور قومی ملک کی حفاظت کے لئے راہ ہموار کرتا۔ راج شاہی ریڈیو کے تمام پروگرام بھی یہی شعبہ طے کرتا اور کرواتا تھا جبکہ انٹیلی جنس کا شعبہ آرمی اور البدر کے کمانڈروں کو مخالفین کی صف بندی، ان کے اڈوں اور پروگرام سے بروقت آگاہ کرتا جس کی بنا پر ہماری کارروائیاں عمل میں آتیں۔

ان ایام میں مختلف مواقع پر ہمارے پوسٹ کے سات آٹھ ساتھی شہید ہوئے۔ نواب گنج سب ڈویژن بھارتی سرحد سے گھرا ہوا تھا وہاں پر البدر کا ایک مکمل پوسٹ تھا۔ علام تصدق جمعیت کے رکن کمانڈر تھے، (یہ اب مشرقی پاکستان جیل میں ہیں) انہوں نے ہی راج شاہی ضلع میں جمعیت کے کام کا آغاز کیا تھا۔ ان کی باقاعدہ انڈین فوج کے ساتھ سرحد پر لڑائی ہوتی رہتی۔ ۱۹ نومبر اور دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے زوال کے بعد بھی بھارتی فوج کے حملوں کو یہ لوگ روک رہے تھے۔ اس سے قبل بھی جب آرمی کو ضرورت ہوتی وہ البدر کو سرحد پر بلا لیتی تھی۔ ۱۵ دسمبر تک وہاں چھ سات سے زیادہ ساتھی شہید نہیں ہوئے تھے۔ البتہ خدشہ یہ ہے کہ بعد کے دوران مزید کافی ساتھی شہید ہوئے ہوں گے۔

کھلنا سے ایم رحمٰن دمعلم بیان سوم رکن مشرقی پاکستان جمعیت صوبائی مجلس شوریٰ بتلاتے ہیں: ۴ دسمبر کو جب پاک فوج جیسور سے ہٹی اور کھلنا کی حفاظت کے لئے شہر کے ہی اطراف کو پاک فوج نے دفاعی اعتبار سے بہت مضبوط بنا لیا تھا۔ جبکہ ایک جانب دریا تھا جس کے سبب یہ سمت غیر محفوظ اور کمزور بھی یاد رہے کہ پاک بحریہ یکم دسمبر کو ہی کھلنا کی بندرگاہ چھوڑ چکی تھی بہرحال دریائی کمزور پوزیشن کی حفاظت کے لئے "البدر" کو مقرر کر دیا گیا جن کے پاس ہلکے ہتھیار تھے۔ ۹ دسمبر کو دس بجے کے قریب شہر کی اس جانب دریا کے ذریعہ ہندوستانی "گن بوٹس" (INDIAN GUN BOATS) گھس آئیں اور چالنا بندرگاہ پر شدید گولہ باری شروع کر دی، چونکہ "چالنا پورٹ" کو پہلے ہی پاک نیوی نے خالی کر کے پسپائی اختیار کر لی ہوئی تھی۔ اس لئے دشمن کی گن بوٹس کو روکنا ناممکن تھا مگر ہماری جانب سے جوابی فائرنگ جاری رہی لوہے اور آگ کی اس جنگ میں ۔۔۔۔۔ محض بندوقوں سے مسلح ساتھیوں میں اضطراب تو ضرور پیدا ہوا لیکن کوئی بھی اس جگہ سے ہٹا نہیں۔ اسی اثنا میں ہندوستانی فضائیہ کے دو بمبار نمودار ہوئے، چونکہ پاک فضائیہ بھی بالکل بے بس ہو کر ختم ہو چکی تھی اس لئے اس صورت حال میں مزید پریشان کن کیفیت پیدا ہوئی اس سب کچھ کے باوجود قدرت کا ارادہ کچھ اور ہی تھی۔ بالکل غیر متوقع طور پر ہندوستانی فضائیہ نے اپنی ہی گن بوٹس پر بمباری شروع کر دی اور گن بوٹس نے تحفظ ذات کی خاطر اپنا رخ ہماری طرف سے موڑ کر اپنی ہی فضائیہ کے خلاف کر لیا اس طرح دو گن بوٹس غرق ہو گئیں اور بقیہ دو گن بوٹس زبردست نقصان اٹھا کر واپس بھاگ گئیں۔

ضلع ڈھاکہ سے جمعیت کے رکن برادرم ... حسین (ایف اے) کا آنکھوں دیکھا معاملہ کچھ یوں ہے۔

"ضلع ڈھاکہ میں مدھیا بازی" جو کپڑے کی صنعت کے اعتبار سے "مانچسٹر آف

ایسٹ پاکستان" کہلاتا ہے، اس کے نزدیک ایک گاؤں میں مسدر ریلیں وار کی سمت بڑی بلڈنگ تھی جس میں "مکتی باہنی" والوں نے سب سے بڑا حفیہ اڈہ بنا رکھا تھا اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے ایک رات البدر کے ۲۵ مجاہدوں نے اس گوریلا کمپلیکس کا محاصرہ کر لیا مکتی باہنی کے ایک سو تیس افراد سے زیادہ تھے اور وہ بھی تمام مورچہ بند اور محفوظ ـــــ لیکن قدرت نے ہمیں کوشش یا کے لئے ہماری مدد اس انداز میں کی کہ چند ساتھی مجاہد، کانٹے دار تاروں کے درمیان رینگتے ہوئے کسی طرح ایک کھڑکی کے ذریعے بلڈنگ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے اور بالکل غیر متوقع طور پر مکتی باہنی والوں کو چند گھنٹوں کی لڑائی میں دبا دیا اس عمارت کو تباہ کر دیا اور اچھا خاصا "مال غنیمت" ہیٹ مشین گن، مارٹر، اور دیگر ہلکے ہتھیاروں کی صورت میں ہاتھ لگا ۲۰ تخریب کار مارے گئے باقی کچھ زخمی ہوئے اور دوسرے بھاگ گئے خدا کے فضل سے ہمارے ساتھی بچ گئے ـــــ!!

## لوا کھالی

سے جمعیت کے امیدوار برادرم الف احمد (میڈیکل کالج) نے کہا "ایک دن رات کے وقت ہم آرام سے گئے ہوئے تھے کہ دشمن نے گولیوں کی بوچھاڑ اس قدر تیز کر دی کہ ہمارا وہاں رکنا ناممکن ہو گیا اس صورت میں چند ساتھی وہاں رکے رہے اور چند ایک ساتھی رینگتے ہوئے آرمی کیمپ پہنچے اور وہاں سے ایمونیشن لے کر واپس آئے اور جوابی حملہ کر کے دشمن کو مار بھگایا۔

## ڈوبتا مشرقی پاکستان، آنکھوں دیکھی شہادت

یہاں ہم سقوط مشرقی پاکستان کے مرحلہ پر چند مقامات پر محاذ پر لڑتے ہوئے "البدر" کیڈٹوں کی زبانی یہ ہولناک، الم ناک "فلم ریل" دکھاتے ہیں!!

### مومن شاہی

کامران (شیرپور، مومن شاہی ضلع) ۲۸ نومبر کے بعد کمال پور سے تعلق رہا۔ ۳ دسمبر کو کیپٹن احسان صدیقی کی کمان میں پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے، کمال پور کے بعد بخشی گنج میں دو دن جنگ ہوئی وہاں میجر ایوب خان کمان کر رہے تھے آخر دم تک لڑتے اور شہید ہو گئے ۵ دسمبر کو ہندوستان نے اسے بھی فتح کر لیا اب ہم لوگ پوسٹوں سے نکل کر درختوں اور کھیتوں میں چھپ کر کارروائی کرتے کرنل سلطان احمد نے ہمیں کیمپل پوسٹ پر آنے کو کہا ۔ دسمبر کو جمال پور پہنچ گئے، ۸ دسمبر کو ہم نے جمال پور کے چاروں طرف پوزیشن لے لی یہ پچاس آرمی اور ستر کیمپ "البدر" تھے، ۸ دسمبر کو آفیسرز کی میٹنگ ہوئی البدر کی طرف سے میں اس میں شریک تھا اجتماعی طور پر فیصلہ ہوا کہ گوریلا جنگ کرتے ہوئے واپس ڈھاکہ پہنچا جائے یہاں سے پیچھے ہٹنے میں دشمن کے حملے شدت اختیار کر گئے تھے ہمارا بہت نقصان ہو رہا تھا کیمپ میں البدر کے تین جوان شہید ہوئے جن میں عبدالصمد ایف اے کے سٹوڈنٹ اور دوسرے دو ساتھی شامل ہیں

۱۰ دسمبر کی رات تک جمال پور اور ملحقہ علاقہ کا دفاع کیا مگر رات کو آرڈر ملا کہ پیچھے ہٹو" سخت سردی کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا اس لئے نقل و حرکت میرے لئے مشکل تھی میں جمال پور ہی میں ایک گھر میں رک گیا شہر سے فوج چلی گئی۔ ہندوستانی فوج آ گئی "البدر" گوریلا جنگ کے لیے شہر چھوڑ کر نکل گئے، اور میں شہر میں اکیلا تھا ۱۱ دسمبر کو صبح دس بجے پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے پانچ البدر کے مجاہد گرفتار کر لئے گئے جبکہ اس رات میرے تین ساتھی مجھ سے آن ملے۔

## چٹا گانگ

چٹا گانگ سے محمد (البدر) نے بتایا "سولہ دسمبر کی رات وائس آف امریکہ سے ہم نے سنا کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں ہم یہ اطلاع سن کر گنگ سے ہو گئے۔ ہم یقین نہیں کر سکتے تھے "صبح وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا گیا جواب ملا "ہمیں براہ راست کوئی اطلاع نہیں ملی جنگ جاری رکھو" دن کے ایک بجے تک لڑائی ہوتی رہی۔ پہلے ۱۲ بجے بھارت کی طرف سے فائر بند ہو گیا، تو ہم بھی خاموش ہو گئے

۱۷ دسمبر کے دن ابو سعید (رکن جمعیت) چاٹگام سے پہنچے البدر کے تمام مجاہدین کو اکٹھا کیا، ہم کوئی پچاس کے قریب تھے پوچھا کوئی تکلیف تو نہیں ہے ایک لڑکے نے کہا کئی دن سے بھوکے ہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا ـــ انہوں نے پیسے کو ہاتھ ملا

ابو سعید نے ہنس کر کہا آپ کو صرف پیٹ کی فکر ہے مجھے ان کی ہنسی بڑی مردہ سی لگی میرا ایمان ان کے انداز گفتگو سے ٹھٹکا ـــــ میں نے پوچھا حالات کیسے ہیں انہوں نے جواب دیا "زندگی نہیں" اچھی بھی نہیں ہے؟ اور تمام مجاہدین کو چاٹگام چلنے کا حکم دیا

ہم چاٹگام پہنچے چھاؤنی کے علاوہ شہر میں البدر کے دو کیمپ فوراً ختم کر دیئے گئے شہر میں جماعت کے دفتر کے گرد خندق کھود کر ۱۵ اسلحہ کے دو مورچے لگا دیئے گئے تاکہ دشمن یہ تاثر لے کر یہاں آخر دم تک مقابلہ ہو گا اور اس پر اپنی توجہ مرکوز رکھے دفتر سے چھاؤنی گئے وہاں تحریک کے دیگر ساتھیوں کو بھی وردی پہنا کر البدر میں شامل کر لیا گیا تاکہ یہ فوجی سسٹم کا لحاظ کر کے انہیں بچایا جا سکے اس طرح چھاؤنی میں تین ہزار البدر اور رضاکار اکٹھے ہو گئے تھے وہاں کیپٹن نے پہلے ہتھیار رکھنے کو کہا پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ [illegible] اٹھا سکو اٹھا لو اور ایک ایک پیٹی ہتھیار لے کر ائرپورٹ پہنچ جاؤ وہاں پہنچے تو اس نے البدر سے کہا کہ اپنے مکان پر جا سکو تو چلے جاؤ ورنہ یہاں رہ جاؤ میں نے پوچھا یہاں سے کہاں جائیں" اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا مگر آنسوؤں، رحم اور دھاڑوں سسکیوں کا طوفان ـــ!!

## فرار ـــ فرار ـــ فرار

عروج کے بعد جب زوال آیا انہوں نے آنکھیں پھیر لیں مکتی باہنی نے چھریاں اور سنگینیں سونت لیں تو پیچھے کی واحد راہ ـــ راہ فرار تھی تو ـــ عبرت انگیز بھی ہے، اور ولولہ انگیز بھی ـــ یہاں ہم البدر کی داستان فرار پیش کی جا رہی ہے!

## محمد چٹا گانگ

"جب کیپٹن ہمارے سوال کا جواب نہ دے سکا تو میں نے اسی اثنا میں اپنے حلقہ عیدگاہ کے بارہ البدر ساتھیوں کو اکٹھا کیا ان سے میں نے پوچھا بھائیو! کہاں جاؤ گے؟ انہوں نے کہا یہیں رہیں گے میں نے کہا، مکتی باہنی والے آپ کو شہید کر دیں گے وہ کہنے لگے ماں باپ کے سامنے شہید ہونا اچھا ہے اس پر میں انہیں لے کر چاٹگام آیا (رات شہر میں البدر نے ریڈیو سے اعلان کر کے کرفیو لگایا ہوا تھا) انہیں شہر کے ایک بورڈنگ میں ٹھہرا کر ساحل کی طرف گیا گھاٹ پر موہیش کھالی کا ایک شناسا کشتی والا ملا اسے گھر لے جانے کو کہا اس نے داڑھی کاٹنے کے لئے کہا واپس آ کر بورڈنگ میں سو گیا ۱۷ سترہ تاریخ کی صبح ایئرپورٹ پر گیا وہاں کوئی بھی نہ تھا پورے چاٹگام میں پھر کر کوئی سپاہی یا البدر نہ ملا ایک نالہ کے پیچھے میں نے اسلحہ پھینک دیا بورڈنگ آ کر اپنے ساتھی کارکنوں کو جگایا اور

پڑھی۔ ناشتہ کیا افطار سے ایک لنگی اور کرتہ لیا اور سلیوٹی اتار پھینکی۔ امین الاسلام نے کہا کہ آپ کو لوگ جانتے ہیں اس لئے آپ یہاں سے چلے جانے میں بہتر ہیں ان سے اتنی تی کرکے میں رخصت ہوا اور کہا کہ میرے رہنے سے تم بھی ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ مجھے تو یہ لوگ شاید گلا ہی شہید کر دیں۔ تم لوگ کچھ اور رہ جاؤ ۔ دور ہو تاکہ کچھ اور اللہ کی عبادت کر سکو۔ میرے پاس ۴۰ روپے تھے۔ ہر ایک کو دس روپے دیئے دس اور رکھے اور روتے ہوتے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ میں تو آج یقیناً شہید ہو جاؤں گا

۹ بجے صبح میں دوبارہ کشتی والے کے پاس پہنچا اس نے پوچھا داڑھی کا ذکر چھیڑ دیں بے داڑھی آدمیں کاٹوں گا اس نے یہ کہہ کر کہ کوئی پکڑے تو میں کچھ نہیں کہوں گا مجھے کشتی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ ایک گھنٹے کے بعد کشتی گھاٹ سے الگ ہوئی۔ ایک ہوائی لیگی بھی ساتھ تھا موہیش کھالی کی سمت کشتی ایک میل ہی بڑھی ہوگی کہ مکتی باہنی نے کشتی کی طرف دوڑ کر گئے اور آواز دے کر ادھر آ، کشتی پھر ساحل سے لگ گئی۔ انہوں نے پوچھا کوئی البدر، رضاکار یا مجاہد ہے۔ کشتی والوں نے کہا نہیں کوئی نہیں۔ پھر انہوں نے سب کے چہرے گھورے سب نے نگرانی کرنے لگے اور پھر وہ اس پر میری طرف متوجہ ہوئے۔ وہاں سے تین میل بڑھے تھے کہ بازار گھاٹ کے قریب ایک اور ٹولے نے بلا لیا اور وہی سوال دہرایا۔ کوئی البدر، مجاہد، رضاکار ہے۔ اس پر کشتی میں موجود ہوائی لیگی نے کہا کہ یہ ایک البدر ہے۔ مکتی فوج نے کہا اسے کیا کرے گا۔ میں نے کہا گالی مت دو اور جو چاہے کرو۔ ہاتھ پکڑ کر کشتی سے باہر کھینچ لیا میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا میں مسلمان ہوں جس طرف چاہو لے جاؤ۔ مجھے وہ اتار کر لے گئے ساحل سے قریب ہی میں نے دیکھا کہ ایک سو سے زائد مجاہد بندھے ہوئے تھے انہیں اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ مجھے بھی اس طرف لے گئے

اس وقت اچانک مجھے اپنے محلے کا ایک مکتی باہنی نظر آیا۔ اس نے پوچھا تم ادھر کہاں۔ میں نے کہا کہ ہمارے امتحان کا نتیجہ لینے ہیڈ ماسٹر نے مجھے گاؤں بھیجا تھا مگر راستے سے ہی واپس جانا تھا کہ یہ مجھے البدر کہہ کر مارنے کے لئے کشتی سے اتار لائے ہیں۔ اس پر میرے محلے والا دوسروں سے جھگڑ پڑا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے ایک سال آزادی کے لئے جنگ کی ہے اگر تم اسے مارنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے مار دو۔ جھگڑے کے بعد انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور رات ۲ بجے کے قریب میں گھر پہنچا۔ ابا نے بتایا کہ مکتی باہنی تمہاری تلاش میں کئی مرتبہ یہاں کے چکر لگا چکی ہے۔ تمہارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تم ڈاکٹر نورالامین کے پاس جاؤ۔ جو جریدہ کی عوامی لیگ کا سیکرٹری تھا۔ اسے میں نے پاکستانی فوج سے بچا کر ایک عرصہ اپنے مکان میں رکھا تھا۔ میں نے جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ صبح ۴ بجے کا عمل تھا وہ پستول لے کر نکلا میں نے تعارف کرایا اور یاد دلایا۔ اس احسان فراموش نے جواب دیا کہ فوراً میرے سامنے سے چلے جاؤ ایک مرتبہ اور دیکھا تو مار ڈالوں گا۔ اس مرتبہ تو ترنم میں چھوڑ رہا ہوں میں نے کہا یہ ہے جاری عمر اور پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ ایک ہفتہ درختوں کے پتے کھا کر گزارا کیا۔ ایک ہفتہ بعد حسن اتفاق سے اپنے ایک ملازم سے ملاقات ہوگئی۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا اور وہ کچھ کھانا، کرتہ اور سگریٹ کے پیکٹ دے کر چلا گیا۔ سگریٹ پینے کی عادت فوجیوں سے البدر کے ساتھیوں کو ملی تھی کیونکہ لڑائی کے دوران یہی وہ واحد چیز ہوتی ہے جو سردی سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ابا سے کہو کہ وہ مجھے کسی اور ملک بھیج دیں۔ اکیس دن پہاڑ پر گزارے۔ اکیس دن بعد وہی ملازم اور میرا چھوٹا بھائی

اپنے ساتھ کمبل اور لنگی لے کر آئے تھے کمبل بہت گھٹیا تھا اس پر مجھے صدمہ ہوا کہ کہیں ہمارا گھر بھی تو نہیں لوٹ لیا گیا کہ یہ انتہائی گھٹیا کمبل روانہ کیا ہے۔ بھائی سے پوچھا تو اس نے کچھ نہ کہا مگر کچھ چھپانے کی کوشش کی۔ دراصل بات یہ ہے کہ محمد ... کے والد کا کاکس بازار اور موہیش کھالی کے درمیان آمد و رفت کے لئے کشتیاں چلانے کا کاروبار تھا

خود محمد ... کا بھی الگ کاروبار تھا اور دو تین کشتیاں ان کی بھی چلتی تھیں۔ آتے ہوئے کاکس بازار کے بینک میں ذاتی اکاؤنٹ میں ان کے بارہ ہزار روپے تھے۔ چیک بک وغیرہ جمعیت کے ایک کارکن کو دے آئے تھے۔ بھائی نے ایک سو روپیہ مجھے دیئے اور کہا کہ آئندہ رات ایک لانچ بازار گھٹولی (ایک گھاٹ کا نام) پر آئے گی اس میں سوار ہو جانا

اس اثناء میں میری جوتی بھی ضائع ہوگئی ہوا یوں کہ ایک دن صبح درخت سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا اس وقت ایک لومڑی نے آکر میری جوتی چبانی شروع کر دی۔ میں نے دیکھ کر بھگایا مگر اب وہ پہننے کے قابل نہ رہی تھی۔ یوں اب میں ننگے پیر تھا

ہم مقررہ وقت پر لانچ میں سوار ہو کر برما کی طرف روانہ ہوئے۔ انگریزوں کی یہ لانچ میرے والد صاحب نے کرائے پر حاصل کر کے منگوائی تھی۔ مہیش کھالی ہی کے دو اور محب وطن اس میں سوار تھے۔ سفر شروع ہوا۔ درمیان میں ایک جزیرہ "جیرہ" آیا اس کی ساری آبادی تحریک کی حامی تھی۔ بہرحال ہم نے خود کو مکتی باہنی کہہ کر ان سے ناریل حاصل کئے (یہاں کے ناریل سب سے مشہور ہوتے ہیں)

آٹھویں دن کے ۳ بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ جس جیرہ کے ساحل سے جوں ہی جدا ہوئے ہمیں مکتی باہنی کی ایک لانچ نے دیکھ لیا اور تعاقب شروع کر دیا۔ سورج ڈوبتے وقت تک تعاقب ہوا۔ بالآخر رات کے اندھیرے میں ہم بچ نکلے۔ رات بھر لانچ چلتی رہی مگر مکتی باہنی سے بچنے کی کوشش میں ہم بھٹک کر گہرے سمندر کی طرف نکل آئے تھے کسی کو سمت کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ اندازاً شمال کی طرف لانچ موڑ دی۔ دس گھنٹے بعد یہاں پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ مزید تین گھنٹے کے بعد ہم برما میں مچھیروں کی ایک بستی پہنچے۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر رات ایک گاؤں میں اترے ساری آبادی مسلمان تھی۔ مسجد ایک جاننے والے بھی مل گئے۔ جا کر کھانا کھایا۔ رات ٹھہرے۔ صبح نہائے کپڑے بدلے۔ پتہ چلا کہ ہمارے یہاں آنے کی خبر مشہور ہو گئی ہے۔ (برما میں دو متوازی حکومتیں عملاً موجود ہیں۔ ایک برما گورنمنٹ کی، ایک کمیونسٹوں کی) اب جو بھی ملے گا وہ ہمیں پکڑ لے گا۔ بہرحال دن وہاں گزارا اور رات ہمیں ایک پہاڑ میں مختلف مقامات پر وہاں کے مسلمانوں نے چھپا دیا۔ صبح بیاشکے قریب واقع ایک مسجد کے امام نے مشورہ دیا کہ اپنے سفارت خانے کو خط لکھو۔ چنانچہ میں نے البدر کی ذمہ داری کی حیثیت سے انہیں خط لکھا ہمارا سفارت خانے والوں نے کہا کہ فوراً دفتر آ جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ تیسرے دن ہم کشتی لے کر اکیاب چلے گئے

دن کے ۱۰ بجے وہاں پہنچے۔ کشتی ۲ بجے کرائے کی گاڑی منگوائی اسی اثناء میں اکیاب جامع مسجد کے امام کو بھی ہماری اطلاع پہنچ چکی تھی وہ بھی تشریف لے آئے سب مل کر پاکستان آفس پہنچے مگر دس منٹ بعد برما کے امیگریشن والوں نے ہمیں سفارت خانے کی حدود میں داخل ہو کر گرفتار کر لیا اور ریکارڈ کر لئے گئے۔ سفارت خانے کی حدود سے پکڑنے پر پاکستانی ایلچی نے سخت احتجاج کیا اور بالآخر رہا ہو کر پاکستانیوں کے کیمپ میں بھیج دیا۔ وہاں اس وقت ۸۰ فوجی مقیم تھے۔ سب ٹوٹ کر گلے ملے اور حال احوال معلوم کیا۔ تین دن بعد ڈھاکہ سے فرار ہو کر ایک کرنل وہاں پہنچا۔ اس نے ہم تینوں کو ملا کر خوب گفتگو کی اور کہا کہ اگر مشرقی پاکستان سے ایک کروڑ مسلمان بھی آئیں گے تو بھی ہم انہیں مغربی پاکستان بھیجنے کا انتظام کریں گے۔ پھر وہ دلاسا دے کر چلا گیا

اس بات پر ہم نے مشرقی پاکستان اور ساتھیوں کو لانے کے لئے خطوط روانہ کئے۔ لیکن مزید لوگوں کی سرپرستی میں ایک طرف فوجی کیمپ سے چلے گئے تو ہمیں بھی ایک ہفتہ بعد برما گورنمنٹ کے حوالے کر دیا گیا جس نے ہمیں جیل میں ڈال دیا۔ برما کے افسروں نے کہا کہ تم لوگ اتنی کچھ قربانیاں دے کر آئے ہو مگر ہم کیا کریں پاکستان سفارت خانہ آپ کو قبول نہیں کرتا اس لئے ہمارے ملکی قانون کے مطابق ہم آپ کو قید کر رہے ہیں۔ یہ سترہ ...

بات سنے۔ دوسرے دن ہم نے کھانا پینا بند کر دیا اور کہا کہ کوئی چور نہیں جو جیل میں رکھا ہے ہمارے کھانے سے انکار کرنے پر دو تین بڑے افسر آئے کہ کھانا کھا لیں مگر اصرار کیا ایگزیکٹیو ڈیپارٹمنٹ کا اکیاب میں سب سے بڑا افسر آیا اس نے بہت کہا مگر ہم نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا بالآخر اس ضلع کا سب سے بڑا اسلامی افسر جو ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا آیا وہ بدھ مذہب کا پیرو تھا پاکستان سے اس نے میٹرک کیا ہوا تھا ———— اس نے کہا کہ میں رنگون میں پاکستانی سفارت خانے سے بات کروں گا آپ کھانا کھا لیں اس نے حسب وعدہ پاکستانی سفارت خانے کے ذمہ داران سے بہت بحث و مباحثہ کیا انہیں کافی شرمندہ کیا اس لئے کہ یہ ذمہ داری تم قبول کرتے ہو مگر انہیں لینے سے کیوں انکار کر دیا ہے کیا اس لئے کہ یہ مظلوم ہیں نتیجتاً سفارت خانے نے ہماری ذمہ داری لے لی اور اسی دن ہم لوگوں کو جیل میں پاکستان کی طرف سے کھانا ملا اس کے بعد ہم نے دیگر سہولتوں کے لئے سفارت خانے کو لکھا جو ہمیں مل گئیں۔ برمی سرکاری کارروائی کے طول پکڑنے کی بنا پر ایک ہفتہ مزید جیل کاٹنا پڑی۔

ہماری قید کے دوران "اکیاب" (برما) کے مسلمانوں نے ہمارے لئے ایک ایکشن کمیٹی بنائی تاکہ وہ ہماری رہائی کا ہر ممکن بندوبست کر سکے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک لاکھ روپیہ کی ضمانت بھی دینی پڑے گی تو دیں گے بہرحال ہم مدت بعد کاٹ کر رہا ہوتے پھر ایک ہوٹل میں سفارت خانے نے ہمیں رکھا اس ایک ہفتہ میں برمی مسلمانوں نے ہماری بہت خدمت کی میرے پاس بوسے رہتے اور مہمان ہوتے تساجی کارڈ پر ملتے تھے چنانچہ ایک برمی نے ایسے کارڈ پر میرے لئے نوٹ تحریر کئے۔ ان تمام دنوں روزانہ بے شمار لوگ ہمیں ملنے آتے۔ وہاں سے ہمیں پھر کیمپ لے جایا گیا اب چونکہ آزادی نہ تھی اس لئے لوگوں نے کھلے دل سے ہمارا استقبال کیا کیمپ میں ہمیں ملنے کے لئے کئی مسلمان سپاہیوں کو کچھ دے کر آ جاتے اسی طرح کی کوشش میں ایک رنگون میٹرک کے دو طالب علم گرفتار کر لئے گئے جنہیں ۲۴ گھنٹے قید رکھا گیا

یکم اپریل کو ہم اکیاب سے رنگون روانہ کر دئیے گئے خاموشی سے روانہ کرنے کے باوجود الوداعی سلام کہنے کے لئے بلا مبالغہ سینکڑوں اکیابی مسلمان آن پہنچے مگر پولیس نے ملنے نہ دیا۔ ہم کلاس کے طالب علم رشید نے ہماری روانگی سے دو گھنٹے قبل رو رو کر اپنا حال برا کر لیا ان ساتھیوں کی اس محبت کو جو محض خدا کے لئے تھی، دیکھ کر غریب الوطن ہونے کے باوجود تمام کلفتیں، تکلیفیں بھول گئے، بہرحال یہاں پر میں نے دو طالب علموں کو جمعیت کی دعوت دی جنہوں نے کام کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا خدا کرے وہ بہتر حالت میں استقامت سے گامزن ہوں۔ رنگون پہنچنے پر مسلمانوں نے ہمیں شہر کی سیر کرائی پھر وہاں سے بنکاک اور بنکاک سے کراچی پہنچے۔

**کامران** (مومن شاہی) نے کہا مجھے پوری طرح علم نہ تھا کہ ہتھیار ڈال دیئے گئے ہیں البتہ فائرنگ کی آواز ختم ہو گئی لیکن اکا دکا فائر ہونے جس نے اس اندیشے کو تقویت دی کہ ہندو فوج کہیں ایک ایک کر کے محب وطن لوگوں کو ختم ہی نہ کر رہی ہو۔ سارا دن ہم چھپے رہے شام کے وقت ہم چاروں ساتھی گھر سے نکلے تو راستے میں ہندوستانی فوج نے ہمیں گرفتار کر لیا ہم نے کہا کہ ہم لوگ دیہاتی ہیں یہاں ویسے ہی پھرتے پھراتے آئے ہیں چند گھنٹے بعد انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ اس وقت وہاں مکتی باہنی کا کوئی فرد موجود نہ تھا۔ وہاں سے چار میل دور ہمارے ایک استاد صاحب کا گھر تھا جہاں ہم تین دن چھپے رہے اس کے بعد چاروں ساتھی چاروں طرف پھیل کر معلومات اکٹھی کرنے لگے۔ علم ہوا کہ مقبول احمد فرید الدین اور دوسرے تقریباً ۸ مجاہدین "البدر" شہید کر دیئے گئے ہیں ان ساتھیوں کو بہت ظلم کرتے ہوئے شہید کر دیا۔ اب ان تینوں ساتھیوں نے اپنی راہ لی۔ میں ڈھاکہ کی طرف روانہ ہوا۔ دس دن بعد ڈھاکہ پہنچا۔ مجھے سب سے لوگ جانتے تھے مگر خدا کی مہربانی ہے کہ بہ سلامت بچا رہا۔ ۲ روز وہاں ایک گھر میں چھپا رہا اور ۱۱ جنوری کو چٹاگانگ روانہ ہوا۔

امی جان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی ہم دو بھائی تھے بڑے بھائی ملازمت کرتے اور میں پڑھتا تھا ایک میری چھوٹی بہن تھی۔ والد صاحب ضلع کے رکن تھے سقوط کے بعد گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ البتہ چند مخبروں کے ذریعہ گھر کے حالات کا علم ہوتا رہا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ شاید کسی ملک میں بھیج دیا جائے۔ ابا جان دوبارہ روپوش رہنے مگر گرفتار کر لئے گئے۔ والدہ محترمہ پر بیماری نے زبردست حملہ کیا۔ ان کا انتقال اس صورت میں ہوا کہ ان کی ایک چھوٹی بچی ساتھ تھی انتہائی لاڈلا بچہ چند میل کے فاصلے پر تھا جو لمحات مرگ میں ——— مامتا کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہ دے سکتا تھا سرتاج اور جیون ساتھی قید خانے میں تھا۔ بڑا بچہ مالی طور پر تباہ حال تھا ——— والدہ نے سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ دم دینے وقت امی پیاری ماں کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا جسے دیکھتے ہوئے تقریباً دس ماہ سب تھکے تھے ——— لیکن ماں کی مامتا نے آخری دموں پر پیغام بھیجا کہ "بیٹا سنی، آزادی کے جو ٹھیکیدار ہیں تیری تلاش میں گھر کے گرد بیٹھے ہیں نہ آنا"

چٹاگانگ میں کسمپرسی کے عالم میں ۸ ماہ گزارے۔ جہاں مجیب کے بکھرے ہوئے ساتھیوں کو منظم کرنے کی کوشش کی اس کے بعد ایک رات ہندوستانی سرحد عبور کر کے انڈیا چلا گیا جہاں ایک ماہ گزارنے کے بعد محسوس ہوا کہ انڈیا میں رہنا سخت خطرے میں ہے جس پر کچھ اور معروف دوستوں سے مل کر نیپال کی سرحد عبور کی چھ ماہ کھٹمنڈو میں رہائش پذیر رہا۔ وہاں سے پھر بھارت کے راستے پاکستان داخل ہوا جب مغربی پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں کی زبان یہاں کا کلچر نہ جاننے کے باوجود یوں لگا جیسے میں اپنی دم توڑتی ہوئی والدہ مرحومہ کی گود میں آ گیا ہوں

## ایم اسلام راجشاہی

۱۶ دسمبر کو صبح ۸ بجے باقاعدہ طور پر راجشاہی میں پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ البتہ چھاؤنی کا کنٹرول بھارتی فوج نے اس روز نہ لیا اس لئے ہم اس وقت تک وہیں رہے۔ رات ہوتے ہی ہم وہاں صبح سے شام تک عاملس پہنچا کے قریب ساتھی کپڑے بدل کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے صرف بارہ رکن امیدوار رہ گئے۔ تین بجے رات کو کپڑے وغیرہ بدل کر ہم بھی دو دو کی ٹولیوں میں فرار ہونے لگے (اس وقت سے اب تک کسی اور ساتھی کا پتہ نہیں ہے۔ البتہ میرا ساتھی متین الدین امیدوار رکن جمعیت راجشاہی یونیورسٹی ایم۔اے فائنل ستمبر پلاٹون کا لیڈر کھٹمنڈو پہنچنے میں کامیاب ہو گیا) وہاں سے نکل کر فجر کی نماز کے بعد متین الدین اور میں بھارتی سرحد کی طرف چل نکلے بیس میل کے قریب پیدل چل کر ۲۰ دسمبر کو مغرب کے وقت ہم دریائے پدما کے راشا گھاٹ پہنچے (اس دریا کے کچھ بعد ہی بھارتی سرحد ہے) یہ سفر ہم نے اپنے آپ کو مکتی باہنی ظاہر کر کے کیا راستے میں بے شمار مکتی باہنی کے جھنڈے ملے سب کو اس طرح ہم جل دے کے راشا

گھاٹ پہنچ گئے۔ وہاں سے کشتی پر روانہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد ہی مکتی باہنی کی پیٹرولنگ کرتی ہوئی بائی کشتیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں راج شاہی یونیورسٹی کا ایک طالب علم عوامی لیگ کا طالب علم بھی تھا جس نے ہمیں پہچان لیا اور اس کشتی سے پکڑ کر ہمیں اپنی کشتی میں سوار کرالیا۔ ریوالور جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا وہ ایک سردار کی جیب میں تھا اور ایک سرکار سرکاری جیپ میں بھا مجھے لیا گیا اور کیمپ میں لے گئے ان کا کیمپ تھا وہاں ہمیں لے گئے۔ دو دن ہمیں مسلسل پیٹا لاٹھی وغیرہ سے پیٹ کر وہ ہمیں جان سے مار دینا چاہتے تھے کیونکہ گولی خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی میں چار گھنٹے تو مجھے ہوش رہا بعد باقی عرصہ بےہوش رہا درمیان میں کبھی کبھی ہوش بھی آتا اس دوران اس گروپ سے مکتی باہنی نے اپنے سینئر ایڈوائزر سے جو بھارتی تھا رابطہ میں ایک کمیونیکیٹ کیا تو ہمیں ریل گاڑی پر ڈال کر وہاں پہنچا دیا کیونکہ ہم چل نہیں سکتے تھے۔ ایڈوائزر جیل میں ہمیں میں چار دن رکھا اس دوران کھانا بھی نہیں دیا ہماری حالت ہوش میں آنے کے بعد بھی اس قدر خراب تھی کہ ہمیں اپنے زندہ بچنے کی توقع نہیں تھی چار دن وہاں رہتے اس دوران تشدد دیکھ کر راج شاہی یونیورسٹی کے دو طالب علم مکتی باہنی کو ہم سے کچھ ہمدردی ہوگئی وہ وہاں ہمیں اس طرح مار ڈالنے کے خلاف تھے جو تری تھے انہوں نے ہمیں کچھ دودھ وغیرہ بھی پلایا اور ایک انجکشن بھی ڈاکٹر کو بلا کر لگوایا۔ مکتی باہنی کے ان دو لڑکوں کو ہماری ہمدردی پر آمادہ دیکھ کر مکتی باہنی کے کمانڈر نے ہمیں راج شاہی بھیج دینے کا فیصلہ کیا اس نے ہمیں راج شاہی جانے والی ٹرین کے ایک علیحدہ ڈبے میں پھینکوا دیا کوئی گارڈ وغیرہ بھی ہمارے ساتھ نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم ہوا کہ ہم میں اتنی سکت بھی نہیں کہ حرکت بھی کر سکیں اور جب ہم راج شاہی پہنچیں گے تو خود ہی دھر لئے جائیں گے۔ اس لئے کہ وہاں ہماری تلاش میں مکتی باہنی والے پہلے ہی پھر رہے ہوں گے اندازاً ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو راج شاہی میں جب ٹرین رکی تو ہم دونوں اتر کر ہماری کالونی کی طرف چلے راستے مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی قوت اس وقت ہم میں کس طرح آگئی تھی ہماری کالونی سے سب بہاری ۱۸ دسمبر کو ہی بھاگ چکے تھے۔ بہاری کالونی میں آدھا گھنٹہ ہی چھپے رہتے تھے کہ میرے ساتھی کے گاؤں کا ایک جاننے والا تانگے والا ملا جس پر اس وقت سوار ہو کر وہاں سے تیس میل دور معین الدین کے گاؤں چلے گئے اس کے گھر پہنچ کر ہم فوراً کھانا کھانے لگے کیونکہ کئی دن سے بھوکے تھے ابھی وہاں پہنچے ہوئے ہمیں دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ مکان پر مکتی باہنی نے فائرنگ شروع کر دی۔ نہ جانے انہیں ہماری آمد کی اطلاع کس طرح مل گئی تھی، چونکہ ہم تانگے پر بھی چادر وغیرہ لپیٹ کر بیٹھے ہوئے تھے پچھلے دروازے سے ہم فوراً نکل گئے اور پیدل چل کر پانچ چھ میل دور معین الدین کے ایک اور رشتہ دار کے پاس پہنچے اس دوران میں ہمیں خبر ملی کہ شمس الدین کے گھر پر فائرنگ سے اللہ نے ہمیں بچا لیا ہے۔ لیکن معین کے بڑے بھائی جان اسی میں آکر شہید ہوگئے ہیں۔ ــــــ دو روز ہم وہاں چھپے رہے اسی دوران اسی رشتہ دار کے ذریعے ایک مسلمان محب وطن بنگالی مزدور ہم نے ہمیں رد پ

مزدوری پر حاصل کیا۔ میں نے بھی مزدور کا ساحلیہ بنا لیا۔ لباس اسی طرح کا پہنا اور زندگی بھر سگریٹ نہ پینے کے باوجود بیڑی سلگا کر منہ میں لگائی اس کے ہمراہ بیس میل دور، بھارتی سرحد کے نزدیک اس بہنوئی کے گھر پہنچا

وہاں گیارہ دن چھپا رہا اور بارہ رات کو ایک ہمدرد اور خدا ترس ڈاکٹر آکر مرہم پٹی کرتا تھا گیارہ روز کے علاج کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ۲ جنوری ۱۹۷۲ء کی رات ایک سمگلر کی کشتی پر سمگلر کے طور پر ۳ جنوری کو بھارت میں داخل ہو گیا جہاں ایک ماہ، مالدہ کدار کر بہار کا رخ کیا۔ اور پھر ـــــ اپنے وطن پاکستان میں ـــــ عرب اللہ مار آن پہنچا ـــــ !!

## راج شاہی

کے ام اسلام نے بتلایا کہ راج شاہی میں ۱۹ دسمبر کو فوج نے سرنڈر کیا ۱۸ دسمبر کو ہم لوگ راج شاہی سے تیس میل دور نانور ریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلے گئے تھے۔ تقریباً ساٹھ کارکن میرے ساتھ تھے یہ کارکن نارتھ بنگال کے مختلف علاقوں سے آئے تھے ان میں راج شاہی کے بیس ساتھی بھی تھے جب انگریز ڈسٹرکٹ کو ۸ اسے سے فوج نے خالی کر دیا تھا چنانچہ یہاں سے ہمارے چند چند کارکن اور البدر کے مختلف رینکس کے مجاہد نانور پہنچے۔ نارتھ بنگال کا ریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھی نانور میں تھا۔ ہم اٹھارہ کارکن تھے عبد القیوم عارری، اررحمٰن، غلام علی میاں، ابوالعاصم، عزیز الدین عبدالجبار قربانی صبر اور میں ـــــ

میرے اندازے کے مطابق ۱۵ دسمبر کو ہمارے پاس سے نکل چکا تھا ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ کے زوال تک مکتی باہنی اور انڈین فوج کا راج شاہی شہر پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا ڈھاکہ کے زوال کے بعد بھی جب کبھی ہم فوج سے معلوم کرتے کہ جائی تم تو ہتھیار نہیں ڈالو گے تو وہ کہتے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہمارے علاقوں میں بھی مضبوطی ہوگئی تھی۔ راج شاہی کا ہندو اسٹیشن بھی امریکا ہمارے ہی کنٹرول میں تھا ہم نے فوج سے کہہ رکھا تھا کہ اگر مرنا پڑا یا جانا ہو تو چھاؤنی میں جانے سے پہلے مورچے ہمارے حوالے کر دینا ۱۸ دسمبر کو کمانڈر نے کہا کہ ہم آرمی کو نانور شفٹ کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ سرنڈر کرنے جا رہے ہیں چنانچہ ہم تب بھی اسے فوج کی حکمت عملی سمجھے ہوئے اسے البدر کے ہیڈ کوارٹر اور رہنما افراد کو نانور منتقل کر رہا

۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح ہم نے دیکھا کہ چھاؤنی کے چاروں طرف بھارتی فوج اور مکتی فوج نے پوزیشن لے رکھی ہے اس وقت ہمیں کرنل نے بتایا کہ ہم ہتھیار ڈال رہے ہیں ہم نے کہا کہ ہم تو ساٹھ افراد ہیں، کہاں جائیں گے (اس مرحلہ پر چونکہ ہم اپنا اسلحہ چھپا نہیں سکتے تھے اس لئے ضائع کر دیا، فوج کے ساتھ ہمارا بھی سرنڈر ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ ہم فوجی مطلوب ہے) اس پر پاکستانی کرنل نے انڈین آرمی سے بات کی مگر انہوں نے کہا کہ ہم کسی بھی بنگالی رضاکار کو گرفتار نہیں کریں گے انہیں مکتی باہنی نمٹے گی عرض ۱۹ کی صبح باقاعدہ ہتھیار ڈال دیئے گئے اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے یوں لگتا تھا جیسے پوری دنیا کے شیطان ہماری حالت دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہوں

کھلانا ہے ـــــ ایم۔ رحمٰن ـــــ اے کے صمت نے بتلایا۔ ۱۶ دسمبر کو حسب معمول بھارتی طیارے، چیلوں اور گدھوں کی طرح آ آ کر شہری آبادی، سول اور فوجی تنصیبات پر شدید قسم کی شیلنگ کر کے چلے جاتے ـــــ ایک ایسا مراحمت کئے بغیر شروع دسمبر ہی میں ختم ہو چکی تھی اسی مرحلہ پر مجھے البدر کا ظاہر کبھی نہیں بھول سکتا، جو جماعت ہشتم کا طالب علم اور ننھا کارکن تھا ـــــ اس کی ذمہ داری ”اینٹی ایئر کرافٹ گن“ (ANTI AIRCRAFT) پر تھی۔ شاید کوئی بھی فرد یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو کہ ہشتم کلاس کا بنگالی نوجوان اور گھائل کرنے والی مشین گن کا گر؟ ـــــ اسے عقل تسلیم کرلے ـــــ اگر جب گدھوں پر پڑی ہے تب زندگی اور موت سے کسی ایک کا انتخاب کر نا ہوتا ہے اس جو ماک جنگ میں یہاں یہی کچھ ہو رہا تھا ـــــ !!

دو پہر ایک بجے کے قریب ہمارے مورچہ کی بیت کی اسی اثناء میں فضائی حملہ ہوگا، ظاہر ہے فوراً مار تو ڑی اور اینٹی ائیر کرافٹ استعمال کر دیا ہی فائرنگ سے دائرے بنانا شروع کر دیے تھوڑی دیر بعد جب خطرہ ٹل گیا تو پھر نماز پڑھی ــــ اس پوائنٹ پر پاک فوج کے انچارج حوالدار اسرار خان نے کہا کہ "بھئی اس قدر شدید شیلنگ میں جوابی کارروائی کرنے سے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، کیونکہ اب فضائیہ ہمارے بس میں نہیں، اس لئے اس قدر خطرناک سیٹنگ میں مورچہ بند ہو کر اپنی حفاظت کرنا مرے حال میں بزدلی سے، اور یہی حکمت عملی ــــ ظاہر ہے کہا "استادجی! آپ بھی صحیح کہتے ہیں، مگر شہادت قریب نظر آتی ہے ــــ" ادھر نماز عصر کا وقت ہوا، ظاہر ہے نماز کی نیت باندھی اور پھر دو بھارتی طیاروں نے بیچ پر وار کر کے شیلنگ کی بارش برسانا شروع کیں، ہمارا دھوری تھوڑے پھر اس نے اپنا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا ــــ طیارے چلے گئے، دوبارہ نیت باندھی پھر حملہ ہوا، پھر مار توڑ، "اینٹی ائیر کرافٹ" سنبھالی، نتیجے مورچے سے حوالدار اور دوسرے ایک البدری ساتھی نے حفاظتی اقدام کے لئے مورچہ میں کودنے کو کہا لیکن طاہر حاضر رہا ــــ اور پھر نماز عصر کی نیت باندھ لی ــــ اب حیرت ہے اس نے پہلے عصر کی چار سنتیں ادا کیں، پھر فرائض کی ادائیگی شروع کی ــــ ابھی وہ چوتھی رکعت کے پہلے سجدہ میں گیا ہی تھا کہ شدید فضائی حملہ ہوا، حتیٰ کہ ساتھی بھی نہ بچ سکے ــــ ان کی شدید شیلنگ کی پہلی باڑ نے سجدہ ریز طاہر کے پیکر خاکی کے پرخچے اڑا دیئے ــــ !! اور طاہر شہید ہوگیا ــــ اس کی اینٹی ائیر کرافٹ خاموش تھی ــــ ابھی ایک جانب کھڑی تھی، بے بسی اور حسرت سے انھوں کے لمس کی منتظر کھڑی تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ حوالدار صاحب چیخ چیخ کر دیوانوں کی طرح اسے شاگرد کی لوتھوں کو اٹھا اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگاتا کبھی اسے سینے سے، آدھ گھنٹے بعد ــــ مسجد کے ــــ خاموش مینار سے پرسوز آواز بلند ہوئی ــــ اللہ اکبر، اللہ اکبر ــــ حی علی الصلاح، ــــ (نماز مغرب ہوگئی ــــ)

## ادھورے مضمون کا آخری حصہ!

کہ مارچ سے سات مارچ ۱۹۷۱ء تک ڈھاکہ میں جمعیت کی مجلس شوریٰ اور مجلس اصلاح کا اجلاس ہوتا رہا، دو بڑا در حصے ــــ ایک یہ کہ بالکل خاموش رہا جائے، فوج کا ساتھ دیا جائے اور یہ ہی عوامی لیگیوں کا ــــ دوسرا یہ کہ پوری قوت سے سالمیت پاکستان کے لئے محب وطن عناصر اور گورنمنٹ کی معاونت کی جائے کیونکہ مد مقابل عوامی لیگ ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ایجنٹ اور ہندو بھی ہیں ــــ !! بالآخر دوسری تجویز پر سب نے صاد کیا ــــ !! اور اپریل میں اس پر عملدرآمد شروع کیا ــــ!

مختلف علاقوں میں البدر بننا شروع ہوئی اور سب سے آخر میں یعنی اگست ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں البدر کا قیام عمل میں آیا ــــ صوبائی سطح پر کمانڈر کے تصور کو ردکیا گیا (تنظیمی اعتبار سے تو ناظم صوبہ کمانڈر تھا ہی) لیکن جنگی حکمت عملی میں اصلاح اس کے تابع نہ تھے) اور طے پایا کہ ہر کمانڈر مقامی اور ضلعی سطح پر ہوگا جو بریگیڈ کے تحت کام کرے گا اور جنگی حکمت عملی کا تعین کرے گا!

ــــ دوران جنگ تسلیم کے ایک دوسرے مقام پر رابطہ کے لئے افراد کے ذریعے پیغامات بھجوائے جاتے اور اس عمل کے لئے پورے مشرقی پاکستان کی بنیاد پر جمعیت نے پیغامبروں کا ایک جامع نظام قائم کر رکھا تھا ــــ !! اس عرصہ میں جمعیت کی تمام تر بیٹھکوں اور سب سرگرمیوں اور درس قرآن صرف دو موضوعات پر ہوتے ــــ (۱) تزکیہ نفس، (۲) جہاد

## خون جگر ہونے تک

سقوط مشرقی پاکستان کی رات البدر اور جمعیت کے ساتھیوں کے درمیان مشورہ ہوا کہ "اب کیا کیا جائے ــــ" !!

طے ہوا کہ ــــ یا شہید ہو جائے

یا پھر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے

"کموفلاج" کرلیا جائے ــــ !!

پہلی تجویز کو اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر جذباتی قرار دیا گیا اور کہا کہ شہید ہونے کا مقصد خودکشی نہیں کیا جاسکتا جب شہادت آجائے تو قبول، البتہ اس مرحلہ پر حفاظت اور تسلیم ضروری ہے ــــ ہ در شست ڈھاکہ کی سڑکوں سے ایک جانب ہٹ کر ایک تاریک پارک میں ہوئی ــــ اب مشرقی پاکستان کا کوئی بھی مقام محفوظ نہ تھا ــــ کسی مقام کو اپنا کہا جاسکتا تھا اور نہ پرایا ــــ ۱۷ دسمبر کی صبح فجر کے بعد ڈھاکہ میں آنے والے البدر کیڈٹوں سے مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم نے متحدہ پاکستان کی سرزمین پر جمعیت کا آخری خطاب کرتے ہوئے کہا "ہمیں اپنے رب پہ مکمل اعتماد ہے وہ ہمیں اکیلا نہ چھوڑے گا ــــ اس سرزمین پر ہمیں اس کے دین کے لئے کام کرنا تھا ــــ کرتے رہے ہم نے سب کچھ یہ جان کر کیا کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے ہوئے وطن کی حفاظت ہماری جانوں سے زیادہ عزیز ہے ــــ آج میرے ہزاروں ساتھی نہ جانے کہاں ہیں، کیسے ہیں، کس حال میں ہیں، مگر نہیں اس صورت حال میں بزدل ہونے کی بجائے جدوجہد جاری رکھنا ہے۔

آپ لوگ اپنی حفاظت کریں، ملک میں رہیں یا فرار ہوں، بہرحال اپنی اس قوت کو حفاظت کے ساتھ استعمال کیجئے ــــ!

واپسی اور سسکیوں کی آوازوں میں انہوں نے مزید کہا "ساتھیو! اس وقت صرف ایک ہی ذہن میں میرے دماغ میں صرف "انڈیا" ہے ــــ انڈیا کا نقشہ ہے ــــ !! یہی ہمارا ازلی دشمن ہے جس نے یہاں کی سرزمین پر نفرت کا زہر گھولا ــــ !! دوستو! دعا کرو کہ ہمارے مغربی پاکستانی ساتھی محفوظ رہیں ــــ"!!

## بوئے گل

کمیونسٹوں نے اپنے قبلہ "ماسکو" اور مرکز بھارت کی ملی بھگت سے ہونے والی جنگ میں البدر کے کردار سے خائف ہونے کے سبب مغربی پاکستان میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ

شروع کر دیا ـــــــ اور جواب تک جاری ہے ـــــــ ۱

ہے جو کا ڈرہے سے جو لے ہیں اس صبح کی آثار میں ہم

کرنل صدیق سالک نے کہا: "الدر نے پاکستان کی سلامتی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں، انہیں جو کام سونپا جاتا پوری ایمانداری اور جانی قربانی سے کرتے ان کی تربیان صدیوں تک آنے والی نسلوں کا لہو گرماتی رہیں گی۔ الدر کے کمانڈر میجر صاحب کو ٹومبر کے دوسرے ہفتہ ذاتی نائٹ میں گولی لگ گئی اور وہ زخمی حالت میں لاہور لائے گئے، یہاں تین ہفتے ہسپتال میں رہنے کے بعد بزرگوں سے پوچھتے ہوئے مولانا مودودی کے گھر پہنچے مولانا ان دنوں صاحب فراش تھے ـــــــ وہاں پہنچے گھنٹہ بھیجا عصیم انیمیز سے ملتے ہوتا ہے۔ اس کے اصول کو دیکھا ہے، گھر والوں نے یہ خواہ کوں آ گئے تھے "حسن نے چار روز گفتگو کے گھر والوں کی ترتیب کی لعنی مولانا مودودی"

وہ یہ باتیں سماعت جذباتی انداز میں کر رہے تھے، اس سے قبل میجر صاحب نے کبھی بھی مولانا کو دیکھا اور نہ ملاقات کی اور نہ ان کی کتاب پڑھی ـــــــ ۱۱

بہرحال انہیں مولانا کے کمرے تک پہنچا دیا گیا، وہاں جاتے ہی مولانا کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا: "میرے باپ سب سے پہلے الدری، مولانا صاحب! اللہ کے سپاہی کا تصور ہم نے کتابوں پڑھا ضرور تھا، کہانیوں اور قصوں میں مجاہدوں کے کارنامے سنے تھے، لیکن اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا ۱۱ الدر کے مجاہدوں کی صورت میں ہم نے اللہ کا سپاہی اس صدی میں دیکھ لیا۔ اللہ کے سپاہی کی تمام خصوصیات، صبر، حکمت، عمل، قربانی، وفاداری، خوف خدا ان میں پائی جاتی تھیں۔ مولانا! سچ تو یہ ہے کہ ہم نے میدان جنگ میں عہد صحابہؓ کی یاد تازہ کرنے والے یہ نوجوان دیکھے ـــــــ یہ باتیں میجر صاحب کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مولانا نے جواب میں کہا: "الواقع جس قدر الدر و الشمس کے مجاہدوں نے قربانیاں دیں ان کی نظیر تاریخ اسلام میں بہت کم ملتی ہے ـــــــ مجھے ان نوجوان اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہیں، میں نہیں بیان کر سکتا کہ ان کی اس جدوجہد اور قربانی سے میرے دل پر کس قدر گہرا اثر ہوا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر ان کی قربانیوں کو قبول کرے۔ اس سرزمین پر خدا کا دین نافذ کرنے کی توفیق عطا فرمائے ـــــــ"

ہمارے ہاں جو لوگ اب تک الدر کی جدوجہد کو ناپسند ٹھہراتے ہیں اور الزام تراشیوں میں مصروف ہیں انہیں ایسے موقف پر نظر ثانی کر لینی چاہئے اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے الدر کی قربانیوں کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ الدر نے پاکستان کو زندہ رکھنے کے لئے جو لڑائی لڑی ہے اسی زندگیوں کی قربانی دی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے رائیگاں نہیں جانے دے گا ـــــــ بہت سے اہل علم حضرات کی رائے ہے کہ سانحہ پاکستان کے لئے الدر کے نگاں جوانوں نے جو قربانیاں دی ہیں انہیں تاریخی ریکارڈ کی صورت میں یکجا کر کے محفوظ کر لیا جائے، منظر عام پر لایا جائے اور زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، ہماری یونیورسٹیوں میں اس موضوع پر تحقیقی کام کیا جانا چاہئے اور پاکستان کی حفاظت کے لئے مرنے والے اس اصول ہو کہ ایک ایک قطرے کو محفوظ کر لیا جائے، تاکہ یہ لہو قوم کو بار بار ولولہ اور نئے حوصلے دینے کا باعث بنے۔

---

# تعلیماتِ مسیح علیہ السلام

اے ادھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو مگر اونٹ کو نگل جاتے ہو" (متی ۲۳ : ۲۴)

• "اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا" (متی ۲۸ : ۱۱)

• "یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں، اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی ماں باپ کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں، اور جو کوئی اپنی صلیب (صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے یعنی یہ کہ سر ہتھیلی پر لے کر نکلنا) نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا، اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا" (متی ۱۰ : ۳۴ - ۳۹)

• "جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے۔ ان سے نہ ڈرو، بلکہ اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے" (متی ۱۰ : ۲۸)

• "اے ریاکار فقیہو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو"

• "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳ : ۲۸)

• "اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے، کیا پئیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟" (متی ۶ : ۲۶)

• "تم پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں، وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی ایک کی مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو وہ کیوں نہ پہنائے گا؟ ـــــــ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں تمہیں بھی مل جائیں گی" (متی ۶ : ۳۳)

• "مانگو تو تمہیں دیا جائے گا، ڈھونڈو تو تم پاؤ گے" (متی ۷ : ۷)

# ناخواندگی کا تناسب

اشفاق مہر (مارمسی)

| ملک کا نام | کل آبادی کا ان پڑھ فی صد کے حساب سے |
|---|---|
| جاپان | ۲٫۳ |
| امریکہ | ۲٫۵ |
| فرانس | ۳٫۶ |
| روس | ۹٫۰ |
| مصر | ۸۰٫۱ |
| ہندوستان | ۸۰٫۷ |
| پاکستان | ۸۰٫۸ |

## بقیہ . قانون کی تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں

فقہ سے کی جاتی ہے، پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں، بلکہ ان میں بھی کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو طلبہ ان درس گاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا یہ نتیجہ ہے کہ مسائل زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بارہا شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے۔ اور اس کے لیے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا، لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی، تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخل ہو سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی۔ اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۳ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصول قانون (JURISPRUDANCE) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ، دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تبدیلیوں کے بعد طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے، نہ ان کے اندر وہ اجتہادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجے کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضرورت کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ رونما ہونے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقے پر ہوا ہے اور آئندہ کس طریقے پر ہو سکتا ہے۔ فقہائے اسلام کے جمع کیے ہوئے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو سا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کر لیں۔ اسی وجہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے کالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لا کالج چالاک وکیل یا محض پیشہ ور مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے، بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اس مسند کے لیے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شریحؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور قاضی ابو یوسفؒ جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتویٰ دیتے وقت یا کسی معاملے کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں، کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت ان کو اس بات سے نہ ہٹا سکے کہ وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات کہتے ہوں۔ (اقتباس "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ دوم۔)

# سال بہ سال

## محور کا سفر

| سال | مدیرِ اعلیٰ | مجلسِ ادارت |
|---|---|---|
| ۱۹۵۹-۶۰ | احمد یوسفی | ظفر ہمدانی - صمد رستم |
| ۱۹۶۰-۶۱ء | ایس ناگی | نسرین کوثر |
| ۱۹۶۱-۶۲ء | ایثار حسین کاظمی | ساجدہ پروین |
| ۱۹۶۲-۶۳ء | امین اعظمی | ہما انجم، ممتاز منگلوری، وحدت |
| ۱۹۶۳-۶۴ء | افضال حسین علوی | خالدہ منصور، اسرار حامد |
| ۱۹۶۴-۶۵ء | سیدہ ناز کاظمی | ضیا شاہد، عطاء الحق قاسمی، ریحان عبید |
| ۱۹۶۵-۶۶ء | سیدہ ناز کاظمی | خالد سلیم، ریحانہ بتول، جاوید عظمت |
| ۱۹۶۶-۶۷ء | رفیع الدین ہاشمی | عبدالغنی فاروق، عطاء الحق قاسمی، محمد ارشد چوہدری |
| ۱۹۶۷-۶۸ء | امجد سلام امجد | نرگس پروین، تسنیم شاکر |
| ۱۹۶۸-۶۹ء | اقبال کوثر | جلیل عالی، احمد تبسم |
| ۱۹۶۹-۷۰ء | محمد اجمل نیازی | ممتاز اقبال ملک، مظفر عباس |
| ۱۹۷۰-۷۱ء | ممتاز اقبال ملک | خیر محمد بدھ، محمد سعید |
| ۱۹۷۲-۷۳ء | واجد علی | خالد ہمایوں، ثروت صدیقی |
| ۱۹۷۵-۷۶ء | راشد متین | خالد منصور، یاسمین نیر، انوار قدیر |
| ۱۹۷۶-۷۷ء | | |

## قیادت کا انتخاب

| سن | صدر | جنرل سیکرٹری |
|---|---|---|
| ۱۹۵۸-۵۹ء | محمد حسین | سید اطہر |
| ۱۹۵۹-۶۰ء | جاوید قیوم | مجاہد ترمذی |
| ۱۹۶۰-۶۱ | ریاض احمد | زاہد سرفراز |
| ۱۹۶۱-۶۲ء | علی افضل | خالد سرور |
| ۱۹۶۲-۶۳ء | محمد عثمان غنی | آغا افضال حسین |
| ۱۹۶۳-۶۴ء | محمد نصراللہ شیخ | فدا احمد صدیقی |
| ۱۹۶۴-۶۵ | حامد احمد | مسعود علی |
| ۱۹۶۵-۶۶ | عطاء اللہ | حمید خان |
| ۱۹۶۶-۶۷ء | سید محمد عارف | محی الدین |
| ۱۹۷۰-۷۱ء | حافظ محمد ادریس | عبدالحفیظ خان |
| ۱۹۷۱-۷۲ء | عبدالحفیظ خان | جاوید اختر ہاشمی |
| ۱۹۷۲-۷۳ء | جاوید اختر ہاشمی | پرویز الطاف |
| ۱۹۷۳-۷۴ء | فرید احمد پراچہ | عبدالشکور |
| ۱۹۷۴-۷۵ء | عبدالشکور | سید احسان اللہ وقاص |
| ۱۹۷۵-۷۶ء | مسعود احمد کھوکھر | لیاقت بلوچ |
| ۱۹۷۶-۷۷ | لیاقت بلوچ | سید محمد نعیم |

ریت سے بُت نہ بنا اے مرے اچھے فنکار
ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں
میں ترے سامنے انبار لگا دوں لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا
سُرخ پتھر جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیّر کے پڑے ہوں ڈورے
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے
اِک وہ انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے
جتنے افکار ہیں اِس دور کے سب پتھر ہیں
جتنی اقدار ہیں اس دور کی سب پتھر ہیں
جتنے معبد ہیں اس دور میں سب پتھر ہیں
اِس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے میری زباں پتھر ہے

# بقیہ : پاکستان کا مطلوب شہری اور تعلیم

ماتحتوں پر ان کی آمس کی سکر رہاں اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کا تعامل، دولت کے حصول کے لیے ناجائز طریقوں کا استعمال، امتحانات میں بددیانتی، یہ وہ عام بیماریاں ہیں جو قریب قریب ہر تعلیمی ادارے میں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج استاد کا وہ احترام اور اس کے ارفع و اعلیٰ پیشے کی وہ تقدیس باقی نہیں رہی جو معلّم اخلاق ہونے کی وجہ سے کبھی اُسے حاصل تھی۔

پھر جماعتوں میں وہ جو صورتِ حال دیکھتا ہے اس سے اُسے اسلام کے بارے میں اور بھی بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ معاشیات کا سبق پڑھنے کے لیے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ معاشیات کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ روحانی، مذہبی اور اخلاقی بندشیں معاشی ترقی کے لیے روگ ہیں۔ روزہ سے استعداد کار کم ہوتی ہے، نماز اوقاتِ کار کا اچھا خاصا حصہ ضائع کرتی ہے، حج سے زرمبادلہ کا نقصان ہوتا ہے، مساجد کی تعمیر سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بیکار ہو جاتے ہیں، زکوٰۃ ایک رجعت پسندانہ اور غیر عادلانہ ٹیکس ہے جس میں بنیادی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ سُود کے بغیر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ سٹے کے ذریعہ ہی قیمتوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

نفسیات میں ایک بچے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ خدا، موت، وحی، الہام، خیر و شر، سب اوہام ہیں جو بچپن میں انسان کے دل و دماغ کے اندر خود بخود بیٹھتے رہتے ہیں۔ نیکی و بدی سب اضافی و اعتباری باتیں ہیں۔ جنسی لذات کی تسکین میں کسی نوعیت کی قدغن انسان کو مختلف قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس لیے انسان کو ان بندشوں سے آزاد رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

فلسفہ اور نفسیات کا وہ دور جدید میں جس نہج پر ارتقاء ہوا ہے اُس کا مطالعہ ایک نوجوان کو جو اپنے اندر ناقدانہ صلاحیتیں نہ رکھنے کی وجہ سے غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز اختیار نہیں کر سکتا، مذہب کا باغی بنا دیتا ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں کیا جاتا ہے کہ خدا کا تصور دراصل طبعی قوتوں کے ہاتھ میں انسان کی بے بسی کا مظہر ہے۔ انبیاء علیہم السلام نعوذ باللہ بعض نفسیاتی بیماریوں کے شکار تھے اور انہیں کردار کے مختلف پہلوؤں نے انہیں وحی و الہام ماننے پر مجبور کر دیا۔

ان گمراہ کن افکار و نظریات نے ادب کو بھی بڑی حد تک مسموم بنا دیا ہے۔ دور جدید کا ادب پڑھ کر انسان کے اندر اس

دیکھنے والے، ان سونگھنے والے بیجانے، ان لمحے

دھوکے کا احساس جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، پختہ ہونے کی بجائے معطل ہو جاتا ہے اور انسان اُسے مذہبی عقیدہ سمجھنے کے بجائے محض ایک ادبی لیبل کا درجہ سمجھنے لگتا ہے۔

اور تو اور سماجی علوم جو انسان کے اندر اعمال کی حسِ بیدار کرنے میں ممد و معاون رہتے ہیں آج انہیں بھی باری تعالیٰ کے وجود کے انکار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کی جاتی ہے کہ فطرت کا یہ جمال کسی حسنِ ازل کی جھلک نہیں بلکہ اندھے، بہرے مادہ کی کرشمہ سازی ہے۔

اس غیر اسلامی معاشرہ، درسگاہوں کے غیر اسلامی ماحول اور نصاب کے غیر اسلامی مزاج کے ہوتے ہوئے نوجوان نسلوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلام کی علمبرداری کر کے دنیا میں سرگرم عمل ہوں گی محض خود فریبی ہے۔ اگر ہم واقعی آنے والی نسلوں کو اسلام کا خادم بنانے کے متمنی ہیں تو پھر ہمیں سب سے پہلے اسلام کے بارے میں اپنے فکر و نظر کے زاویوں اور اپنی طرزِ معیشت کے انداز کو بدلنا چاہیے۔ ہم جب تک اسلام کے معاملے میں یکسو نہیں ہو جاتے اور اسے اپنی زندگی کی غایت الغایات ٹھہرا کر اس کی پیروی کا ارادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کر لیتے اس وقت تک ہماری نوجوان نسلیں منافقت کی اس بیماری سے نجات نہیں پا سکیں جو ہمارا اپنا ماحول انہیں لگا رہا ہے۔

اس کے بعد درسگاہوں کے ماحول کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے لیے سب سے پہلی تبدیلی یہ کرنی ہوگی کہ مخلوط تعلیم کی بساط کو جلد از جلد لپیٹ دیا جائے۔ یہ چیز اسلام کے نظامِ معاشرت اور اخلاقی اقدار کے خلاف ایک کھلا چیلنج ہے جسے کوئی مسلمان قوم ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی اگر اس کے اندر اپنے مسلمان ہونے کا کچھ بھی شعور باقی ہو۔

اس کے علاوہ نصابِ تعلیم میں بھی بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ابتداء ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ محض چند مضامین کے تغیر و تبدل سے نوجوان نسل اسلامی سانچوں میں نہیں ڈھل سکتیں جب تک سارے علوم و فنون کو اسلام کے اساسی تصورات کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔ مغربی علوم کو جُوں کا تُوں اپنا کر ان کے ساتھ اسلامیات کے چند اسباق کو الگ سے شامل کر لینا تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس طریقے سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیتیں اُبھرنے کے بجائے اُن کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوگا۔

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے، اسی طرح انگریزی کے مسئلے کو بھی یہ حضرات محض ایک لسانی مسئلہ سمجھتے ہیں جس کا کوئی تعلق کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے دین اور تہذیب سے نہیں ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔

KINGDOM OF SAUDI ARABIA

# FIRST WORLD CONFERENCE ON MUSLIM EDUCATION

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

قرآن كريم

# RECOMMENDATIONS

## Objectives of the Conference

1 To define the Principles, Aims and Methodology of the Islamic concept of Education

2 To suggest Ways and Means of realizing the above principles in practice

3 To formulate methods of securing mutual understanding and co-operation among Muslim scholars all over the world

### I

### PREAMBLE

**The First World Conference on Muslim Education** which met at Hotel Intercontinental Mecca al Mukarramah from 12 to 20 Rabiulthani 1397 A H corresponding to 31 March to 8 April 1977 A D on the invitation of King Abdul Aziz University and under the patronage of His Majesty King Khalid bin Abdul Aziz and the Crown Prince Fahd bin Abdul Aziz

Discussed in the course of a number of sessions the foundations upon which there should be built a sound educational system deriving basically from Islam and committed fully to Islamic concepts and attitudes

And after considering 150 papers presented on the subject by 313 scholars from 40 different countries

Formulated the concepts and attitudes which should inform Islamic education and

Considering the great importance attaching to educaion in the life of a nation

Conscious of the heavy responsibility in the matter of consolidating Islamic solidarity which rests on the shoulders of Muslim scholars the leaders of thought and all those who work in the field of education serve the cause of the Muslim world and advocate full commitment to Islam and believe in the application of the Islamic Shari ah to all domains of life

Recognising that existing conditions in present-day educational institutions in most Muslim countries do not truly reflect the Islamic ideal

And that these institutions do not play their rightful role in the education of the younger generation in Islamic faith thought and conduct

And that there exists at present a regrettable dichotomy in education in the Muslim World one system namely religious education be[ing] completely divorced from the secular sciences and secular educat[ion] being equally divorced from religion although such compartmental[iza]tion was contrary to the true Islamic concept of education and made [it] impossible for the products of either system to represent Islam as a co[m]prehensive and integrated vision of life and

Finally considering the anti religious and often irreligious ideolog[ies] and concepts which have made inroads into secular education — a proc[ess] which is continuing

Made the following recommendations on the concepts and attitud[es] enunciated below

### CONCEPTS AND ATTITUDES

The aim of Muslim education is the creation of the good and righ[te]ous man who worships Allah in the true sense of the term builds up t[he] structure of his earthly life according to the Shari ah (law) and employs i[t to] subserve his faith

The meaning of worship in Islam is both extensive and comprehe[n]sive it is not restricted to the physical performance of religious rituals o[nly] but embraces all aspects of activity faith thought feeling and work [in] conformity with what Allah (Praise be to Him) says in the Holy Qur an [I] have created the Jinn and man only to worship Me and Say O my Lo[rd] my prayers my sacrifice my life and my death are for Allah the Lord of t[he] Worlds Who hath no peer

Therefore the foundation of civilization on this earth the exploitat[ion] of the wealth resources and energies that Allah has hidden in its bow[els] the search for sustenance the measures by which man can rise to [the] recognition of the ways of Allah in the Universe knowledge of the prop[er]ties of matter and the ways in which they can be utilised in the service

faith and in the dissemination of the essence of Islam and in helping man to attain to a righteous and prosperous life — all these are considered forms of worship by which scholars and God seekers come into closer contact with Allah. If such is the Islamic concept of worship and if from the Islamic point of view the object of education in the most comprehensive sense of worship is the upbringing of the true believer, it follows that education must achieve two things. First, it must enable man to understand his Lord so that he worships Him in full conviction of His Oneness, observes the rituals and abides by the Shari ah and the Divine injunctions. Secondly, it must enable him to understand the ways of Allah in the universe, explore the earth and use all that Allah has created to protect faith and reinforce His religion in the light of what Allah has said in the Quran:

> *It is He who hath brought you from the earth and made you inhabit and inherit it*

Thus the sciences of the Shari ah (Islamic law) meet other sciences such as medicine, engineering, mathematics, psychology, sociology etc. in that they are all Islamic sciences so long as they move within the framework of Islam and are in harmony with Islamic concepts and attitudes. All these sciences are necessary in reasonable degree for the ordinary Muslim, while they are in a much more specialized form required and sought by scholars, Mujtahideen and Jurists of the Ummah (the nation).

The Islamic concept of science does not impose any restriction or limitation on theoretical, empirical or applied sciences except for one limitation which pertains to the ultimate ends on the one hand and their actual effects on the other. In the Islamic sense science is a form of worship by which man is brought into closer contact with Allah; hence it should not be abused to corrupt faith and morals and to bring forth harm, corruption, *injustice and aggression*.

Consequently any science which is in conflict with faith and which does not serve its ends and requirements is in itself corrupt, and stands condemned and rejected and has no place in God s injunctions.

*Every system of education embodies a particular philosophy which* emanates from a particular concept from which it cannot be isolated. We cannot have a philosophy or an educational policy which is based on a concept not identical with the Islamic. This is what is now happening when we apply British, French, American or Russian policies of education because they, in the long run, conflict with and contradict the Islamic concept.

Islam embodies a general and comprehensive concept which sustains a self contained, unique and distinctive educational policy. All we have to do is to base our education on this particular, unique and distinctive concept. When it comes to the means by which this end can be achieved there is no objection whatsoever to the full exploitation of every successful human experiment so long as it is not in conflict with the Islamic concept.

*The sources of knowledge*, according to the Islamic concept, fall into two categories:

(1) Divine revelation where Allah teaches that man cannot by himself be rightly guided to the Divine truth and that life cannot be regulated *in the proper manner in the absence of stable and unchangeable injunc*tions inspired by Allah, the Wise and the All knowing whose knowledge encompasses all.

(2) The human intellect and its tools which are in constant interaction with the physical universe on the levels of observation, contemplation, experimentation and application. Man is free to do as he pleases subject to the condition that he remains fully committed to the Quran and the Sunnah.

On the basis of these concepts and attitudes the conference recommends the following:

## III

## RECOMMENDATIONS

**1 Aims of Education**

1 1 Education should aim at the balanced growth of the total personality of Man through the training of Man s spirit, intellect, the rational self, feelings and bodily senses. Education should therefore cater for the growth of man in all its aspects: spiritual, intellectual, imaginative, physical, scientific, linguistic, both individually and collectively and motivate all these aspects towards goodness and the attainment of perfection. The ultimate aim of Muslim education lies in the realization of complete submission to Allah on the level of the individual, the community and humanity at large.

1 2 The Conference recommends that all Muslim countries must necessarily implement Allah s Shari ah and mould the lives of people upon Islamic principles and values because only then they shall succeed in systematising their education according to the aims given above.

**2 Classification of knowledge and the system**

2 1 In order to achieve the ultimate aims and objectives of education knowledge be classified into the following two categories:

(a) Given perennial knowledge based on the Divine revelation represented in the Quran and Sunnah and all that can be derived from them with emphasis on the Arabic language as the key to the understanding of both.

(b) *Acquired knowledge including social, natural and applied sciences* susceptible to quantitative growth and multiplication, limited variations and cross cultural borrowings as long as consistency with the Shari ah as the source of values is maintained.

2 2 *There must be a core knowledge drawn from both with major* emphasis on the first, specially on the Shari ah, which must be made obligatory to all Muslims at all levels of the educational system from the highest to the lowest, graduated to conform to the standards of each level. This along with the compulsory teaching of Arabic should form the major section of the core curriculum. These two alone can sustain Islamic civilization and preserve the identity of the Muslims.

**3 Curricula and Syllabi: Given perennial knowledge**

3 1 Study of the Holy Quran is the basic step in the formation of a Muslim s faith, his ethics, ideas and concepts. Students nowadays memorize small portions of the Holy Quran at different stages of education, and therefore when they graduate from the universities, particularly the professional colleges, they find themselves completely unable to recite properly one single Sura *of the Quran or memorize or read it. The* recitation and memorizing of the Quran therefore be made obligatory from the elementary stage of education onwards with gradually increasing emphasis on interpretation and understanding at later stages in order to guarantee that when the student completes his secondary school he will have memorized at least some parts of the Quran and understood their general meaning. More and more Quranic schools be established for boys and girls alike throughout the Muslim world. At the same time at all stages the study and understanding of the Hadith be emphasised.

3 2 Religious curricula and religious books should be based on the Quran and the Sunnah and be so formed that Allah s signs in the creation and the miracles of His Apostle Muhammad (peace be on him) are highlighted, the allegations of the enemies of Islam repudiated and the hearts of the young opened to the love and fear of Allah and His Prophet (peace be upon him).

3 3 The study of Fiqh (Islamic jurisprudence) should be linked with and bear on our contemporary life as it is actually lived and experienced and its problems and issues with particular emphasis on Islamic solutions as they must be applied in an integrated form in Muslim society.

3 4 The study of the Shari ah with all its related branches should form the core of courses in faculties of law together with comparative studies between Shari ah and secular laws when the need arises. Such courses should be given by a panel of specialists who in virtue of their deep faith and scholarly competence are entitled to elucidate the integral, comprehensive and sublime character of the Shari ah as an effective instrument in serving the interest of the people and meeting the needs of the community and in avoiding the pitfalls arising from the application of secular laws as have been recognised by contemporary capitalist and communist societies alike.

3 5 Islamic culture be taught at all stages of education, particularly at the university level and also in military academies and every college and institute in such a way as would meet the needs of students, solve their scientific, ideological and religious problems and provide sufficient and convincing answers to their queries. The study of Islamic culture should demonstrate the greatness of Islam, its comprehensiveness, its sublime values, principles and systems and its salutary influence on the condition of mankind at all times and in all places. Courses on Islamic culture should review the glories of Islamic history in all fields and enumerate the human *material, political, military and cultural accomplishments of the Muslim* peoples which entitle them to be called the best nation ever known to mankind. This would also demonstrate the influence of Islam on oppressive human institutions, past and present, whether political, economic or social, and emphasize aberrations in contemporary civilisation with its capitalist and communist aspects, in contrast to the institutions of Islam.

3 6 The Conference urges the necessity of further research into rare manuscripts in order to turn them into useful material for study in legal departments at Islamic universities and to raise the standard of the learner of the Islamic Shari ah. Curricula and plans for higher legal studies should be drawn up to produce men competent enough to assess the sources of the Shari ah and formulate Islamic solutions for all problems with which the world is faced.

3 7 ***Place of Arabic and its method of Teaching***

The Conference, having noted that the standard of the students in Arabic is extremely poor in Arab and Islamic countries alike, recommends

that extra attention be paid to the Arabic language with all its branches and that it should become a compulsory subject in all countries of the Muslim world The Conference further recommends that necessary measures be taken to emphasise the place of Arabic in education at all stages particularly in Arab countries and experiments and studies actually undertaken in this field be utilised

4 **Curricula and Syllabi Acquired knowledge**

4 1 **Literature** The Conference urges men of letters in the Muslim world to establish an Islamic school of literary criticism on the basis of Islamic principles with its own standards of judgement in order to be able to *scrutinize and evaluate literature alien to Islamic thought*

4 2 **Arts and Crafts** The Conference draws attention to the necessity of the study of Islamic arts and crafts and the development of Islamic aesthetics

4 3 **Social Sciences** Western social sciences be replaced by a newly devised set of social sciences whose concepts are not only not contradictory to Islam but are drawn from the principles to be found in the Quran and the Sunnah The Conference also recommends that facilities and financial aid be provided to committed Muslim scholars and that the outstanding among them be selected for higher studies Research by individual scholars as well as by teams should be arranged by institutes and societies for specialised studies established for this purpose and the preparation and publication begun at once of text books dealing with the Islamic heritage in all fields of social sciences The Conference would also like the following tasks to be undertaken

a) Bibliographical indexing of the social sciences

b) Comparative studies and

c) Preparation of easy to handle encyclopaedias

4 4 **Natural Sciences** Educational curricula in the Muslim world and at all stages should include the study of the history of sciences and knowledge of the role of Muslims in their development with particular emphasis on the scientific achievements of each Muslim country the significance of Muslim contribution in the scientific field particularly in medicine astronomy physics chemistry and mathematics that led to pioneering work whose research methodology and discovered content and principles were the main basis for further research by European scholars The cause of the development of the sciences during Islam s heyday and their subsequent decline should be fully investigated Students should be urged to revive the scientific spirit of their ancestors under whom Islamic sciences flourished

4 5 **Applied Sciences** *The Conference recommends that courses in* Natural and Applied Sciences be reformulated in the spirit of Islam in such a manner so as to link them with faith intensify the religious outlook of the learners and make them appreciative of the greatness of the Creator and His miraculous creativity as Allah says in the Holy Quran Only those who know fear Allah The artificial gap between Shari ah sciences on the one hand and the physical and non physical sciences on the other must be removed Such a gap has resulted from our failure to adopt Islamic methodology in teaching those subjects separately from religion The *Conference urges that the curricula of those sciences and the prescribed* text books must be purged of ideas and attitudes which directly conflict with Islamic faith or contradict it A distinction must be drawn between scientific facts — which are not contrary to Islamic faith and scientific hypotheses and theories which have not been established definitely and which may be contrary to Islam

On the other hand the Conference calls for separating the cosmic references in the Quran from modern scientific hypotheses and theories excepting those established definitively as scientific facts To connect *them is no service to the Quran it leads rather to confusion of thought and* faith when some of these hypotheses and theories turn out to be false

Universities and scientific research centres should be responsible for recording the facts about these sciences from the Islamic view point in encyclopaedias so that writers of school books of every kind and level can draw upon and refer to them The Conference recommends that students of pure and applied sciences should be required to have some knowledge of Shari ah sciences and humanities

5 **Education and Society Non formal Education**

5 1 **Mass Media programmes** The ideal method for consolidating the educational institutions and helping them in the upbringing of the younger generation on sound Islamic lines is the application of Islam in all domains of life Mass communication media are the most potent instru*ments which can help schools perform their functions if they adhere to* Islamic principles but if they adhere to anti Islamic principles they can equally effectively wipe out any traces of Islamic education

The Conference requests that all those responsible for the information media in Islamic countries should offer simplified scientific programmes guided by the Islamic spirit which links religion with science and which uses science to strengthen religious consciousness Serious efforts be made to produce cultural programmes based on Islamic values as substitute for those immoral plays and films obscene pictures and entertainment subversive of morality that occupy a major place in the present day programmes and films

5 2 **Architecture City Planning and Islamic Atmosphere**

A good and healthy environment outside the limited scope of the school be created and the social atmosphere be purged of alien impurities relating to ideology and values so that there is no conflict between the goals of education and the practice in society In order to achieve this aim proper care be taken to maintain the Islamic atmosphere in architecture city planning and the like to ensure that they are guided by Islamic concepts particularly in the holy cities of Mecca al Mukarramah Al Madina al Munawarah and Jerusalem The Conference urges King Abdul Aziz University to undertake necessary research in this particular field

6 **Teacher Education and Teacher Recruitment**

6 1 Muslim teacher be so trained that their ideas and concepts are inspired by the true Islamic faith and their conduct as individuals and as social beings may be representative of Islamic values and principles in order that they may set the best possible example to their students

6 2 The selection and appointment of teachers should not be based on their academic qualifications alone but their faith and behaviour must be *taken fully into account*

6 3 Care be taken to equip teacher training colleges with all necessary aids tools and facilities for the preparation and education of the good teacher

6 4 Good and promising students be enrolled at these colleges and scientific incentives and rewards be given to encourage them Full attention must be paid to the needs of the teacher and teachers should enjoy material as well as moral prerogative which would help them continue in the teaching profession

7 **Female Education**

7 1 As far as female education is concerned the Conference is of the opinion that the countries which have co-educational systems and where *women are educated according to curricula originally formulated to suit* man s nature and meet his needs without regard to the delicate nature of women and their individual and social functions have begun to suffer from the impact of these systems on their communities The evil consequences of the co educational system consist of moral corruption family disintegration inadequacy in the upbringing of the young truancy among them and their susceptibility to criminal and abnormal tendencies at variance with the Islamic outlook Hence the Conference recommends that men and women be taught separately

7 2 The Conference recommends that a special female educational system based on carefully considered scientific principles be drawn up Each stage in such a system should be self sufficient and independent It shall offer courses which suit the nature of women fulfil society s needs for female services realise the objectives of Islam preserve the ideals of chastity strengthen family ties and morals take into account natural and functional specializations and at the same time spread education among women on a wider scale since in Islam the obligation to acquire knowledge devolves on men and women alike

8 *Non formal Education for Youth*

8 1 Actual application of Islam is absolutely necessary in every school Therefore mosques where congregational prayers are conducted and said at their appointed times should be established in all educational institutions Islamic behaviour which condemns lying and teaches honesty goodness self-denial discipline and cleanliness must be encouraged among pupils Any pattern of un Islamic social behaviour adopted by teachers and pupils should be rejected and resisted

8 2 Youth institutions should be encouraged to practise activities suitable for this stage and in line with the objectives of our Islamic society and its present-day circumstances Programmes should be purged of element alien to Islam and Islamic values

9 **Muslim Minorities**

9 1 Thorough studies of the condition of Muslim minorities in non Muslim countries be prepared and educational policies be designed to protect Muslim minorities from liquidation and prevent their isolation from the Muslim world

The Conference draws attention to the grave and serious situation of Muslims living in Palestine or abroad who receive education at the hands of Zionists or their allies It urges all Muslim to provide adequate educational facilities for the children of this occupied land in view of the precarious circumstances under which Muslim minorities live circumstances calling for continued and ceaseless support to them by all Muslim coun

tries

9 2 A special fund be established for the education of Muslim minorities to which Muslim countries should contribute in order to help these minorities build up Islamic school and institutes in their host country

9 3 Specially trained and qualified teachers equipped with the right cultural and scholarly background suited to the circumstances of the countries where Muslim minorities live should undertake the task of teaching the Arabic language and Islamic culture Muslim minorities in the host countries should also be provided with plenty of school and university textbooks based on Islamic concept

9 4 Muslim countries should mediate between Muslim minorities and their respective host countries with a view to securing to them full rights to establish Islamic schools and persuade their host countries to recognise the degrees and certificates which Islamic schools and colleges award

9 5 Establishment of centres and institutes particularly in Arab countries for the teaching of Arabic to non Arabic speaking Muslims

9 6 Research into the situation of Muslims in non Muslim countries since information about their social cultural religious and educational conditions will be of considerable value in framing an educational policy that will bring the Muslim minorities closer to the Muslim world at large

10 **Ban on Missionary activities**

10 1 The Conference recommends that Muslims in the Islamic countries should abstain from enrolling their children in foreign or missionary schools in their countries whatever the inducements offered by these schools or their parent bodies and organisations because of their ruinous effects on pupils as regards their beliefs and loyalty to Islam and the Islamic nation as well as the danger arising from attempts by the enemies of Islam to combat Islam from within Islamic society itself

10 2 The Conference further recommends a ban on the establishment of further missionary schools in the Muslim world and urges that measures be taken to close down the existing missionary schools

11 **Arabic Script**

The Conference stresses the necessity of retaining the Arabic script in which all languages in Muslim countries should be written so that they might not be alienated from the language of the Holy Quran

12 **Periodicals**

The Conference further recommends that universities and Islamic research centres should undertake the publication of periodicals and papers in foreign languages containing the most important information about Islam published in Arabic and publish in Arabic journals such research published in other languages

13 **World Organisation for Education Culture and Science**

The Conference recommends that a World Organisation for Education Culture and Sciences be established with headquarters located at Mecca al Mukarrama in order to coordinate the work of universities and Islamic education and scientific institutions and supervise Islamic educational policies

14 **World Centre for Islamic Education**

The Conference recommends that King Abdulaziz University establish a world educational centre under the name of the World Centre for Islamic Education at Mecca al Mukarrama which would recruit competent scholars from various Muslim countries who are deeply versed in the culture and ideology of Islam and could be entrusted with the implementation of the resolutions of this Conference. Its functions would be as follows

**First** Drawing up educational policies modelled on the pioneering experiment to be undertaken in the Kingdom of Saudi Arabia which derives its fundamental principles from Islamic sources Detailed curricula for all teaching materials should also be advised and introduced in schools and universities Textbooks suitable for all levels of education from the kindergarten up to the university should be written For this purpose a central research library should be established with a documentation centre attached to it

**Second** The documentation centre should include a translation bureau mainly charged with the task of providing translation of the Quran which are lucid and easy to understand and completely free from the errors noticeable in the existing translations The translation bureau should also undertake the translation of books written in Arabic which deal with Islam into the languages of non Arab Muslims Useful Islamic books written in foreign languages should also be translated into Arabic

The Conference recommends that the translation bureau to be attached to the Education centre should immediately undertake the preparation and publication of translations into Arabic of work on science written in foreign languages particularly works embodying the latest achievements in this field

**Third** Drawing up a policy of cooperation among all scholars working in the field of Islamic education coordinating the work of Muslim states and institutions in the field of education and facilitating the accessibility and exchange of necessary documents and data

15 **Implementation in Muslim countries**

15 1 The Conference recommends that those Muslim countries which are in possession of material resources and manpower expertise should come forward with a pioneering experiment in the field of Islamic education that would serve as a model to be used by other Muslim countries when they try to put the resolutions of this Conference into effect

15 2 As the acquisition of knowledge in Islam is the duty of every individual Muslim in the sense that it will lead him to his Creator enable him to perform all rituals of worship enjoined upon him and make him adhere to Shariah in his dealings and actions the Conference recommends that all Muslim countries make education at all stages freely available and provide equal opportunities for all citizens throughout the Muslim World

15 3 The Conference urges Ministers of education and all supervisory staffs to plan and build educational establishments on the Islamic architectural pattern that will fulfil the needs of the local environment and contemporary requirements

15 4 Efforts should be made to stop the brain drain from the Muslim world and various incentives should be offered to expatriates to return to their respective Islamic countries

15 5 The Conference recommends reliance on the genuine Islamic experience in unifying Islamic studies in universities colleges and institutions in the Islamic countries and urges that help should not be sought in this regard from individuals bodies and institutions which neither rely on Islamic sources nor act on clear Islamic lines

15 6 The Conference recommends that opportunities be provided for people who have received special Islamic education to work in various fields of life

15 7 Facilities for studies overseas should be offered only to those who wish to specialise in certain subjects since students sent overseas are exposed to threats to their beliefs morals traditions and values The Conference recommends that students going overseas should receive moral and religious care and that they should be selected on the basis of their religion and morals not their scholarly distinctions alone Strenuous efforts should be made to create all specializations in the Muslim world as a preliminary step to a complete stoppage of overseas scholarships unless absolutely necessary

16 **World Union of Islamic and Arab Schools**

The Conference is of the opinion that the establishment of the World Union of Islamic and Arab schools is a good initiative which deserves encouragement and puts on record its thanks to the Government of Saudi Arabia for their continued support of this union

17 **Group Recommendations**

The recommendations agreed upon by the three groups are to be issued by the Conference after being studied and finalised by the drafting committee and will constitute an integral part of the Conference s recommendations provided that they are in harmony with the objectives of the Conference

18 **Proceedings and Papers**

In view of the great value of the papers presented to this Conference and the serious discussions carried on among Muslim scholars specialised in various fields of education the Conference recommends that the Implementation Committee publish at once the complete proceedings of the Conference so that Muslim countries and Islamic educational institutions might benefit from them when designing an educational system on the basis of Islamic principles Until the Islamic Educational Centre comes into being the Conference recommends that the Organising Committee be transformed into a Follow up committee entrusted with the implementation of the Conference s resolution

19 **Vote of Thanks**

The Conference expresses its deep and heart felt thanks to the Kingdom of Saudi Arabia for convening this Conference the first of its kind to discuss the basis upon which an integrated self-contained Islamic educational system is to be built The Conference also extends its thanks to King Abdulaziz University for taking this good initiative and using it in the service of Islamic Da wa and the interest of all Muslims

# قانون کی تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں ؟

"الجہاد فی الاسلام" کے مصنف نے یہ تقریر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور کے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان سینیٹ ہال میں ۱۴ فروری ۱۹۴۰ء کو فرمائی (ادارہ)

## پہلا قدم

پاکستان میں قانون کی تعلیم کو اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ایک قانونی اکیڈمی — قائم کرنا چاہیئے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو گزشتہ دور میں ہمارے اسلاف اس سلسلے میں کر چکے ہیں، اور ان عربی کتابوں کو جو اسلامی قانون کی تعلیم کے لیے اگر رہنما ہو سکتی ہیں منتقل کرے۔ پھر ان کے مواد کو جدید طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کرے۔ اگر ان سے اس صدی کا طالب علم کسی دقت کے بغیر استفادہ اٹھا سکے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہمارے فقہ کا اصل ذخیرہ عربی میں ہے اور بدقسمتی سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس وجہ سے اور کچھ دوسری نفسیاتی وجوہ سے یہ عام لوگ اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض لوگ یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ ان افکار و خیالات کو اصلاحی تحقیقوں کے بغیر ہی سرے سے منسوخ کر دیا جائے، اور نئے سرے سے اجتہاد کر کے کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض علم کی کمی کا نتیجہ ہیں۔ قدر و قیمت کے متعلق کوئی اندازہ کرتے ہیں۔ اگر وہ پہلے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو انہیں پتہ چلے کہ انہوں نے اپنی ان نسلوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہو کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ سب اسلامی فقہ کی بنیادیں ہمارے لیے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے زیادہ کر رہیں کاروائی کی اگر ہم محض جہالت کی بنا پر ان کی بنائی عمارت کو جوں کا توں ڈھاکر نئے سرے سے ہی تعمیر کی بنا ڈالنے پر اصرار کریں۔ ہمارے پہلے عقلمندی یہی ہے کہ جو کچھ وہ بنا گئے ہیں اسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لیے کار آمد بنائیں، اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آئے اس کے لیے مزید تعمیر کرتے چلیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی پچھلی نسلوں کے کام پر پانی پھیر کر نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جن قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون اسلامی ہی تھا۔ اس زمانے میں مسلمان نری گھاس نہیں کھودتے تھے، بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری ہی ضروریات پر ان کے فقہاء نے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ ہمیں فقہاء ان حکومتوں کے جج، مفتی اور قانون بنانے والے ہوتے تھے، اور ان کے فیصلوں سے لٹریچر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ سو ڈیڑھ سو برس قبل تک ہر شعبۂ قانون پر بحث کی ہے۔ محض دیوانی و فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی اس کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون داں آدمی ان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اہل علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرے کا جائزہ لینے پر مامور کریں، اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کار آمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اس ذخیرے میں مل سکتا ہو۔

## فوری تراجم کی ضرورت

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں، جو ایسی ہیں جن کو اردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے:

(۱) احکام القرآن۔ تین کتابیں: جصاص، ابن العربی اور قرطبی

ان کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانون کے طلبہ کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثار صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمہ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں ان کے دلائل سمیت مفصل بیان کر دیا گیا۔

(۲) دوسرا اہم ذخیرہ کتب حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بحثوں کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اردو میں منتقل ہونی چاہییں:

بخاری پر — فتح الباری اور عینی

مسلم پر — نووی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی "فتح الملہم"

ابوداؤد پر — "عون المعبود" اور "بذل المجہود"

موطا پر — شاہ ولی اللہ صاحب کی "مسویٰ" اور "مصفیٰ" اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی "اوجز المسالک"

منتقی الاخبار پر — شوکانی کی "نیل الاوطار"

مشکوٰۃ پر — مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی "التعلیق الصبیح"

علم الآثار میں — امام طحاوی کی "شرح معانی الآثار"

(۳) اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیئے جو اس علم میں امہات کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں منتقل ہونی چاہییں:

فقہ حنفی پر — امام سرخسی کی "المبسوط" اور "شرح السیر الکبیر"، کاسانی کی "بدائع الصنائع"، ابن ہمام کی "فتح القدیر" مع ہدایہ اور "فتاویٰ عالمگیری"

فقہ شافعی پر — "کتاب الام"، "شرح المہذب" اور "مغنی المحتاج"

فقہ مالکی پر —— "المدونہ" یا کوئی اہم کتاب جس کا اہل علم انتخاب کریں۔
فقہ حنبلی پر —— ابن قدامہ کی "المغنی"
فقہ ظاہری پر —— ابن حزم کی "المحلی"
مذاہب اربعہ پر —— ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد" اور علماء مصر کی مرتب کردہ "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ"
نیز ابن القیم کی "زاد المعاد" میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں
معاشی مسائل پر —— امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج"، یحییٰ بن آدم کی "الخراج" اور ابو عبید القاسم کی "کتاب الاموال"، ہلال بن یحییٰ کی "احکام الوقف" و دمیاطی کی "احکام المواریث"

۴۔ پھر ہمیں اصول قانون اور حکمت تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنانا چاہیئے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہل قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابل انتخاب ہیں:
ابن حزم کی "اصول الاحکام"، علامہ آمدی کی "الاحکام لاصول الاحکام"، خضری کی "اصول الفقہ"، شاطبی کی "الموافقات"، ابن القیم کی "اعلام الموقعین" اور شاہ ولی اللہ صاحب کی "حجۃ اللہ البالغہ"۔

ان کتابوں کے متعلق میں صرف اتنا ہی نہیں کہتا کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان میں کر ڈالے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سر نو مرتب بھی کرنا ہوگا، نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا، فہرستیں شامل کرنی ہوں گی، اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے، جس کے بغیر یہ کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد نہ ہو سکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریق تدوین کچھ اور تھا اور اس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد، امارت اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ہی مجموعہ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے، اس سلسلے کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ اور کتاب المزارعہ وغیرہ عنوانات کے تحت
اسی طرح قانون شہادت، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری اور ضابطہ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادات اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جوں کی توں اردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہل علم ان پر کام کریں اور ان کی از سر نو تدوین کر کے ان کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں، اور بالفرض اگر یہ سب زیادہ محنت طلب کام نظر آئے، تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہو جانا چاہیئے کہ ان کی ترتیب پرانی ہی رکھ کر انہیں شائع کیا جائے اور مختلف قسم کے انڈکس بنا دیئے جائیں جن کے ذریعے سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

## تدوین احکام

اس سلسلے کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دور کی کتب قانون کے طرز پر دفعہ وار مدون (CODIFY) کر دے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے:

۱۔ کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو
۲۔ کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔
۳۔ کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر امت کا اجماع ہو یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔
۴۔ اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اب اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلۂ احکام (CODE) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ چوتھی قسم کے جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں، ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلۂ احکام بن جائے، تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شرح (COMMENTARY) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

## قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لاء کالجوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درسگاہوں میں دی جا رہی ہے، وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل بیکار ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہوتی ہیں جو مغربی قوانین کے اجرا کے لیے موزوں ترین مگر قانون اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درسگاہوں میں اپنے معیار کے مطابق پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لیے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہل علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں، تاکہ ایک صحیح قابل عمل اسکیم بن سکے۔

● سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیئے کہ آئندہ سے لاء کالجوں میں داخلہ کے لیے عربی زبان کی واقفیت —— اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہو —— لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی، اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لاء کالجوں کے لیے عربی دان امیدوار فراہم کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ ممکن ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر لاء کالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کے لیے کھولنی پڑے اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے، لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی علی الطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی، تو لاء کالج میں داخلہ کے لیے جو گریجوایٹ بھی آئیں گے، وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

● عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن و حدیث کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے کہ تعلیم کی ابتداء

(باقی صفحہ ۳۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ

# لختِ جگر کے نام

یہ دو یادگار خطوط ــــ ڈاکٹر نذیر احمد شہید (ایم این اے قومی اسمبلی پاکستان، ڈیرہ غازی خان) نے اپنے بیٹوں کے نام جیل سے تحریر کیے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ان خطوط کی اصل کاپیاں مل گئیں جو نذرِ قارئین کرتے ہیں ــــ (ادارہ)

پیارے بیٹے محمد ابوبکر صدیق! تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے!

مجھے تم سے کئی باتیں کرنے کی فرصت نہ ملی اور نہ میں تمہاری تعلیم و تربیت پر کچھ توجہ دے سکا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم یہ سمجھو کہ میں تمہارے حال سے بے پرواہ اور غافل ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ساری کائنات ایک باغ اور ایک گلشن ہے اس میں خدا نے اپنے مالی اور باغبان بھیج کر پودے لگائے اور انہیں کانٹ چھانٹ کر درست کرایا انہیں اچھے پھلوں کے پیوند لگانے ایک ایک کرکے اچھے سے اچھا مالی آتا رہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اس طرح اس باغ کو اجاڑنے، اس سے گل چینی کرنے، بیل توڑنے، شاخیں مروڑنے اور ان کے پتے کاٹنے کے لیے بھی کچھ غارت گر لوگ موجود رہے۔ ہر بناؤ اور سدھار کے ساتھ ایک بگاڑ اور ہر بگاڑ کے ساتھ ایک بناؤ اور سدھار کا سلسلہ ہے۔ یہاں تک کہ آج ہمارا دور آگیا ہے۔

اب باغ کی رکھوالی اور گلشنِ حیات کی نگہبانی ہم جیسے کم کوش اور کوتاہ دست، نااہل لوگوں پر آپڑی ہے۔ کام اتنا عظیم اور کرنے والے اتنے کمزور۔ پھر اگر رات دن بغیر کسی وقفہ اور آرام و آسائش کی خواہش کے کام نہ کیا گیا تو بگاڑ اس درجہ بڑھ جائے گا کہ پھر معاملہ کسی کے بس کا نہیں رہے گا اور یہ عظیم گلشنِ حیات کا مالک کیا فیصلہ کرے ــ ممکن ہے مالیوں اور باغبانوں کی کوتاہی اور بگاڑ کی زیادتی سے تنگ آکر وہ دوسرے سے اس باغ کو ہی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لے پھر اسے اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس لیے میری مصروفیت کی یہ دو وجوہ ہیں:-

۱۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس باغ کے مالک نے مالی اور نگران مقرر کر دیا ہے۔ اب میرا فرض ہے کہ اپنے آپ کو اس اعتماد اور بھروسے کے قابل ثابت کروں جو مجھ پر کیا گیا ہے کیونکہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے نتیجے میں مجھے صرف انعام ہی نہیں ملے گا، بلکہ اگر میں فرائض میں کوتاہی کروں گا تو سزا بھی ملے گی۔

۲۔ جس باغ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں انسانی حیات کے پودے اگتے ہیں، ان پر کردار کے پھول کھلتے ہیں اور حسنِ عمل کے پھل لگتے ہیں۔ اور پھولوں کی کاشت، آبیاری، کانٹ چھانٹ ان کی نگہبانی کی بیداری، ان کے لئے موسم اور ماحول کی سازگاری وغیرہ کا ایک منظم اور دائم تھکا دینے والا مسلسل کام ہے جس میں کوئی چھٹی اور غفلت مجرمانہ کوتاہی کے ہم معنی ہے!

پیارے ابوبکر!

تم بھی اس باغِ دنیا کے ننھے سے پودے ہو۔ صرف تمہاری کاشت اور تربیت تو کوئی کام نہیں ہے۔ ایسی تنگ اور بے سلیقہ کاشت کاری تو آندھیاں اور جھکڑ روز کرتے ہیں لیکن اس سے جنگل پیدا ہوتے ہیں، باغ نہیں لگائے جاتے، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری پرورش کے لئے اس باغ کا ماحول اور موسم سازگار کروں ورنہ تم اور تم جیسے لاکھوں پودے اور پھول مرجھا جائیں گے۔ اور اگر میں سارا کام کاج چھوڑ کر صرف تمہاری نگرانی میں لگ جاؤں اور عام باغ کی آرائش اور نگرانی سے کوتاہی کروں تو اول تو فرائض میں کوتاہی کا مجرم سمجھا جاؤں گا دوسرے یہ بات نتیجے کے لحاظ سے تمہارے لئے مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ہوگی، کیونکہ جب باغ میں تباہی کے عام آثار پیدا ہوں گے پودوں کی زمین کی رونق، کیاری اور زرخیزی کھو بیٹھے گی۔ پانی کی بہم رسانی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ کانٹ چھانٹ نہ ہونے کی وجہ سے باغ ایک جنگل کی صورت اختیار کر جائے گا اور بڑے درخت چھوٹے پودوں کو پھلنے پھولنے نہ دیں گے، موسم کے ایسے جھکڑ باغ میں داخل ہو جائیں گے جس سے ایک طرف سارے نرم و نازک پودے مرجھا کر سوکھ جائیں گے، تو دوسری طرف تیز آندھیوں کے عمل دخل سے بڑے درخت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے کیونکہ حفاظتی تدابیر ختم ہو چکی ہوں گی۔ ان حالات کا نتیجہ سارے باغ کی تباہی ہے۔ جب باغِ حیات کا نظام یوں بگڑ جائے تو تم کہاں پرورش پاؤ گے!

پیارے صدیق!

اگر میں تمہارے لئے ایسا گھر بناؤں جہاں زندگی کی ساری سہولتیں اور نیکی و بھلائی کی عام فضا موجود ہو، ہر طرف تقویٰ، عبادت کی خوشبو مہک رہی ہو تو ہمسایہ کے گھر میں بجنے والے ریڈیو اور اس پر گائے جانے والے فحش گانے کو کیسے بند کروں گا۔ ... جب تم صبح و شام باہر محلے کے گلی کوچے میں نکلو گے تو بھی وہاں تمہارے ہم عمر لڑکوں کی گالی گلوچ، بدزبانی، مار دھاڑ، چوری چکاری، اور بداخلاقی کے مظاہروں کو کیسے روکوں گا؟ کسی بازار میں تمہیں سودا سلف لینے جانا پڑے تو دکاندار کی بے ایمانی، اور ہیرا پھیری تمہیں متاثر کرے گی۔ سڑک کے ہر چوک، گلی کی ہر نکڑ پر نیم برہنہ فلمی تصاویر آویزاں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سارے عمر کے بچے سینما کے بورڈ اٹھائے ہوئے فحش فلمی گانے گاتے پھرتے ہیں۔ سکول میں جاؤ گے تو اگر لائق ہوئے تو استاد دیکھے گا کہ فلاں نالائق لڑکے کا سوال حل کر کے معائنہ کے دن دکھا دیا۔ فلاں لڑکے کو نقل کرا دیا اور اگر نالائق ہوئے تو استاد صاحب دوسروں کے حوالے کر دے گا۔ سکول میں تم چوری، لڑائی جھگڑا، بدزبانی، استادوں کی بے عزتی اور بداخلاقی اور نہ جانے کیا کیا سیکھو گے۔ اور پھر کالج میں سکول سے کئی گنا زیادہ خطرناک ماحول ملے گا۔ مخلوط تعلیم ... خدا اور رسولؐ سے فراموش کر دینے والی تعلیم۔ دین، آخرت، قرآن وغیرہ کی ایک بنیاد وہاں ڈھے جائے گی۔ کالج کی تعلیم کے بعد کہ کرو گے ملازمت میں رشوت، بددیانتی، کام چوری، سراج سیکری، اور ایک غلط کار نظام کی چاکری، تجارت میں بے اصولی۔ زیادہ کمانے کی خواہش، اشیاء میں ملاوٹ۔ حساب کتاب میں گھپلا۔ گاہکوں سے جھوٹ موٹ کی قسمیں، بلیک مارکیٹنگ، سمگلنگ وغیرہ۔ زمینداری اور کاشت کاری کرو گے تو زمیندار کاشت کار کے مال و جان، اور عزت و آبرو کا دشمن ملے گا اور کاشت کار اس کے لئے بھی جرم ملے گا۔

صنعت و کارخانہ داری اور مزدوری کی طرف بڑھو گے تو کارخانہ دار اور سرمایہ دار کو ظالم و جابر اور مزدور کا خون چوسنے والا اور ہیرا پھیری سے قوم کی جیب کاٹنے والا پاؤ گے، اور مزدور کو جوڑ توڑ، ہنگامہ، ہڑتال اور جلتے جلاتا ہوا پاؤ گے!

پیارے بیٹے!

اب کہو کہ تم کہاں رہوگے اور کیا کروگے ... یا گھٹ گھٹ کے مر جاؤ گے۔ یا پھر مرغ باد نما کی طرح ہوا کے رخ پہ چلتے رہو گے بیٹو ... مجھے کیا ملا تمہارا باپ بن کر اور تمہیں کیا ملا میرا بیٹا بن کر ... !

قوم کے لاکھوں بچوں میں سے تم ایک ہو میں لاکھوں کو چھوڑ کر ایک کا کیسے ہو رہوں یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے اوپر ایک خالص اسلامی حکومت موجود ہو اسلامی معاشرہ تعمیر ہو چکا ہو وہ ہمہ ایک بہترین طاقت ور اجتماعی مرکز ہو اس کی موجودگی میں ہم اپنی انفرادی تعمیر میں حصہ لے سکتے ہیں بلکہ اس وقت ہر کرنے والے کا کام بس یہی رہ جاتا ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے کام لگ جائے ... ایسے کاموں کا نتیجہ ایک جیب نکلتا ہے اس سے سب کا کام ایک ہی گھاٹ میں جمع ہو جاتا ہے!

میرے لخت جگر!

میں تمہارے لئے وہ صبح بہار لا رہا ہوں جس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ شگوفے کھلتے ہیں، کلیاں پھول بنتی ہیں اور شجر پھولوں میں پھل لگتے ہیں ... تم کئی دھوپ کے جل میں اگر جل گئے ہو جب تک اسلام آزاد نہیں ہوتا میری فکر یہی جل جانا ہے یا اسلام کو آزاد کر اسکے چھوڑوں گا یا پھر خود بھی اسلام کے ساتھ قید و بند قبول کئے رکھوں گا!

میں نے تمہیں ایک منزل اور ایک راہ دکھا دی ہے۔ اگر میرے جانشین بننا چاہو تو ابھی سے ابھی سے تیاری کرنا شروع کر دو

۹ ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ ہے اور ہر موسیٰ کے لئے ایک فرعون ہے اور موسیٰ کامیاب رہا ہے اپنے رب کے فضل و کرم سے اور فرعون ڈوب مرا اپنے رب کی نافرمانی سے ... !

اپنی والدہ کی خدمت کرو بہن بھائیوں سے لڑائی جھگڑا نہ کیا کرو، تعلیم میں محنت کرو، اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرو!

ترک اور تعلیم کے لئے میں تمہیں وہی نصیحت کرتا ہوں جو حضرت لقمان نے اپنے لڑکے کو کی تھی اور وہ نصیحت خدا کو اتنی پسند آئی کہ اس نے اسے آخری کتاب میں درج کیا اچھی طرح سنو اور اس پر اپنے عمل کی بنیاد رکھو

۱: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ... اس کی ذات، صفات، حقوق و اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے!

۲: خدا کا شکریہ ادا کرو!

۳ اپنے والدین کے احسان فراموشی نہ کرو کہ انھوں نے تمہیں جنا، پالا پوسا اور تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا خدا کے بعد والدین کا حق سب سے بڑا حق ہے ... لیکن اگر والدین کے حقوق خدا کے حقوق سے ٹکرا جائیں پھر اللہ کا حق باقی رہ جانے والا ہے اس کے سامنے حقوق ہیچ ہیں!

۴ جو لوگ اللہ کی طرف جانے والے راستہ پر چلیں، ان کا ساتھی بنا کر یہی کامیابی کی راہ اور منزل مراد ہے!

۵ چھپے ہوئے اور ظاہر ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو، کیونکہ ہر چھوٹا بڑا کام اس کی نگاہ میں ہے اور وہ قیامت کے دوران کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا!

۶ نماز کی پابندی رکھنا کیونکہ نماز برے کاموں سے روکتی ہے اور اس کے ذریعے بندے کے نفس کی صفائی ہوتی ہے اور اپنے رب کے حضور اظہار بندگی کا موقع ملتا ہے!

۷ خدا کے بندوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے روکنا یہ سب بڑی بات ہے ہر وہ کام نیکی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے کرنے کا حکم دیا ہے ہر وہ برائی اور منکر ہے جس کے کرنے سے خدا اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے اس پر تم خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جاؤ اپنی زبان، دل اور ہاتھوں سے جیسا موقع پاؤ جیسے حالات ہوں۔ ..... کام لو ... !

۸۔ راہ حق میں مشکلات اور مصائب پر صبر کرو اس لئے کہ بے صبری ایک مومن کے عزم و ہمت اور مقام سے فروتر ہے۔ بلکہ صبر نہ کرنا سخت ناشکری ہے اور بعض اوقات اس کی شدت کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

۹: لوگوں سے محبت اور شفقت سے پیش آنا ہر وقت غرور یا تکبر سے منہ لٹکا کر نہ پھرنا اور گال پھلائے نہ رہنا!

۱۰ زمین پر ایک مسلم، مومن کی چال چلنا یعنی ایک بندے کی طرح عجز و انکساری فروتنی اور خاکساری کی چال چلنا، وقار سے قدم جما کر چلنا، زمین پر پاؤں مار مار کر اکڑ کر چلنا، غرور و تکبر کی چال ہے ... خدا کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی چال کو پسند نہیں کرتا!

۱۱ کسی کے ساتھ کلام کرتے وقت خوش خلقی، متانت، آہستگی اور نرم زبانی کا رویہ اختیار کرنا زور سے آواز نکالنا، چیخ چیخ کر رعب ڈال کر باتیں کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے، اس لئے کہ اونچی آواز گدھوں اور بے عقلوں کی آواز ہے اور خدا کی ناپسندیدہ زبان اور آواز ہے!

فی الحال اسی پر قناعت کرو اور اسی پر عمل کرو!

میں چاہتا ہوں کہ تم دین اور دنیا دونوں شعبوں میں اعلیٰ تعلیم پاؤ اسلام کی اعلیٰ اقدار و روایات کے مطابق تمہاری تربیت ہو ... تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا نام کس ذات مبارک کے نام پر رکھا ہے اس لئے خدا اور رسولؐ کے احکام و فرمان کے بعد ہمیشہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت کو سامنے رکھنا وہ تمہارے لئے آئینہ ہے!

والسلام

نذیر احمد (ڈاکٹر)

ڈسٹرکٹ جیل، ڈیرہ غازی خان

۲ جون ۱۹۶۴ء

پیارے عمر فاروق!

تم پر خدا کی طرف سے رحمت اور سلامتی ہو!

بیٹا! تمہارا بچپن، تمہاری جوانی اور پختہ عمری کی خوش آئند علامت ہے ... تمہاری پیدائش سے پہلے سب اہل خانہ تم دونوں بھائیوں کی پیدائش سے مایوس تھے کیونکہ تمہاری بہنوں کا سلسلہ جس طرح لگاتار باقاعدگی سے چلا کسی کو امید نہ تھی!

اصل قصہ میں تمہیں بتاؤں

تمہارے دادا جان کی اولاد میں ... میں سب سے بڑا ہوں ... ہمارے والد محترم ہم سے دور اپنی دیہی قیام گاہ میں تشریف رکھتے تھے اور میرے اکثر چھوٹے بہن بھائی میرے پاس ڈیرہ غازی خان میں تھے۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اگر میرے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو جائے تو پھر میری ساری توجہ اس کی طرف نہ ہو جائے اور میرے چھوٹے بہن بھائی مناسب تعلیم و تربیت نگرانی اور سرپرستی سے محروم نہ رہ جائیں، اس لئے میں نے ایک دن خدمات میں آکر اپنے اللہ

سے ایک دُعا مانگ ڈالی کہ

"اے اللہ! جب تک میرے سب بھائی تربیت پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں تو مجھے زندہ رکھنا!"

حضور والد صاحب قبلہ کی وفات کے بعد میں نے اپنی اس دُعا کو پھر دہرایا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ خدا کے ہاں میری دُعا قبول ہوئی اس لئے تم دونوں بھائیوں کی اس دنیا میں آمد ہوئی ہو گی۔ تمہارے بڑے بھائی کی پیدائش کے وقت میں اور تمہاری والدہ بستی میں تھے۔ غالباً ماہ صیام تھا اس سال میں بستی میں اعتکاف کی غرض سے مقیم تھا کیونکہ یہاں شہر میں سکون اور اطمینان کوئی نصیب ہوتا ہے۔ ابوبکر کی پیدائش پر سب سے زیادہ خوشی تمہاری دادی اماں کو ہوئی۔ میری خوشی کا حال خدا سے بہتر جانتا ہے کہ پیدائش پر خوشی اور مسرت پر زیادہ ... کر ہر ماں باپ زندگی کے عام معمولات کی طرح انہیں بھی پاس کر لیتا ہوں۔ ابوبکر اور تمہاری پیدائش پر خوشی کو ہر لہر کے پیچھے ذمہ داری، تعلیم و تربیت کا احساس، بگڑے ہوئے حالات میں ہمارے بچوں کی فکر اور پھر سب سے زیادہ وہ تلخ تجربات جو گذشتہ دور کی تحریکوں میں تمہارے چچا اماں جان کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہو چکے ہیں میرے لئے رہے ہیں، اور تم پہلے ... ان کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت گزاری کی طرف سے مجھے کبھی شکایت نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کسی خوش نصیب کی اولاد اتنی اچھی ہو گی جتنی یہ میری معنوی اولاد میرے بھائی ہیں۔ لیکن میری ساری کوششوں کے باوجود نتیجہ میرے اصل مقصد حیات سے بہت دور رہا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا۔ میں کوئی بڑا آدمی تو نہ تھا کہ اپنے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی بڑا اہتمام کرتا۔ پھر بھی جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے دریغ نہ کیا لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں ان بچوں کو اپنے مقصد حیات سے روشناس نہیں کرا سکا اور انہیں اس پر مطمئن نہیں کر سکا!

سوچ کر رہ کے بعد میں اب ہر کسی سے مایوس ہو جاتا ہوں۔ اسی وجہ سے ابوبکر اور تمہاری پیدائش سے مجھے حقیقی خوشی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ تم پڑھ لکھ کر اگر ملک اور قوم کے ایک اعلیٰ یا ادنیٰ جیسی تمہاری قسمت یا حالات ہوں گے) ملازم یا ماہر افراد میں ایک دو کا اضافہ کر دو گے۔ جس تعلیم کو پانے کے بعد تم اپنے بزرگوں کو جاہل اور خدا اور اس کے رسولؐ سے ناآشنا دین، آخرت، قرآن، حدیث اور وحی الٰہی سے روگرداں ہو جاؤ گے اور اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ تم دنیاوی نقطۂ نظر سے بلکہ اس کے دور جاہلیہ اسی پاسدار ہو جاؤ تو مجھے کیا خوشی ہو گی! میں ڈرتا ہوں کہ آج کل کے لڑکے ذکر ہی کچھ ہے ہیں اور جو بس نہ بچتے وہ الیکشن کے ارمان میں گھل گھل کر مر جاتے ہیں!

مجھے تو ایسی اولاد چاہئے جو میرے کام سے لگے، امانت اور دیانت کو ہاتھ سے نہ دے، وعدہ و عہد کا پکا ہو، اپنے عہد کے سودے نہ چکائے۔ مجھے ایسے بچے چاہئیں جو خدا کے دین کا پیغام لے کر گلی گلی، قریہ قریہ، دیار دیار پھریں، جس اپنے بچوں کے لئے یہ پسند ہے کہ وہ کسی حسرت اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لئے کل پڑ رہے ہیں اور طاقت خدا کو دکھ پہنچا کر صاحب منصب و جاگیر ہو جائیں جبکہ اس بات کو ہزار درجہ پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں اس کی آرزو کرتا ہوں کہ میری اولاد راہ حق میں نکلتی تو تیں قید و بند کی آزمائشوں میں جائے اور پھر خدا کے فضل و کرم سے کامیاب اپنی منزل تک پہنچے۔ راہ حق میں اپنے بچوں کے قید کو ہزار درجہ پسند اور اس راہ میں پھانسی پانا لاکھ درجہ محبوب ہے!

فاروق بیٹا!

جس باپ کے عزائم اور ارادے ایسے خطرناک ہوں، اس کے بیٹوں کو ابھی تک سوچ لینا چاہئے کہ اگر وہ باپ کی پسندیدہ راہوں پر چلنا چاہتے ہیں تو یہ راہ کانٹوں کی راہ ہے لیکن اس پر چل کر تم ایک سرسبز و شاداب باغ میں پہنچو گے جو جنت ہی

بھلا پھولا رہے گا جس میں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، جس پر کبھی خزاں نہیں آسکے گی اور تم وہاں سے نکالے بھی نہیں جاؤ گے اور جس نے کانٹوں کی اس راہ سے کنارہ کشی کی وہ کبھی بھی جنت نعیم میں داخل نہیں ہو سکے گا!

پیارے عمر فاروق!

تمہارے بھائی کی پیدائش سے پہلے میں نے تمہاری والدہ کو نام لکھ کر دے دیا تھا۔ اور پھر میں نے اس کی پیدائش کے بعد جب اس کا نام محمد ابوبکر صدیق رکھا لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ صدیق تو نام عام ہے البتہ ابوبکر خال خال نام رکھے جاتے ہیں اس کی ایک وجہ لوگوں کے نزدیک نام کی قدامت ہے دوسرے ہر ایک کے اپنے نام اور معروفات ہوتے ہیں!

بہرحال نام رکھ کر جب اعتکاف کے دنوں میں میں نے اپنے بزرگ ملک تصوف کی زبان میں پیرومرشد حضرت مولانا استاد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں ابوبکر کی پیدائش کی خبر بھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کے دوسرے بھائی بھی دیئے تو ان کے نام عمر فاروق، عثمان غنی اور علی حیدر رکھوں گا تو مولانا نے ... تم نے ساری خلافت راشدہ پوری کر دی پھر سب کے لئے انہوں نے دعا فرمائی۔ اسی منصوبے کے تحت جب تم پیدا ہوئے تو نام پہلے سے موجود تھا اور تم عمر فاروق کہلائے۔

پیارے بیٹے!

تمہاری طبیعت اور مزاج مجھے بہت ہی پسند ہے۔ تمہارا ہر وقت صاف ستھرا اور صحیح رہنا، چمکدار آنکھیں، کشادہ پیشانی اور اس کے پیچھے، اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا، اپنے حصے کی چیزوں کو دوسروں کو دے دینا ... بہت ہی خوش آئند علامت ہے۔

خدا کرے تم اپنے بزرگوں کی توقعات کے مطابق تعلیم و تربیت پا جاؤ اور ساتھ نیک اور صالح اسلاف کے خلف الرشید ثابت ہو۔ تمہارے دادا جان اپنے دور کے بہت بڑے بزرگ تھے بظاہر سادہ سے زمیندار دکھائی دیتے تھے لیکن جن لوگوں نے ان کے سینے میں جھانک کر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ مرد درویش، آزادی، خودداری، علم، توکل اور تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ ساری عمر غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت میں گزاری۔ لوگ بزرگوں کی زندگی میں کرامات تلاش کرتے پھرتے ہیں لیکن ان کی ساری زندگی کرامت تھی مخلوق خدا کی جان، مال، عزت و آبرو کے محافظ تھے ... حکام اور بڑے آدمیوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ غریبوں اور قبائل اور عام لوگوں سے ہمیشہ شفیق بھائیوں اور کرم بزرگوں کی طرح ملتے رہتے۔ بیٹا ان کی کس کس نیکی کا ذکر کروں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو ان کی لغزشوں کو معاف کرے!

بیٹا فاروق!

تم یہ کبھی فراموش نہ کرو کہ تم کس کی اولاد اور کس کی اخلاف ہو اور پھر تمہارا نام کس بزرگ ہستی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ گو تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ لوگوں نے محمدؐ اور احمد نام رکھ کر محمدؐ احمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین و شریعت کی بیخ کنی کی۔ بعض نے بزرگ لوگوں کے نام کا لوگ کہا۔ لیکن پھر بھی نام، خاندان، قوم، ملک اور علاقہ بھی ایسے فیکٹر (FACTOR) ہیں جو آدمی کی اٹھان پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی لئے حضور پاکؐ نے مسلمانوں کو اچھے اچھے نام رکھنے کی تلقین فرمائی تھی تاکہ نام لیتے ہی ایک اچھا تصور قائم ہو۔

تم جیل میں آکر کئی ماہ مجھے مل گئے ہو۔ خدا کرے کہ راہ حق کی یہ منزل تمہیں یاد رہے!

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو!

ڈسٹرکٹ جیل ڈیرہ غازی خان

والسلام

عبد الحمید (ڈاکٹر)

۲۱ جون ۱۹۶۴ء اتوار

جہانِ مستور حیا

# ایک خط ....!

میرے مرتب کردہ ملک سالنامہ "محور" کے ضخیم نمبر پر اسی نگاہ ڈالی گئی تھی جس میں جناب ا... مسلسل لا کا ساد تھا میں نے "اشکبار وادی" اور مدیرِ صاحب صرف مضمون صاحب کا پیغام "محور" میں چھاپ دیا جس پر محور کی تقسیم بند کر دی گئی، اور میں یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے ڈٹ گیا کہ مدیرِ اعلیٰ مدیرِ اعلیٰ ہوتا ہے، صرف پرنٹ نیڈ نہیں ہوتا، پھر یونیورسٹی انتظامیہ اور ناصر سے ملک کے معاملوں کی دھن لگی اور میری دائرہ وار ... آ۔ ناسٹوں کا محور بن گئی۔ بات کشمکش کے سوالوں سے ناسل لا دو ملک بھی۔ مگر میں اپنے موقف سے باہر نکلا۔ تا آخر "محور" بیسہ مدیرِ اعلیٰ کی مرضی کے مطابق تقسیم ہو سکے۔ اس سلسلے میں وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی، ڈائریکٹر سعد احمد طلبہ پروفیسر حوا علام صادق اور صدر یونین جناب حامد ہاشمی نے جس کھلی رواداری اور وسعت دل کا مظاہرہ کیا اب میں اُن سے کہیں زیادہ خود سے زیادہ شرمندہ ہوں ـــــ دوسری طرف مدیرِ اعظم محمود صاحب نے پاکستان کے حلوس رسیدہ لوگوں کی ادبی نشستوں کی رپورٹیں کی اور ان کے بیچے مضمون کو مسترد کر کے اُن سے ان لمحے سے حوصلہ پر وہ ہشاد مار کر نہیں ملک کے سیاسی منظر نامے سے حذف کر دیا جائے۔ اس کے لیے بھی مجھے اپنے آپ سے ہی شرمندگی اٹھانا پڑی ہے شاید یہ ہمارا سیاسی مقدر ہے کہ جس کے راستے میں ہم جان نچھاور کریں، اُسی سے جان چھڑانے کے لیے جان کی بازی بھی لگائیں۔

یہ آپ کے سوالوں کا جواب نامہ نہیں، میرا مقدمہ نامہ ہے۔ اگر آپ نے ابھی نصفوں کے ساتھ چھاپ سکیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ آپ اور "محور" پر مجھے کچھ حقوق بھی ہیں میں نے اپنے ضمیر و من پر جو سرطبک پہاڑ اٹھا رکھا ہے، کم از کم مجھے پوری طرح تو نہیں کچل پائے گا۔ میں اُس انقلاب آسا لمحے کی کیفیت کو (DISOWN) نہیں کر پاتا تھا، جب میں نے "محور" کی ساکھ کے چیلنج کو کمال سے قبول کیا تھا یہ ادارے کی حرمت اور صحافت کا سالمیت کا معاملہ صرف اسے سامنے مصلحتوں اور سیاسی مصلحتوں کے ساتھ تھا وہ دوسری طرف جو چہرے تھے، اُن کے لیے یہ ان آنکھوں میں کبھی بھی کبھی پھیری نہیں ـــــ البتہ یہ بے پناہ کڑی جسے اور ایک "چپ" سی کر دیا گیا ہے کہ ہم نے حسن تحسین کے لیے ناسمجھ لفظوں کو قربان کیا تھا، اُس نے ہمیں قومی ندامت کے علاوہ اور کچھ دیا "محور" کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے آپ بالخصوص اور جامعہ کے طلبہ و طالبات بالعموم میری یہ صفائی قبول کریں کہ اسی "محور" کی بنیاد پر مجھے اعلیٰ ترین مناصب کی جو پیشکش بھی کی گئی، میں نے ٹھکرا دی، مگر اس عہد میں یار لوگوں نے ایک ایک جھوٹے نعرے کی نرمی سے نرمی سمت و سوال کی صحبت ماضی میں یہ آگ میرے تعاقب میں رہی اور میں اپنے پسماندہ اعداد و شمار جسم کھوئی ہوئی مسافتوں میں پناہ گزین ہو گیا۔

جہاں تک "محور" کے معیار و وقار کا تعلق ہے، میں نے اس کے لیے اپنے سارے حوصلے ارادے اور وسیلے استعمال کیے۔ پہلی بار ملک کے طول و عرض میں معاصر اخبارات و رسائل میں جامعہ کے اس رسالے پر جامع تبصرے شائع ہوئے۔ میرے نزدیک یونیورسٹی میگزین صرف طالب علموں کے ذہن و دل کے انکشاف و اضطراب کا عکاس ہوتا ہے، مگر وہاں کی تہذیبی اور ثقافی قدروں کا اظہار نامہ بھی ہوتا ہے۔ میرا "محور" یونیورسٹی کے اُس سال کی تمام تر تخلیقی اور تہذیبی صورتحال کا آئینہ سی منظر آئے گا۔ اس سے پہلے میں نے تین سال تک گورنمنٹ کالج لاہور کے معلم ادبی مجلے "راوی" کی ادارت بھی کی تھی۔ میرے رفیق کار شریک مدیر برادر عزیز محمد اقبال ملک نے کہا تھا کہ آپ نے "محور" کو "راوی" بنا دیا ہے۔ ملک صاحب "راوی" کے لیے بھی میرے رفیق ہیں۔۔۔ ابھی رسالوں کی رونق میں برکت ہے کہ آج ملک صاحب ملک کے ایک نامور ... روزنامے کے ڈپٹی ایڈیٹر ہیں ـــــ

اس سلسلے میں اور "محور" کے آخری کاسے میں کی تو لی میری محولی ہی۔ ان کی محنتیں اور میری محنتیں ہمدم و ہمنوا ہو گئیں۔ دانش کے سمندر میں غوطوں کے حریر سے تکمیل کر سکا، اور مجھ پر کھلا کہ جدید دور کے سامنے کے انقلاب اضطراب کا کیا ہے۔ اللہ آپ کو جوانوں کی قیادت سے آشنا کرے اور پھر استقامت بھی دے۔

محمد اجمل نیازی (سابق مدیرِ اعلیٰ "محور")

# پاک جذبے اعلیٰ قیادت

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان بھر میں اسلامی انقلاب کے لازوال جذبے کے علمبردار طلبہ نے اپنی قیادت کے لیے حسب ذیل جری جوان منتخب کیے۔ جو صحراؤں، کہساروں اور طوفانوں سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے۔ قافلہ دل کے لیے نشانِ منزل کی طرف گامزن ہیں۔ یہ تمام ناظمین اعلیٰ ہیں جو پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کی جدوجہد کے لیڈران ہیں (ادارہ)

| تاریخ انتخاب | ناظم اعلیٰ | کلاس اور تعلیمی ادارہ |
|---|---|---|
| • دسمبر ۱۹۴۷ء | ظفر اللہ خان | (بی اے سال اول اسلامیہ کالج لاہور) |
| • دسمبر ۱۹۴۸ء | ظفر اللہ خان | (بی اے سال دوم اسلامیہ کالج) |
| • اکتوبر ۱۹۴۹ء | ظفر اللہ خان | (ایم اے اسلامیات اسلامیہ کالج) |
| • نومبر ۱۹۵۰ء | محمد نسیم | (کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور) |
| • اکتوبر ۱۹۵۱ء | خرم جاہ مراد | (این ای ڈی انجینئرنگ کالج کراچی) |
| • نومبر ۱۹۵۲ء | اسرار احمد | (کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور) |
| • مارچ ۱۹۵۳ء | سید محبوب سبحانی | (ایم اے تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور) |
| • اگست ۱۹۵۳ء | سید مراد علی شاہ | (کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور) |
| • نومبر ۱۹۵۳ء | خورشید احمد | (ایم اے معاشیات کراچی یونیورسٹی) |
| • اکتوبر ۱۹۵۴ء | خورشید احمد | (ایم اے معاشیات کراچی یونیورسٹی) |
| • اکتوبر ۱۹۵۵ء | حسین خان | (ایم اے معاشیات ـ کراچی یونیورسٹی) |
| • اکتوبر ۱۹۵۶ء | حسین خان | (ایم اے معاشیات کراچی یونیورسٹی) |
| • جنوری ۱۹۵۷ء | انصار عالم | (ایم اے تاریخ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۵۷ء | انصار عالم | (ایم اے تاریخ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۵۸ء | حسین خان | (ایم اے ریاضی ـ ڈھاکہ یونیورسٹی) |
| • دسمبر ۱۹۶۲ء | محبوب علی | (بی اے فاضل ـ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۶۳ء | محبوب علی | (ایم اے سیاسیات کراچی یونیورسٹی) |
| • دسمبر ۱۹۶۴ء | سید منور حسن | (ایم اے انگریزی کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۶۵ء | سید منور حسن | (ایم اے اسلامیات کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۶۶ء | سید منور حسن | (ایم اے اسلامیات ـ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۶۷ء | محمد کمال خان | (خیبر میڈیکل کالج پشاور) |
| • نومبر ۱۹۶۸ء | محمد کمال خان | (خیبر میڈیکل کالج پشاور) |
| • نومبر ۱۹۶۹ء | مطیع الرحمٰن نظامی | (ایم اے اسلامیات ـ ڈھاکہ یونیورسٹی) |
| • جنوری ۱۹۷۱ء | مطیع الرحمٰن نظامی | (ایم اے اسلامیات ـ ڈھاکہ یونیورسٹی) |
| • اکتوبر ۱۹۷۱ء | تسنیم عالم منظر | (این ای ڈی انجینئرنگ کالج کراچی) |
| • ستمبر ۱۹۷۲ء | ظفر جمال بلوچ | (ایم اے اسلامیات ـ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۷۲ء | ظفر جمال بلوچ | (ایم اے اسلامیات ـ کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۷۳ء | ظفر جمال بلوچ | (ایل ایل بی اردو لاء کالج کراچی) |
| • نومبر ۱۹۷۴ء | ظفر جمال بلوچ | (ایل ایل بی اردو لاء کالج ـ کراچی) |
| • اکتوبر ۱۹۷۵ء | عبدالملک مجاہد | (ایم اے سیاسیات کراچی یونیورسٹی) |
| • نومبر ۱۹۷۶ء | عبدالملک مجاہد | (ایم اے سیاسیات کراچی یونیورسٹی) |
| • اکتوبر ۱۹۷۷ء | لیاقت بلوچ | (ایم اے صحافت پنجاب یونیورسٹی) |

# "مشرقی پاکستانی کمانڈوز"

"البدر" میں صد درجہ وفادار محبِ وطن اور سرگرم پاکستانی نوجوان شامل تھے جنہوں نے خود کو پاکستان کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ "البدر" کے رضاکار زیادہ پُرجوش تھے جنہوں نے دل و جان سے پاک افواج کے ساتھ تعاون کیا انہوں نے ہمیں کبھی دغا نہیں دی، کبھی فریب نہیں کیا، ہمارا ساتھ چھوڑ کر وہ کبھی باغیوں سے نہیں ملے، ہمارے دشمن سے کبھی ساز باز نہیں کی۔ مجھے اپنے کمانڈوز کو دشمن کے علاقے میں بھیجنے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ دشمن کی سرزمین میں یہ کارروائیاں اکثر و بیشتر "البدر" کے رضاکار کیا کرتے تھے انہوں نے اگرتلہ کے ایک تھیٹر میں بم پھینکے تھے اور اس واقعہ سے بھارتی شہریوں کا حوصلہ بہت پست ہوگیا تھا حتیٰ کہ لوگ اگرتلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر مجھے سرحد پار کمانڈوز بھیجنے کی اجازت ہوتی تو دشمن کے لیے اس کی اپنی سرزمین پر مسائل پیدا کیے جا سکتے تھے ان جوانوں نے کلکتہ میں بھی ایسی کارروائی کی تھی جس کی تفصیلات مجھے ٹھیک طرح سے اب یاد نہیں رہیں

مشرقی پاکستان کے ان تمام رضاکاروں اور اسلام پسند جماعتوں کی خدمت میں مجھے بس یہی کہنا ہے۔

ماں گروہ سگ از ساقی وفا مستند
سلام ما برساید ہر کجا ہستند

ہمارے رضاکاروں کو جدید اسلحہ سے لیس نہیں کیا گیا تھا، ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی، یہاں تک کہ ہمیں سول آرمڈ فورسز کے لیے بھی ٹھیک طرح اسلحہ سپلائی نہ ہوا تھا۔ بعض رضاکاروں کو تو ہم نے پامر محوری بارہ بور کی شاٹ گنیں دیں۔ رضاکاروں کا تو کیا ذکر میری اپنی آرٹلری بھی شدید قلت سے دوچار تھی جو کچھ تھوڑا بہت ہمارے پاس موجود تھا، اسی سے کام چلانا پڑا اور ہمارے ایک آرٹلری رجمنٹ کو ۳.۷ ہاؤٹزر سے مسلح کیا گیا جنہیں دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) میں بھی فرسودہ تصور کیا جاتا تھا یہ گنیں صوبہ سرحد میں قبائلیوں کے خلاف استعمال ہوئی تھیں آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ ہم نے ان فرسودہ ہتھیاروں کے ساتھ جدید جنگ لڑی ہیں اور بھی دیگر اشیاء درکار تھیں جو اوّل تو فراہم نہ کی گئیں اور بعض صورتوں میں جو اشیاء ہمارے پاس تھیں وہ یا تو مطلوبہ تعداد میں نہ تھیں یا فرسودہ ہو چکی تھیں دشمن کے تمام یونٹ، حتیٰ کہ پولیس اور کشتی ماہی کے افراد کے پاس جدید ہتھیار اور نئی ٹرانسپورٹ تھی۔ لیکن نو ماہ کے اس طویل عرصے میں پاک فوج کے جوانوں نے ثابت کر دکھایا کہ اصل اہمیت اسلحے کو نہیں، بلکہ اسے استعمال کرنے والے کو حاصل ہے۔

("ٹائیگر بولتا ہے" از جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کمانڈر ایسٹرن کمانڈ) قومی ڈائجسٹ — جولائی ۱۹۷۸ء)

---

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے، تیرے جانباز چلے آتے ہیں
تیری میلوں میں ہے وکھیل شہیدوں کا لہو
ہم تجھے گنج دو عالم سے گراں جانتے ہیں
ہم ہیں جو غیرت و ناموس پہ کٹ سکتے ہیں
ہم ہیں جو اپنی شرافت کا علم رکھتے ہیں
ہم نے سدا ہے بیاباں کو، کہساروں کو
ہم جو بڑھتے ہیں تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں

اور پاکستانی انقلاب کے سیلابِ سحر خیز کی یہ موجِ اوّل تو ہے، لیکن کوئی بڑی لہر نہیں کہ جس کے ساحلِ سمندر پر پٹخنے کے نتیجے بس ہم فوری طور پر موتیوں اور قیمتی گھونگھوں کی تلاش میں بھاگ کھڑے ہوں ــــــ!

عزیزانِ گرامی! منزلِ مراد کا ایک سنگِ میل ہے ــــ جو زیادہ تر تعریفاتی بحث سمیٹے ہوئے ہے ــــ کاش! کوئی ہمارے بعد آنے والا اس کا دوسرا نمبر نکالے کہ جو بہت سے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے شاندار خاکے، بہترین حاشیے دے سکے ــــ! اور ــــ بھٹکا ہوا راہی ــــ بھٹکی ہوئی موجیں آخر پالیں اپنا ساحل ۔ منزلِ مطلوب ! جس کا طغریٰ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے روشن ترین اور آنکھوں سے لگا لینے والے روشن روشن الفاظ پر مشتمل ہو ــــ جس کے پس منظر میں میرے اندر کی شہیدوں کی مقدس روحیں اور آکاش کے اس پار علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی ارواح مسرت سے لبریز جذبات کے ساتھ موجود ہوں ــــ!!

اس کی تکمیل کے مرحلے پر ان دوستوں کا شکریہ ادا نہ کرنا نہایت کنجوسی ہوگی کہ جنہوں نے اپنی دعاؤں سے میری "حوصلوں اور تھپکیوں سے نوازا" ان میں ابھرنے والے چمکتے ہوئے چہروں میں برادرم لیاقت بلوچ (صحافت) برادرم راجہ شفقت (فلسفہ) برادرم سید نعیم (کامرس)، برادرم سید متین الرحمٰن برادرم سید ابن حسن۔ برادرم حسن نواز (صحافت)، محترم معدر چودھری صاحب محترم ظفر منصور خالد (راولپنڈی) محترم ممتاز اقبال ملک صاحب (مادوان) جنابِ سمیع اللہ اصلاحی، جنابِ یوسف بٹ (جوش لوئیس) برادرم ذوالفقار چودھری، برادرم اختر جاوید ملک اور بہت سے بھائی ہیں ــــ! علاوہ ازیں ادارہ معلوماتِ طلبہ" اور اسلامی جمعیت طلبہ کا بھی بہت شکریہ کہ جن کی مطبوعات سے استفادہ کیا

دل اس مرحلے بہت رنجیدہ ہے کہ ــــ وہ محترم، وہ عظیم ہستی، وہ مرد درویش جنہیں لوگ ــــ پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے نام سے جانتے تھے، لیکن وہ میرے لیے روحانی سہارا تھے، اور جنہوں نے اس مقالہ کے خاکے کو پسند کرتے ہوئے نہایت مفید مشورے دیے اور جو وقتاً فوقتاً پیش رفت کے بارے میں پوچھا کرتے مگر قدرت کی جانب سے بلاوا آنے پر وہ ۱۸ اپریل کو ربِ کریم کے حضور جا پہنچے، انا للہ وانا الیہ راجعون! اس پرچے پر میں صرف ان کے مصرے کی خواہش تھی، مگر اب تو وہ اور کہیں چلے گئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ اسے انہی کے نام معنون کر دوں، مگر اس کا اختیار نہیں ــــ!!

مدیر اعلیٰ
محور

# پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

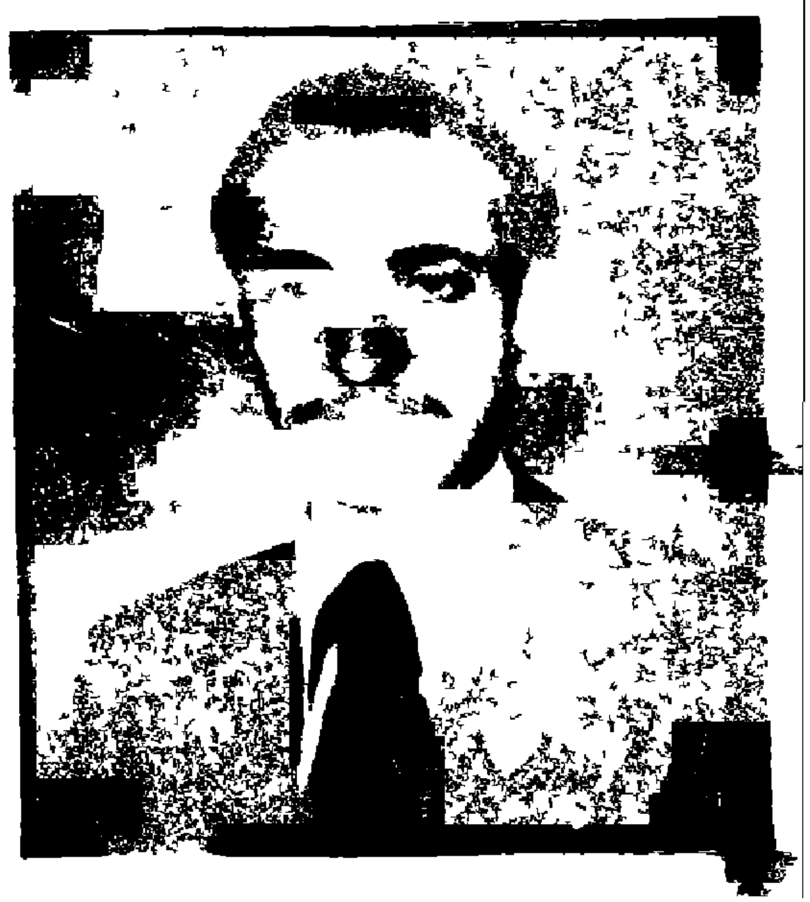
## ۷۷-۱۹۷۶ء



← صدر لیاقت بلوچ (شعبۂ معاشیات)



نائب صدر راجہ شفقت (شعبۂ فلسفہ) →



← سیکریٹری محمد نعیم (شعبۂ کامرس)

# ابھی کام باقی ہے

حسبِ ذیل مضامین کے حصول و تکمیل کا مرحلہ درپیش تھا کر کوئی پریس
میں جاری حق ادا کرے کہ کام کسی دوست کے ہاتھوں انجام پائے۔ ادارہ

۱ : تعلیم کے لیے قرآن و حدیث کی رہنمائی

۲ : تعلیم و تدریس کے لیے نصابی خاکے۔

۳ : اسلامی انقلاب اور تعلیم

۴ : پاکستان میں نظامِ تعلیم کے مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہییں؟

۵ : معیارِ تعلیم کے انحطاط کے اسباب اور اس کا حل

۶ : اسلامی نظریۂ تعلیم کی ترویج میں ذرائع ابلاغ کا کردار

۷ : طلبا میں بے چینی کے اسباب اور اس کا حل

۸ : پاکستان میں مختلف نظام ہائے تعلیم کا تجزیہ اور معاشرے پر اُن کے اثرات

۹ : دورِ جدید کے نوجوان کی زندگی میں اسلامی فکر و عمل کو کس طرح جاری و ساری کیا جائے؟

۱۰ : نوجوان نسل کے جذباتی مسائل

۱۱ : سائنس کی تعلیم میں نظریات کا دخل

۱۲ : عمرانی علوم کے ذریعے نظریاتی امور کی تعلیم

۱۳ : رہنمائی و مشاورت کا اسلامی تصور

۱۴ : دینی تعلیم اور عصری تقاضے

۱۵ : اساتذہ اور طلبہ کے لیے ضابطۂ اخلاق

۱۶ : تدریس کو مؤثر بنانے کے طریقے

۱۷ : تعلیم یافتہ اور ہنرمند افرادی قوت کے بیرونِ ملک ہجرت کرنے کے اسباب و عوامل اور
اُس کی مؤثر سد بندی

۱۸ : تعلیم کو عام کرنے میں مساجد کا کردار

۱۹ : سول سروس کے تربیتی اداروں کا تنقیدی جائزہ اور تجاویز

۲۰ : مسلح افواجِ پاکستان کے تربیتی اداروں اکیڈمیوں کے نظام اور سسٹم کا تنقیدی جائزہ،
نصاب اور تربیتی امور میں مشورے

۲۱ : حسبِ ذیل مفکرین کے تعلیمی نظریات : حضرت علیؓ، علی ہجویریؒ، ارسطو، مولانا اشرف علی
تھانوی، حضرت شاہ ولی اللہ، جیرمی بنتھم و دستنگ

۲۲ : انجینئرنگ کی تعلیم میں نظریاتی آہنگ کا نفوذ

۲۳ : اوپن یونیورسٹی۔ جامع اسکیم، عمل جائزہ

۲۴ : اب تک بننے والے تمام پاکستانی تعلیمی کمیشنوں کا تجزیہ۔

۲۵ : پاکستان میں یونیورسٹیوں کا موجودہ ڈھانچہ تنقیدی جائزہ۔ وغیرہ وغیرہ